العطایا الاحمدیہ فی فتاوی نعیمیہ

فتاوی نعیمیہ

صاحبزادہ اقتدار احمد خان بدایونی نعیمی

فہرست مضامین العطایا الاحمدیہ جلد اوّل

۱	نام کتاب	العطایا الاحمدیہ فی فتاوی نعیمیہ جلد اول
۲	مصنف	صاحبزادہ اقتدار احمد خان بدایونی نعیمی قادری
۳	کاتب	راجہ محمد صدیق خوشنویس کیدانی ضلع گوجرانوالہ تحصیل وزیرآباد
۴	مقام اشاعت	الجدہ پرنٹنگ پریس آفسٹ مچھلی مارکیٹ لاہور
۵	بار اشاعت	دوسری بار تعداد ایک ہزار
۶	قیمت کتاب	------ چالیس روپیہ
	ملنے کا پتہ	نعیمی کتب خانہ گجرات پنجاب پاکستان

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ النبی الکریم ورءوف الرحیم

اما بعد۔ شکر ہے پروردگارِ عالم کا جس نے مجھ جیسے کمترین کو جامع انسانیت سے نوازا۔ احسان ہے اُس آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جس نے عقل کے گداؤں کو علم و عرفاں کی شہنائیوں سے آراستہ کیا۔ محنتِ عظیمہ ہے، والدِ محترم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جس نے مجھ جیسے غبی کو معرفت الٰہی اور عشق محمدی کے درس پڑھائے، اور فرشِ خاکی سے اُٹھا کر بامِ عروج تفقہ فی الدین تک بلند کیا۔ اور آج مَیں بھی اِس لائق ہوا کہ مصنفین اسلام کی جوتیاں مبارک سیدھی کر سکوں۔ مَیں کیا، اور میرا علم کیا، اور کیا میری تحریر جو دین پاک کی خدمت کر سکے، بس اللہ رب العزت ہی کا کرم ہے جو اُس نے کچھ دین کی خدمت کے لئے مجھ جیسے کو مقرر فرمایا۔ بڑا خوش بخت ہے وہ انسان جس کو رب کریم دین کی سمجھ عطا فرمائے، اور پھر علم لدُنی کے زیور سے مزین فرمائے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظرِ کرم کا صدقہ ہے۔ اور قبلۂ عالم والدِ محترم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی محنت اور دعاؤں کا ثمرہ ہے، جو آج مَیں بھی اس لائق ہوا کہ اپنی تصنیف کی شکل میں ایک فتاوٰی جو وقتاً فوقتاً لوگوں کے سوالات کے جوابات اور شرعی فیصلوں و فقہی مسائل پر مشتمل ہے، تحفۂ ناظرین کر سکوں۔

یہ فتاوٰی میری تصنیف کا تیسرا پہلو ہے۔ اور اس مجموعے میں وہ اہم فیصلے اور فتوے درج ہیں جو مسلمانوں اور حکومت کی عدالتوں نے مجھ سے طلب کِئے۔ مَیں نے حتی الامکان ان فیصلوں اور فتووں میں ذاتی محنت اور تحقیق کی ہے، جس کی بنا پر میری بعض عبارتیں بعض اہم شخصیات کی روش سے کچھ ہٹ کر ہیں، لیکن بلا دلیل نہیں ہیں۔

میں اپنا یہ تحفہ بیک وقت علماء، طلباء، اور عوام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، اور مقصد محض یہ ہے، کہ علمائے کرام سے کچھ لینا ہے، طلباء کو کچھ دینا ہے اور عوام کو کچھ سمجھانا ہے۔ اگر میرے اس مجموعے میں کچھ درستگیاں ہیں تو محض کریم کا کرم ہے، اور اگر کچھ خامیاں نظر پڑیں تو وہ میری ہی کم عقلی اور کج فہمی کا باعث ہونگی۔ اللہ جلّ شانہٗ میری غلطیوں کو معاف فرمائے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طفیل میرے گناہوں کو عطائے بخشش سے نوازے۔ یہ فتاوٰی اسی روش پر بلا ترتیب ہے جس طرح والدِ محترم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "فتاوٰی نعیمیہ" تصنیف فرمایا۔ اس لحاظ سے اگر میرے اس مجموعے کو "فتاوٰی نعیمیہ" کا دُوسرا حصّہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بس آرزو یہی ہے کہ بارگاہِ رسول اللہ میں باریابی حاصل ہو جائے۔ اور اگر یہ اللہ کریم کی بارگاہ میں قبول ہو، تو اس کا ثواب میرے والدِ محترم کو عطا ہو، کیونکہ جو کچھ ہے انہی کا ہے، فقط ہاتھ میرا ہے قلم اور فیض انہی کا ہے، اُنہوں نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے سے مانگنے کا ڈھنگ سکھایا۔ انہوں نے ہی بہت محنتوں سے نبی پاک کے گیت گانے کا شعور عطا کیا۔ اور جاتے جاتے دائمی طور پر اس چوکھٹ پر ہمیں بھی جھکا دیا۔ جہاں سے ساری عمر خود کھایا، اور ہمیں بھی کھلایا۔ اے میرے اللہ اُن کی قبرِ انور کو نبی پاک کے نور سے اور منور فرما۔

اس مجموعہ فتاوٰی کے بعد فی الحال اور کسی تصنیف کا ارادہ نہیں ہے، اس لئے کہ زیادہ تر میری توجہ اس وقت "تفسیرِ نعیمی" کی تصنیف کی طرف مرکوز ہے۔ گیارھویں سپارے کی چند آیات باقی رہ گئی ہیں، وقت بہت تھوڑا ہے اور منزل بہت دُور ہے، زندگی کی چند سانسیں ہیں۔ دعا کرو کہ اسی ذکر و فکر میں گزریں، اور اسی نقشِ پاک کی تلاش میں بسر ہو جائیں جس میں والدِ محترم نے زندگی گذار دی۔ سب توفیقیں میرے رب تعالیٰ کو ہیں۔

اِس مجموعے کو شائع کرنے کا مقصد محض تبلیغ اسلام ہے، حاشا و کلّا، نہ علمی وقار کی حاجت، نہ کسی پر اپنی رائے ٹھونسنے کا ارادہ، نہ اپنی رائے کو حتمی و یقینی سمجھنے کا شوق، نہ اکابر سے تصادم کا خیال ہے بلکہ بہت سے تحقیقی فتاوے لکھنے کے بعد جب میری نظر میں اکابرین سے کسی کے غیر مجمل نظریات آئے اور باوجود کوشش بسیار کے صورت انطباق نہ بندھی اور اکابر کے اقوال میری تحقیق کے برعکس ہوئے تو میں نے اپنی تحقیق سے روگردانی کرتے ہوئے اُن فتاوا کو اشاعت سے خارج کر دیا۔ اس احتیاط کے باوجود اب بھی اگر شائع شدہ اس مجموعے کی کسی تحریر

کسی بزرگ کو محققانہ اعتراض ہو، اور میرے پاس اُس کے سوا چارہ نہ ہو، تو رجوع میں کچھ عار نہ ہوگی، اس لئے کہ: فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٌ کے بموجب اگر تا قیامت تحقیق کا دروازہ بند نہیں، تو خطاؤ نسیان اور کج فہمی میں رجوع سے عار بھی عقلاء کو زیبا نہیں۔ ہاں اہلِ تنقید کی خدمت میں اتنی ضرور گذارش ہے کہ اس مجموعہ کو بنظرِ تعصب نہ بلکہ بنظرِ تصلّب مطالع میں لائیں۔

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَنُوْرِ عَرْشِهٖ وَزِيْنَةِ فَرْشِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔

(اقتدار احمد خاں نعیمی بدایونی) ۵/۲/۲

انتساب

چونکہ اس فتاوٰی کا نام دو بزرگ ترین ہستیوں کی ذاتی و اسمی شخصیات سے وابستہ ہے، کہ لفظِ احمدیہ میں اُستادِ گرامی آقائے نعمت والدِ محترم "مفتی احمد یار خان" رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نامِ پاک سے وابستگی ہے، اور لفظِ نعیمیہ میں شیخ المشائخ اُستاذ زمن میرے علمی جدِّ اعلیٰ (دادا اُستاد) صدر الافاضل جناب قبلہ ولی نعمت مولانا نعیم الدین والملّت سے وابستگی ہے، اس لئے اس اپنی تحریر و محنت کی نسبت ان دونوں بزرگوں کی جانب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ حضور پاک غوث الاعظم والیٔ بغداد کے صدقے آقائے دو عالم رحیم و کریم ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم ان ہی بزرگوں کی وجہ سے ناقابلِ قبول ہونے کے باوجود قبول فرما لیں۔ ع: بہ کریماں کارہا دشوار نیست۔

مخلص و عاجز گناہگار، اکابر کا کفش بردار،
دین اسلام کا خدمت گار بندہ مفتی اقتدار

کتاب الطہارت

شیعوں کے اعتراض سنیوں پر کہ اہل سنت پیشاب سے آیت لکھنی جائز مانتے ہیں اس کا جواب

سوال ۱:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے شہر حیدرآباد سندھ میں ایک شیعہ مجتہد نے تقریر کرتے ہوئے اہلسنت علماء کو بہت برا بھلا کہا اور کہا کہ سنی علماء قرآن مجید کو پیشاب سے لکھنا جائز مانتے ہیں۔ اس بات سے یہاں شیعہ سنی میں بڑا فساد ہے۔ یہاں کے بہت سے علمائے کرام سے پوچھا گیا مگر تسلی بخش جواب کوئی نہ دے سکا۔ تمام شہریوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ منبع فیض و نصیحت دربار حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اس مسئلہ کو حل کرایا جائے۔ لہٰذا عرض ہے کہ آپ ہماری سچی رہنمائی فرماتے ہوئے اس مسئلہ کو وضاحت سے حل فرمائیں تاکہ ہم بھی شیعوں کے آگے بات کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کا سایہ تمام اہلسنت پر دائم و قائم رکھے۔

السائل محمد اقبال زرگر۔ بازار صرافاں حیدرآباد سندھ پاکستان

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

ایک شیعہ جو خود پر مجتہد ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ افسوس اور حیرت ہے کہ اپنی تقریر سے اپنے اجہل ہونے کو ثابت کر رہا ہے۔ اور یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مذکورہ فی السوال مجتہد صاحب فقہ حنفی تو ایک طرف خود اپنی فقہ رافضی سے بھی ناواقف ہیں۔ اور شریعت اسلامیہ کی فقہی باریکیوں سے آشنا نہیں۔ یہ مسئلہ کوئی اتنا اہم نہیں کہ اس پر تنازعہ کیا جائے۔ اولاً تو کسی عالم دین یا مجتہد اسلام نے اس چیز کا ذکر نہیں فرمایا۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری۔ فتاویٰ شامی در مختار فتاویٰ بحر الرائق۔ کتب فقہاء میں اس کا ذکر تک نہیں۔ ہاں صرف فتاویٰ قاضی خان جلد سوم ص۴۰۴ پر ہے قِيْلَ لَوْكَتَبَ بِالْبَوْلِ قَالَ لَوْكَانَ فِيْهِ شِفَاءٌ لَابَأْسَ بِهٖ۔ اسی طرح فتاویٰ بزازیہ جلد سوم پر ہے ص۳۶۵ وَلِلَّذِيْ يَرْعُفُ وَلَا يَرْقَأُ اَنْ يَكْتُبَ شَيْئًا مِّنَ الْقُرْاٰنِ عَلٰى جَبْهَتِهٖ وَلَوْبِالْبَوْلِ (الخ) ان ہر دو کتب کی روایت و عبارت سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ انسان یا مطلقاً ہر جانور کے پیشاب سے معاذاللہ قرآن مجید کی عبارت لکھنا جائز ہو جائے۔ جیسا کہ مذکورہ فی السوال شیعہ مجتہد نے عوام کو دھوکہ دیا ہے۔ صاحب فتاویٰ قاضی خان نے اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے قیل ارشاد فرمایا۔ حالانکہ جمہور فقہاء کے نزدیک قیل ضعف کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ مقدمہ بخاری شریف جلد اول ص۱۱ میں ان لفظوں کو صیغہ تمریض کہا گیا ہے جس سے حکم جاری نہیں ہوتا۔ تمام مجہول کے صیغے اصلیت کے لحاظ سے ضعف پر دلالت کرتے ہیں لیکن کبھی عارضی طور پر ضعف کے علاوہ بھی آجاتے ہیں اسی لیے حضرت حکیم الامت نے جاء الحق جلد دوم میں فرمایا کہ

قیل ضعف کے لیے نہیں وہاں یہ ہی مراد ہے۔ شامی جلد ۲ صفحہ ۱۵۱ پر بھی مخصوص قیل کو ضعف کے لیے نہیں کہا۔ وہاں بھی یہ ہی مراد ہے یعنی قیل کی عارضی حالت مگر قیل کو اصلیت کے لحاظ سے صاحب درمختار نے بھی تمریض ہی مانا ہے صفحہ ۱۱۱ کتاب درمختار صرف میں ہے قُلْتُ قَدْ مَرَّ اجْمَعْتُ الْقَمَرَ تَاشِی فَرَایْتُہٗ حَکَاہٗ مِنْ مَذْھَبِ الْغَیْرِ بِصِیْغَۃِ التَّمْرِیْضِ فَتَنَبَّہٗ۔ چنانچہ ارشاد ہوا وَمَا کَانَ بِصِیْغَۃِ التَّمْرِیْضِ کَرُوِیَ وَنَحْوِہٖ فَلَیْسَ فِیْہِ حُکْمٌ بِصِحَّتِہٖ الخ اس سے ثابت ہوا کہ یہ مسئلہ صاحب فتاوے قاضی خان کے نزدیک ضعیف ہے۔ اور فقہاء کرام کے نزدیک ضعیف پر عمل جائز نہیں۔ چنانچہ فتاوے شامی جلد اوّل صفحہ ۹۶ پر ہے۔ لَا یَجُوْزُ الْعَمَلُ بِالضَّعِیْفِ (الخ) پس ثابت ہوا کہ فقہاء اسلام کے نزدیک اِس قول پر عمل جائز نہیں۔ خاص کر احناف کے نزدیک۔ یہ بات لفظ قیل سے ثابت ہوئی۔ اور بول سے مراد اُن جانوروں کا پیشاب ہے جو حلال جانور ہیں۔ مثلاً اونٹ گائے بکری بھینس وغیرہ اس لیے کہ ان کا پیشاب علماء احناف کے نزدیک نجاست خفیفہ ہے کہ کسی چیز کے چہار حصہ سے کم تک لگ جائے تو ناپاک نہیں ہوتی۔ اور امام محمدؒ امام مالکؒ کے نزدیک حلال جانور کا پیشاب پاک ہے۔ چنانچہ ہدایہ شریف جلد اوّل صفحہ ۹۱ پر ہے۔ وَقَالَ مُحَمَّدٌ رَحِمَہُ اللّٰہُ وَاَصْلُہٗ اَنَّ بَوْلَ مَا یُؤْکَلُ لَحْمُہٗ طَاھِرٌ عِنْدَہٗ۔ اور فتاوی بیجوری شافعی جلد اوّل صفحہ ۱۰۲ پر ہے۔ غَایَۃُ لِلرَّدِّ عَلَی الْاِمَامِ الْمَالِکِ الْقَائِلِ بِاَنَّ مَا اُکِلَ لَحْمُہٗ فَبَوْلُہٗ وَرَوْثُہٗ طَاھِرَانِ (الخ) خود شیعہ حضرات کے نزدیک بھی یہ پیشاب پاک ہے۔ چنانچہ فروع کافی جلد سوم عربی کتاب الطہارۃ صفحہ ۵۷ پر ہے۔ عَلِیُّ ابْنُ اِبْرٰھِیْمَ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ حَمَّادِ بْنِ عِیْسٰی عَنْ حَرِیْزٍ عَنْ زُرَارَۃَ اَنَّھُمَا قَالَ لَا تَغْسِلْ ثَوْبَکَ مِنْ بَوْلِ شَیْءٍ یُؤْکَلُ لَحْمُہٗ۔ دوسری روایت عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مُسْلِمٍ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا عَبْدِاللّٰہِ عَنْ اَلْبَانِ الْاِبِلِ وَالْغَنَمِ وَالْبَقَرِ وَاَبْوَالِھَا وَلُحُوْمِھَا۔ فَقَالَ لَا تَوَضَّاْ مِنْہُ اِنْ اَصَابَکَ مِنْہُ شَیْءٌ اَوْ ثَوْبًا لَکَ فَلَا تَغْسِلْہٗ (الخ) اسی طرح دوسری شیعہ تصنیف تحفۃ العوام تصنیف منظور حسین نقوی مطبوعہ کتب خانہ حسینیہ محلہ شیعہ لاہور صفحہ ۵۶ پر ہے۔ پس جن حیوانوں کا گوشت کھانا حلال ہے مثلاً گائے بھینس یا بھیڑ بکری ان کا پیشاب و گوبر پاک ہے کوئی چیز اُن سے ملنے سے نجس نہیں ہوتی۔ ان ہر دو عبارتوں سے ثابت ہوا کہ اگر گائے بھینس کے پیشاب سے کوئی شیعہ آیت لکھے تو اُن کے نزدیک حرام نہ ہوگا۔ اس لیے کہ تمام شیعوں کے نزدیک گائے بھینس، وغیرہ کا پیشاب بالکل پاک ہے۔ تو جس طرح پاک سیاہی سے لکھنا جائز ہے اسی طرح بول سے ان کو جائز ماننا پڑے گا۔ شیخ عبدالحق صاحبؒ نے مدارج صفحہ ۲۲۰ اوّل پر لکھا و جائز نیست کتابتِ آن (قرآن) بخونِ راعف چنانکہ بعض جہال کنند زیرا کہ خون نجس است۔ حنفی علماء کرام نے تو اس مسئلہ کو بہت ہی قیدوں سے ذکر کیا ہے کہ اگر طبیب حاذق یہ کہہ دے، یا کوئی عامل یہ کہے کہ اس تعویذ سے اس کو ضرور فائدہ ہوگا۔ تب سخت مشکل میں اس کو جائز قرار دیا اور وہ بھی اس جانور کے پیشاب سے جس کو شیعہ پاک جانتے ہیں نہ کہ حرام جانور کے بول سے۔ کیونکہ حرام جانور کو تو

سب حنفی ناپاک مانتے ہیں۔ اور اس سے کسی قسم کے علاج کو بھی منع کرتے ہیں چنانچہ فتاوے بحرالرائق جلد ہشتم صفحہ ۲۰۵ پر ہے وَاِنَّمَا یَجُوْزُ التَّدَاوِیْ بِالْاَشْیَاءِ الطَّاهِرَةِ وَلَا یَجُوْزُ بِالنَّجِسِ (الخ) اور فتاوے بزازیہ جلد سوم صفحہ ۳۶۵ پر ہے۔ وَیُکْرَهُ مُعَالَجَةُ الْجِرَاحَةِ بِعَظْمِ اِنْسَانٍ اَوْخِنْزِیْرٍ لِاَنَّهُمَا مُحَرَّمُ الْاِنْتِفَاعِ۔ یعنی مسلکِ حنفی کے نزدیک جس چیز سے نفع حاصل کرنا حرام ہے۔ اس سے خواہ مخواہ علاج کرنا بھی حرام ہے۔ پس ہر دو عبارات۔ عبارت النص اور دلالۃ النص سے ثابت ہوا۔ کہ مندرجہ بالا مسئلہ ضعیف ہے۔ اور صرف حلال جانوروں کے بول سے ہی بوقتِ ضرورت اجازت دی گئی۔ اور اجازت بھی صرف اسی وقت ہوگی جب کہ اس عمل سے مرض کی شفاء یقین کی حد تک ہو۔ اگر شفاء نہ ہو تو یہ بھی قطعاً حرام و گناہ ہے۔ شفاء کی صورت میں اجازت دینے کی وجہ یہ ہے کہ حقوق العباد حقوق اللہ سے۔ اللہ رب العزت کی طرف سے مقدم رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ فتاوے بحر میں صفحہ ۲ پر ہے لِاَنَّ حَقَّ الْاٰدَمِیِّ مُقَدَّمٌ عَلٰی حَقِّ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے صرف دو حنفی بزرگوں نے یہ ضعیف مسئلہ درج کر دیا۔ ورنہ شیعہ لوگ تو مطلقاً اس کو جائز مانتے ہیں جیسا کہ اشارۃً ان کی عبارتوں سے ثابت ہوا۔ اب کوئی شیعہ مقرر یا واعظ کس طرح اہلسنت پر زبان طعن دراز کر سکتا ہے۔ حنفی علماء تو پھر بھی اس پیشاب کو نجاستِ خفیفہ ہی مانتے ہیں مگر شیعہ لوگوں نے پیشاب کو بالکل پاک قرار دے دیا۔ اور یہاں تک لکھ دیا کہ جو چیز بھی اس پیشاب سے لگ جائے گی وہ ناپاک نہ ہوگی۔ صاف پتہ لگا کہ دودھ، پانی، آٹا، روٹی، سالن وغیرہ جس میں بھی گائے بھینس پیشاب کر دے تو شیعہ لوگ بلا تکلف اس کو کھا پی لیں گے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ شیعہ کے نزدیک اس بول سے آیت لکھنی جائز ہے۔ اللہ تعالے ان کو ہدایت دے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔

کتنـــه

وضو میں پیر دھونے کا بیان۔ شیعہ کے مسلک مسح رجلین کی مدلل تردید

سوال ۱۰: کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے۔ کہ وضو کے چار فرض ہیں۔ (۱) مکمل چہرہ دھونا (۲) ہاتھ کلائیوں کا دھونا (۳) چوتھائی سر کا مسح کرنا (۴) پیروں کا مسح کرنا اگرچہ موزے نہ پہنے ہوئے ہوں۔ یعنی زید پیر دھونے کی فرضیت کا انکار کرتا ہے۔ اور مسح کو فرض جانتا ہے۔ زید حسب ذیل دلائل پیش کرتا ہے:۔ (۱) صحیح بخاری مع شرح فتح الباری جلد پنجم صفحہ ۲۶۲ بَابُ الشُّرْبِ قَائِمًا۔ میں یہ حدیث منقول ہے۔ عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَنَّهٗ صَلَّی الظُّهْرَ ثُمَّ قَعَدَ فِیْ حَوَائِجِ النَّاسِ فِیْ رَحْبَةِ الْکُوْفَةِ حَتّٰی حَضَرَتْ صَلٰوةُ الْعَصْرِ ثُمَّ اُتِیَ بِمَاءٍ فَشَرِبَ وَغَسَلَ وَجْهَهٗ وَیَدَیْهِ وَمَسَحَ عَلٰی رِجْلَیْهِ۔ دلیل نمبر ۲:۔ وَمِثْلُهٗ فِیْ رِوَایَةِ عُمَرَ ابْنِ مَرْزُوْقٍ عِنْدَ اِسْمَاعِیْلَ وَیُؤْخَذُ مِنْهُ اَنَّهٗ فِی الْاَصْلِ وَمَسَحَ عَلٰی رَاْسِهٖ وَرِجْلَیْهِ وَاِنَّ اٰدَمَ تَغَیَّرَ بِقَوْلِهٖ وَذَکَرَ رَاْسَهٗ وَرِجْلَیْهِ الخ۔

ترجمہ:۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ کہ کوفے میں آپ نے عصر کی نماز کا وضو فرمایا تو چہرے اور ہاتھوں کو دھویا۔ اور سر کا اور پیروں کا مسح کیا۔ اس کی مثل ابن مرزوق سے روایت ہے۔ کہ اسماعیل کے

نزدیک اور اُن میں سے اصل کتاب میں یہی روایت لی گئی۔ کہ آپ نے سر اور پیروں کا مسح کیا۔ آدم نے بھی لفظ ذکر ما اَسْتَهُ وَرِجْلَيْهِ ط سے یہی تعبیر کیا۔ دلیل ع۵۔ آثار طحاوی جلد اوّل صفحہ ع۲۱ پر اور دلیل ع۶۔ مسند احمد جلد اوّل صفحہ ع۹۵ پر بھی روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وضو کیا۔ اور پشتِ قدم پر مسح کیا۔ پھر مسح کے بعد فرمایا۔ کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو مسح کرتے نہ دیکھا ہوتا۔ تو بہ نسبت پشتِ قدم کے تلوے کا مسح زیادہ بہتر تھا۔ دلیل ع۷۔ کبریت احمر تصنیف علامہ شعرانی مطبوعہ بر حاشیہ یواقیت الجواہر جلد اوّل صفحہ ع۲۶ پر لکھا ہے۔ کہ شیخ محی الدین ابن عربی نے فتوحات میں لکھا ہے۔ کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ لا آدمِ اَرْجُلَكُمْ میں فتح پڑھنا اُس کو ممسوح ہونے سے نہیں نکالتا۔ کیونکہ بہ تحقیق یہ واؤ کبھی معیت کے لیے ہوتی ہے۔ جو نصب دیتی ہے۔ مثلاً۔ قَامَ عَمْرٌ وَّ زَيْدًا دلیل ع۸۔ تفسیر خازن جلد اوّل صفحہ ع۴۴۱ پر ہے۔ کہ اِخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي هٰذَا الْحُكْمِ هَلْ فَرْضٌ فِي الرِّجْلَيْنِ الْمَسْحُ اَوِ الْغَسْلُ فَرُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهُ قَالَ اَلْوُضُوْءُ غَسْلَتَانِ وَمَسْحَتَانِ وَيُحْكٰى ذٰلِكَ عَنْ قَتَادَةَ اَيْضًا وَيُرْوٰى عَنْ اَنَسٍ اَنَّهُ قَالَ نَزَلَ الْقُرْاٰنُ بِالْمَسْحِ وَالسُّنَّةُ بِالْغَسْلِ۔ وَعَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ لَيْسَ فِي الرِّجْلَيْنِ غَسْلٌ اِنَّمَا الْمَسْحُ عَلَى الرِّجْلَيْنِ وَعَنِ الشَّعْبِيِّ وَعَامِرٍ اَنَّهُ قَالَ اِنَّمَا نَزَلَ جِبْرِيْلُ بِالْمَسْحِ عَلَى الرِّجْلَيْنِ۔ اَلَا تَرٰى اَنَّ مَا كَانَ عَلَيْهِ الْغَسْلُ جُعِلَ عَلَيْهِمُ التَّيَمُّمُ وَمَا كَانَ عَلَيْهِ الْمَسْحُ اُهْمِلَ ط:۔ ترجمہ:۔ تفسیر خازن صفحہ ع۴۴۱ پر ہے۔ وضو میں پیر دھونے میں علمائے کرام نے اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے۔ کہ وضو دو غسلوں اور دو مسحوں کا نام ہے۔ اور یہی بات حضرت قتادہ سے روایت ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ قرآن مجید نے مسح کو نازل فرمایا۔ اور سنت نے دھونے کو۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ دونوں پیروں میں غسل (دھونا) نہیں ہے۔ فقط دونوں پیروں کا مسح ہی ہے۔ اور حضرت شعبی عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ بے شک حضرت جبرئیل علیہ السلام دونوں پیروں پر مسح کا حکم لے کر نازل ہوئے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ بے شک وہ عضو جس پر دھونا فرض ہے۔ اُس پر تیمم کرایا گیا۔ اور جس پر مسح ہے۔ اس کو چھوڑ دیا گیا۔ دلیل ع۹:۔ تفسیر دُرِّ منثور جلد دوم صفحہ ع۲۶۳ باسناد عبد الرزاق ابن ابی شیبہ، ابن ماجہ، ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا لوگوں سے۔ کہ لوگوں نے بجز دھونے کے انکار کر دیا ہے۔ حالانکہ کتاب اللہ میں مجھ کو سوائے مسح کے معلوم نہیں ہوتا:۔ دلیل ع۹:۔ کنز العمال مطبوعہ مصر ص۱۰۸ پر ہے۔ کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پاؤں پر مسح کیا۔ چنانچہ لکھا ہے۔ وَمَسَحَ بِرَاْسِهٖ وَظَهْرِ قَدَمَيْهِ ط دلیل ع۱۰:۔ مسند احمد جلد اوّل صفحہ ع۵۹ مطبوعہ مصر عَنْ حِمْرَانَ بْنِ بُسْرِ بْنِ سَعِيْدٍ وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ ط انہوں نے کہا۔ کہ امیر عثمان وکانوں کی طرف آئے۔ اور وضو کے واسطے پانی منگوایا اور غرغرہ کیا، ناک میں پانی ڈالا پھر اپنے منہ میں اور ہاتھوں کو تین تین بار دھویا۔ پھر اپنے سر اور پاؤں کا تین تین بار مسح کیا۔ پھر فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا۔

دلیل ۱۱:۔ تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ ۵۴۶ پر ہے۔ قُلْنَا ھٰذَا بَاطِلٌ مِنْ وُجُوْہٍ ثُمَّ قِیْلَ ثَبَتَ اَنَّ قِرَأَتَ وَاَرْجُلَکُمْ بِنَصْبِ اللَّامِ تُوْجِبُ الْمَسْحَ اَیْضًا لِاَنَّہٗ مَعْطُوْفٌ عَلٰی مَحَلِّ بِرُءُوْسِکُمْ وَھُوَ النَّصْبُ وَکَانَ اِعْمَالُ الْعَامِلِ الْاَقْرَبِ اَوْلٰی الخ ترجمہ ہم نے کہا۔ کہ یہ یہاں پر چند وجہوں سے باطل ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ بے شک بلفظ اَرْجُلَکُمْ کو لام کے زبر سے پڑھنا بھی مسح کو واجب کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ بِرُءُوْسِکُمْ کے محل پر معطوف ہے۔ اور وہ زبر ہے اور قریبی عامل کا عمل دینا بہتر ہوتا ہے۔ دلیل ۱۲:۔ کبیری شرح منیہ صفحہ ۱۵ پر ہے۔ کہ لفظ اَرْجُلُکُمْ قرأتِ سَبْعَہ میں نصب اور جر دونوں سے پڑھا گیا ہے۔ اور مشہور یہ ہے۔ کہ نصب عطف وُجُوْھَکُمْ سے ہے اور جر جوار کے لیے اور صحیح یہ ہے۔ کہ اَرْجُلَ رُءُوْس پر دونوں قرأتوں میں معطوف ہے۔ نصب اس کے محل پر اور جر اس کے لفظ پر ہے۔ کیونکہ عطفِ منصوب اَیْدِیَکُمْ پر منع ہے۔ اس لیے کہ عاطف اور معطوف علیہ کے درمیان جملہ اجنبیہ فاصل ہے۔ حالانکہ اصل قانون یہ ہے۔ کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ نہ کیا جائے۔ لفظ مفرد سے بھی چہ جائیکہ جملے کے ساتھ فاصلہ کیا ہو۔ اور کلامِ فصیح میں ایسا کبھی نہیں سنا گیا۔ کہ ضَرَبْتُ زَیْدًا وَمَرَرْتُ بِبَکْرٍ وَعَمْرًا الخ کی مثال میں عمرًا کو زیدًا پر عطف کیا ہو۔ لیکن جر جوار تو عطفِ نسق میں ہرگز ہرگز نہیں ہوتا۔ کیونکہ عاطف مجاورات کو مانع ہے:۔ دلیل ۱۳:۔ عینی حنفی شرح بخاری باب الوضوء مطبوعہ مصر رفاعہ ابن رافع سے روایت ہے۔ فرمایا کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم نے۔ کہ کسی کی نماز صحیح نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اپنے وضو کو مکمل نہ کرے۔ جس طرح کہ اس کو اللہ تعالٰی نے حکم دیا ہے پس چاہیے کہ اپنے منہ کو اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے۔ اور اپنے سر پر اور پاؤں پر ٹخنوں تک مسح کرے اس حدیث کو ابو علی حافظ ابن حبان ابن خزیمہ نے صحیح کیا۔ نیز اس کو ابو عیسٰی ترمذی اور ابو بکر بزّار نے حسن کہا اور اس کو حافظ ابن حبان ابن خزیمہ نے صحیح کہا نیز اس کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مسند میں عبد اللہ ابن زید سے اس طرح روایت کیا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کیا۔ اور اپنے دونوں پاؤں پر مسح کیا۔ اور اس روایت کو ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں زبیر سے اس نے مقوی سے روایت کیا۔ اور منجملہ ان کے یہ حدیث جابر بن عبد اللہ کی ہے اس کو طبرانی نے اوسط میں بیان کیا۔ زید کو اپنے ان دلائل پر بہت ناز ہے۔ اور بستی میں شور مچا رہا پھرتا۔ اور وضو میں پیر دھونے کو کفر کہتا ہے۔ کہ یہ خلافِ قرآن وحدیث ہے۔ فرمایا جائے۔ کہ ان دلائل کے جوابات کیا ہیں۔ اور پیر دھونے کے مضبوط دلائل کیا ہیں مشرقی پاکستان میں سنی علماء اس کا مسکت جواب نہ دے سکے۔ اس لیے یہاں کے سب علماء کے کہنے پر آپ کو استفتاء بھیجا جارہا ہے:۔ الراقم: سید محمد اختر خطیب ڈھاکہ مشرقی پاکستان:۔

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ

الجواب

آپ کے سوالِ مذکورہ کو بغور پڑھا۔ زید کے تمام دلائل بے حد کمزور ہیں۔ اور زید مذہبًا شیعہ معلوم ہوتا ہے

کیونکہ تمام دنیاء اسلام میں کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں۔ کہ وضو میں ننگے پیروں کو مسح کرو۔ سوائے رافضیوں اور شیعوں کے سب مسلمان وضو کا چوتھا فرض غسل رجلین ہی تسلیم کرتے ہیں۔ رافضی شیعہ لوگ چونکہ اوّل تو نماز پڑھتے ہی نہیں اور عیسائیوں کی طرح کہہ دیتے ہیں۔ کہ ہماری طرف سے امام حسین نے نماز پڑھ لی۔ اگر پڑھتے بھی ہیں۔ تو بڑی سستی اور کاہلی۔ وقت سے بے وقت کرکے یہ غفلت اور سستی کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ کسی شیعہ کو سردی زیادہ لگی ہوگی۔ تو اس نے یہ مسئلہ گھر بیٹھے بنا لیا۔ کہ وضو میں پاؤں دھونے نہ چاہئیں۔ اور چند عربی عبارتیں گھڑ کر اُن کو حدیثوں کا نام دے دیا کسی دوسرے شیعے کو ذرا زیادہ سردی لگی۔ تو اس نے چہرے کو دھونے سے بھی انکار کر دیا۔ اور بندر کی مشہور بلدی کی طرح کہیں سے بنا جوڑ کر ایک عربی عبارت لے آیا۔ اور اس کو حدیث کا نام دے دیا جس طرح کہ آثار طحاوی صفحہ ۲۰ پر لکھا ہے:۔ عَنِ النَّزَّالِ بْنِ سَبْرَۃَ قَالَ رَأَیْتُ عَلِیًّا رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ صَلَّی الظُّھْرَ ثُمَّ قَعَدَ لِلنَّاسِ فِی الرَّحْبَۃِ ثُمَّ اُتِیَ بِمَاءٍ فَمَسَحَ بِوُجْھِہٖ وَیَدَیْہِ وَمَسَحَ بِرَأْسِہٖ وَرِجْلَیْہِ وَشَرِبَ فَضْلَہٗ قَائِمًا (الخ) دیکھئے یہ کیسی بناوٹی روایت ہے۔ کہ اس میں چہرے اور ہاتھوں کے دھونے کا انکار ہے۔ یہ تو خیر ہوئی جو یہ روایت زیادہ مشہور نہیں ہوئی۔ ورنہ اگر یہ عبارت بھی کسی شیعہ کے ہتھے چڑھ جاتی۔ تو شیعہ رافضیوں کو سارے وضو سے ہی چھٹی مل جاتی۔ یہ بات واقعی ہے۔ کہ بہت سے عملی مسائل میں شافعی مالکی اختلاف ہیں۔ مگر وہ اصول پر مبنی ہیں۔ لیکن ان اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر جُہلانے اجتہاد کا لبادہ اوڑھ کر میدانِ فقاہت میں۔ کودنا اچھلنا شروع کر دیا۔ اور جن کو صحیح راویوں کا نام لینا نہیں آتا۔ وہ بھی اپنے کو مجتہد کہنے کہلوانے لگے۔ اور ان جاہل اور کذّاب لوگوں نے مسائل دینیہ میں اتنے اختلافات کئے۔ اور ایسی غلط عبارتوں کو بنا کر حدیث کا لقب دینا شروع کیا کہ محدثین کرام کو انتہائی کوششیں کرنی پڑیں۔ اور ہزاروں صعوبتیں برداشت کرکے روایتوں کی چھان بین کی۔ انہیں کذّابوں کے نکالنے کے لیے اگر کہیں اسماء الرجال تیار کیا جا رہا ہے۔ تو کہیں، احادیث کی اقسام کی جا رہی ہیں۔ انہیں جھوٹوں سچوں کی چھان بین کے لیئے امام بخاری رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ وامام مسلم رحمۃ اللہ تعالٰی و دیگر محدثین نے چھ چھ ماہ کا سفر کیا۔ یہ چھان بین و تحقیق ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ محدثینِ کرام و مجتہدینِ اربعہ کا مسلمانوں پر احسانِ عظیم ہے۔ جنہوں نے ہم پر مسلمان رہنا کتنا آسان کر دیا۔ ورنہ جھوٹوں کی ایسی بھیڑ بھاڑ میں اتنے ایمان مجروح ہوتے۔ کہ مرہم پٹی کرنے والا کوئی نہ ملتا۔ انہی ایمان سوز لوٹوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لیئے فقہاءِ کرام نے تقلید کے چار قلعے مرتب کئے۔ کہ ان کے بغیر عوام تو عوام خواص بھی طغیانی ہواؤں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اسی لیئے ہم لوگ تقلید مجتہدین اربعہ پر عوام و خواص کو مجبور کرتے ہیں۔ اور بحمدہٖ تعالٰی ہم اس کوشش میں کامیاب ہیں۔ خیال رہے۔ کہ حدیث پاک کا سلسلہ بحرِ بے کنار ہے۔ اگر اس میں کروڑہا علم و عرفان کے موتی، لعل و جواہر ہیں۔ تو بہت سے بدبختوں نے اس میں جہالت کی کنکریاں بھی شامل کر دی ہیں۔ انہیں چیزوں کو دیکھ کر چکڑالے کے بے دین عبداللہ اور اس کے شاگرد لاہور کے پرویز نے تمام

احادیث کا انکار کرکے اپنے اور اس کے شاگردوں کے دین کا بیڑا غرق کر لیا۔ اِس دَور میں ایمان اس کا ہی محفوظ رہے گا جس کے گلے میں تقلید کا پٹہ ہو گا۔ اور ہاتھ میں کسی ولی کامل کا ہاتھ ہو گا۔ واضح رہے۔ کہ سوال مذکورہ کا زید اور دنیا بھر کے شیعہ پیروں کے مسح سے متعلق جتنی عبارتیں بطور روایت پیش کرتے ہیں۔ وہ سب بناوٹی اور شیعوں کی اپنی بنائی ہوئی ہیں۔ میرے اس دعوے کے چار دلائل (۱) تفسیر روح المعانی پارہ ششم جلد سوم صفحہ ۷۴ پر ہے:۔ وَمَا يَزْعُمُهُ الْإِمَامِيَّةُ مِنْ نِسْبَةِ الْمَسْحِ إِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا وَأَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ وَغَيْرِهِمَا كَذِبٌ مُفْتَرًى عَلَيْهِمْ فَإِنَّ أَحَدًا مِنْهُمْ مَا رَوٰى عَنْهُ بِطَرِيْقٍ صَحِيْحٍ أَنَّهُ جَوَّزَ الْمَسْحَ اھ اور تفسیر روح البیان جلد دوم صفحہ ۳۵۱ پارہ ششم پر ہے۔ وَذَهَبَتِ الرَّوَافِضُ إِلَى أَنَّ الْوَاجِبَ فِي الرِّجْلَيْنِ الْمَسْحُ وَرَوَوْا فِي الْمَسْحِ خَبَرًا ضَعِيْفًا شَاذًّا اھ یعنی پیروں کا مسح واجب ہونا صرف شیعوں رافضیوں کا عقیدہ ہے (نہ کہ مسلمانوں کا) اس مذہب کو قائم رکھنے اور بچانے کے لیے انہوں نے چند روایات ضعیفہ وشاذہ بنا ڈالی ہیں۔ جو صرف جھوٹ اور افترا ہے (۲) جتنی بھی روایتیں اس قسم کی شیعوں نے بنائی ہیں۔ اُن کی اسناد کوئی نہیں نہ سلسلۂ روایات کا کسی نے ذکر کیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ سب بناوٹی ہیں جن اہل سنت محدثین ومفسرین نے بھی یہ روایتیں نقل کیں وہ یا تو کسی تردید کے لیے نقل کی ہیں۔ یا بلا سوچے سمجھے۔ چنانچہ تفسیر معانی جلد سوم ص۷۳ پر ہے:۔ وَرَوَاهَا بَعْضُ أَهْلِ السُّنَّةِ مِمَّنْ لَمْ يُمَيِّزِ الصَّحِيْحَ وَالسَّقِيْمَ مِنَ الْأَخْبَارِ بِلَا تَحَقُّقٍ وَلَا سَنَدٍ اھ دلیل ۳:۔ رسول کریم رؤف الرحیم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پاک متواترہ سے بھی ثابت ہے کہ غسل رجلین فرض ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر جلد دوم صفحہ ص۲۸ پر ہے۔ وَكَذٰلِكَ هٰذِهِ الْآيَةُ الْكَرِيْمَةُ دَالَّةٌ عَلٰى وُجُوْبِ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ مَعَ مَا ثَبَتَ بِالتَّوَاتُرِ مِنْ فِعْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اھ جب متواترا احادیث سے ثابت ہوا۔ کہ وضو میں پیر دھونے فرض ہیں اور متواترا احادیث کا انکار کفر ہے جیسا کہ علم عقائد کی کتب میں مرقوم ہے اور فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صفحہ ص۲۶۵ پر ہے:۔ مَنْ أَنْكَرَ الْمُتَوَاتِرَةَ فَقَدْ كَفَرَ اھ تو کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ چند صحابی اس کا انکار کریں۔ حالانکہ پچاس سے زائد احادیث غسل رجلین پر وارد ہیں۔ پس ثابت ہوا۔ کہ یہ روایتیں جو مسح پر دال ہیں۔ سب بناوٹی ہیں۔ اِس لیے تفسیر ابن کثیر نے تحقیق کرکے یہی فرمایا۔ کہ فَهٰذَا إِسْنَادٌ غَرِيْبٌ جِدًّا اھ دلیل ۴:۔ وضو میں پیروں کے دھونے پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ چنانچہ صغیری شرح منیہ کا حاشیہ ۶ صفحہ ۲۶ پر ہے:۔ وَعَنْ عَطَاءٍ مَا عَلِمْتُ أَنَّ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَسَحَ عَلَى الْقَدَمَيْنِ فَهٰذَا إِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ عَلٰى وُجُوْبِ الْغَسْلِ اھ اور تفسیر روح المعانی جلد سوم پارہ ششم صفحہ ۷۴ پر ہے:۔ وَلٰكِنَّ الرَّسُوْلَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابَهُ لَمْ يَفْعَلُوْا إِلَّا الْغَسْلَ اھ ان روایات سے ثابت ہوا۔ کہ غسل رجلین پر صحابہ کرام کا اجماع ہو چکا ہے۔ اور قانونِ عقائد شرعیہ کے مطابق اجماعِ صحابہ کا انکار کفر ہے۔ کیونکہ اجماعِ امت دو قسم کا ہے (۱)

اجماع قطعی اس کا انکار کفر ہے (۲) اجماع ظنی اس کا انکار کفر نہیں۔ صحابہ کا اجماع قطعی ہے۔ چنانچہ نبراس لشرح العقائد صفحہ ۲۶۵ پر ہے: فلاتوی اجماع الصحابۃ مع تصریحھم بالحکم المجمع علیہ وھو قطعی کالاٰیۃ والخبر المتواتر ویکفر منکرہ اھ۔ حاشیہ برخوردار نبراس صفحہ ۲۶۲ پر ہے قال فخر الاسلام اجماع الصحابۃ کالمتواترۃ فیکفر جاحدہ ط جب ثابت ہو گیا۔ کہ پیروں کے دھونے پر تمام صحابہ کا اجماع ہے۔ اور اس اجماع کا انکار کفر ہے۔ تو کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ چند صحابی اس اجماع کا انکار کریں۔ جب کہ بوجہ صحابیت وہ خود بھی اس اجماعِ قطعی میں شامل ہوں۔ لہٰذا صاف پتہ لگا۔ کہ وہ سب روایات جو مسحِ رجلین کو بتا رہی ہیں۔ بناوٹی ہیں۔ اِن چار مضبوط دلائل سے صراحۃً یہ ثابت کیا گیا ہے۔ کہ شیعہ لوگ بناوٹی روائتیں بنانے میں کتنے تیز ہیں۔ ابھی اپنے مسلک کے دلائل اور مذکورہ فی السوال زید کے دلائل کا جواب آگے بیان کیا جائے گا مسلک اہل سنت والجماعت یہ ہے کہ وضو کا چوتھا فرض پیر دھونے ہیں اور اس میں حنفی شافعی وغیرہما آئمہ اربعہ اصولی یا مجتہدین فروعی ہرگز ہرگز کسی کا اختلاف نہیں۔ خیال رہے۔ کہ دو مسئلوں میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں۔ مگر جہلا اس میں بھی بلا دلیل شرعی اختلاف کر کے علیحدہ اپنی چودھراہٹ ظاہر کرتے پھرتے ہیں۔ (۱) طلاقِ ثلاثہ بیک دم دینے سے تین ہی پڑ جاتی ہیں۔ کسی امام کا اس میں اختلاف نہیں۔ مگر جاہل غیر مقلد اس میں ٹانگ اڑانے سے باز نہیں آئے۔ اور شیعوں کی طرح کچھ بناوٹی روایات اور کچھ بے تکی کے دلائل پیش کر دیئے (۲) اسی طرح پیر دھونے کا مسئلہ اس پر بھی سب مسلمان متفق ہیں۔ جس کے مضبوط دلائل حسب ذیل ہیں (۱) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ پارہ ششم سورۃ انعام یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَ اَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ؕ اس آیت کریمہ میں لفظ ارجلکم کا عطف ایدیکم پر ہے۔ کیونکہ لفظِ الٰی ارجلکم کو مغسولہ اعضا میں داخل کر رہا ہے۔ سر کے لیے الٰی نہیں آسکتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ روؤس کے لیے الٰی نہیں آیا اگرچہ نحوی حضرات نے آیت کریمہ کی ترکیب نحوی میں بہت کچھ باتیں بنائی ہیں۔ اور بلاوجہ لفظ ارجلکم کو برؤسکم کا معطوف بنانے کی ناجائز کوشش کی ہے۔ مگر وہ سب غلط اور بے ہودہ قول ہیں۔ جو قرآن کریم اور حدیث پاک کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ آگے بتایا جائے گا۔ دلیل ۲ مسلمانوں کے لیے مشعل راہ آقائے دوعالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عمل شریف پیروں کے بارے میں دھونا ہی ہے۔ اسی کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا چنانچہ مشکوٰۃ شریف بحوالہ مسلم شریف صفحہ ۳۸ پر یہ حدیث پاک مرقوم ہے۔ وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم اذا توضاء العبد المسلم او المومن فغسل وجھہ خرج من وجھہ کل خطیئۃ (الخ) فاذا غسل رجلیہ خرج کل خطیئۃ مشتھا رجلاہ مع الماء او مع اٰخر قطر الماء حتی یخرج نقیا من الذنوب رواہ مسلم۔ اسی طرح انہی الفاظ کی ایک حدیث پاک نسائی شریف میں حضرت عبداللہ صنابحی سے مروی ہے بلکہ اگر خوف طوالت و اختصار کا خیال نہ ہوتا تو تقریباً

۞ ۞ ۞ ۞

چالیس پچاس احادیث صحیحہ مبارکہ مع اسنادِ تامہ درج کر دی جاتیں۔ غسلِ رجلین کے بارے میں ۲۵ احادیث تو تفسیر ابن کثیر نے ہی روایت فرمائی ہیں۔ چالیس حدیثیں طحاوی شریف نے درج کیں۔ ان احادیث میں پیر دھونے کی فرضیت کا ہی ذکر ہے:۔ دلیل ع۳:۔ اسی لیے وضو میں پیر نہ دھونے والوں کو عذاب جہنم کی خبر ہے۔ یہاں تک کہ جس کی صرف ایڑی خشک رہ جائے۔ اس کو بھی ویل کی وعید ہے۔ چنانچہ جامع صغیر جلال الدین السیوطی جلد دوم صفحہ ۱۹۷ پر ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ تعالی علیہ وَسَلَّمَ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ ط اور اسی جگہ دوسری حدیث حضرت عبد اللہ بن حرث سے روایت کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ وَبُطُوْنِ الْاَقْدَامِ مِنَ النَّارِ ط ترجمہ:۔ ہلاکت ہو ان ایڑیوں کو جو وضو میں خشک رہ جائیں۔ اتنی سخت وعید اور عذاب جہنم کی دھمکی ثابت کر رہی ہے۔ کہ وضو میں پیر دھونے فرض ہیں۔ کیونکہ قانون شریعت کے مطابق وعید صرف ترک فرض یا واجب پر ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ جب پاؤں سارا دھونا فرض ہے۔ تب ہی ایڑیاں دھونا فرض ہوں گی۔ نہ کہ فقط ایڑی تو دھونا فرض ہو پاؤں دھونا فرض نہ ہو اس حماقت کا کوئی بھی قائل نہیں پتہ لگا کہ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ ط فرض غسل ثابت کر رہا ہے۔ ہاں یہ احتمال ہے۔ کہ شاید کوئی جاہل شیعہ یہ کہہ دے۔ کہ یہ وعید اور دھمکی وضو کے بارے میں نہیں ہے بلکہ کسی گناہ کی طرف جانے کیلئے ہے۔ کیونکہ اس روایت میں وضو کا کہیں ذکر نہیں۔ تو اس کے لیے دیگر محدثین کے ابواب و اقوال بطور دلیل پیش کیے جاتے ہیں چنانچہ مفتاح کنوز السنۃ نے صفحہ ۵۳۰ پر وضو کے بیان میں ہی اس کو نقل فرمایا۔ چنانچہ صفحہ ۵۳۰ پر ارشاد عالیہ ہے:۔ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ ط۔ اور مسلم شریف، بخاری شریف، ابو داؤد شریف ترمذی شریف، نسائی شریف وغیرہ متعدد کتب حدیث میں سب محدثین کرام نے ان الفاظ کو باب الوضوء میں ہی ذکر کیا ہے مسند امام اعظم رحمۃ اللہ تعالی علیہ باب الوضوء حدیث ۱۵ صفحہ ۳۵ پر ہے۔ اَبُوْ حَنِیْفَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنْ مُحَارِبٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ وَیْلٌ لِّلْعَرَاقِیْبِ مِنَ النَّارِ ط (ترجمہ) عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سوکھی ایڑیوں کے لیے جہنم کی ویل ہے۔ اگرچہ ان روایات و حوالوں سے بخوبی واضح ہو گیا۔ کہ وعید صرف وضو میں پاؤں نہ دھونے والوں کے لیے ہے۔ مگر مزید وضاحت کے لئے ہم پوری حدیث بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ حدیث کے چند الفاظ ہیں۔ پوری حدیث سے بالکل صاف ہو جائے گا۔ کہ یہ لفظ وضو کے لیے ہی ارشاد ہوئے ہیں۔ اور یہاں سوکھی ایڑیاں ہی مراد ہیں نہ کہ گنہگار ایڑیاں جیسا کہ جہلا کے سمجھنے کا احتمال ہو سکتا تھا چنانچہ (بَابُ الْوُضُوْءِ) فَصْلٌ فِی الْوُضُوْءِ قِسْمٌ ثَانِی اَلتَّرْهِیْبُ مِنْ نَقْصِ الْوُضُوْءِ ، عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ رَاٰی رَجُلًا لَّمْ یَغْسِلْ عَقِبَیْہِ فَقَالَ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ - اَخْرَجَہُ الشَّیْخَانِ ط بخاری شریف میں بھی جلد اوّل باب الوضوء میں مع مکمل سند کے انہی الفاظ

سے یہ حدیث درج ہے۔ ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص کو نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے دیکھا۔ کہ اس نے وضو میں بھول کر بے توجہی سے صرف ایڑیاں خشک چھوڑدیں۔ جو بظاہر معمولی بات تھی۔ ارشاد فرمایا کہ ان جیسی خشک ایڑیوں کو جہنم کے ویل میں ڈالا جائے گا۔ ویل جہنم کی سخت عذاب اور ہلاکت والی ایک جگہ ہے۔ کتنی مضبوط دلیل ہے غَسْلِ رِجْلَیْنْ کی فرضیت کی دلیل ۶ ہم نے تو وہ حدیثیں پیش کردیں جس میں خود نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عمل شریف اور وعید ثابت کررہا ہے۔ کہ وضو میں پیر دھونے فرض ہیں۔ نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے عمل سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے لیکن شیعوں کے پاس کوئی ایسی روایت نہیں۔ کہ جس میں خود نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا عمل شریف مسح کو ثابت کرتا ہو۔ اگر کوئی ہوتی تو ضرور پیش کردی جاتی۔ صرف چند بناوٹی عبارتوں کو اپنے باطل عقیدوں کی ڈھال بناتے ہیں۔ مخالف کے پاس اپنے دعویٰ کا مضبوط ثبوت نہ ہونا بھی ہماری دلیل دعویٰ ہے: دلیل ۸ غسل رجلین پر تمام صحابہ کبار کا اجماعِ قطعی ہوچکا ہے۔ اور اجماع منسوخ نہیں ہوسکتا چنانچہ اصول کی مشہور کتاب التلویح والتوضیح جلد اوّل صفحہ ۱۷ پر ہے: فَاِنَّ الْحُکْمَ الْمُجْمَعَ عَلَیْہِ مَرْفُوْعٌ لَا یُوْضَعُ وَمَنْصُوْبٌ لَا یُخْفَضُ ۱ھ یعنی اجماعِ قطعی نہیں اٹھ سکتا۔ اس کی شرح حاشیہ ۱ میں ہے۔ اِشَارَۃٌ اِلٰی عَدَمِ نَسْخِ الْاِجْمَاعِ اِنْ کَانَ الْمُرَادُ مِنْہُ الْقَطْعِیُّ عَلٰی مَذْھَبِ الْجُمْھُوْرِ ظَاھِرٌ ۱ھ یعنی جمہور علماء امتِ رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے نزدیک اجماعِ قطعی منسوخ نہیں ہوسکتا پس ثابت ہوا کہ اب بھی مسلمانوں کو فرض ہے۔ کہ پیروں کو مسح ہرگز نہ کریں۔ بلکہ ننگے پیر وضو میں دھونا فرض ہیں۔ یہ زید جو مسلمانوں کو منع کرتا پھرتا ہے۔ بے دین گمراہ ہے: دلیل ۹۔ ویسے تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم الرضوان ہی عملاً ہمیشہ وضو میں پیر دھوتے تھے۔ جس کا ثبوت متعدد روایات ہیں۔ لیکن شیعہ لوگ کے نزدیک چونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول وعمل ہی معتبر ہے۔ اس لیے دلیل قرونِ ثانی کے زمرے میں صرف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول و عمل ہی نقل کیا جاتا ہے اور باوجود اس بات کے کہ صحاح ستہ، مشکوٰۃ شریف، طحاوی شریف وغیرہ کتب احادیث وتفاسیر کثیرہ معتبرہ میں بہت سی روایات حضرت علی کرم اللہ وجہہ بسند صحیح مرقوم ہیں۔ مگر شیعہ حضرات کے نزدیک ان کی اپنی ہی کتب مخصوصہ معتبر ہیں۔ چنانچہ انہی کا حوالہ پیش کیا جارہا ہے فروعِ کافی جلد اوّل عربی مطبوعہ طہران مشہد صفحہ ۱۲ باب الوضوء پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ از ابی عبداللہ کی روایت اس طرح درج ہے۔

وَمِنْ اَصْحَابِنَا عَنْ اَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدٍ وَاَبِیْ دَاوٗدَ جَمِیْعًا عَنِ الْحُسَیْنِ بْنِ سَعِیْدٍ عَنْ فَضَالَۃَ بْنِ اَیُّوْبَ عَنِ الْحُسَیْنِ اِبْنِ عُثْمَانَ عَنْ سَمَاعَۃَ عَنْ بَصِیْرٍ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ اِنْ نَسِیْتَ فَغَسَلْتَ ذِرَاعَیْہِ قَبْلَ وَجْھِکَ ثُمَّ اغْسِلْ ذِرَاعَیْکَ بَعْدَ الْوَجْہِ فَاِنْ بَدَءْتَ بِذِرَاعِکَ الْاَیْسَرِ قَبْلَ الْاَیْمَنِ ثُمَّ اغْسِلِ الْاَیْسَرَ وَاِنْ نَسِیْتَ مَعَ مَسْحِ رَاْسِکَ حَتّٰی تَغْسِلَ رِجْلَیْکَ فَامْسَحْ رَاْسَکَ ثُمَّ اغْسِلْ

رِجْلَيْكَ وَلِهٰذَا الْاِسْنَادِ فَاكَ (الخ) آخری جملہ کا ترجمہ: یعنی جب تم وضو کرتے ہوئے بھول جاؤ۔ پہلے پیر دھولیجئے۔ تو پھر سر کا مسح یاد آیا۔ اس کے متعلق حضرت علی عبداللہ فرماتے ہیں۔ کہ سر کا مسح کرے۔ اور پھر دوبارہ پیر دھولے۔ (الخ) سبحان اللہ مذہب شیعہ کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پر زور دوبارہ پیر دھونے کا حکم دیا ہے۔ کون شیعہ مولیٰ علی ابوعبداللہ اور فروع کافی کی روایت کا انکار کرسکتا ہے۔ ثابت ہوا۔ کہ وضو میں پیر دھونے ہی فرض ہیں۔ مسح قطعاً ناجائز۔ یہ تھی شیعوں کی مشہور و معروف و معتبر کتاب فروع کافی کی عبارت اگرچہ اس باب میں اس سے پہلے مسح رجلین کی بہت سی روایات ٹھونس ڈالی ہیں مگر دروغ گو را حافظہ نہ باشد کے بموجب حقیقت سامنے آہی گئی۔ نہج البلاغہ کی شرح لابن حدید جلد اوّل صفحہ ۲۰ پر مؤلف نہج البلاغۃ شریف رضی کی طرف سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وضو کیا۔ تو پیر دھوئے۔ اس کو تفسیر روح المعانی جلد سوم پارہ ششم صفحہ ۷۴ پر بھی نقل کیا ہے۔ وَنَقَلَ الشَّرِيْفُ الرَّضِيُّ عَنْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ كَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ حِكَايَةَ وُضُوْئِهٖ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَذِكْرُ فِيْهِ غَسْلَ الرِّجْلَيْنِ اھ (ترجمہ): یعنی نہج البلاغہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل ہے۔ کہ آپ نے نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے وضو کے طریقے کو بیان فرمایا۔ اور اس میں پیر دھونے کا ذکر کیا۔ اس کی شرح میں ابن حدید لکھتے ہیں۔ کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود بھی پیر ہی دھوئے۔ اگرچہ آگے چل کر اس کو تقیہ کہہ رہے ہیں مگر یہ شیعوں کی زیادتی اور کم ظرفی اور راہِ حقیقت سے محض فرار ہے۔ دلیل ۵: احناف کے علاوہ بھی مذاہب ثلاثہ یعنی مالکی، شافعی و حنبلی، غسل رجلین کو ہی فرض سمجھتے ہیں چنانچہ فقہ مالکی بلغۃ السالک جلد اوّل فصل فرائض وضو صفحہ ۲۴ پر ہے۔ وَغَسْلُ الرِّجْلَيْنِ بِالْكَعْبَيْنِ (الخ) اَلْفَرِيْضَةُ غَسْلُ جَمِيْعِ الرِّجْلَيْنِ اَيِ الْقَدَمَيْنِ مَعَ اِدْخَالِ الْكَعْبَيْنِ فِي الْغَسْلِ اھ یعنی امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک بھی غسل رجلین ہی فرض ہے اور پیروں کا دھونا ہی فرض ہے۔ اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی غسل رجلین ہی فرض ہے چنانچہ فقہ شافعی حاشیہ بیجوری جلد اوّل صفحہ ۴۲ پر ہے۔ وَالْخَامِسُ غَسْلُ الرِّجْلَيْنِ مَعَ الْكَعْبَيْنِ اھ یعنی وضو کا پانچواں فرض امام شافعی کے نزدیک دونوں پیروں کو دھونا فرض ہے۔ خیال رہے۔ کہ امام مالک کے نزدیک وضو میں سات فرض ہیں۔ اور امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک وضو میں چھ فرض ہیں، اس لحاظ سے حاشیہ بیجوری میں۔ اَلْخَامِسُ کا لفظ ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک بھی غسل رجلین ہی وضو کا چوتھا فرض ہے۔ جس کا حوالہ آگے بیان کیا جائے گا۔ غرضیکہ نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں۔ کہ وضو میں ننگے پیروں پر مسح فرض ہو۔ سوائے جہلاء شیعہ کے۔ یہ تھے وضو میں غسل رجلین کے دلائل۔ اب زید کی پیش کردہ دلیلوں پر علمی و تحقیقی تبصرہ ملاحظہ ہو۔ زید نے سوال مذکورہ میں بہت سی لغو دلیلیں پیش کی ہیں، اور بہت جگہ خیانتیں بھی کی ہیں: مثلاً دلیل ۱: زید کی اس دلیل میں کہیں بھی مسح رجلین کا ثبوت تو درکنار

ذکر تک نہیں۔ چنانچہ بخاری شریف جلد دوم پارہ ۲۲ حاشیہ پر شرح فتح الباری باب الشرب قائماً صفحہ ۸۴۰ پر ہے
حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَۃُ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْمَلِکِ بْنِ مَیْسَرَۃَ سَمِعْتُ النَّزَّالَ بْنَ سَبْرَۃَ
یُحَدِّثُ عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَنَّہٗ صَلَّی الظُّھْرَ ثُمَّ قَعَدَ فِیْ حَوَائِجِ النَّاسِ فِیْ رَحْبَۃِ الْکُوْفَۃِ حَتّٰی
حَضَرَتْ صَلٰوۃُ الْعَصْرِ ثُمَّ اُتِیَ بِمَاءٍ فَشَرِبَ وَغَسَلَ وَجْھَہٗ وَیَدَیْہِ وَذَکَرَ رَاْسَہٗ وَرِجْلَیْہِ
اِس حدیثِ پاک میں کہیں بھی مسح کا ذکر نہیں۔ یہ زید کی خیانت ہے۔ کہ اُس نے تمام شیعوں کی طرح الفاظِ حدیث شریف میں چوری کی۔ اور ذَکَرَ رَاْسَہٗ کی بجائے مَسَحَ رَاْسَہٗ بنا ڈالا۔ حدیث مبارکہ سے ایسی خیانت کرنا جہنمیوں کا شیوہ اور طریقہ ہے۔ فتح الباری شرح بخاری نے اس کی شرح میں فرمایا۔ کہ ایک راوی طیالسی نے مَسَحَ رَاْسَہٗ وَرِجْلَیْہِ کہا ہے۔ اور علماء اسماء الرجال والے طیالسی کو رافضی بتاتے ہیں۔ اور فتح الباری نے اس کا احتمال یہ بھی نکالا ہے کہ حضرت علی اُس وقت چمڑے کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ طیالسی کا اسی طرف اشارہ ہے۔ زید نے فتح الباری کا ذکر تو کر دیا۔ مگر اس احتمال کا ذکر نہ کیا۔ یہ خیانت نہیں تو اور کیا ہے۔ حالانکہ خود صاحب شرح فتح الباری کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ پیر دھونے فرض ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَعَطَفَ الرِّجْلَ عَلَیْہِ وَاِنْ کَانَتْ مَغْسُوْلَۃً عَلٰی نَحْوِ قَوْلِہٖ تَعَالٰی (الخ) یہ ہیں۔ ان شیعوں کی دلیلوں کی حقیقت ۔ دلیل ۲ زید نے اپنی اس دلیل کا حوالہ نقل نہ کیا۔ جس سے ثابت ہوا۔ کہ یہ عبارت خود زید کی بناوٹی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ زید رافضی شیعہ ہے کیونکہ بناوٹی عبارتیں اور صحیح روایات و عبارات میں توڑ پھوڑ اور مروڑ کرنا شیعہ لوگوں کا کام ہے ۔ دلیل ۳ ۔ و دلیل ۴ ۔ زید نے اِس دلیل ۳ اور ۴ میں آثارِ طحاوی اور مسند احمد جلد اول کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ کہ حضرتِ علی نے پشتِ قدم پر مسح کیا۔ زید ثابت کرنا چاہتا ہے کہ معاذ اللہ۔ مسح رجلین کا کفریہ عقیدہ امام احمد اور علامہ ابو جعفر طحاوی کا بھی ہے۔ حالانکہ علامہ طحاوی اور امام احمد کا اپنا مذہب غُسلِ رجلین ہی ہے۔ اور بہت دلائلِ قاہرہ سے اس مسلک کو ثابت کر رہے ہیں اور تردید کے لیے شیعوں کی خود ساختہ روایات بھی لکھ رہے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ شیعہ مذہب کتنا لغو ہے۔ چنانچہ علامہ طحاوی اپنی کتاب آثارِ طحاوی جلد اول صفحہ ۲۰ پر فرماتے ہیں۔ عَنِ النَّزَّالِ بْنِ سَبْرَۃَ رَاَیْتُ عَلِیًّا رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ صَلَّی الظُّھْرَ ثُمَّ قَعَدَ لِلنَّاسِ فِی الرَّحْبَۃِ ثُمَّ اُتِیَ بِمَاءٍ فَمَسَحَ بِوَجْھِہٖ وَیَدَیْہِ وَمَسَحَ بِرَاْسِہٖ وَرِجْلَیْہِ وَشَرِبَ فَضْلَہٗ قَائِمًا (الخ) ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر بازاروں کے لوگوں کے کام کے لیے بیٹھے پھر آپ کے لیے پانی لایا گیا۔ تو آپ نے چہرے کا مسح کیا۔ اور ہاتھوں کا مسح کیا اور سر کا اور پیروں کا مسح کیا۔ علامہ طحاوی اِس کو بھی موضوع و جعلی فرماتے ہیں۔ یہ بھی شیعوں کی بناوٹ ہے۔ ورنہ دنیا میں کسی کا مذہب نہیں۔ کہ وضو میں ہاتھوں اور چہرے کا مسح کرے۔ شیعہ بھی اس کو نہیں مانتے حالانکہ یہ روایت حضرت علی

کی ہے۔ تو جس طرح یہ روایت بھی موضوع اور بناوٹی ہے۔ اسی طرح تمام وُہ احادیث بناوٹی ہیں۔ جن میں پیروں کے مسح کا ذکر ہے اور جس طرح علامہ طحاوی نے اِس حدیث کو بطورِ تردید اپنی کتاب میں درج کردیا۔ اسی طرح زید کی پیش کردہ روایت کو صاحب طحاوی نے تردید کے لیے درج کیا۔ جیساکہ ہر محقق مصنف اور مناظر کا طریقہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ اوّل اوّل اِسی قسم کی مسح رجلین کی چند روائتیں بیان کر کے تردید کی۔ اور اس کے بعد کثیر تعداد میں غسلِ رجلین کی احادیث روایت کرتے ہوئے اپنا مسلک بیان اور واضح کردیا۔ یہی طریقہ فقہاء محققین کا ہے۔ کہ پہلے مخالف کا مسلک پیش کرتے ہیں۔ بعدہٗ اپنا مسلک پھر مخالف کی تردید اس لیے تمام روایات مخالفہ و موافقہ . . علی الترتیب بیان کر کے صفحہ ع۲۲ پر ارشاد فرمایا۔ فَهٰذِهِ الْاٰثَارُ تَدُلُّ اَيْضًا عَلٰى اَنَّ الرِّجْلَيْنِ فَرْضُهُمَا الْغَسْلُ لِاَنَّ فَرْضَهُمَا لَوْ كَانَ هُوَ الْمَسْحُ لَمْ يَكُنْ فِيْ غَسْلِهِمَا ثَوَابٌ اَلَا تَرٰى اَنَّ الرَّاْسَ الَّذِيْ فَرْضُهُ الْمَسْحُ لَا ثَوَابَ فِيْ غَسْلِهٖ فَلَمَّا كَانَ فِيْ غَسْلِ الْقَدَمَيْنِ ثَوَابٌ دَلَّ ذٰلِكَ اَنَّ فَرْضَهُمَا هُوَ الْغَسْلُ ط یعنی چونکہ تمام احادیث میں پاؤں دھونے کا ثواب مقرر ہے۔ پس لازم آیا۔ کہ دھونا ہی فرض ہے۔ نہ کہ مسح۔ اگر مسح رِجلَین فرض ہوتا۔ تو دھونے کا کوئی ثواب مقرر احادیث میں بیان نہ ہوتا۔ جس طرح کہ سر کا مسح فرض ہے۔ تو سر دھونے کا کوئی ثواب مقرر نہیں۔ یہ تھا صاحب طحاوی کا مسلک اسی طرح مُسند احمد جلد اوّل صفحہ ع۹۵ پر بروایت وَكِيْعٍ عَنِ الْاَعْمَشِ یہ زید کی پیش کردہ روایت موجود ہے۔ مگر اِسی مسند احمد جلد اوّل صفحہ ع۱۲۰ پر بعینہٖ یہی الفاظ بروایت ابن عباس عَنْ عَلِيٍّ موجود ہے۔ اور وہاں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ وَهُوَ لَابِسٌ نَعْلَيْهِ۔ تو اب یا تو اِس روایت کو اُس کی شرح کہنا پڑے گا۔ اور مطلب یہ ہوگا۔ کہ اس وقت حضرت علی چمڑے کے موزے پہنے ہوئے تھے۔ اُن پر مسح کیا۔ یا پھر زید کی اس روایت کو بناوٹی کہنا پڑے گا۔ کیونکہ آگے چل کر امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ غسلِ رِجلَین کے ثبوت میں روایات کثیرہ پیش کر رہے ہیں۔ جن سے خود امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے مسلک کا پتہ چل جاتا ہے اُن روایات کا ذکر ÷ دلیل ع۱۰ میں کیا جائے گا۔ مندرجہ بالا تمام گفتگو سے پتہ لگ گیا۔ کہ علامہ طحاوی اور امام احمد ہر دو بزرگوں کا عقیدہ غسلِ رجلین ہے۔ نہ کہ مسحِ رجلین۔ امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی آگے والا مسح رجلین کی روایاتِ خود ساختہ تردید ہی کے لیے لائے۔ مگر حیرت اور تعجب ہے زید کی جاہلانہ اور متعصبانہ عقل پر جس نے وہی عبارتیں دیکھیں جس کی آگے چل کر پُر زور محققانہ تردید کر رہے ہیں۔ بحمداللہ تعالےٰ زید کی تیسری اور چوتھی دلیل بھی ٹوٹ گئی۔ دلیل ع۵ ÷ زید نے دلیل ع۵ میں کبریتِ احمر کا حوالہ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ معاذ اللہ حضرت محی الدین ابن عربی کا بھی یہی مسحِ رجلین کا باطل عقیدہ۔ حاشا حاشا یہ محض فریب کاری اور زید کی اُلٹی سمجھ کا نتیجہ ہے صوفیِ وقت ولیِ کامل عارف باللہ

حضرت محی الدین ابن عربی کا یہ ہرگز ہرگز نہ عقیدہ ہے نہ نظریہ۔ اور نہ عبارت مذکورہ فی السوال کا یہ ہی مقصد ہے بلکہ اس عبارت کا مقصد محض ترکیب نحوی اور نحاتِ مختلفین میں سے ایک کے مسلک کو اپنانا ہے۔ اگرچہ میری تحقیق کے نزدیک حضرت محی الدین علیہ رحمۃ اللہ صرف نحوی ترکیب میں اُلجھے ہوئے ہیں اور اُن کے نزدیک غسلِ رجلین ہی عقیدۂ اسلامیہ ہے۔ چنانچہ کبریت جلد اوّل صفحہ ۲۳ مطبوعہ مصر طبع ثانی ۱۳۲۱ھ مصنف عبدالوہاب شعرانی قولِ حضرت محی الدین ابن عربی نقل فرماتے ہیں:۔ قَالَ وَمَذْهَبُنَا اَنَّ الْفَتْحَ فِي لَامِ اَرْجُلَكُمْ لَا يُخْرِجُهَا مِنَ الْمَسْمُوْحِ فَاِنَّ هٰذِهِ بِاَنْوَاعٍ وَقَدْ يَكُوْنُ وَاوُ الْمَعِيَّةِ تَنْصَبُ تَقُوْلُ قَامَ زَيْدٌ وَعَمْرًا وَالْحَالُ فِي ذٰلِكَ قُلْتُ قَوْلُهٗ وَمَذْهَبُنَا اَيْ حَيْثُ النَّحْوُ لَا مِنْ حَيْثُ الْاَحْكَامِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ؂ ترجمہ:۔ یعنی لفظِ اَرْجُلَکُم کا زبر بھی اس کو مسح والا ہونے سے نہیں نکالتا۔ کیونکہ اس واؤ کا ترجمہ ساتھ ہے۔ اور ایسی واؤ بعد والے لفظ کو زبر ہی دیتی ہے جیسے کہ کھڑا ہوا زید عمرو کے ساتھ۔ اسی طرح اس وضو کی آیت میں مسح کرو تم سروں کا پیروں سے متصل۔ اس کی شرح میں عبدالوہاب فرماتے ہیں۔ کہ میں کہتا ہوں۔ کہ حضرت محی الدین ابن عربی کا قول مذهبنا یعنی یہ ہمارا مذہب صرف علم نحو کے اعتبار سے ہے نہ حکم شریعت سے۔ یہ تھی زید کی پیش کردہ مایۂ ناز عبارت اور اس کا مطلب مصنف نے خود ہی بیان کر دیا ہے۔ کہ یہ نحوی گفت گو ہے نہ کہ شرعی۔ اور حضرت محی الدین عربی علیہ الرحمت کے نزدیک ممسوح سے مراد مغسول ہی ہے چنانچہ اسی کبریتِ اوّل صفحہ ۲۳ پر ہے۔ وَيُنْقَلُ عَنِ الْعَرَبِ اَنَّ الْمَسْحَ تُعْتَنٰى فِي الْغُسْلِ فَيَكُوْنُ مِنَ الْاَلْفَاظِ الْمُتَرَادِفَةِ؂ یعنی حضرت محی الدین ابن عربی کے نزدیک غسل اور مسح ہم معنی لفظ اور کبھی کبھی مسح، غسل کے معنی میں مستعمل ہے۔ جیسا کہ اہل عرب سے منقول ہے۔ اپنے مسلک کو واضح کرتے ہوئے آگے فرماتے ہیں۔ وَقَالَ فِيْهِ مَسْحُ الرِّجْلَيْنِ بِالْكِتَابِ وَغَسْلُهُمَا بِالسُّنَّةِ الْمُبَيِّنَةِ بِالْكِتَابِ (الخ) ترجمہ:۔ حضرت ابن عربی علیہ الرحمت نے فرمایا۔ کہ قرآن مجید کی ظاہر عبارت اور نحوی ترکیب سے تو یہی پتہ لگتا ہے کہ مسح ہو۔ مگر سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قرآن کا مقصد بیان کرتے ہوئے پیروں کے دھونے کا ہی ذکر فرما رہی ہے۔ یہ کبریت احمر کی پوری عبارت ہے۔ زید کی کتنی بد دیانتی ہے ہے کہ کبریت احمر کی اگلی پچھلی عبارت کو چھوڑ کر صرف درمیانی عبارت کو پیش کر دیا۔ یہ تو تھی زید کی دلیل کی بد دیانتی کا بیان اب میری تحقیق سنیئے۔ حضرت محی الدین ابن عربی علیہ الرحمت کا پیش کردہ قاعدہ غلط اور جمہور النحات کے خلاف ہے جیسا کہ دلیل ۲ میں آگے بیان ہوگا۔ اگر لفظِ وَاَرْجُلَکُم کی واؤ بمعنیٰ مع تسلیم کر بھی لی جائے اگرچہ یہ بھی غلط ہے تب بھی شیعوں کا مطلب حاصل نہیں۔ کیونکہ معیت حکم کی نہیں ہوتی۔ بلکہ وقت کی ہوتی ہے۔ قَامَ زَيْدٌ وَعَمْرًا۔ کھڑا ہوا زید عمر کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے قیام کا وقت

ایک ہے۔ نہ کہ طریقہ قیام و نوعیت کا اتحاد اس لیے یہ کہنا بھی جائز ہے۔ کہ عمر نے مارا زید کو۔ کھڑا ہوا ایک ساتھ یعنی دونوں کاموں میں کسی فعل کا فاصلہ نہیں وہی مطلب اس آیت کا ہوگا۔ کہ مسح کرو۔ سروں کا اور غسل کرو پیروں کا ایک ساتھ۔ درمیان میں کوئی فاصلہ نہ ہو۔ دلیل ۲ زید کی چھٹی دلیل بھی محض فریب کاری ہے۔ علامہ خازن بھی اپنی تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل جلد دوم صفحہ ۴۴۲ پر اپنا عقیدہ یہی بیان فرماتے ہیں۔ کہ پیروں پر مسح کرنا حرام ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ مسح کا عقیدہ صرف شیعوں کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَمَذْهَبُ الْاِمَامِيَّةِ مِنَ الشِّيْعَةِ اَنَّ الْوَاجِبَ فِي الرِّجْلَيْنِ الْمَسْحُ وَقَالَ جُمْهُوْرُ الْعُلَمَاءِ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ وَالْاَئِمَّةُ الْاَرْبَعَةُ وَاَصْحَابُهُمْ اَنَّ فَرْضَ الرِّجْلَيْنِ هُوَ الْغَسْلُ اھ یعنی صرف شیعوں کا مذہب ہے کہ مسح کرو۔ ورنہ جمہور صحابہ کرام، تابعین عظام اور سب بعد والے آئمہ کرام اور چاروں امام پیروں کے دھونے کو فرض جانتے ہیں۔ زید کی پیش کردہ عبارت علامہ علاؤالدین علی بن محمد بن ابراہیم خازن نے ذکر کی ہے۔ لیکن صرف تردید کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ شیعہ لوگ اپنا باطل دین بچانے میں اتنی خیانتیں اور من گھڑت باتیں بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تفسیر خازن صفحہ ۴۴۲ پر پیروں کے دھونے کی احادیث و روایات میں پوری ایک فصل باندھتے ہیں۔ اور بے شمار احادیث نقل فرماتے ہیں اسی ضمن میں ایک حدیث ارشاد فرمائی۔ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَنَّ رَجُلًا تَوَضَّاَ فَتَرَكَ مَوْضِعَ ظُفُرٍ عَلٰى قَدَمِهٖ فَاَبْصَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِرْجِعْ فَاَحْسِنْ وُضُوْءَكَ (الخ) یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالے عنہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا۔ کہ ایک شخص نے وضو کیا اس کے قدم میں ایک ناخن برابر جگہ خشک رہ گئی تھی۔ آقائے دو عالم صلے اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ لوٹ جا اچھی طرح وضو کر۔ علامہ خازن اس مسئلہ میں شیعوں کی سخت تردید کر رہے ہیں۔ مگر یہ زید کا کتنا بڑا فریب ہے کہ صرف اس عبارت کو نقل کر دیا۔ جس کو علامہ موصوف خود رد کر رہے ہیں۔ اور اُن کے اپنے مسلک اور بے شمار احادیث منقولہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ تفسیر خازن میں غسلِ رجلین پر دلائل نقلیہ کے علاوہ دلائل عقلیہ بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اور تمام دلائل کے بعد شیعہ لوگوں کی بناوٹی باتوں کا رد فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں فَبَطَلَ مَا قَالُوْهُ وَثَبَتَ قَوْلُ الْجُمْهُوْرِ اھ یعنی جو کچھ شیعوں نے بناوٹ میں کہا۔ وہ سب باطل ہے اور جمہور کا قول ہی ثابت و مضبوط ہے۔ زید ان عبارات کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ دلیل ۷ اسی طرح تفسیر درمنثور میں بھی تردیدی طور پر شیعوں کی بناوٹی روایات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعد میں واضح کر دیا۔ کہ ابن ابی شیبہ اور ابن عبدالرزاق کی روایت شیعوں کی خود ساختہ ہے۔ ہاں ابن عباس رضی اللہ تعالے عنہ کی روایت

مبارکہ ایک اسناد سے صحیح ہے مگر وہ بھی دلیلِ روافض نہیں بن سکتی۔ کیونکہ حضرت ابن عباس نے یہ جملہ کہ میں قرآن مجید میں بجز مسح کے کچھ نہیں پاتا۔ بطورِ تعجب فرمایا۔ اور یہ تعجب اپنی سمجھ پر ہے۔ کہ عملِ رسولِ کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تو غسلِ رجلین ہے۔ مگر ہماری عقلیں اور عقل سے بنائے نحوی قاعدے مسح کے پیچھے پڑے ہیں۔ اس تعجب کے بعد ابن عباس کا اپنا عمل شریف بھی تاعمر غسلِ رِجْلَیْن ہی رہا۔ اور عملاً ثابت کر دیا۔ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل اور حکم کے مقابل اپنی عقلیں اور سمجھیں اور عقلی نحوی قاعدے سب مردود و نامقبول ہیں۔ زید کی بدنصیبی دیکھیے۔ کہ تفسیر درِ منثور کی عبارت مردودہ کو پیش کرتا ہے اور اس کے اتنے کثیر دلائل معقولہ منقولہ فی غسلِ رجلین نظر انداز کر دیتا ہے

دلیل ۸: زید آٹھویں مذکورہ فی السوال دلیل میں تفسیر معالم التنزیل کا حوالہ نقل کر کے عوام مسلمین کو یہ دھوکا دینا چاہتا ہے کہ (معاذ اللہ) صوفی باصفا صاحبِ تفسیر معالم التنزیل کا بھی یہی عقیدہ کہ وضو میں پیروں پر مسح واجب ہے حالانکہ یہ بھی صرف زید کا دھوکا فریب ہے۔ ورنہ صاحبِ معالم التنزیل امام ابی محمد فراء بغوی علیہ الرحمت اپنی تفسیر معالم تنزیل جلد دوم صفحہ ۱۶ مطبوعہ ۱۳۳۱ھ مصر طبع اول پر اس مردود مذہب کی تردید فرماتے ہوئے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ فَقَدْ ذَهَبَ قَلِيْلٌ مِّنْ اَهْلِ الْعِلْمِ اِلٰى اَنَّهٗ يَمْسَحُ عَلَى الرِّجْلَيْنِ وَذَهَبَ جَمَاعَةُ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَغَيْرِهِمْ اِلٰى وُجُوْبِ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ ط ترجمہ: بہت ہی تھوڑے علم والے ایسے ہیں۔ جو پیروں کا مسح مانتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کا علم تھوڑا ہے کیونکہ یہاں لفظ مِنْ ہے جو قلت علم پر بھی دال ہو سکتی۔ بخلاف آگے عبارت میں کہ وہاں قلت اور بعضیت کا رنگ نہیں۔ چنانچہ لکھا ہے :۔ وَذَهَبَ جَمَاعَةُ اَهْلِ الْعِلْمِ (الخ) یعنی بہت علم والے صحابہ میں سے اور تابعین میں سے اور بعد والے پیر دھولے کو مانتے ہیں۔ اور قائلینِ مسحِ رِجْلَیْن کو خفیہ رکھا مگر غاسلین کو واضح کیا۔ کہ وہ صحابہ اور تابعین وغیرہم ہیں مسح کے ذکر میں اہل علم کی نشان دہی نہ کی۔ اس لیے کہ وہ لوگ نامقبول ہیں۔ جن کا ذکر فضول ہے اس کے بعد امام فراء ان روایتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو شیعوں نے مسح رجلین کے لیے گھر بیٹھے بنا ڈالیں۔ ان روایتوں میں بھی کسی کی اسناد نہیں۔ بلکہ تفسیر معالم تنزیل میں لفظ رُوِیَ سے مروی ہیں۔ حالانکہ لفظ رُوِیَ اور حُکِیَ وغیرہ الفاظ محدثین کے نزدیک ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ان الفاظ سے حدیث ضعیف یا موضوع بن جاتی۔ جیسا کہ پہلے بخاری شریف کے حوالے سے عرض کیا گیا۔ لیکن جب علامہ فراء بغوی نے اپنے مسلک کی احادیث بیان کیں۔ تو پوری قوی اسناد بیان کر دی۔ چنانچہ صفحہ ۱۷ پر ہے۔ اَخْبَرَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ الْمَلِيْحِيُّ اَخْبَرَنَا اَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ النُّعَيْمِيُّ نَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ نَا مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ نَا عَبْدُ اللّٰهِ نَا مَعْمَرٌ حَدَّثَنِي الزُّهْرِيُّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ حُمْرَانَ اَنَّ مَوْلٰى عُثْمَانَ قَالَ رَاَيْتُ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ تَوَضَّاَ فَاَفْرَغَ عَلٰى يَدَيْهِ ثَلَاثًا ثُمَّ تَمَضْمَضَ (الخ) ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهٗ

الیُسریٰ ثُمَّ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِیْ ھٰذَا (الخ) امام فرّاء نے غسلِ رجلین کی باسنادِ صحیح دو حدیثیں نقل کیں مگر روایاتِ مسحِ رجلین بغیر اسناد نقل ہیں۔ اس طرزِ نقل سے جہاں یہ ثابت ہوا۔ کہ مسح کی روایات بوجہ صیغہ تمریض ہونے کے ناقابلِ قبول ہیں۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ علامہ فراء بغوی صاحب تفسیر معالم کا مذہب غسلِ رجلین ہی ہے اور زید کی محوّلہ روایت کو امام فرآء نے اپنی اس تفسیر میں صرف اس لیے نقل کیا ہے۔ تاکہ بتایا جائے۔ کہ شیعہ لوگ اس طرح بناوٹ کر لیتے ہیں۔ دلیل ع۹ :۔ زید اس دلیل میں حضرت عثمانِ غنی کی طرف اس روایت کو منسوب کرتا ہے۔ کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالٰی عنہ نے پاؤں پر مسح کیا۔ چنانچہ حوالہ کنز العمال مطبوعہ مصر صفحہ ع۱۰۰ کا پیش کرتا ہے۔ اور حضرت عثمان غنی کے غلام حضرت حمران کی روایت بتاتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ کہ مَسَحَ بِرَاْسِہٖ وَظَھْرِ قَدَمَیْہِ ترجمہ مسح کیا اپنے سر کا اور اپنے قدموں کی پیٹھ کا۔ زید نے کنز العمال کی جلد کا ذکر نہ کیا۔ میں نے محققانہ طریقے پر ساری جلدوں کا مطالعہ کیا صفحہ ع۱۰۰ بھی بغور دیکھا۔ مگر کنز العمال میں یہ روایت کہیں نہ ملی۔ ثابت ہوا۔ کہ زید نے اپنے بڑوں کی نقل کرتے ہوئے خود حدیثیں بنانا شروع کر دی ہیں۔ زید نے اس دلیل سے بھی یہ تاثر دیا۔ کہ معاذ اللہ صاحب کنز کا بھی یہ ہی باطل عقیدہ ہو۔ حالانکہ صاحب کنز العمال جلد سوم مطبوعہ بیروت صفحہ ص۲۳۴ پر مذہب شیعہ کو باطل کرتے ہوئے ان کی خیانتوں اور بناوٹوں کے ضمن میں بغیر اسناد ہی روایات نقل کرتے ہیں۔ جن کی تفسیر خازن و درِّ منثور نے تردید کر دی۔ یہ بھی اُن کی تردید کرنے کے لیے صفحہ ع۲۳۹ پر اپنا مسلک بیان فرماتے لکھتے ہیں۔ کہ فقط لفظی اور نحوی طور پر حضرت ابن مسعود فقیہ اوّل کچھ کچھ مسح رجلین کے قائل ہوئے۔ تو خطاءِ قیاسی کے خوف سے فوراً رجوع کیا۔ یہ قول صرف اجتہادی تھا نہ کہ بالنص لہٰذا اس کے ساتھ خوف سے فوراً رجوع کیا چنانچہ کنز العمال میں پوری سند کے ساتھ حدیث مبارکہ اس طرح مرقوم ہے۔ عَنْ قَتَادَۃَ اَنَّ اِبْنَ مَسْعُوْدٍ قَالَ رَجَعَ اِلٰی غَسْلِ قَدَمَیْنِ ط اسی طرح صفحہ ع۲۳۹ پر حدیث نقل کرتے ہیں۔ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ سَعِیْدٍ اَنَّہٗ ذَکَرَ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ الْمَسْحَ عَلَی الْقَدَمَیْنِ فَقَالَ لَقَدْ بَلَغَنِیْ مِنْ ثَلَاثَۃٍ مِّنَ الصَّحَابَۃِ اَدْنَاھُمْ اِبْنُ عَمِّکَ الْمُغِیْرَۃُ بْنُ شُعْبَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَسَلَ قَدَمَیْہِ ط ثابت ہوا۔ کہ صاحب کنز العمال کا عقیدہ غسلِ رجلین ہی کا ہے۔ اور کیونکر نہ ہو۔ کہ یہ ہی عقیدہ تمام صحابہ کرام تابعین تبع تابعین اور تمام مسلمانوں کا ہے۔ مسح کا عقیدہ تو صرف چند جہلاءِ شیعہ کا ہے۔ زید نے اس سے پہلے دلیل ع۲ اور دلیل ع۳ میں دو روایتیں نقل کی ہیں ع۱ مسند احمد کی عَنْ عَلِیٍّ۔ اگر میں نے رسول اللہ صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم کو پشتِ قدم کا مسح کرتے نہ دیکھا ہوتا۔ تو میری عقل میں تلوا زیادہ بہتر تھا۔ کیونکہ وہاں ہی گندگی کا اندیشہ ہے۔ تفسیر خازن نَزَلَ الْقُرْاٰنُ بِالْمَسْحِ وَالسُّنَّۃُ بِالْغَسْلِ ط

یعنی قرآن کریم میں مسح کا ذکر ہے۔ اور حدیث پاک میں دھونے کا۔ تفسیر معانی و بیان نے تو شیعہ کی دیگر روائیتوں کی طرح اِس کو بھی بناوٹی کہا۔ اور یہی تحقیقی بات ہے جیسا کہ میں نے پہلے ثابت کر دیا۔ لیکن جن علماء نے اس کی زیادہ تحقیق نہ کی۔ وہ بھی اس کو مسح خفین پر محمول نہیں کرتے۔ چنانچہ مسند احمد نے اس روایت سے پہلے بالکل انہی الفاظ کی حدیث صفحہ ص۸۳ جلد اوّل میں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ و علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت نقل کی۔ جہاں صاف طور پر موزوں اور نعلین کا ذکر ہے۔ لہٰذا ارشاد ہے۔ ثُمَّ اَخَذَ بِکَفَّیْهِ مِنَ الْمَآءِ فَصَكَّ بِهِمَا عَلٰی قَدَمَیْهِ وَفِیْهِمَا النَّعْلُ ثُمَّ قَلَبَهَا بِهَا ثُمَّ عَلَی الرِّجْلِ الْاُخْرٰی مِثْلَ ذَالِكَ قَالَ فَقُلْتُ فِی النَّعْلَیْنِ اَقَالَ فِی النَّعْلَیْنِ ط یعنی حضرت علی نے موزے پہنے تھے۔ اور موزوں کو چمڑے سے منعل کیا تھا۔ جس کو ہماری اردو میں مسِیٰ کہا جاتا ہے۔ جوتی کی طرح چمڑہ سیا جاتا ہے۔ تو آپ نے یکے بعد دیگرے پیروں کو پانی لگایا۔ خیال رہے کہ اس حدیث میں یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ الخ بِکَفَّیْهِ مِنَ الْمَآءِ فَصَكَّ بِهِمَا۔ یہاں صَكَّ کے معنی سب شیعہ بھی پانی لگانا کرتے ہیں لغت میں بھی یہی ترجمہ ہے اور مسح ہوتا بھی پانی لگانے سے ہے نہ کہ مارنے سے۔ ثابت ہوا کہ صَكَّ کے معنی لگانا ہے۔ نہ کہ مارنا یا پیٹنا ماتم کرنا جیسا کہ بعض نادان شیعہ نے قرآن مجید کے الفاظ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا کے لفظ سے دھوکا دیا۔ وضو کرتے ہوئے آخر میں پانی لگایا اور پھر آپ نے یہ الفاظ کہے جس کا ذکر سوال میں زید کرتا ہے مگر زید نے سب سے آنکھیں بند کر کے اپنے مطلب کی چیز نکال لی۔ اسی طرح کنز العمال صفحہ ص۲۶۹ جلد اوّل فصل سوم فی مسح الخفین میں ہے۔ عَنْ عَلِیٍّ لَوْ کَانَ الدِّیْنُ بِالرَّاْیِ لَکَانَ بَاطِنُ الْقَدَمَیْنِ (الخ) کنز العمال نے اس کو مسح خفین کی فصل میں ذکر کیا ہے اسی طرح دوسری روایت میں یہ ہے۔ عَنْ عَبْدِ الرَّزَّاقِ ابْنِ اَبِیْ شَیْبَةَ عَنْ اَبِیْ دَاؤدَ عَنِ الْحَسَنِ الْبَصَرِیِّ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنِ الْمَسْحِ عَلَی الْخُفَّیْنِ اَفَضْلُ اَوْ غَسْلُ الْقَدَمَیْنِ فَقَالَ الْغَسْلُ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ وَالْمَسْحُ فِیْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ط اسی طرح شیعوں کی ثبوت مسح میں پیش کردہ یہ روایت عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَلْوُضُوْءُ غَسْلَتَانِ وَمَسْحَتَانِ ط اوّلاً تو یہ روایت بناوٹی ہے جیسا کہ پہلے ثابت ہو گیا۔ اور شیعوں نے یہ اس لیے بنائی تاکہ کہیں مسح رِجلین ثابت ہو جائے مگر محققین کا خدا بھلا کرے۔ کہ انھوں نے یہاں بھی شیعوں کی ناک رگڑ دی۔ اور لغت کے دلائل قاہرہ وادب کے براہین باہرہ و دیگر احادیثِ صحیحہ کی نصوصِ صحیحہ سے ثابت کر دیا۔ کہ مسح کے ایک معنی یہ بھی ہیں۔ کہ دھو کر پوچھنا چنانچہ لغات منجد عربی صفحہ ص۱۱۶ پر ہے۔ مَسَحَ مَسْحًا الشَّیْئَ اَزَالَ الْاَثَرَ عَنْهُ یعنی پانی وغیرہ کا اثر ختم کرنا، لغات مجمع البحار صفحہ ص۲۹۶ جلد سوم میں ہے : وَالْمَسْحُ یَکُوْنُ مَسْحًا بِالْیَدِ وَغَسْلًا یعنی مسح کا معنی ہاتھ سے پوچھنا بھی ہے۔ اور دھونا بھی شامل کرتا ہے۔

مَسَحْتُ دُمُوْعِیْ یَوْمَ بَطْحَاءِ سَرْمَلٍ   مِنْ عَزَارِیْ فَاحْمَرَّتْ اَنَامِلُ

یعنی سرمل کے میدانِ جنگ میں میں نے اپنے رخساروں کا مسح کیا۔ اور زخمی رخساروں سے آنسو پونچھے۔ تو پورے سرخ ہو گئے۔ طحاوی کی حدیث پہلے بیان کر دی۔ کہ حضرت علی نے اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کیا اور سر و پیروں کا مسح کیا یہاں ظاہری لحاظ سے پونچھنے کا معنی ہی درست ہوتا ہے۔ کنز العمال جلد سوم صفحہ ۲۰۹ پر حدیث ہے۔ عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِیْمِ بْنِ زَیْدِ الْاَنْصَارِیْ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ تَوَضَّاَ وَمَسَحَ بِالْمَاءِ عَلٰی لِحْیَتِهٖ وَرِجْلَیْهِ ط یعنی نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہٖ وسلم نے اپنی داڑھی مبارک اور پیروں کا مسح کیا۔ لازمًا یہاں پونچھنا ہی مراد ہے ورنہ چہرے کے مسح کا کوئی قائل نہیں اسی طرح داڑھی کا مسح بھی کسی کے نزدیک فرض نہیں اسی طرح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول کہ اَلْوُضُوْءُ غَسْلَتَانِ وَمَسْحَتَانِ ط کا مطلب بھی یہ ہی ہے۔ کہ وضو میں دو عضو صرف دھونے فرض ہیں۔ مگر دو عضو دھونے اور ملتے پونچھنے ضروری ہیں یہ گفتگو تب ہے جب اس روایت کو فرضًا صحیح تسلیم کیا جائے۔ دلیل عنا: زید نے مسند احمد سے ایک حدیث نقل کر کے مسحِ رجلین کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ زید کی خیانت دیکھئے۔ کہ اوّلًا تو زید نے مسند احمد کی روایت کے الفاظ کنز العمال کی طرف منسوب کر دیئے حالانکہ یہ روایت کنز العمال میں نہیں بلکہ مسند احمد میں ہے۔ دوم حدیث پاک کے الفاظ متنازعہ اس طرح ہیں۔ وَمَسَحَ بِرَاْسِهٖ وَطَهَّرَ قَدَمَیْهِ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سر کا مسح کیا۔ اور دونوں قدموں کو پاک کیا۔ مگر زید لکھتا ہے۔ کہ وَمَسَحَ بِرَاْسِهٖ وَظَهْرَ قَدَمَیْهِ اب یہ ترجمہ ہوا۔ کہ اپنے سر کا مسح کیا۔ اور پیروں کی پیٹھ پر مسح کیا۔ کتنی بد دیانتی ہے۔ کہ ایک نقطہ کا ٹکر کیا سے کیا مطلب بن گیا۔ یہاں دو سوال وارد ہو سکتے ہیں۔ عا یہ کہ ہو سکتا ہے: ظَهْرَ قَدَمَیْهِ ہی درست ہو۔ جس روایت کو آپ نے طَهَّرَ دیکھا ہے۔ وہاں کاتب کی غلطی سے ایک نقطہ رہ گیا ہو۔ جواب حدیث پاک کی آخری عبارت سے ثابت ہے کہ لفظ طَهَّرَ ہی درست ہے بالنقطہ بغیر نقطہ ظَهْرَ ظ سے غلط ہے۔ حدیث پاک کے آخری لفظ اس طرح ہیں وَاِنْ مَسَحَ بِرَاْسِهٖ کَانَ کَذٰلِكَ وَاِذَا طَهَّرَ قَدَمَیْهِ کَانَ کَذٰلِكَ ترجمہ اگر اپنے سر کا مسح کیا۔ تو بھی اتنا ہی فائدہ اور جب اپنے قدموں کو پاک کیا۔ تو بھی اتنا ہی فائدہ۔ یہاں اِذَا طَهَّرَ ہے۔ لفظ اِذَا فعل کا متقاضی ہے۔ طَهَّرَ فعل ہے لیکن ظَهْرَ اسم جامد ہے اور اسم جامد سے پہلے اذا نہیں آ سکتا۔ تو اس جگہ تو حدیث میں طَهَّرَ متعین ہو گیا۔ یہاں تو لفظ ظَهْرَ ہرگز نہیں آ سکتا۔ اور جب یہاں فعل مشتق لازم۔ تو وجوب مطابقت کے لیے وہاں بھی طَهَّرَ ہی لازم ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کہ وہاں لفظ جامد ہو۔ اور یہاں فعل مشتق۔ ورنہ الفاظِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہٖ وسلم کی فصاحت و بلاغت پر زد پڑنے کے

علاوہ خبر اور حکم میں بھی بہت گڑبڑ پیدا ہوگی دوسرا سوال یہ ہوسکتا ہے۔ کہ اس روایت میں تمام اعضاء کے فعل کو واضح فرما دیا۔ کہ فرمایا چہرے کو دھوئے۔ تو چہرے کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ پھر ہاتھوں کے دھونے سے پھر کلائیوں کے دھونے سے پھر سر کے مسح سے۔ مگر جب پیروں کے ذکر کا بیان فرمایا۔ تو وہاں اجمال کیا۔ کہ جب قدموں کو پاک کرے۔ یہاں وضاحت نہ کی نہ دھونے کا ذکر ہے نہ مسح کا۔ اس کی وجہ کیا؟ جواب اس لیئے کہ تمام اعضاء وضو کے پاک کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے مگر قدموں کے پاک کرنے کے دو طریقے ہیں:- (۱) ننگے پیر ہوں تو دھوئے۔ اگر موزے چمڑے کے پہنے ہوں تو مسح کرے۔ اسی وجہ سے ایک جامعہ لفظ طہر ارشاد فرمایا۔ جو دونوں کو شامل ہے۔ اور یہ روایت جس کو زید نے اپنے مطلب کے لیئے پیش کی تھی۔ درحقیقت زید اور تمام شیعوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ شیعہ فرقہ چمڑے کے موزوں پر مسح کو ناجائز کہتے ہیں جیسا کہ فروع کافی اول صفحہ ص۱۳ پر لکھا ہے مگر یہ روایت اشارۃً و دلالۃً مسح خفین کو جائز فرما رہی ہے۔ اور مسند امام احمد بن حنبل کی اس روایت کے پورے الفاظ مع سند اس طرح ہیں۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثنا سَعِیْدٌ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ یَسَارٍ عَنْ حُمْرَانَ بْنِ اَبَانَ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّهٗ دَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ وَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهٗ ثَلٰثًا وَذِرَاعَیْهِ ثَلٰثًا وَمَسَحَ بِرَأْسِهٖ وَظَهْرَ قَدَمَیْهِ ثُمَّ ضَحِكَ فَقَالَ لِاَصْحَابِهٖ اَلَا تَسْاَلُوْنِیْ عَمَّا اَضْحَكَنِیْ فَقَالُوْا مِمَّ ضَحِكْتَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ دَعَا بِمَاءٍ قَرِیْبًا مِّنْ هٰذِهِ الْبُقْعَةِ فَتَوَضَّأَ كَمَا تَوَضَّأْتُ ثُمَّ ضَحِكَ فَقَالَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا دَعَا بِوَضُوْءٍ فَغَسَلَ وَجْهَهٗ حَطَّ اللّٰهُ عَنْهُ كُلَّ خَطِیْئَةٍ اَصَابَهَا بِوَجْهِهٖ فَاِذَا غَسَلَ ذِرَاعَیْهِ كَانَ كَذٰلِكَ وَاِنْ مَسَحَ بِرَأْسِهٖ كَانَ كَذٰلِكَ وَاِذَا طَهَّرَ قَدَمَیْهِ كَانَ كَذٰلِكَ طہ اس حدیث پاک کا پہلا جملہ فعل عثمانی سے عملی دعوے ہے۔ اور دوسرا جملہ بطور دلیل ہے۔ اصول کے علم قواعد کے مطابق دعوے اور دلیل ہر طریقہ سے مطابق ہونا چاہیئے۔ اسی لیئے لفظی مطابقت کو قائم رکھنے کے لیئے وہاں طَهَّرَ قَدَمَیْهِ بجائے دعوے اور دلیل میں تعارض ہوگا۔ جو شرعاً و قانوناً منع ہے۔ دوسرا فائدہ لفظ طہر سے یہ حاصل ہوا۔ کہ جس طرح ننگے پیر وضو میں دھونے سے سارے پیروں کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ اسی طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے سے سب گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور بقول امام شافعی موزوں کا مسح بستر حدیث نہیں۔ بلکہ بقول امام اعظم رافع حدث مثل غسل ہے دلیل ع۱۱۔ اس دلیل میں بھی زید نے وہی حرکت کی ہے جو پہلے کرتا آرہا ہے یعنی امام رازی کے متعلق یہ تاثر دے رہا ہے۔ کہ معاذ اللہ آپ بھی مسح رجلین کے قائل ہیں اور یہاں بھی تفسیر کبیر کا ایک رخ بتایا جس کو امام رازی مخالف اقوال کے ذمرے میں پیش کر رہے ہیں اور یہ بیان کر رہے ہیں کہ مخالف یہ کہتا ہے چنانچہ تفسیر کبیر جلد سوم فخر الدین رازی صفحہ ص۳۰۲ مطبوعہ مصر کل مخالفین کی عبارت اس طرح منقول ہے

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ وَاَنَسِ بْنِ مَالِكٍ وَعِكْرِمَةَ وَالشَّعْبِيِّ وَاَبِيْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ اَنَّ الْوَاجِبَ فِيْهِمَا الْمَسْحُ وَهُوَ مَذْهَبُ الْاِمَامِيَّةِ الشِّيْعَةِ یعنی شیعوں کا مذہب ہے۔ کہ حضرت ابن عباس عکرمہ شعبی ابوجعفر بن امام باقر وغیرہ سے یہ روایت ہے۔ کہ وضو میں پیر ننگے پر مسح واجب ہے۔ اور اپنے مسلک کے لیے یہ خود ساختہ روایت پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ یہ روایت بجز فروع کافی کے اور کسی حدیث کی کتاب میں نہیں۔ فروع کافی جلد اول صفحہ ۱۲ پر بعینہٖ یہ روایت مرقوم ہے۔ امام رازی نے وہیں سے نقل کی ہوگی۔ اس کے بعد شیعہ حضرات کی ایک نحوی دلیل پیش کرتے ہیں۔ اسی دلیل نحویہ کا ذکر زید نے سوال میں کیا۔ حالانکہ پوری عبارت اس کی نقل نہ کی۔ تاکہ بددیانتی کا راز نہ کھل جائے۔ چنانچہ امام رازی لکھتے ہیں:۔ قُلْنَا هٰذَا بَاطِلٌ مِّنْ وُجُوْهٍ ثُمَّ قَالَتْ اَنَّ قِرَاءَةَ وَاَرْجُلَكُمْ بِنَصْبٍ لَامٍ تُوْجِبُ الْمَسْحَ اَيْضًا لِاَنَّهٗ مَعْطُوْفٌ عَلٰى مَحَلِّ رُءُوْسِكُمْ وَهُوَ النَّصْبُ وَكَانَ اِعْمَالُ الْعَامِلِ الْاَقْرَبِ اَوْلٰى؂ یہ زید کی پیش کردہ عبارت ہے۔ اس کے ساتھ ہی امام رازی نے فرمایا فَهٰذَا وَجْهُ الْاِسْتِدْلَالِ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ عَلٰى وُجُوْبِ الْمَسْحِ؂ یعنی جو کچھ یہ روایتیں اور اس آیتِ وضو سے متعلق نحو کے قاعدے ہیں یہ سب اُن شیعوں کے استدلال ہیں۔ اور اُن کے بنائے ہوئے ہیں۔ جو مسحِ رجلین کی فرضیت کے قائل ہیں۔ (اگرچہ یہ سب نحوی قاعدے بے ہودہ اور اصول نحو کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا) ورنہ حقیقت امام رازی کے نزدیک بھی اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ آگے امام فخر الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنا مذہبِ حق بیان فرماتے ہوئے دلائلِ نقلیہ وعقلیہ غسلِ رجلین کے حق میں پیش کرتے۔ پس ارشاد ہے:۔ وَقَالَ جُمْهُوْرُ الْفُقَهَاءِ وَالْمُفَسِّرِيْنَ فَرْضُهُمَا الْغَسْلُ۔ وَاِنَّ الْاَخْبَارَ الْكَثِيْرَةَ وَرَدَتْ بِاِيْجَابِ الْغَسْلِ؂ یعنی مسح کے قائل تو صرف چند رافضی شیعہ ہی ہیں مگر پیر دھونا تمام مسلمانوں اور فقہائے اسلام اور قرآن کریم کے مفسرین اور علمائے کرام کا مذہب ہے۔ اور شیعوں نے تو صرف ایک دو خود ساختہ روایتیں فروع کافی وغیرہ سے پیش کر دیں مگر کثیر احادیث عمل صحابہ واہلِ بیت اور قول نبی کریم دھونے کی فرضیت پر ہی وارد ہے۔ تفسیر کبیر جلد سوم نے صفحہ ۳۷۱ پر شیعوں کی ایک لغوی دلیل سے مختصر جواب دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔ وَالْغَسْلُ مُشْتَمِلٌ عَلَى الْمَسْحِ وَلَا يَنْعَكِسُ؂ یعنی باعتبار لغت کے مسح دونوں پر شامل ہے۔ نہ کہ اس کا الٹ۔ لہٰذا جن روایتوں میں شیعوں نے مسحِ رجلین ثابت کیا ہے اگرچہ بناوٹی ہوں مگر غسل اس کو شامل ہو جائے گا لیکن جن روایتوں میں غسلِ رجلین کا ذکر ہے۔ وہاں کیا کرو گے اس لیے کہ غسل مسح پر شامل نہیں ہو سکتا۔ کہ لغوی طور پر مسح بول کر غسل مراد ہو سکتا ہے لیکن غسل بول کر مسح مراد نہیں ہو سکتا۔ ہم اہلسنت تو ہر دو روایات کو بذریعہ لغت مطابقت کر لیں گے مگر تم کس طرح مطابقت کرو گے۔ سبحان اللہ! امام رازی کیسا بہترین جواب دیتے ہیں۔ آگے چل کر عقلی دلائل پیش کرکے مذہب شیعہ کا ردِّ بلیغ فرماتے ہیں

چنانچہ ارشاد ہے:۔ مَذْهَبُ جُمْهُوْرِ الْفُقَهَاءِ اِنَّ الْكَعْبَيْنِ عِبَارَةٌ عَنِ الْعَظْمَيْنِ النَّاتِئَيْنِ مِنْ جَانِبَيِ السَّاقِ ط (ترجمہ) :۔ یہ کہ تمام جمہور فقہاءِ کرام کا مذہب ہے۔ کہ بے شک آیت مذکورہ میں لفظ کعبین نام ہے اُن دو ہڈیوں کا جو پنڈلی کی دونوں جانب اُبھری ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ شیعہ لوگ اپنے مذہب کو بچانے کے لیئے ہر اُس حقیقت کا ایک دم بلا سوچے سمجھے انکار کر دیتے ہیں۔ جو اُن کے مذہب کا تیا پانچا کرتی ہو۔ جیسا کہ مناظرین سے پوشیدہ نہیں۔ کہیں لغت کا انکار کیا۔ تو کہیں علمِ اصول سے منہ موڑا۔ کہیں نحوی قواعد کلیہ کو جھٹلا دیا۔ تو کہیں علمِ صرف کے منکر ہوئے۔ کہیں قرآن سے بھاگے۔ تو کہیں حدیث کو پس پشت ڈالا۔ کہیں جہالت کو اپنایا۔ کہیں علم سے کورے ہوئے۔ کہیں نصوص باطنیہ سے روگرداں ہوئے۔ تو کہیں حقیقتِ ظاہریہ کے صاف انکاری ہو گئے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے ؟ صرف اس لیئے کہ کہیں اپنے غلط عقیدے بچے رہیں۔ اسی طرح یہاں وضو کے مسئلہ میں جب اِلَى الْكَعْبَيْنِ ط کے لفظ سے اُن کے کمزور مذہب پر اچھی خاصی ضرب پڑی ۔ تو عَلَى الْاِعْلَانِ ط ٹخنوں کا ہی انکار کر دیا۔ اور کہنے لگے۔ کہ ہر پیر میں ایک ٹخنہ ہوتا ہے اور ٹخنہ پنڈلی کے ساتھ ہوتا ہی نہیں بلکہ پشتِ قدم کی ہڈی کعب ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ ٹخنہ اُن دو ابھری ہوئی ہڈیوں کو کہتے ہیں۔ جو پنڈلی کے آخر میں قدم کے جوڑ کے پاس دائیں بائیں ہوتا ہے اس لیئے ہر قدم میں دو ٹخنے ہوئے۔ اُن ہی دو ابھری ہڈیوں کی وجہ سے ان کو کعب کہا جاتا ہے۔ مگر شیعوں کو ہم کیا کہیں۔ کہ اتنی واضح حقیقت کا بھی انکار کر دیا۔ شکر کرو۔ کہ انہوں نے پوری ٹانگ کا ہی انکار نہ کر دیا۔ اسی چیز کا عقلی جواب دیتے ہوئے امام رازی نے فرمایا:۔ لَوْ كَانَ الْكَعْبُ مَا ذَكَرَهُ الْاِمَامِيَّةُ لَكَانَ الْحَاصِلُ فِي كُلِّ رِجْلٍ كَعْبًا وَاحِدًا فَكَانَ يَنْبَغِي اَنْ يُّقَالَ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكِعَابِ كَمَا اَنَّهُ لَمَّا كَانَ الْحَاصِلُ فِي كُلِّ يَدٍ مِرْفَقًا وَاحِدًا لَاجَرَمَ قَالَ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (ترجمہ) :۔ اگر شیعوں کا یہ قول درست ہوتا کہ ٹخنہ پاؤں کی پشت کو کہتے ہیں۔ تو لازم آتا۔ کہ ہر پیر میں ہاتھ کی ایک کہنی کی طرح ایک ٹخنہ ہوتا۔ تو جس طرح کہ اللہ تعالٰی نے کہنیوں کے لیئے جمع کا لفظ ارشاد فرمایا۔ اِلَى الْمَرَافِقِ اسی طرح ٹخنوں کے لیئے جمع کا لفظ ارشاد ہوتا اِلَى الْكِعَابِ ط حالانکہ قرآن کریم میں اس طرح نہیں۔ بلکہ کہنیوں کی لیئے جمع اور ٹخنوں کے لیئے تثنیہ ارشاد ہوا۔ ثابت ہوا۔ کہ ہر قدم میں ٹخنے دو ہیں۔ اور وہ وہی دو ابھری ہوئی ہڈیاں ہیں۔ جو پنڈلی کے ساتھ ہیں۔ تو اگر وضو کا چوتھا فرض مسح قدمین ہوتا۔ تو اِن دونوں ہڈیوں تک ہاتھ کھینچ کر لانا پڑتا۔ حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ شیعوں کو اپنا مذہب بچانے کے لیئے ٹخنے کی حقیقت کا انکار کرنا پڑا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے۔ کہ اگر مسح رجلین فرض ہوتا۔ تو لفظِ اِلٰی بھی نہ آتا۔ کیونکہ مسح کی حد بندی نہیں ہوتی۔ اسی لیئے سر کے مسح میں کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ یہ تھا امام رازی کا عظیم جواب عقلیہ در ردِّ مذہب شیعہ ان تمام باتوں سے

آنکھیں بند کر کے زید نے ایک ٹکڑا عبارت لکھ کر کتنا چکر چلانے کی کوشش کی۔ حالانکہ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ﴿﴾ دلیل ۱۲:۔ زید شیعہ نے کبیری کا حوالہ بھی اپنے مسلک کے ثبوت میں پیش کیا حالانکہ صاحب کبیری کا بھی یہ عقیدہ نہیں۔ کہ مسح رجلین فرض ہو۔ بلکہ صاحب کبیری آیتِ وضو میں ترکیب نحوی کو صرف اس لیے رؤس کے عطف کی طرف پھیر رہے ہیں۔ تاکہ پیروں کو پانی کے صرف اس اسراف سے بچایا جائے اور دیگر مغسولہ اعضاء کے مقابلہ پیروں پر کم پانی خرچ کیا جائے۔ کہ اُن کے عقیدے میں ترتیب وضو بلا مقصد نہیں بلکہ سر کے بعد پیروں کا ذکر محض اس لیے ہے۔ کہ پیر مثل مسح کے دھوئے جائیں یہی منشا سلطانُ الصوفیاء حضرت شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے۔ یہ سب نحوی تانے بانے صرف اسی بات کو پالنے کے لیے ہیں۔ ان حضرات کا یہ عقیدہ کہ پیروں پر بمقابلہ دیگر مغسولہ کم پانی خرچ کیا جائے۔ اپنی جگہ پر صحیح ہے یا غلط اس سے بحث نہیں۔ البتہ ان کے نحوی قاعدے سب غلط ہیں۔ اور کلام اہلِ عرب اور قرآنی نحو کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ متبحر آئمہ نحات کے بھی خلاف۔ جیسا کہ ابھی بالتفصیل ثابت کیا جائے گا۔ اس کے باوجود شیعہ مسلک کی تائید کبیری سے ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ چنانچہ صاحب کبیری علامہ ابراہیم بن محمد حلبی یہ تمام نحوی قاعدے جو زید نے نقل کیے ہیں لکھ کر آگے ارشاد فرماتے ہیں: کبیری صفحہ ۱۸ پر ہے۔ فَکَانَتْ مَظِنَّۃَ الْاِسْرَافِ الْمَذْمُوْمِ الْمَنْھِیِّ عَنْہُ فَعُطِفَتْ عَلَی الْمَمْسُوْحِ لَا لِیُمْسَحَ ﴿﴾ اس طرح کی کج فہمیوں سے دین کی بنیادیں مظبوط نہیں ہوتیں۔ زید نے کبیری کے تمام نحوی قاعدے نقل کر دیئے مگر یہ عبارت پیش نہ کی۔ مذکورہ آیت مبارکہ میں صاحب کبیری اور شیخ الاکبر حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور دیگر حضرات ترکیب نحوی کرتے ہوئے مندرجہ ذیل دعاوی و دلائل پیش کرتے ہیں:۔ دعویٰ ۱ قَالَ مُحْیُ الدِّیْنِ اِبْنُ عَرَبِیٍّ فَاِنَّ ھٰذِہِ الْوَاوَ قَدْ یَکُوْنُ وَاوَ الْمَعِیَّۃِ تَنْصِبُ یعنی وَاَرْجُلَکُمْ کی واؤ بمعنیٰ مع ہے۔ اور یہ نصب دیتی ہے۔

دلیل:۔ تَقُوْلُ قَامَ زَیْدٌ وَعَمْرًا ﴿﴾ اس مثال میں واؤ بمعنیٰ ساتھ ہے۔ اسی طرح آیت میں بھی اور یہ مطلب ہے۔ کہ سر کے ساتھ پاؤں کا مسح کرو۔ (کبریت احمر صفحہ ۲۲) دعویٰ ۲ واؤ عطف کی ہے۔ یعنی اور اَرْجُلَکُمْ کو نصب (زبر ہے) اور یہ زبر محلی ہے۔ اور عطف رؤس پر ہی ہے دلیل۔ کبیری صفحہ ۱۷ پر ہے۔ لِامْتِنَاعِ الْعَطْفِ عَلَی الْمَنْصُوْبِ لِلْفَصْلِ بَیْنَ الْعَاطِفِ وَالْمَعْطُوْفِ بِجُمْلَۃٍ اَجْنَبِیَّۃٍ (الخ) یعنی منصوب عطف کے درمیان مفرد سے فاصلہ بھی جائز نہیں چہ جائیکہ اجنبی جملے سے پس ثابت ہوا کہ اَرْجُلَکُمْ کا عطف رؤس پر ہے۔ نہ کہ اَیْدِیَکُمْ پر ورنہ جملے سے فاصلہ لازم آئے گا۔۔ دعوے ۳ اَرْجُلِکُمْ کے لام کو زیر ہے۔ دلیل:۔ اعراب

پر عطف ہے۔ کیونکہ زیر صرف عطف کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ یہاں جر جوار جائز نہیں۔ اس لیے کہ عطف نسق ہے۔ اور عطف نسق میں جر جوار نہیں ہو سکتا۔ **دعوی ۴** :- وَاَرْجُلَکُمْ علیحدہ جملہ ہے۔ اور یہاں ایک اِمْسَحُوْا پوشیدہ ہے۔ **دلیل** :- کیونکہ وَاَرْجُلَکُمْ نہ فَاغْسِلُوْا اَیْدِیَکُمْ پر عطف ہو سکتا ہے۔ بوجہ فاصلہ اور نہ فَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ پر کیونکہ عطف میں معطوف علیہ اور معطوف کا حکم ایک جیسا ہوتا ہے۔ حالانکہ سر کا مسح پیروں کے مسح سے مختلف ہو گا۔ لہٰذا یہ علیحدہ جملہ ہے۔ **دعوی ۵** :- لفظ اَرْجُلُکُمْ کے لام پر پیش یعنی ضمہ ہے **دلیل** :- کیونکہ اس کے بعد لفظ مَغْسُوْلَۃٌ پوشیدہ ہے۔ اور اصل آیت اس طرح ہے فَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلُکُمْ مَغْسُوْلَۃٌ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ۵ پانچواں نحوی دعوی :- جس کو تفسیر روح المعانی جلد سوم صفحہ ۷۳ پارہ ۶ پر اور اربع تفاسیر جلد دوم صفحہ ۱۱۲ پر اس طرح نقل کیا ہے :- وَقُرِیَ بِالرَّفْعِ اَیْ وَاَرْجُلُکُمْ مَغْسُوْلَۃٌ (الخ) یہ تھے۔ اِن فقہاء کے نحویانہ پانچ دعوے۔ اس آیت کی ترکیب میں جن سے شیعوں کو غلط مذہب بنانے کا موقع مل گیا۔ مگر یہ نحوی ترکیبی قاعدے سب غلط ہیں۔ اور صاحب کبیری وغیرہ نے فحش غلطی کی ہے چنانچہ غلطیاں ملاحظہ ہوں۔ **جواب دعوی ۱** :- یہ قطعًا غلط ہے۔ کہ یہاں واو معیۃ کی ہے۔ **دلیل** :- کیونکہ معیۃ صرف دو قسم کی ہے :- ۱ معیۃ فی الزمان ۲ معیۃ فی المکان ۵ اور یہاں معیۃ زمانی ناممکن :- معیۃ مکانی کا کوئی قائل نہیں۔ هٰکَذَا فِیْ تَفْسِیْر مظہری علٰی صحیفۃ جلد سوم۔ **جواب دعوی ۲** :- یہ بالکل غلط ہے کہ اَرْجُلَکُمْ کا معطوف علیہ بِرُءُوْسِکُمْ ہے اور یہ کہ عطف میں جملے یا مفرد سے فاصلہ منع بلکہ فاصلہ جائز ہے **دلیل** :- چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے سورۂ توبہ۔ اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ اور ابن حسن ابی اسحٰق اور عیسٰی ابن عمرو وغیرہ قرّاء کی قرأت میں۔ وَرَسُوْلَہٗ بنصب اللام ہے۔ چنانچہ روح المعانی جلد پنجم پارہ ۱۰ صفحہ ۴۳ پر ہے۔ وَرَسُوْلَہٗ بِالنَّصْبِ وَهِیَ قِرَأَۃُ الْحَسَنِ وَابْنِ اَبِیْ اِسْحٰقَ وَعِیْسٰی ابْنِ عَمْرٍو۔ وَعَلَیْهَا فَالْعَطْفُ عَلٰی اِسْمِ اِنَّ وَهُوَ الظَّاهِرُ :- دیکھو اس آیت میں منصوب معطوفوں میں (مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ) مفردوں کا فاصلہ ہو گیا۔ ایسی بے شمار آیات ہیں نہ معلوم صاحب کبیری نے قرآن کے خلاف یہ قاعدہ کہاں سے بنا لیا۔ کتاب النحو الانصاف جلد دوم صفحہ ۲۴۳ پر مغنی اللبیب سے ابی دواد ایادی کا شعر منقول ہے :-

اَکُلَّ امْرِیٍٔ تَحْسَبِیْنَ اِمْرَءً
وَنَارٍ تَوَقَّدُ بِاللَّیْلِ نَارًا

ترجمہ :- کیا ہر مرد جس کو تم گمان کرتے ہو۔ مرد ہی ہو۔ اور ہر آگ جو رات کو بھڑکائی گئی۔ آگ ہی ہو۔ اس شعر میں دو عطف ہیں۔ ایک مجرور اور ایک منصوب۔ اور دونوں میں جملہ اجنبیہ کا فاصلہ ہے ثابت ہوا۔ کہ معطوف علیہ معطوف میں فاصلہ جائز ہے۔ اسی لیئے آیت وضو میں اَرْجُلَکُمْ کا لفظ اَیْدِیَکُمْ پر عطف ہے۔ فاصلہ بقاعدۂ نحویہ مضر نہیں۔ اور صاحب کبیری کا اپنی پیش کردہ مثال ضَرَبْتُ زَیْدًا وَمَرَرْتُ بِعَمْرٍو وَبَکْرًا ط پر قیاس ناجائز ہے۔ کیونکہ یہاں بکر کا عمرو پر عطف کرنے کے لیئے کوئی مانع نہیں۔ بخلاف آیت کے کہ وہاں اِلَی الْکَعْبَیْنِ مانع ہے۔ کہ ممسوح کے لیئے غایت منع ہے۔ اور آیت میں اَرْجُلَکُمْ کو اَیْدِیَکُمْ پر عطف میں قرینہ موجود ہے مگر مثال منقولہ میں نہیں۔ لہٰذا بہر دو وجہ قیاس غلط۔ نیز تفسیر مظہری جلد سوم صفحہ [illegible] پر ہے۔ کہ معرب میں عطف محلی جائز نہیں۔ بلکہ اصل اس میں عطف اور اعراب لفظی معتبر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :-

اِذِ الْاَصْلُ فِی الْمُعْرَبِ الْعَطْفُ عَلَی اللَّفْظِ دُوْنَ الْمَحَلِّ ۔ **جواب دعویٰ ۲** :- اس آیت میں جرِ جوار بھی ہم کو مسلم نہیں کیونکہ یہ غیر صحیح قاعدہ ہے۔ اکثر نحاۃ عطفِ نسق میں فاصلہ جائز مانتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر مظہری جلد سوم صفحہ [illegible] پر ہے۔ وَالْحَقُّ اَنَّہٗ یَجُوْزُ بِتَوَسُّطِ الْعَاطِفِ اسی طرح اَلْاِنْصَاف جلد ۲ صفحہ [illegible] پر ہے۔

جواب دعویٰ ۳ :- یہ بھی نحویوں کے نزدیک صحیح نہیں۔ کیونکہ لفظ اِمْسَحُوْا فعل خاص ہے اور فعل خاص میں تعیین شرط ہے۔ اور تعیین بغیر قرینہ ناممکن۔ لہٰذا چونکہ یہاں کوئی قرینہ نہیں۔ اس لیئے مذکورہ دعویٰ غلط ہے۔ چنانچہ تفسیر مظہری میں ہے۔ فَاِنَّ تَقْدِیْرَ الْفِعْلِ الْخَاصِّ لَا یَجُوْزُ مِنْ غَیْرِ قَرِیْنَۃٍ تَدُلُّ عَلٰی تَعْیِیْنِہٖ ط جواب دعویٰ ۴ :- یہ قرأت شاذ ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد سوم میں اسی طرح ہے اور شاذ غیر معتبر ہوتی ہے۔ اس پر حکم جاری نہیں ہوتا۔ معترض کی دلیل ۱۳ بھی غلط ہے۔ کیونکہ پیش کردہ حوالہ اصل کتاب میں موجود نہیں۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

(خنزیر کے بالوں سے بنے ہوئے برش کا حکم)

سوال نمبر ۳ کیا فرماتے ہیں۔ علماء دین اس مسئلہ میں کہ ہم نے انگلستان کے ایک شہر ہیلی فکس میں ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ مسجد کی اندرونی دیواروں پر روغن کیا گیا ہے۔ اور بہت سے قیمتی و شاندار رنگ لگوائے ہیں۔ جس وقت رنگ ہو رہا تھا۔ تو کسی مسلمان نے رنگ ساز کے برش کو دیکھا۔ تو اس پر لکھا تھا۔ خالص خنزیر کے بالوں کا بنا ہوا برش۔ یہ دیکھ کر ہم سب مسلمانوں کو فکر ہوئی ہم نے بازاروں، فیکٹریوں سے مزید تحقیق اور پوچھ گچھ کی۔ تو ہم کو پتہ چلا۔ کہ سارے انگلستان میں خنزیر کے

بالوں کے برش ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اب ہم میں سے بعض یہ کہتے ہیں سب روغن کھرچ دو۔ اور رنگ کو مکمل رگڑ کر پاک کرو۔ پھر سب نے متفق ہو کر یہ ارادہ کیا۔ کہ آپ سے فتویٰ منگایا جائے۔ لہٰذا آپ کو ہم گزارش کرتے ہیں۔ کہ ہم کو شرعی فتوٰے دے کر آگاہ فرماویں کہ ہم کیا کریں؛ بینوا وتوجروا۔

سائل۔ :۔ چوہدری محمد طارق۔ سکونت حال مقام ھیلی فکس۔ انگلستان؛

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق صورتِ مسئولہ میں۔ دیواریں کھرچنے، رنگ و روغن اکھیڑنے کی کوئی ضرورت نہیں صرف دیواروں کو اچھی طرح دھوڈالنا کافی ہے۔ فقط اسی کے دھونے سے پاکیزگی حاصل ہو جائے گی۔ اس لیئے کہ قرآن کریم اور حدیث پاک و فقہاء اسلامی کے واضح اقوال سے صرف خنزیر کے اجزاء لحمیہ تو بالاتفاق حرام ہیں۔ مگر خنزیر کے بالوں میں علماء کا اختلاف ہے۔ جس کی وجہ سے خنزیر کے بالوں کی حرمت ظنی ہو گئی۔ بعض علماء نے فرمایا۔ کہ دیگر اعضاء کی مثل خنزیر کے بال بھی حرام قطعی ہیں۔ اُن کی دلیل یہ آیت ہے :۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ (ترجمہ) :۔ حرام کیا گیا۔ تم پر مردار اور خون۔ اور خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔ اس آیت کریمہ میں۔ صراحتًا خنزیر کا گوشت حرام ہوا۔ لیکن بالتبع تمام اعضاء کی حرمت ثابت ہے۔ جیسا کہ مفسرین فرماتے ہیں۔ اور اعضاء میں بال، دانت ناخن سب ہی داخل ہیں۔ دیگر جمہور علماء فرماتے ہیں کہ بال نجس العین نہیں اور یہ آیت اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی۔ کہ سوٗر کے بال بھی نجس ہوں کیونکہ یہاں صرف حرمت کا ذکر ہے۔ نہ کہ نجاست کا۔ : نجاست اور حرمت میں بہت فرق ہے۔ بعض اشیاء حرمت کے باوجود پاک ہوتی ہے جیسے کہ مٹی کھانا حرام ہے۔ حالانکہ پاک ہے۔ چنانچہ فتاوٰے شامی میں ہے :۔ لِأَنَّهُ لَا يَلْزَمُ مِنَ الطَّهَارَةِ الْحِلُّ كَمَا فِي التُّرَابِ۔ فَإِنَّ التُّرَابَ طَاهِرٌ وَلَا يَحِلُّ أَكْلُهُ ترجمہ :۔ اس لیئے کہ پاک ہونے سے حلال ہونا لازم نہیں۔ جیسے مٹی میں۔ پس بے شک مٹی پاک ہے۔ لیکن اس کا کھانا حلال نہیں۔ اور بھی بہت سی مثالیں کتب فقہ میں مرقوم ہیں۔ یہ بات متفقًا مسلم ہے۔ کہ خنزیر کے گوشت کی طرح اس کے دیگر اجزاء ہڈی، دانت، ناخن، چربی وغیرہ حرام قطعی ہیں۔ مگر یہ حرمت شباہت اور اتباع کی وجہ سے ہے۔ کہ ہڈی اور چربی گوشت کے تابع اور ناخن دانت ہڈی کے مشابہ مگر بال نہ کسی کے تابع اور نہ مشابہ۔ اسی لیئے بالوں کا حکم بھی بالکل جداگانہ ہوگا۔ پس ثابت ہوا

کہ مخالفِ کا اس آیت سے بالوں کی نجاست پر استدلال غلط ہے۔ اور اس کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں۔ جس سے بالوں کو نجس کہا جا سکے۔ بلکہ تمام فقہاء کی کتب سے یہی ثابت ہو رہا ہے۔ کہ خنزیر کے بال نجس العین نہ ہوں۔ چنانچہ ردّ المحتار جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۹۰ پر ہے۔ "وَعِنْدَ مُحَمَّدٍ لَا یَنْجُسُهُ اَفَادَهٗ فِی الْبَحْرِ وَذَکَرَ فِی الذَّخِیْرَۃِ اَنَّهٗ عِنْدَ مُحَمَّدٍ طَاهِرٌ لِضَرُوْرَۃِ اِسْتِعْمَالِهٖ" (ترجمہ):- حضرت امام محمد کے نزدیک خنزیر کے بال پلید نہیں۔ بحر الرائق اور فتاوٰی کبیری شرح منیہ صفحہ نمبر ۱۶۸ پر ہے۔ "اِلَّا شَعْرُ الْخِنْزِیْرِ لِمَا اُبِیْحَ الْاِنْتِفَاعُ بِهَا لِلْخَرَزِ ضَرُوْرَۃً قَالَ مُحَمَّدٌ رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْهِ اَنَّهٗ لَوْ وَقَعَ فِی الْمَاءِ لَا یُنَجِّسُهٗ" (ترجمہ) - بجز خنزیر کے بالوں کے خنزیر کی کوئی شئ پاک نہیں خنزیر کے بال بھی اس لیے پاک ہیں۔ کہ اُن سے موزہ، دستانہ وغیرہ بنا کر نفع لینا ہے۔ امام محمدؒ نے فرمایا۔ کہ اگر سؤر کا بال پانی میں گر جائے تو پانی کو ناپاک نہ کرے گا۔ تفسیراتِ احمدیہ جلد اوّل صفحہ نمبر ۳ پر ہے:- "وَلَا یَجُوْزُ الْاِنْتِفَاعُ سِوٰی شَعْرِهٖ لِلْخَرَزِ لِلضَّرُوْرَۃِ" (ترجمہ) خنزیر کی کسی چیز سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔ سوائے بالوں کے۔ کہ دستانے، موزے بنانے کی ضرورت کی بنا پر اس کے بال پاک ہیں۔ اسی طرح مشہور تحقیقی کتاب حیات الحیوان جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۶۳ پر ہے۔ "اِلَّا الشَّعْرُ فَاِنَّهٗ یَجُوْزُ الْخَرْزُ بِهٖ" (ترجمہ) سؤر کے صرف بال پاک ہیں۔ کیونکہ اُن سے خرازت جائز ہے۔ طہارتِ بال سے متعلق حیات الحیوان نے اسی صفحہ ۲۶۳ پر ایک روایت بھی نقل فرمائی۔ چنانچہ ارشاد ہے:- "رُوِیَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَرَازَۃِ بِشَعْرِهٖ فَقَالَ لَا بَاْسَ بِذٰلِکَ رَوَاهُ ابْنُ خُوَیْزٍ" (ترجمہ) مروی ہے۔ کہ ایک آدمی نے آقائے کائنات علیہ التحیۃ والثناء سے پوچھا۔ کہ خنزیر کے بالوں سے جراب وغیرہ بنانی جائز ہے یا نہیں تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ مضائقہ نہیں۔ اس کے راوی ابن خویز ہیں۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا۔ کہ خنزیر کے بال شرعًا پاک اور قابلِ استعمال ہیں۔ حضرت امام مالک جو اصولِ شریعت کے مجتہدِ دوم ہیں۔ اُن کے نزدیک بھی خنزیر کے بال پاک ہیں۔ چنانچہ مالکی فقہ بلغۃ السالک جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۹ پر ہے:- "وَمِنَ الطَّاهِرِ الشَّعْرُ وَلَوْ مِنْ خِنْزِیْرٍ" اور پاک چیزوں میں سے بال بھی ہیں۔ اگرچہ خنزیر کے ہوں۔ علامہ دمیری رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے ابن منذر کا اجماعی نجاست کا قول اسی بات سے رد کیا۔ کہ امام مالک تو نجاست کے قائل ہی نہیں۔ تو یہ مسلک اجماعی کیسے ہوا۔ چنانچہ حیات الحیوان جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۶۳ پر ہے:- "نَقَلَ ابْنُ الْمُنْذِرِ الْاِجْمَاعَ عَلٰی نَجَاسَتِهٖ وَفِیْ دَعْوَی الْاِجْمَاعِ نَظَرٌ لِاَنَّ مَالِکًا یُخَالِفُ فِیْهِ" (ترجمہ):- ابن منذر نے خنزیر کے بالوں کی پلیدی پر اجماعِ اُمت کو نقل کیا ہے حالانکہ ابن منذر کی یہ بات قطعًا غلط ہے۔ بالوں کی نجاست پر بالکل اجماع نہیں ہوا۔ اس لیے

کہ امام مالک۔ تو طہارت کے قائل ہیں۔ اکثر احناف بھی امام محمد کے مسلک پر فتوے دیتے ہیں۔ بحر الرائق جلد نمبر ۱ صفحہ نمبر ۱۱۳ پر ہے :۔ وَرُخِّصَ فِیْ شَعْرِہِ لِلْخَرَّازِیْنَ لِلضَّرُوْرَۃِ ط (ترجمہ) اور اجازت دی گئی ہے۔ خنزیر کے بالوں سے جراب و دستانہ بنانے کی بوجہ ضرورت کے۔ ثابت ہوا۔ کہ حنفی مسلک کے امام ثالث امام محمد کے نزدیک بوجہ ضرورت سؤر کے بالوں کو مطلق پاک مانا گیا ہے یہاں تک کہ اگر بال پانی وغیرہ میں گر جائیں۔ تو پانی ناپاک نہ ہوگا جیسا کہ اوپر کبیری کی روایت سے بیان ہوا۔ حیات الحیوان کی محولہ روایت سے بھی ثابت ہوا۔ کہ خزارت کے لیے خنزیر کے بال استعمال کرنا جائز۔ لفظِ خزارت کا لغوی معنے ہے۔ حرفت۔ چنانچہ المنجد عربی صفحہ نمبر ۱۷۰ پر ہے :۔ اَلْخِزَارَۃُ حِرْفَۃٌ : خزارت کا معنی ہے۔ حرفت اور لفظ حرفت عام پیشے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ لغاتِ کشوری صفحہ نمبر ۱۵۱ پر ہے :۔ حرفہ عربی و حِرْفَتْ عربی۔ پیشہ۔ کسب اور پیشہ اسی طرح اکثر کتب لغت میں مرقوم ہے :۔ اور یہ اس معنیٰ کے اعتبار سے عام ہے اباحت کو کہ اس سے جراب دستانے بنائے جائیں۔ یا اس خنزیر کے بال سے ضرورۃً برش بنائے جائیں۔ جب کتب فقہاء اور حدیث پاک سے۔ موزہ و دستانہ بنانا جائز ہوا۔ تو قیاساً خنزیر کے بال سے برش بنانا۔ اور استعمال کرنا بھی جائز ہوا۔ ہاں البتہ امام یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور چند متقدمین نے سؤر کے بالوں کو ناپاک فرمایا ہے۔ چنانچہ حاشیہ ابوداود شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۲۹ ۱۳ پر ہے :۔ اِخْتَلَفُوْا فِیْ جَوَازِ الْاِنْتِفَاعِ بِہٖ فَکَرِھَہٗ طَائِفَۃٌ ذٰلِکَ۔ وَمِمَّنْ مَنَعَہٗ اِبْنُ سِیْرِیْنَ وَالْحَکَمُ وَالشَّافِعِیُّ وَاَحْمَدُ وَاِسْحٰقُ وَرَخَّصَ فِیْہِ الْحَسَنُ وَالْاَوْزَاعِیُّ وَاَصْحَابُنَا۔ وَاَصْحَابُ الرَّاْیِ ط (ترجمہ) اور خنزیر کے بالوں سے نفع حاصل کرنے کے جواز میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ ایک گروہ نے ناپسند کیا۔ اس کو اور ان ہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ان بالوں کا استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ وہ ابن سیرین اور حکم اور شافعی اور احمد اور اسحٰق ہیں۔ لیکن امام حسن حنفی اور اوزاعی اور ہمارے بہت سے ساتھی فقہاء عظام اور بہت سے صاحب الرائے حضرت نے ان بالوں کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ امام یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اگرچہ حنفیوں کے امام ہیں۔ مگر اس مسلک میں ان کی بات پر فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اشیاء کی پاکی پلیدی میں امام اعظم کا قول معتبر ہے۔ اور معاشرے و میراث میں امام محمد کے مسلک پر فتویٰ ہے اور فیصلوں اور قضاء کی صورتوں میں امام یوسف صاحب کے قول پر فتویٰ خنزیر کے بالوں کی طہارت یا نجاست میں امام اعظم کا قول معتبر ہوگا مگر امام صاحب کی طرف سے ظاہراً خاموشی ہے۔ مگر باطناً امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ آپ کے نزدیک صرف خنزیر کی کھال و گوشت و چربی وغیرہ حرام و ناپاک ہیں۔ پس امام محمد علیہ الرحمۃ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۴۶ پر ہے :۔ قَدْ جَعَلَ الْعُلَمَاءُ الْفَتْوٰی عَلٰی قَوْلِ الْاِمَامِ الْاَعْظَمِ فِی الْعِبَادَاتِ مُطْلَقًا الخ) وَعَلٰی قَوْلِ مُحَمَّدٍ فِیْ جَمِیْعِ مَسَائِلِ ذَوِی الْاَرْحَامِ وَفِیْ قَضَاءِ الْاَشْبَاہِ وَالنَّظَائِرِ۔ اَلْفَتْوٰی عَلٰی قَوْلِ اَبِیْ یُوْسُفَ فِیْمَا یَتَعَلَّقُ بِالْقَضَاءِ ط (ترجمہ) :۔

علماءِ اسلام مطلقاً عبادات میں امام اعظم کے قول پر اشباہ والنظائر اور مسائل ذوی الارحام میں امام محمد اور مسائل قضا میں امام یوسف کے قول پر فتوی جاری کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ چونکہ قضاء سے متعلق نہیں۔ اس لیئے امام یوسف کے قول پر فتوے نہ ہوگا۔ پس ثابت ہوا۔ کہ خنزیر کے بال مفتابہ قول میں ناپاک نہیں۔ امام یوسف کے نزدیک خنزیر کے بال کی نجاست سے فقط خفیفہ کا ثبوت ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اختلاف سے نجاست خفیفہ ہی بنتی ہے۔ چنانچہ کبیری صفحہ ۱۶۹ پر ہے والخفیفۃ ھی التی وقع الاختلاف فیھا۔ اور نجاست خفیفہ وہ ہے۔ کہ جس کے نجس ہونے میں فقہاء کا اختلاف ہو جو لوگ خنزیر کے بالوں کو ناپاک کہتے ہیں۔ وہی اس کی بیع کو بھی بالکل ممنوع قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے حنفیوں کے نزدیک یہ بال ناپاک نہیں اس لیئے ان کی بیع بھی جائز ہے۔ امام نووی نے قاعدہ کلیہ مقرر فرمایا۔ کہ ہر وہ چیز جس کا کھانا حرام ہو۔ اور جس سے نفع لینا بھی حرام ہو۔ اس کا بیچنا ناجائز ہے۔ چنانچہ مسلم شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۲۳ پر ہے ان ما لا یحل اکلہ والانتفاع بہ لا یجوز بیعہ۔ (ترجمہ) وہی ہے۔ جو اوپر گزرا۔ اس قانون سے واضح ہوگیا۔ کہ جس کا نفع جائز۔ اس کی بیع بھی جائز لہٰذا خنزیر کے بالوں کا برش، خریدنا بیچنا جائز ہے۔ ہاں ایسا برش دانتوں پر پھیرنا قطعاً حرام ہے۔ کہ یہ کھانے کے مشابہ ہے۔ ان تمام دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ثابت ہوا۔ کہ خنزیر کے بالوں سے بنے ہوئے برش کے ذریعے روغن لگانا جائز ہے۔ اور روغن ناپاک نہ ہوگا۔ مگر چونکہ امام یوسف اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ اس لیئے حکم دیا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ فی السوال مسجد کی دیواریں کو صرف پاک پانی سے اچھی طرح دھو دیا جائے۔ اس لیئے کہ فقہاءِ کرام کے نزدیک پاک چیزیں اگر ناپاک تر چیز شامل ہو جائے اور پھر وہ پاک چیز خشک ہو جائے تو پانی سے دھونا پاک کرنے کے لیئے کافی۔ چنانچہ فتاوےٰ ردّ المحتار جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۰۵ پر ہے:۔ الکیمخت المدبوغ بدھن الخنزیر اذا غسل یطھر ولا یضر بقاء الاثرہ (ترجمہ):۔ وہ کچی کھال جس کو خنزیر کی چربی سے رنگا جائے۔ جب اس کو پانی سے دھو دیا۔ تو پاک ہوگیا۔ اب بقیہ چربی کا معمولی چکناہٹ کا اثر نقصان دہ نہ ہوگا۔ فرمان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطابق متفقاً سور کی چربی پلید ہے۔ اسی طرح مسلم شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۲۳ پر لکھا ہے جب اس نے نجاست غلیظہ سے رنگی ہوئی کھال پانی سے دھل کر پاک ہو جاتی ہے۔ تو خنزیر کے بالوں کا برش تو نجاست خفیفہ ہے۔ لہٰذا اس سے لگا ہوا رنگ بدرجہ اولیٰ پاک ہونا چاہیئے۔

خلاصہ یہ کہ سائل مذکورہ کو چاہیئے۔ کہ مسجد کی روغن شدہ دیواریں فقط پاک پانی سے دھو ڈالے۔ دیواریں شرعاً بالکل پاک ہو جائیں گی۔ واللہ ورسولہ اعلم۔

❊ ❊ ❊ ❊

آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے فضلات مبارکہ کے بارے میں شرعی حکم

سوال نمبر ۱۴ عالی خدمت جناب مفتی اعظم صاحب گجرات جناب صاحبزادہ اقتدار احمد خان صاحب مدظلہ آپ کی خدمت میں یہ استفتاء حاضر ہے ؛

کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ راقم نے دوران تقریر بروز جمعہ سیرتِ طیبہ بیان کرتے ہوئے یہ بیان کیا۔ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا پیشاب مبارک باندی پانی سمجھ کر پی لیا۔ بعد معلومات حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس باندی سے فرمایا۔ کہ تیرے بطن سے تمام پیدا شدگان سے خوشبو آتی رہے گی۔ اور امراض وغیرہ سے محفوظ رہے گی۔ ایک مودودی اور ذو نجدی اس حدیث کو حدیث نہیں مانتے۔ وہ لوگ یہاں علاقہ کے مشہور نجدی مودودی ہیں۔ وہ اس واقعہ کے تصحیح کے بارے میں ہر کتاب کے منکر ہیں۔ جناب کی اجازت سے یہاں گیارھویں شریف راقم نے جاری کر دیے ہیں۔ آذان سے قبل اور بعد صلوٰۃ وسلام شروع کر دیا ہے بعد جمعہ کے سلام بھی پڑھا جاتا ہے۔ تمام لوگ بہت مسرور ہیں۔ یہ ذو تین نجدی مودودی گیارھویں شریف، مزار اولیاء اللہ کی حاضری، صلوٰۃ وسلام وجہری ذکر سے بھی منع کرتے ہیں۔ مگر سب لوگ ان پر لعنتیں ڈالتے ہیں۔ براہِ مہربانی وعین بندہ نوازی صحیح حوالہ کتب واحادیث مبارکہ سے جواب تحریر فرما کر اجر دارین حاصل فرمائیں آپ کی مہر شدہ تحریر میرے لیئے تبرک اور میرے پاس ثبوت ہو گا ؛ مورخہ : ۲۱/۴/۷۳

سائل :۔ قدوری کا پیرزادہ مولوی عبد الجلیل نعیمی خطیب جامعہ مسجد حنفیہ خادم آباد تحصیل وضلع میرپور۔ (آزاد کشمیر) ؛

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق عند المحققین یہ امر متفقاً مسلم ہے۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہر چیز طیب و طاہر ہے۔ پاک وہ منزہ ہے۔ کسی مسلمان کا اس میں اختلاف نہیں یہ دعوئے عقلاً ہر طرح ثابت ہے اس لیے کہ نبی کریم ہر طرح کائنات سے بے مثل ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے عناصر اربعہ بھی دیگر مخلوق سے وراء ہیں۔ تمام انسانوں وغیرہ کے اربعہ عناصر، آگ، ہوا، مٹی اور پانی ہیں۔ لیکن میرے پیارے کریم ورحیم آقا کے چار عنصر طیبہ، طاہرہ، نور، ہوا، مٹی اور پانی ہیں۔ کیونکہ تمام حیوانات انسان وغیرہ کے اعضاء محض مٹی سے بنے مگر آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے اعضاء شریفہ جنت کی نعمتوں سے بنائے گئے۔ گویا جنت اور اس کی نعمتیں بنی میرے نبی کے نور سے اور میرے نبی کے اعضائے طیبہ بنے۔ جنت کی نعمتوں سے۔ چنانچہ

تفسیر روح البیان جلد دوم صـ۲۳۲ پر ہے :۔ قَالَ بَعْضُ الْحُکَمَاءِ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ رَاْسَہٗ مِنَ الْبَرَکَۃِ وَعَیْنَیْہِ مِنَ الْحَیَاءِ وَاُذُنَیْہِ مِنَ الْعِبْرَۃِ وَلِسَانَہٗ مِنَ الذِّکْرِ وَشَفَتَیْہِ مِنَ التَّسْبِیْحِ وَوَجْھَہٗ مِنَ الرِّضٰی وَصَدْرَہٗ مِنَ الْاِخْلَاصِ وَقَلْبَہٗ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَفُؤَادَہٗ مِنَ الشَّفْقَۃِ وَکَفَّیْہِ مِنَ السَّخَاوَۃِ وَشَعْرَہٗ مِنْ نَبَاتِ الْجَنَّۃِ وَرِیْقَہٗ مِنْ عَسَلِ الْجَنَّۃِ (الخ) وَقَالَ بَعْضُ وَبَوْلَہٗ مِنْ مَاءِ الْجَنَّۃِ ط (ترجمہ)۔ بعض حکماء نے فرمایا۔ کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جب اپنے حبیب محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا۔ تو آپ کا سر مبارک برکت سے بنایا۔ آپ کی آنکھیں حیا سے آپ کے کان پاک عبرۃ سے آپ کی زبان مبارک ذکر اللہ اور آپ کے ابرو پاک تسبیح سے اور آپ کی ہتھیلیاں سخاوت سے آپ کے بال مبارک جنت کی کلیوں اور شاخوں سے۔ اور آپ تھوک شریف جنت کے شہد سے۔ (الخ) بعض نے فرمایا۔ کہ آپ کے بول مبارک، جنت کے پانی سے سبحان اللہ کیا شان ہے۔ میرے آقا کی۔ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم علی النبی الامی وآلہٖ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم صَلٰوۃً وَّسَلَامًا عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ط شیخ ابن ابراہیم الجیلی اپنی تصنیف انسان کامل جلد دوم صفحہ ۴۷ میں فرماتے ہیں :۔ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الصُّوْرَۃَ الْمُحَمَّدِیَّۃَ مِنْ نُوْرِ اِسْمِہِ الْبَدِیْعِ الْقَادِرِ وَنَظَرَ اِلَیْہِ بِاِسْمِہِ الْقَاھِرِ ثُمَّ تَجَلّٰی عَلَیْھَا بِاِسْمِہِ اللَّطِیْفِ الْغَافِرِ (الخ) ترجمہ :۔ بے شک اللہ ذات کریم نے صورت محمدی کو اپنے نام پاک بدیع اور قادر سے پیدا کیا۔ اور کروڑہا سال ذاتِ کریم اسی صورت محمدی کو دیکھتا رہا اپنے اسم مبارک منان اور قاھر سے پھر تجلی فرمائی۔ اُس پر اپنے اسم پاک لطیف، غافر سے۔ اس دیکھنے اور تجلی کی حقیقت رب بہتر جانتا ہے۔ کیا ہے۔ صورت مسئولہ میں جس چیز کا سوال ہے اس کو موضوع بحث یا مناظرہ نہ بنایا جائے۔ نہ ہی اس بارے میں کسی مودودی نجدی وغیرہ سے جھگڑا کیا جائے۔ کیونکہ یہ لوگ جاہل اور گستاخ ہوتے ہیں۔ اپنی جہالت سے مزاق اور گستاخیاں کریں گے۔ حالانکہ یہ گستاخ لوگ اگر عقل سے بھی کام لیں۔ تب بھی اس حقیقت کے انکار کی مجال نہیں رہتی۔ حمقاء عقل سے کورے ہیں۔ اب یہ بات چونکہ بر سر عام آچکی ہے۔ اور آپ نے تحریراً سوال بھیج دیا ہے۔ لہٰذا اس کا جواب دینا اشد ضروری ہے۔ بحمدہٖ تعالےٰ اہل سنت کے ہر دعوے پر ہزارہا دلائل ہیں۔ ہم لوگ بغیر دلائل بات نہیں کرتے اگرچہ ہمارا ایمان دلائل پر موقوف نہیں۔ ہمارا قول برہانی۔ اور ہمارا ایمان عشقی ہے۔ ؎

عاشقاں راچہ کار با تحقیق
ہر کجا نام اوست قربانیم

اس مسئلہ پر بھی عقلاً ونقلاً بہت سے دلائل ہیں۔ پہلے دلائل نقلیہ بیان کئے جاتے ہیں۔ دلیل ۱ مواہب لدنیہ جلد اوّل صـ۲۸۵ پر ہے :۔ وَفِیْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ دَلَالَۃٌ عَلٰی طَھَارَۃِ بَوْلِہٖ وَدَمِہٖ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ط (ترجمہ) :۔ اس حدیث پاک میں آقا ئے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خون اور بول مبارک کے پاک ہونے کی دلیل ہے ؛ دلیل ۲ :۔ علامہ نووی نے شرح مہذب میں فرمایا :۔ وَاسْتَدَلَّ مَنْ قَالَ بِطَھَارَتِھَا بِالْحَدِیْثَیْنِ الْمَعْرُوْفَیْنِ ط (ترجمہ) :۔ دو مشہور اور بالکل صحیح حدیثوں سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تمام فضلات مبارکہ کے طیب وطاہر اور بالکل پاک ہونے کی شاندار دلیل بنتی ہے دلیل ۳ :۔ وہ احادیث مبارکہ کون سی ہیں ۔ جن کو مواہب لدنیہ اور علامہ نووی نے دلیل بنایا پس ملاحظہ ہوں ۔ احادیث کی مشہور کتاب مستدرک حاکم اور شرح شفا للملا علی قاری صفحہ نمبر ۱۶۲ جلد اول میں ہے :

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اِمْرَأَۃٍ شَرِبَتْ بَوْلَہٗ فَقَالَ لَھَا لَنْ تَشْتَکِیْ وَجَعَ بَطْنِكِ اَبَدًا وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَنْ تَلِجَ النَّارُ بَطْنَكِ رَوَاہُ الْحَاکِمُ ط دلیل ۴ دوسری حدیث شریف طبرانی صفحہ نمبر ۲۰۱ پر ہے :۔ عَنِ الْاَسْوَدِ بْنِ قَیْسٍ عَنْ نُبَیْحٍ الْعَنَزِیِّ عَنْ اُمِّ اَیْمَنَ قَالَتْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ اللَّیْلِ اِلٰی فَخَّارَۃٍ فِیْ جَانِبِ الْبَیْتِ فَقُمْتُ مِنَ اللَّیْلِ وَاَنَا عَطْشَانَۃٌ فَشَرِبْتُ مَا فِیْھَا وَاَنَا لَا اَشْعُرُ فَلَمَّا اَصْبَحَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ یَا اُمَّ اَیْمَنَ قُوْمِیْ فَاَھْرِیْقِیْ مَا فِیْ تِلْكَ الْفَخَّارَۃِ ۔ فَقُلْتُ قَدْ وَاللّٰہِ شَرِبْتُ مَا فِیْھَا قَالَتْ فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ حَتّٰی بَدَتْ نَوَاجِذُہٗ ثُمَّ قَالَ اَمَا وَاللّٰہِ لَا یَیْجَعَنَّ بَطْنُكِ اَبَدًا ط (ترجمہ) :۔ اسود بن قیس سے روایت ۔ کہ وہ نبیح عنزی سے راوی وہ ام ایمن سے انہوں نے فرمایا ۔ کہ نبی کریم نے ایک قارورے میں رات کے وقت بول فرمایا گھر کے ایک گوشے میں ۔ پس میں اتفاقیہ اٹھی تھی ۔ پیاسی بھی تھی ۔ میں نے بے خبری میں وہ قارورے کا پانی پی لیا ۔ صبح کو نبی کریم نے حکم فرمایا ۔ کہ اے اُمّ ایمن وہ قارورہ باہر پھینک دو ۔ تب حیرانی سے میں نے جواباً عرض کیا ۔ بے شک اللہ کی قسم میں نے وہ سب پی لیا ۔ فرمایا ام ایمن نے پس ہنس پڑے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ۔ یہاں تک کہ ظاہر ہوگئے ۔ آپ کے دَرِ دندان مبارک ۔ پھر فرمایا آقا ئے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ کی قسم نہ دکھے گا تیرا پیٹ کبھی ۔ دلیل ۵ :۔ قَالَ الطَّبْرَانِیُّ ۔ شَرِبَ مَالِكُ بْنُ سِنَانٍ دَمَہٗ یَوْمَ اُحُدٍ وَمَصَّہٗ اِیَّاہُ وَاَمَرَ تَسْوِیْغَہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ذَالِكَ لَہٗ وَقَوْلُہٗ لَہٗ لَنْ تُصِیْبَہُ النَّارُ ۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنْ اَبِیْہِ ط (حوالہ شرح شفا جلد اوّل صفحہ ۱۶۳) ترجمہ :۔ طبرانی نے ابی سعید خدری سے انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ۔ کہ مالک بن سنان نے جنگ احد میں نبی کریم کا خون پاک پیا بھی اور چوسا بھی اور زخم میں منہ لگانے کا ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ۔ پھر فرمایا ان کو اب ہرگز تجھ کو نار جہنم نہ پہنچے گی ؛ یہی مسئلہ مرقات

شرح مشکوٰۃ اوّل صفحہ ۳۴ اور شامی جلد اوّل صفحہ ۲۹۳ پر ہے۔ دلیل ۶: نسائی وشرح نسائی جلد اوّل صفحہ نمبر صفحہ ۱۴ پر ہے: عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کَانَ یَبُوْلُ فِیْ قَدَحٍ مِّنْ عِیْدَانٍ ثُمَّ یُوْضَعُ تَحْتَ سَرِیْرِہٖ فَجَآءَ فَاِذَا الْقَدَحُ لَیْسَ فِیْہِ شَیْءٌ فَقَالَ لِاِمْرَأَۃٍ (یُقَالُ لَھَا بَرَکَۃُ کَانَتْ تَخْدِمُ اُمَّ حَبِیْبَۃَ جَاءَتْ مَعَھَا مِنَ الْحَبَشَۃِ) اَیْنَ الْبَوْلُ الَّذِیْ کَانَ فِی الْقَدَحِ قَالَتْ شَرِبْتُہٗ قَالَ صِحَّۃٌ یَا اُمَّ یُوْسُفَ فَمَا مَرِضَتْ قَطُّ ؕ ان احادیث کی شرح میں شیخ الاسلام البلقینی اور ابن دحیہ فرماتے ہیں۔ کہ بول مبارک پینے کا دو عورتوں کو شرف حاصل ہوا۔ ایک اُمّ ایمن، دوم برکت اُمّ یوسف نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برائی نہ فرمائی۔ بلکہ صحتِ ابدی کا مژدہ سُنایا۔ اور عذابِ جہنم سے بھی نجات دائمی کا

دلیل ۷: نسیم الریاض شرح شفا جلد اوّل صفحہ نمبر صفحہ ۳۴۴ پر ہے: اِنَّ امْرَأَۃً شَرِبَتْ بَوْلَہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ یُنْکِرْ عَلَیْھَا وَلَمْ یَأْمُرْ بِغَسْلِ فَمِھَا (ترجمہ): ایک عورت نے بول مبارک پیا۔ تو نبی کریم نے ان پر انکار کیا اور نہ ہی منہ دھونے کا حکم دیا۔

دلیل ۸: بیہقی شریف جلد دوم صفحہ ۲۲ پر ہے: عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ الزُّبَیْرِ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ احْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ فَاَعْطَانِی الدَّمَ فَقَالَ اِذْھَبْ فَغَیِّبْہُ، قَالَ فَذَھَبْتُ وَشَرِبْتُہٗ فَاَتَیْتُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا صَنَعْتَ قُلْتُ غَیَّبْتُہٗ قَالَ لَعَلَّکَ شَرِبْتَہٗ قُلْتُ شَرِبْتُہٗ فَقَالَ اِذْھَبْ فَقَدْ اَحْرَزْتَ نَفْسَکَ مِنَ اللّٰہِ ؕ (ترجمہ) نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فصد کھلوائی۔ عبد اللہ بن زبیر نے فرمایا۔ کہ والد صاحب کو وہ پیالہ خونِ پاک کا دیا۔ کہ جاؤ اس کو کہیں غائب کر دو۔ زبیر کہتے ہیں۔ کہ میں گیا۔ اور وہ سارا خون میں نے پی لیا۔ پھر پی کر حاضر بارگاہ ہوا۔ تو نبی پاک نے فرمایا۔ کیا۔ کر دیا غائب؟ میں نے عرض کی۔ ہاں غائب کر دیا۔ غیب جاننے والے نے غیب کے ذریعے حقیقتِ حال کا پتہ لگا کر ارشاد فرمایا۔ تم نے شاید پی لیا۔ میں نے کہا ہاں میں نے پی لیا۔ تو فرمایا۔ جا۔ تو نے اپنے کو اللہ کے عذاب سے بچا لیا۔ دلیل ۹: حدیث پاک کی کتاب جوہر مکنون فی ذکر قبائل والبطون میں ہے اَنَّہٗ لَمَّا شَرِبَ اَیِ الزُّبَیْرُ دَمَہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ تَضَوَّعَ فَمُہٗ مِسْکًا وَبَقِیَتْ رَائِحَتُہٗ مَوْجُوْدَۃً فِیْ فَمِہٖ ؕ (ترجمہ): جب حضرت زبیر نے دم مبارک پیا۔ تو تا عمر اُن کے منہ سے مشک وعنبر کی خوشبوئیں آتی رہیں۔ ان نو دلائل منقولہ سے بالوضاحت ثابت ہوا۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا بول مبارک اور خون مبارک دونوں پاک تھے صحابیات وصحابہ کرام نے با خوشی پیا۔ اور یہ تمام احادیث بالکل صحیح ہیں۔ چنانچہ مواہب لدنیہ جلد اوّل میں ارشاد ہے: صفحہ نمبر صفحہ ۲۸۵ پر ہے۔

وَحَدِیْثُ شُرْبِ الْبَوْلِ صَحِیْحٌ رَوَاہُ الدَّارُقُطْنِیْ۔ وَقَالَ ھُوَ حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ ط یعنی تمام محدثین کرام کے نزدیک یہ حدیثیں بالکل حسن صحیح ہیں۔ تین ہی چیزیں جسم انسانی سے خروج کرتی ہیں اور وہ ناپاک ہوتی ہیں۔ لیکن وہی اشیاء جسم پاک مصطفٰے علیہ التحیۃ والثناء سے بعد خروج بھی پاک رہتی ہیں۔ وہ تین اشیاء خون، بول اور براز ہے۔ منکرین جہلاء وہابیہ عام حیوانات کی طرح نبی کریم کے فضلات ودم کو بھی غیر طاہر کو بھی اور ناپاک مانتے ہیں۔ حالانکہ یہ دیوبندیوں وہابیوں کی بے دلیلی بات ہے صحیح مسلک یہ ہے ہے۔ کہ نبی کریم علیہ السلام کا خون مبارک اور بول مبارک بالکل طیب وطاہر پاک ہے۔ جیسا کہ اقوال محققین اور احادیث صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہوا۔ اسی طرح آپ کا براز مبارک بھی پاک اور طیب ہے۔ جیسا کہ آئندہ دلائل سے ثابت ہو رہا ہے۔ براز مبارک کو ہمیشہ خود بخود زمین نگل لیتی تھی۔ یہ بھی اس کے اظہار عظمت کے لیئے ہے :۔ **دلیل ع۱۰**: بیہقی شریف جلد اول صفحہ نمبر ص۷۱ پر ہے حَدَّثَنَا حُسَیْنُ ابْنُ عَلْوَانَ عَنْ ھِشَامِ بْنِ عُرْوَۃَ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ اَرَاکَ تَدْخُلُ الْخَلَاءَ ثُمَّ یَاْتِیْ بَعْدَکَ فَلَا یُرٰی لِمَا یَخْرُجُ مِنْکَ اَثَرٌ فَقَالَ عَائِشَۃُ اَمَا عَلِمْتِ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَ الْاَرْضَ اَنْ یَّبْتَلِعَ مَا یَخْرُجُ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ ط (ترجمہ) :۔ ہشامؓ اپنے والدؓ سے راوی، وہ اُمّ المومنین رضؓ سے راوی فرماتی ہیں۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ بے شک میں نے کئی دفعہ آپکو دیکھا کہ آپ خلا میں داخل ہوئے پھر جو آپ کے بعد جاتا ہے وہ اس کا اثر بالکل نہیں دیکھتا جو آپ سے خارج ہو۔ فرمایا نبی کریم نے اے عائشہ کیا تم نے نہ جانا۔ کہ اللہ نے زمین کو حکم دے رکھا ہے۔ کہ براز انبیاء نگل جائے :۔ **دلیل ع۱۱** مواہب لدنیہ ص۲۸۳ جلد اوّل میں ہے :۔ عَنْ ھِشَامِ بْنِ عُرْوَۃَ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْغَائِطَ دَخَلْتُ فِیْ اَثَرِہٖ فَلَا اَرٰی شَیْئًا اِلَّا اَنِّیْ کُنْتُ اَشُمُّ رَائِحَۃَ الطِّیْبِ (الخ) :۔ ترجمہ :۔ اُمّ المومنین فرماتی ہیں۔ کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی النبی الامی وآلہ وسلم بیت الخلاء سے تشریف لاتے۔ تو میں فوراً انہیں قدموں پر بیت الخلاء میں جاتی تو سوائے بہترین بہت تیز خوشبو کے کچھ نہ پاتی۔ **دلیل ع۱۲** شفاء شریف لقاضی عیاض جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۴۱ پر ہے :۔ فَقَدْ قَالَ قَوْمٌ مِّنْ اَھْلِ الْعِلْمِ بِطَھَارَۃِ ھٰذَیْنِ الْحَدَثَیْنِ مِنْہُ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ط (ترجمہ) قاضی عیاض جو تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں۔ کہ اہل علم کی پوری قوم کہتی ہے۔ کہ نبی کریم کے بول براز طیب طاہر ہی ہیں۔ زمانہ تابعین میں صحابہ کو اہل علم کہا جاتا ہے ان بارہ عدد منقولہ دلائل سے ثابت ہوگیا۔ کہ نبی کریم کے فضلات طیبہ وطاہر پاک ومنزہ ہیں

اب اس کے دلائل عقلیہ ملاحظہ ہوں۔ دلیل ۱: ۔ ناپاک چیزیں خوشبو نہیں ہوتی یا بدبو ہوتی ہے یا بغیر بدبو۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بول وبراز میں مشک وعنبر سے زیادہ خوشبو تھی۔ جیسا کہ مندرجہ احادیثِ صحابہ سے ثابت ہوا۔ چنانچہ فتاوٰی شامی علی درمختار جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۹۲ پر ہے۔: وَاَطَالَ فِیْ تَحْقِیْقِہٖ فِیْ شَرْحِہٖ عَلَی الشَّمَائِلِ فِیْ بَابِ مَاجَآءَ فِیْ تَعَطُّرِہٖ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ ط

ترجمہ:۔ نبی کریم کے بول وبراز اور خون مبارک خوشبو والے اور پاک ہیں۔ اس کی دراز گفتگو شمائل شریف باب ما جاء تعطرہ میں موجود ہے۔ اس خوشبو ہونے میں طہارت کا بیّن ثبوت ہے۔ کیونکہ اللہ کریم نے صرف پاک چیزوں کو ہی خوشبو والا بنایا ہے؛ دلیل ۲: ناپاک چیز کا کھانا پینا حرام ہے۔ جیسا کہ قرآن و حدیث سے متعدد مقام پر واضح ہے۔ اگر یہ بول وغیرہ حرام ہوتا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت عتاب فرماتے۔ حالانکہ یہ کچھ نہ ہوا۔ بلکہ مژدۂ شفا سنایا گیا۔ فقہاء فرماتے ہیں۔ کہ اگر کسی چیز میں بدبو پیدا ہوجائے۔ تو ناپاک ہوجاتی ہے۔ (دیکھو کتب فقہ) دلیل ۳:۔ ناپاک حرام ہے۔ اور حرام میں شفا نہیں۔ چنانچہ حدیثِ مبارکہ میں ہے۔ لَا شِفَآءَ فِی الْحَرَامِ ط (ترجمہ)۔ حرام میں شفاء نہیں، اگر فضلات وخون ناپاک یا حرام ہوتے تو شفاء کا مژدہ کیسے ہوا۔ دلیل نمبر ۴۔: کافر اور گمراہ کی عقل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ کم از کم کسی مسلمان کی عقل میں تو یہ تصور بھی نہیں آسکتا۔ کہ نبی علیہ السلام کے جسم میں گندگی یا ناپاک چیز کا حصہ ہو یا کسی نبی کے جسم سے معاذ اللہ نجاست نکلے۔ کسی مسلمان کی غیرت گوارہ نہیں کرسکتی۔ کہ ایسی نازیبا بات سنے بھی۔ بلکہ عقیدۂ مومن تو یہی ہے۔ کہ ع

آن خورد گردد ہمہ نورِ خدا

ترجمہ:۔ وہ انبیاء جو کھاتے ہیں وہ سب نورِ خدا بن جاتا ہے۔ تمام ایمانی ریزدانی عقلیں انبیاء کے فضلات کو پاک ماننے پر مجبور ہیں۔ خصوصاً سرور انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کہ جن کے جسم اطہر میں رب کریم کو نفس امارہ کا لوتھڑا باقی رکھنا بھی پسند نہ آیا۔ اور شقِ صدر سے نکلوادیا۔ اور جن کے اسم پاک ولعاب دہن سے کفر جیسی گندگیاں دور ہو جاتی ہیں۔ کیسے ہوسکتا ہے۔ کہ بول یا خون ناپاک ہو۔ بلکہ محال بالذات ہے۔ دلیل ۵:۔ امام مالکؒ کی عقل تو حلال جانوروں کی ہر چیز بول، پیشاب، گوبر، مینگنی کو پاک کہتی ہے۔ چنانچہ فقہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مشہور کتاب بلغۃ السالک لِفِقْہِ اِمَامِ مَالِک جلد اول صفحہ ۱۹ میں ہے:۔ وَمِنَ الطَّاھِرِ فُضْلَۃُ الْمُبَاحِ مِنْ رَوْثٍ وَبَعْرٍ وَبَوْلٍ (الخ) ترجمہ:۔ حلال چوپایوں کا فضلہ، گوبر، مینگنی۔ اور پیشاب پاک ہیں۔ اور کوئی وہابی اس جگہ نہ بولے گا۔ کتنی بدنصیبی کی بات ہے۔ کہ گائے بھینس کا گوبر پاک اور کوئی حیرانگی نہ ہوئی۔ کوئی دلیل نہ مانگے مگر اصدق الصادقین اطہر الطاہرین سرور انبیاء کے فضلات کو پاک مانتے ہوئے ان کو تکلیف ہو۔ خود امام مالکؒ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نبی کریم کے فضلات مبارکہ کو پاک وطیبہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ بلغۃ السالک صفحہ ۱۸ پر ارشاد

ہے۔ کہ اِنَّ فُضُلَاتِ الْاَنْبِیَاءِ طَاھِرَۃٌ ترجمہ :۔ انبیاء کرام کے فضلات پاک ہیں۔ دلیل ع۶ : امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی عقلِ سلیم نے تو بچے کے بول کو بزمانۂ شیر خوارگی پاک مانا ہے۔ چنانچہ حاشیہ بیجوری فقہ شافعی جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۲۱ پر ہے۔ وَغَسْلُ جَمِیْعِ الْاَبْوَالِ وَالْاَرْوَاثِ وَلَوْ کَانَ مِنْ مَّاکُوْلِ اللَّحْمِ۔ وَاجِبٌ اِلَّا بَوْلَ الصَّبِیِّ الَّذِیْ لَمْ یَاکُلِ الطَّعَامَ فَاِنَّہٗ طَاھِرٌ عِنْدَ الشَّافِعِیْ ترجمہ :۔ ہر اس کپڑے یا جسم کا دھونا واجب ہے۔ کہ جس پر کسی جانور کا پیشاب یا گوبر لگا ہو۔ اگرچہ حلال جانور کا ہو سوائے شیر خوار بچے کا کیونکہ دودھ پینے والے کا پیشاب امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک پاک ہے۔ ہند و پاک کے وہابی بھی ایسے بچے کا پیشاب پاک مانتے ہیں۔ پوچھو ان بے وقوفوں سے کہ کیا نبی کا درجہ اور پاکیزگی عام بچے سے بھی کم ہے۔ (العیاذ باللہ) یہ تسلیم ہے تو اس کے انکار پر کیوں مصر ہو۔ دلیل ع۷ تمام جہان کی عقل بلا جرح تسلیم کرتی ہے۔ کہ ریشم کے کیڑے کا فضلہ جس کو ریشم کہا جاتا ہے۔ بالکل پاک طیب و طاہر ہے۔ کیا وہابیوں کی عقل فضلاتِ انبیاء پر آ کر فنا ہو جاتی ہے کیا مت ماری جانے کا یہی مقام تھا۔ ریشم کے کیڑے کی مینگنی بھی سب فقہاء کے نزدیک پاک ہے۔ دلیل ع۸ ۔ شہد کی مکھی کا فضلہ جس کو شہد کہا جاتا ہے۔ تمام وہابی بھی کھا جاتے ہیں۔ اس کی تعریف خود نبی کریم نے فرمائی۔ اور قرآن کریم شہد کی مکھی کے فضلے کی تعریف کرتا ہے :۔ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط ترجمہ :۔ شہد میں تمام لوگوں کی شفا ہے۔ اب کہو اے وہابیانِ زمانہ اور اٹھاؤ تعصب کے پردے۔ کیا اب بھی کچھ حیل و حجت باقی رہ گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضلات کے پاک ماننے میں :۔ دلیل ع۹ : تمام کیڑے مکوڑوں مکھی مچھر کے فضلات پاک ہیں۔ دیکھو احادیث اور کتبِ فقہاء کرام۔ دن رات یہ مکھیاں وہابیوں کے منہ پر لگتی رہتی ہیں۔ مگر کوئی بھی ان شیخ نجدی صاحب کے منہ کو ناپاک نہیں کہتا۔ اور عقلِ وہابی نے یہاں چون و چرا بھی نہ کی۔ تو فضلات انبیاء کرام کے بارے میں کیا کھٹکا رہے۔ جو یہاں تم وہابی لوگ کوئی کتاب ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہالت و ضد اور حسد و بغض کی پٹیاں ان کے دماغوں، عقلوں پر پڑی ہیں مسئلہ مذکورہ اکیس دلائل قاطعہ و براہین عقلیہ و نقلیہ ثابت ہو گیا :۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ط
وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتاب الصلوٰۃ

سوال نمبر ۵: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ نماز میں فرائض واجبات اور مستحبات اور نفل سنتیں کون کونسی ہیں۔

دستخط سائل نور حسین گیلانی ۲۶-۱-۷۹

الجواب بعون العلام الوھاب

نماز کے باہر سات فرض ہیں جس کو شرطیں کہا جاتا ہے ۱ کپڑے پاک ۲ جسم پاک ۳ جگہ پاک ۴ وقت کا مقرر کرنا ۵ قبلے شریف کی طرف منہ کرنا ۶ نیت کرنا ۷ وضو کرنا۔ نماز کے اندر بھی سات فرض ہیں۔ جن کو رکن کہا جاتا ہے ۱ تکبیر تحریمہ ۲ قیام ۳ قرأت ۴ رکوع ۵ سجدہ ۶ آخری التحیات ۷ نماز سے نکلنا

نماز کے واجبات ۲۲ ۱ سورت فاتحہ ۲ سورت کو ملانا ۳ ایک مرتبہ سورت فاتحہ پڑھنا ۴ پہلی دو رکعت میں قرأت کرنا ۵ پہلے سورت فاتحہ پڑھنا پھر دوسری سورت ۶ کوئی سورت الحمد سے ملا کر پڑھنا بیچ میں بجز بسم اللہ کسی ذکر سے فاصلہ نہ کرنا ۷ ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیتیں ملا کر پڑھنا ۸ مغرب عشاء فجر میں قرأت بلند پڑھنا ۹ ظہر عصر میں قرأت آہستہ پڑھنا ۱۰ دعا قنوت وتر میں پڑھنا ۱۱ دونوں قعدوں میں تشہد پڑھنا ۱۲ پہلا قعدہ بیٹھنا ۱۳ نماز میں سجدہ تلاوت کرنا ۱۴ سجدہ سہو کرنا اگر واجب رہ جائے ۱۵ ایک رکن سے دوسرے رکن میں منتقل ہونا مثلاً قیام سے رکوع میں آنا رکوع سے سجدے میں آنا وغیرہ ۱۶ ترتیب نماز کا لحاظ رکھنا کوئی آگے پیچھے نہ ہو ۱۷ فرض کو ایک ہی دفعہ کرنا دوبارہ نہ ہو ۱۸ فرض میں دیر نہ لگانا ۱۹ واجب میں دیر نہ لگانا ۲۰ واجب کو دوبارہ نہ کرنا ایک ہی دفعہ کرنا ۲۱ نماز سے نکلتے وقت السلام علیکم کہنا ۲۲ عیدین کی چھ تکبیریں کہنا

نماز کی سنتیں ۲۶ عدد ہیں۔ ۱ پانچ نمازوں کے لیے اور جمعہ کے لیے اذان کہنا ۲ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانا ۳ انگلیوں کو ہاتھ اٹھانے کے وقت ڈھیلا چھوڑنا ۴ امام کا تکبیر زور سے کہنا ۵ سمع اللہ کہنا زور سے ۶ زور سے سلام پھیرنا ۷ ثنا پڑھنا ۸ اعوذ پڑھنا ۹ سورت فاتحہ سے پہلے اور بعد بسم اللہ پڑھنا ۱۰ آہستہ پڑھنا آمین ۱۱ اعوذ اور بسم اللہ اور ثناء کو آہستہ پڑھنا ۱۲ دونوں ہاتھوں کو ناف پر باندھنا ۱۳ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر رکھنا اور عورت کا اسی طرح ہاتھ سینے پر ہاتھ باندھنا ۱۴ نماز کی درمیانی تکبیریں کہنا ۱۵ ربنا لک الحمد کہنا مقتدی کا ۱۶ رکوع کی تسبیحیں ۱۷ سجدے کی تسبیحیں ۱۸ دونوں ہاتھوں سے دونوں گھٹنوں کو رکوع میں پکڑنا ۱۹ گھٹنوں کو پکڑنے کے وقت انگلیاں کھولنا ۲۰ دائیں پیر کو التحیات میں کھڑا کرنا اور اس پیر کی انگلیاں کعبے کی طرف ہوں ۲۱ بائیں پیر کو بچھانا اور اس پر بیٹھنا ۲۲ عورت اپنے دونوں پیر باہر نکال دے ۲۳ آخری التحیات میں تشہد کے بعد درود شریف ابراہیمی پڑھنا ۲۴ درود شریف کے بعد دعا پڑھنا ۲۵ شہادت کی انگلی سے

شہادت کے وقت اشارہ کرنا ع۲۶ چار فرض کی دوسری دو رکعتوں یا ایک رکعت میں فاتحہ پڑھنا

نماز کے مستحبات چار ہیں

ع۱ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو آستینوں وغیرہ سے تکبیر کے وقت باہر نکالنا اور رکوع سجدے کے وقت بھی ع۲ اپنی رانوں سے اپنے پیٹ پسلیوں کو دور کرنا ع۳ سجدے اور قعدے اور جلسے میں ہاتھوں کی انگلیاں کعبے شریف کی طرف کرنا ع۴ اپنے بازوں کو اپنی کروٹوں سے دور رکھنا اور زمین سے اونچا رکھنا۔

نماز میں بارہ کام حرام ہیں

ع۱ بے وضو نماز پڑھنا ع۲ جان کر قبلے کے علاوہ دوسری طرف منہ کرکے نماز پڑھنا ع۳ اجنبی نمازی کعبے کی طرف منہ کرکے نماز پڑھے مگر کسی سے پوچھے بغیر اور سوچے بغیر ع۴ اجنبی سوچے بغیر غیر کعبے کی طرف منہ کرکے نماز پڑھے ع۵ جان کر سجدہ سہو واجب ہونے والا کام کرے ع۶ جان کر کوئی فرض چھوڑے ع۷ نماز سے نکلنے کے لیے وضو توڑے التحیات پڑھنے کے بعد جان بوجھ کر ع۸ قبر کے سامنے نماز پڑھے اگرچہ رخ کعبے ہی کو ہو ع۹ کسی ایسے شخص کی طرف منہ کرکے نماز پڑھے جس کا منہ یا کروٹ نمازی کی طرف ہو ع۱۰ لوگوں کے گذرنے کی جگہ نماز پڑھنا شروع کرے ع۱۱ نماز میں جان کر اوپر یا پیچھے یا دائیں بائیں منہ پھیر کر دیکھے ع۱۲ کعبے سے سینہ پھیرے ؛

نماز کے مکروہ تحریمی چوراسی عدد ہیں

ع۱ نماز میں اپنے منہ کو کھولنا بلا وجہ اُباسی کا حکم اس کے علاوہ ہے وہاں منہ کھولنے میں مجبوری ہوتی ہے، ع۲ منہ اور ناک کو کپڑے سے ڈھکنا ع۳ سر پہ پگڑی سے اعتجار کرنا اس کی دو صورتیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ آدھی پگڑی سر پہ لپیٹے آدھی پگڑی سے ٹھوڑی کے نیچے سے چہرے کو باندھے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سر پر اس طرح اس پاس پگڑی باندھے کہ بیچ میں کھوپڑی کھل رہے ع۴ بالوں کا جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا جس طرح عورتیں یا سکھ باندھ لیتے ہیں ع۵ جلدی جلدی سجدے کرنا جس طرح مرغ ٹھونگے مارتا ہے ع۶ کتے کی طرح بیٹھنا ہاتھ کھڑے کرکے ع۷ کہنیاں بچھا کر کتے کی طرح بیٹھنا ع۸ رکوع اور سجدے کے وقت دونوں ہاتھوں کو تکبیر تحریمہ کی طرح اٹھانا جیسے وہابی اور شیعہ کرتے ہیں ع۹ التحیات کے وقت بھی اسی طرح رفع یدین کرنا ع۱۰ نماز میں سدل کرنا اس کی چار قسمیں ہیں۔ اور چاروں مکروہ تحریمی ہیں پہلی قسم سر پہ رومال یا تولیہ ڈال کر چھوڑ دے اور نہ لپیٹے دوسری قسم کندھے پہ یا دونوں کندھوں پہ کوئی کپڑا ڈال کر چھوڑ دے گردن پر نہ لپیٹے تیسری قسم کندھوں پر کرتہ یا کوٹ یا واسکٹ ڈال کر نماز پڑھے اور ہاتھ آستینوں میں نہ ہوں چوتھی قسم کوٹ یا واسکٹ پہنا ہو بٹن بند نہ ہوں یہ سب نماز میں مکروہ تحریمی ہیں ع۱۱ نماز میں اپنا کپڑا لپیٹا ہو مثلاً آستین یا پونچے

لپیٹے ہوئے ہوں ع۱۲ نماز میں اکڑ کر کھڑا ہونا سینہ تان کر ع۱۳ فقط تہبند یا پاجامے میں نماز پڑھنا بغیر کرتے کے ع۱۴ ننگے سر نماز پڑھنا ۱۵ رکوع میں سر زیادہ اونچا کرنا یا زیادہ نیچا کرنا ع۱۶ نماز میں ایک ہاتھ سے اپنے جسم یا داڑھی یا کپڑوں سے کھیلنا ع۱۷ اپنی انگلیوں سے چٹخارے نکالنا ع۱۸ دونوں ہاتھوں کی کنگھیاں بنانا نماز میں ع۱۹ اپنے ہاتھوں کو اپنی کمر پر رکھنا ع۲۰ بلاوجہ کنکریوں کو ہٹانا نماز میں ع۲۱ چہار زانوں بیٹھنا نماز میں بغیر عذر ع۲۲ آنکھیں بند کرنا نماز میں ع۲۳ نماز میں دائیں بائیں متوجہ ہونا ع۲۴ اپنی پگڑی کے بیچ کو یا رومال یا ٹوپی کو ماتھے پر کرنا اور اس پر سجدہ کرنا ع۲۵ نماز میں بلاوجہ کھانسنا ع۲۶ نماز میں ہاتھ یا سر کے اشارے سے کسی کے سلام کا جواب دینا ع۲۷ نماز میں بچے کو اٹھانا ع۲۸ نماز میں تھوکنا ع۲۹ اپنے منہ میں کوئی چیز ڈالنا مثلاً پیسہ یا روپیہ یا روئی روٹی وغیرہ ع۳۰ نماز میں پھونک مارنا ع۳۱ نماز میں اپنے دانتوں میں سے کوئی چیز نکال کر نگلنا ع۳۲ بسم اللہ اونچی پڑھنا ع۳۳ آمین اونچی پڑھنا ع۳۴ ثنا اونچی پڑھنا ع۳۵ اعوذ اونچی پڑھنا ع۳۶ قرأت رکوع میں کرنا ع۳۷ اپنی انگلیوں سے آیتیں یا تسبیحیں گننا جس سے ہاتھ ہٹانا پڑے ع۳۸ نماز میں دیوار یا لاٹھی سے ٹیک لگانا بغیر عذر کے ع۳۹ نماز میں زمین پر لکیریں کھینچنا ایک ہاتھ سے ع۴۰ بغیر عذر کے ایک قدم آگے چلنا یا پیچھے چلنا ع۴۱ نماز میں ایک پاؤں پر کھڑے ہونا جس سے ایک طرف جھکاؤ پیدا ہوتا ہے ع۴۲ رکوع اور سجدے میں جلد بازی کرنا ایسے ہی قومے اور جلسے میں بھی بے اطمینانی یعنی جلد بازی کرنا ع۴۳ پہلی رکعت کو چھوٹا کرنا دوسری رکعت کو لمبا کرنا ہر قسم کی نماز میں ع۴۴ نماز کی حالت میں قمیض یا ٹوپی اتارنا ایک ہاتھ سے ع۴۵ ایک ہاتھ سے قمیض یا ٹوپی پہننا ع۴۶ نماز کی حالت میں پھول سونگھنا ع۴۷ نماز میں ایک ہاتھ سے پنکھا کرنا ایک دو مرتبہ ع۴۸ نماز میں ایک ہاتھ سے اپنی آستیں چڑھانا ع۴۹ قیام اور رکوع یا سجدے یا تشہد میں اپنی جگہ ہاتھ رکھنا ع۵۰ سجدے یا قعود رکوع جلسہ وغیرہ میں قیام کے علاوہ قرأت کرنا ع۵۱ رکوع یا سجدے کی تسبیحیں چھوڑنا ع۵۲ رکوع سجدے کی تسبیحیں تین سے کم کرنا ع۵۳ منتقل ہونے والی تکبیریں منتقل ہونے کے بعد کہنی شروع سے خاموش ہوکر نماز میں منتقل ہو جانا ع۵۴ نمازی اپنے ماتھے سے پسینہ یا مٹی پونچھے ع۵۵ نماز فرض میں دنیا کی دعا مانگے ع۵۶ جاندار تصویر نما والے کپڑے پر سجدہ کرنا ع۵۷ تصویر کے سامنے کھڑے ہوکر نماز پڑھنا اگرچہ جاندار کی تصویر سر کے اوپر ہو چھت پر ہو یا سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی ہو یا رکھی ہوئی ع۵۸ امام محراب میں کھڑا ہو اکیلا ع۵۹ امام اکیلا اونچی جگہ کھڑا ہو ع۶۰ مقتدی اکیلا ایک صف میں کھڑا ہو ع۶۱ کوئی نمازی نفل پڑھنے والا صف کے بیچ ہی کھڑے ہوکر جماعت کے ساتھ بالکل کھڑے ہوکر علیحدہ نماز پڑھے ع۶۲ گندی جگہ مثلاً اصطبل وغیرہ میں پاک مصلہ بچھا کر ناپاک جگہ نماز پڑھے ع۶۳ جنگل میں بغیر سترے کے نماز پڑھے۔ ع۶۴ اونٹوں کے پاس نماز پڑھے ع۶۵ مذبح خانے میں نماز پڑھے ع۶۶ ایک یا دو کلمے کسی سورت کے پڑھ کر اس کو

چھوڑنا اور بغیر عذر کے کوئی دوسری سورت شروع کر دینا ۶۷ ایسے شخص کو امام بنانا جس سے قوم نفرت کرتی ہو ۶۸ امام طلاوت کو زیادہ کرے کہ مقتدی گھبرا جائیں ۶۹ نماز میں اتنی جلد بازی کی جائے کہ نہ تلاوت سمجھ آئے نہ رکوع سجدے کی تسبیحیں صحیح ادا ہوں ۷۰ امام قوم کو لقمہ دینے پر مجبور کرے ۷۱ کسی کے ذاتی خادم کو امام بنانا ۷۲ جاہل کو امام بنانا ۷۳ قوم کے کمی کو امام بنانا ۷۴ فاسق کو امام بنانا ۷۵ یعنی وہ فاسق جس کا گناہ نماز میں ظاہر موجود ہو جیسے داڑھی منڈا یا کترا یا انگوٹھی پہنے ہوئے یا ریشمی لباس والا یا کالا خضاب بالوں کو لگا ہوا یا ہاتھ پیروں کو مہندی لگا ہوا مرد امام ۷۵ حرامی مشہور مرد کو امام بنانا ۷۶ نماز عید سے پہلے نفل پڑھنا ۷۷ نماز عید کے بعد عید گاہ میں نفل پڑھنا گھر میں آکر جائز ہے ۷۸ نمازی کو پیشاب یا بڑا پیشاب لگا ہو اور نماز پڑھے ۷۹ بیت الخلا یا حمام کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا جب کہ کعبہ بھی ادھر ہی ہو ۸۰ نماز میں آسمان کی طرف منہ اٹھانا ۸۱ بھوکا ہو اور کھانا پاس ہو تو کھانا چھوڑ کر نماز پڑھنا ۸۲ امام سے پہلے رکوع سجدے میں اپنا سر اٹھانا اور رکھنا ۸۳ جلتی بھڑکتی آگ یا چراغ کے سامنے نماز پڑھنا ۸۴ سجدے میں اپنے ہاتھ پیر کی انگلیوں کو قبلے سے ہٹانا (یہ تھے نماز کے مکروہ تحریمی)

نماز کے مکروہ تنزیہی چودہ عدد ہیں ۱ سجدے میں جاتے وقت گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھنا ۲ سجدے سے اٹھتے وقت ہاتھوں سے پہلے گھٹنے اٹھانا ۳ اپنے کام کاج کے کپڑوں میں جن سے دوستوں کے پاس نہیں جا سکتا اُن میں نماز پڑھنا ۴ میلی کچیلی حالت میں نماز پڑھنا ۵ نماز میں جوں یا کھٹمل پکڑ کر مارنا ایک ہاتھ سے ۶ بغیر عذر کے ایک سورت ہر رکعت میں پڑھنا ۷ ایک رکعت میں ایک سورت بار بار پڑھنا فرض ہوں یا نفل سوائے خاص نفلوں کے ۸ جمعہ کے دن بغیر غسل اور بغیر صاف کپڑے بغیر خوشبو بلا عذر جمعہ پڑھنا ۹ جہاں فرض پڑھے ہوں وہی کھڑے ہو کر نفل سنتیں پڑھنا ۱۰ اندھے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ۱۱ سجدے کی حالت میں کانوں سے آگے ہاتھ کرنا ۱۲ کسی کی چھینی ہوئی زمین میں نماز پڑھنا ۱۳ اسلام کے بغیر سجدہ سہو کرنا ۱۴ کسی کی کھیتی میں نماز پڑھنا (ان جرموں کا حکم) اگر مکروہ تحریمی کام نماز میں ہو تو نماز واجب الاعادہ ہوتی ہے۔ اگر حرام کام نماز میں ہو تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اگر مکروہ تنزیہی کام ہو تو نماز کا ثواب کم ہو جاتا ہے اور نفلوں سے یہ نقصان پورا ہو جاتا ہے۔ اگر مستحب نماز رہ جائے تو وہ مکروہ تحریمی ہو جاتا ہے۔ اور اگر مستحب رہ جائے تو مکروہ تحریمی ہوتا ہے۔ فرض رہ جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے واجب رہ جائے تو سجدہ سہو پڑتا ہے سجدہ سہو رہ جائے تو نماز دوبارہ پڑھی جائے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

مفتی دار العلوم مدرسہ غوثیہ نعیمیہ اقتدار احمد خاں گجرات

بے نمازی کا حکم

سوال نمبر ۶ :- کیا فرماتے ہیں۔ علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے محلے بکر قصاباں کی مسجد کا امام زید کہتا ہے۔ کہ جو شخص نماز نہ پڑھے۔ وہ کافر ہے۔ ایک اور امام مسجد کہتا ہے۔ کہ بے نمازی کافر نہیں ہوتا۔ بلکہ فاسق گنہگار ہوتا ہے۔ خالد کہتا ہے۔ کہ حنفی مسلک میں نماز نہ پڑھنے والا گناہ گار ہے۔ کافر نہیں۔ فرمایا جائے۔ کہ زید کا قول درست ہے۔ یا خالد کا ؟

سائل

محمد انور ڈیرہ نواب صاحب۔ ضلع بہاولپور مورخہ ۱۹۷۱-۱۱-۱۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق اسلامی روایات و تقریبات و عبادات سے روگردانی کرنے والا مجرم تین قسم کا ہے۔

پہلا مجرم :- نظرِ حقارت کرنے والا ؛ دوسرا مجرم :- منکر ؛ تیسرا مجرم :- بے عمل ؛ پہلی قسم کا مجرم ہر حال میں کافر ہو جاتا ہے۔ خواہ چھوٹی چیز کی تحقیر کرے یا بڑی چیز فرض واجب کو حقارت سے دیکھے۔ یا سنت مؤکدہ کو۔ غرضیکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی چیز کو حقارت سے دیکھنا کافر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۳۰۶ پر ہے :- لِاَنَّ مَنَاطَ التَّكْفِيْرِ هُوَ التَّكْذِيْبُ اَوِ الْاِسْتِخْفَافُ ؕ (ترجمہ) :- کفر کا دارومدار دو ہی چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف منسوب چیزوں کو جھٹلانا :- دوسرے یہ کہ ان کی تحقیر کرنی، اور ان کو معمولی سمجھنا۔ نسیم الریاض شرح شفا جلد نمبر سوم صفحہ نمبر ۴۰۸ پر ہے۔ وَاٰيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُهُمْ ؕ :- منافقت کی ایک نشانی یہ بھی ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت والوں سے بغض رکھنا۔ اسی کے صفحہ نمبر ۴۱۲ پر ہے۔ وَعَلَامَةُ حُبِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ حُبُّ السُّنَّةِ ؕ (ترجمہ) :- آقا کریم رؤف و رحیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کی نشانی یہ ہے۔ کہ آپ کی سنتوں سے محبت کی جائے۔ یہ تو نماز، روزے کا حکم تھا۔ حالانکہ حقیقۃً قاعدہ کلیہ یہ ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب، کسی چیز کی بھی توہین کی جائے۔ تو مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ فقہاءِ کرام فرماتے ہیں۔ کہ اگر کدو شریف کو حقارت کی نظر سے دیکھ لیا۔ تو بھی ایمان کا خطرہ ہے۔ اور کدو شریف کے متعلق کلمہ تحقیر زبان سے ادا کر دیا۔ تو متفقًا کافر ہو گیا۔ چنانچہ فتاوٰی قاضی خان جلد سوم صفحہ نمبر ۲۲۲ پر ہے :- رَجُلٌ قَالَ لَا اُحِبُّ الْقَرْعَ ۔ قَالُوْا اِنْ اَرَادَ بِهٖ اِنَّ

لَا اُحِبُّہٗ لِمَا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُحِبُّہٗ فَھُوَ کَافِرٌ وَاِنْ قَالَ ذَالِکَ لِمَرَضٍ اَصَابَہٗ مِنَ الْقَرْعِ۔ لَا یَکْفُرُ ۱ھ (ترجمہ:۔ کسی شخص نے کہا۔ میں لوکی کدّو سے محبت نہیں کرتا۔ فقہاء کرام نے فرمایا۔ کہ اگر اس بات سے اُس نے یہ ارادہ کیا۔ کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ وآبائہٖ وبارک وسلم کو کدّو پسند تھا۔ اس لیئے مجھ کو پسند نہیں۔ تو وہ شخص کافر ہو گیا۔ اور اگر کسی بیماری کی بنا پر جو کدّو سے پہنچی تھی۔ کدّو کو ناپسند کرتا ہے۔ تو کافر نہ ہوگا۔ اسی لیئے فقہاء کرام فرماتے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی کسی چیز کی تصغیر کرنا حرام ہے۔ کہ یہ بھی تحقیر کی ایک شق ہے۔ حضرت حکیم الامت مدظلہ العالی نے بہت شعراء و نعت خوان حضرات کو کملی والے کہنے سے منع فرمایا۔ کہ کملی کمبل مبارک کی تصغیر ہے۔ غرضیکہ حقارت اور توھین اتنا بڑا جرم ہے۔ کہ جس کا مرتکب، کافر، مرتد، ہونے سے نہیں بچ سکتا۔ متکلمینِ ملت تو یہاں تک ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ توھین میں اگر ارادہ توھین نہ بھی ہو۔ تب بھی کفر لازم آجاتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰی ردّ المحتار جلد سوم صفحہ نمبر ۲۹۲ پر ہے:۔ قُلْتُ وَیَظْھَرُ مِنْ ھٰذَا اِنَّ مَا کَانَ دَلِیْلُ الْاِسْتِخْفَافِ یَکْفُرُ بِہٖ وَاِنْ لَمْ یَقْصُدِ الْاِسْتِخْفَافَ ۱ھ (ترجمہ):۔ مصنف نے فرمایا۔ میں نے کہا۔ اور ظاہر ہوتا ہے۔ اس تمام گفتگو سے کہ بے شک ہر وہ بات جس میں توھین کی دلیل بنتی ہے۔ اس سے کفر لازم آجاتا ہے۔ اگرچہ تخفیف یا تحقیر کا ارادہ نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی بدبخت، بدنصیب، بوسیدہ قرآن مجید کے اوراق کو گندے گٹر میں یا گندی جگہ ڈال دے تو کافر ہو جائے گا۔ چنانچہ نسیم الریاض شرح شفاء القاضی ایاز جلد چہارم صفحہ نمبر ۵۹۵ اور فتاوٰی شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۲۹۲ پر ہے:۔ اَذَا وَضَعَ مُصْحَفًا فِیْ قَاذُوْرَۃٍ فَاِنَّہٗ یَکْفُرُ وَاِنْ کَانَ مُصَدِّقًا ۱ھ (ترجمہ) کسی شخص نے قرآن پاک کو گندی جگہ ڈال دیا۔ تو ڈالنے والا کافر ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ قرآن پاک پر ایمان رکھتے ہوئے تصدیق کرتا ہو۔ یعنی اس کی نیت توھین کی نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ نماز کو معمولی اور حقیر سمجھ کر نہ پڑھنے والا اگر ایک سنت بھی چھوڑ دے۔ تب بھی کافر ہو جائے گا۔ شرح درّ مختار جلد سوم میں ہے:۔ بَلْ بِالْمُوَاظَبَۃِ عَلٰی تَرْکِ سُنَّۃٍ اِسْتِخْفَافًا بِھَا بِسَبَبِ اَنَّہٗ فَعَلَھَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ زِیَادَۃً اَوْ اِسْتِقْبَاحِھَا ترجمہ:۔ بلکہ کافر ہو جائے گا وہ شخص جس نے ترکِ سنت پر ہمیشگی کی۔ اُس کو حقیر اور معمولی سمجھتے ہوئے اس وجہ سے کہ بے شک اُس کو نبی کریم نے ادا فرمایا ہے۔ زائد کر کے۔ یا قبیح سمجھا۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں کو۔ یہ تمام گفتگو اُس مسلمان کے بارے میں ہے جو نماز، روزے کو حقیر سمجھتا ہو۔ ایسا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی ادائے مبارکہ پر بھی زبانِ طعن دراز کرے۔ تو متفقًا کافر ہو گا۔ دوسرا مجرم:۔ وہ ہے جو نماز کا منکر ہو۔ چنانچہ فتاوٰی تنویر الابصار صفحہ نمبر ۳۴ پر ہے شریعت کے قانون میں۔ صرف فرض

نماز کا منکر کافر ہے ۔ خواہ خود نماز پڑھتا ہو۔ یا بے نمازی ہو۔ اور شرح تنویر جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۲۵ و ۳۲۶ پر ہے:- ھِیَ- اَیِ الصَّلٰوۃُ الْکَامِلَۃُ وَھِیَ الْخَمْسُ الْمَکْتُوْبَۃُ- فَرْضُ عَیْنٍ عَلٰی کُلِّ مُکَلَّفٍ وَیَکْفُرُ جَاحِدُھَا ۔ (ترجمہ):- پانچ نمازیں جو ہر بالغ، عاقل مسلمان پر فرض ہیں۔ اُن کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ بے نمازی کافر نہیں۔ بلکہ منکرِ نماز کافر ہے۔ دوسری بات یہ کہ صرف پنجوقتہ فرائض کا منکر کافر ہے۔ واجب نماز یا سنّت و نفل نماز کا منکر درجہ کفر تک نہ پہنچے گا۔ چنانچہ قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار فی اصولِ فقہ صفحہ نمبر ۱۷۰ پر ہے:- فَاِنَّ مُنْکِرَ الْفَرْضِ کَافِرٌ دُوْنَ مُنْکِرِ الْوَاجِبِ لِثُبُوْتِ الْفَرْضِ بِالدَّلِیْلِ الْقَطْعِیِّ وَثُبُوْتِ الْوَاجِبِ بِالدَّلِیْلِ الظَّنِّیِّ ۔ (ترجمہ):- فرض کا منکر کافر ہے۔ واجب کا منکر کافر نہیں۔ اس لیے کہ فرض دلیل قطعی سے ثابت ہوتا ہے۔ اور واجب دلیل ظنی سے۔ مختصر یہ کہ ہر وہ شخص جو پنجوقتہ فرائض نماز کا منکر ہو وہ بھی شرعاً متفقاً کافر ہے۔ تیسرا مجرم:- وہ ہے۔ جو صرف سستی کاہلی کی بنا پر نماز نہ پڑھتا ہو۔ اور یہ غفلت جانتے بوجھتے کرتا ہو۔ مگر نماز اور نمازی کا احترام کرتا ہو۔ نہ محتقر ہو نہ منکر۔ اسی کے بارے میں سوال ہے زید کا یہ کہنا۔ کہ بے نمازی کافر ہے۔ قطعاً غلط۔ اور جہالت کا فتویٰ بذاتِ خود گناہِ کبیرہ ہے۔ چنانچہ جامع الصغیر للسیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۶۶ پر ایک حدیث مبارکہ باین الفاظ مروی ہے:- عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ- مَنْ اَفْتٰی بِغَیْرِ عِلْمٍ لَعَنَتْہُ مَلٰئِکَۃُ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ رَوَاہُ ابْنُ عَسَاکِرَ- ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ ۔ (ترجمہ):- حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ کہ جو شخص بغیر علم فتوےٰ دے۔ اُس پر آسمان و زمین کے فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ صورتِ مسئولہ میں بکر کا قول بالکل درست ہے۔ قانونِ شرعی کے مطابق تارکِ نماز گنہگار، فاسق فاجر ہے۔ صرف حنفی مسلک میں ہی نہیں۔ بلکہ ائمہ اربعہ کے نزدیک بے نمازی قابلِ تعزیر و قابلِ سزا، شرعی علمِ شرعی گنہگار مجرم ہے۔ بے نمازی کے کفر کا کوئی مسلمان قائل نہیں۔ زید نے کفرِ تارک الصلوٰۃ کا جو مسلک پیش کیا۔ وہ سب سے پہلے خارجیوں نے بنایا۔ خارجیوں سے موجودہ زمانے کے وہابیوں نے یہ مسلک اختیار کیا۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ موجودہ وہابی ہی خارجی ہیں۔ صرف مرورِ زمانہ سے نام بدل گیا۔ پہلے جن عقیدوں کا نام خارجیت تھا اب اُن کا نام وہابیت ہے۔ چنانچہ فتاوٰی شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۳۲۲ پر ہے:- اَتْبَاعُ عَبْدِ الْوَھَّابِ الْخَوَارِجُ فِیْ زَمَانِنَا ۔ (ترجمہ):- عبد الوہاب نجدی کو ماننے والے سب خارجی لوگ ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جو عقائد کردار اُن کے تھے۔ اِن کے بھی وہی ہیں۔ پہلے خوارج کا عقیدہ تھا۔ کہ اولیاء اللہ سے بعد وفات مدد مانگنا شرک ہے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۹۰ پر ہے

فَلَیْسَ فِی الْاٰیَۃِ دَلِیْلٌ عَلٰی مَا زَعَمَہُ الْخَوَارِجُ مِنْ اَنَّ الطَّلَبَ مِنَ الْغَیْرِ حَیًّا اَوْ مَیِّتًا فَاِنَّہٗ جَعْلٌ مُرْتَکِبٌ لِاَنَّ سُوَالَ الْغَیْرِ مِنْ حَیْثُ اَجْرَاءَ اللّٰہُ النَّفْعَ اَوِ الضَّرَّ عَلٰی یَدِہٖ قَدْ یَکُوْنُ وَاجِبًا لِاَنَّہٗ مِنَ التَّمَسُّکِ بِالْاَسْبَابِ۔ وَلَا یُنْکِرُ الْاَسْبَابَ اِلَّا جَحُوْدًا اَوْ جَھُوْلًا ؎ (ترجمہ): ۔ خارجیوں کا عقیدہ ہے۔ کہ کسی زندہ یا وفات شدہ ولی اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے۔ پس یہ عقیدہ بالکل جہالت ہے۔ کیونکہ غیر اللہ سے مدد مانگنا اس نظریہ پر کہ اصل دینے والا رب تعالیٰ ہے یہ اولیاء اللہ اس کے اسباب ہیں اور ان سے مانگنا سبب کو پکڑنا ہے۔ اس استمداد کا منکر صرف ضدی اور جاہل ہی ہوگا۔ بالکل یہی شرکیہ عقیدہ اب وہابیوں کا ہے۔ اسی طرح پہلے سب خارجی لوگ بھی یہی کہتے تھے کہ بے نمازی بلکہ ہر گناہ گار کافر ہے۔ چنانچہ شرح عقائد صفحہ نمبر ۸۵ پر ہے :۔ وَاحْتَجَّتِ الْخَوَارِجُ عَلٰی اَنَّ مُرْتَکِبَ الْمَعْصِیَۃِ کَافِرٌ (ترجمہ) خارجیوں نے اس بات پر حجت کی ہے۔ کہ گناہوں کا مرتکب کافر ہے۔ اسی لیے ہمارے علاقے کے وہابیوں نے ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام ہے "حُکْمُ التَّارِکِ فِیْ مَنْ لَّا یُصَلِّیْ" اس میں تمام جگہ یہی لکھا ہے کہ بے نمازی کافر ہے۔ اور آیتوں، حدیثوں کے غلط مطلب کرکے اپنا کمزور عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش کی ہے اسی طرح غیر مقلد مولوی محمد علی جانباز لائلپوری نے اپنی کتاب اہمیت نماز کے تقریباً تمام صفحات پر اسی عقیدے پر زور دیا ہے۔ کہ بے نمازی کافر ہے حالانکہ مسلمان کو کافر کہنا خود کفر کا ذریعہ ہے جیسا کہ کتب فقہ میں تصریح ہے شرعی تحقیقی مسئلہ یہ ہے۔ کہ بے نمازی کافر ہرگز نہیں ہے۔ کسی مسلمان کا اس میں اختلاف نہیں ہاں البتہ معتزلی اور خارجی جو پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے اور آج کل دونوں کی تائید و فرقے واری دیوبندی وھابی فرقے پر ہے۔ ان سابقین نے اس مسئلے سے اختلاف کرتے ہوئے مسلمانوں سے علیحدہ راہ نکال لی۔ کہ معتزلیوں نے کہا۔ بے نمازی وغیرہ گنہگار نہ مسلمان رہتا ہے نہ کافر بنتا ہے۔ خارجیوں نے کہا۔ کہ ہر گنہگار کافر ہو جاتا ہے۔ لیکن اہلسنت مسلمان کے مسلک میں بے نماز وغیرہ لوگ صرف فاسق ہوتے ہیں۔ فسق اور گناہ سے انسان کافر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شرح عقائد صفحہ نمبر ۸۳ پر ہے :۔ اِنَّ مُرْتَکِبَ الْکَبِیْرَۃِ فَاسِقٌ اِخْتَلَفُوْا فِیْ اَنَّہٗ مُؤْمِنٌ وَھُوَ مَذْھَبُ اَھْلِ السُّنَّۃِ وَالْجَمَاعَۃِ اَوْ کَافِرٌ وَھُوَ قَوْلُ الْخَوَارِجِ اَوْ مُنَافِقٌ وَھُوَ قَوْلُ الْحَسَنِ الْبَصْرِیِّ ؎ (ترجمہ) :۔ متفقہ حکم یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کرنے والا فاسق ہے۔ لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس مسئلے میں نمبر ۱ :۔ ایک قول ہے کہ مومن رہتا ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے نمبر ۲ :۔ دوسرا قول یہ ہے۔ کہ وہ کافر ہے خارجی کہتے ہیں۔ نمبر ۳ :۔ ایک قول ہے۔ کہ وہ منافق ہے۔ یہ حسن بصری کا مسلک ہے۔ یہاں منافق سے مراد منافق حکمی ہے نہ کہ شرعی۔ جیسے کہ حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ وعدہ خلاف اور خائن۔ اور جھوٹا شخص منافق ہے۔

اس سے مراد حکمی منافق ہے۔ نہ کہ شرعی۔ اسی طرح حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک بھی منافق حکمی مراد ہے۔ جس کو منافق عملی کہا جاتا ہے۔ قانونِ شریعت کے مطابق عملی منافق مسلمان ہی رہتا ہے۔ چنانچہ نبراس علی شرح عقائد صفحہ نمبر ۳۵۵ پر ہے:۔ وَنِفَاقٌ فِی الْعَمَلِ هُوَ تَرْكُ الطَّاعَةِ وَلَيْسَ هٰذَا بِكُفْرٍ وَهُوَ مُرَادُ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ وَهٰذَا الْاِصْطِلَاحُ اَيْضًا اھ (ترجمہ):۔ عبادت کو جان بوجھ کر سستی کاہلی سے چھوڑنا عملی منافقت ہے۔ یہ کفر نہیں۔ اور لفظِ منافق سے حسن بصری کی یہی مراد ہے بے نمازی فُسّاق کے متعلق معتزلیوں کا مذہب یہ ہے۔ کہ وہ نہ مومن ہے اور نہ کافر چنانچہ نبراس صفحہ ۳۵۱ پر ہے:۔ اِنَّ الْكَبِيْرَةَ الَّتِیْ هِیَ غَيْرُ الْكُفْرِ لَا تُخْرِجُ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ مِنَ الْاِيْمَانِ لِبَقَاءِ التَّصْدِيْقِ الَّذِیْ هُوَ حَقِيْقَةُ الْاِيْمَانِ خِلَافًا لِلْمُعْتَزِلَةِ حَيْثُ زَعَمُوْا اَنَّ مُرْتَكِبَ الْكَبِيْرَةِ لَيْسَ مُؤْمِنٌ وَّلَا كَافِرٌ اھ (ترجمہ):۔ کبیرہ گناہ وہ ہے۔ جو کفر نہیں ہوتا۔ اس کا مرتکب بندۂ مومن ایمان سے نہیں نکلتا۔ کیونکہ تصدیق قلبی۔ جو حقیقت ایمان ہے۔ وہ موجود ہے۔ بخلاف معتزلہ فرقے باطلہ کے کہ اُن کے نزدیک گناہ کبیرہ کرنے والا نہ مومن ہے اور نہ کافر۔ یہ تھے باطل عقیدے جو خارجیوں معتزلیوں سے دیوبندیوں، وہابیوں نے اپنائے۔ خیال رہے۔ کہ وہابیوں کے عقائد مسلمانوں سے بہت کم متفق ہیں۔ اُن کے کچھ عقیدے معتزلیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور اکثریت میں خوارج کے نقش قدم پر ہیں۔ تمام مسلمانوں کے نزدیک خواہ شافعی ہو یا مالکی، حنبلی ہو یا حنفی۔ بے نمازی کافر نہیں۔ بلکہ بدترین فاسق فاجر ہے۔ اس کی سزا بھی فقہاءِ کرام نے سخت ترین بیان فرمائی۔ چنانچہ فتاویٰ تنویر الابصار جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۲۲ پر ہے:۔ وَتَارِكُهَا عَمْدًا مَجَانَةً اَیْ تَكَاسُلًا فَاسِقٌ۔ يُحْبَسُ حَتّٰى يُصَلِّیَ وَقِيْلَ يُضْرَبُ حَتّٰى يَسِيْلَ مِنْهُ الدَّمُ اھ (ترجمہ):۔ حنفی مسلک یہ ہے۔ کہ جان بوجھ کر سستی کرنے والا نماز کو چھوڑنے والا فاسق ہے۔ اس کو قید کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ نماز پڑھے۔ اور بعض نے فرمایا کہ بے نمازی کو اتنا مارا جائے۔ کہ اُس کا خون نکل آئے۔ فتاویٰ شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۲۲ پر ہے:۔ وَعِنْدَ الشَّافِعِیِّ يُقْتَلُ وَكَذَا عِنْدَ مَالِكٍ وَّاَحْمَدَ اھ (ترجمہ):۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک بے نمازی کو قتل کیا جائے گا۔ یہی مذہب امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کا ہے:۔ (غنیۃ الطالبین عربی مطبوعہ ریفیق عام ۱۲۹۷ھ) جس کے متعلق مشہور ہے۔ کہ حضور غوث پاک کی تصنیف ہے۔ اگرچہ صاحب نبراس نے صفحہ نمبر ۵۷۴ پر لکھا ہے۔ غُنْيَةُ الطَّالِبِيْنَ الْمَنْسُوْبَةُ اِلَی الْغَوْثِ الْاَعْظَمِ عَبْدِ الْقَادِرِ قُدِّسَ سِرُّهُ الْعَزِيْزُ۔ فَالنِّسْبَةُ غَيْرُ صَحِيْحَةٍ وَّالْاَحَادِيْثُ الْمَوْضُوْعَةُ فِيْهَا وَافِرَةٌ اھ (ترجمہ):۔ وہ غنیہ طالبین جو غوث اعظم عبد القادر جیلانی قُدِّسَ سِرُّہٗ کی طرف منسوب ہے۔ پس نسبت غلط ہے۔ اور اس کتاب میں بے شمار بناوٹی روائتیں ہیں۔ اسی طرح نبراس کے حاشیہ

نمبر ۷ پر ہے :- وَیَشْھَدُ قَوْلُ الشَّیْخِ عَبْدِ الْحَقِّ مُحَدِّثْ دِھْلَوِیْ فِیْ مَدَارِجْ (ترجمہ) فارسی :- ہرگز ثابت نشد کہ ایں از تصنیف آں جناب است اگرچہ انتساب بآنحضرت شہرت دارد (ترجمہ) :- نیز اس کے قول کے حق میں مدارج النبوت کی فارسی عبارت جو شیخ عبد الحق محدث کی تصنیف ہے گواہی دیتی ہے لکھا ہے کہ ہرگز ثابت نہیں ہوا۔ کہ یہ غنیۃ الطالبین آن کی جناب کی تصنیف ہے۔ اگرچہ آنحضرت کی طرف نسبت ہی مشہور ہو چکی ہے۔ اسی غنیۃ الطالبین کے صفحہ نمبر ۳۲۳ پر لکھا ہے :- فَتَارِکُ الصَّلٰوۃِ یَکْفُرُ عِنْدَ اِمَامِنَا اَحْمَدَ رَحِمَہُ اللّٰہُ اِذَا تَرَکَھَا جَاحِدًا لِوُجُوْبِھَا وَجَبَ قَتْلُہٗ لَاخِلَافَ فِیْ مَذْھَبِہٖ وَاَمَّا اِنْ تَرَکَھَا تَھَاوُنًا وَکَسْلًا مَعَ اِعْتِقَادِ وُجُوْبِھَا (الخ) وَعَنْہُ لَا یَجِبُ قَتْلُہٗ فِی التَّھَاوُنِ حَتّٰی یَتْرُکَ ثَلٰثَ صَلَوَاتٍ وَیَضَایِقُ وَقْتُ الرَّابِعَۃِ وَیُقْتَلُ حَدًّا کَالزَّانِیْ وَحُکْمُہٗ حُکْمُ اَمْوَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ ؕ (ترجمہ) ہمارے امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک بے نمازی اس وقت کافر ہو گا۔ جب فرضیتِ نماز کا انکار بھی کرتا ہو لیکن اگر سستی اور غفلت سے نماز نہ پڑھتا ہو۔ تو امام احمد سے روایت ہے۔ کہ ایک یا دو نمازوں کی غفلت سے قتل نہ کیا جائے۔ ہاں اگر تین چار نمازیں رہ جائیں۔ اور وہ پرواہ نہ کرے۔ تو زانی کی حد کی طرح قتل کر دو قتل کے بعد اس کا حکم مسلمانوں کی طرح ہو گا۔ غنیہ کی اس عبارت سے ثابت ہو گیا۔ کہ امام احمد بن حنبل کا مسلک بے نمازی کے بارے یہ رہا ہے۔ کہ مسلمان ہی رہتا ہے۔ اگرچہ بدترین فاسق مثل زانی کے ہے۔ غنیہ طالبین کی دیگر عبارات جو کفر کی طرف راغب۔ وہ مصنف کی اپنی ہیں امام احمد کا اپنا مسلک یہی ثابت ہوا کہ تارکِ صلوٰۃ کافر نہیں۔ ان تمام عبارات واقوال سے یہی ثابت ہوا۔ کہ بے نمازی کافر نہیں۔ زید مسلکاً وہابی معلوم ہوتا ہے وہابی اور خارجی لوگوں کو اپنے اس مسلکِ باطلہ پر جو دلائل میسر آئے۔ وہ کل مع جوابات مندرجہ ذیل ہیں وہابیوں کی دلیل نمبر ۱ نسائی شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۸۱ پر ہے :- عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ بُرَیْدَۃَ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْعَھْدُ الَّذِیْ بَیْنَنَا وَبَیْنَھُمُ الصَّلٰوۃُ فَمَنْ تَرَکَھَا فَقَدْ کَفَرَ ؕ (ترجمہ) :- عبد اللہ بن بریدہ اپنے والد سے راوی ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ وہ عہد جو ہمارے درمیان اور کافروں کے درمیان ہے۔ وہ نماز ہے۔ پس وہ شخص جس نے نماز کو چھوڑ دیا۔ وہ کافر ہے۔ اس روایت سے ثابت ہوا کہ بے نمازی کافر ہے :-

تردیدی جواب :- خیال رہے۔ کہ آقائے دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قانونی اقوالِ طیبہ تین قسم کے ہیں۔

۱ :- حکم ؕ ۲ وعید یا توبیخ ؕ ۳ :- علامت ؕ

یعنی کسی جگہ قولِ مبارک حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ جس سے وہ مخاطب مجرم حقیقی اور یقینی طور پر اُس حکم کے درجے میں آجاتا ہے۔ اور کبھی قولِ جلالی سے صرف جھڑکنا مقصود ہوتا ہے اصل حکم جاری نہیں ہوتا۔ اور کبھی فقط نشانی مقصود ہوتا ہے:۔ مثالِ اول:۔ عام اصطلاح میں جیسے کوئی حاکم کہے۔ کہ اگر کسی شخص نے کسی کو قتل کیا۔ تو قاتل کو مار ڈالوں گا۔ یہاں حکم مراد ہے۔ اور واقعی وہ جان سے مار ڈالا جائے گا۔ مثال ۲ دوم:۔ وہی حاکم اپنے بیٹے سے کہے۔ کہ اگر تو نے یہ شرارت کی یا پڑھنے نہ گیا۔ تو جان سے مار ڈالوں گا۔ یہاں جھڑک مراد ہے۔ نہ کہ حکم۔ پھر وہ ہی حاکم اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ اگر تم نے تعلیم حاصل نہ کی۔ تو گدھے کے گدھے ہی رہو گے۔ یہاں نشان اور علامت مراد ہے۔ نہ حکم نہ وعید۔ یعنی گدھوں جیسے بیوقوفی کی نشانی پائی جائے گی۔ پس سمجھ لو۔ کہ خوارج کی پیش کردہ حدیث میں فقط جھڑک مراد ہے۔ نہ حکم مراد ہو سکتا ہے نہ نشان۔ اس کی چار وجہ ہیں:۔

پہلی ۱ :۔ یہ کہ روشِ کلام بتا رہی ہے۔ کہ یہ جھڑک ہے۔ کیونکہ پہلے ارشاد ہوا:۔ اَلْعَھْدُ الَّذِیْ یہاں عہد سے مراد فرق ہے۔ اور مقصدِ کلام یہ ہے۔ کہ اے نو مسلمو! غور سے سن لو۔ کہ ہمارے اور کافروں کے درمیان سب سے زیادہ واضح فرق نماز ہے۔ پس جس نے نماز نہ پڑھی۔ گویا وہ کافر ہے۔ مسلمان ہوا ہی نہیں:۔ دوسری وجہ:۔ یہ ہے۔ کہ اس روایت صحیحہ کا آخری جملہ ہے:۔ فَقَدْ کَفَرَ یہ صیغہ ماضی مطلق ہے۔ جو زمانۂ گزشتہ کو ثابت کرتا ہے۔ وہابی استدلال کی بنا پر اس کا ترجمہ کرنا پڑے گا:۔ فَقَدْ کَفَرَ وہ کافر ہو گیا۔ حالانکہ یہ ترجمہ نحوی اعتبار سے قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ کَفَرَ۔ صَارَ کے معنیٰ میں نہیں ہو سکتا اگر خارجیوں اور وہابیوں کی بات درست ہوتی۔ تو یہاں فَقَدْ کَفَرَ نہ ہوتا۔ بلکہ اس طرح ارشاد ہوتا فَمَنْ تَرَکَھَا فَقَدْ اِرْتَدَّ (ترجمہ):۔ پس جس نے نماز کو چھوڑ دیا۔ وہ مرتد ہو گیا یا ہوتا یَکْفُرُ بصیغۂ مستقبل۔ یعنی نماز چھوڑنے والا کافر ہو جائے گا۔ بہر صورت قَدْ کَفَرَ نہ ہوتا قرآن کریم میں بھی جہاں کہیں لَقَدْ کَفَرَ وغیرہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً آیت نمبر ۱:۔ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمَانُ (الخ) آیت نمبر ۲:۔ لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا آیت نمبر ۳:۔ مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖ اس قسم کی تقریباً اٹھارہ آیات قرآنِ کریم میں ارشاد ہیں۔ یہاں سب جگہ کَفَرَ ماضی ہی مراد ہے۔ کفرِ ابتداد کے لیے یا تو اِرْتَدَّ ارشاد ہوتا ہے۔ یا فعل مضارع۔ فقہاءِ کرام بھی ارتداد کے لیے یَکْفُرُ وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ پس ثابت ہوا۔ کہ مخالف کی پیش کردہ عبارت حدیث پاک میں فَقَدْ کَفَرَ سے محض جھڑک مراد ہے۔ بعض مترجمین نے اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ والی آیت میں بھی کَانَ کو صَارَ کے معنیٰ میں بطورِ احتیاط نہ لیا۔ اور یہی ترجمہ کیا تھا۔ وہ کافروں میں سے اگرچہ اس احتیاط کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ کَانَ بمعنیٰ صَارَ ہو سکتا ہے۔ مگر کَفَرَ بمعنیٰ صَارَ

نہیں ہو سکتا کیونکہ فعل، نام ہے پس کفر بمعنی صادر کسی قاعدے سے نہیں ہو سکتا۔ تیسری وجہ:۔ جس کو تائید بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی حدیث کی شرح میں حضرت علامہ حافظ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ الباری نے نسائی شریف صفحہ نمبر ص۱۰۸ پر فرمایا هُوَ تَوْبِيخٌ لِتَارِكِ الصَّلٰوةِ وَتَحْذِيرٌ لَّهٗ مِنْ كُفْرٍ اَیْ سَيُؤَدِّيهِ ذَالِكَ اِلَيْهِ اِذَا تَهَاوَنَ بِالصَّلٰوةِ ط (ترجمہ):۔ یہ حدیث پاک بے نمازی کو جھڑک ہے۔ اور کفر سے ڈرانا مقصود ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو۔ کہ یہ نمازوں سے غفلت یہاں تک بڑھے۔ کہ بے نمازی سرکش ہو کر کفر تک جا پہنچے۔ خیال رہے کہ سرکشی اور تکبر نماز ہی توڑتی ہے :۔ چوتھی وجہ:۔ اس بات کی کہ اس حدیث پاک سے وہابی کفر پر استدلال غلط ہے یہ ہے کہ کسی محدث، محقق، مفسر، شارح نے اس حدیث سے کفر کا حکم ثابت نہ کیا۔ نہ کسی عالم نے بے نمازی کو کافر کہا۔ امام سندھی کا حضرتِ جان نثارِ اسلام امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالٰی عنہ کی طرف کفرِ تارکِ صلوٰۃ کی نسبت کرنا نادانی ہے۔ جیسا کہ غنیۃ الطالبین و شامی کی عبارت سے پہلے مندرجہ بالا ثابت کر دیا گیا۔ یہ تھا وہابی دلیل کا محققانہ جواب :۔ خوارج اور وہابیوں کی دوسری دلیل نسائی شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ص۸۱ پر ہے :۔ اَخْبَرَنَا اَحْمَدُ بْنُ حَرْبٍ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ رَبِيْعَةَ عَنْ اِبْنِ جُرَيْجٍ عَنْ اَبِي الزُّبَيْرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ اِلَّا تَرْكُ الصَّلٰوةِ ط (ترجمہ) خبر دی ہم کو احمد بن حرب نے انہوں نے کہا۔ کہ حدیث بیان کی ہم سے محمد بن ربیعہ نے وہ راوی جریج سے وہ ابو زبیر سے وہ حضرت جابر سے راوی۔ فرمایا انہوں نے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے۔ نہیں ہے بندے اور کفر کے درمیان مگر ترکِ نماز۔ اس روایت سے بھی ثابت ہوا۔ کہ بے نمازی کافر ہے :۔ جواب :۔ اس دلیل کی تردید میں دو جواب ہیں :۔ پہلا یہ کہ یہ روایت صحیح نہیں بلکہ اس میں ضعف کا شائبہ ہے۔ اس لیے کہ اس کی سند میں احمد بن حرب ہے اور محدثین کے نزدیک احمد بن حرب، صدوق عاشر ہیں۔ چنانچہ تقریب التہذیب لابن حجر عسقلانی صفحہ نمبر ص۱۲ پر ہے :۔ اَحْمَدُ بْنُ حَرْبِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ حَيَّانِ بْنِ مَازِنِ الطَّائِيِّ الْمُوْصِلِيِّ صَدُوْقٌ مِّنَ الْعَاشِرِ ط ترجمہ :۔ احمد بن حرب۔ محمد بن علی کے پوتے اور حیان بن مازن کے پڑپوتے قبیلہ بنی طے کے سکونت موصل راویان کے دسویں طبقے سے ہیں۔ اور صدوق یا صدوقِ عاشر کے متعلق ابن حجر صفحہ نمبر ص۲ اور صفحہ نمبر ص۱ پر فرماتے ہیں :۔ وَاِلَيْهِ الْاِشَارَةُ بِصَدُوْقٍ سَيِّئِ الْحِفْظِ اَوْ صَدُوْقٍ يَهِمُ اَوْ لَهٗ اَوْهَامٌ اَوْ يُخْطِئُ اَوْ تَغَيَّرَ بِاٰخِرِهٖ وَيَلْتَحِقُ بِذَالِكَ مَنْ رُمِيَ بِنَوْعٍ مِّنَ الْبِدْعَةِ كَالتَّشَيُّعِ وَالْقَدْرِ وَالْعَاشِرَةُ مَنْ لَّمْ يُوَثَّقْ اَلْبَتَّةَ وَضُعِّفَ مَعَ ذَالِكَ ط (ترجمہ):۔ اس طبقے کے راوی کو صدوق کہا جاتا ہے۔ کمزور حافظے کے ہوتے ہیں یا ایسے راوی کو صدوق کہا جاتا ہے۔ کہ اکثر زمانے میں ان پر بہت سے وہم کیے جاتے رہے یا غلطیاں

ان کی طرف منسوب ہیں۔ یا آخر زمانے میں اُن کے حالات متغیر ہو گئے۔ اور ان پر بدعت وغیرہ کی تہمتیں لگتی رہیں، اور دسواں طبقے کے لوگ وہ ہیں جن پر یقینی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ضعیف بھی ہیں۔ اس حدیث کے دوسرے راوی محمد بن ربیعہ کلابی نویں طبقے کے صدوق ہیں۔ اس لیئے یہ مجہول فی الحدیث ہیں۔ دیکھو تقریب التہذیب صفحہ نمبر ۱۰ اور صفحہ نمبر ۲۹۷ پر ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ بلحاظ سند یہ روایت ضعیف ہے۔ لہٰذا کفر جیسا حکم ثابت نہیں ہو سکتا :۔ دوسرا جواب :۔ یہ ہے تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت اور واضح ہے۔ کہ مسلمانوں کو اشد لازم ہے اپنے افعال و کردار میں اور شکل و صورت میں ایسی روش اختیار کریں جس سے حق پرست مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان امتیازی نشان پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہر دور میں حق پرست مسلمان علماء، صوفیاء، ایسی صورتیں بتاتے رہے۔ جس سے مسلم، اور غیر مسلم اور حق و باطل میں تفریقی نشانات ظاہر رہے۔ اس لیئے کہ ہر قوم کا نشان لازم شدیدہ ہے۔ بغیر نشانِ قوم۔ قوم نہیں رہتی۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ ضروریاتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف ضروریات میں مختلف نشانات قائم کیئے جاتے رہے۔ چنانچہ قرنِ اوّل میں مسلم کے مقابل صرف کفر تھا۔ اس لیئے آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ پنجوقتہ کو اسلام کا نشانِ اعظم قرار دیا۔ اور واضح الفاظ سے بیان فرمایا :۔ لَیْسَ بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ اِلَّا تَرْکُ الصَّلٰوۃِ (لَیْسَ تامہ) کا فاعل لفظِ فرق پوشیدہ ہے۔ اور ترجمہ اس طرح ہے۔ کہ نہیں ہے فرق بندے اور کفر کے درمیان مگر ترکِ نماز۔ اُس وقت کے لیئے یہی ایک نشانِ مسلم کافی تھا۔ کہ دنیا میں یا کفر تھا۔ یا اسلام۔ پھر ایسا دور آیا۔ کہ کفر ہی کی سیاسی شرارت سے اسلام میں بہت سے باطل فرقے پیدا ہو گئے۔ پس مخلصین کو اپنا اور بھی نشان قائم کرنا پڑا۔ تاکہ سچ جھوٹ اور مخلص اور مکار، متصلّب و متعصب میں فرق واضح رہے۔ یہ نشانات بھی مختلف ادوار میں بنسبت باطل بدلتے رہے۔ چنانچہ آج کل حق پرستوں کی مساجد میں قبل اذان یا فوراً بعدِ اذان درود پاک کا ورد۔ بروز جمعہ صلوٰۃ وسلام پڑھنا۔ محراب مسجد پر یَا اَللّٰہُ جَلَّ جَلَالُہٗ، یَا مُحَمَّدُ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لکھنا۔ محفل گیارھویں، جلوس عیدِ میلادِ النبی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ یہ سب کچھ اہل سنت مسلمانوں کے نشاناتِ اسلامی ہیں۔ اگر کوئی اہل سنت والجماعت مسلمان یہ کام نہ کرے۔ تو اس کی سنیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح قرنِ اوّل میں ترکِ نماز مسلمانوں کا نشانِ اسلامی تھا۔ کہ اگر اُس وقت کوئی نماز نہ پڑھتا۔ تو اس کا اسلام مشکوک ہو جاتا تھا۔ بلکہ آج کل بھی کفرستان میں نماز نشانِ امتیاز ہے شہر کا امتیازی نشان بلند اذانیں اور محلّے کا امتیازی نشان مسجدیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان پاکستانیوں سے زیادہ نمازی متقی ہیں۔ خدا کرے۔ ہم پاکستانی بھی سچے مسلمان بن جائیں امتیازی نشان کو چھوڑنا قومی اور جماعتی جرم تو ہو

سکتا ہے۔ مگر اس سے کفر لازم نہیں آسکتا۔ لہٰذا ثابت ہوا۔ کہ اس روایت سے بھی بے نمازی کا کفر ثابت نہ ہوا۔ اور ثابت یہ ہوا۔ کہ یہ لفظ نشان بنا یا گیا۔ گویا کہ فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے مسلمانو! یاد رکھو۔ کہ کافر مومن میں تفریقی نشان نماز ہے۔ یعنی نماز پڑھنے والا مسلمان ہی ہوتا ہے۔ اور کافر نماز کے قریب بھی نہیں جاتا۔ ہمارے ان علاقوں میں پہلے داڑھی سے مسلمان کی پہنچان ہوتی تھی تو جس طرح داڑھی منڈانا اس وقت نشان کفر تھا اسی طرح اب نماز چھوڑنا صرف علامت کفر ہے نہ کہ کفر اب روایت بالکل واضح ہوگئی کہ نہ اس سے حکم کفر ثابت نہ وعید کفر۔ بلکہ صرف نشان۔ اور نشان سے حکم جاری نہیں ہو سکتا۔ جیسے کہ کوئی پولیس کی وردی پہن کر سپاہی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ باقاعدہ ملازمت نہ اختیار کرے۔ ایسے ہی کوئی مسلمان نماز نہ پڑھ کر کافر کا درجہ نہیں لے سکتا۔ خارجیوں اور وہابیوں کی تیسری دلیل۔ مسلم شریف جلد اول صفحہ نمبر ۶۱ پر ہے۔ عَنْ اَبِیْ سُفْیَانَ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرًا یَقُوْلُ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوۃِ ط (ترجمہ) :۔ ابو سفیان تابعی نے فرمایا۔ کہ میں نے حضرت جابر صحابی سے سنا۔ وہ جابر فرماتے ہیں۔ کہ میں نے آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ بے شک مرد کے درمیان اور شرک وکفر کے درمیان ترکِ نماز ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ بے نمازی کافر ہے۔ **جواب** :۔ یہ حدیث اسناداً صحیح متصل ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ یہ روایت مسلم شریف میں اسی جگہ دو سندوں سے مروی ہے۔ پہلی سند اس طرح ہے یحییٰ بن یحییٰ تمیمی وعثمان بن شیبہ کلاھما عَنْ اعمش عن ابی سفیان عن جابر (الخ) :۔ اَبُوْ غَسَّانِ مُسْمِعِیْ عَنْ ضَحَّاكِ بْنِ مَخْلَدٍ عَنْ اِبْنِ جُرَیْجٍ عَنْ اَبِی الزُّبَیْرِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ ط (الخ) یہ حدیثِ مطہرہ بھی خوارج کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اس لیئے کہ اس میں لفظِ شرک بتا رہا ہے۔ ترکِ صلوٰۃ بطورِ نشان فرمایا جا رہا ہے یعنی مشرک اور کافر کی نشانی یہ ہے۔ کہ وہ نماز نہیں پڑھتے۔ لیکن مردِ مومن کی نشانی ہے۔ نماز پڑھنا۔ تو اے مسلمانو تم اپنی نشانی نہ چھوڑنا۔ ورنہ امتیاز باقی نہ رہے گا۔ اگر مخالف کا بیان کردہ مطلب لیا جائے۔ تو بے نمازی کو مشرک بھی ماننا پڑے گا۔ حالانکہ اس کا خود مخالف بھی قائل نہیں۔ نہ ہی نقلاً و عقلاً درست ہے۔ کیونکہ کفر و شرک میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے وہابی کی چوتھی دلیل :۔ حدیث پاک میں آتا ہے :۔ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جِهَارًا ط (ترجمہ) :۔ جس نے نماز جان بوجھ کر چھوڑی۔ بے شک وہ کافر ہو گیا (از جامع صغیر للسیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۶۸ پر ہے :۔ رَوَاهُ الطَّبْرَانِیْ عَنْ اَنَسٍ فِی الْاَوْسَطِ حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ ط (ترجمہ) :۔ جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی۔ تو ظاہر ظہور کافر ہو گیا۔ اس صحیح حدیث کو جامع صغیر نے طبرانی اوسط سے لیا۔ وہ حضرتِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی۔ اس روایت سے بھی ثابت ہوا۔ کہ بے نمازی کافر ہے۔ **جواب** :۔ یہ حدیث بھی مخالفین کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اس لیئے کہ یہاں

بھی فَقَدْ کَفَرَ ہے بصیغہ ماضی مطلق معروف۔ لہٰذا نہ کفر ماضی بن سکتا ہے نہ کفر ارتدادی۔ کیونکہ کفر ماضی محال بالذات ہے۔ اور کفر ارتدادی بدیں وجہ منع ہے۔ کہ کَفَرَ۔ فعل ماضی کے معنیٰ میں نہیں آیا کرتا جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا۔ بلکہ یہ حدیث بھی جھڑک اور توبیخ بیان کرتی ہے۔ اور اس کا صحیح قانونی ترجمہ یہ ہے۔ کہ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کی کثیر نعمتوں کی ناشکری کی جن میں خود اس کا جسم ظاہری بھی شامل ہے۔ کہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ نبراس صفحہ نمبر ۲۵۸ پر ہے:۔ فَاِنَّہٗ کُفْرَانُ النِّعْمَۃِ لَامُقَابِلُ الْاِیْمَانِ ط (ترجمہ):۔ فَقَدْ کَفَرَ کا مقصد ناشکری ہے۔ نہ کہ شرعی کفر جو ایمان کا مقابل ہے۔

قرآنِ کریم میں بہت جگہ کفر بمعنیٰ ناشکری ہے۔ چنانچہ آیت پہلی ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وَاشْکُرُوْلِیْ وَلَاتَکْفُرُوْنِ ط (ترجمہ):۔ اے بندو میرا شکر کرو۔ اور میرا کفر نہ کرو یعنی ناشکری نہ کرو۔ دوسری آیت کریمہ:۔ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ط (ترجمہ) اور وہ شخص جس نے شکر کیا۔ تو اپنے لیے کیا۔ اور جس نے ناشکری کی تو بے شک میرا رب غنی کریم ہے۔ ان جیسی آیات میں کفر بمعنیٰ ناشکری ہے۔ نہ کہ شرعی کفر۔ وہابیوں اور خارجیوں کی پانچویں دلیل:۔ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۵۹ پر ہے:۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ ذَکَرَ الصَّلٰوۃَ یَوْمًا فَقَالَ مَنْ حَافَظَ عَلَیْہَا کَانَتْ لَہٗ نُوْرًا وَّبُرْھَانًا وَّنَجَاۃً یَّوْمَ الْقِیَامَۃِ وَمَنْ لَّمْ یُحَافِظْ عَلَیْہَا لَمْ تَکُنْ لَّہٗ نُوْرًا وَّلَا بُرْھَانًا وَّلَا نَجَاۃً وَّکَانَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مَعَ قَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَھَامَانَ وَاُبَیِّ بْنِ خَلَفٍ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ ط (ترجمہ) عبداللہ بن عمرو بن عاص آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ کہ آپ نے ایک دن نماز کا تذکرہ فرمایا۔ تو ارشاد فرمایا۔ کہ جو شخص نمازوں پر حفاظت کرے۔ قیامت کے دن نماز اُس کے لیے نور اور برھان اور نجات کا ذریعہ ہوگی۔ اور جو شخص نماز پر حفاظت نہ کرے۔ قیامت کے دن نماز اس کے لیے نہ نور ہوگی نہ برھان نہ نجات۔ اور قیامت کے دن وہ قارون اور فرعون اور ہامان اور ابی ابن خلف کے ساتھ ہوگا۔ اس روایت سے ثابت ہوا۔ کہ بے نمازی کافر ہے۔ جواب:۔ اس حدیث پاک سے کفر پر استدلال کرنا کمال حماقت ہے۔ یہ حدیث پاک بھی دیگر مذکورہ احادیث کی طرح وعید ہی آئی ہے کفر بے نمازی ہرگز ثابت نہیں ہوتا تین وجہ سے۔ پہلی وجہ:۔ یہ کہ خوارج کا دعویٰ ہے۔ ترک نماز کفر ہے۔ مگر یہاں غیر حفاظت یعنی بے احتیاطی کا ذکر ہے۔ نماز بالکل نہ پڑھنے اور حفاظت نہ کرنے میں بڑا فرق ہے ٭ دوسری وجہ:۔ اِس حدیث پاک میں قارون و فرعون وغیرہ کی ہمراہی کا ذکر ہے۔ اور فقط ہمراہی سے کفر ثابت نہیں ہوسکتا۔ حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ نیک تاجر کل قیامت میں نبیوں

کے ساتھ ہوگا۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد اوّل صفحہ ۱۴۵ پر ہے:۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ ط ترجمہ حضرت ابی سعید سے روایت ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں۔ آقائے کائنات رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا آپ نے کہ سچا امانت دار تاجر انبیاء، صدیقین، شہداء کے ساتھ ہوگا۔ کیا کوئی پاگل کہہ سکتا ہے کہ سچا تاجر نبی ہو جاتا ہے۔ (معاذ اللہ) ہرگز نہیں۔ پس اسی طرح یہاں بھی صرف ہمراہی مراد ہے ٭ تیسری وجہ:۔ یہ کہ ہمراہی صرف میدانِ قیامت میں ہوگی۔ نہ کہ جہنم میں حالانکہ کفر کی ہمراہی ابدالآباد تک جہنم میں ہوگی۔ یہ ھامان وقارون کی ہمراہی بوجہ مناسبت، سرکشی، تکبر اور بخیلی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ بے نماز میں یہ سب خصلتیں ہوتی ہیں۔ اور قیامت میں ذلیل کرنے کی بنا پر یہ ہمراہی ہوگی۔ بہرحال۔ تارکِ صلوٰۃ کا کفر کسی طرح ثابت نہیں ہوتا ٭ خوارج کی چھٹی دلیل:۔ آیت کریمہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ط (ترجمہ):۔ اے لوگو نماز قائم کرو۔ اور نہ ہو تم مشرکوں سے اِس آیت سے بھی ثابت ہوا۔ کہ بے نمازی کفر ہے۔ کیونکہ فرمایا جا رہا ہے۔ کہ نماز قائم کرتے رہو۔ ورنہ مشرکین سے ہو جاؤ گے۔ گویا کہ نماز نہ قائم کرنے والا مشرک بن جاتا ہے

جواب:۔ اس آیت سے استدلال دو وجہ سے قطعاً غلط ہے:۔ پہلی وجہ:۔ یہ کہ واؤ عاطفہ ہے تفسیریہ نہیں ٭ دوسری وجہ:۔ یہ کہ یہاں مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ کا لفظ ہے۔ نہ کہ کافرین کا۔ کافر اور مشرک میں بہت طرح فرق ہے۔ بے نمازی کے مشرک ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں اس آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے۔ کہ اے مسلمانوں نماز پڑھتے رہو۔ اور بے نمازی رہ کر مشرکوں کی نشانیاں اختیار نہ کرو۔ اور بطورِ علامات مشرکوں کے مشابہ اور ان کے علامتی ساتھی نہ بنو۔ ایسی واضح آیت سے کفر ثابت کرنا فقط کھینچاتانی ہے۔ حقیقت میں یہ آیت کریمہ صرف نشانی اور علامات کو بیان فرما رہی ہے بعض مفسرین نے فرمایا۔ کہ دونوں جملے علیحدہ ہیں۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا وَلَا تَکُوْنُوْا سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح وَلَا تَکُوْنُوْا کے جملے میں پہلے جملے سے کوئی رابطہ علامت نہیں اور یہ آیتِ پاک اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ط کی مثل ہے۔ یعنی جس طرح زکوٰۃ اور نماز کا عقلاً، نقلاً جنساً، نوعاً۔ فعلاً، عملاً۔ کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح نماز اور شرک کا کوئی تعلق نہیں۔ وہابی خوارج کی ساتویں دلیل:۔ قرآن مجید میں ہے:۔ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ط (ترجمہ) مسلمان متقی جنت میں سے آواز دے کر کافر جہنمیوں سے پوچھیں گے۔ کہ تم کو جہنم میں کس نے پہنچایا۔ تو وہ کہیں گے۔ کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اِس سے ثابت ہوا۔ کہ بے نمازی کافر ہو کر جہنمی ہوگا۔ **جواب**:۔ وہابی صاحب نے آدھی آیت کو بیان کرکے اور غلط ترجمہ کرکے اپنی حسبِ عادت وہابیانہ خیانت کی ہے پوری آیت کریمہ اس طرح ہے:۔ فِیْ جَنّٰتٍ یَتَسَآءَلُوْنَ لا عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ مَا سَلَکَکُمْ

فِیْ سَقَرَ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ لا وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ه وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ حَتّٰى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ ط (ترجمہ) :- جنت میں جنتی مجرموں سے پوچھیں گے۔ کہ دوزخ میں تم کو کس چیز نے پہنچایا۔ تو وہ کہیں گے۔ کہ ہم نمازیوں کے ساتھی نہ بنے تھے۔ اور نہ ہی ہم مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ اور ہم بُروں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اور ہم روزِ قیامت کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم کو موت آ گئی اس آیتِ کریمہ میں لفظِ مجرمین عام ہے۔ اِس بات کو اس سے کافر مراد ہے یا گنہگار۔ اگر کافر مراد لیا جائے۔ تو اُن کا کفر نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ط یعنی قیامت کو جھٹلانے کی بنا پر ہوگا۔ نہ کہ ترکِ نماز سے پھر اِس آیتِ پاک میں ہے :- مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ط ہے۔ جس سے ترکِ نماز کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ ترکِ مسلمانی کی وضاحت ہو رہی ہے۔ یعنی ہم لوگ مسلمان بن کر نمازیوں میں سے نہ بنے تھے۔ لہٰذا اس آیت کو اپنے دعوے کفر پر دلیل بنانا قطعاً غلط ہے۔ پ یہ تھیں وہ احادیث و آیات جن سے یہ خوارج اپنا استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ جوابات سے آپ نے بخوبی اندازہ لگا لیا۔ کہ یہ استدلال کتنا کمزور ہے۔ تمام فقہاءِ کرام کے نزدیک ثابت ہے کہ بے نمازی صرف فاسق ہے۔ اور فاسق کافر نہیں ہوتا۔ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں اس کے بہت دلائل ہیں۔ پ

پہلی دلیل :- قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے :- يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ كَمَا تُوْبَةَ النَّصُوْح ط (ترجمہ) :- اے ایمان والو۔ اپنے رب کریم غفور الرحیم کی بارگاہ میں ایسی توبہ کرو۔ جیسی مضبوط توبہ ہوتی ہے۔ اِس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے لفظِ مومن جیسے پیارے الفاظ سے خطاب فرمایا۔ اور ساتھ ہی توبہ کا حکم دیا۔ قانونِ شرعی کے مطابق توبہ گناہگار سے کرائی جاتی ہے۔ اگر بقول خوارج سب گناہگار کافر ہوتے۔ تو يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا نہ فرمایا جاتا پ دوسری دلیل :- آیتِ کریمہ میں ارشاد ہے :- يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ ط (ترجمہ) :- اے مومنو! تم پر قتل میں قصاص فرض کر دیا گیا۔ دیکھو ترکِ نماز کی طرح قتل بھی گناہ کبیرہ ہے۔ مگر ایسے مجرم کو بھی رب کریم نے مومنوں میں داخل فرمایا جب قاتل کافر نہیں تو بے نمازی کیوں کافر ہوئے۔ لہٰذا یہ وہابیوں کا مسلک ہی قرآن کریم کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ تیسری دلیل :- قرآن پاک فرماتا ہے :- وَاِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا الرَّحِيْمًا ط (ترجمہ) :- اور جب مسلمان اپنی جانوں پر ظلم کریں۔ اور آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں۔ اور اللہ سے بخشش مانگیں۔ اور اے پیارے حبیب! آپ بھی اُن کے لیے دعائے بخشش فرمائیں۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کو پالیں گے۔ توبہ فرمانے والا اور رحم فرمانے والا۔ اِس آیت میں ظلم اور بخشش کا ذکر ہے۔ ظلم گناہ کبیرہ ہے۔ اور استغفار گناہگار کے لیے ہوتی

ہے۔ اگر بقولِ خوارج ہر گناہگار کافر ہوتا۔ تو قرآن استغفار کا حکم نہ فرماتا۔ بلکہ اسلام لانے کا ذکر ہوتا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی بخشش نہ مانگتے کیونکہ کافر کے لیئے دعائے بخشش حرام ہے بخشش صرف گناہگاروں فاسقوں کے لیئے ہوتی ہے۔ چنانچہ عقائد کی کتاب نبراس میں صفحہ نمبر ۲۵۵ پر ہے:۔ وَالدُّعَاءُ وَالْاِسْتِغْفَارُ لَایَجُوْزُ لِغَیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ط (ترجمہ):۔ غیر مومن یعنی کافر کے لیئے دعا بخشش کرنا قطعًا ناجائز ہے:۔

دلیل نمبر ۴ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ فرماتا ہے:۔ وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ:۔ آیت ۹۹ سورت بقرہ (ترجمہ) اور نہیں کفر کرتے اس کا مگر فاسق لوگ یہاں فسق کو کفر نہ بنایا۔ بلکہ ذریعۂ کفر ثابت ہوا۔ کہ ہر دو علیحدہ ہیں حرفِ اِلَّا نے تفریق ظاہر کر دی۔

دلیلِ عقلیہ:۔ عقل کا بھی تقاضا ہے کہ بے نمازی کافر نہ ہو۔ اس لیئے کہ فسق جرم ہے۔ اور کفر بغاوت ہے۔ قانون سے کوتاہی جرم ہے۔ اور قانون میں بے احتیاطی، سستی، غفلت کرنے والے کو باغی قرار نہیں دیا جاتا۔ تو اللہ رحیم وکریم کے قانون میں بے احتیاطی، سستی، غفلت کرنے والے تارکِ نماز کو کافر باغی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک نماز کا تارک کافر ہوگا۔ یا زیادہ کا۔ اگر ایک نماز کا تارک کافر ہو۔ تو کتنی دیر بعد۔ قضاء کرنے کی مہلت ملے گی۔ یا نہ۔ اور قضاء کی مدت قانونِ اسلامی میں کہاں تک ہے۔ اگر قضاء کی مہلت نہ ملے۔ تو قضاء کرنے کا قانون یکسر ختم کرنا پڑے گا۔ حالانکہ یہ قانون قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک نماز چھوڑتے ہی کفر لازم اور شادی شدہ ہو، تو نکاح بھی ٹوٹ جائے۔ سارا معاشرہ ہی تباہ ہو جائے۔ پس لازم آیا۔ کہ وہابی وخوارج کا یہ مسئلہ باطلِ محض ہے۔ عقلِ ایمانی ہرگز اس کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ نماز قضاء کرنے کا قانون بنانا۔ پھر اس کی مدت معین نہ فرمانا۔ بلکہ آخری عمر تک قضاء کی مہلت ہی بتا رہا ہے۔ کہ ترکِ صلوٰۃ کفر نہیں مخالفین کی پیش کردہ آیاتِ قرآنیہ اور چند احادیث میں عمر کی قید بھی نہیں ہے۔ پھر بتاؤ۔ کہ کس بے نمازی پر کس وقت فتوئے کفر لگاؤ گے۔ اور معذور کو کس حساب میں رکھو گے۔ مخالف کے دلائل تو ایسے ہیں کہ جس سے معذور بھی شامل ہو جاتا ہے۔ تو کیا معذور کو بھی کافر قرار دو گے۔ سچ فرمایا ہمشاہ حضرت مفکرِ اسلام حکیم الامت بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہ قرآن وحدیث سمجھنا آسان نہیں۔ ظاہری الفاظ سے عقیدے مرتب کرنا وہابیت کا کام ہے۔ اسی سے گمراہی پھیلتی ہے۔ اللہ کریم سچی سمجھ نصیب فرمائے آمین

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط:

کتبہ

باب الاذان

خارج مسجد اذان دینے کا بیان

سوال نمبر ١ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے۔ اذان مسجد کے خارج حصے میں دینی چاہیئے۔ اسی کو سنت قرار دیتا ہے۔ اور دلیل میں ابوداؤد کی روایت پیش کرتا ہے۔ کَانَ یُؤَذَّنُ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ عَلٰی بَابِ الْمَسْجِدِ ۔ (حدیث شریف) کتب فقہ کی بَیْنَ یَدَیْہِ کی عبارت کا مطلب اس طرح بیان کرتا ہے۔ کہ اذان خارج مسجد ہی ہو۔ مگر امام کے دائیں یا بائیں نہ ہو۔ بلکہ لَا عَنِ الشِّمَالِ وَلَا عَنِ الْیَمِیْنِ ۔ بلا حائل ہو یعنی باہر اذان ہو۔ اور کوئی آڑ خطیب سے نہ ہو۔ آج کل حجروں کے اندر مسجدوں کی محرابوں کے پاس جو اذانیں لاؤڈ سپیکر میں دی جاتی ہیں۔ وہ سب خلافِ سنت ہیں۔ بکر کہتا ہے۔ کہ اذان ہر طرح سے جائز ہے۔ خواہ خارج مسجد میں ہو یا مسجد کے اندر۔ لیکن جمعہ کی اذانِ ثانی پہلی صف میں ہی ہونی چاہیئے۔ اور مسجد کے اندر دینی سنت ہے فرمایا جائے۔ کہ حق پر کون ہے؟ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا ۔

سائل:۔ حاجی نذر محمد صدر مجلس عاملہ دار العلوم جامعہ غوثیہ حنفیہ پشاور شہر مورخہ: ١١/١١/١٩٧٠

الجواب بعون العلام الوھاب

صورتِ مسئولہ میں زید کا قول شرعاً درست ہے۔ بکر کا قول قطعاً غلط ہے۔ اور بلا دلیل ہے۔ اس لئے کہ قانونِ شریعت کے مطابق اذان پانچ قسم کی ہے۔

نمبر ١۔ اذانِ نماز نمبر ٢ اذانِ خطبہ نمبر ٣ اذانِ مولود نمبر ٤ اذانِ مصیبت نمبر ٥ اذانِ قبر۔ باعتبارِ لغت اذان کا صرف یہ معنی ہے۔ کہ صاف طور پر اعلان کر دیا جائے خواہ کسی طرح کی زبان اور کسی عبارت میں ہو۔ لفظ اذان اِذْنٌ یا اُذُنٌ سے مشتق ہے۔ المنجد عربی مصری صفحہ نمبر ٦ پر ہے:۔ الاذان، الاعلام یعنی اذان کا مقصد کسی چیز کا ظاہر کرنا۔ یہی کچھ اعلان میں ہوتا ہے اعلان العلام سے مشتق ہے۔ اس کا معنی بلند ہونا۔ اسی لئے جھنڈے کو عربی میں علم کہا جاتا ہے۔ محرم کے تعزیوں میں شیعہ لوگ حرمِ پاک سیدہ زینب وسیدہ شہربانو رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف منسوب شدہ دوپٹوں کو لمبے بانسوں پر ٹانگ دیتے ہیں اور بشہادۃ تاریخ جو کام بازار کوفہ میں آلِ شمر نے کیا۔ اسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا نام رکھتے ہیں۔

عَلَمْ۔ معاذ اللہ)، لغوی لحاظ سے اذان اور اِعلام کا معنیٰ ہے۔ بلند ہونا یا بلند ہونے والا مگر بمنقولِ شرعی مخصوص اور معیّن لحاظ سے بطریقۂ مخصوص ادا کرنا۔ اذان الفاظ تو شریعت پاک نے مقرر فرما دیئے مگر طریقۂ ادا اقسامِ اذان کے اعتبار سے پانچ قسم پر ہے ؛ پس جیسی اذان ویسا ہی اس کا طریقۂ مسنونہ۔ اصلِ اذان، نمازِ پنجگانہ کے لیئے وارد ہوئی۔ لیکن آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اختیارِ عطائی من جانب اللہ تعالیٰ سے چار مقام استعمالِ الفاظِ اذان کی مزید اجازت فرمائی۔ مگر چونکہ اذان کے یہ مندرجہ بالا پانچوں موقعے آپس میں بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا ان کے طریقۂ ادا بھی لازمًا مختلف ہونے چاہئیں۔ اور چونکہ بانیِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اشارۃً کنایۃً وصراحۃً اذان کی پانچ قسمیں فرمائیں۔ تو ضروری ہے۔ کہ ان اذانِ مختلفہ کا طریقۂ ادا بھی بانیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات سے ہی حاصل کیا جائے۔ اپنے ذہنی اختراعات اور دل پسند رواج کو ان شرعی معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔ تاکہ دورِ حاضرہ کی بڑھتی ہوئی بے باکانہ گمراہی و بے راہ روی کے سدِّباب کے ساتھ ساتھ قوانینِ شرعی کی دل آویز پابندیوں کا ادب واحترام بھی رکھا جاسکے۔ اذان کی پہلی اور اصلی قسم، اذانِ پنجگانہ ہے۔ اس کے طریقۂ ادا کے متعلق متعدد اَحادیثِ طیبہ اور تمام فقہاءِ کرام کی عباراتِ کثیرہ اس بات پر شاہد ہیں۔ کہ یہ اذان خارجِ مسجد ہونا ہی مستحب ہے۔ یہی بات لغت سے ثابت ہے۔ جیسا کہ لفظی ترجمے سے ظاہر ہوچکا۔ قرآن کریم کی ایک آیت پاک سے بھی اشارۃً یہی ثابت ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ اذانِ پنجگانہ خارج مسجد اور بلندیوں پر ہو۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔ فَاِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ ط (ترجمہ) اور جب پکارا جائے۔ نماز کے لیئے جمعہ کے دن۔ اس آیت کریمہ میں۔ نُوْدِیَ، نِدَیٰ سے مشتق ہے۔ جس کا لغوی ترجمہ بلندی سے آنے والی چیز۔ اس لیئے عربی میں بارش اور شبنم کو بھی نَدٰی کہہ دیتے ہیں۔ کہ یہ بھی بلندی سے آتی ہے۔ چنانچہ المنجد عربی صفحہ نمبر ۸۹۶ پر ہے:۔ اَلنَّدٰی، اَلْمَطَرُ نَدیٰ کا ترجمہ ہے بارش۔ اور بارش بلندیوں سے سب کی طرف آتی ہے۔ یہاں بھی بجائے خُوْطِبَ یا اُعْلِنَ کے نُوْدِیَ ارشاد ہوا۔ اس لیئے اذانِ صلوٰۃ بلندی سے ہونی چاہیئے۔ اور پھر بلند کرنا ہو۔ اذان کہنے والا۔ نہ کہ لاؤڈ سپیکر، ریڈیو، ریکارڈ وغیرہ۔ کیونکہ ندا مرد کی آواز کو کہا جاتا ہے۔ نہ کہ لاؤڈ سپیکر کی آواز کو۔ اسی طرح منجد صفحہ نمبر ۸۹۶ پر ہے۔ اس اشارۃً النص سے ثابت ہوا۔ کہ اذان خارج مسجد ہونی چاہیئے۔ اور خود مؤذن بلند جگہ کھڑا ہو۔ حدیثِ پاک میں بھی یہی صراحت ملتی ہے۔ کہ اذان مسجد کے خارجی حصے میں ہونی چاہیئے۔ چنانچہ فتح السنن صفحہ نمبر [illegible] پر ہے۔ اور صحیح البہاری جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۸۷ پر ہے :۔ عَنْ اَبِیْ بَرْزَۃَ الْاَسْلَمِیِّ قَالَ مِنَ السُّنَّۃِ الْاَذَانُ فِی الْمَنَارَۃِ وَالْاِقَامَۃُ فِی الْمَسْجِدِ اَخْرَجَہٗ

اَبُو الشَّیْخُ الْحَافِظُ۔ وَرِجَالُہٗ ثِقَاتٌ ؂ (ترجمہ:) ابو برزہ اسلمی سے روایت ہے آپ نے فرمایا سنت یہ ہے۔ کہ اذان بلند منارے وغیرہ پر ہو۔ اور تکبیر مسجد کے اندر ہو۔ اس حدیث پاک کو ابو الشیخ حافظ محدث نے ثابت کیا ہے اور اس کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں۔ محدثین کے نزدیک اس کی سند یں دو طرح ہیں۔ ایک سند ابو شیبہ نے اپنی مسند جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۵ پہ بیان فرمائی۔ اور دوسری سند نصب الرایہ جلد اوّل کے صفحہ نمبر ۱۵۳ پر مذکور ہے۔ تمام محدثین کرام نے اس کو صحیح فرمایا۔ ثابت ہوا۔ کہ اذان خارجِ مسجد ادا کرنا سنت ہے۔ خیال رہے کہ مینارہ سے مراد آج کل کی شکل والا مسجدوں کا مینار نہیں۔ بلکہ ہر وہ اونچی جگہ ہے جو مسجد کے خارجی حصہ میں ہو۔ خواہ وہ سیڑھی یا ممبر نما کوئی اونچی جگہ یا مسجد کی چھت یا مسجد کے قریبی متصل کسی پڑوسی کی چھت چنانچہ ابوداؤد شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۷۷ پر ہے:۔ بَابُ الْاَذَانِ فَوْقَ الْمَنَارَۃِ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ الخ عَنْ عُرْوَۃَ بْنِ الزُّبَیْرِ عَنْ اِمْرَءَۃٍ مِنْ بَنِی النَّجَّارِ قَالَتْ کَانَ بَیْتِیْ مِنْ اَطْوَلِ بَیْتٍ کَانَ حَوْلَ الْمَسْجِدِ فَکَانَ یُؤَذِّنُ عَلَیْہِ الْفَجْرَ الخ (ترجمہ) احمد بن محمد دراز سند کے ساتھ حضرت عروہ بن زبیر صحابی رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت کیا۔ کہ بنی نجار کی ایک صحابیہ نے فرمایا۔ میرا بہت بڑا گھر مسجد نبوی شریف سے ملحق تھا۔ تو حضرت بلال میرے اس مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر فجر کی اذان دیتے تھے۔ اس کی شرح میں بذل المجہود جلد اوّل نے صفحہ نمبر ۲۹۸ پہ فرمایا:۔ فَکَانَ بِلَالٌ یُؤَذِّنُ عَلَیْہِ اَیْ عَلٰی بَیْتِیْ ؂ (ترجمہ) حضرت بلال میرے مکان پر اذان فجر دیا کرتے تھے۔ ثابت ہوا کہ چھت بھی لغوی مینارہ ہی ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کے قانون میں۔ خارجِ مسجد اذان دینا عملی طور پر سنت غیر مؤکدہ ہے۔ اور حکمی لحاظ سے سُنّتِ مؤکدہ ہے۔ غیر مؤکدہ تو اس لیئے کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے صرف ایک دفعہ بحالت سفر جنگل میں اذان ادا فرمائی۔ چنانچہ بخاری شامی میں جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۶۷ پہ ہے۔ وَقَدْ اَخْرَجَ التِّرْمِذِیُّ اَنَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَذَّنَ فِیْ سَفَرٍ وَصَلّٰی بِاَصْحَابِہٖ وَجَزَمَ النَّوَوِیُّ وَقَوَّاہُ ؂ (ترجمہ) ترمذی نے ایک حدیث ثابت فرمائی۔ کہ ایک سفر مبارک میں آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود اذان دی۔ اور صحابہ کرام کو نماز پڑھائی۔ یہ حدیث شریف ترمذی شریف جلد اوّل باب مَاجَآءَ فِی الصَّلٰوۃِ عَلَی الدَّابَّۃِ: صفحہ نمبر ۵۵ پر ہے۔ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۴۲۴ پر بھی یہ بھی فرمایا۔ کہ نبی کریم نے ایک مرتبہ خود اذان دی۔ شروحِ اربعہ ترمذی کی شرح اوّل سراج احمد فارسی اور شرح دوم ابی الطیب عربی کے صفحہ نمبر ۲۰۱ پہ بھی یہی ثابت کیا گیا ہے۔ شرح سوم قوت المغتذی صفحہ نمبر ۲۰۴ پہ فرمایا۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے صرف ایک مرتبہ اذان اور تکبیر ادا فرمائی۔ اور جو لوگ اس کے منکر ہیں۔ وہ غافل ہیں۔ علامہ نووی نے

اس پر یقین کیا۔ اور اس حدیث کو ہر لحاظ سے قوی کہا۔ ثابت ہوا۔ کہ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی اذان پاک بھی خارج مسجد فضاء آسمانی میں ہوئی۔ نہ کہ بند کمرے یا خیمے میں۔ اور چونکہ صرف ایک ہی دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا اس لیے عملاً غیر مؤکدہ ہوئی۔ مؤکدہ اس لیے ہے۔ کہ کسی صحابی یا تابعی بلکہ تبع تابعی سے بھی کبھی ثابت نہیں۔ کہ اذان نماز مسجد کے اندر کہی گئی ہو۔ تمام کتبِ احادیث سے خارجِ مسجد کا ہی ثبوت ملتا ہے۔ دورِ اجتہادی میں بھی یہی سنت قائم رہی۔ علماء فقہاء صوفیاء اور دیگر بزرگانِ دین سے بھی کہیں ثبوت نہیں۔ کہ داخلِ مسجد اذان دی گئی ہو۔ یہ بدعتِ سیئہ تو اب چند سالوں سے مروّج ہوئی ہے۔ جس کو سب سے پہلے ان وہابیوں نے ایجاد کیا۔ جو محفلِ میلاد جیسی سنّتِ طیبہ پر دن رات بدعت، بدعت کے فتوے لگاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ عملی طور پر اگر دیکھا جائے۔ تو سب سے زیادہ بدعتیں وہابیوں نے ہی اسلام میں داخل کیں۔ اور سب سے بڑے بدعتی وہابی ہیں۔ بہر حال اذانِ پنجگانہ کے متعلق یہی سنّت ہے۔ کہ خارجِ مسجد دی جائے مسجد کے اندر نماز کی جگہ اذان دینا مکروہ تحریمی ہے۔ کیونکہ سنّتِ مؤکدہ کی خلاف ورزی ہے۔ اور بدعت سیئہ ہے۔ کیونکہ رافع سنت ہے۔ فی زمانہ ہمارے بہت سے لاؤڈ سپیکر پر اذان اندر دینے کے خواہش مند حضرات اپنی خواہش کو مسجد کے اندر پورا کرنے کے لیے یہ فرماتے ہیں کہ اذان پنجگانہ صرف نمازیوں کو بلانے کے لیے ہے۔ اور زمانہ نبوی اور بعد والے زمانوں میں خارجِ مسجد یا بلند جگہ پر اذان دینے کا مقصد محض یہی تھا۔ کہ دور دور کے نمازیوں کو اطلاع ہو جائے۔ اور اس زمانے بلکہ تابعی، تبع تابعی اور زمانہ ماضی قریب تک نماز کی اطلاع کے لیے فقط یہی ایک طریقہ ممکن تھا۔ کہ مؤذن کو کسی سیڑھی یا چھت یا مینار سے پر چڑھا دیا جائے۔ اور وہاں پر دی ہوئی اذان سے سب کو اطلاع بخوبی ہو جائے۔ آج جب کہ لاؤڈ سپیکر ایجاد ہو چکا ہے تو مؤذن کو چھت پر چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ مقصد اطلاع بذریعہ لاؤڈ سپیکر اب زیادہ میسر ہے۔ مگر ہمارے احباب کی یہ قیاس آرائی بہت ہی کمزور ہے۔ اولاً اس لیے کہ اگر شریعت اسلامیہ کے محکم قانون اسی طرح ایجاداتِ عالم سے ختم کیے۔ اور توڑے جاتے رہے۔ تو کچھ لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ پہلے زمانے میں صرف انسان ہی اذان دے سکتا تھا۔ اس لیے انسان کو مقرر کرنا سنت ہوا ہے۔ اب جب کہ ٹیپ ریکارڈ ایجاد ہو چکا ہے۔ اور اس سے کسی بھی خوش الحان شخص کی اذان بھر کر کام چلایا جا سکتا ہے۔ تو کسی انسانی مؤذن کی کوئی حاجت نہیں۔ جب وقتِ اذان ہو۔ اذان کا ریکارڈ لگا دیا جائے۔ (معاذ اللہ) اور اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید گمراہیاں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ جب ریکارڈ سے مؤذن کی شرعی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ تو خارجِ مسجد اذان کے بدلے لاؤڈ سپیکر پر اذان بھی۔ شرعی ضرورت

قطعاً پوری نہیں کرسکتی۔

دوم: اس لیے کہ پنجگانہ اذان کا مقصد صرف یہی نہیں۔ کہ اس سے نمازیوں کو بلایا جائے۔ بلکہ احادیثِ مبارکہ اذان پنجگانہ کے فوائد دنیاوی و اخروی اور بھی بہت سے بیان فرما رہی ہیں چنانچہ ابو داؤد شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ٧٦ پر ہے :۔ حَدَّثَنَا الْقَعْنَبِيُّ الخ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ۔ قَالَ اِذَا نُوْدِيَ بِالصَّلٰوةِ اَدْبَرَ الشَّيْطَانُ وَلَهٗ ضُرَاطٌ حَتّٰى لَا يَسْمَعَ التَّاْذِيْنَ ط الخ (ترجمہ) :۔ حضرتِ قعنبی نے حدیثِ مبارکہ بیان فرمائی کہ جب نماز کی اذان دی جاتی ہے تو شیطان بوجہ خوف گوز مارتا ہوا۔ بھاگتا ہے۔ ثابت ہوا۔ کہ اذان پنجگانہ کا فائدہ یہ بھی ہے۔ کہ اس سے شیطان کو بھگایا جائے۔ اور لازم بات ہے۔ کہ شیطان لاؤڈ سپیکر یا ٹیپ ریکارڈ کی آواز سے نہیں بھاگتا۔ بلکہ مؤمن مسلمان مؤذن کی اصل صوتِ اذان سے بھاگے گا۔ جو فضا میں بکھر رہی ہے۔ ورنہ احادیثِ پاک میں نُوْدِیَ کا لفظ نہ ہوتا۔ بلکہ اُذِنَ ہوتا۔ اور پھر فقط پنجگانہ اذان سے ہی شیطان بھاگے گا۔ نہ کہ دیگر اذانوں سے۔ اسی لیے حدیث پاک میں نُوْدِیَ بِالصَّلٰوۃِ کی قید لگی۔ پس واضح ہوگیا۔ کہ اذان پنجگانہ خارجِ مسجد کسی اونچی جگہ کھڑے ہو کر کہنی ضروری ہے۔ کیونکہ فرارِ شیطانی کا یہ فائدہ صرف اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ داخل مسجد بند کمرے میں لاؤڈ سپیکر پر اذان سے لوگوں کو تو بلایا جاسکتا ہے۔ مگر شیطان کو نہیں بھگایا جاسکتا۔ حالانکہ شیطانوں کو بھگانا اشد لازم۔ الفاظ اذان تو اپنے مقام پر باعثِ برکت ہیں ہی۔ مگر اس کی اس تاثیر کے لیے مومن متقی مرد کی آواز ضروری ہے اسی لیے فقہائے کرام مؤذن کے تقویٰ طہارت میں بہت قیدیں لگاتے ہیں۔ خود حدیثِ پاک میں بھی اسی طرح ارشاد ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ شریف صفحہ نمبر ٥٣ پر ہے :۔ حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ (الخ) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ لِيُؤَذِّنْ لَكُمْ خِيَارُكُمْ ط الخ (ترجمہ) فرمایا آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وسلم نے ضروری ہے۔ کہ تم میں سے دینی، ایمانی اعتبار سے بہتر لوگ تمہاری نمازوں کی اذان دیں۔ اور یہ تاثیر صرف اسی اذان سے پیدا ہوگی۔ جو تمام قیود و شرائط کے ساتھ ساتھ عین کسی نماز کے وقت مومن مسلمان کی طیب و طاہر زبان سے فضا میں ظاہر ہو۔ غلط لفظ یا وقت سے ہٹی ہوئی یا فاسق و فاجر کی اذان کا یہ اثر نہ ہوگا۔ ایسی اذان سے شیطان ہرگز ہرگز نہیں بھاگتا۔ گویا کہ الفاظِ اذان عمدہ کارتوس ہیں۔ اور زبانِ مومن اُن کے لیے شاندار بندوق کی مثل ہیں۔ اذانِ پنجگانہ سے

تیسرا فائدہ: یہ بھی ثابت ہے۔ کہ مسلمان جب اذان دیتا ہے۔ تو جہاں تک مؤذن کی اونچی آواز پہنچے۔ وہاں تک کے پتھر کنکر، شجر، ثمر، گھاس، پتّے، جن و انس، چرند و پرند۔ اس کے ایمان کے گواہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ صفحہ نمبر ٥٣ پر ہے :۔ اور اسی طرح بہت سی کتب احادیث میں ہے

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ (الخ) قَالَ قَالَ لِی اَبُوْسَعِیْدٍ اِذَا کُنْتَ فِی الْبَوَادِی فَارْفَعْ صَوْتَكَ بِالْاَذَانِ فَاِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَسْمَعُہٗ جِنٌّ وَّلَا شَجَرٌ وَّلَا حَجَرٌ اِلَّا شَہِدَ لَہٗ (ترجمہ) :۔ محمد بن صباح نے پوری سند کے ساتھ آخر تک حدیث بیان فرمائی۔ آخری راوی نے فرمایا۔ کہ مجھ کو حضرت ابو سعید نے فرمایا۔ کہ جب تم کسی وادی میں اذان دو، تو اپنی آواز خوب بلند کرو۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہٖ وسلم سے سنا آپ فرماتے ہیں۔ کہ مؤذن کی آواز جن پر حیوان، جن، مسلمان یا پتھر، درخت سنے۔ وہ کل قیامت میں اس کے ایمان کا گواہ ہوگا۔ اس حدیث پاک میں لفظ صَوْتَكَ بتارہا ہے۔ کہ مؤذن کی اپنی آواز سے یہ فائدہ ہوگا۔ نہ کہ کسی برقی آلہ سے۔ رفع صورت سے مراد بھی خود اپنی آواز اونچی کرنی ہے۔ نہ کہ مشین کا بٹن گھمانا۔ اور یہ عظیم الشان فائدہ خارج مسجد اذان دینے سے ہوگا نہ کہ مسجد کے اندر گھس کر اذان دینے سے لاؤڈ سپیکر یا ٹیپ ریکارڈ کی آواز سے یہ گواہی میسر نہ ہوگی۔ یہ تو تھا اُخروی فائدہ۔ چوتھا فائدہ دنیا میں بھی حاصل ہوگا۔ یہ کہ مؤذن کے لیے شجر، حجر وغیرہ بخشش مانگتے ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد شریف صفحہ نمبر ۷۵ پر ہے۔ اور ابن ماجہ شریف صفحہ نمبر ۵۳ پر ہے :۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ مِنْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ۔ اَلْمُؤَذِّنُ یُغْفَرُ لَہٗ مَدَّ صَوْتِہٖ وَیَسْتَغْفِرُ لَہٗ کُلُّ رَطْبٍ وَّیَابِسٍ۔ (الخ) (ترجمہ) :۔ حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ میں نے خود اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دہن پاک سے سنا آپ فرماتے ہیں۔ مؤذن کی اس جگہ تک بخشش کی جاتی ہے۔ جہاں تک کہ اس کی آواز پہنچے۔ اور وہاں تک کی۔ ہر خشک وتر چیز اس کے لیے دنیا میں ہی بخشش مانگتی ہیں۔ یہ اکرام بھی اس ہی کو حاصل ہوگا۔ جو باہر اذان دے۔ داخلِ مسجد اذان دینے والا۔ اس نعمت سے محروم رہے گا۔ غرضکہ داخلِ مسجد اذان میں اتنے ہی نقصان ہیں جتنے خارجِ مسجد فائدے ہوتے ہیں۔ خیال رہے۔ کہ ان روایات میں شجر وحجر رطب ویابس سے اصطلاحاً غیر مرکب افراد واعداد مراد ہوتے ہیں۔ نہ کہ مرکب اشیاء۔ کیونکہ مرکب شئی حاملہ مؤنث کی مثل ایک نفر کے درجے میں ہے۔ ایک جانور کے پیٹ میں دس بچے ہوں۔ تو ولادت سے پہلے وہ ایک چیز ہی مانی جائے گی۔ اسی طرح بہت سے شجر وحجر رطب ویابس سے بنا ہوا ایک مکان۔ ایک عدد ہی ہوگا۔ لہٰذا کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ مسجد کی اینٹیں وغیرہ اس کی گواہ بن سکتی ہیں۔ تو باہر اذان دینے کی کیا ضرورت۔ ساری مسجد صرف ایک نفر ہی ہو سکتی ہے۔ خارجِ مسجد اذان دینے کے مسنون حکم اور داخلِ مسجد اذان دینے کی ممانعت وکراہت تنزیہیہ میں اور بھی بے شمار پوشیدہ حکمتیں ہیں۔ جو عقولِ انسانیہ میں سما نہیں سکتیں۔ نیا تماشا کبھی ثابت ہے۔ کہ اذان پنجگانہ کا فائدہ صرف اعلان یا اطلاع نہیں۔ کیونکہ احادیث مبارکہ میں ارشاد

ہے۔ کہ اگر جنگل میں اکیلا شخص نماز پڑھے۔ تو اذان دے لے۔ چنانچہ موطا امام مالک جلد اول صفحہ نمبر ۷۶ پر ہے وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ (الخ) ثُمَّ الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ۔ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ قَالَ لَهُ إِنِّي أَرَاكَ تُحِبُّ الْغَنَمَ وَالْبَادِيَةَ فَإِذَا كُنْتَ فِي غَنَمِكَ أَوْ بَادِيَتِكَ فَأَذَّنْتَ بِالصَّلٰوةِ فَارْفَعْ صَوْتَكَ بِالنِّدَاءِ فَإِنَّهُ لَا يَسْمَعُ مَدٰى صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَلَا إِنْسٌ وَلَا شَيْءٌ إِلَّا شَهِدَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ قَالَ أَبُو سَعِيدٍ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ ط (ترجمہ)۔ مازنی اپنے والد سے راوی ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا۔ مجھ کو ابوسعید خدری نے ارشاد فرمایا۔ کہ میں دیکھتا ہوں۔ تجھ کو بکریاں اور جنگل کی تنہائی بہت پسند ہیں۔ لہٰذا جب کبھی تم بکریوں اور جنگل میں ہو۔ تو اکیلے نماز پڑھنے کے لیئے بھی اذان دے لیا کرو۔ اور خوب آواز بلند کیا کرو۔ کیونکہ موذن کی بلند آواز جن وانس اور اشیاءِ عالم میں سے جو بھی سنے گا وہ قیامت کے دن اس کا گواہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ اذانِ نمازِ پنجوقتہ صرف بلانے کے لیئے نہیں۔ بلکہ ان الفاظِ معینہ مخصوصہ اور اس طریقۂ ادا سے ہزار ہا رحمتوں کا حصول ہے ورنہ دف اور ناقوس ہی کافی ہو جاتا جیسے کہ روزے کے لیئے اور سحری افطار کے لیئے۔ اکثر شہروں میں دف بجائے جاتے ہیں۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا۔ کہ جن لوگوں نے یہ کہا۔ کہ پہلے زمانے میں صرف اس لیئے خارجِ مسجد اذان ہوتی تھی۔ کہ اس وقت لاؤڈ سپیکر نہ تھے۔ اور آواز پہنچانے کا واحد ذریعہ یہ ہی تھا۔ کہ باہر اذان ہو۔ یہ خیال فاسد اور عقیدہ باطل ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی۔ کہ چونکہ لوگوں کو بلانے کا اور کوئی طریقہ موثر نہ تھا۔ اس لیئے خارج از مسجد اذان دی جاتی تھی۔ تو جمعہ کی دوسری اذان خود آقائے دو عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد سے باہر کیوں دلوائی۔ جمعہ کی دوسری اذان فقط اہتمام خطبہ کے لیئے ہے۔ لوگوں کو جمع کرنے اور بلانے کے لیئے پہلی اذان ہوتی ہے۔ اور نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ سے پہلی اذان ہی مراد ہے چنانچہ تفسیر روح البیان جلد نہم صفحہ نمبر ۵۲۲ پر ہے۔ وَالْمُعْتَبَرُ فِي تَعَلُّقِ الْأَمْرِ الْأَذَانُ الْأَوَّلُ ط (ترجمہ)۔ نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ ط والے امر میں پہلی اذان ہی مراد ہو سکتی ہے۔ پس اس کے باوجود کہ جمعہ کی دوسری اذان لوگوں کو بلانے کے لیئے نہیں پھر بھی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ دوسری اذان خارج مسجد ہی کہلوائی چنانچہ ابوداؤد شریف جلد اول صفحہ نمبر ۱۵۵ پر ہے۔ حَدَّثَنَا النُّفَيْلِيُّ (الخ) عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ۔ قَالَ كَانَ يُؤَذَّنُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ۔ الخ ط (ترجمہ)۔ سائب بن یزید سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ اذان دی جاتی تھی۔ آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے جب آپ ممبر شریف پر تشریف فرما ہو جاتے تھے۔ جمعہ کے دن مسجد پر

کے دروازے پر اسی طرح حضراتِ صدیق و فاروق کے دورِ خلافت میں بھی ہوتا رہا۔ اس روایت کریمہ میں لفظ بَیْنَ یَدَیْہِ سے حتمًا ثابت ہو رہا ہے۔ کہ یہ اذان ثانیہ نمازیوں کو بلانے کے لیے نہ تھی۔ ورنہ یہ بھی اذانِ پنجگانہ کی طرح کسی بلندی پر ہوتی۔ اس کے باوجود پھر دروازے کے پاس ہی کہی جاتی تھی۔ لفظ بَیْنَ یَدَیْ بالکل سامنے کو کہتے ہیں۔ کہ نہ شمالًا ہو نہ جنوبًا، اسی طرح نہ یسارًا نہ یمینًا۔ اور ہر انسان کا سامنا تا حدِ نگاہ ہے اس سے قربِ مکانی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اقوالِ مؤرخین سے مسجد نبوی شریف کے چار دروازے ثابت ہیں ایک دروازہ محراب و ممبر کے پاس۔ اور تین دروازے خارجی دیوار میں مدینہ طیبہ میں سمتِ قبلہ جانب مشرق ہے۔ اس لیے تاریخی نقشے کے لحاظ سے محراب النبی صلی اللہ علیہ وسلم شرقی دیوار میں تھا اس سے کچھ ہٹ کر ایک دروازہ جس کو باب النبی کہتے تھے۔ غربی دیوار میں چنانچہ وفاء الوفاء جلد دوّم صفحہ نمبر ۴۵۹ پر دراز عبارت سے یہی بات ظاہر ہے ساری مسجد پاک پر چھت پڑی تھی۔ درمیان کا دروازہ جس کو باب الرحمتہ کہا جاتا تھا۔ اور وہ جوتیں رکھنے کی جگہ سے خارج تھا۔ ممبر مبارک کے بالمقابل یہی دروازہ تھا۔ اسی کا ذکر مندرجہ بالا روایتِ معتبر میں گزرا اِس حدیث سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ دوسری اذان بھی خارجِ مسجد ہونی چاہیے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہو گیا، کہ اذان کی دوسری قسم صرف احترامِ خطبہ کے لیے ہے نہ کہ نمازیوں کو بلانے کے لیے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی اذانیں ہیں جن کی دیگر فوائد کے لیے شریعت نے اجازت دی۔ چنانچہ اذان کی تیسری قسم اذانِ مولود ہے۔ اِس کا فائدہ صرف یہ ہی ہے۔ کہ ابتداءً شعور انسانی کو خالق و محسن سے متعارف کرایا جائے اذان کی چوتھی قسم اذانِ مصیبت ہے۔ یہ بھی اعلان کے لیے نہیں۔ اِس لیے اس کا طریقہ ادا بھی علیحدہ ہے۔ نہ اس سے شجر و حجر کو گواہ بنانا مقصود۔ لہٰذا یہ اذان ہر جگہ اندر باہر آوپر نیچے ہر طرح جائز مباح۔ پانچویں اذان اذانِ قبر ہے۔ اس کے فوائد بھی اذانِ پنجگانہ کی طرح نہیں۔ اس لیے اس کے واسطے بھی وہ قیدیں نہیں جو اذانِ نماز کے لیے ہیں۔ کہ خارج مسجد ہو۔ بلندی پر ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ اذانِ قبر کا فائدہ صرف میت کو تسکین اور تخفیفِ عذاب کا ہے۔ لہٰذا اس کے طریقہ ادا میں بھی وہ قیود نہیں۔ جو مسجد کی اذان میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ حدیث و قرآن کے حکم سے نماز پنجگانہ مسجد سے خارج ہونا ضروری۔ اگرچہ کسی لاؤڈ سپیکر پر دی جائے مسجد کے اندر منع ہے۔ تمام فقہاء بھی یہی فرماتے ہیں۔ چنانچہ فتح القدیر جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۷۱ پر ہے:۔ وَکَانَ الْحَسَنُ ابْنُ زِیَادٍ یَقُوْلُ الْمُعْتَبَرُ هُوَ الْاَذَانُ عَلَی الْمَنَارَةِ لِاَنَّهٗ لَوِ انْتَظَرَ الْاَذَانَ عِنْدَ الْمِنْبَرِ تَفُوْتُهٗ اَدَاءُ السُّنَّةِ ط (ترجمہ) حسن بن زیاد فرماتے ہیں۔ کہ معتبر اذان وہی ہے۔ جو مینار پر ہو۔ اس لیے کہ اگر ممبر کے پاس اذان کا انتظار ہو۔ تو ادا سنّت اس کی فوت ہو جاتا ہے۔ فتاویٰ قاضی خان جلد اوّل صفحہ نمبر ص۷۸ پر ہے:۔ وَیَنْبَغِیْ اَنْ یُّؤَذِّنَ عَلَی الْمِئْذَنَةِ اَوْ خَارِجَ

الْمَسْجِدِ وَلَا یُؤَذَّنُ فِی الْمَسْجِدِ ؎ (ترجمہ) لائق یہ ہے کسی بلند جگہ یا خارج مسجد اذان دی جائے مسجد کے اندر اذان نہ دی جائے۔ یہی فتاویٰ شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ص۲۶۰ پر اور عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ص۵۵ پر بھی ہے۔ فقہاءِ کرام نے مسجد کے اندر اذان کو خلاف سنت ہونے کی بنا پر منع کیا ہے نہ کہ آواز نہ پہنچنے کی بنا پر مسجد کے اندر ہر اذان مکروہ تحریمی ہے۔ اس لئے کہ اس میں سنتِ صحابہ کا ترک ہے اور بدعت سیئہ ہے۔ لیکن مسجد کے اندر اذان دینے سے بھی اذان ہو جائے گی۔ ہاں البتہ اذان دینے والا فضیلت اور فوائد سے محروم ہو گا مگر گنہگار ہو گا۔ کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت مؤکدہ کا تارک ہے اذان نماز بذات خود واجب ہے اور خارج مسجد سنتِ مؤکدہ۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ہی باہر کہلوائی۔ اور بعض کے نزدیک سنتِ غیر مؤکدہ کا ترک مکروہ تنزیہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ ردالمحتار صفحہ نمبر ص۱۱۶ پر ہے:۔ وَاِنْ کَانَتْ غَیْرَ مُؤَکَّدَۃٍ فَتَرْکُھَا مَکْرُوْہٌ تَنْزِیْھًا ؎ (ترجمہ):۔ اگر سنتِ غیر مؤکدہ ہو۔ تو اس کا ترک کرنا مکروہ تنزیہی۔ اسی طرح ہر بدعت سیئہ سے رفع سنت ہے۔ لیکن غیر مؤکدہ سنت کا رفع گمراہی نہیں کیونکہ وہ حدیثِ پاک کا ارشاد یہ ہے۔ کہ کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ ؎ ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس سے مراد وہ فعل ہے۔ جو رافع سنتِ مؤکدہ یا فرض واجب کو ختم کرنے والا ہو۔ بہر حال مسجد سے باہر اذان کہنا لازم ہے۔ جو لوگ مسجد کے اندر اذان دیتے ہیں۔ وہ اخروی فوائد اور فضیلتوں سے محروم رہتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ صرف لاؤڈ سپیکر پر اذان دینا گناہ نہیں ہے۔ مگر یہ شوق خارجِ مسجد ہو کر بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر خارجِ مسجد اذان صرف نمازیوں کو بلانے کے لیے ہوتی۔ تو مسجد کے اندر جائز ہونے کا کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل جاتا یا کم از کم اس کو ممنوع نہ کہا جاتا حالانکہ فقہاء نے مسجد کے اندر اذان دینے کو صاف مکروہ تحریمی فرمایا۔ چنانچہ فتح القدیر جلد اوّل ص۱۷۱ پر ہے۔ وَھُوَ ذِکْرُ اللہِ فِی الْمَسْجِدِ اَیْ فِیْ حُدُوْدِہٖ لِکَرَاھَۃِ الْاَذَانِ فِیْ دَاخِلِہٖ۔ اور فتاویٰ شرح طحطاوی ص۱۰۷ پر ہے۔ وَیُکْرَہُ اَنْ یُؤَذِّنَ فِی الْمَسْجِدِ کَمَا فِی الْقُھُسْتَانِیْ عَنِ النَّظْمِ فَاِنْ لَمْ یَکُنْ ثَمَّ مَکَانٌ مُرْتَفِعٌ لِلْاَذَانِ یُؤَذِّنُ فِیْ فِنَاءِ الْمَسْجِدِ کَمَا فِی الْفَتْحِ اور مطلق ہونے کی بنا پر تحریمی مراد ہے

وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

اذان قبر کا ثبوت بزبان فارسی

سوال نمبر۹:۔ چہ می فرمایند علماءِ اسلام دریں مسئلہ کہ ما ہم مسلماناں بعد از دفنِ میت اذان می دہیم و حسبِ توفیق حیلۂ اسقاط و ایصالِ ثواب برائے میت میکنیم۔ دریں زماں گروہِ نجدیاں و دیابنہ ...... خَذَلَھُمُ اللہُ تعالےٰ فی الدارین ؎ دریں کار با شدّ مانع آمد۔ لیکن سخن ایشاں مثل ھَبَاءً مَّنْثُوْرًا می شود۔ و لے۔ علامہ ابنِ عابدین کہ صاحبِ فتاویٰ شامی ہست در فتاویٰ خود جلدِ اوّل بابِ دفن

میت صفحہ نمبر ۶۰۰:۔ اذانِ میت را منع میکنند پس بفرمائید کہ قولِ او صحیح است یا فعلِ ما۔ یا قولِ شامی در فہم من نیامد۔
لہٰذا اطلاع زود بدھید۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء ۔ عبارتِ شامی چنیں است:۔ وَفِي الْاِقْتِصَارِ
عَلٰى مَا ذُكِرَ مِنَ الْوَارِدِ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّهٗ لَا يُسَنُّ الْاَذَانُ عِنْدَ اِدْخَالِ الْمَيِّتِ
فِيْ قَبْرِهٖ كَمَا هُوَ الْمُعْتَادُ الْاٰنَ ۔ لیکن یک توجیہ در آں معلوم میشود اگر راست آمد فبہا۔ وآں:۔ ایں
است کہ عبارتِ شامی بوقتِ ادخال می گوئید مگر ما ہمہ مسلماناں بعد از ادخالِ میت و بعد از دفن و اہالہ
تراب و بعد از تیار شدن قبر۔ اذان می دہیم آیا ایں توجیہہ درست است یا نہ چگونہ۔ نباشد کہ روزِ قیامت
نزد علامہ ابن عابدین شرمسار شوم دریں زماں ہمہ اہلِ سنت بر قولِ مقتدائے اہلِ اسلام اعلیٰ حضرت احمد
رضا خان صاحب بریلوی عمل می کنند۔ آگاہ کنند کہ ایں عمل بر قبورِ مومناں مصاب است یا نہ:۔

السائل:۔ محمد عثمان خطیب جامع مسجد منگھوپیر روڈ۔ راشن شاپ نمبر ۲۳ کراچی مورخہ ۱۱/۱۲/۱۹۶۷

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

بمطابقِ قانونِ شریعتِ پاک در دہ مقام اذانِ شرعی دادن جائز و سنت است زیرا کہ از عبارت
احادیث مختلفہ ثابت است۔ اوّل از نہا برائے نمازہائے پنجگانہ است ہم ازیں پنج فرائض جمعہ نیز
است۔ گو شکّے کہ جمعہ فرضِ ششم نیست۔ چنانکہ دریں زماں چند جہلا گفتند۔ دوم از نہا در گوشِ
طفلِ نوزائیدہ چنانکہ از روایات متعددہ بصراحت ثابت است و سنت اذان دادن۔ در گوشِ طفلِ یک
روزہ سوم ہنگامِ آتش افتادن در اشاعہ چہارم وقتِ جنگ کردن از کفار پنجم برائے مسافر پسِ مردہ ششم ہنگامِ
غضبناکیِ کسے ہفتم برائے دفعِ آسیبِ جنات اگر پدید آمد ہشتم بوقتِ مرگ نہم بوقتِ گم گشتگی
راہِ مسافراں دہم وقتِ اندوہ و غم۔ دریں دہ مقام احادیث وارد است صراحتاً و عبارۃً و یکے مقام یازدہم
ہمیں است۔ کہ در سوال نوشتہ است۔ یعنی بوقتِ دفنِ میت بعد از فگندنِ خاک و قبر برابر ساختن
پیش از سوالِ فرشتگانِ منکر نکیر۔ بر قبورِ مومنین اذان دادن بہتر است ہیچ کس از فقیہان و عالمان منکرِ
ایں نیست۔ و ایں کار کردن برائے نفعِ فوت شدگان خوب تر است و نزدِ من ایں اذان ہم
مسنون است۔ و از اشارۂ حدیثِ مشہورہ ثابت می شود۔ چنانچہ در مشکوٰۃ کتاب الجنائز
بر صفحہ نمبر ۱۴۰ است:۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ (ترجمہ) از عبداللہ بن جعفر روایت
است کہ آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فرمودائے مسلماناں مردگانِ خود را

آوازِ کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ برسانید۔ ودر زبانِ عربی موتٰی شخصِ مردہ را گویند حقیقۃً۔ وقریب المرگ را گویند مجازاً۔ وترکِ حقیقت بلاعذر جائز نیست۔ چنانچہ در اصولِ شاشی بر صفحہ نمبر ص۱۲ ایں قاعدہ مرقوم است:
وَاِنْ کَانَ لَہَا مَجَازٌ مُتَعَارَفٌ فَالْحَقِیْقَۃُ اَوْلٰی (الخ) و بر حاشیہ است:۔ لِاَنَّ الْاَصْلَ فِی الْکَلَامِ الْحَقِیْقَۃُ ؎ (ترجمہ):۔ اگر لفظے را مجازی معنٰی ہم موجود شد پس با وجودِ ایں معنٰیِ حقیقی مراد آوردن بہتر است۔ زیرا کہ مجاز را بغیر قرینہ شمردن جائز نیست۔ چنانچہ در تلویح علٰی توضیح بر صفحہ نمبر ص۲۵۵ مسطور است:۔ لَابُدَّ لِلْمَجَازِ مِنْ قَرِیْنَۃٍ مَانِعَۃٍ عَنْ اِرَادَۃِ الْمَعْنَی الْحَقِیْقِیِّ ؎ (ترجمہ):۔ برائے مجاز قرینہ ضروری است۔ کہ باز دارد از ارادۂ حقیقی۔ ودر مختصر معانی ہم چناں فرمود بر صفحہ نمبر ص۲۵۱ ارشاد است:۔ نَخْرُجُ الْمَجَازُ لِاَنَّ دَلَالَتَہٗ عَلٰی ذٰلِکَ الْمَعْنٰی اِنَّمَا تَکُوْنُ بِقَرِیْنَۃٍ ؎ (ترجمہ):۔ و پس ازیں تعریفِ حقیقی مجازی معنٰی خارج شد زیرا کہ مجازی معنٰی با قرینہ طرفِ خود راہ نمائی کند نہ کہ بذاتِ خود۔ وایں ہمہ اقوال ازیں وجہ است کہ قاعدۂ کلیۂ اصول مشہور است:۔ اِذَا تَعَذَّرَ الْحَقِیْقَۃُ فَیُصْرَفُ اللَّفْظُ اِلَی الْمَجَازِ ؎ (ترجمہ):۔ چوں استعمالِ حقیقت مشکل شود لفظ را بطرفِ مجاز بگردانند پس لفظِ موتٰی در یں حدیثِ مطہرہ بمعنیِ حقیقی استعمال می شود۔ زیرا کہ مجاز را اینجا ہیچ قرینہ نیست۔ ومقصدِ روایتِ پاک ایں است کہ بعدِ دفن قبلِ سوالاتِ قبر ہم تلقین باید کرد۔ بدیں وجہ بعض فقہاء اذانِ قبر را مسنون می گویند۔ چنانکہ علامہ شامی در شامی جلد اوّل ص۷۷۲ فرمودہ:۔ قِیْلَ وَعِنْدَ اِنْزَالِ الْمَیِّتِ الْقَبْرَ قِیَاسًا عَلٰی اَوَّلِ خُرُوْجِہٖ لِلدُّنْیَا ؎ (ترجمہ):۔ گفتہ شدہ است کہ بعد از دفن میت در قبر۔ ہم اذان سنت است قیاس کردہ بوقتِ در آمدنِ مولود بدنیا۔ وے ایں سنیت ثابت از اشارۃً و قیاساً۔ نہ مثلِ اذانِ نمازہائے پنجگانہ صراحۃً و عبارۃً و عملاً۔ در اذانِ قبر اشارہ از لفظِ موتٰی واز لفظ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ معلوم شد زیرا کہ در اذان نیز لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہست و از حدیثِ دیگر نیز ثابت است کہ اذان بعدِ دفن سنت است۔ چنانچہ احمد و طبرانی فرمودہ:۔
عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ۔ قَالَ لَمَّا دُفِنَ سَعْدُ بْنُ مُعَاذٍ (الخ) وَسُوِّیَ عَلَیْہِ۔ سَبَّحَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ۔ وَسَبَّحَ النَّاسُ طَوِیْلًا ثُمَّ کَبَّرَ وَکَبَّرَ النَّاسُ (الخ) :۔ ترجمہ):۔ چوں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالٰی عنہ را دفن کردہ شد و قبرِ او برابر ساختہ شد۔ نبی اکرم صلے اللہ تعالٰی علیہ وسلم و صحابہ کرام رضی اللہ تعالٰی عنہم اجمعین۔ دراز مدت تسبیح خواندند۔ بآوازِ بلند۔ باز ہم چناں تکبیر خواندند۔ ودر اذان بایں طور تکبیر ہم است۔ پس سنیتِ اذانِ قبر ازیں عمل مبارکہ قیاساً ثابت است باید دانست کہ لفظِ موتٰی

در قرآن و حدیث بسہ۳ معنی مستعمل است۔ اول ازینہا بمعنی حقیقیہ چنانکہ دریں حدیث مندرجہ لَقِّنُوْا مَوْتٰی کُمْ؎ ہست و بعض می گویند کہ درینجا عموم مجاز است ؛ **دوم** :۔ روایت مشکوٰۃ شریف بروایت :۔ معقل بن یسار۔ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِقْرَءُوْا سُوْرَۃَ یٰسٓ عَلٰی مَوْتَاکُمْ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَ اَبُوْدَاؤُدَ وَ ابْنُ مَاجَۃَ؎ (ترجمہ) نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمود۔ کہ نزد موتائے خویش سورۃ یٰسین بخوانید۔ دریں روایت لفظِ موتا بقرینۂ علیٰ حرفِ جار بقرینۂ عملِ مسلماناں از دورِ صحابہ تا ایں دم بمعنی مجاز است حرفِ علیٰ در معنی عند است و لفظِ عندَ قربِ مکانی را مستلزم است۔ و بعد دفن قرب مکانی ممکن نیست ایں ہر دو قرینہ در حدیثِ اول نیست لیکن آنجا معنی حقیقی لازم و اینجا معنی مجازی مراد است ؛ **سوم** :۔ آیتِ قرآن مجید اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (الخ) ترجمہ :۔ یا حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم بیشک نتوانی شنوانید مردگاں را۔ لفظِ موتٰے بریں مقام نہ در حقیقی معنے استعمال می شود۔ نہ در مجازی۔ نہ در عموم مجاز بلکہ در معنی مرتجل مستعمل است زیرا کہ مراد از موتی۔ اینجا زندہ کفار اند بزندگی ظاہری۔ پس ازیں دلائل عقلیہ و نقلیہ ثابت شد۔ کہ اذان بر قبورِ مسلماناں فوراً بعد از دفن سُنّت است۔ مگر مسنونیت قیاساً و از اشارۃً و اقتضاءً النص است۔ نہ عبارۃً و دلالۃً بدیں وجہ امام ابن حجر در تصنیفِ خود شرح عباب فقط۔ انکارِ سنیت آں اذان می کنند چنانچہ فتاوی شامی جلد اول بر صفحہ نمبر ۲۵۸ نوشتہ است :۔ لٰکِنْ رَدَّہٗ ابْنُ حَجَرٍ فِیْ شَرْحِ الْعُبَابِ؎ (ترجمہ) :۔ لیکن ابنِ حجر در شرح ایں سنیت را انکار ساخت۔ و در نیابتِ ابن حجر مکی و موافقتِ قولِ علامہ خیر الدین رملی استاد علامہ محمد علاؤ الدین حصکفی صاحبِ در مختار علامہ شامی نیز در فتاوٰی خود بر صفحہ نمبر ۸۳۷ بعبارتیکہ در سوالِ سائل نوشتہ است۔ انکار می کردہ مگر ایں ہمہ انکارہا۔ انکارِ سُنّیت است نہ کہ انکارِ جواز و استحباب انکار سنّت نیز بدیں سبب است۔ کہ نزدِ ایشاں فعلِ مسنون آنست کہ بصراحت از عمل یا قولِ صحابہ ثابت شد و لیکن اذانِ قبر ہم چنیں ہرگز ثابت نیست۔ و ایں عدمِ ثبوت فقط بر سُنیتِ اذان خلل توانداند اخت نہ کہ بر جواز و استحبابِ اذانِ قبر۔ و در حدِ انکارِ فائدہ اذانے را کسے را مجالے نیست۔ بدیں وجہ خود امام ابن حجر فائدہ اذان بعد دفن را اقرار می کنند۔ چنانچہ حاشیہ بیجوری جلد اول بر صفحہ نمبر ۱۹۰ است۔ قَالَ ابْنُ حَجَرٍ وَ رَدَدْتُہٗ فِیْ شَرْحِ الْعُبَابِ لٰکِنْ اِنْ وَافَقَ اِنْزَالَہُ الْقَبْرَ اَذَانٌ خُفِّفَ عَنْہُ فِی السُّؤَالِ؎ (ترجمہ) :۔ ابن حجر فرمود۔ و رد کردم آں قولِ سنیت را در شرح عباب۔ لیکن اگر بعد از دفنِ میت۔ بر زودادان

گفتہ شود۔ فائدہ آنست کہ در سوال از میت تخفیف و بہتر کردہ خواہد شد۔ سبحان اللہ۔ نزدِ امام ثابت شد کہ اذان بر قبر بسیار فائدہ مند است۔ و در فتاوٰی شامی آنرا بدعت گفتن ضدِ سنّت است۔ نہ کہ ضدِ جواز و استحباب پس معلوم شد کہ نزدِ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ و شامی علیہ الرحمۃ و علامہ خیر الدین علیہ الرحمۃ اذانِ قبر بدعت حسنہ است نہ کہ سیئہ زیرا کہ در سیئہ ہیچ فائدہ نیست۔ بلکہ گناہ وارد شود۔ حالانکہ ھنوز گذشت از عبارت ابن حجر کہ در آں اذان فائدہ تخفیفِ سوال و عذاب است۔ و من می گویم۔ کہ اذانِ قبر بلحاظ اشارۃ سنّت است۔ و بلحاظ صراحت بدعت حسنہ است و بجز ایں تقسیم چارہ نیست زیرا کہ آنہا اذانہا کہ پیش ازیں از کتب فقہاء نوشتم بعضے را ازینہا انکار سنیت لازم آید۔ مثلاً اذانِ ھنگام آتش افتادن۔ از حدیث صراحۃً ثابت نیست بلکہ ہم چناں اشارہ است۔ چنانچہ در جامع الصغیر للسیوطی رحمۃ اللہ علیہ جلد یکم بر صفحہ ص۲۰ است۔

از ابن عدی فی الکامل ۔ حَسَنٌ حَدِیْثٌ ۔ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ۔ اِذَا رَاَیْتُمُ الْحَرِیْقَ فَکَبِّرُوْا فَاِنَّہٗ یُطْفِی النَّارَ ؂ (ترجمہ) چوں دیدید بآتش گرفتہ را پس تکبیر بخوانید۔ زیرا کہ تکبیر آتش بمیرد۔ و در کنوز الحقائق جلد اول للمناوی علیہ الرحمۃ بر صفحہ نمبر ص۲۳ است بحوالہ طبرانی ۔ اِطْفِئُوا الْحَرِیْقَ بِالتَّکْبِیْرِ ؂ (ترجمہ) ۔ آتش سوختہ را بذریعہ تکبیر سرد کن۔ بر بنائے ایں حدیث ہائے مبارکہ اذانِ حریق متفقاً مسنون شد نزد شامی و ابن حجر ہم سنیت ایں مسلم است چنانچہ فتاوٰی ردّ المحتار جلد اول بر صفحہ نمبر ص۲۵۷ است ۔ قَدْ یُسَنُّ الْاَذَانُ لِغَیْرِ الصَّلٰوۃِ کَمَا فِیْ اَذَانِ الْمَوْلُوْدِ وَالْمَھْمُوْمِ وَالْمَصْرُوْعِ وَعِنْدَ الْحَرِیْقِ ؂ (ترجمہ) اذان بغیرِ نماز ہم سنت است۔ چنانکہ اذانِ طفل یک روزہ و غم زدہ و برائے مریض مرگی و نزد آتش زدہ۔ حالانکہ در روایت کہ علماء استدلالِ سنیت اذان کنند۔ بالکل لفظِ اذان موجود نیست۔ فقط لفظِ تکبیر است۔ و فقط لفظِ تکبیر دلیل اذان شد پس چہ وجہ است کہ در روایتِ دفن و در روایت لَقِّنُوْا مَوْتَاکُمْ۔ لفظِ تکبیر و لفظ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دلیلِ اذان نہ باشد۔ و چوں نزدِ بزرگان برائے دیگر اذانہا صرف لفظِ تکبیر دلیل سنیت کافی۔ پس چگونہ ایں ہم لفظِ تکبیر برائے اذانِ قبر کافی نباشد۔ ایں جا صراحت چہ ضروری است۔ پس ما را قولِ ابن حجر قطعاً مسلّم نیست۔ خلاصہ ایں کہ بقانونِ شریعت نزدِ ہمہ فقہاء اذانِ قبر مستحب و جائز و سنت است۔ و نزدِ ابن حجر مکی و شامی و علامہ خیر الدین رملی اذانِ قبر فقط جائز و مستحب و فائدہ مند است و لے سنت نیست بلکہ بدعتِ حسنہ۔ و تاویلِ شما در قولِ شامی درست نیست۔ زیرا کہ مراد از عِنْدَ اِدْخَالِ الْمَیِّتِ ۔ ہمہ وقتِ دفن است و مقصود ازیں ہمیشگی میباشد۔

کتبہ

نماز کی نیت کب شروع کرتے تکبیر بیٹھ کر سننا واجب ہے،

سوال نمبر ۹ کیا فرماتے ہیں۔ علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ جماعت کھڑی ہونے پر تکبیر جا رہی ہے۔ تو امام کس وقت نیت کر کے تکبیر تحریمہ کہے۔ بعض بزرگوں کا فرمان ہے کہ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ کے وقت امام نیت کرے۔ اور جب تکبیر ختم ہو۔ تو فوراً تکبیر تحریمہ کہے اور نماز شروع کرے۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں۔ کہ امام اور مقتدی اطمینان سے تکبیر سنیں تکبیر تحریمہ ختم ہونے کے بعد نیت کرے۔ پھر تکبیر تحریمہ کہے۔ لہٰذا آپ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ امام کس وقت نیت اور تکبیر تحریمہ کہے۔ اور مقتدی کس وقت نیت شروع کریں۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ؕ

سائل:۔ جناب ماسٹر محمد عبدالمجید صاحب سجادہ نشین دربارِ عالیہ حضرت دینہ شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مقام دینہ۔ ضلع جہلم۔ پاکستان۔ مورخہ: ۱۲-۱-۱۹۶۹

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

الجواب

قانون شریعتِ مطہرہ کے مطابق نماز کی تکبیر جس کو عربی میں اقامت کہا جاتا ہے۔ تمام نمازیوں کا بیٹھ کر سننا واجب ہے۔ خواہ مقتدی ہوں یا امام۔ حدیث پاک میں بہت جگہ اس کا حکم دیا گیا ہے:۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۷ پر ہے:۔ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِبِلَالٍ۔ یَا بِلَالُ اِذَا اَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ فِیْ اَذَانِکَ وَاِذَا اَقَمْتَ فَاحْدُرْ وَاجْعَلْ بَیْنَ اَذَانِکَ وَاِقَامَتِکَ قَدْرَ مَا یَفْرُغُ الْاٰکِلُ مِنْ اَکْلِہٖ وَالشَّارِبُ مِنْ شُرْبِہٖ وَالْمُعْتَصِرُ اِذَا دَخَلَ لِقَضَاءِ حَاجَتِہٖ وَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ ؕ (ترجمہ):۔ حضرت جابر سے مروی ہے بے شک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت بلال کو فرمایا۔ اے بلال! جب اذان دو۔ تو آواز طرز سے لمبی کھینچو۔ اور تکبیر پڑھو۔ تو جلدی کرو۔ بغیر طرز کے اور اذان و تکبیر کے درمیان اتنا وقفہ کرو۔ کہ کھانے والا کھانے سے اور پینے والا پینے سے۔ استنجے والا قضاءِ حاجت سے فارغ ہو جائے۔ اور اے نمازیوں! تم تکبیر سن کر اس وقت تک نہ کھڑے ہوا کرو۔ جب تک مجھ کو نہ دیکھ لو۔ اس حدیث کی سند میں۔ احمد بن حسن۔ معلیٰ بن اسد۔ عبدالمنعم۔ یحییٰ بن مسلم اور حسن اور عطاء۔ راویانِ کرام ہیں۔ ترمذی شریف اوّل صفحہ نمبر ۲۸ پر دوسری سند کے ساتھ اسی حکم کی ایک اور حدیث مکتوب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ۔ نَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ الْمُبَارَکِ

نا معمر عن یحییٰ بن ابی کثیر عن عبد اللہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی خرجت قال ابو عیسٰی حدیث ابی قتادۃ حدیث حسن صحیح ؂ (ترجمہ) :- ہم سے حدیث بیان کی احمد بن محمد نے اُن سے عبد اللہ بن مبارک نے اُن سے معمر نے اُن سے یحییٰ بن ابی کثیر نے وہ راوی عبد اللہ بن ابی قتادہ سے وہ اپنے والد سے راوی۔ فرمایا اُنہوں نے۔ کہ فرمایا نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کہ جب نماز کی تکبیر کہی جائے۔ تو اُس وقت تک نہ کھڑے ہو۔ جب تک مجھ کو نہ دیکھ لو۔ کہ میں نکل آیا۔ اِن دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا۔ کہ یہ حکم تمام نمازیوں کو ہے۔ نہ کہ مکبّرین کو۔ جیسا کہ بعض بیوقوفوں کو دھوکہ لگا۔ کیونکہ پہلی حدیث شریف میں جہاں تک تکبیر پڑھنے والے مکبّر کو حکم دینے کا تعلق تھا۔ وہاں تک آقائے دو عالم علیہ التحیہ والثناء نے واحد کے صیغہ سے حکم فرمایا۔ مثلاً فترسل فاحدر اجعل ؂ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ابتداءِ نماز کے لیے کھڑے ہونے پر۔ لا تقوموا ؂۔ جمع کا صیغہ بتلا ثابت کر رہا ہے۔ کہ یہ حکم تمام مقتدیوں نمازیوں کو دیا جا رہا ہے۔ نہ کہ مکبّر کو۔ اور نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ذکر ہے۔ نہ کہ تکبیر کے لیے کھڑے ہونے کا۔ ورنہ واحد کا صیغہ ہوتا۔ جیسے کہ پہلے صیغے۔ لا تقوموا :- جمع نہ ہوتا۔ کیونکہ اس وقت مکبّر مخاطب ایک ہی ہے۔ اور یہ استدلال صرف میرا ہی نہیں۔ بلکہ تمام شارحین یہی مطلب فرماتے ہیں۔ چنانچہ حاشیہ مشکوٰۃ شریف اسی حدیثِ مطہرہ کے ماتحت صفحہ نمبر ۶۴ پر ہے :- حاشیہ ۱ :- قولہٗ :- ولا تقوموا حتی ترونی ای فی المسجد لان القیام قبل مجیء الامام تعب بلا فائدۃ۔ کذا قال بعضھم۔ و لعلہٗ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج من الحجرۃ بعد شروع المؤذن فی الاقامۃ و یدخل فی محراب المسجد عند قولہ حی علی الصلوٰۃ ؂ (ترجمہ) :- لا تقوموا :- کا حکم اس لیے دیا گیا۔ کیونکہ امام کے آنے سے پہلے کھڑا ہونا بے فائدہ ہے۔ ایسے ہی بعض فقہاء نے فرمایا۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس وقت حجرۂ پاک سے باہر تشریف لاتے تھے۔ جب مؤذن تکبیر پڑھنے میں شروع ہو چکا ہوتا تھا۔ اور حی علی الصلوٰۃ کے وقت آپ محراب پاک میں تشریف لاتے تھے :- ترمذی شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۱ کے حاشیہ نمبر ۳ پہ ہے :- قولہٗ :- لا تقوموا حتی ترونی خرجت قال الشیخ فی اللمعات قال الفقہاء یقومون عند قولہ حی علی الصلوٰۃ و لعل ذالک عند حضور الامام۔ و یحتمل انہٗ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج عند ھذا القول ؂ الخ (ترجمہ) اس لا تقوموا والی حدیث کے بارے میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے لمعات جلد سوم میں فرمایا۔ کہ فقہاء کرام فرماتے ہیں۔ نماز کی جماعت کو

شروع کرنے کے لیے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ پر کھڑا ہونا چاہیے اور شاید یہ حکم امام کے حاضر ہونے کے وقت کا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کے وقت حجرۂ مقدسہ سے باہر تشریف لاتے تھے۔ اِن تمام تشریحات و احادیث سے ثابت ہوا۔ کہ امام اور مقتدیوں کو ہر جماعت کی تکبیر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر سننا چاہیے۔ شروحِ اربعہ ترمذی کے صفحہ نمبر ۱۲۲ پر ہے لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ ط و بر تخیز ید برائے نماز بمجرد تکبیر برآوردن تا آنکہ ببینید مرا یعنی بیرون آمدم از درونِ خانہ و در کتبِ فقہ مذکور است۔ کہ چوں حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ۔ گوید باید برخاست شاید کہ آں حضرت نیز دریں وقت بیرون می آید۔ ترجمہ:۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح ط کے وقت سب نمازیوں کو جماعت کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہٖ وسلم اسی وقت حجرہ پاک سے باہر تشریف لاتے تھے۔ اور تمام فقہاء بھی یہی فرماتے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لَا تَقُوْمُوْا فرمانے کی وجہ بھی یہی ہے۔ اسی طرح کتاب شروح اربعہ کے صفحہ نمبر ۱۵۴ پر ہے۔ چوں اقامت گفتہ شود برائے نماز پس بر نخیزید تا آنکہ ببینید مرا کہ تحقیق بیرون آمدم از درونِ خانہ۔ ترجمہ:۔ اس لَا تَقُوْمُوْا والی حدیثِ پاک سے ثابت ہوا۔ کہ جب اقامت کہی جائے۔ تو کوئی نمازی نہ کھڑا ہو۔ جب تک کہ مجھ کو نکلتا نہ دیکھ لے۔ جب میں باہر آجاؤں۔ تب کھڑے ہوا کرو۔ احادیثِ مطہرہ کا یہ حکم ظاہراً اگرچہ صحابہ کرام کو دیا جا رہا ہے۔ مگر حقیقتاً قیامت تک کے لیے حکم جاری ہے۔ چنانچہ شرح ابی الطیب صفحہ نمبر ۱۵۳ پر ہے:۔ لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ قَدْ خَرَجْتُ اَیْ مِنَ الْحُجْرَۃِ الشَّرِیْفَۃِ۔ وَھٰذَا یَدُلُّ عَلٰی جَوَازِ تَقْدِیْمِ الْاِقَامَۃِ عَلٰی خُرُوْجِ الْاِمَامِ (ترجمہ):۔ لَا تَقُوْمُوْا:۔ والی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ کہ امام کے باہر سے آنے سے پہلے تکبیر کہنا جائز ہے۔ اور یہ شرط نہیں۔ کہ امام تکبیر سے پہلے مصلّیٰ پر بیٹھے۔ ان احادیث اور ان کی شروح سے ثابت ہوا۔ کہ تکبیر بیٹھ کر سننا واجب ہے۔ تمام فقہاء کے نزدیک۔ انہی احادیث کے اقتضاء اور دلالت کی بنا پر تکبیر کے لیے نہ بیٹھنا اور کھڑے ہو جانا مکروہ تحریمی ہے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۵۷ پر ہے:۔ اِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ عِنْدَ الْاِقَامَۃِ یُکْرَہُ لَہُ الْاِنْتِظَارُ قَائِمًا وَلٰکِنْ یَقْعُدُ ثُمَّ یَقُوْمُ اِذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ قَوْلَہٗ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ط (ترجمہ) جب مردِ نمازی مسجد میں تکبیر کے وقت داخل ہوگا۔ تو کھڑے رہنا۔ اور کھڑے کھڑے ختم ہونے کا انتظار کرنا مکروہ ہے۔ لیکن پہلے بیٹھے پھر کھڑا ہو۔: جب کہ مُؤَذِّنُ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح ط:۔ پر پہنچے اور یہ پہلے بتا دیا گیا ہے۔ کہ مطلق مکروہ سے فقہاء کرام

تحریمی مراد لیتے ہیں شامی اور فتح القدیر میں ایسا ہی لکھا ہے۔ یہ حکم صرف مقتدیوں کے لیے نہیں، بلکہ امام پر بھی اس حکم کی اتباع واجب ہے۔ چنانچہ عالمگیری نے اسی جگہ لکھا۔ ان کان المؤذن غیر الامام۔ وکان القوم مع الامام فی المسجد فانہ یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلاثۃ وھو الصحیح[1] (ترجمہ):۔ اگر تکبیر پڑھنے والا مؤذن امام کے سوا ہو۔ اور تمام نمازی امام کے ساتھ مسجد میں ہوں تو امام اور مقتدی سب اس وقت کھڑے ہوں۔ جب مؤذن حَیَّ عَلَی الْفَلَاح ط کہے۔ اور یہ صحیح مسئلہ تینوں اماموں کے نزدیک متفابہ ہے۔ یعنی امام اعظم اور صاحبین کے نزدیک پس ان دلائل سے یہ تو ثابت ہو گیا۔ کہ پنجگانہ جماعت کی تکبیر بیٹھ کر سننا لازم ہے۔ کھڑے ہو کر سننا مکروہ تحریمی ہے۔ مگر حدیث پاک نے بیٹھ کر تکبیر سننے کا کیوں حکم دیا؟ اور فقہاء کرام نے اسی حدیث کے اقتضاء سے اوّلاً کھڑے ہو جانے کو کیوں مکروہ فرمایا؟ تو یاد رکھیے۔ کہ جس طرح اذانِ مؤذن کو پانچ نمازوں کے وقت ادب و احترام سے سننا واجب ہے۔ اور نہ سننے والے شخص کے لیے احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔ اسی طرح ہر جماعت کی تکبیر کو بھی خاموشی اور ادب سے سننا واجب ہے۔ اور جس طرح ہر سننے والے کے لیے اذان کے الفاظ دھرانے باعث ثواب واجر عظیم ہیں۔ (جیسا کہ احادیث متعددہ سے ثابت ہے)۔ اسی طرح جماعت کی تکبیر کے الفاظ کا بھی آہستہ آہستہ جواب دینا باعث اجر و ثواب ہے۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۶۶ پر ہے:۔ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَوْ بَعْضِ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ بِلَالًا اَخَذَ فِی الْاِقَامَۃِ فَلَمَّا اَنْ قَالَ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقَامَہَا اللّٰہُ وَاَدَامَہَا۔ وَقَالَ فِیْ سَائِرِ الْاِقَامَۃِ کَنَحْوِ حَدِیْثِ عُمَرَ فِی الْاَذَانِ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ[2] (ترجمہ):۔ حضرت ابی امامہ یا کسی اور صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تکبیر پڑھنے لگے۔ جب قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ ط پر پہنچے۔ تو پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ اَقَامَہَا اللّٰہُ وَاَدَامَہَا ط اے اللہ ان تکبیروں کو قیامت تک قائم و دائم فرما اور تمام تکبیر میں آپ اسی طرح جواباً فرماتے رہے۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث پاک اذان کے جوابات کے بارے میں گزری۔ اَقَامَہَا میں ھَا ضمیر مؤنث کا مرجع تکبیر کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور نماز کی طرف بھی مگر اکثریت علماء کرام تکبیر کی طرف راجع ہے اسلیے ہم نے یہی اختیار کیا لہٰذا ثابت ہوا۔ کہ تکبیر کے وقت بیٹھنا اس لیے ضروری ہے۔ تاکہ ہر نمازی اپنی اپنی زبان سے کلماتِ تکبیر دھراتا رہے۔ یہاں تک حکم ہے۔ کہ اذان یا تکبیر ہوتے وقت دنیا کا کلام تو درکنار تلاوتِ قرآن کریم بھی بند کرنا لازمی ہے چنانچہ فتاویٰ ھندیہ جلد اوّل صفحہ نمبر ۵۷ پر ہے:۔ وَلَا یَنْبَغِیْ اَنْ یَتَکَلَّمَ السَّامِعُ فِیْ خِلَالِ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَۃِ وَلَا یَشْتَغِلُ بِقِرَائَۃِ الْقُرْاٰنِ وَلَا بِشَیْءٍ مِّنَ الْاَعْمَالِ سِوَی الْاِجَابَۃِ[3] (ترجمہ) اور نہیں لائق ہے۔ یہ کہ اذان اور تکبیر ہوتے وقت درمیان میں کلام کرے۔ (یعنی دنیاوی) کوئی بھی سننے والا اور نہ

مشغول رہے۔ تلاوتِ قرآن پاک میں اور نہ کسی اور کام میں سوائے اذان یا تکبیر کے جوابات دینے میں۔ یعنی جب اذان یا تکبیر شروع ہو۔ تو کہیں بھی کوئی سننے والا ہو۔ ہر قسم کی بات چیت اور کام کاج اور عبادت وظائف چھوڑ کر اذان و تکبیر اور ان کے الفاظ آہستہ دھرانے اور ادعیہ مسنون پڑھنے میں مشغول ہو جائے۔ اس فعل مستحبہ سے جہاں اذان و تکبیر کا ادب و احترام اور وقار قائم ہو گا۔ وہاں توجہ الی اللہ کے ساتھ ساتھ حضورِ قلبی اور الفتِ نماز بھی مؤمن کے دل میں پیدا ہو گی۔ حضرت حکیم الامت قبلہ ملجائی و ماوائی والدِ محترم مفتی احمد یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ جس شخص کا دل نماز میں نہ لگتا ہو۔ اور کوشش بسیار کے باوجود نمازی نہ بن سکے۔ وہ اذان کا احترام اور الفاظ کے جوابات کا خاص اہتمام شروع کر دے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آدابِ اذان اس کو خود بخود نمازی اور متقی بنا دے گا۔ فرماتے تھے۔ کہ یہ عمل مجرب ہے۔ اور یہ فتویٰ آپ کی حیاتِ طیبہ میں۔ میں نے لکھا تھا۔ مگر آج جب کہ برائے طباعت اس فتوے پر نظرِ ثانی کر رہا ہوں تو حضرت قبلہ کے ملفوظات سے غیر مطبوعہ یہ ملفوظ بوجہ مناسبت شامل کر رہا ہوں۔ بہر حال تکبیر جماعت بیٹھ کر سننا ضروری ہے۔ دنیا میں مشغول انسان بعض موقعوں پر دنیا میں اتنا منہمک ہو جاتا ہے۔ کہ اس کو کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ بحالتِ نماز بھی اس کا دل آماجگاہ دنیا بنا رہتا ہے اور جو وقت صرف خشوع و خضوع کا ہونا ضروری ہے۔ اس وقت بھی دنیوی گتھیاں سلجھانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اور یہ اس کے بس کی بات نہیں غیب جاننے والے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو سب کچھ علم تھا۔ کہ دنیا میں بھی ایک ایسا نفسی نفسی کا وقت آنے والا ہے۔ مولانا روم نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا۔ شعر

اہلِ دنیا کافرانِ مطلق اند !   روز و شب در زق زق و در بک بک اند

ترجمہ: دنیا والے بالکل ناشکر ہیں۔ کہ اللہ و رسول سے دور ہیں۔ دن رات، دولتِ دنیا کی گھاگھی ہیں۔ اور اسی بک بک جھک جھک میں پھنسے ہوئے۔ ان وجوہ کے پیش نظر۔ رؤف و رحیم آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پہلے۔ بہت آسان قانون بنا دیا۔ کہ اے دنیا کی الجھنوں میں پھنسے ہوئے مسلمانوں نماز میں عجز و انکساری اور حضورِ قلبی کو حاصل کرنے کے لیے بیرونِ مسجد ہو۔ تو اذان میں دل لگاؤ۔ اور مسجد میں آکر قلب و ذہن اور خیالات و تصورات کو تکبیرِ جماعت میں لگاؤ۔ تاکہ بوقتِ صلوٰۃ و قیام تمہارے لیے خشوع اور خشیتِ الٰہی کا راستہ ہموار ہو۔ اور شریعتِ مطہرہ نے عجب کرم نوازی سے اس قانونِ اجابت کو فرض یا واجب نہ فرمایا۔ بلکہ استحباب کا درجہ عطا فرمایا۔ تاکہ کسی مجبور کی کوتاہی پر گرفت اخروی نہ ہو۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۵۷ پر ہے: وَإِجَابَةُ الْإِقَامَةِ مُسْتَحَبَّةٌ هٰكَذَا فِي فَتْحِ الْقَدِيْرِ تکبیر کے لفظوں کا جواب دینا مستحب ہے۔ اس تمام گفتگو سے ثابت ہوا۔ کہ تکبیر بیٹھ کر سننی چاہیے۔ اور زبان سے صرف الفاظِ تکبیر ادا کرنے چاہیئے۔ ان لفظوں کے سوا اور کوئی لفظ اس وقت زبان سے نہ نکلیں۔ تب وہ نمازی۔ نماز کے کامل ثواب کا مستحق ہو گا۔ ہاں جب تکبیر مکمل ہو تب نیتِ نماز کی طرف متوجہ ہو۔

اس طرح کہ دونوں ہاتھ کانوں تک اُٹھے ہوں زبان پر اللہ اکبر کا ذکر ہو۔ اور دل میں نیتِ نماز ہو۔ چنانچہ کبیری شرحِ منیہ صفحہ نمبر ۲۹۶ پر ہے:۔ وَ فِی الْکِفَایَۃِ عَنْ شَرْحِ الطَّحَاوِیْ۔ اَلْاَفْضَلُ اَنْ یَّشْتَغِلَ قَلْبُہٗ بِالنِّیَّۃِ وَ لِسَانُہٗ بِالذِّکْرِ یَعْنِی التَّکْبِیْرَ وَ یَدُہٗ بِالرَّفْعِ ؕ (ترجمہ):۔ کفایہ میں بحوالہ شرح طحاوی منقول ہے۔ کہ افضل یہ ہے۔ کہ دل نیتِ نماز میں مشغول ہو اور زبان ذکر تکبیر میں مشغول ہو اور ہاتھ اُٹھنے میں۔ یہ طریقہ اس لیے فرمایا۔ کہ نیت دو قسم کی ہے۔ ۱:۔ نیت جنانی یعنی قلبی ۲:۔ نیت لسانی۔ اصل نیت جو احادیث سے ثابت ہے۔ اور جس کو شریعت نے شرطِ نماز کا درجہ دیا۔ وہ صرف قلبی نیت ہے۔ زبان سے نیت کرنا۔ نبی کریم یا صحابہ سے ثابت نہیں۔ چنانچہ فتاویٰ کبیری صفحہ نمبر ۲۹۵ پر ہے:۔ وَ النِّیَّۃُ بِالْقَلْبِ لِاَنَّہٗ عَمَلُہٗ وَ التَّکَلُّمُ لَا۔ وَنَقَلَ اِبْنُ الْہُمَامِ عَنْ بَعْضِ الْحُفَّاظِ اَنَّہٗ قَالَ لَمْ یَثْبُتْ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِطَرِیْقٍ صَحِیْحٍ وَّلَا ضَعِیْفٍ اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ عِنْدَ الْاِفْتِتَاحِ اُصَلِّیْ کَذَا۔ وَلَا عَنْ اَحَدٍ مِّنَ الصَّحَابَۃِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ وَالتَّابِعِیْنَ رِضْوَانُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ اَجْمَعِیْنَ۔ بَلِ الْمَنْقُوْلُ اَنَّہٗ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ کَبَّرَ ط (ترجمہ):۔ اور نیت دل سے ہوتی ہے اس لیے کہ نیت دل کا کام ہے۔ اور زبانی بات کا نام نیت نہیں۔ اور علامہ ابن ہمام نے بعض حافظ حدیث سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے صحیح یا ضعیف کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں۔ کہ آپ نے نماز شروع کرتے وقت یہ الفاظ ادا کیے ہوں۔ کہ میں فلاں نماز پڑھنے لگا ہوں اسی طرح زبانی نیت کسی صحابہ سے ثابت نہیں، نہ تابعین سے رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ بلکہ احادیث میں فقط یہی منقول ہے۔ کہ جب تکبیر ختم ہوتی تھی۔ تو عام نمازی کھڑے ہو کر فوراً نماز شروع فرما دیتے تھے تو گویا اُس وقت نیت کی۔ فقط ایک ہی قسم۔ دلی نیت تھی۔ کیونکہ اُس وقت محبتِ نماز لوگوں کے دلوں میں۔ بطریقہ اتم موجود تھی۔ ہر وقت دل نماز میں حاضر رہتے تھے۔ دنیا کی ٹک ٹک و جھک جھک سے دور رہتے تھے۔ اُن کا نقشہ بقولِ پنجابی بالکل اس طرح تھا۔ کہ:۔ ہتھ کار ول۔ دل یار ول ایسے ہی پاکیزہ لوگوں کے لیے ارشادِ پروردگار ہے:۔ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِہِمْ دَآئِمُوْنَ ط (ترجمہ):۔ وہ پیارے بندے ہمیشہ ہی نماز میں رہنے والے ہیں۔ (اے میرے کریم مجھ کو بھی سچا نمازی بنا) بعد میں جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ صحبتِ اغیار سے مسلمانوں کے دل پژمردہ ہوتے گئے۔ دلوں میں وہ ایمانی تروتازگی باقی نہ رہی۔ جس سے حضورِ قلبی میسر ہوتی تھی۔ تفکراتِ دنیا کا ازدہام بڑھا۔ تو علماءِ ملت نے زبان کو بھی دل سے ملایا۔ اور نیت کو بدعتِ حسنہ فرمایا۔ چنانچہ کبیری صفحہ نمبر ۲۹۶ پر ہے:۔

وَهٰذِهٖ بِدْعَةٌ لٰكِنْ عَدَمُ النَّقْلِ وَكَوْنُهٗ بِدْعَةٌ لَا يُنَافِيْ كَوْنَهٗ حَسَنًا لِقَصْدِ اِجْتِمَاعِ الْعَزِيْمَةِ ط (ترجمہ): ۔ اور یہ زبانی نیت بدعت ہے۔ لیکن اس کا منقول فی الحدیث نہ ہونا۔ ۔ اور بدعت ہونا اس کے حسن لذاتہٖ ہونے کے خلاف نہیں۔ کیونکہ یہ لسانی نیت دل کے خیالات کو جمع کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ص۶۵ پر ہے۔: وَلَا عِبْرَةَ لِلذِّكْرِ بِاللِّسَانِ۔ فَاِنْ فَعَلَهٗ لِتَجْتَمِعَ عَزِيْمَةُ قَلْبِهٖ فَهُوَ حَسَنٌ ط (ترجمہ): ۔ دلی ارادے کے بغیر زبان سے نیتِ نماز کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہاں اگر قلبی ارادے کو حاضر کرنے کے لیے زبان سے نماز کی نیت کرتا ہے۔ تو وہ اچھا ہے۔ یعنی بدعتِ حسن ہے۔ خلاصہ یہ کہ تکبیرِ جماعت بیٹھ کر سننا واجب ہے اور اس کے الفاظ کی تکرار کرنا مستحب ہے۔ حَيَّ عَلَى الْفَلَاح پر کھڑے ہو کر فقط قلبی یا قلبی زبانی دونوں نیتیں کرے۔ مگر تکبیر ختم ہونے کے بعد نیت شروع ہو۔ کیونکہ نیت کا نماز سے ملا ہونا ضروری ہے اسی طرح فقہاء فرماتے ہیں۔ چنانچہ ھندیہ جلد اوّل صفحہ نمبر ص۶۷ پر ہے۔: اَجْمَعَ اَصْحَابُنَا عَلٰى اَنَّ الْاَفْضَلَ اَنْ تَكُوْنَ النِّيَّةُ مُقَارِنًا لِلشُّرُوْعِ ط (ترجمہ): ۔ ہمارے امام اس بات پر متفق ہیں۔ کہ افضل یہ ہے کہ نیت بالکل نماز شروع کرنے سے متصل ہو۔ ایسے ہی کبیری صفحہ نمبر ص۲۹۶ پر ہے۔: ہم احناف کے نزدیک تو فقط تکبیر ختم ہونے کے بعد نیت کرنا افضل ہے۔ مگر شوافع کے نزدیک فرض ہے۔

ہمارے زمانے کے وہابی محض اہلِ سنت سے حسد و ضد کی بنا پر اتنے دلائلِ احادیث کو پسِ پشت ڈال کر تکبیر کھڑے ہو کر سننے کی بدعت بنائے بیٹھے ہیں۔ اور دلیل لیتے ہیں۔ فاروقِ اعظم کے واقع سے کہ آپ نے ایک دفعہ تمام نمازیوں کو کھڑا کر کے تیر سے صفوں کو درست کیا۔ بعد میں تکبیر کہی گئی۔ لہٰذا لائق ہے۔ کہ صفوں کو درست کرنے کے لیے سب نمازی کھڑے ہو جائیں۔ بعد میں تکبیر کہی جائے یہ تھا وہابی استدلال مگر یہ دو وجہ سے غلط ہے۔ اوّلاً اس لیے کہ اس معنے کی حدیث نہ صحاح ستہ میں ہے۔ نہ مشکوٰۃ شریف، نہ موطا امام مالک، نہ بلوغ المرام، نہ سبل السلام، نہ مسند امام اعظم، نہ موطا امام محمد، نہ موطا امام مالک، نہ صحیح البہاری جامع الترضوی۔ کسی جگہ بھی ان الفاظ کی حدیث نہیں۔ ہاں فاروقِ اعظم کے بارے دوسری الفاظ کی حدیث پاک موجود ہے۔ چنانچہ موطا امام مالک جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۳۲ پر ہے۔: حَدَّثَنِيْ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَأْمُرُ بِتَسْوِيَةِ الصُّفُوْفِ ط (ترجمہ): ۔ حضرت نافع سے روایت ہے۔ کہ فاروقِ اعظم صفوں کے درست کرنے کا حکم دیا کرتے تھے، کسی وعظ یا خطبے میں تکبیر سے پہلے یا تکبیر کے بعد؟ اس حدیث شریف نے کچھ نہیں بتایا۔ لہٰذا اس حدیث کے لیے کسی شرح کی ضرورت ہے۔ چنانچہ صحیح البہاری

صفحہ نمبر ص۵۴ پر ہے۔ اور ترمذی شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ص۳۱ پر ہے:۔ وَرُوِیَ عَنْ عُمَرَ اَنَّہٗ کَانَ یُوَکِّلُ رِجَالًا بِاِقَامَۃِ الصُّفُوْفِ وَلَا یُکَبِّرُ حَتّٰی یُخْبَرَ اَنَّ الصُّفُوْفَ قَدِ اسْتَوَتْ وَرُوِیَ عَنْ عَلِیٍّ وَّعُثْمَانَ اَنَّھُمَا کَانَا یَتَعَاھَدَانِ ذٰلِکَ وَیَقُوْلَانِ اِسْتَوُوْا وَکَانَ عَلِیٌّ یَقُوْلُ تَقَدَّمْ یَا فُلَانُ تَاَخَّرْ یَا فُلَانُ ؂ (ترجمہ)۔: حضرت عمر ایک مرد مقرر کر دیتے تھے۔ جو صفوں کو درست کرائے۔ اور اس وقت تک تکبیر تحریمہ آپ نہ کہتے تھے جب تک یہ خبر نہ مل جاتی۔ کہ صفیں درست ہوگئیں۔ حضرت علی و حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ کہ یہ دونوں بزرگ اس کام کی ڈیوٹی سنبھالتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ لوگو! صفیں درست کرو۔ اور حضرت علی فرماتے تھے۔ کہ اے فلاں پیچھے ہو جا۔ اے فلاں آگے ہو جا! سبحان اللہ اس حدیثِ پاک نے شرح کر دی۔ کہ صفوں کی درستگی تکبیر جماعت ہو جانے کے بعد کی جاتی تھی۔ لفظ لَا یُکَبِّرُ سے مراد امام کی تکبیر تحریمہ ہے۔ اس لیے کہ مؤذن کی تکبیر کے لیے عربی میں اقامت یا قامت بصیغہ ماضی آتا ہے۔ چنانچہ اس سے بھی واضح صحیح البہاری کے صفحہ نمبر ص۵۴ پر موطا امام مالک جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۳۳ پر ایک اور حدیث پاک ہے:۔ عَنْ مَالِکٍ اَنَّہٗ قَالَ کُنْتُ مَعَ عُثْمَانَ ابْنِ عَفَّانَ فَقَامَتِ الصَّلٰوۃُ وَاَنَا اُکَلِّمُہٗ فِیْ اَنْ یَّفْرِضَ لِیْ فَلَمْ اَزَلْ اُکَلِّمُہٗ وَھُوَ یُسَوِّی الْحَصْبَآءَ بِنَعْلَیْہِ حَتّٰی جَآءَہٗ رِجَالٌ قَدْ کَانَ وَکَّلَھُمْ بِتَسْوِیَۃِ الصُّفُوْفِ فَاَخْبَرُوْہُ اَنَّ الصُّفُوْفَ قَدِ اسْتَوَتْ فَقَالَ لِیْ اِسْتَوِ فِی الصَّفِّ ثُمَّ کَبَّرَ ؂ (ترجمہ)۔: مالک کہتے ہیں۔ کہ میں حضرتِ عثمان غنی کے ساتھ تھا کہ اقامت ہوئی۔ اور نماز کھڑی ہوگئی۔ میں اپنی ذاتی بات آپ سے کرتا رہا اور آپ خاموشی سے پیر مبارک سے کنکریاں برابر فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کے صف درستی پر مقرر کردہ آدمی آ گئے۔ اور عرض کیا۔ سب صفیں درست ہوگئیں۔ تو آپ نے مجھے بھی فرمایا۔ کہ صف میں برابر ہو جاؤ۔ تب فوراً آپ نے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کر دی۔ اس حدیث میں کہیں بھی نہیں۔ کہ صفیں درست کر کے اقامت ہوئی۔ بلکہ یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ صحابہ کرام کے زمانے میں پہلے بیٹھ کر تکبیر کہی جاتی تھی۔ پھر کھڑے ہو کر صفیں درست کرتے تھے۔ پھر نماز کی نیت و تحریمہ سے نماز کی جماعت شروع ہوتی تھی۔ اگر! قَامَتِ الصَّلٰوۃُ کا معنی تکبیر جماعت نہ کیا جائے۔ بلکہ لوگوں کا کھڑا ہونا بلا دلیل کیا جائے۔ تو اقامت کے لیے کون سا لفظ لاؤ گے۔ صرف صحابہ کے زمانے میں ایسا نہ ہوتا تھا۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حَیَّ عَلَی الْفَلَاح پر سب نمازیوں کو کھڑا کر کے پھر صفیں درست فرماتے تھے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۹۸ پر ہے:۔ وَعَنْ نُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

يُسَوِّي صُفُوفَنَا إِذَا قُمْنَا إِلَى الصَّلٰوةِ فَإِذَا اسْتَوَيْنَا كَبَّرَ۔ رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ ؎ (ترجمہ)۔ نعمان بن بشیر فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو اس وقت درست فرماتے تھے، پس جب ہم تکبیر سن کر حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ پر کھڑے ہو جاتے تھے، پس جب ہم صفوں میں برابر ہو جاتے تھے۔ تو آپ تکبیر تحریمہ فرماتے تھے۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوا۔ کہ تکبیر اور نماز میں دینی وجہ سے دیر لگنے میں حرج نہیں، جب یہاں تکبیر اقامت کے بعد صفوں کی درستی ہے۔ تو اسی طرح فاروق اعظم کے وقت میں بھی۔ اور پھر خود فاروق اعظم صفیں درست نہیں فرماتے۔ بلکہ حضرتِ عثمان یا حضرت علی یا دیگر لوگ۔ لہٰذا وہابیوں کا یہ کہنا کتنا غلط ہے کہ حضرتِ عمر تیر سے کر اقامت سے پہلے کھڑا کر کے خود صفیں درست کرتے تھے۔ حالانکہ احادیث میں نہ تیر کا ذکر ہے۔ نہ خود صفیں درست کرنے کا۔ ہاں البتہ ایک جگہ خود نبی کریم رؤف و رحیم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمْ سے متعلق تیر کا ذکر ہے۔ مگر وہ اس طرح نہیں۔ بلکہ صرف تشبیہ کے طور پر۔ چنانچہ سبل السلام جلد دوم صفحہ نمبر ۲۹ پر اور مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۹۷ پر جامع الرضوی صفحہ نمبر ۵۵ پر اور مسلم شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۸۲ پر۔ ابوداؤد جلد اوّل صفحہ نمبر ۹۷ پر ہے :- حَدَّثَنَا مُوْسٰی بْنُ إِسْمَاعِيْلَ ثَنَا حَمَّادٌ عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيْرٍ يَقُوْلُ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَوِّيْنَا فِي الصُّفُوْفِ كَمَا يُقَوَّمُ الْقِدْحُ حَتّٰى إِذَا ظَنَّ أَنْ أَخَذْنَا ذَالِكَ عَنْهُ ؎ (ترجمہ) :- موسےٰ بن اسمٰعیل نے ہم کو حدیث بیان کی۔ اُن سے حماد نے۔ کہ روایت ہے سماک بن حرب سے۔ فرمایا۔ کہ سنا میں نے نعمان بن بشیر سے فرماتے تھے۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم۔ ہم کو صفوں میں اس طرح برابر فرماتے تھے۔ کہ جس طرح گویا تیر درست ہوتا ہے۔ یہ برابر ہونا بہت دن رہا۔ یہاں تک کہ نبی پاک علیہ السلام کو یقین ہو گیا۔ کہ اب ہم نے آپ سے یہ سبق سیکھ لیا۔ (تب آپ نے یہ اہتمام ترک فرمایا۔) اس جگہ تیر کی صرف تشبیہ ہے۔ اور کسی جگہ تیر کا ذکر نہیں ملتا۔ پس ثابت ہوا۔ کہ وہابی استدلال قطعًا غلط اور بناوٹی ہے۔ ثانیًا اس لئے کہ حضرتِ فاروق اعظم کا اس اہتمام سے صفوں کی برابری کا حکم دینا ایک ہنگامی اور وقتی حکم تھا۔ جو صرف ناواقفوں کو چند دن سمجھایا گیا۔ جب اُن کو صفوں کی برابری کا طریقہ آگیا۔ تو وہ خود برابر ہونے لگے۔ جیسے کہ ابھی یہی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعلِ پاک سے ثابت ہوئی۔ پس یہ فعل ضرورت کی جگہ عارضی طور پر ایک دو دن کے لیے تو ہو سکتا ہے۔ وہ بھی بیٹھ کر تکبیرِ جماعت سننے کے بعد حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ پر کھڑے ہو کر۔ لیکن اس کو وہابیوں کی طرح دائمی رواج بنانا محض بدعت سیّئہ ہے۔ وہابیوں کی یہ دلیل ثالثًا اس لئے غلط ہے

کہ وہ صرف اہل سنت کی ضد میں تکبیر کھڑے ہو کر سننے کے لیے بہانہ تراشتے ہوئے فاروقِ اعظم کے فعل کا حوالہ دیتے ہیں۔ حالانکہ جو روایت انہوں نے پیش کی۔ وہ قطعاً کہیں نہیں۔ اور جو حدیثیں فعلِ فاروقی سے ملتی ہیں۔ ان میں یہی ثابت ہوتا ہے۔ تکبیر پہلے۔ کھڑا ہونا اور صف درست کرنا بعد میں۔ بہر حال قانون اسلامی یہ ہے۔ کہ تکبیر بیٹھ کر سنی جائے۔ اور تکبیر سے متعلق مسنون دعائیں اور کلمات تکبیر کے جوابات بیٹھ کر ہی تمام نمازی ادا کریں۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح پر کھڑے ہوں۔ پھر اگر امام مناسب سمجھے۔ تو ناواقفوں کی صف درست کر دے۔ پھر قلبی اور زبانی نیت نماز کر کے فوری تکبیر تحریمہ کہی جائے۔ سوال میں جن بزرگوں نے قد قامت الصلوٰۃ کے وقت نیت کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ غلط ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم۔

کتبـــــــــــــــــــــــــــہ

جریان کی بیماری والے مریض کی نماز و تلاوت کا حکم

سوال نمبر ۱۱ کیا فرماتے ہیں۔ علماء دین اس مسئلے میں کہ جریان کا مریض نماز کس طرح ادا کرے۔ جس شخص کو روزانہ احتلام ہوتا ہے۔ کیا وہ تیمم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔ سردی کی وجہ سے ایسا مریض اگر غسل نہ کرے۔ اور تیمم کر کے نماز ادا کرے۔ تو کیا جائز ہے۔ اسی طرح تلاوتِ قرآن پاک کا حکم فرمایا جائے:۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا۔

سائل:۔ محمد رفیق گجرات شہر مورخہ: ۱۷-۱-۹۰

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

لفظ جریان جَرْیٌ سے مشتق ہے۔ یہ عربی لفظ ہے۔ صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔ جیسے غَرْیَانٌ، قَرْیَانٌ، دِمَادَانٌ وغیرہ۔ اس کا ترجمہ ہے۔ بہت جاری رہنے والا، مگر طب اور حکمت کی زبان میں ایک ایسی سخت بیماری کا نام ہے۔ جو عورت و مرد دونوں میں مشترک ہوتی ہے۔ اگرچہ نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بہت تکلیف دہ بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ شافی الامراض ہم سب مسلمانوں کو اس سے بچائے، جریان بیماری کی تین قسمیں ہیں۔ ۱:۔ جریان بالمذی ۔ ۲:۔ جریان بالمنی ۔ ۳:۔ جریان مع سوزاک ۔ اس تیسری قسم کی پھر دو قسمیں ہیں ۱:۔ جریان مع سوزاک بالمنی ۔ ۲:۔ جریان مع سوزاک بالمذی ۔ گویا کہ جریان کی پانچ قسمیں ہو گئیں۔ پہلی قسم جریان بالمذی اور پانچویں قسم جریان مع سوزاک بالمذی ان دونوں قسم کی بیماری سے غسل نہیں ٹوٹتا۔ صرف وضو ٹوٹتا ہے۔ کیونکہ مذی یا ودی نکلنے سے غسل نہیں ٹوٹتا۔

صرف وضو ٹوٹتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۵ پر ہے:۔ وَاِنْ تَیَقَّنَ اَنَّہٗ وَدْیٌ کَاالْغُسْلَ عَلَیْہِ وَاِنْ تَیَقَّنَ اَنَّہٗ مَذْیٌ لَایُجْعَلُ عَلَیْہِ الْغُسْلُ ط (ترجمہ):۔ اور اگر یقین ہو۔ کہ یہ ودی ہے تب بھی خواہ بیماری سے نکلیں یا تندرستی سے صرف وضو واجب ہوگا۔ بیماری کی حالت میں اس کا حکم سلسل بول کی طرح ہوتا ہے۔ کہ جس شخص کو یہ بیماری ہو اور بار بار مذی یا ودی نکلتی ہو۔ تو وہ ایک لنگوٹ باندھ کر رکھے۔ تاکہ اس کے کپڑے پلید نہ ہوں، جب نماز پڑھنے کا ارادہ ہو۔ تو وضو کرے۔ اور لنگوٹ اتار کر پاک لباس میں نماز پڑھے بعد نماز پھر لنگوٹ باندھے۔ اور جب تک نماز کا وقت باقی اس کا وضوء باقی رہے گا۔ بشرطیکہ کسی دوسری طرح نہ ٹوٹے۔ ہر نماز فرض ادا کے لیے وضو کرنا لازم ہے۔ سردی ہو یا نہ ہو صرف اس بیماری کی وجہ سے تیمم نہیں کرسکتا۔ جریان بالمنی میں اگر منی شہوت سے نکلتی ہے۔ تو غسل واجب خواہ بیداری میں ہو یا احتلام میں۔ صرف سردی کے بہانے تیمم نہیں کرسکتا۔ ہاں مسلک حنفی میں اگر طبیب حاذق مسلمان بتائے کہ غسل سے بیمار ہو جائے گا۔ تب تیمم کرسکتا ہے۔ اگر منی بلاشہوت بحالت سکون خارج ہوتی ہے۔ تو غسل واجب نہیں۔ صرف وضو واجب ہوگا چنانچہ فتاوٰی ھندیہ جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۴ پر ہے:۔ رَجُلٌ بَالَ فَخَرَجَ مِنْ ذَکَرِہٖ مَنِیٌّ اِنْ کَانَ مُنْتَشِرًا عَلَیْہِ الْغُسْلُ وَاِنْ کَانَ مُنْکَسِرًا عَلَیْہِ الْوُضُوْءُ ط (ترجمہ):۔ ایک مرد نے پیشاب کیا۔ تو نکلی اس کے ذکر سے منی۔ اگر آلہ تناسل متحرک بالشہوت ہو۔ تو غسل واجب اور اگر عضو تناسل سکون میں ہو۔ تو صرف وضو واجب۔ ایسے ہی صرف سوزاک کے مرض سے بھی فقط وضو واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ سوزاک میں اندرونی زخم سے پیپ نکلتا ہے۔ اور پیپ نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ وضو واجب ہوگا۔ سوزاک بالمنی کی صورت شاذ و نادر ہوتی ہے۔ مگر اس کا حکم جریان بالمنی کی طرح ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ بہر صورت تیمم کرنے کی اجازت صرف اُسی وقت ہے۔ جب کہ بیماری کا حتمی اندیشہ ہو۔ اس کے علاوہ جب تک پانی کے استعمال پر قدرت ہوگی۔ اس وقت تک تیمم جائز نہ ہوگا۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبـــــہ

نفل، سنتوں کے بعد دعا مانگنے کا بیان

باب النوافل:۔ سوال نمبر گیارہ ۱۱:۔ زید کہتا ہے کہ وتر اور نفل کے بعد دعا مانگنی اجتماعی طور پر ثابت نہیں۔ اس لیے نفلوں کے بعد امام کو دعا نہ مانگنا چاہیے۔ زید کے پاس دلیل کوئی نہیں۔ بکر کہتا ہے۔ کہ ہر وقت ہر طریقے سے دعا ء

مانگنی جائز ہے دلیل یہ ہے۔ کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے:۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ۔ :۔ اس ارشاد میں کسی زمان، مکان یا انفراد، اجتماع کی قید نہیں۔ اور احادیث مبارکہ میں بھی ہر وقت دعا مانگنے کا حکم ہے۔ اور دعا کو مُخُّ الْعِبَادَتِ :۔ فرمایا گیا ہے۔ رمضان المبارک کی ہر گھڑی قبولیت کے لیئے ہے۔ زید کا اجتماعی دعاء کو ناجائز یا حرام کہنا بلا دلیل قابلِ قبول نہیں۔ جب اصولِ فقہ کا مشہور قاعدہ موجود ہے کہ حلت کے منکر کو دلیل دینی لازم ہے۔ زید کی دلیل نہ ہونے کی صورت میں زید کا قول مقبول ہے یا مردود۔ یہاں بہت جھگڑا ہے:۔ سب نے آپ کے فیصلے پر اعتماد کا اقرار کیا ہے:۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا :۔

سائل:۔ محمد مصطفےٰ کمال الدین صدر مدرس و مفتی دارالعلوم از کریم نگر شہر انڈیا بھارت مورخہ ۱۹ ۱/۵

بِعَوْنِ اللّٰہِ الْوَھَّابِ ط

الجواب

زید کا قول قطعاً غلط ہے اور بکر درستی پر ہے۔ کیونکہ یہ ٹھیک نہیں۔ کہ نوافل کے بعد دُعاء مانگنی جائز نہیں بلکہ متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نمازِ تہجد و صلوٰۃ تشکر کے بعد دُعا مانگا کرتے تھے بکر کی آیت مبارکہ مذکورہ فی السّوال سے استدلال بھی بہترین ثبوت ہے۔ شریعت اسلامیہ میں مسلک مجتہد بھی دلیل شرعی دلیل مسلّمہ ہے۔ لہذا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول پاک اہل ایمان کے لئے شرعی دلیل ہے اُن کے مسلک کی کُتبِ فقہاء میں اُن کا قولِ پاک اِس طرح کہ بعد نوافل دُعا مانگنا افضل ہے۔ اور جس طرح فرائض کے بعد ہر دُعا متفقاً لازم ہے۔ اسی طرح بعد نمازِ نفل بھی۔ کیونکہ علم اُصول کا قاعدہ مشہور ہے فِی الْفُرُوْعَاتِ حُکْمُ التَّابِعِ وَالْمَتْبُوْعِ وَاحِدٌ ط یعنی فروعات میں تابع متبوع کا حکم ایک طرح ہوتا ہے ردّ المحتار جلد اوّل ص۴۹۲ پر ہے بَلْ یُحْمَلُ عَلَی الْاِتْیَانِ بِمَا بَعْدَھَا لِاَنَّ السُّنَّۃَ مِنْ لَوَاحِقِ الْفَرِیْضَۃِ وَتَوَابِعِھَا وَمُکَمِّلَاتِھَا فَلَمْ تَکُنْ اَجْنَبِیَّۃً عَنْھَا فَمَا یُفْعَلُ بَعْدَھَا یُطْلَقُ عَلَیْہِ اَنَّہٗ عَقِیْبُ الْفَرِیْضَۃِ :۔ دُعاء کے ثبوت بلکہ حکم تو بہت روایات میں ظاہر و باہر ہیں۔ جن چیزوں کے ثبوتِ حلت و حرمت بھی میسر نہ ہوں۔ وہ بھی حلال ہیں۔ چنانچہ مشہور حدیث ہے:۔ اَلْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَمَا سَکَتَ عَنْہُ فَھُوَ مَعْفُوٌّ۔ زید کو چاہیئے۔ کہ ناجائز ہونے پر دلیل پیش کرے۔ فقط زبانی گفتگو کافی نہ ہوگی۔ ورنہ کئی اشیاء کو حرام ماننا پڑے گا خود زید کا وجود بھی اور تمام ایجادات خواہ دینی یا دنیوی جیسے مدارس، مطبوعہ کتب وغیرہ۔ پس جب یہ بلا ثبوت زید کے نزدیک جائز تو دُعاء بعد نوافل بھی جائز ہونا چاہیئے واللہ ورسولہ اعلم

کتبہ

مسجد میں نفل سنتیں پڑھنے کا بیان :۔

سوال ۱۲: کیا فرماتے ہیں۔ علمائے کرام اِس مسئلہ میں کہ فرائض نماز ادا کرنے سے پہلے اور بعد نفل، سنتیں مسجد میں پڑھنی چاہئیں یا گھر میں۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ گھر میں ہی پڑھنی چاہئیں مسجد میں پڑھنی ناجائز ہیں۔ اور حدیث پاک میں ممانعت ثابت ہے۔ مسجد میں نوافل پڑھنا کسی صحابی سے ثابت نہیں۔ موجودہ زمانے میں بعد فرائض مسجدوں میں جو نفل، سنت پڑھنے کا رواج ہُوا ہے۔ وُہ غلط ہے۔ لہٰذا اس کو روکنا چاہیئے۔ پس فرمایا جائے۔ کہ کیا یہ ٹھیک ہے۔ اور مساجد میں نفل پڑھنا ناجائز ہیں۔ ہم کو دُرست مدلل فتوٰی عطا فرمایا جائے

السائل :۔ عبداللطیف افضل۔ محلہ فتوپورہ گجرات۔ مورخہ ۱۹۹۵/۱۰/۱ ط

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

کسی عبادت کو مسجد میں سے جبراً روکنا سخت ترین گناہِ کبیرہ ہے۔ عبادت خواہ نفلی ہو۔ یا واجبی یا فرض۔ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے۔ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ ط (ترجمہ) اُس سے زیادہ ظالم کون ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں سے اللہ کے ذکر کو روکے۔ سوالِ مذکورہ میں جو لوگ مسجدوں میں نفل پڑھنے سے روکنے کی کوشش یا تلقین کرتے ہیں وُہ سخت ترین بیہودہ لوگ ہیں۔ خاص کر اِس زمانے میں جب کہ بمشکل لوگوں کو مساجد میں لایا جاتا ہے قانونِ شرعی کے مطابق عبادتِ نماز میں چار صُورتیں ہیں۔ ۱۔ فرض ۲۔ واجب ۳۔ سُنت ۴۔ نفل :۔ فرض نماز یعنی پنجگانہ معیّن رکعات مرد کے لیئے بلامجبوری مسجد میں پڑھنا لازم ہیں۔ اگر مرد مسجد کے قریب رہ کر بھی گھر میں یا دکان میں فرض نماز پڑھے گا تو گنہگار ہو گا۔ ہاں البتہ واجب سنت نفل گھر میں بھی پڑھ سکتا ہے۔ نفل کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم جیسے تحیۃ المسجد یہ مسجد میں ہی پڑھ سکتا ہے۔

مسجد سے باہر ہرگز ادا نہ ہوں گے دوسری قسم عام نفل خواہ پنجگانہ نمازوں والے نفل و سنتیں ہوں۔ یا اُس کے علاوہ نماز اشراق اوابین، صلاۃ تسبیح، چاشت، تہجد وغیرہ۔ یہ تمام نوافل گھروں والے مقیم شخص کے لیئے مستحب ہے۔ کہ گھر ادا کرے۔ نبی کریم نے اِسی طرح حکم استحبابی فرمایا ہے۔ اِس میں چند حکمتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ گھر کی خلوت میں ریاکاری کا خطرہ نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ بڑوں کو نماز پڑھتا دیکھ کر چھوٹے بچوں کو نماز کی عادت پڑے گی۔ وُہ بھی لوٹے مصلّیٰ کی اہمیت کو سمجھیں گے۔ تیسری یہ کہ بڑی عورتوں پر کبھی نماز معاف ہو جاتی ہے۔ تو مرد کے نوافل سے گھر میں رحمتوں، برکتوں کا نزول ہوگا۔ اور گھر نمازوں سے خالی ہو کر قبرستان کے مشابہ نہ ہوگا۔ اِس لئے کہ آقائے دو عالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جس گھر میں نماز نہیں ہوتی۔ وُہ قبرستان ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔ کہ اے مسلمانوں اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ چوتھی یہ کہ نماز برکت کی چیز ہے۔ اس لئے اس کا کچھ حصہ گھر میں بھی ادا کرو۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص ۱۱۳ پر ہے :۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَضٰی اَحَدُکُمُ الصَّلٰوۃَ فِیْ مَسْجِدِہٖ، فَلْیَجْعَلْ لِبَیْتِہٖ نَصِیْبًا مِّنْ صَلٰوتِہٖ فَاِنَّ اللّٰہَ جَاعِلٌ فِیْ بَیْتِہٖ مِنْ صَلٰوتِہٖ خَیْرًا رَوَاہُ مُسْلِمٌ ط (ترجمہ) حضرت جابر نے فرمایا۔ کہ آقائے دوعالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص تم میں سے مسجد میں نماز ادا کرے۔ تو اس کو چاہیئے۔ کہ کچھ نماز گھر میں بھی ادا کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں بھی اس کی نماز سے کچھ خیر عطا فرمائے گا۔ اس لیئے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب نفلوں کا ذکر نہ فرمایا۔ بلکہ ارشاد ہوا۔ کہ نَصِیْبًا مِّنْ صَلٰوتِہٖ ط (اپنی نماز کا کچھ حصہ) لفظِ صلوٰت کے اطلاق سے تو فرض بھی شامل ہوتے تھے۔ مگر دیگر روایات نے فرائض کو مسجد میں مقرر کر دیا۔ اب اس حدیث میں صرف نفل واجب رہ گئے اور ان کے متعلق ہی ارشاد نبوی ہے۔ کہ کچھ گھر میں بھی۔ پس لفظِ نصیبًا نے شقِ ثانی کو بھی ثابت کر دیا کہ مسجد میں نوافل بھی پڑھنے صحیح ہیں۔ اس روایت مبارکہ کا لفظ فَلْیَجْعَلْ بھی استحباب کو ہی ثابت کر رہا ہے۔ کیونکہ امر استحباب کے لئے بھی آتا ہے۔ اس حدیث میں دیگر روایات کی طرح حکم ہی مراد ہے۔ ورنہ احادیث میں تعارض لازم آئے گا۔ چنانچہ ترمذی اور نسائی شریف میں ہے۔ عَنْ کَعْبِ بْنِ عُجْرَۃَ قَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتٰی مَسْجِدَ بَنِیْ اَشْہَلَ فَصَلّٰی فِیْہِ الْمَغْرِبَ فَلَمَّا قَضَوْا صَلٰوتَہُمْ قَامَ نَاسٌ یَتَنَفَّلُوْنَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکُمْ بِہٰذِہِ الصَّلٰوۃِ فِی الْبُیُوْتِ ط (ترجمہ) کعب بن عجرہ نے فرمایا کہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز مغرب بنی اشہل کی مسجد میں ادا فرمائی۔ نماز سے فراغت کے بعد لوگ نفل پڑھنے لگے (اوابین وغیرہ) تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تم کو چاہیئے۔ کہ اس نماز کو گھر میں پڑھو۔ لفظ عَلَیْکُمْ سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ مستحب ہونا واضح ہے۔ اور بِہٰذِہٖ کی ب بعضیت کو بھی ثابت کر سکتی ہے۔ تو یہ روایت پہلی روایت کی مثل ہوگی۔ یعنی اس نماز سے کچھ نماز گھر میں بھی ادا کیا کرو فائدے وہی ہیں۔ جو پہلے بیان کئے گئے۔ اصطلاحِ شریعت میں لفظ عَلَیْکُمْ صرف وجوب کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثر استحباب کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ جامع صغیر جلد اول نے صفحہ نمبر ۱۲۵ پر حاکم اور بیہقی کی صحیح روایت نقل فرمائی۔ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکُمْ بِلِبَاسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْا حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ط (ترجمہ)

ابی امامہ سے روایت ہے۔ کہ نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ لازم پکڑو تم اونی لباس کو۔ تو اپنے دلوں میں ایمان کی مٹھاس پاؤ گے دیکھو یہاں بھی عَلَیْکُمْ ہے۔ مگر واجب کرنے کے لیئے نہیں۔ بلکہ بہتر ہے۔ کہ فقراء، اولیاء، علماء، عام متقی مسلمان موٹی اون کا کھدر پہنا کریں۔ اگر یہاں عَلَیْکُمْ وجوب کے لیئے ہوتا۔ تو باقی تمام لباس ناجائز ہو جاتے۔ اسی طرح نوافل میں بھی۔ صرف بہتر ہے۔ کہ نفل گھر میں پڑھے جائیں۔ مسجد میں

پڑھنے بھی ناجائز نہیں۔ جیسا کہ سوال میں کچھ لوگوں نے نادانی سے کہا اگر مسجد میں نوافل پڑھنا منع ہوتے۔ تو ان روایات کا کیا مطلب ہوگا۔ جس میں صحابہ کرام بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے مسجد میں نفل پڑھنا ثابت ہیں۔ چنانچہ مشکوۃ شریف صفحہ نمبر ۱۰۵ پر ہے عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ. قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُطِيْلُ الْقِرَاءَةَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ حَتّٰى يَتَفَرَّقَ اَهْلُ الْمَسْجِدِ. رَوَاهُ اَبُوْ دَاوٗدَ

(ترجمہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اکثر بعد نماز مغرب دو رکعتوں میں قرأت اتنی لمبی فرمایا کرتے تھے۔ کہ لوگ نمازیں پڑھ کر مسجد سے چلے بھی جایا کرتے تھے

اس حدیث پاک سے چند باتیں ثابت ہوئیں۔

۱۔ نبی کریم اکثر مغرب کی سنت نفل مسجد میں ہی ادا فرمایا کرتے تھے۔ کیونکہ كَانَ يُطِيْلُ ماضی استمراری ہے جس سے کثرت ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ صحابہ کرام بھی بعد مغرب سنت و نفل مسجد میں ہی ادا فرمادیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ لفظ حَتّٰی کو نبی کریم کی درازی قرأت سے متعلق کیا گیا۔ یعنی اتنی دراز قرأت ہوتی تھی۔ کہ لوگ سنتیں نفل پڑھ کر گھروں کو چلے جاتے تھے۔ عربی قواعد نحویہ کے مطابق لفظ حتّٰی بیانِ انتہاء کے لئے مستعمل ہے۔ روایتِ مبارکہ میں ثابت کیا جارہا ہے۔ کہ صحابہ کرام فرض مغرب پڑھتے ہی نہ چلے جاتے تھے۔ بلکہ کافی دیر کے بعد جایا کرتے تھے۔ حالانکہ نبی کریم ابھی سنتیں ہی پڑھ رہے ہوتے تھے۔ ان جانے سے نبی کریم کی قرأت کا اندازہ لگایا جارہا ہے۔ تو لازمی بات ہے۔ کہ صحابہ کرام فرضوں کے بعد کافی دیر سے جایا کرتے۔ اور پھر یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ صحابہ کرام ویسے ہی بیٹھے رہتے تھے۔ نفل سنت بعد میں جاکر پڑھتے تھے کیونکہ مغرب کے فرضوں کے فوراً بعد سنت نہ پڑھنا بھی خلافِ سنت ہے۔ چنانچہ اسی جگہ مشکوۃ شریف صفحہ نمبر ۱۰۵ پر بیہقی اور رزین کی روایت منقول ہے۔ وَعَنْ مَكْحُوْلٍ (الخ) وَعَنْ حُذَيْفَةَ نَحْوَهٗ وَزَادَ. فَكَانَ يَقُوْلُ عَجِّلُوا الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فَاِنَّهُمَا تُرْفَعَانِ مَعَ الْمَكْتُوْبَةِ (ترجمہ) آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ اے مسلمانوں فرض مغرب کے بعد دو رکعتیں سنت جلدی پڑھا کرو۔ کیونکہ یہ دونوں فرضوں کے ساتھ اٹھائی جاتی ہیں۔ یقیناً صحابہ کرام اس حدیث شریف پر بھی عمل کرتے ہوں گے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ صحابہ کرام مسجد میں سنت، نفل پڑھ لیا کرتے تھے بعض جہلاء کا یہ کہنا۔ کہ مسجد میں نوافل پڑھنا کسی صحابی سے ثابت نہیں۔ محض کم علمی ہے خلاصہ یہ کہ گھر میں نفل پڑھنے بہتر ہیں۔ لیکن مسجد میں جائز ہیں۔ پڑھنے والے کو روکا نہ جائے گا اور یہ بہتر ہونے کا حکم بھی صرف اہل محلہ کے لئے ہے۔ مسافر اور گھر سے دور۔ یا بازار میں دکان دار یا کارخانے کا ملازم، کاروباری، یا مزدور شخص کے لئے بہتر یہی ہے۔ کہ پوری نماز نفل، سنت وغیرہ مسجد میں پڑھ کر ہی باہر نکلے۔ اس لئے کہ جتنی احادیث میں بھی نفل پڑھنے کا ذکر ہے وہاں اپنے ہی گھر مراد ہیں۔ نہ کہ لوگوں کے گھر۔ یہ ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ کہ کوئی شخص مسجد میں فرض پڑھ کر محلے محلے، دروازے کھٹکھٹاتا

پھرے۔ کہ ذرا ٹھیک کھولتا۔ میں نے نفل پڑھتے ہیں۔ حدیث میں بھی ثابت ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم زمانہ سفر میں مسجد میں نفل پڑھا کرتے تھے چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۱۰۵ پر ہے:۔ وَعَنْ عَطَاءٍ قَالَ كَانَ اِبْنُ عُمَرَ اِذَا صَلَّى الْجُمُعَةَ بِمَكَّةَ. تَقَدَّمَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ يَتَقَدَّمُ فَيُصَلِّيْ اَرْبَعًا وَاِذَا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ صَلَّى الْجُمُعَةَ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰى بَيْتِهٖ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَلَمْ يُصَلِّ فِي الْمَسْجِدِ فَقِيْلَ لَهٗ فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهٗ. رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤُدَ ط (ترجمہ):۔ حضرت عطاء سے روایت ہے۔ کہ فرمایا۔ ابن عمر جب مکہ مکرمہ جمعہ پڑھتے تھے۔ تو آگے بڑھ کر دو رکعت ادا فرماتے جمعہ کی۔ پھر بعد جمعہ اپنی جگہ سے ہٹ کر چار رکعت ادا فرماتے۔ اور جب مدینہ منورہ میں ہوتے۔ تو جمعہ کی نماز پڑھتے۔ پھر گھر تشریف لے جاتے۔ اور گھر میں دو رکعت پڑھتے۔ اور مسجد میں نہ پڑھتے تو ان سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا۔ پس فرمایا۔ کہ آقائے دوعالم بھی مکہ مکرمہ و مدینہ طیبہ میں اسی طرح تفریق فرمایا کرتے تھے۔ ثابت ہوا۔ کہ حالتِ سفر میں مسجد میں ہی نوافل پڑھے جائیں گے۔ رہی وہ روایت جس کو صاحبِ مشکوٰۃ امام ولی الدین ابن عبداللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے روایت فرمایا۔ چنانچہ مشکوٰۃ صفحہ نمبر ص۱۱۵ پر ارشاد ہے:۔ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةُ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهٖ اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهٖ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ. رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ ط (ترجمہ) زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ کہ آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مرد کی نماز اس کے گھر میں زیادہ افضل ہے۔ میری اس مسجد یعنی مسجد نبوی میں نماز پڑھنے سے سوائے فرضوں کے اس کو ابوداؤد، اور ترمذی نے روایت کیا محققین کے نزدیک اس روایت پر عقلاً نقلاً اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ نقلاً تو اس لئے کہ یہ روایت مضطرب بھی ہے۔ اور ضعیف بھی۔ مضطرب اس لئے کہ یہاں متن اور اسناد میں بہت اختلاف ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد نے ان ہی زید بن ثابت کی یہی روایت بیان کی۔ تو ترمذی کی اسی روایت سے متن و اسناد میں بہت اختلاف ہوا۔ ترمذی کا متن و اسناد اور ہے۔ جامع صغیر نے اسناد کو اور متن کو مختلف پیش کیا۔ چنانچہ ترمذی شریف صفحہ نمبر ص۹۱ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ نا حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَعِيْدِ بْنِ اَبِيْ هِنْدٍ عَنْ سَالِمٍ اَبِي النَّضْرِ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. قَالَ اَفْضَلُ صَلٰوتِكُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ ط (الخ) حدیث بیان کی ہم سے محمد بن جعفر نے ان سے عبداللہ بن سعید نے ان سے روایت کی سالم نے ان سے روایت کی بسر بن سعید نے ان سے زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ آقائے دوعالم حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے راوی فرمایا۔ تمہاری بہتر نماز وہ ہے۔ جو گھر میں ہو۔ سوائے فرض کے۔ دیکھئے یہاں اسناد میں زید بن ثابت سے پہلے پانچ نام ہیں۔ مگر ابوداؤد میں زید بن ثابت سے پہلے اس طرح اسناد نہیں۔ متن میں بھی اختلاف ہو گیا۔ کہ یہاں فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا کے الفاظ نہیں ہیں۔ جب کہ ابوداؤد و مشکوٰۃ شریف میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ حالانکہ بقولِ مشکوٰۃ شریف روایت ایک

ہی ہے۔ خود ترمذی شریف نے صفحہ نمبر ص۹۰ پر فرمایا۔ وَقَدِ اخْتَلَفُوْا فِیْ رِوَایَةِ ھٰذَا الْحَدِیْثِ طہ (ترجمہ) محدثین کرام نے اِس حدیث کی روایت میں بہت اختلاف کیا ہے۔ کسی نے اس کو مرفوع کہا۔ کسی نے موقوف۔ کسی نے غیر مرفوع۔ وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا یہ روایت مضطرب کے درجے میں ہے۔ ابوداؤد شریف نے اِس کو صفحہ نمبر ص۱۴۹ پر اِس طرح روایت کیا۔ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ صَالِحٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ وَھْبٍ۔ اَخْبَرَنِیْ سُلَیْمَانُ بْنُ بِلَالٍ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ بْنِ اَبِیْ نَضْرٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِیْدٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلٰوةُ الْمَرْءِ فِیْ بَیْتِهٖ اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهٖ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا اِلَّا الْمَکْتُوْبَةَ ط :۔ (ترجمہ) :۔ اس کا ترجمہ وہی ہے۔ جو اُوپر مشکوٰۃ کے الفاظ میں گزرا۔ اس کی اسناد میں چار اشخاص احمد بن صالح۔ عبداللہ بن وہب سلیمان بن بلال۔ ابراہیم بن ابی نضر۔ ترمذی کی اسناد سے بالکل مختلف ہیں۔ غرضیکہ اِس روایت کا چونکہ نہ اسناد مضبوط ہے۔ نہ متن۔ اِس لئے یہ روایت اصطلاحِ محدثین میں مضطرب کہلائی۔ اور مضطرب روایت قابلِ سند و اعتماد نہیں ہوتی۔ بلکہ اَوّلاً اِس اختلاف کو دُور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر مطابقت نہ ہو سکے۔ تو روایت مضطربہ کو موقوف رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کا مقدمہ دیباچہ صفحہ نمبر ص۲ پر ہے۔: فَاِنْ اَمْکَنَ الْجَمْعُ فِیْھَا وَاِلَّا فَالتَّوَقُّفُ طہ (ترجمہ) :۔ مضطرب روایت میں اگر مطابقت ہو سکے۔ تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اِس پر اعتماد نہ کیا جائے گا۔ بلکہ موقوف رکھا جائے گا۔ روایت مذکورہ میں ایسا اختلاف ہے۔ جس کو دُور کر کے مطابقت ناممکن ہے۔ بلکہ ابوداؤد والی روایت میں اسناد کا پہلا راوی احمد ابن صالح امام نسائی کے نزدیک غیر معتبر ہے۔ چنانچہ تقریب التہذیب کے صفحہ نمبر ص۱۲ پر ابن حجر عسقلانی نے فرمایا:۔ اَحْمَدُ بْنُ صَالِحٍ الْمِصْرِیُّ اَبُوْ جَعْفَرِ بْنُ الطَّبْرِیُّ (الخ) تَکَلَّمَ فِیْهِ النَّسَائِیُّ بِسَبَبِ اَوْھَامٍ لَّهٗ قَلِیْلَةٍ وَنُقِلَ عَنِ ابْنِ مُعِیْنٍ تَکْذِیْبُهٗ طہ ترجمہ احمد بن صالح مصری ابوجعفر بن طبری کے بارے میں نسائی نے کچھ کلام کیا ہے۔ اور امام نسائی نے نقل فرمایا۔ کہ علامہ ابن معین نے احمد بن صالح کو جھوٹا کہا ہے نسائی کا یہ کلام کرنا احمد بن صالح کی ذات میں کچھ قدرے وہموں کی بنا پر ہے۔ لہٰذا اس روایت کو ضعیف کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ اور ضعیف حدیث بھی قابلِ سند نہیں ہوتی۔ جامع صغیر للسیوطی جلد دوم نے ص۵۹ پر اس کو صحیح کہا ہے۔ مگر یہ صحیح لغیرہٖ ہے۔ نہ کہ لذاتہٖ۔ صحیح لغیرہٖ وہ روایت ہے۔ جس کی اسناد میں کمزوری ہو۔ اور کسی راوی میں قصور ہو۔ چنانچہ مقدمہ مشکوٰۃ صفحہ نمبر ص۵ پر ہے۔: وَاِنْ کَانَ فِیْهِ نَوْعُ قُصُوْرٍ وَّوُجِدَ مَا یُجْبِرُ ذٰلِکَ الْقُصُوْرَ مِنْ کَثْرَةِ الطُّرُقِ۔ فَھُوَ الصَّحِیْحُ لِغَیْرِهٖ طہ (ترجمہ) :۔ اگر اسناد میں کسی طرح کا قصور اور نقص ہو۔ اور نقص بہت طریقوں سے پایا جائے۔ کہ مجبوراً قصور ثابت ہو۔ تو وہ روایت صحیح لغیرہٖ ہے۔ اور ایسی روایت بھی قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔ پس ثابت ہوا کہ مشکوٰۃ شریف کی یہ روایت جس میں فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا

کے الفاظ موجود ہیں۔ وہ دلیل نہیں بنائی جاسکتی۔ عقلاً بھی یہ روایت صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ چنانچہ جامع صغیر جلد دوم صفحہ نمبر ۵۷ پر ابن ماجہ کی حدیث مبارکہ نقل فرمائی ہے۔ عَنْ اَنَسٍ۔ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (الخ) وَصَلٰوتُہٗ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا بِخَمْسِیْنَ اَلْفِ صَلٰوۃٍ وَصَلٰوتُہٗ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَۃِ اَلْفِ صَلٰوۃٍ ھٰ صَحِیْحٌ (ترجمہ) مسجد نبوی کی ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار مسجد حرم کی ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ بیت المقدس کی ایک نماز کا ثواب پانچ ہزار ہے۔ عقلی طور پر جب بیت المقدس جیسی عظیم ومکرم جگہ بھی مسجد نبوی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ تو کسی عام انسان کا گھر اُس کا مقابلہ کیسے کرسکتا ہے۔ عام عقل بھی اِس بات کا بخوبی فیصلہ کرسکتی ہے۔ کہ مشکوٰۃ وابوداؤد کی یہ روایت صحیح نہیں۔ خلاصہ یہ کہ عام نفل گھر میں پڑھنا بہتر ہیں۔ مگر مسجد میں پڑھنے والوں کو روکنا سخت ترین ظلم اور روکنے والا بدترین ظالم۔ مستحب کا ترک مستلزم گناہ نہیں۔ بہتر چیز کے لئے صرف مسئلہ بتادینا ٹھیک ہے۔ کافی ہے۔ عمل کرنے نہ کرنے کا سامعین کو اختیار ہے۔ بلکہ خلل فی الدین یا فتنہ فساد کی صورت میں مسئلہ نہ بتانا ہی بہتر ہے۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتاب

باب الامامت

نابینا شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال ۱۳: ۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نابینا آدمی جو بالغ مرد ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں اس کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟ باحوالہ فتویٰ عطا فرمائیں۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا ط

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ ط

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق ہر اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنا منع ہے۔ جس کو لوگ یا شریعت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔ لہٰذا وہ شخص جو نابینا ہے اور پاک پلیدی کا خیال نہیں رکھتا۔ یا گندا رہتا ہے۔ اوصافِ حمیدہ اس میں موجود نہیں۔ ایسے شخصِ نابینا کو امام بنانا جائز نہیں۔ کہ اس سے قوم کو نفرت ہے۔ اسی طرح وہ فاسق فاجر جس کا گناہ نماز میں بھی اس کے ساتھ ظاہر ہو رہا ہے۔ جیسے کالا خضاب لگی ہوئی داڑھی یا سر والا یا چار انگل سے کم داڑھی رکھنے والا۔ ایسے کے پیچھے بھی نماز پڑھنا منع ہے۔ چنانچہ فتاویٰ تنویر الابصار صفحہ نمبر ۷۲/۵۲ پر ہے:۔
وَیُکْرَہُ اِمَامَۃُ عَبْدٍ وَاَعْرَابِیٍّ وَفَاسِقٍ وَاَعْمٰی ط (ترجمہ) :۔ غلام اور جاہل اور فاسق اور اندھے شخص کی امامت منع ہے۔ فتاویٰ صغیری شرح منیہ میں صفحہ نمبر ۲۴۳ پر ہے:۔ وَیُکْرَہُ تَقْدِیْمُ الْفَاسِقِ

كَرَاهَةَ تَحْرِيْمٍ وَعِنْدَ مَالِكٍ لَا يَجُوْزُ تَقْدِيْمُهُ وَهُوَ رِوَايَةٌ عَنْ اَحْمَدَ وَكَذَا الْمُبْتَدِعُ وَ يُكْرَهُ تَقْدِيْمُ الْعَبْدِ وَالْاَعْرَابِيِّ وَوَلَدِ الزِّنَا وَالْاَعْمٰى - وَالْكَرَاهَةُ فِيْهِمْ دُوْنَ تِلْكَ الْكَرَاهَةِ (ترجمہ) فاسق گنہگار کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔ امام مالک کے نزدیک بالکل جائز نہیں ہے فاسق کی امامت۔ یہی امام احمد کا مسلک ہے۔ اور غلام، جاہل، حرامی مرد اور نابینا شخص کو امام بنانا بھی مکروہ ہے۔ مگر فاسق کی امامت زیادہ مکروہ ہے۔ اور نابینا وغیرہ کی کراہت کم ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ فاسق سے شریعت پاک متنفر ہے۔ اور نابینا گندے شخص سے قوم نفرت کرتی ہے۔ فتاوی ہندیہ میں ہے جس شخص سے قوم نفرت کرتی ہے اس کو امام بنانا منع ہے۔ چنانچہ جلد اول صفحہ نمبر ۸۵ پر ارشاد ہے:- رَجُلٌ اَمَّ قَوْمًا وَهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ اِنْ كَانَتِ الْكَرَاهَةُ لِفَسَادٍ فِيْهِ اَوْ لِاَنَّهُمْ اَحَقُّ بِالْاِمَامَةِ يُكْرَهُ لَهٗ ذٰلِكَ (ترجمہ) ترجمہ:- ایک شخص کسی قوم کا امام بنے۔ حالانکہ وہ قوم اس سے نفرت کرتی ہے یا اس لئے کہ اس میں ہی کچھ فساد ہے۔ یا اس لئے کہ وہ شخص امام بننے کا حق دار نہیں۔ قوم میں کوئی دوسر شخص حقدار اس سے زیادہ ہے تو اس مرد کے لیے امامت کرنی مکروہ ہے۔ لہٰذا اگر نابینا آدمی اپنے آپ کو معاشرے کے لائق پاک وصاف ستھرا نہیں رکھتا ایسا گندا بنا رہتا ہے۔ کہ قوم کو اس سے گھن آتی ہے۔ تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ لیکن اگر پڑھی گئی تو لوٹانی واجب نہ ہو گی۔ اس لیئے کہ مکروہ تنزیہی ہے۔ اور مکروہ تنزیہی قابلِ اعادہ نہیں ہوتی۔ بخلاف فاسق فی الصلوٰۃ کے۔ کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوٹانی واجب ہے کیونکہ فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ اور کراہت تحریمی کے ساتھ نماز ادا کرنا واجب الاعادہ ہے۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد اول صفحہ نمبر ۳۲۴ پر ہے:- وَاِنَّ النَّقْصَ اِذَا دَخَلَ فِيْ صَلٰوةِ الْاِمَامِ فَلَمْ يُجْبَرْ تَجِبُ الْاِعَادَةُ عَلَى الْمُقْتَدِيْ (ترجمہ) ترجمہ:- جب امام کی نماز ناقص ہو بغیر مجبوری کے تو مقتدی کو نماز لوٹانی واجب ہے۔ فتاوی درمختار صفحہ نمبر ۲۲۴ پر ہے:- كُلُّ صَلٰوةٍ اُدِّيَتْ مَعَ كَرَاهَةِ التَّحْرِيْمِ تَجِبُ اِعَادَتُهَا (ترجمہ):- ہر وہ نماز جو مکروہ تحریمی کے ساتھ ادا ہو تو لوٹانی واجب ہے۔ ہاں وہ نابینا جو با عزت اور پاک صاف ستھرے طریقے سے رہتا ہو۔ اس کو دیکھ کر شرعاً احترام پیدا ہوتا ہو۔ اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اس کو امام مقرر کرنا بھی جائز ہے۔ ایسے ہی وہ شخص جس کا گناہ ظاہر نہ نظر آتا ہو۔ یا نماز کی حالت میں اس کا گناہ ساتھ نہ ہو۔ وہ امام بن سکتا ہے۔ چنانچہ فتاوی شامی و فتاوی عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر ۸۵ پر ہے:- وَتَجُوْزُ اِمَامَةُ الْاَعْرَابِيِّ وَالْاَعْمٰى وَالْعَبْدِ وَوَلَدِ الزِّنَا وَالْفَاسِقِ (ترجمہ) ترجمہ:- جاہل اور نابینا، غلام، ولد الزنا، فاسق کی امامت جائز ہے۔ یہاں غلام وغیرہ سے بھی وہ ہی لوگ مراد ہیں جن سے قوم گھن وغیرہ کی بنا پر متنفر نہ ہو کیونکہ متنفر لوگوں کا ذکر پہلے آگیا۔ کہ ایسے غلام وغیرہ کے پیچھے بھی منع ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز پڑھو۔ وہاں بھی وہی فاسق مراد ہیں

جن کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا۔ چنانچہ جامع صغیر جلد دوم صفحہ نمبر ۴۲ پر ہے:۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلُّوْا خَلْفَ کُلِّ بَرٍّ وَّ فَاجِرٍ رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ ط (ترجمہ) :۔ حضرت ابی ہریرہ سے روایت ہے۔ فرمایا کہ فرمایا آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھو نماز نیک و بد کے پیچھے۔ ان عبارت سے ثابت ہوا کہ اگر نابینا آدمی شرعی معیار کے مطابق صاحب وجاہت ہو۔ تو بلاکراہت اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے، جن بزرگوں نے مطلق مکروہ لکھا ہے۔ وہاں بھی مکروہ تنزیہی مراد ہے۔ جو جائز کے درجے میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اختلاف اقوال نے اطلاق ختم کردیا پیچھے تحریر ہے کہ زوکا فہم نابینا انسان جب عاقل، بالغ مسلمان متقی ہو۔ تو اس کو بلاکراہت امام مقرر کرنا یا عارضی طور پر اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ خود سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بہت دفعہ غزوات یا بغرض سفر جاتے وقت اپنے عظیم صحابی حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو نابینا تھے ان کو امام بنایا۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ نابینا کو امام مقرر کرنا جائز ہے۔ چنانچہ علامہ شامی اپنے فتاویٰ ردالمحتار جلد اول صفحہ نمبر ۵۲۳ پر فرماتے ہیں:۔ لٰکِنْ وَرَدَ فِی الْاَعْمٰی نَصٌّ خَاصٌّ ھُوَ اسْتِخْلَافُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاِبْنِ اُمِّ مَکْتُوْمٍ وَّعُتْبَانَ عَلَی الْمَدِیْنَۃِ وَکَانَا اَعْمَیَیْنِ ط :۔

ترجمہ:۔ لیکن نابینا کے بارے میں نص قطعی آچکی۔ کیونکہ آپ نے عبداللہ بن ام مکتوم اور حضرت عتبان کو مدینہ منورہ میں چند مرتبہ امام بنایا۔ حالانکہ وہ دونوں بزرگ نابینا تھے۔ خلاصہ یہ کہ اگر نابینا شخص قابل امامت ہونے کے ساتھ قابل احترام و صاحب وجاہت اور صاف ستھرا بھی ہو۔ تو بلاکراہت اس کی امامت و تقرری جائز ہے۔ لیکن اگر صاف ستھرا اور ذی وقار نہ ہو۔ بلکہ ایسی حالت بنائی ہو۔ جس سے وہ حقیر متصور ہو۔ تو ہرگز ایسے نابینا کو امام نہ بنایا جائے۔ اگر یہ تقسیم نہ کی جائے۔ تو عبارات فقہاء میں اختلاف و تضاد کا خطرہ ہے۔ اور یہ تقسیم اس لیے بھی ضروری ہے: تاکہ امامت کا وقار قائم رہے:۔

کتبہ

سنی امام کو کسی شیعہ میت کی نماز جنازہ پڑھانا ناجائز ہے

سوال ۱۴:۔ شیعوں کے غسل و جنازہ پڑھنے کا حکم:۔ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے گاؤں میں امام صاحب نے ایک شیعہ آدمی کا نماز جنازہ پڑھایا۔ جب اہل سنت لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ تو اس نے جواباً کہا۔ کہ میں نے اس لیے نماز جنازہ پڑھایا۔ تاکہ کوئی شیعہ امام اس بستی میں قدم نہ رکھے۔ اب تک صرف دو گھر شیعوں کے ہیں۔ اگر میں ان کے جنازے نہ پڑھاؤں۔ تو وہ کوئی اپنا امام لے آئیں اور اس طرح ہمارے گاؤں میں ایک نیا فتنہ شروع ہو جائے گا۔ جس سے یہ بھی خطرہ ہے کہ کہیں شیعہ زیادہ نہ ہو جائیں۔ اور ان کی دل چسپ اور مزیدار رسموں سے ہماری بستی کا نوجوان طبقہ متاثر ہو کر زیادہ مائل بہ شیعہ

نہ ہو جائے۔ فرمایا جائے کہ کیا قانون شریعت میں اس کا یہ کہنا درست ہے۔ اور سنی عالم ایسی صورت میں۔ شیعہ لوگوں کا جنازہ پڑھا سکتا ہے۔ یا کہ نہیں؟ اور ایسے امام کے پیچھے کسی اہل سنت کی نماز جائز ہے

کیتے

سائل (حضرت قبلہ علامہ مولانا محمد عبداللہ قادری رضوی خطیب و مدرس قصور۔ ضلع لاہور)

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

فی زمانہ ہمارے علاقوں میں دو قسم کے شیعہ رہتے ہیں۔ (۱) شیعہ تبرائی (۲) تفضیلی "تبرائی شیعہ کے عقائد سراسر اسلام کے خلاف ہیں۔ اور وہ شرعاً اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے عقائد میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں (۱) قرآن کریم متواترہ موجودہ درست نہیں۔ اس میں کچھ آیتیں بعد کی مخلوط ہیں۔ (۲) حضرت علی نبی کریم سے افضل ہیں (۳) خلافت صدیقی غلط ہے (۴) حضرت علی رب ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذالک ط) یہ ان کے چند بنیادی اور اصولی فوائد ہیں۔ جن کی بنا پر شریعت اسلامیہ مطہرہ ان کو اسلام سے خارج قرار دیتی ہے۔ یہ تمام عقائد ان کی کتب میں مرقوم ہیں۔ اس کے لیئے ان کا مقبول ترجمہ اور اس کا ضمیمہ اور دیگر شیعہ کتب کے عقائد مندرجہ بالا میں شیعہ کتب ملاحظہ ہوں ان لوگوں کی ہمارے علاقوں میں دیگر شیعہ کے مقابل کثرت ہے۔ تفضیلی شیعہ کے عقائد درج ذیل ہیں۔ (۱) یزید کافر ہے (۲) حضرت علی سب صحابہ سے افضل ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت صدیق اور حضرت فاروق سے بھی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) (۳) حضرت ابو طالب تمام صحابہ کی طرح کھلم کھلا ظاہراً مکمل طور پر شرعی مسلمان اور مومن ہیں (۴) حضرت فاطمۃ الزہرا کا درجہ تمام ازواج مطہرات خصوصاً حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ صدیقہ امہات المؤمنین سے افضل ہے۔ ان عقائد کو تفضیلی شیعہ حضرات نے اپنی کتب میں شائع کیا ہے۔ ان میں بعض شیعہ اپنے کو شیعہ نہیں کہتے۔ بلکہ اہل سنت کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ تمام عقائد اہل سنت کے خلاف ہیں۔ خاص طور پر حضرت ابو طالب شرعاً عند الناس کافر اور عند اللہ سائر ہیں۔ ان کو مومن کہنا کہیں ثابت نہیں۔ تفضیلی شیعہ شرعی فتویٰ کے لحاظ سے مسلمان ہیں۔ ان کا نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ اہل سنت کا امام ان کا جنازہ پڑھا سکتا ہے۔ لیکن تبرائی شیعہ اور یہی لوگ لفظ شیعہ سے معروف ہیں۔ جب مطلقاً لفظ شیعہ بولا جائے۔ تو یہی لوگ مراد ہوتے ہیں۔ ان کا نماز جنازہ پڑھانا مسلمان اہل سنت کو قطعاً حرام ہے۔ کیونکہ یہ لوگ شرعی طور پر اسلام سے خارج ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر ۲۶۳ پر ہے:۔ اَلرَّافِضِیُّ اِذَا كَانَ يَسُبُّ الشَّيْخَيْنِ وَيَلْعَنُهُمَا وَالْعِيَاذُ بِاللّٰهِ فَهُوَ كَافِرٌ وَاِنْ كَانَ يُفَضِّلُ عَلِيًّا كَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَجْهَهٗ عَلٰى اَبِيْ بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ لَا يَكُوْنُ كَافِرًا اِلَّا اَنَّهٗ مُبْتَدِعٌ ط

اس عبارت معتبرہ سے دونوں مذکورہ بالا فرقوں کا حکم معلوم ہوگیا۔ اور کافر اسلام سے خارج شخص کا نماز جنازہ پڑھنا حکم قرآنی کے مطابق سخت ترین گناہ کبیرہ ہے اور اس کو جائز سمجھ کر پڑھنا خود پڑھنے والے کو کافر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ یعنی اے مسلمانو! کافر انسان کا جنازہ نماز بھی نہ پڑھو اور نہ ہی ان کی قبر پر جاؤ۔

سوال مذکورہ میں چونکہ لفظِ شیعہ مطلقہ معروفہ آس لیئے بھی اور سوال کے روش کلام سے بھی ظاہر ہے کہ شیعہ سے فرقہ اولی تبرائی ہی مراد ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لیئے جائز نہیں۔ کہ اُن کا جنازہ پڑھے یا پڑھائے۔ جو ان کو مسلمان سمجھ کر جنازہ پڑھے یا پڑھائے وہ تو خود بھی کافر متصور ہوگا۔ کیونکہ نصوص قطعیہ کا منکر ہوگا۔ ہاں اگر نادانی یا غلط فہمی کی بنا پر یا اپنے خیال میں کسی بڑے فتنہ سے بچنے کیلئے ایسی نا زیبا حرکت کرلی ہے۔ جیساکہ مذکورہ فی السوال امام نے عذر پیش کیا۔ تو وہ اگرچہ شرعاً اتنا بڑا مجرم تو نہ بنے گا۔ مگر مسئلہ جاننے کے بعد آئندہ ایسا جنازہ پڑھنے سے احتراز لازم و واجب ہے۔ اب اگر وہ پھر امام اسی عذر بے ہودہ کو مدِ نظر رکھ کر کسی تبرائی شیعہ کا جنازہ پڑھاتا ہے۔ تو گویا کہ وہ میلانِ قلبی میں مائل بہ رفض ہے۔ اور شرعاً سخت ترین مجرم۔ ایسے امام کو ایسی صورت میں اہل سنت کے آگے امام بننے کا حق نہیں۔ اور نہ کسی مسلمان کی نماز پھر جائز ہوگی۔ اس لیئے کہ امام مذکور کا پیش کردہ عذر شرعاً قطعاً معتبر نہیں چند وجوہات سے جوکہ درج ذیل ہیں:۔ (۱) سب کچھ تقدیرِ الٰہی سے ہونا (۲) اس فتنے کو روکنے کے اور ذرائع بھی ہو سکتے ہیں (۳) ہر شخص اپنے اعمال کا اختیاری جواب دہ ہے۔ جن خرابیوں کو دور کرنا انسان کی ہمت سے باہر ہے۔ کل قیامت میں اس پر پکڑ نہ ہوگی (۴) اگر اس بستی میں اس فتنۂ رفض کا ہونا مقدر ہے تو کسی بھی حیلے سے روکا نہیں جاسکتا۔ (۵) اگر یہ امام مرجائے یا خود شیعہ اس سے متنفر ہوجائیں۔ یا میرے اس فتوے پر عمل نہ کرنے کی بنا پر اس امام کو خود مسلمان ہی نکال دیں تب کس طرح یہ اس فتنے کو روکے گا۔ لہٰذا فتوئِ شرعی سے حکم نافذ کیا جاتا ہے کہ خبردار آئندہ امام کسی شیعہ تبرائی کا جنازہ ہرگز ہرگز نہ پڑھائے۔ اور سب مقتدیوں کے سامنے اپنے رب کریم کے حضور سچی توبہ کرے۔ اس خیالی عذر کی بنا پر اپنے دین ایمان کو خراب نہ کرے۔ واللہ ورسولہٗ اعلم

کیا

ماہ رمضان میں فرض عشاء جماعت سے نہ پڑھ کر وتر جماعت سے پڑھنے کا بیان

سوال ۱۵: کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جس شخص نے ماہ رمضان میں کسی دن نماز عشاء کے فرض باجماعت ادا نہ کیئے ہوں کیا وہ تراویح اور وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے؟ (۲) کیا نابالغ بچہ جو قریب

بلوغ ہو حافظ بن کر بالغ مردوں کی امامت تراویح یا نفل میں بغرض قرآن کریم سنانے کے کر سکتا ہے؟ ایسی امامت کے لیے شرعی حکم کیا ہے۔ زید کہتا ہے کہ دونوں مسئلوں میں جائز ہے۔ ایک یہ کہ فرض نماز بغیر جماعت پڑھنے والا وتر اور تراویح با جماعت پڑھ سکتا ہے۔ اور نابالغ حافظ تراویح اور نفل کی جماعت کرا سکتا ہے۔ زید اپنے دعویٰ کی دلیل میں دو کتب کے حوالے پیش کرتا ہے۔ (۱) رکن دین مطبوعہ لاہور صفحہ نمبر ۱۳۳ اور (۲) انواع بارک اللہ مطبوعہ لکھنؤ صفحہ نمبر ۱۰۲۔ ہماری بستی کے لوگ زید کی اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ سب حضرات نے متفقہ طور پر آپ کے فتوے پر اعتماد کیا ہے۔ لہٰذا جلد از جلد شرعی مسئلہ سے آگاہ کیا جائے۔ جناب کی نہایت مہربانی ہوگی۔

السائل: محمد یعقوب امرتسر صدر جامع مسجد اہل سنت و محلہ اہل سنت۔ ہندوستان

۶۲ ؎ ۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق جماعت صرف فرض نمازوں کے لیے مقرر ہے۔ بجز عیدین کسی واجب نفل، سنت موکدہ سنت غیر مؤکدہ وغیرہ کی جماعت جائز نہیں۔ بعض فقہاء جماعت نماز کو واجب قرار دیتے ہیں۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ واجب ہے یا سنتِ مؤکدہ جو واجب کہتے ہیں ان کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ چنانچہ ہدایہ جلد اول صفحہ نمبر ۱۰۵ پر حاشیہ ۱۰ پر ہے ہے قَوْلُهٗ تَعَالٰى وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ نَصٌّ فِيْ وُجُوْبِ الْجَمَاعَةِ (الخ) اور درمختار جلد اول صفحہ نمبر ۵۱۵ پر ہے: قَالَ الزَّاهِدِيُّ اَرَادُوْا بِالتَّاكِيْدِ الْوُجُوْبَ ؎ ترجمہ: زاہدی نے کہا کہ فقہاء مؤکدہ سے مراد وجوب لیتے ہیں۔ بعض فقہاء نے فرمایا کہ جماعت پنج وقتہ فرضوں کے لیے سنتِ مؤکدہ ہے۔ چنانچہ کتاب تنویر الابصار جلد اول صفحہ نمبر ۵۱۵۔ ہدایہ جلد اول صفحہ ۱۰۱ پر اور فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر ۸۲ پر ہے اَلْجَمَاعَةُ سُنَّةٌ مُؤَكَّدَةٌ لِلرِّجَالِ ؎ یعنی جماعت سنتِ مؤکدہ ہے صرف بالغوں پر یہی جماعت جمعہ وعیدین کے لیے فرض ہے۔ پانچ وقتہ فرائض کے لیے سنتِ مؤکدہ ہے۔ اور باقی تمام سنت اور نفل واجب کے لیے منع ہے۔ اسی طرح فقہاء کرام فرماتے ہیں۔ اور یہ اس لیے ہے کہ نمازوں میں فرضوں کا درجہ سب سے بلند ہے۔ اور جماعت عظمت وجلالِ شان میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ شرعاً بلندی بلند ہی کو عطا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک کے بغیر سوائے فرائض کے اور کسی نماز کی جماعت جائز نہیں ہوتی۔ ماہِ رمضان میں بھی صرف تراویح اور وتر کی جماعت ہوتی ہے۔ دیگر کسی سنت نفل کی نہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ اصل جماعت مسنون فرض کے لیے ہے۔

تراویح میں جماعت اس لیئے سنت کفایہ ہوئی۔ کہ مقصود حفاظتِ قرآن ہے۔ فقط اسی ایک ذریعہ سے لوگ حفظ قرآن کی طرف مائل ہیں۔ اور حفاظت کلام پاک کا یہ ایک شاندار طریقہ ہے۔ تراویح سنت ہے۔ اس سے بلند درجہ وتر کا ہے وتر کے لیئے جماعت جائز نہ تھی مگر تراویح کے مقابل وتر کی عظمت قائم رکھنے کے لیئے وتر کی جماعت مستحب ہوئی۔ کہ اصل جماعت صرف فرض کے لیئے تراویح کے لیئے مجبوراً وتر کے لیئے بوجہ تراویح۔ لہٰذا تراویح کے لیئے تو لازمی جماعت ہوگی۔ تاکہ سماعتِ قرآن کا تسلسل نہ ٹوٹے۔ مگر وتر کے لیئے فرضوں پر نظر کرنی ہے۔ اگر فرض جو اصل مقصود جماعت ہیں۔ اُن کی جماعت کسی نمازی نے پائی ہے تب تو وتر بھی جماعت سے ہوں گے ورنہ نہیں۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اول صفحہ صـ۱۶۲ پر ہے:۔ ثُمَّ قَالَ لٰكِنَّهٗ اِذَا لَمْ يُصَلِّ الْفَرْضَ مَعَهٗ لَا يَتْبَعُهٗ فِي الْوِتْرِ ط :۔ ترجمہ:۔ پھر فرمایا لیکن جب کسی ایک شخص نے فرض علیحدہ پڑھے۔ جماعت کے ساتھ ادا نہ کئے۔ تو وتر بھی علیحدہ پڑھے۔ جماعت سے نہ پڑھے۔ وجہ وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی۔ لیکن تراویح جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ شامی میں اسی جگہ ہے کہ:۔ اَمَّا لَوْ صَلَّيْتَ بِجَمَاعَةِ الْفَرْضِ وَكَانَ رَجُلٌ قَدْ صَلَّى الْفَرْضَ وَحْدَهٗ فَلَهٗ اَنْ يُصَلِّيَهَا مَعَ ذٰلِكَ الْاِمَامِ ط (ترجمہ)

ترجمہ:۔ یعنی اگر فرضوں کی جماعت ہوگی۔ اور کسی ایک ایسے شخص نے فرض جماعت سے نہ پڑھے تو با جماعت تراویح پڑھ سکتا ہے۔ ہاں اگر فرض جماعت سے پڑھے۔ اور تراویح علیحدہ پڑھیں۔ تو وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ سنت کفایہ ہے۔ درمختار میں ہے۔ کہ لَوْ لَمْ يُصَلِّهَا اَيِ التَّرَاوِيْحَ بِالْاِمَامِ لَهٗ اَنْ يُصَلِّيَ الْوِتْرَ مَعَهٗ ط (ترجمہ) یعنی جس شخص واحد نے تراویح جماعت سے نہ پڑھیں۔ وہ وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ وجہ وہی ہے جو اُوپر بیان کی گئی ہے۔ یہ تمام قول ایک شخص کے بارے میں تھا۔ لیکن اگر پوری قوم فرض کی جماعت چھوڑ دے تو نہ تراویح جائز اور نہ وتر۔ تو تراویح نمازِ عشاء کے تابع ہیں۔ اور جماعت وتر جماعت تراویح جماعت عشاء کے تابع۔ بکذا فی الشامی خلاصہ یہ کہ فرض عشاء جماعت سے نہ پڑھنے والا وتر جماعت سے نہیں پڑھ سکتا۔ زید کا قول غلط ہے۔ رکن دین اور انوار بارک کا مسئلہ ناقابل قبول ہے۔ ۲۔ نابالغ بچہ خواہ قریب بلوغ ہو۔ بالغ لوگوں کی امامت جماعت نہیں کرا سکتا۔ نہ نفل اور نہ فرض اور نہ تراویح نہ وتر کی۔ یہی فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ حنفیہ قاضی خان جلد اول صفحہ نمبر صـ۸۹ اور ردمختار جلد اول صفحہ نمبر صـ۵۲۵ پر اور فتاویٰ عالمگیری اول صفحہ نمبر صـ۸۵ پر ہے اور ہدایہ شریف جلد اول صفحہ نمبر صـ۱۱۱ پر ہے:۔ وَالْمُخْتَارُ اَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ فِي الصَّلٰوةِ كُلِّهَا لِاَنَّ نَفْلَ الصَّبِيِّ دُوْنَ نَفْلِ الْبَالِغِ حَيْثُ لَا يَلْزِمُهُ الْقَضَاءُ بِالْاِفْسَادِ بِالْاِجْمَاعِ۔ وَلَا يُبْنَى الْقَوِيُّ عَلَى الضَّعِيْفِ ط

ترجمہ:۔ صحیح مسئلہ یہ ہے۔ کہ بچے نابالغ کے پیچھے کوئی نماز جائز نہیں۔ اس لیئے کہ بچے کے نفل بالغ کے نوافل سے

کم درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ بچے کے نفل توڑ دینے کے باوجود قضا نہیں حالانکہ بالغ نفل توڑے تو قضا واجب ہے تمام کے اتفاق سے۔ اور قوی کو ضعیف پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ بچہ تراویح کی جماعت کسی بھی مقتدی کے پیچھے نہیں کرا سکتا۔ زید کا قول غلط ہے۔ مزید تحقیق کے لیے حضرت حکیم الامت کی تصنیف جاء الحق حصہ دوم کا مطالعہ کرو۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

عیدوں میں سے کوئی عید اگر جمعہ کے دن آجائے تو اس کا بیان

سوال نمبر ۱۹۱: ۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ اگر جمعہ کے روز عید ہو جائے تو کیا ہر دو نمازوں کے لیے الگ خطبہ پڑھا جائے گا یا ایک خطبہ ساقط ہو جائے گا۔ اور کیا دونوں نمازیں پڑھی جائیں گی۔ یا ایک پڑھی جائے گی۔ اگر دونوں خطبے اور دونوں نمازیں پڑھی جائیں۔ تو بھی وضاحت سے جواب عطا فرمایا جائے اور اگر ایک نماز یا ایک خطبہ پڑھا جائے گا تو بھی وضاحت فرمائیں۔ کہ کونسا خطبہ اور کون سی نماز پڑھی جائے گی۔ اور کون سی چھوڑی جائے گی۔ اور کونسا خطبہ پڑھا جائے گا۔ اور کونسا خطبہ چھوڑا جائے گا۔ اور فرمایا جائے کہ کیا ایک دن دو خطبے ملک اور حکومت پر بوجھ ہیں۔ اور آفتِ ناگہاں کا باعث ہیں۔ ہمارے یہاں بہت سے لوگ اس قسم کی بات کرتے ہیں۔ اہل سنت علماء کا کیا طرز عمل ہے۔ براہ مہربانی نہایت جلد جواب دیا جائے بینوا و توجروا۔

السائل: ۔ احمد نثار بیگ ایم۔ اے خطیب جامع مسجد گنج بھاٹہ آبادی مری روڈ راولپنڈی۔

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ

الجواب

قانون شریعت کے مطابق ایک دن میں عید اور جمعہ کا اجتماع کوئی تعجب خیز یا اہمیت کی بات نہیں۔ نہ ہی نحس اور پریشان کن ہے۔ جس طرح کے بہت سے پڑھے لکھے جہلاء اس اجتماع سے پریشان ہوئے پھرتے ہیں۔ اور طرح طرح کی دو رخی باتیں کرتے ہیں۔ یہ سب وہم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔ فقہاء کرام اور علماء اہل سنت نے اس چیز کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ بلکہ یہ رب تعالیٰ کے قانون کے مطابق گردشِ افلاک سے اجتماع عیدین یعنی عید الفطر و جمعہ ایک دن میں ہو جاتے ہیں۔ ہر سال عید وغیرہ تہوار دن بدل بدل کر آتے ہیں۔ آپ اسی طرح دیکھتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی جمعہ کا دن بھی آجاتا ہے۔ تو جب منگل، بدھ، جمعرات کو عید ہو۔ تو منحوس نہیں۔ اسی طرح اگر جمعہ ہو۔ تو بُرا کیوں اور جس طرح کسی دن عید ہو جائے۔ تو کوئی فرض نماز معاف نہیں ہو سکتی۔ نہ ظہر نہ عصر تو جمعہ کی صلوٰۃ معاف کیوں ہو۔ کہ وہ بھی ایک فرض ہے۔ اور جس طرح کوئی کسی دن عید واقع ہو۔ تو عید کے خطبے کے بعد شام تک جتنے چاہو وعظ، تقریریں خطابات کرو۔ تو منحوس نہیں نہ

حکومت پر بوجھ و مصیبت تو جمعہ کا خطبہ بھی ایک قوم سے خطاب ہی ہے۔ عرب علاقوں میں جو تقریر بھی آپ سُنیں گے۔ وُہ آپ کو مثل جمعے کے خطبے معلوم ہوگی۔ اور جمعہ کا خطبہ مثل تقریر کے معلوم ہوگا۔ فرق صرف ہمارے علاقوں میں محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہمارے وعظ اُردو وغیرہ میں مگر خطبہ جمعہ و عید عربی میں لازم۔ اور یہ اجتماع شروعِ اسلام سے آج تک بہت دفعہ وقوع پذیر ہوتے رہے۔ خود ہمارے زمانے میں بھی متعدد بار ایسا ہُوا۔ ہم نے اپنے اکابرین کا یہی طریقہ دیکھا۔ کہ دونوں خطبے اپنی اپنی نماز کے ساتھ پڑھتے۔ شریعت اسلامیہ کے حکم کے مطابق بھی دونوں خطبوں میں سے یا نمازوں میں سے کوئی بھی چھوڑنا گناہِ عظیم ہے۔ کیونکہ جمعہ کی نماز فرضِ عین ہے۔ اور جمعہ کا خطبہ نماز کے فرائض سے ہے۔ جس کے بغیر جمعہ ہو سکتا ہی نہیں چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل صفحہ ۱۴۵ پر ہے فَلِاَدَائِہَا شَرَائِطُ فِیْ غَیْرِ الْمُصَلِّیْ وَمِنْہَا الْخُطْبَۃُ قَبْلَہَا اور عید کا خطبہ سنّت مؤکدہ ہے۔ چنانچہ فتاوٰی دُرِّ مختار جلد اوّل صفحہ ۷۷۷ پر ہے:۔ سِوَی خُطْبَۃِ الْعِیْدِ۔ اور فتاوٰی رد المحتار میں ہے۔ لِاَنَّہٗ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاظَبَ عَلَیْہِمَا عقلاً بھی خطبۂ عید سنّت مؤکدہ ہونا چاہیئے۔ کہ اگر واجب یا فرض مانو تو تبعیت فرض شرط ہے جیسے کہ خطبہ جمعہ بوجہ فرضیت اوّل ہے۔ اور اگر خطبہ عید کو سُنتِ غیر مؤکدہ کہو۔ تو کہیں ثابت نہیں کہ نبی کریم نے نماز عید تو پڑھائی۔ مگر اس کا خطبہ نہ پڑھا۔ پس جب بعدیت اور ہمیشگی ثابت ہے۔ تو سنت مؤکدہ ہونا ظاہر ہُوا کہ ضد کی نفی اصل کا ثبوت ہے اور جس طرح واجب یا فرض کا چھوڑنا گناہِ کبیرہ ہے۔ اسی طرح سنت مؤکدہ کا چھوڑنا بھی گناہ ہے۔ چنانچہ فتاوٰی شامی جلد اوّل صفحہ ۷۷۷ پر ہے۔ اَلَّا یَاْثَمُ بِتَرْکِ السُّنَّۃِ الْمُؤَکَّدَۃِ کَالْوَاجِبِ۔ ثابت ہُوا۔ کہ ہر دو جمعہ و عید کے خطبے اپنے اپنے وقت اپنی اپنی نمازوں میں پڑھنے لازم ہیں۔ جو بھی چھوڑے گا گناہگار ہوگا۔ اِسی طرح صحابہ کرام سے لے کر آج تک بہت دفعہ ایسا موقعہ آیا۔ کہ جمعہ کے دن عید ہُوئی۔ تو تمام مُسلمانوں نے دونوں ہی نمازیں پڑھیں۔ اور اپنے اپنے وقتوں میں خطبے بھی دیئے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ ۸۰ اور مُسلم شریف جلد اوّل صفحہ ۲۸۸ پر حدیث شریف مرقوم ہے۔ وَعَنْ نُعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ (الخ) قَالَ وَاِذَا اجْتَمَعَ الْعِیْدُ وَالْجُمُعَۃُ فِیْ یَوْمٍ وَّاحِدٍ قَرَءَ بِہِمَا فِی الصَّلٰوتَیْنِ رَوَاہُ مُسْلِمٌ ۵ ط یعنی صحابہ کرام فرماتے ہیں۔ کہ آقائے دوعالم حضور اقدس صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں جب کبھی عید اور جمعہ ایک دن میں ہوتے۔ تو نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم۔ دونوں نمازیں ادا فرماتے۔ اور اُن دونوں میں مخصوص تلاوت فرماتے۔ اور ظاہر بات ہے۔ کہ جب نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔ تو خطبے بھی ایک دِن میں دو ضرور ہُوئے۔ کیونکہ خطبے چھوڑنا گناہ کبیرہ ہے۔ جیسا کہ اُوپر ثابت ہُوا۔ لہٰذا اب بھی ایسا ہی کیا جائے گا چنانچہ فتاوٰی شامی جلد اوّل صفحہ ۷۷۷ پر ارشاد ہے۔ فَلَوِ اجْتَمَعَا (الخ) تَجِبُ صَلٰوتُہُمَا فِی الْاَصَحِّ مَا مَذْہَبُنَا فَلُزُوْمُ کُلٍّ مِّنْہُمَا ط اور فتاوٰی ہدایہ جلد اوّل صفحہ ۱۵۵ پر ہے۔ وَفِی الْجَامِعِ الصَّغِیْرِ (لِلْاِمَامِ مُحَمَّدٍ) عِیْدَانِ اِجْتَمَعَا فِیْ یَوْمٍ وَّاحِدٍ فَالْاَوَّلُ سُنَّۃٌ وَّالثَّانِیْ فَرِیْضَۃٌ وَّلَا یُتْرَکُ

وَاحِدٌ مِّنْهَا ۔ یعنی جب کبھی کسی زمانے میں جمعہ کے دن عید ہو۔ تو کوئی نماز اور خطبہ نہیں چھوڑا جائے گا اور پھر عقلی طور پر بھی لازم رہنا چاہیئے۔ کہ یہ رب تعالیٰ کی عبادت ہے۔ اور رب العالمین ہی کا مقرر کردہ دن ہے۔ کہ اس نے ہی جمعہ کے دن عید بھی۔ جس کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ اور عبادت میں جتنی بھی زیادتی ہو بہتر ہے عبادت سے مصیبتیں اور گناہوں اور دُنیا کے بوجھ ہلکے ہوتے ہیں۔ لوگ کتنے بیوقوف ہیں جو ان دو خطبوں کو حکومت پر بوجھ سمجھتے ہیں حکومت اور ملکوں کو مصیبتوں، فسادوں بوجھوں سے بچاتا ہے۔ تو جھوٹے گواہوں، غلط فیصلوں کے ذریعے عیدوں کو تبدیل نہ کراؤ۔ بلکہ گناہوں سے بچو۔ رویتِ ہلال کمیٹی کے جھوٹے فیصلوں سے اللہ کا مقرر کردہ قانون اور وقت رمضان و عید کی تاریخ تبدیل نہیں ہوسکتی۔ اور خطبے کم نہ کرو۔ بلکہ اپنی سرکشی اور خدا سے بغاوت والی عادت تبدیل کرو لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ :۔ یہ تو ایسا ہے جیسے دورِ جہالت کے کافر حرمت جہاد کے مہینے تبدیل کرکے جنگ شروع کردیتے تھے۔ یا جیسے بے دین بنی اسرائیل ہفتے کے دن کا نام تبدیل کرکے شکار کرلیتے تھے۔ اُس دن کا نام کچھ اور رکھ لیتے تھے۔ یا جیسے آج کل کے گمراہ مسلمان سُود کو نفع کا نام دے کر شراب کو برانڈی کا نام دے کر استعمال حلال سمجھ لیتے ہیں۔ یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔ بہرحال جمعہ کی عید میں ہر دو نماز کے خطبے لازم واشد ہیں۔ واللہ ورسولہ اعلم۔

کتبہ

درمیان تراویح کچھ دیر بیٹھنے کا بیان :۔

سوال نمبر ۱۷ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے۔ کہ ہر ترویحہ کے بعد ہر نمازی کو اتنی دیر بیٹھنا بہت ضروری ہے۔ جتنی دیر میں ترویحہ پڑھا جاتا ہے۔ اگر نمازی نہ بیٹھیں گے یا کم بیٹھیں گے۔ تو جائز نہیں ہوگا۔ دلیل دیتا ہے۔ کہ ترویحہ تراویح کی چار رکعت کو کہتے ہیں۔ اور تراویح مشتق ہے۔ راحت سے جس کے معنی ہیں آرام کرنا ایسے ہی کتب فقہ میں مع اس استدلال کے درج ہے۔ کیا زید کی یہ بات صحیح ہے۔ اس آرام میں تمام نمازیوں کو تسبیح پڑھنی لازم ہے۔ تاکہ عوام تسبیح یاد کرلیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ ذکر جہری کی وہابی کش سنت پر بھی عمل ہو جائے گا۔ اور یہ بات شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی فرماتے ہیں۔ چنانچہ شرح سفر السعادت میں ارشاد ہے۔ جہر آں حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم برائے تعلیم بود۔ اگر جائے دیگر نیز امام را مصلحت و جہر و اعلان بود۔ بقصدِ تعلیم بکند درست است بلکہ مستحسن است۔ بکر کہتا ہے۔ کہ آرام کرنا لازم نہیں۔ بلند آواز کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ فرمایا جائے کہ کیا بکر کی بات درست ہے یا زید کی۔ بینوا توجروا

سائل :۔ محمد مصطفےٰ کمال الدین صدر مدرس دار العلوم محلہ شہر کریم نگر ہندستان ۱۹۵۶ ۱

بِعَوْنِ اللہِ الْوَھَّابِ ؕ

الجواب

(۱) مذکورہ سوال میں زید اور بکر دونوں کی ایک ایک بات غلط ہے صحیح قول یہ ہے کہ ہر ترویحے کے بعد بیٹھنا نہ فرض ہے نہ واجب بلکہ مستحب ہے اور فعلِ مستحبہ کا کرنا ثواب ہے اور نہ کرنا گناہ نہیں۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری جلد اوّل صفحہ ۱۱۵ پر ہے۔ وَیُسْتَحَبُّ الْجُلُوْسُ بَیْنَ تَرْوِیْحَتَیْنِ قَدْرَ تَرْوِیْحَۃٍ وَکَذَا بَیْنَ الْخَامِسَۃِ وَالْوِتْرِ دوسری دلیل یہ ہے کہ ترویحہ راحت سے مشتق ہے۔ جس کا مقصد محض آرام کرنا ہے جیسا کہ سوال میں بھی درج ہے اور آرام کرنا شرعاً مستحب ہے کیونکہ یہ حقِ نفس کی قسم سے ہے۔ نہ کہ فرض واجب۔ ورنہ دنیوی کاروبار معطل ہو جائے۔ اور بیٹھنے سے بھی حقیقی بیٹھنا مراد نہیں بلکہ صرف توقف چنانچہ فتاوی شامی جلد اوّل صفحہ ۶۶۰ پر ہے (قَوْلُہٗ یَجْلِسُ) لَیْسَ الْمُرَادُ حَقِیْقَۃَ الْجُلُوْسِ بَلِ الْمُرَادُ الْاِنْتِظَارُ ؕ یہی وجہ ہے کہ مختلف علاقوں کے لوگ اس موقعہ پر مختلف اذکار و عبادات کرتے ہیں۔ ہمارے علاقے پاکستان میں تسبیح پڑھتے ہیں۔ کہیں درود شریف کہیں کھڑے ہو کر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر درود وصلوٰۃ وسلام۔ مکہ مکرمہ میں طواف کعبہ کے دو تین چکر لگاتے ہیں۔ نجدی حکومت سے پہلے روضۂ پاک پر سلام پڑھنے کا طریقہ تھا۔ ان ترویحوں کے درمیان قضا شدہ نماز پڑھنا یا دیگر نفل پڑھنا بھی جائز ہیں۔ چنانچہ فتاوی قاضی خان جلد اوّل صفحہ ۲۳۵ پر ہے۔ وَھُوَ فِی الْاِنْتِظَارِ بِالْخِیَارِ اِنْ شَاءَ سَبَّحَ وَاِنْ شَاءَ ھَلَّلَ وَاِنْ شَاءَ صَلّٰی وَاِنْ شَاءَ سَکَتَ وَاَھْلُ مَکَّۃَ یَطُوْفُوْنَ بِالْبَیْتِ ؕ ۔ ۔ ۔ اور اگر بالکل انتظار نہ کیا یا بہت مختصر کیا۔ یا بجائے ایک ترویحے کے دو یا تین ترویحوں کے بعد توقف کیا۔ تو بھی جائز ہے۔ اسی خانیہ جلد اوّل صفحہ ۲۳۵ پر ہے۔ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَرِحْ بَیْنَ کُلِّ تَرْوِیْحَۃٍ اِخْتَلَفُوْا فِیْہِ قَالَ بَعْضُھُمْ لَا بَأْسَ بِہٖ (وَھُوَ الْاَصَحُّ) ہاں اللہ تعالیٰ رب العزت کا ذکر پاک بلند آواز سے کرنا سنت ہے۔ اور اس کے بہت سے فائدے بھی ہیں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ جب میں بچہ نابالغ تھا۔ اور حاضری مسجد کی معاف تھی۔ تو میں گھر بیٹھا ہوتا تھا مجھ کو جماعت قریب ہو چکنے کی خبر لگ جاتی تھی کیونکہ نبی اکرم اور صحابہ کرام ذکر اللہ اتنی زور سے کرتے تھے۔ کہ دور دور تک آواز جاتی تھی۔ ذکر جہری کا پورا بیان جاء الحق حصہ اوّل میں ملاحظہ فرماویں۔ جو شخص اس سے منع کرتا ہے۔ وہ عقیدۃً وہابی معلوم ہوتا ہے ذکر اللہ نہ آہستہ کرنا چاہیئے نہ چیخ کر بلکہ درمیانی پرسوز آواز سے۔ چنانچہ خود پروردگار عالم کا ارشاد ہے۔ لَا تَجْھَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ ؕ اس آیت میں صلوٰۃ سے مراد صرف ذکر اللہ ہے اس سے نمازِ مخصوصہ مراد نہیں۔ ورنہ رکوع سجدہ التحیات وغیرہ آہستہ ہی پڑھی جاتی ہیں۔ یہ آیت بقاعدۂ نحویہ عام خاص مطلق ہے اس لئے نماز کے قیام کے اذکار و تکبیرات کے علاوہ تمام اذکار کو شامل ہے۔ اور یہ نہی وجوبی نہیں بلکہ استحبابی اولویت کی ہے۔ حضرتِ محدث دہلوی کا قول بھی صریح دلیل ہے

کتبہ

ظہر احتیاطی پڑھنے کا بیان

سوال نمبر ۱۸: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ جمعہ کے دن احتیاط الظہر پڑھنا کیسا ہے؟ اگر یہ فرض یا واجب ہے تو پھر جمعہ کے دو فرض اور احتیاط الظہر چار فرض کس طرح نیت کریں؟ جوابات مفصل اور معتبرہ کتب سے عطا فرمائیں۔ اگر کوئی احتیاط الظہر نہ پڑھے تو کیا حرج ہے؟ کئی علمائے کرام احتیاط الظہر پڑھنا ضروری کہتے ہیں مثلاً امیر ملت رحمۃ اللہ وغیرہ۔ سائل: مقبول احمد نقشبندی ۲-۹-۵۶

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

اَلْجَوَاب

شریعت اسلامیہ میں جس طرح پنج وقتہ نماز فرض ہے۔ اسی طرح جمعہ بھی فرض عین ہے مگر فرق صرف یہ ہے کہ دیگر نمازیں فرض مطلق ہیں لیکن صلوٰۃ جمعہ فرض مقید ہے۔ جمعہ کی نماز میں بارہ قیدیں ایسی ہیں جو دیگر نمازوں میں نہیں۔ چھ ادا کرنے والے پر اور چھ ادا کرنے پر یعنی چھ یہ ہیں۔ مذکر ۱، مکلف ۲، تندرستی ۳، شہری ۴، بینا ۵، آزاد ۶۔ دوسری چھ یہ ہیں، شہر یا فنائے شہر۔ بادشاہ یا نائب کی اجازت۔ وقت ظہر۔ جماعت۔ خطبہ۔ اذن عام۔ جہاں یہ بارہ قیدیں جمع ہو جائیں وہاں جمعہ بالکل فرض عین ہے۔ ایسے مقام پر ایسا شخص نماز جمعہ کے ساتھ یا نماز جمعہ چھوڑ کر دوسری کوئی نماز فرض ادا سمجھ کر ہرگز ہرگز نہیں پڑھ سکتا۔ مذکورہ بارہ شرائط کے ہوتے ہوئے جمعہ کے دن ظہر احتیاطی پڑھنا منع ہے اسلئے کہ جمعہ فرض مکمل ہے۔ اس کی فرضیت میں کوئی شک نہیں۔ احتیاطی وہاں ہوتی ہے جہاں شک ہو۔ لہٰذا قانون شریعت کے مطابق بارہ عدد قیود کے ہوتے ہوئے ظہر احتیاطی منع ہے۔ چنانچہ ردالمحتار جلد اوّل صفحہ ۵۹۹ پر ہے۔ لا يميلها بنا على ما قدمه عن البحر من انه افتى بذالك مرارا خوف اعتقاد الجهلة فرضية الجمعة ترجمہ [illegible] احتیاطی اسلئے منع ہے کہ اس سے فرضیت جمعہ کے خلاف عقیدہ بنتا ہے۔ ان حالات میں ظہر احتیاطی منع ہے۔ جیسا کہ متعدد کتب فقہ سے ثابت ہے۔ سائل نے جواز احتیاطی کے ثبوت میں جن بزرگان دین کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نزدیک بھی جہاں مذکورہ شرائط مکمل جمع ہو جائیں وہاں جمعہ کے بعد ظہر احتیاطی پڑھنا ناجائز ہے۔ ظہر احتیاطی صرف وہاں پڑھی جائے گی جہاں ادا کی چھ مندرجہ بالا شرطوں میں سے کوئی نہ ہو۔ اگر ہر جگہ ہی جمعہ کے بعد ظہر احتیاطی پڑھنا واجب ہو جیسا کہ سائل کا قول ہے تو جمعہ کے فرض عین ہونے کا کیا مطلب ہے۔ ہاں جن مذکورہ بزرگان نے ظہر احتیاطی کو جائز اور ضروری فرمایا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مذکورہ فی الجواب ادا کی چھ شرطوں میں سے دو میں اختلاف واقع ہے ۱۔ شہر ۲۔ اذن سلطان یا نائب۔ بعض علمائے کرام فرماتے ہیں شہر وہ ہے جہاں عدالت ہو قاضی، مفتی ہو، بازار ہو اور بعض حضرات کہتے ہیں شہر وہ ہے جہاں اتنے انسان بستے ہوں کہ وہاں کی بڑی

مسجدیں سما نہ سکیں، جیسا کہ عالمگیری جلد اول ص۱۴۸ اور تفسیرات احمدیہ ص۳۸۶ پر ہے۔ لہٰذا شہر کی یہ تمام ہر دو قول کی تعریفیں جس بستی پر صادق آئیں گی وہاں جمعہ فرض عین ہے۔ جہاں یہ بات نہیں وہاں اگر جمعہ پڑھا گیا تو ظہر احتیاطی پڑھنی لازم ہے۔ پس چونکہ شہر کی تعریف میں اختلاف ہوا۔ اس لئے حکم احتیاطی میں بھی اختلاف ہو گیا۔ اسی طرح دوسری شرط حاکم کا جمعہ میں حاضر ہونا۔ چونکہ عام طور پر بلکہ فی زمانہ بالکل حاکم لوگ نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے اس لئے صرف ان چند علماء کرام نے اس شرط کو مفقود جان کر ہر جگہ ظہر احتیاطی کا حکم دے دیا حالانکہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ اس شرط کا یہ مطلب ہے کہ یا تو حاکم خود جمعہ میں حاضر ہو یا اجازت دے دے۔ پس آج کل جانب حکومت سے اذنِ عام ہے۔ لہٰذا آج کل مکمل تمام شرائط کے جمعہ ادا ہوتا ہے۔ چنانچہ تفسیرات احمدیہ ص۳۸۶ پر ہے۔ وَفِی السُّلْطَانِ اَدْنَاہُ لَا نَدْرِیْ شَرْطُ الْحُضُوْرِ اَمْ یَکْفِی الْاِذْنُ الْعَامُ

یہ ہی مندرجہ دو وجہیں ہیں جن کی وجہ سے علماء کرام نے ظہر احتیاطی کا حکم دیا تھا مگر بحمد اللہ تعالیٰ آج کل یہ وجہیں موجود نہیں اس لئے ان مقامات پر احتیاطی بھی منع ہے۔ اب احتیاطی صرف وہاں ہو گی جہاں اس بستی کے شہر ہونے میں شک ہو کیونکہ جب جمعہ کی فرضیت والی شرط یعنی شہر ہونے میں شک ہو تو جمعہ اور ظہر دونوں کی فرضیت میں شک ہوا۔ اور قانونِ شریعت کے مطابق ایک وقت میں دو وقتی فرض ہو نہیں سکتے۔ لہٰذا ظہر احتیاطی پڑھنا لازم اور یہ شہریت کا شک اس کی تعریف میں اختلاف کی بناء پر۔ اس لئے وہاں یہ احتیاط لازم تاکہ بندے کے ذمہ سے فرضیت نماز ادا ہو جائے۔ چنانچہ شامی جلد اول ص۷۵۶ پر ہے۔ وَنَقَلَ الْمُقَدَّسِیُّ عَنِ الْمُحِیْطِ کُلُّ مَوْضِعٍ وَقَعَ الشَّکُّ فِیْ کَوْنِہٖ مِصْرًا یَنْبَغِیْ لَھُمْ اَنْ یُّصَلُّوْا بَعْدَ الْجُمُعَۃِ اَرْبَعًا بِنِیَّۃِ الظُّہْرِ اِحْتِیَاطًا۔ امام مقدسی نے کہا کہ جہاں شہر ہونے میں شک پڑے وہاں احتیاطی پڑھ لو۔ خلاصہ یہ ہے کہ شہر میں ظہر احتیاطی نہ پڑھنا چاہیئے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

دیوبندی وہابی کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال نمبر ۱۹ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرح متین حسب ذیل مسائل کے بارے میں کہ:۔ (۱) دیوبندی وہابی کے پیچھے سنی کی نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟ (۲) اگر نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟

(۳) اگر کوئی اہل سنت والجماعت کا آدمی کہے کہ ہو جاتی ہے۔ تو اس کے لئے کیا حکم ہے۔ براہ کرم جواب دیں۔ نوازش ہو گی (۴) بعد از وفات اللہ تعالیٰ کے ولی زندہ ہوتے ہیں؟ (۵) اگر کوئی ان کو مردہ کہے۔ تو اس کیلئے کیا حکم ہے (۶) یہ جو تبلیغی جماعت نکلی ہے وہ کس عقیدے کی ہے؟ (۷) ان کے ساتھ تبلیغ میں جانا جائز ہے یا نہیں۔ براہ کرم جواب سے نوازیں۔ نوازش ہو گی۔ سائل: محمد افضل بہاولپور

۱۱ ۱۱ ۶۵

الجواب بعون العلام الوھاب ط

(۱) دیوبندی کے پیچھے سُنّی کی نماز قطعاً نہیں ہوتی۔ کیونکہ دیوبندی نبی کریم کے سخت گستاخ ہیں۔ اور جو شخص نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا گستاخ ہو۔ اس سے تو بات بھی نہیں کرنی چاہیئے چہ جائے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھی جائے جب ہم اپنے دشمن سے بات نہیں کرتے۔ اور ناراض رہتے ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن سے بات کرنا قطعاً گوارہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ مومنوں کے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے۔ اور اللہ ورسول کا دشمن سب مومنوں کا دشمن ہے۔ کیونکہ مومن وہ ہے جس کی محبت اللہ تعالیٰ کے لیئے ہو۔ اور دشمنی اللہ تعالیٰ کے لیئے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَ الْبُغْضُ لِلّٰہِ اور وہابی کی نماز تو رسول کریم کی گستاخی کی بنا پر باطل ہے۔ اگر پڑھانے والے کی نماز باطل ہے۔ تو پڑھنے والے کی کیسے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ نماز اللہ کی امانت ہے۔ اور امانت برے شخص کو دینا منع ہے۔ چنانچہ عالمگیری جلد اول باب الامانت میں ہے لَا یَجُوْزُ اَمَانَتُہٗ لِرَجُلٍ اَلَّذِیْ کَرِہَ الْقَوْمُ مِنْہُ ۔ (۳)۔ اور جو شخص کہے۔ کہ جائز ہے۔ وہ غلطی پر ہے۔ اس کو چاہیئے۔ کہ مندرجہ بالا جواب نمبر ا کا ملاحظہ کر کے اپنے غلط خیال سے توبہ کرے ۔ (۴)۔ بعد وفات کے اللہ تعالیٰ کے ولی زندہ ہوتے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ط۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیئے گئے وہ زندہ ہیں۔ مگر تم اتنا شعور ہی نہیں رکھتے۔ یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے ہر ولی کو شامل ہے۔ اس کا موضوع باری تعالیٰ نے شہیدوں کو فرمایا ہے۔ اگرچہ موضوع خاص ہے مگر حکم عام ہے۔ ہر وہ شخص شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں مارا گیا (۵) جو شخص ان کو مردہ کہے۔ وہ قرآن پاک کا انکار کرتا ہے۔ اس کو چاہیئے کہ اپنے باطل طریقے سے توبہ کرے ورنہ گمراہی کا خطرہ ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق آئندہ صفحات پر ملاحظہ ہو۔ (۶) جو لوگ مسجدوں میں اکثر تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ اور چند لوگ ان کے ساتھ کبھی کبھی مل جاتے ہیں۔ یہ جماعت وہابی ہے۔ ان کا ناظم مولوی الیاس وہابی تھا وہ فوت ہو گیا ہے۔ پہلے پہلے یہ اپنا مذہب ظاہر نہیں کرتے۔ مگر جب کوئی آدمی اُن کے جال میں پھنس جائے تو یہ اس کو اپنا عقیدہ صحیح بتاتے ہیں۔ جیسے تمام وہابیوں کا شروع سے پر فریب طریقہ ہے اس کے پورے حالات مشہور کتاب بنام تبلیغی جماعت میں دیکھو۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

بعد نماز پنج گانہ صلوٰۃ وسلام اور نعت خوانی کا بیان

سوال نمبر ۱۲ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جمعہ میں فرض، سنت، نوافل اور دعا وغیرہ کے اختتام پر جامع مسجد آرام باغ کراچی منجانب بزم غلامان مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم عرصہ سے پورے ادب واحترام کے ساتھ صلوٰۃ وسلام ونعت خوانی ہوتی ہے۔ ورد درود شریف کا ورد رہتا ہے۔ قبل عصر فاتحہ خوانی پر اختتام ہوتا ہے۔ اس مسئلہ میں اپنی رائے عالیہ سے واضح طور پر مستفیض فرمایئے۔

۵۶ - ۱۱ - ۱۹

بعون العلام الوهاب ط

الجواب

(۱) نماز کے بعد یا پہلے بلکہ ہر وقت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہر مسلمان کی زبان پر جاری رہنا نہایت ہی باعث برکت اور کار ثواب ہے۔ خواہ کسی طریقے سے ہو۔ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ط مگر چونکہ ہر مسلمان ذکر رسول اور ذکر اللہ کسی پابندی سے نہیں کر سکتا۔ اس لئے پانچوں وقتوں کی نماز کے بعد خاص طور پر جمعہ کی نماز کے بعد اللہ اور رسول کا ذکر بہت ہی بہتر ہے۔ اسی لئے بزرگان دین شروع سے یہ طریقہ ہی اختیار کرتے رہے ہیں۔ کہ وہ بعد نماز بلند آواز سے ذکر درود پاک، اور کلمہ شریف کا ذکر کرتے تھے چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ شریف جلد اول باب الجماعت) لہٰذا کسی وقت کسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول کا ذکر کرنا بہت ہی باعث برکت ہے۔ نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نعت خوانی اور آپ پر سلام پڑھنا، درود پاک پڑھنے کا حکم خود باری تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ نماز میں ارشاد فرمایا۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ ط اور اس طریقہ سے نماز میں کلمہ اور تکبیر میں سب ذکروں میں اپنے نبی کریم کے ذکر کی تلقین فرمائی۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بلند آواز سے کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ دوسرا پارہ رکوع پچیس۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ ط اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے ذکر کی تشبیہ لوگوں کے والدین کے ذکر سے دے رہا ہے۔ اور عرب کے لوگ جب اپنے والدین، باپ، دادوں کے ذکر کرتے تھے۔ تو مجلس مقرر کر کے بڑی شان وشوکت کے ساتھ بڑی آواز سے ذکر کیا کرتے تھے۔ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی بلند آواز سے کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نحوی عقلی قاعدہ اصولی ہے، کہ مشبّہ مشبّہ بہ کی طرح ہوتا ہے باری تعالیٰ کی منشاء یہ ہے کہ اللہ اور رسول کا ذکر تمام لوگوں کے ذکر سے زیادہ دھوم دھام اور شان وشوکت سے ہو ادب کا طریقہ بھی یہ ہے کہ غلامانہ کھڑے ہو کر عرض کیا جائے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ط

جو شخص جمعہ کی نماز کے لیئے ایک خطبہ پڑھ کر نماز شروع کر دے اس کا حکم

سوال نمبر ۱۲: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں، کہ ایک واعظ صاحب نے جمعہ کے دن بوقت نماز جمعہ پہلے تقریر کا خطبہ پڑھا پھر تقریر کی۔ پھر دوسری اذان ہوئی اور واعظ و امام صاحب نے صرف ایک خطبہ پڑھ کر ممبر سے اتر کر نماز کی جماعت شروع کرا دی۔ فرمایا جائے کہ کیا یہ صحیح ہے اور نماز جمعہ صحیح ادا ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ امام و خطیب اسی طرح کرتا ہے۔ لہٰذا شرعی فتویٰ عطا فرمایا جائے کہ ایسے امام و خطیب کے متعلق کیا حکم ہے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا۔

السائل:- آپ کا تابعدار عبد المجید مقام فتو والہ جامع مسجد براستہ شرقپور مورخہ ۸ ۱/۱۹۷۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ ۝

الجواب

قانونِ شریعت مطہرہ کے مطابق یہ مذکورہ خطیب سخت ترین گناہگار، قاطع و رافع سنت ہے۔ ممکن ہے کہ چکڑالوی یا پرویزی عقائد کا بے دین ہو۔ ایسے شخص کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز جائز نہیں، اس کو فوراً خطابت و امامت سے علیحدہ کر دو۔ ادائیگی جمعہ کے لیئے ایک خطبہ فرض ہے اور دو خطبے سنتِ مؤکدہ ہیں۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی ترک نہ فرمائے۔ بے شمار احادیث مبارکہ میں جمعے کے دو خطبوں کا ذکر ہے۔ مگر ترک کی طرف اشارۃً بھی کوئی روایت نہیں ملتی۔ جس سے قطعاً و یقیناً ثابت ہوا کہ نماز جمعہ کے لیئے دو خطبے ہی سنت مؤکدہ ہیں، چنانچہ فتاویٰ دُرِ مختار جلد اول صفحہ نمبر [illegible] پر ہے:- وَیُسَنُّ خُطْبَتَانِ خَفِیْفَتَانِ وَیُکْرَہُ زِیَادَتُھُمَا۔ ترجمہ:- اور جمعہ کے لیئے دو چھوٹے چھوٹے خطبے پڑھنا سنت ہیں، زیادہ دراز کرنا مکروہ ہیں، ایک خطبہ فرض ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اوّل صفحہ نمبر [illegible] پر ہے:- لِاَنَّ الْمَسْنُوْنَ ھُوَ تَکْرَارُھَا مَرَّتَیْنِ وَالشَّرْطُ اِحْدَاھُمَا۔ ترجمہ اس لیے کہ سنت ہے خطبوں کو دو دفعہ پڑھنا۔ اور ایک خطبہ پڑھنا فرض ہے۔ فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر [illegible] پر ہے:- وَالْخَامِسُ عَشَرَ الْجُلُوْسُ بَیْنَ الْخُطْبَتَیْنِ ۝ :- ترجمہ پندرھویں سنتِ جمعہ دو خطبوں کے درمیان بیٹھنا ہے۔ عالمگیری کا یہ قول دلالۃ النص ہے۔ جس سے ثابت ہے کہ دو خطبے سنتِ مؤکدہ ہیں۔ پس دلائل اشارۃ النص و عبارت النص و دلالۃ النص سے ثابت ہو گیا۔ کہ جمعہ کے لیئے دو خطبے سنتِ مؤکدہ ہیں۔ بطورِ ثبوت و عقیدہ تو واجب و سنتِ مؤکدہ میں کچھ تفاوت ہے۔ لیکن عملی طور پر دونوں ایک درجے کے ہیں کہ واجب کا تارک بھی گناہگار اور سنتِ مؤکدہ کا تارک بھی گناہگار۔ اس لیئے بہت سے فقہائے کرام نے سنت کو واجب کا درجہ دیا ہے

جبکہ سنت موکدہ بوجہ کسالت وسستی عملاً چھوڑی جائے لیکن اگر تحقیراً یا بارادۂ رفع سنت یا بنیت تبدیلی ہو سنت ترک کرتا ہے تو تارک کافر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی چیز کی حقارت یا ذلت کرنا موجب کفر ہے (دیکھو فتاوی شامی وبحر الرائق باب المرتدین کتاب السیر) سوال مذکورہ میں ظاہراً نظر آتا ہے کہ امام مذکورہ رفع سنت کی نیت سے ایسا کر رہا ہے۔ لہٰذا یا تو آئندہ کے لیئے توبہ کرے اور ہر جمعہ میں دو خطبے پڑھا کرے عربی زبان میں۔ یا امامت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تاکہ مسلمانوں کی نماز خراب نہ ہو اگر امام مذکورہ فقط سستی کی بنا پر ایسے قبیح فعل سے مرتکب ہوا۔ تو وہ شرعی گناہگار ہے۔ مگر نماز درست ہو گئی لیکن اگر تنفر عن سنت کی بنا پر ایسا کیا ہے۔ تو آج تک جتنی نمازیں اُس کے پیچھے ادا ہوئیں۔ وہ سب برباد۔ تمام۔ لوٹانی فرض ہیں۔ جمعہ کی جگہ اتنی ظہریں پڑھی جائیں۔ اور آئندہ کے لیئے توبہ بہر دوصورت لازم ہے۔ ورنہ توبہ نہ کرنا بھی اس کے ارتداد پر دال ہوگا۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتبہ

بلاضرورت چند جگہ جمعہ قائم کرنے کا حکم۔

سوال نمبر ۲۲ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر قریب قریب چند مساجد میں پہلے سے جمعہ قائم ہو اور آبادی تھوڑی ہو۔ ان مسجدوں میں بھی جگہ خالی رہتی ہو۔ نمازی تھوڑے مسجدیں زیادہ ہیں۔ ان حالات میں کیا ایک اور نئی مسجد میں جمعہ قائم کرنا جائز ہے یا نہیں۔ سائل ملک غلام حسین متولی نئی مسجد اپشاور شہر۔ مورخہ ۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

فی زمانہ مسلمانوں میں یہ بہت بری بیماری پیدا ہو چکی ہے کہ اسلام کے معاملے میں جہالت کی حد تک ضد بازی شروع کر دیتے ہیں جو قوم ذلیل ترین انسان کے سامنے بھی سر جھکا دے وہ اکڑتی ہے تو صرف علماء اسلام کے سامنے دیگر خرابیوں کی طرح آج کل یہ خرابی بھی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ کسی عالم دین یا بزرگ سے مخالفت ہوئی یا اپنی مرضی ہوئی تو جھٹ علیحدہ جمعہ قائم کر دیا۔ نہ مسجد کی حیثیت کو دیکھا نہ شریعت کے قانون کو حالانکہ قانون اسلامیہ کے مطابق جمعہ قائم کرنا بادشاہ اسلام کا کام ہے۔ جمعہ یا بادشاہ قائم کر سکتا ہے یا اس کا نائب شرعی طور پر آج کل مفتی اسلام بھی بادشاہ وقت کا قائم مقام ہے۔ لہٰذا مفتی اسلام کی اجازت کے بغیر کسی جگہ پر بھی جمعہ قائم کرنا جائز نہیں۔ اگرچہ وہ بہت بڑا عظیم شہر ہی کیوں نہ ہو۔ جس جگہ جمعہ قائم کرنا ہو پہلے شرعی فتوی حاصل کیا جائے۔ جمعہ باقی پنجگانہ نمازوں کی طرح فرض مطلق نہیں۔ بلکہ اس کے ادا کرنے میں بہت سی شرطیں ہیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کو بادشاہ یا نائب جاری کرے۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری جلد اول

صفحہ نمبر ۱۴۵ پر ہے۔ وَمِنْهَا السُّلْطَانُ عَادِلًا كَانَ اَوْجَائِرًا هٰكَذَا فِى التَّاتَارْخَانِيَةِ نَاقِلًا عَنِ النِّصَابِ اَوْمَنْ اَمَرَهُ السُّلْطَانُ وَهُوَ الْاَمِيْرُ اَوِ الْقَاضِىْ اَوِ الْخَطِيْبُ ط :۔

اور یہ شرطیں اس لیئے لگائی گئی ہیں، تاکہ جہلا عوام ہر جگہ جمعہ قائم نہ کرتے پھریں۔ اور جمعہ کی عظمت اور وقار میں فرق نہ آنے پائے۔ حاکمِ وقت، یا مفتی اسلام کے حکم سے ہر نئی جگہ جمعہ قائم کرنا جائز ہے۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد اول صفحہ نمبر ۵۹۵ پر درج ہے۔ کہ تُؤَدّٰى فِىْ مِصْرٍ وَّاحِدٍ بِمَوَاضِعَ كَثِيْرَةٍ مُّطْلَقًا (الخ) دَفْعًا لِلْحَرَجِ۔ یعنی شہر میں مطلقاً چند جگہ جمعہ ادا کرنا جائز ہے۔ ضرورت کو پورا کرنے کے لیئے علامہ شامی کی یہ عبارت ثابت کر رہی ہے۔ کہ چند جمعوں کی اجازت اسی وقت سے جب کہ مسجدیں بہت دور دور ہوں اور کسی مخصوص مسجد میں سب کا پہنچنا دشوار ہو اور یہ دشواری وہیں پر ہو سکتی ہے جہاں شہر بہت بڑا ہو۔ آبادی بہت زیادہ ہو۔ ایسے عظیم مقامات پر چند جگہ پر جمعہ قائم کرنا اشد ضروری ہے۔ اگر وہاں پر جمعہ میں پابندی اور رکاوٹ کی جائے گی تو بہت زیادہ حرج لازم آئے گا۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد اول میں ہے لِاَنَّ فِى اِلْزَامِ اِتِّحَادِ الْمَوْضِعِ حَرَجًا بَيِّنًا لِاِسْتِدْعَائِهٖ تَطْوِيْلَ الْمَسَافَةِ عَلٰى اَكْثَرِ الْحَاضِرِيْنَ ط :۔ پس ثابت ہوا کہ فقہائے کرام کا چند جگہ پر جمعہ کو قائم کرنے کی اجازت دینا سخت ترین ضرورت کی وجہ سے ہے۔ جب کہ منشاء جمعہ یعنی بہت لوگوں کا اجتماع اور جمعہ کی شان وشوکت باقی رہتی ہو۔ اسی طرح بہار شریعت باب جمعہ صفحہ نمبر ۹۴ پر ہے۔ سوال مذکورہ میں علیحدہ جمعہ قائم کرنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ جو صورتِ حال سوال میں درج ہے اس سے ظاہر ہے کہ نئی جگہ جمعہ قائم کرنا تو در کنار پہلے قائم شدہ جمعے بھی درست نہیں ہیں کیونکہ لفظ جمعہ جامع الجماعت کے معنیٰ میں ہے جس کا منشاء ہے کہ جامع مسجد میں بہت سے محلوں کے مسلمانوں کا اجتماع ہو۔ مگر سوالِ مذکورہ میں یہ ثابت ہو رہا ہے کہ پہلے قائم شدہ جمعے بھی شان وشوکت کے ساتھ ادا نہیں کیئے جاتے۔ شریعت میں منع ہے کہ جمعہ بھی پنجگانہ نماز کی طرح ہر محلے میں قائم کیا جائے۔ اور جمعہ کا اجتماع بھی عام نمازوں کی طرح تھوڑے تھوڑے نمازیوں سے ہو۔ پس سوال مذکورہ کی مسجد میں جمعہ ہرگز قائم نہ کیا جائے۔ اور امام مذکورہ کا مطالبہ غیر شرعی ہے۔ جمعہ قائم کرنے کے لیئے چند باتیں ضروری خیال رکھی جائیں۔ (۱) جمعہ کا خطیب عام مسجدوں کا امام نہ ہو۔ بلکہ جید مفتی اسلام یا عالمِ دین ہو، کہ جو اسلام کے تمام مسائل سے واقف ہو۔ اور ہم عقیدہ ہو۔ سند یافتہ ہو :: (۲) جمعہ قائم کرنے کے لیئے مفتی اسلام کا فتویٰ ضرور لے لیا جائے۔ تاکہ بستی والے لوگ بلا اجازت جمعہ قائم کر کے شرعی مجرم نہ بنیں :: (۳) بلا ضرورت جمعہ ہرگز ہرگز قائم نہ کیا جائے۔ جس جگہ پہلے جمعہ قائم ہے اسی کو آباد کیا جائے تاکہ جمعہ کے احترام باقی رہیں۔ جمعہ کی شان وشوکت کو بڑھانا ہر مسلمان کا فرض ہے :: واللہ ورسولہ اعلم ہ

کتبہ

نماز جوتی پہن کر پڑھنا گناہ ہے

سوال ۲۲

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں۔ کہ جوتی پہن کر مسجد میں آکر نماز پڑھنا باجماعت جائز ہے یا ناجائز۔ ہمارے علاقے میں بعض وہابیوں نے جوتے پہن کر نماز پڑھنی شروع کر دی ہے اور عَلَى الْاِعْلَان اس چیز کا رواج ڈالنا چاہتے ہیں کہ بوٹوں سمیت نماز پڑھ لی جائے اور باجماعت نماز میں جوتوں کے ساتھ مصلوں پہ کھڑا ہونا برا نہیں کہتے۔ ہم اہلسنت نے جب سخت اعتراض کیا تو کہنے لگے کہ شریعت میں جائز ہے۔ لہٰذا ہم سب اہلسنت نے آپ کی طرف رجوع کیا ہے ہم کو شرعی فتوٰی عطا فرمایا جائے تاکہ حق بات کا علم ہو

سائل :- حافظ محمد حنیف ساکن جاسوچنوں ڈاکخانہ باسوپنوں تحصیل پرور ضلع سیالکوٹ ،، ۲۰۔

اَلْجَوَاب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

قانون شریعت کے مطابق، روزمرہ کی استعمال شدہ کسی قسم کی جوتی پہن کر مسجد میں آنا یا اس کے ساتھ نماز کوئی بھی۔ فرض۔ نفل سنت۔ واجب۔ ادا کرنا یا باجماعت منع ہے۔ وہابیوں دیوبندیوں کا۔ ایسا کرنا یا جوتی پہن کر نماز پڑھنے کا رواج ڈالنا۔ ان کی کم علمی اور نافہمی کی بنا پر ہے۔ اور ایک نئی گستاخی بے ادبی کا ایجاد کرنا ہے۔ جو صرف غیر شرعی فعل نہیں۔ بلکہ فی زمانہ جب کہ نوجوان طبقے میں پہلے ہی فیشن پرستی۔ دین سے بے رغبتی کسل، سندی کاستی جیسی بیماریاں۔ روز بروز جاگزیں ہوتی جا رہی ہیں۔ ایسا رواج دینی لحاظ سے بہت ہی خطرناک حد تک قابلِ نفرت ہے۔ اس دور پر آشوب میں ہر روز نت نئی خود ساختہ شریعتیں بنتی چلی جا رہی ہیں ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی شریعت علیحدہ بنائے بیٹھا ہے۔ چھوٹے۔ چھوٹے مولوی تو در کنار ایک عام آدمی علوم دینیہ سے بالکل کورا۔ شرعی قواعد سے بالکل جاہل۔ قرآن کریم و احادیثِ مبارکہ کی باریکیوں سے قطعاً ناواقف بھی اپنے آپ کو کسی مفتی اعظم سے کم نہیں سمجھتے۔ اوّلاً تو حق مسئلہ سننے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے اور اگر کسی وجہ سے دل پہ جبر کر کے شرعی عالم کی بات سن بھی لیں تو عمل کرنے کی طرف بالکل آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی بحث نہ ڈاکٹر سے ہو نہ وکیل سے۔ نہ مستری سے ہو نہ بڑھئی سے۔ اُن کے قانون اور مشورے پر لب بمہر ہو کر سننے سمجھنے اور عمل کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ مگر جب عالم دین کوئی نماز روزے کا مسئلہ بتانے کی کوشش کرے گا تو کج بحثی۔ مناظرہ بلکہ مجادلہ۔ پیش پیش۔ اور عالم دین اور شریعت پاک

سے مذاق ہنسی وغیرہ اس کے علاوہ اس پُرفتن زمانے کی آزادی کو کیا کہئے کہ کوئی فیشن زدہ ننگے سر ہی نماز پڑھ رہا ہے۔ کسی نے بلاوجہ اظہارِ فیشن کے لیے۔ کرتے کے بٹن کھولے ہوئے ہیں۔ کسی فیشن پرست نے گلے میں ٹائی لٹکا کر بحالتِ نماز ہی صلیب پرستی روا رکھی ہے۔ کوئی شخص زمین تک تہبند گھسیٹے رہا ہے۔ ان سب باتوں کو اگر کوئی حرام نہ بھی کہے تو کم از کم۔ اَللّٰہ ربّ العالمین کے حضور بدتہذیبی گستاخی بے باکی ضرور ہے۔ اور پھر اس قسم کی بدتہذیبیاں خاص کر نماز میں اس لیے بھی منع ہونا لازم ہیں کہ ان سے خوفِ خدا ختم ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ عجز۔ خشوع۔ خضوع لذتِ نماز۔ عشقِ الٰہی یکسر مفقود ہو جاتا ہے جو قبولیتِ نماز کے لیے اشد ضروری ہے۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ مسلم قوم میں یہ بے خوفی یہ باکی آئی کہاں سے تو تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہ سب کچھ تربیتِ دیوبند اور تعلیم وہابیت کی پیداوار ہے۔ ان ہی کے نئے دین نے ابتداءً کچھ بے ادبیاں سکھائیں تو قوم نے دو ہاتھ اور آگے بڑھ کر عجیب آزاد خیالی بے باکی۔ بے تہذیبی۔ گستاخی کا مظاہرہ کیا کہ نہ قرآنِ مجید و احادیث مطہرات کو کوئی اہمیت دی۔ نہ مساجد و نماز کا احترام باقی رکھا۔ نہ کعبے کا ادب کیا۔ نہ مقابر و مزارات سے اچھا سلوک کیا۔ آفرین اور صد آفرین ہے اولیاء اللہ۔ مشائخ عظام۔ اور علماءِ اہلسنت کی تعلیم پر کہ جس کے روح پرور اثر سے مسلمان تو مسلمان۔ ہندوں۔ سکھوں۔ مشرکوں کو قرآن۔ حدیث اور مساجد و نماز کا ادب احترام کرتے دیکھا گیا۔ خصوصًا شادی بیاہ کے موقع پر۔ جتنا ادب مسجدوں کا ہندوؤں کو کرتے دیکھا گیا۔ آج ہمارے دیس کے مسلمان کہلانے والے نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ وہابی پودھی کی حرکات کا خمیازہ ہے۔ وہابیت کی اسی بے باکی آرام طلبی نے پہلے یہ ایک مسئلہ نکالا کہ کپڑے باریک نائلون کی جرابوں پر مسح کرنا جائز بتایا تاکہ وضو میں پیر نہ دھونے پڑیں اور اس طرح مسلمانوں کے وضو کے ساتھ ساتھ ان کی نمازیں بھی برباد کر دیں۔ اور اب حال ہی میں بقول سائل جوتیوں میں نماز پڑھنے کا مسئلہ ایجاد کر ڈالا۔ ایسے مسائل ایجاد کرنے کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دل سے مساجد اور نماز جیسے نشاناتِ اسلام کا تقدس ختم کیا جائے۔ قرآن و حدیث کی روشنی اور نصوصِ ظاہرہ و عباراتِ باطنہ کے ارشادات و مجملات سے فقہاءِ اسلام کے مستنبطہ مسائل اور ایسی ایمان فروز شرعی پابندیاں اسی لیے بھی ہو سکتی ہیں کہ دینِ اسلام کی عبادات مطہرہ و مقاماتِ مقدسہ۔ کی ہیبت و جلالت اور احترام و تقدس۔ اپنوں اور غیروں کے دلوں میں باقی رہے۔ تاکہ جلالِ کبریائی کے ذریعے جمالِ یار کے جلوے نظر آئیں اور نماز کی صحیح مٹھاس قلبِ مومن کو میسر ہو۔ ورنہ اگر کوئی آزاد خیال مسلمان ننگے سر۔ یا بوٹوں جوتیوں

کے ساتھ نماز پڑھ کر اپنی عبادت کو غارت کرتے ہوئے۔ شیرینیِ نماز سے محروم ہو جائے تو کسی کا کیا نقصان ہے۔ دیگر قیود و شرائط کے ساتھ ساتھ فقہاء کرام کی ننگے پیر کی نماز پڑھنے کی پابندی بھی اسی مقصدِ عظیم کے حصول کے لیئے ہے۔ مذکورہ فی السّؤال وہابیوں کا اس طریقے کو مطلقاً جائز نہ کہنا ہو سکتا ہے کسی خبرِ واحد کے سہارے پر ہو۔ اس لیئے کہ چند روایات کو بلا غور و فکر دیکھنے سے اس طریقے کا خفیف جواز نکل سکتا ہے اور نسلِ انسانی کے لیئے بڑے بڑے فتنے پیدا کیئے جا سکتے ہیں یہی نہیں بلکہ عبارات کے محض ظاہری الفاظ دیکھ کر بہت سے شرعی قانون کو توڑ کر نیا فرقہ بنایا جا سکتا ہے مگر جب تدبرِ ایمانی اور تفقہ فی الدین کی نظر سے ان احادیث کو پرکھا جائے تو عقلاً نقلاً یہی ثابت ہوتا ہے کہ فی زمانہ بلا مجبوری کسی طرح کی جوتی پہن کر نماز پڑھنا یا مسجد میں داخل ہونا شرعاً منع ہے۔ قرآن و حدیث و کتبِ فقہاء میں اس کے بیشمار دلائل موجود ہیں۔ لیکن چونکہ فی زمانہ مستعملہ جوتیاں تین قسم کی ہیں اور نماز کے ارکان و شرائط کے مختلف ہونے کے ساتھ مرورِ زمانہ سے بعض جزوی احکام بدل جاتے ہیں (جیسا کہ عقود رسم المفتی صفحہ ۲ پر باوضاحت لکھا ہے) اور پھر ہر شخص کی نیت اس کے ذہن اور عقیدے کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیئے یہ جوتیوں کی ممانعت تمام دلائل و عبارات پر پوری محققانہ نظر رکھنے سے تین قسم ثابت ہوتی ہے۔ ع۱ بعض جوتیوں سے نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی۔ ع۲ بعض سے مکروہ تحریمی۔ ع۳ بعض سے حرام ہے۔ چنانچہ باریک ربڑ یا سپنج کی پاک صاف نرم جوتی پہن کر نماز پڑھنا اگر اس مجبوری سے ہو کہ پیروں میں کچھ بیماری ہے جو ننگے پیر کرنے سے بڑھتی ہے اور جوتی پہنے بغیر چارہ نہیں۔ یا اس نماز کی جگہ میں کنکر پتھر یا کانٹے ہوں جس سے قدموں کا زخمی ہونا یقینی ہو تب ایسی مجبوریوں کی حالت میں پاک صاف نرم جوتی پہن کر نماز پڑھنا جائز بلا کراہت ہے مگر بلا ضرورت اس فیشن میں کہ پیر گرد آلود نہ ہوں۔ نرم پاک جوتی پہن کر نماز پڑھنا یا فقط مسجد میں داخلہ بھی مکروہ تنزیہی ہے۔ اس کے بہت دلائل ہیں۔ **دلیل ع۱**۔ یہ کہ اس میں مسجد اور نماز کی بہت بے ادبی۔ بے حرمتی ہے۔ اور مسجد مقدس جگہ نماز اللہ کی عظیم عبادت اور مومن کی معراج ہے۔ چنانچہ۔ صحیح البہاری جامع رضوی صفحہ ۲۳۶ پر طبرانی کے حوالے سے مرقوم۔ عَنْ نَافِعِ ابْنِ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ مِنْ اَبِیْہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (الخ) اِنَّمَا بُنِیَتْ بِالْاَمَانَۃِ وَشَرِفَتْ بِالْکَرَامَۃِ رَوَاہُ الطَّبَرَانِیُّ فِی الْکَبِیْرِ۔ (ترجمہ)۔ حضرت نافع نے فرمایا کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسجدیں امانۃ ایمانی کے لیے بنائی گئی ہیں اور عزت

سے مشرف و مقدس کی گئی ہیں اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ مساجد۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت مقدس مقامات ہیں مشکوٰۃ شریف صفحہ ۶۸ پر ہے۔ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ مَسَاجِدُھَا وَاَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ اَسْوَاقُھَا۔ رَوَاہُ مُسْلِمٌ۔ (ترجمہ) حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ فرمایا آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام جگہوں میں محبوب اور پیاری جگہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسجدیں ہیں اور سب میں بری جگہ بازار ہیں۔ اس حدیث پاک کی شرح میں ملا علی قاری نے مرقات جلد اوّل صفحہ ۴۴۲ پر کہا وَلَا شَكَّ اَنَّ الْمَسَاجِدَ مَحَلُّ التَّقَرُّبِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی۔ (ترجمہ)۔ اور نہیں ہے شک اس میں کہ بے شک مسجدیں قرب الٰہی کا مقام ہیں۔ اور یہ بات تو قرآن پاک سے ثابت ہے کہ مقدس مقامات اور قرب الٰہی کی جگہ جوتی پہن کر جانا بے ادبی میں شمار ہے۔ ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ شریعت کی عظمت والی جگہ جوتی اتار کر جانا چاہیے اگرچہ جوتی پاک ہو۔ چنانچہ باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ یٰمُوْسٰی اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی۔ (سورۂ طٰہٰ پ آیت ۱۲) (ترجمہ)۔ اے موسیٰ بے شک میں ہی تمہارا رب ہوں پس اپنی جوتی اتار دو کیونکہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اس کی تفسیر میں چند مفسرین نے کچھ غلط باتیں بھی کی ہیں کہ معاذ اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت مردہ گدھے کی غیر پختہ کھال کی جوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ جیسا کہ تفسیر صاوی صفحہ ۳۹ پر پارہ ۱۶ کی اسی آیت کے تحت قیل سے ایک قول نقل فرمایا۔ مگر یہ قطعاً غلط بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توہین ہے۔ بھلا آپ ناپاک جوتی کس طرح پہن سکتے تھے۔ وہ تو نبی مکرم رسول معظم تھے۔ ایک عام مسلمان کو ناپاک لباس یا پلید کھال کی جوتی نماز کے علاوہ بھی منع ہے۔ صحیح تفسیر ہے جو حضرت حسن۔ حضرت مجاہد۔ حضرت سعید ابن جبیر۔ اور ابن جریج رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمائی۔ کہ وہ جوتیاں مذبوحہ گائے کی پاک ستھری کھال کی بنی ہوئی تھیں۔ اتارنے کا حکم صرف اس لیے دیا گیا کہ وہ جگہ مقدس تھی۔ روش کلام بھی یہی ثابت کر رہی ہے کیونکہ۔ لفظ۔ اِنَّكَ بِالْوَادِ علت ہے جوتی مبارک اتارنے کی۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی پ جلد ہشتم صفحہ ۱۶۹ پر ہے۔ تَعْلِیْلٌ لِمُوْجِبِ الْخَلْعِ الْمَامُوْرِ بِہٖ وَبَیَانٌ لِسَبَبِ وُرُوْدِ الْاَمْرِ بِذٰلِكَ مِنْ شَرْفِ الْبُقْعَۃِ وَقُدْسِھَا۔ (ترجمہ) اِنَّكَ بِالْوَادِ کا جملہ علت ہے جوتی اتارنے کی اور اس حکم آنے کی سببیت کا بیان ہے۔ اس جگہ کے شرافت ہونے کی وجہ سے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو بھول چکے تھے۔ لہٰذا قرآن پاک سے ثابت ہوا کہ مشرف

اور مقدس جگہ پاک جوتی پہن کر جانا بھی بے ادبی ہے۔ اور اسلامی قانون سے پہلے ثابت کیا گیا کہ تمام مسجدیں معظمہ مقدس۔ اور لائق تعظیم ہیں۔ لہٰذا مسجد میں پہن کر جوتی لے جانا بھی گناہ ہے۔ اگرچہ پاک ہو۔ دوسری دلیل۔ فتاویٰ شامی جلد ۱ صفحہ ۶۱۵ پر ہے:۔ قُلْتُ لٰكِنْ اِذَا خَشِیَ تَلْوِیْثَ فَرْشِ الْمَسْجِدِ بِهَا یَنْبَغِیْ عَدَمُهٗ وَاِنْ كَانَتْ طَاهِرَةً۔ (الخ) وَلَعَلَّ ذٰلِكَ مَحْمَلُ مَا فِیْ عُمْدَةِ الْمُفْتِیْ مِنْ اَنَّ دُخُوْلَ الْمَسْجِدِ مُتَنَعِّلًا مِنْ سُوْءِ الْاَدَبِ تَاَمَّلْ۔ (ترجمہ) میں کہتا ہوں لیکن جب کہ خطرہ ہو مسجد کے گندہ ہونے کا تو اگرچہ جوتی پاک ہو مسجد میں لانا جائز نہیں۔ اور شاید یہی مطلب ہے اس عبارت کا جو عمدۃ المفتی میں ہے۔ کہ بے شک مسجد میں جوتی پہن کر داخل ہونا سخت ترین بے ادبی گستاخی ہے۔ یہ قابلِ غور مقام ہے اس دلیل سے بھی ثابت ہوا کہ مسجد میں پاک جوتی پہنے جانا بھی گناہ ہے۔ دلیلِ سوم۔ قرآن مجید فرماتا ہے:۔ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ:۔ (آیت ۳۲ سورۂ حج پ ۱۷) ترجمہ:۔ اور کون ہے جو تعظیم کرے اللہ تعالیٰ کے شعائر کی کیونکہ یہ تعظیم دلوں کے تقوے میں سے ہے۔ مسجدیں بھی اللہ کریم کے شعائر اور نشانات ہیں چنانچہ تفسیر معانی جلد نہم صفحہ ۱۵ پر ہے:۔ وَقَالَ زَیْدُ بْنُ اَسْلَمَ۔ اَلشَّعَآئِرُ سِتٌّ۔ ۱ اَلصَّفَا۔ ۲ اَلْمَرْوَةُ ۳ اَلْبُدْنُ ۴ اَلْجِمَارُ ۵ مَسْجِدُ حَرَامٍ ۶ عَرَفَةُ۔ (ترجمہ):۔ زید بن اسلم نے فرمایا کہ شعائرِ اسلام چھ ہیں۔ صفا مروہ قربانی کی ھدی کا اونٹ۔ تینوں جمرے۔ مسجدِ حرام:۔ میدانِ عرفات۔ جب مسجد حرم نشان اسلام ہے اور اس کی تعظیم واجب تو اسی پر قیاس کرکے دیگر مساجد بھی شعائرِ اسلام ہیں اور ان کی تعظیم و ادب بھی قلبی تقوے اور پرہیزگاری ہے۔ لہٰذا مسجد حرم شریف یا کسی بھی مسجد میں جوتی لے جانا بے ادبی اور تعظیم کے خلاف ہے۔ بلکہ ننگے پیر مسجد میں جانا عین ادب اور تعظیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع اسلام سے آج تک تمام حاجی مسلمان لوگ ننگے پاؤں طواف کرتے ہیں۔ بلکہ دورِ صحابہ میں حاجیوں کو جوتی اتارنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ کہ کعبے کو ننگے پیر جاؤ۔ چنانچہ تفسیر ابنِ کثیر جلد سوم صفحہ ۱۴۳ پر ہے:۔ وَقَالَ سَعِیْدُ بْنُ جُبَیْرٍ كَمَا یُؤْمَرُ الرَّجُلُ اَنْ یَّخْلَعَ نَعْلَیْهِ اِذَا اَرَادَ اَنْ یَّدْخُلَ الْكَعْبَةَ۔ ترجمہ:۔ صحابی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضرتِ موسیٰ کو نعلین شریف اتارنے کا حکم اس طرح ہے جس طرح اسلامی شریعت میں اس شخص کو حکم دیا جاتا ہے کہ جوتی اتار دے جو کعبے شریف میں جانے کا ارادہ کر رہا ہو۔ کعبے سے مراد مسجد حرم ہے۔ کیونکہ کعبہ شروع سے ہی مقفل ہوتا چلا آیا۔ اور بجز خصوصی اشخاص خصوصی اوقات کے کبھی عام داخلہ نہ ہوا۔ اور تفسیر

تفسیر انوار التنزیل علی اربع تفاسیر جلد چہارم صفحہ ۱۱ پر ہے:۔ وَلِذٰلِكَ طَافَ السَّلَفُ حَافِيْنَ۔ (ترجمہ):۔ اور اسی تعظیمِ مسجد کی بنا پر تمام پچھلے مسلمان ننگے پیر جوتی کے بغیر طواف کرتے تھے۔ حالانکہ طواف کعبے سے باہر مسجد حرام میں ہی ہوتا ہے۔ ثابت ہوا کہ شروعِ اسلام سے آج تک یہ ادب قائم دائم ہے کہ مسجد میں جوتی پہن کر نہ جاؤ بلکہ پابرہنہ جانا ہی ادب و تعظیم ہے۔ قرآن و حدیث و اقوالِ فقہاء کی ان تمام دلیلوں سے ثابت ہوا کہ تمام مسجدوں کا ادب ضروری اور جوتی پہن کر ان میں داخلہ ادب کے خلاف اس لیئے کہ تمام مسجدیں شعائر اللہ میں شامل ہیں۔ کیونکہ بقولِ مفسرین مسجد حرام شعائر میں ہے تو قیاساً مسجد نبوی شریف اور دیگر مساجد بھی نشانِ اسلام ہیں۔ اور میرا یہ قیاس نہ مع الفارق ہے نہ منفصل۔ نہ خیر شرع کیونکہ اسی طرح اور بھی بہت سے قیاس ہوئے ہیں۔ جس میں فقہاء علماء نے ایک مسجد کا حکم سب مساجد پر جاری فرمایا۔ چنانچہ کتاب وفاء الوفا جلد دوم صفحہ ۴۲۲ پر ہے۔ وَفِي الصَّحِيْحِ مِنْ حَدِيْثِ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ غَزْوَةِ خَيْبَرَ مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ يَعْنِي الثُّوْمَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا قَالَ بَعْضُهُمْ اَلنَّهْيُ اِنَّمَا هُوَ عَنْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاصَّةً مِنْ اَجْلِ مَلَائِكَةِ الْوَحْيِ وَالْاَكْثَرُ عَلٰى اَنَّهٗ عَامٌّ وَقَدْ حَكٰى اِبْنُ بَطَّالٍ اَلْقَوْلَ بِالْاِخْتِصَاصِ عَنْ بَعْضِ اَهْلِ الْعِلْمِ وَوَهَّاهُ۔ (ترجمہ) حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوم خیبر میں فرمایا کہ جو شخص کچا لہسن کھائے وہ ہماری مسجد نبوی شریف کے قریب بھی نہ آئے۔ بعض نے کہا یہ فرمان صرف مسجد نبوی کے لیئے ہے کیونکہ وہاں وحی کے فرشتوں کا وُرود ہوتا ہے:۔ مگر اکثر فقہاء کے نزدیک تمام مسجدیں اس حکم میں شامل ہو جائینگی۔ اور جنھوں نے اس حکم کو صرف ایک مسجد سے خاص کیا ان کا قول امام ابن بطال کے نزدیک واھیات اور ضعیف ہے۔ دیکھو فقہاء اسلام نے ایک مسجد کا حکم تاقیامت تمام مساجد پر جاری کر دیا اور قانون بنا دیا کہ کسی مسجد میں یا اس کے قریب ہو کر۔ پیاز۔ لہسن۔ حقہ۔ بیڑی۔ سگریٹ اور دیگر بدبودار اشیاء استعمال کرنا اور مسجد کے قرب وجوار میں بدبو پھیلانا حرام ہے۔ یہ سب مسائل قیاسی ہیں مگر جاری و ساری ہیں کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اعتکاف کے بہانے مسجد میں بیٹھ کر حقہ پیتے ہیں اور اپنی تمام عبادات کو برباد کر لیتے ہیں۔ پس جب یہ حکم قیاسی طور پر۔ سب مساجد پر جاری ہو سکتا ہے تو یہ قیاس بھی شرعاً درست ہے کہ تاقیامت تمام تقوے کی مسجد اور شرعی موقوفہ مسجدیں بھی شعائر اللہ ہیں۔ اور جب مسجد حرام کا ادب یہ ہے کہ جوتی اتار کر جائے تو دیگر مسجدوں میں جوتی اتار کر

جاتا ضرور رہا ہے۔ دلیل ع۴۔ پھر جاننا چاہیئے کہ جس طرح کائنات کے مقامات میں مساجد سب سے زیادہ اعلیٰ، ارفع معظم، مقدس مقام ہیں، اسی طرح، عبادات میں نماز سب عبادتوں سے زیادہ، اعلیٰ ارفع معظم مقدم و مقدس ہے۔ کہ عملی عبادات میں پہلی عبادت نماز ہے اور قولی عبادت یعنی ارکان اسلام میں دوسرا درجہ اس کا ہے۔ سب سے زیادہ قربِ الٰہی و معرفتِ نور کا ذریعہ نماز ہی ہے۔ چنانچہ مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اوّل دفتر چہارم مکتوب ۲۶۱ صفحہ ۳۲۲ پر ایک حدیث مبارکہ بایں الفاظ نقل فرمائی کہ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ نماز مومنوں کی معراج ہے۔ اور بھی بہت سی احادیث طیبہ نماز کی فضیلت میں وارد ہیں۔ تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی معراج کے لیے وادیِ طویٰ میں حاضر ہوئے۔ ان کو حکم ہوا کہ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ۔ اے موسیٰ جوتیں اتار دیجئے۔ پس اسی طرح ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب معراجِ مومنین یعنی نماز میں شامل ہو تو اپنی جوتی اتار دے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ صحابہ سے لے کر آج تک کبھی کسی نمازی نے جوتی پہن کر بلا مجبوری نماز نہ پڑھی۔ اسی طرح امام اعظم۔ امام شافعی۔ امام مالک۔ بھی نماز میں جوتی پہننے کو برا جانتے تھے۔ ہاں بعض حنبلی علماء۔ بلا کراہت جواز بلکہ فضیلت کے قائل ہیں۔ مگر یہ حنابلہ کو بھی تسلیم ہے کہ دورِ صحابہ و تابعین میں عام ذہنوں میں بحالتِ صلوٰۃ جوتی پہننا برا۔ بلکہ گناہ و کفر سمجھا جاتا رہا۔ چنانچہ حنبلی مسلک کی کتاب بلوغ المرام صفحہ ۴۲ پر اپنے مسلک کی حیثیت سے پہلے کچھ منع کرنے والوں کی برائی کرتے ہوئے آخر میں عوام الناس کے قلبی رجحان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ حَتّٰی کَادُوْا یُکَفِّرُوْنَ مَنْ یُّصَلِّیْ فِیْ نَعْلَیْہِ الطَّاہِرَیْنِ۔ ترجمہ۔ یہاں تک کہ قریب ہے کہ عام لوگ جس شخص کو بھی پاک جوتیوں میں نماز پڑھتے دیکھیں اس کو کافر کہنا شروع کر دیں، ثابت ہوا کہ پرانے زمانوں میں بھی جوتی سے نماز پڑھنا بہت برا سمجھا جاتا رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی طبقہ یا کوئی جماعت اس بے ادبی کا رواج ڈالتی تو عوام کا ذہن کبھی جوتی سے نماز پڑھنے والے کو اچھا نہ سمجھتا۔ جس کا ذکر برائی کے ساتھ حافظ ابن حجر عسقلانی حنبلی علیہ الرحمۃ نے کیا۔ حالانکہ ان کا دور ۸۵۲ھ ہجری کا ہے۔ امام عسقلانی کی یہ برائی ہم پر اثر انداز نہیں ہوتی کیونکہ یہ ان کا اپنا مسلک ہے اپنے اس مسلک کی بنا پر عام رواج کی برائی کر رہے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں صرف اُن کا ہی عقیدہ تھا کہ جوتیوں سے نماز پڑھنا بہتر ہے۔ رہی یہ بات کہ جن روایات و احادیث سے ابن حجر علیہ الرحمۃ نے جواز کا استدلال کیا ہے آن سے جواز یا فضیلت ثابت بھی ہوتی ہے، یا نہیں اور قائلینِ جواز کا استدلال کہاں تک درست ہے یہ سب وضاحت ابھی آگے بیان کی جائے گی۔ دلیل ع۵۔ وہابیوں کے ایک مولوی صاحب نے اپنے فتاویٰ نذیریہ میں صفحہ ۳۴

پر لکھا ہے کہ قبرستان میں جوتی پہن کر جانا منع ہے۔ اور ایک حدیث شریف بھی نقل فرمائی چنانچہ لکھتے ہیں منتقیٰ میں ہے :۔ عَنْ بَشِیْرِ بْنِ الْخَصَاصِیَةِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاٰی رَجُلًا یَّمْشِیْ فِیْ نَعْلَیْنِ بَیْنَ الْقُبُوْرِ فَقَالَ یَا صَاحِبَ السِّبْتِیَّتَیْنِ اَلْقِهِمَا رَوَاہُ الْخَمْسَةُ اِلَّا التِّرْمِذِیَّ (ترجمہ) :۔ بشیر بن خصاصیہ سے روایت ہے بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جوتی پہنے چلتے دیکھا قبرستان میں تو آپ نے فرمایا اے جوتی والے دونوں جوتیوں کو اتار دے صحاح ستہ میں سے پانچ کتب نے روایت کیا بجز ترمذی شریف۔ مولوی نذیر حسین صاحب نے اس کی بہت سی تاویلوں کو رد کرتے ہوئے۔ یہی عقیدہ بنایا کہ قبرستان کا ادب کرتے ہوئے جوتی پہنے قبرستان سے گزرنا منع ہے :۔ ثابت ہوا کہ وہابیوں کے پیشوا تو قبرستان میں بھی جوتی پہنے جانے کو بے ادبی شمار کرتے ہیں تو بتاؤ۔ کہ مسجد کا احترام کیا قبرستان سے کم ہے۔ دلیل ۶ صحیح البہاری جامع ترمذی صـ۸۷ پر ہے :۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ حَضَرْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ الْفَتْحِ فَصَلّٰی قِبَلَ الْکَعْبَةِ فَخَلَعَ نَعْلَیْہِ فَوَضَعَہُمَا عَنْ یَّسَارِہٖ (الخ) ترجمہ :۔ عبداللہ بن سائب نے فرمایا کہ میں بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا فتح مکہ کے دن آپ بجانب کعبہ نماز پڑھانے لگے تو آپ نے اپنی نعلین مبارک اتاریں اور ان کو بائیں جانب رکھا دلیل ۷ ابوداؤد صـ۹۵ وابن ماجہ صـ۲ اور نسائی صـ۱۲۵ پر ہے :۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ السَّائِبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلّٰی یَوْمَ الْفَتْحِ فَوَضَعَ نَعْلَیْہِ عَنْ یَّسَارِہٖ (ترجمہ) روایت ہے حضرت عبداللہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے موقع پر نماز پڑھانے لگے تو آپ نے اپنی جوتی شریف اتار دیں۔ ان دونوں دلیلوں سے ثابت ہوا کہ نبی کریم نے عملاً امت کو تبلیغ فرمادی کہ جوتی اتار کر نماز پڑھنا صحیح ہے۔ لہٰذا اب جو شخص جوتی پہن کر نماز پڑھے گا وہ نبی کریم کی عملی تبلیغ اور سنت نبی پاک کی مخالفت کی بنا پر گناہ گار ہوگا۔ دلیل ۸ مجمع البحار جلد سوم صـ۳۷۰ پر :۔ نووی شرح مسلم کے حوالے سے ہے :۔ یُصَلِّیْ فِی النَّعْلَیْنِ لَا یُؤْخَذُ مِنْہُ لِغَیْرِہٖ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاَنَّ حِفْظَ غَیْرِہٖ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُلْحَقُ بِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ ثُمَّ اِنْ نَعَلَ لَا یَفْعَلُ فِی الْمَسَاجِدِ لِئَلَّا یُفْضِیَ اِلَی الْفَسَادِ بَلْ لَا یَدْخُلُ الْمَسْجِدَ بِالنَّعْلِ مَخْلُوْعَةً اِلَّا وَهِیَ فِیْ کِنٍّ مُحْفَظَةٍ :۔ ترجمہ :۔ نبی کریم کے سوا کسی کو جائز نہیں کہ جوتی پہن کر نماز پڑھے۔ اس لیے کہ نبی کریم کی نعلین پاک جتنی ہر طرح محفوظ ہے اتنی کسی کی ہو نہیں سکتی پھر اگر کوئی کسی مجبوری سے جوتی کے ساتھ پڑھے بھی تو مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں تا کہ فساد نہ بڑھے اور جوتی پہن کر داخل نہ ہو بلکہ اتار کر ایک کونے میں محفوظ کرے۔ اس عبارت سے صاف ثابت

ہوا کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنا یا مسجد میں جانا ہر مسلمان کو منع ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف نبی کریم کو مل سکتی ہے اگرچہ آخر میں آپ نے بھی عملی تبلیغ اور صحابہ و تا قیامت مسلمانوں کو ادب سکھانے کے لیے ننگے پیر نماز پڑھانی شروع کر دی تھی۔ دلیل ۹ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک بھی جوتیوں میں نماز پڑھنا درست نہیں ہے چنانچہ نووی شرح مسلم جلد اوّل ص۲۰۸ پر ہے:۔ وَھُمَا قَوْلَانِ لِلشَّافِعِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَلْاَصَحُّ لَا تَصِحُّ۔ ترجمہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ صحیح قول یہ ہے کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ اور مرقات شرح مشکوٰۃ شریف میں جلد اوّل ص۴۸۳ پر ہے:۔ وَنُقِلَ عَنِ الْاِمَامِ الشَّافِعِیِّ اَنَّ الْاَدَبَ خَلْعُ نَعْلَیْہِ فِی الصَّلٰوۃِ۔ ترجمہ:۔ اور نقل ہے امام شافعی سے کہ بے شک ادب یہ ہے کہ نماز جوتی اتار کر پڑھے۔ ثابت ہوا کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنا بے ادبی گستاخی ہے دسویں دلیل عقل کا بھی تقاضہ ہے کہ جوتی اگرچہ پاک ہو مگر اس کے ساتھ نماز پڑھنا یا اس کو پہنے ہوئے مسجد کے اندر جانا ضرور بے ادبی ہے کیونکہ تمام لباس میں جوتی سب سے زیادہ ذلیل اور حقیر مانی جاتی ہے کسی معزز شخص کے قریب یا اس سے اونچی جوتی رکھنا معیوب گنا جاتا ہے۔ عام رواج میں کسی کو انتہائی ذلیل کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ وہ تو میری جوتی کے برابر بھی نہیں۔ اسی طرح کسی شخص سے ذلت آمیز نفرت کا اظہار کرنے کیلئے دوران جلسہ اس کو جوتیاں دکھائی جاتی ہیں بعض مجرموں کو ذلت کی سزا دینے کے لیے گلے میں جوتیوں کا ہار ڈالا جاتا ہے۔ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جوتی اگرچہ بالکل نئی ہو۔ مگر اس کو قرآن کریم یا حدیث مطہرہ و کتب فقہ و دینیہ سے اوپر کرنا گناہ ہے، حالانکہ صرف چمڑہ اونچا کرنا بلکہ اس کی جلد بنا کر قرآن پاک کو مجلد کرنا بالکل جائز ہے لیکن جب اسی چمڑے نے جوتی کی شکل اختیار کر لی تو اگرچہ مستعمل نہ ہو مگر حقیر ہو گی۔ اعلیٰحضرت کی متعلق مشہور ہے کہ آپ اپنے سید مرید یا شاگرد سے اپنی جوتی نہ اٹھواتے تھے۔ یہ ہے سادات کرام کا ادب جو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ جوتی ایک حقیر چیز ہے۔ اسی طرح اہل لغت کے نزدیک ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد ہشتم پارہ ۱۶ ص۱۶۹ پر ہے:۔ وَغَلَبَ عَلٰی مَا ذُکِرَ تَحْقِیْرًا وَلِذَا اُطْلِقَ عَلَی الزَّوْجَۃِ نَعْلٌ کَمَا فِیْ کُتُبِ اللُّغَۃِ۔ ترجمہ:۔ اور غالب وجہ جوتی اتارنے کی جوتی کا حقیر ہونا ہے۔ اسی لیے پہلے عرب لوگ بیوی کو جوتی سے تشبیہ دیتے تھے جیسے کہ کتب لغت میں ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ عام رواج میں بلا امتیاز عرب و عجم، جوتی ذلیل چیز ہے تو مسجد جیسی مقدس جگہ اور نماز جیسی اعلےٰ ارفع عبادت اور سجدے جیسی قرب خداوندی کی معراج مومن کے وقت جوتی پہننا کتنی بری بات ہے۔ اس لیے تمام فقہاء و محدثین نے اس کو منع اور بے ادبی

فرمایا۔ مگر یہ ممانعت مکروہ تحریمی اس لیے ہے کہ بعض روایات ایسی دستیاب ہیں جن سے جواز کا ایک پہلو نکل آتا ہے۔ اور وہابی لوگ اپنے ہم مسلک عوام کو مزید بے ادب بنانے کے لیے ان ہی روایات کو لیے پھرتے ہیں۔ لہٰذا اب ہم ان روایات سے گفتگو کرتے ہیں خیال رہے کہ میری یہ سابقہ سب گفتگو و دلائل صرف اس جوتی کے بارے میں ہے جو پاک اور نرم ہو۔ اسی کو مکروہ تحریمی فی الصلوٰۃ قرار دیا گیا ہے اور عقلی بھی روایات مندرجہ ذیل ہیں وہ سب اسی قسم کی جوتی کے بارے میں ہیں۔ کیونکہ پہلے زمانے میں سخت جوتی ہوتی ہی نہ تھی۔ چنانچہ فتح الودود شرح ابوداؤد کے حاشیہ صفحہ ۹۶ پر ہے:۔ نِعَالُ الْعَرَبِ كَانَتْ فِي ذَالِكَ الْوَقْتِ مِمَّا يُمْكِنُ وَضْعُهَا فِي الْفُرْجَةِ بِلَاحَرَجٍ۔ ترجمہ:۔ عرب والوں کی جوتیاں اس وقت اتنی نرم ہوتی تھیں کہ جن کو نماز کے لیے اتار کر قدموں کے درمیان یا بائیں طرف قدم کے ساتھ بلا تکلف رکھنا ممکن تھا۔ یعنی ان زمانوں میں چپل کی طرح مختصر اور معمولی نرم جوتی ہی بنتی تھیں آج کل کی طرح سخت موٹے موٹے بوٹ یا گرگابی نہ ہوتی تھیں۔ مسند عبدالرزاق کے حوالے سے جامع ترمذی نے صفحہ ۲۸۶ پر فرمایا:۔ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِي نَعْلَيْنِ مَخْصُوْفَتَيْنِ۔ ترجمہ:۔ عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے آقائے کائنات حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی جوتی مبارکہ میں نماز پڑھتے دیکھا۔ مخصوفتین کا لغوی ترجمہ ہے۔ کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چپل۔ (دیکھو منجد صفحہ ۱۷۸) پتہ لگا کہ اس زمانے میں رسیوں پتوں اور نرم نازک چمڑوں کی ہی جوتیاں بنتی تھیں۔ رسیوں کی چپلیں تو آج کل بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایسی جوتی سے نماز پڑھنا اسلام کے ابتدائی دور میں جائز تھا۔ جس کے متعلق مختلف کتب حدیث میں چند روایات مبارکہ وارد ہیں۔ چنانچہ ایک روایت بلوغ المرام صفحہ ۲۲ پر اس طرح ہے:۔ وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ رَأَى فِي نَعْلَيْهِ أَذًى أَوْ قَذَرًا فَلْيَمْسَحْهُ وَلْيُصَلِّ فِيْهِمَا أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاؤدَ۔ ترجمہ:۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا کہ فرمایا نبی کریم علیہ التحیۃ والثناء نے جب کوئی تم میں سے مسجد کی طرف آئے تو اپنی جوتی دیکھے اگر اس میں گندگی لگی ہے تو چاہیے کہ پونچھ دے اور ان جوتیوں کے ساتھ ہی نماز پڑھ لے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس روایت کو قائلین جواز بلا کراہت دلیل بناتے ہیں مگر یہ چند وجوہ سے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی پہلی وجہ یہ کہ بلوغ المرام نے کہا کہ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا یہ روایت ابوداؤد میں ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد اوّل صفحہ ۱۳۶ پر اس روایت کو سنداً ضعیف کہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَرَوَاهُ الْحَاكِمُ مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ وَرَوَاهُ الدَّارَ

قطنی مِنْ حَدِیْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَعَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الشِّخِّیْرِ وَاِسْنَادُھُمَا ضَعِیْفٌ۔ ترجمہ۔ اس ہی روایت کو حاکم نے حضرت انس وابن مسعود کی حدیث سے اور دار قطنی نے ابن عباس اور عبد اللہ بن شخیر کی حدیث سے روایت کیا۔ حالانکہ ان دونوں کی اسناد ضعیف ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ روایت صحیح نہیں اور اس سے کوئی دلیل پکڑنا غلط ہے، بلکہ سبل السلام والے تو صٓ۱۲ پر اس طرح کی تمام روایتوں کی سندوں کو ضعیف کہہ رہے ہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد قیاس کے مقابل چھوڑ دی جاتی ہے۔ چنانچہ اصول شاشی صٓ۷۸ پر ہے۔ فَاِنْ وَافَقَ الْخَبَرُ الْقِیَاسَ فَلَا خِفَاءَ فِیْ لُزُوْمِ الْعَمَلِ بِہٖ وَاِنْ خَالَفَہٗ کَانَ الْعَمَلُ بِالْقِیَاسِ اَوْلٰی۔ (الخ)۔ وَاِنَّمَا یُرَدُّ بِالْقِیَاسِ۔ ترجمہ۔ اگر خبر واحد، قیاس کے مطابق ہو تو تو اس پر عمل کرنا صحیح ہے لیکن اگر خبر واحد قیاس کے مخالف ہو تو روایت چھوڑ دی جائے گی اور قیاس پر عمل کیا جائے گا۔ اور امام شافعی کا قیاس اور امام اعظم کا قیاس قرآن مجید کی آیت فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ پر ہوا۔ قیاس کے علاوہ یہ روایت تو خود آیتِ قرآنی کے بھی خلاف ہے۔ کہ وہاں متقدس جگہ کے احترام کے لیے جوتی اتارنے کا حکم ہے اور یہاں مسجد نبوی جیسی مقدس و متبرک مقام میں جوتی پہننے کا حکم مل رہا ہے۔ اور جب خبر واحد قرآن کریم کے خلاف پڑتی ہو تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا آیت پر عمل کیا جائے گا چنانچہ شاشی صٓ۷۳ پر ہے:۔ قُلْنَا شَرْطُ الْعَمَلِ بِخَبَرِ الْوَاحِدِ اَنْ لَّا یَکُوْنَ مُخَالِفًا لِلْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمَشْھُوْرَةِ وَاَنْ لَّا یَکُوْنَ مُخَالِفًا لِلظَّاھِرِ قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ تَکْثُرُ لَکُمُ الْاَحَادِیْثُ بَعْدِیْ فَاِذَا رُوِیَ لَکُمْ عَنِّیْ حَدِیْثٌ فَاعْرِضُوْہُ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ فَمَا وَافَقَ فَاقْبَلُوْہُ وَمَا خَالَفَ فَرُدُّوْہُ۔ ترجمہ ہم علماءِ اصول نے کہا خبرِ واحد پر عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ روایت کتاب اللہ و حدیث مشہور کے مخالف نہ ہو اور نہ ہی کسی ظاہری حالت کے خلاف آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے میرے امتیو میرے بعد تم کو بہت حدیثیں گھڑ کر سنائی جائیں گی۔ تو جب کوئی حدیث تم سے بیان کی جائے میری طرف سے پس اے علماءِ امت اس روایت کا کتاب اللہ سے مقابلہ کر لیا کرو۔ اور جو موافق ہوں کو مان لیا کرنا جو مخالف ہو۔ اس کو نہ ماننا۔ سبحان اللہ اس حدیث مبارک نے بات صاف کر دی۔ اب خود غور کر لو کہ سابقہ دلائل عشر کے تحت یہ روایت آیتُ اللہ سے کب مطابقت رکھتی ہے۔ دوسری روایت۔ ابن ماجہ صٓ۷ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ بَکْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَةَ ثَنَا غُنْدَرٌ عَنْ شُعْبَةَ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ اَوْسٍ قَالَ کَانَ جَدِّیْ اَوْسٌ اَحْیَانًا یُصَلِّیْ فَیُشِیْرُ اِلَیَّ وَھُوَ فِی الصَّلٰوةِ فَاُعْطِیْہِ نَعْلَیْہِ وَیَقُوْلُ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ فِیْ نَعْلَیْہِ۔ ترجمہ ابن اوس نے فرمایا میرے دادا اوس زندہ تھے ایک دفعہ نماز پڑھتے وقت میری طرف اشارہ کیا حالانکہ نماز میں

ہی تھے پس رہا میں نے اُن کو اُن کی جوتی۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا کہ نعلین پاک میں ہی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس روایت میں شعبہ راوی مشکوک ہیں۔ ان کا اصل نام شعبہ بن دینار ہے چنانچہ تقریب التہذیب صفحہ ۱۴۶ پر ہے۔ شُعْبَۃُ بْنُ دِیْنَارِ الْہَاشِمِیُّ مَوْلَی ابْنِ عَبَّاسٍ اَلْمَدَنِیُّ صَدُوْقٌ سَیِّءُ الْحِفْظِ مِنَ الرَّابِعَۃِ مَاتَ فِیْ وَسْطِ خِلَافَۃِ ھِشَامٍ۔ ترجمہ شعبہ بن دینار ہاشمی ابن عباس کے آزاد کردہ غلام ہیں مدنی ہیں۔ درجہ حدیث میں صدوق ہیں۔ حافظہ خراب تھا چوتھے درجے کے ہیں ہشام کے دورِ خلافت میں فوت ہوئے تیسری روایت:۔ ابوداؤد صفحہ ۹۶ پر ہے حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاھِیْمَ ثَنَا عَلِیُّ بْنُ الْمُبَارَكِ عَنْ حُسَیْنِ الْمُعَلِّمِ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ حَافِیًا وَّمُنْتَعِلًا۔ ترجمہ:۔ عمر بن شعیب اپنے والد سے راوی ہے وہ اپنے دادا سے یا اُن کے دادا سے راوی . فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ نبی کریم کبھی ننگے پاؤں اور کبھی نعلین پاک کے ساتھ نماز پڑھتے اس روایت کی سند میں ایک راوی عمرو بن شعیب بن محمد صدوق راوی ہیں۔ محدثین کے نزدیک پانچویں درجے کے ہیں ۱۱۸ھ میں فوت ہوئے ایسا ہی امام ابن حجر نے اپنی کتاب تقریب کے صفحہ ۲۶۰ پر لکھا ہے۔ صدوق وہ ہے۔ جس کے حالات اولاً یا آخراً قابلِ اعتماد نہ ہوں حافظہ بھی کمزور، بہت خطائیں کرنے والا ہو (تقریب صفحہ ۹ مقدمہ ابن حجر عسقلانی) یہ روایت اور ان جیسی دیگر روایات میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے۔ جس سے یہ شہرت کے درجے پر تو کجا۔ صحت میں بھی معتمد نہیں۔ لہٰذا ان روایات کی وجہ سے آیاتِ قرآنی اور قیاسِ قرآن کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ ان میں فقط نبی کریم علیہ السلام کا اپنا عمل شریف بیان ہوا، جو خصوصی بھی ہو سکتا ہے۔ بھلا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین پاک سے آج ہماری جوتی کچھ نسبت رکھ سکتی ہے۔ پیارے۔ آقا صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے سب روا ہے کہ وہ تو خود صاحب شرع ہیں۔ جیسا کہ پہلے مجمع البحار کی عبارت سے ثابت کیا گیا تیسرے یہ کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم ایک وقتی اور عارضی حکم تھا۔ جس کی مدت تقریباً فتح مکہ کے دن تک رہی بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے یہ عمل بالکل ختم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کتب احادیث میں مع جوتی والی نماز کی جتنی احادیث بعد جستجوئے کثیر کے میری نظر سے گزریں وہ سب فتح مکہ سے قبل کی ہیں فتح مکہ کے دن اور بعد کا عمل شریف۔ جوتی اتار کر ہے۔ اور اقتضاءً اسی جوتی اتارنے ہی کا حکم احادیث سے ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد صفحہ ۹۵ جامع رضوی صفحہ ۴۸ ابن ماجہ صفحہ ۲ بذل المجہود جلد اوّل صفحہ ۳۵۵ پر اسی طرح ہے۔ خود ملا علی قاری بھی یہی کہہ رہے ہیں چنانچہ مرقات جلد اوّل

صفحہ ۴۸۳ پر ہے:۔ اِنَّ الْاَدَبَ الَّذِیْ اِسْتَقَرَّ عَلَیْہِ آخِرُ اَمْرِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ خَلْعُ نَعْلَیْہِ (ترجمہ) بے شک وہ ادب جس پر پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حکم قائم ہوا وہ جوتی اتار کر نماز پڑھنے کا ہے۔ ثابت ہوا کہ مدینے منورہ کی ابتدائی زندگی میں تو عارضی اور استحبابی حکم یہ تھا کہ چاہو تو جوتی پہن کر نماز پڑھ لو مگر فتح مکہ کے ایام میں جوتی اتارنے کا ہی آخری حکم جاری فرمایا گیا جو تا قیامت ہر مسلمان کے لیے ہے یاد رکھو کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنے کا عارضی حکم بھی چند وجہ سے دیا گیا تھا۔ پہلی وجہ یہ کہ اس وقت مساجد میں چٹائیاں مصلے قالین۔ یا دریاں نہ ہوتی تھیں بلکہ کنکر پتھر پڑے ہوتے تھے جو پیروں میں چبھتے تھے اسی مجبوری کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو جوتی پہننے کا حکم دیا۔ چنانچہ۔ فتاویٰ شامی جلد اول صفحہ ۶۱۵ پر ہے:۔ وَاَمَّا الْمَسْجِدُ النَّبَوِیُّ فَقَدْ کَانَ مَفْرُوْشًا بِالْحَصَا فِیْ زَمَنِہٖ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِخِلَافِہٖ فِیْ زَمَانِنَا۔ ترجمہ:۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد مطہرہ آپ کے زمانے میں کنکر بھری تھی لیکن آج ہماری مسجدوں اور خود مسجد نبوی شریف میں اب یہ بات نہیں۔ اور یہ میں نے پہلے بیان کر دیا ہے کہ مجبوری کی حالت میں پاک اور نرم تلے والی جوتی پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے:۔

صحابہ کرام کا جوتی پہن کر نماز پڑھنا تاریخی پس منظر کے لحاظ سے مجبوری ہی کی بنا پر تھا۔ جیسا کہ ابھی شامی کی عبارت سے ثابت ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ ہجرت پاک کے شروع زمانوں میں مدینہ منورہ میں یہودی بھی آباد تھے۔ جو اسلام کے ہر نظریے کی مخالفت میں سب کافروں سے زیادہ متعصب اور پیش پیش تھے اور مسلمانوں کے سخت دشمن ہونے کے علاوہ جھوٹ۔ فریب۔ وعدہ خلافی میں بڑے تاک تھے۔ اور ہر طرح سے مسلمانوں کو ایذا رسانی اور تکلیف پہنچانے کی سکیموں میں لگے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ منافقت کا جال بھی انہوں نے ہی بنایا۔ غرضکہ ہر لحاظ سے تنگ نظری۔ بداخلاقی۔ اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس لیے نبی کریم رؤف ورحیم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ یہودیوں کی ہر بات میں مخالفت کرو۔ اور ان کو اپنا ازلی دشمن سمجھو۔ وہ چونکہ جوتی اتار کر اپنی نماز پڑھتے تھے اس لیے صحابہ کو حکم دیا گیا کہ اس بات میں بھی ان کی مخالفت کرو۔ چنانچہ ابوداؤد شریف صفحہ ۹۵ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا قُتَیْبَۃُ بْنُ سَعِیْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا مَرْوَانُ بْنُ مُعَاوِیَۃَ الْفَزَارِیُّ عَنْ هِلَالِ بْنِ مَیْمُوْنَ الرَّمْلِیِّ عَنْ یَعْلَی بْنِ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَالِفُوا الْیَهُوْدَ فَاِنَّهُمْ لَا یُصَلُّوْنَ فِیْ نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ ترجمہ:۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کہ مخالفت کرو یہودیوں کی پس بے شک وہ جوتیوں میں نماز نہیں پڑھتے نہ موزوں میں۔ اسی روایت کو صحیح بہاری جامع رضوی نے بحوالہ بزار صفحہ ۴۸۶ پر کچھ زیادتی سے اس طرح نقل کیا:۔

خَالِفُوا الْیَهُوْدَ وَصَلُّوْا فِیْ خِفَافِکُمْ وَنِعَالِکُمْ فَاِنَّهُمْ (الخ) یعنی مخالفت کرو یہودیوں کی اور نماز پڑھا کرو اپنے موزوں میں اور اپنے جوتوں میں۔ کیونکہ وہ اپنے جوتوں موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔ طبرانی نے اسی روایت کو اس طرح بیان کیا۔ عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوْا فِیْ نِعَالِکُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْیَهُوْدِ ترجمہ:۔ جوتے پہنے نماز پڑھو اور نہ مشابہت کرو یہود کی اس لفظی اختلاف نے بھی اس روایت کو مشکوک کر دیا۔ ابوداؤد کی یہ روایت اگرچہ سنداً مکمل ثقہ نہیں کیونکہ اس کا ایک راوی ہلال بن میمون رملی ضعیف راوی ہے۔ جیسا کہ اسماء الرجال التقریب ص۳۶۶ پر ہے لیکن روشِ کلام سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ اجازت نہ تو دوامی ہے اور نہ یہ حکم وجوبی ہے بلکہ فقط یہود کی مخالفت کے اظہار کے لیے استحبابی امر کیا جا رہا ہے وہ بھی صرف چند دن کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہودی مدینہ منورہ میں رہے اس وقت تک صحابہ کرام با جماعت نعلین پہنے نماز پڑھتے رہے جیسا کہ ابوداؤد ص۹۵ اور جامع رضوی ص۴۸۶ پر ہے۔ اور یہودی مدینہ پاک میں ۴ھ تک رہے چنانچہ تاریخ طبری جلد دوم ص۳۰ پر ہے:۔ کہ ربیع الاوّل شریف کی تقریباً پچیس تاریخ کو ۴ھ میں مدینہ مقدسہ سے چھ دن کی مہلت پر تمام نکال دیئے گئے اور بجز ہتھیار سب سامان لے کر گئے:۔ گویا کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم سن ہجری چار تک تھا۔ بعد میں فتح مکہ ہوا اس وقت کے عمل سے ثابت ہوتا ہے:۔ کہ جوتی اتار کر نمازیں پڑھیں اسی لیے جتنی روایتیں جوتی پہن کر نماز پڑھنے کی ہیں وہ سب پہلے کی ہیں اور جوتی اتارنے کی فتح مکہ کے دن کی ہیں۔ اور بقول مرقات ملا علی قاری یہ ہی آخری حکم تھا۔ اور اصول فقہ کے مطابق آخری حکم قیامت تک کے لیے محکم ہوتا ہے:۔ پس نتیجہ نکلا کہ اب قیامت تک جوتی اتار کر نماز پڑھی جائے گی۔ روایات مندرجہ ذیل میں بیان کردہ جوتی پہننے کا حکم صرف مخالفت یہود کی بنا پر تھا۔ اب یہ مقام غور ہے کہ یہ مخالفت کیوں تھی اس میں دو احتمال ہیں۔ یا یہ مخالفت ان کے کفر کی بنا پر ہے، اور یا اُن کی خصوصی اسلام دشمنی کی وجہ سے پہلی صورت میں تو تمام کافر شامل ہو جاتے ہیں کہ جس زمانے میں جس کافر کا جس علاقے میں عروج ہو وہاں کے سب مسلمانوں پر اُن کفار کے تمام طور طریقوں مذہبی رواجوں کی مخالفت ضروری ہے۔ اور یہ (خَالِفُوا الْیَهُوْدَ۔ والخ۔) :۔ روایت کو قاعدہ کلیہ کی حیثیت حاصل ہو گی کہ اسی پر تمام جزئیات متفرع بنتے چلے جائیں گے اور تغیر زمان سے تغیر حکمی ہوتا رہے گا۔ پس چونکہ زمانۂ صحابہ میں مدینہ پاک کی سکونت میں یہود کثرت سے تھے۔ اور اس وقت جوتی اتار کر نماز پڑھتے تھے اور پہنتے

کو حرام اشد حرام سمجھتے تھے لہٰذا اس وقت مخالفت کی یہی شکل تھی جو اوپر حدیث شریف نے بیان کی کہ صَلُّوْا فِیْ نِعَالِکُمْ۔ وَخَالِفُوا الْیَهُوْدَ۔ جوتی پہنے نماز پڑھو اور یہود کی مخالفت کرو مگر اب چونکہ ہمارے علاقوں میں پاکستان ہندوستان افغانستان میں۔ یہود ہیں ہی نہیں عیسائی بکثرت ہیں۔ وہ اپنی نمازیں جوتی پہن کر پڑھتے ہیں۔ یہود بھی جن علاقوں میں رہتے ہیں اب جوتی پہنے عبادت کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت کی صورت یہی ہے کہ جوتی اتار کر مسلمان نماز پڑھیں چنانچہ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف جلد اوّل ص۴۸۳ پر ہے اَلْاَدَبُ فِیْ زَمَانِنَا عِنْدَ عَدَمِ الْیَهُوْدِ النَّصَارٰی۔ ترجمہ۔ یا جوتی اتارنے کا حکم اب اس لیے ہے۔ کہ ہمارے زمانے میں عیسائی یہودی نہیں ہیں۔ تو ادب کا خیال رکھتے ہوئے جوتی اتاری جائے:۔

بذل المجہود جلد اوّل ص۳۵۵ پر ہے:۔ دَلَّ هٰذَا الْحَدِیْثُ عَلٰی اَنَّ الصَّلٰوةَ فِی النِّعَالِ کَانَتْ مَامُوْرَةً لِمُخَالِفَةِ الْیَهُوْدِ اَمَّا فِیْ زَمَانِنَا فَیَنْبَغِیْ اَنْ تَکُوْنَ الصَّلٰوةُ مَامُوْرًا بِهَا حَافِیًا لِمُخَالِفَةِ النَّصَارٰی فَاِنَّهُمْ یُصَلُّوْنَ مُتَنَعِّلًا لَا یَخْلَعُوْنَهَا عَنْ اَرْجُلِهِمْ۔ ترجمہ۔ اس (خَالِفُوا الْیَهُوْدَ والی) روایت نے یہ دلالت کی کہ بے شک نماز جوتی پہن کر پڑھنے کا حکم صرف یہود کی مخالفت کے لیے دیا گیا تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں بس لائق یہ ہے کہ ننگے پیر نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے۔ عیسائیوں کی مخالفت کی بنا پر کیونکہ وہ جوتے پہن کر نماز پڑھتے ہیں۔ بذل المجہود کی اس عبارت نے بات بالکل صاف کر دی اب کسی وہابی کو کلام کی اجازت نہیں۔ پتہ لگا کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنے کی استحبابی اجازت صرف ان دنوں تک تھی جب تک یہودی وہاں آباد تھے ہماری اس تقریر کو اگر مخالف نہ مانے تو کتب احادیث کی مختلف روایات جو ابھی ہم نے بیان کیں ان میں تضاد و ٹکراؤ پیدا ہو گا۔ کہ قولاً کچھ ثابت ہو گا عملاً کچھ۔ قول سے جوتی پہننے کا وجوب ماننا پڑے گا۔ صَلُّوْا فِیْ نِعَالِکُمْ۔ میں صَلُّوْا امر ہے۔ جس کو بجز ہمارے استدلال کے کسی اور صورت میں استحباب نہیں مانا جا سکتا۔ اور جب اسی امر کو مخالف نے وجوب کے لیے مانا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کے بعد والے اس عمل شریف کو کیا جائے گا جو اپنی جوتی مبارک اتار کر پڑھیں کیا معاذ اللہ یہ ہو سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک شئی کو واجب کیا اور خود ہی اس کا ترک فرمایا حالانکہ واجب کا ترک گناہ ہے:۔ دیکھو تلویح توضیح ص۲۶:۔ اور بعض فقہاء کے نزدیک یہ بھی قانون ہے کہ دلیل فعلی زیادہ قوی ہوتی ہے قولی دلیل سے چنانچہ مرقات اوّل ص۴۸۳ پر ہے:۔ اِنَّ الدَّلِیْلَ الْفِعْلِیَّ اَقْوٰی مِنَ الدَّلِیْلِ الْقَوْلِیِّ:۔ احادیث سے دلیل قول پہلے زمانے میں ہے۔ دلیل فعل عمل بعد میں ہے۔ اور بعد والا قانون دائمی مستحکم اور محکم ہوتا ہے۔ اگر مخالف یہ کہے۔ کہ صلوا۔ امر سے وجوب ہی مراد ہے۔ مگر وجوب اسی وقت کے لیے تھا۔ اب وجوب ختم ہو گیا۔

استحباب باقی رہے گا تو میں کہوں گا کہ بالکل غلط ہے کیونکہ قانون تین قسم کے ہیں ع۱ قانون معلق بالعلت جیسے نماز کی فرضیت امر سے ۔ ع۲ معلق بالسبب جیسے نماز کی فرضیت وقت سے ع۳ قانون غیر معلق جیسے کھانا پینا وغیرہ پہلا قانون جو علت سے معلول ہو، علت کے ختم ہونے سے بالکل ختم ہو جاتا ہے اگر خدانخواستہ آج نماز کا اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ختم ہو جائے تو نماز کی فرضیت استحبابیت سب ختم ہو جائے بلکہ اس طرح نماز پڑھنا گناہ ہو جائے ۔ جیسے کہ نماز موسوی کی علت ختم تو آج اس طریقے پر نماز پڑھنا گناہ ہے :۔ دوسرا قانون معلق بالسبب ہے یہ بھی سبب کے ختم ہونے ختم ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے سفر میں اقامت کی نمازیں ادا کرنا گناہ ہے ۔ یا جیسے کہ وقت سے پہلے یا بعد نماز پڑھنے سے گناہ لازم آتا ہے ۔ جوتی میں نماز کا حکم معلق بالسبب ہے اور اس کا سبب یا مجبوری ہے یا مخالفتِ یہود ۔ جب یہ سبب ختم تو حکم بھی بالکل ہی ختم نہ وجوب باقی رہا نہ استحباب ۔ بخلاف قانون غیر معلق کے کہ اس میں اگر وجوب ختم ہو جائے تو استحباب باقی رہتا ہے ۔ جیسے کہ غذا و القباء زندگی و صحت کیلئے واجب ہے ۔ مگر لذت کے لیئے کھانا پینا مستحب ہے، پس مخالف کا یہ عذر بھی قطعاً ختم ہو گیا ۔ اگر مخالفت یہود فقط ان کی تنگ نظر و سرکشی کی بنا پر ہو تب بھی یہ حکم اب جاری نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارے علاقوں میں یہود موجود نہیں ہیں اور پھر اب اس کی نمازوں کا طریقہ بھی بدل گیا تو حکم مخالفت کی نوعیت بھی بدل جائے گی کیونکہ وقت کے بدلنے سے فرعی حکم بدل جاتے ہیں ۔ چنانچہ فتح القدیر اوّل صفحہ ۲۰۹ پر اسی طرح ہے :۔ اب ہماری اس دراز گفتگو سے ثابت ہو چکا کہ فی زمانہ بلا عذر جوتی پہن کر نماز پڑھنا گناہ ہے ۔ جو اس چیز کا رواج ڈالتا ہے وہ بدترین گناہ گار ہے ۔ ہم نے وہ سب روایتیں بیان کر کے ان کا تاریخ و شرح کی روشنی صحیح مطلب مفہوم بھی بیان کر دیا جو ۔ نعلین پہننے کے استدلال میں پیش کی جا سکتی تھیں ۔ یہ سب تحریر اور دلائل نرم اور پاک جوتی کے بارے میں ہے :۔ اور چونکہ ان دلائل کی بنیادی و عبارتی حیثیت زیادہ قیاسی ہے ۔ اس لیئے اس کو مکروہ تنزیہی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ قانون فقہ کے مطابق جس کام سے بے ادبی کا شائبہ پیدا ہوتا ہو وہ مکروہ تنزیہی ہے فتح القدیر کے حوالے سے شامی نے فرمایا ۔ (قَوْلُهٗ تَنْزِيْهًا) لِمَا قَدَّمْنَا عَنِ الْفَتْحِ مِنْ اَنَّ تَرْكَهٗ اَدَبٌ وَتَرْكُهٗ اَوْلٰى وَاَيْمَنًا هُوَ خِلَافُ التَّوْدَةِ وَالْوَقَارِ فَالنَّهْيُ عَنْهُ نَهْيُ اَدَبٍ ۔ ترجمہ ۔ مکروہ تنزیہی بقول فتاوی فتح القدیر یہ ہے کہ اس کا چھوڑنا بہترین ادب ہو اور اسکا چھوڑ دینا بھی بہتر ہو اور وہ کام عزت اور وقار کے بھی خلاف ہو تو اس کی ممانعت ۔ ادب کی وجہ سے ممانعت ہے حاشیہ طحطاوی جلد اول صفحہ ۲۴۳ پر ہے :۔ وَمَكْرُوْهٌ تَنْزِيْهًا وَهُوَ مَا تَرْكُهٗ اَوْلٰى مِنْ فِعْلِهٖ ۔ ترجمہ :۔ مکروہ تنزیہی وہ ہے ۔ جس کا چھوڑنا ہی بہتر ہے اس کے کرنے سے ۔ اس میں ہمارے متأخرین و متقدمین کا اختلاف

ہے کہ مکروہ تنزیہی کا حکم ادرجہ کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے دونوں مکروہ حرام ہیں۔ چنانچہ حاشیہ عبدالحکیم علی توضیح صفحہ ۲۷ پر ہے:۔ اِذِ الْمُسْتَفَادُ مِمَّا نُقِلَ اَنَّ الْمَکْرُوْہَ مُطْلَقًا حَرَامٌ۔ ترجمہ:۔ کیونکہ منقولہ عبارت سے یہی فائدہ لیا گیا ہے کہ بے شک مطلق مکروہ حرام ہے۔ اکثریت کا قول ہے کہ مکروہ تنزیہی کے چھوڑنے پر ثواب ہے اور کرنے پر عذاب نہیں۔ مگر عند اللہ ناپسندیدہ ہے۔ پاک جوتی سے نماز پڑھنا اس لیے مکروہ تحریمی ہے کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قولی کا ترک کرنا ہے ہاں البتہ سنت غیر مؤکدہ کا ترک تنزیہی ہے۔ چنانچہ کبیری صفحہ ۳۹۲ پر ہے:۔ وَاِنْ تَضَمَّنَ تَرْكَ سُنَّةٍ فَهُوَ مَكْرُوْهٌ كَرَاهَةً تَنْزِيْهِيَّةً۔ (ترجمہ:۔ اگر ایسا کام کیا جس سے سنت کا چھوڑنا لازم آئے تو وہ کام مکروہ تنزیہی ہے۔ فتاوےٰ رد المحتار جلد اول صفحہ ۶۱۱ پر ہے:۔ فَاِنْ كَانَتْ غَيْرَ مُؤَكَّدَةٍ فَتَرْكُهَا مَكْرُوْهٌ تَنْزِيْهًا (ترجمہ) اگر کسی نے سنت غیر مؤکدہ کو چھوڑا تو مکروہ تنزیہی ہوگا۔ نماز جوتی اتار کر پڑھنا غیر مؤکدہ سنت پاک نہیں ہے۔ جیسا کہ احادیث مشہورہ سے ثابت کر دیا لہٰذا اب کوئی شخص جوتی نہ اتارے تو مکروہ تحریمی فعل کا مرتکب ہوگا۔ اور مکروہ فعل قانونِ شریعت میں عند اللہ بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔ شامی جلد اول صفحہ ۱۱۱ پر ہے:۔ لِاَنَّ الْكَرَاهَةَ حُكْمٌ شَرْعِيٌّ۔ مکروہ ہونا اسلامی شریعت کا حکم ہے۔ کبیری صفحہ ۲۹۲ اور مراقی الفلاح صفحہ ۲۲ پر ہے:۔ اَلْمَكْرُوْهُ ضِدُّ الْمَحْبُوْبِ وَالْاَدَبِ (ترجمہ) مکروہ چیز پسندیدگی اور ادب کے خلاف ہے پس جب جوتی پہننا رب تعالیٰ کو ناپسندیدہ ہے تو مسلمان کو کب جائز ہے بعض عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مکروہ تنزیہی اس لیے ہے کہ پاک نرم جوتی سے سجدے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور اس لیے بھی جوتی مکروہ تنزیہی ہے کہ اس پر کوئی وعید ثابت نہیں ہوتی اور اس لیے بھی مکروہ تنزیہی ہے کہ مسجد یا نماز میں پاک و صاف نرم جوتی پہننے سے گناہ کا شائبہ ہے۔ فی الواقع نہیں۔ اور شائبہ گناہ کراہت تنزیہی بنا دیتا ہے۔ کیونکہ ادنےٰ گناہ صغیرہ سے بھی فعل مکروہ تحریمی بن جاتا ہے۔ چنانچہ شامی جلد اول صفحہ ۴۲۵ پر ہے:۔ بِاَنَّ كُلَّ مَكْرُوْهٍ تَحْرِيْمًا مِنَ الصَّغَائِرِ (ترجمہ) ہر مکروہ تحریمی سے گناہ صغیرہ لازم آتے ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ مکروہ تنزیہی جائز ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ قول اصولاً غلط ہے:۔ اس لیے کہ کراہت تنزیہی نہی کی آٹھ اقسام سے ہے۔ چنانچہ تلویح صفحہ ۱۴۷ پر ہے:۔ اَلنَّهْيُ هِيَ التَّحْرِيْمُ وَالْكَرَاهَةُ وَالتَّنْزِيْهُ (ترجمہ) حرمت، کراہت۔ اور مکروہ تنزیہی ہونا یہ سب نہی ہے یعنی شریعت مطہرہ کی ممنوع چیز اور ممنوع وجواز کا اجتماع۔ اجتماع ضدین ہے جو غلط ہے فتاویٰ حدیثیہ نے بھی صفحہ ۳۶ پر ایک مسئلہ بتاتے ہوئے مکروہ تنزیہی کو نہی میں شامل کیا ہے لہٰذا کراہت تنزیہی کو جائز کہنا ہمارے علماء کی فکری غلطی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنا اگر مکروہ تنزیہی ہو تب بھی ناجائز ہے۔ اگرچہ جوتی پاک ہو بعض عبارات سے جو تنزیہی ثابت ہوا وہ بھی فقط پاک جوتی سے نماز

اس صورت میں مکروہ تنزیہی ہے جب کہ مسئلے سے ناواقفی کی بنا پر ایسا کرے یا اپنے خیال میں احادیث کو بے سمجھی کی بنا پر جواز کا قائل بنا رہے۔ لیکن صحیح مسئلے کو جاننے کے بعد ہٹ ہر لا کرتے ہوئے۔ یا ضد بازی سے مسجد میں جوتی پہنے جانا یا نماز پڑھنا سب کے نزدیک ہر طرح مکروہ تحریمی ہے اور اگر نماز یا مسجد کو معمولی سمجھ کر یا بے ادبی کی نیت سے جوتی پہنے داخل ہوگا اور نماز پڑھے گا تو فوراً کافر ہو جائے گا کیونکہ شعائر اسلام کی حقارت و اہانت کفر ہے یہ تمام صورتیں پاک اور نرم جوتی کی بیان ہوئیں۔ مگر ناپاک جوتی سے نماز پڑھنا ہر وقت حرام ہے۔ اگرچہ نیچے سے پلید ہو یا اوپر سے یا کسی قسم کی نجاست لگی ہو۔ اور پڑھنے والا سخت گناہ گار فاسق۔ نماز لوٹانی واجب ہے۔ اس لیے کہ جب جوتی پہنی ہو تو وہ لباس کے حکم میں ہے۔ فتاویٰ بحر الرائق جلد اوّل ص۲۶۸ پر ہے:۔ وَفِیْ رِجْلَیْہِ نَعْلَانِ اَوْجَوْرَبَانِ ۔ لَمْ تَجُزْ صَلٰوتُہٗ لِاَنَّہٗ قَامَ عَلٰی مَکَانٍ نَجِسٍ وَلَوِ افْتَرَشَ نَعْلَیْہِ وَقَامَ عَلَیْہِمَا جَازَتْ صَلٰوتُہٗ ۔ ترجمہ:۔ اگر جوتی یا جراب وغیرہ کے نیچے گندگی لگی ہو اور جوتا پہنا ہوا ہو تو نماز منع ہے ناجائز ہے۔ لیکن اگر جوتا اتار کر اس پر کھڑا ہو گیا تو جائز ہے۔ شارحین فرماتے ہیں لِاَنَّہٗ فِیْ حُکْمِ اللِّبَاسِ ۔ اس لیے کہ وہ جوتا پہننا لباس کے حکم میں ہے۔ اگر جوتا اوپر سے پلید ہو تب بھی نماز میں جوتا پہننا مکروہ تحریمی ہے۔ چنانچہ بذل المجہود جلد اوّل ص۲۵۸ پر ہے:۔ اَنَّ وُجُوْبَ طَہَارَۃِ الثَّوْبِ وَالنَّعْلِ ثَابِتٌ بِالنَّصِّ وَھُوَ مُجْمَعٌ عَلَیْہِ اَیْضًا فَعَدَمُ طَہَارَتِہٖ یُنَافِی الصَّلٰوۃَ فَیَمْنَعُ اِبْتِدَاءَ الصَّلٰوۃِ ۔ (ترجمہ):۔ بے شک کپڑوں جوتوں کا پاک رکھنا واجب ہے۔ ثابت ہے نص شرعی سے بھی اور اجماع امت سے بھی پس ناپاک ہونا نماز کے منافی ہے اور ناپاک جوتی سے شروع سے ہی نہ ہوگی۔ یعنی مجبوری۔ بلا مجبوری بہر صورت ناپاک جوتی پہنے نماز پڑھنا سرے سے ہی نماز کو باطل کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ فعل اشد حرام ہوا۔ اس عبارت سے یہ امتیاز بھی ہو گیا کہ نرم پاک جوتی بحالتِ نماز۔ بذات خود بھی مکروہ تحریمی اسکا پہننا بھی مکروہ تحریمی۔ لیکن ناپاک جوتی خود تو مفسدِ نماز ہے مگر پہننے سے مکروہ تحریمی والا گناہ لازم ہوتا ہے اس لیے کہ ناپاک جوتی یا کپڑے اتارنا واجب اور ترک واجب بھی مکروہ تحریمی ہوتا ہے۔ چنانچہ شامی جلد اوّل ص۵۹ پر ہے:۔ بِاَنْ تَضَمَّنَ تَرْکَ وَاجِبٍ اَوْتَرْکَ سُنَّۃٍ فَالْاَوَّلُ مَکْرُوْہٌ تَحْرِیْمًا وَالثَّانِیْ تَنْزِیْہًا ۔ ترجمہ:۔ دلیل کے بغیر کراہت اس طرح بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ فاعل کا فعل واجب کو ترک کرتا ہو تو مکروہ تحریمی ہے اور سنت کو ترک کرتا ہو تو تنزیہی ہے یہ ثابت ہے کہ پاک لباس۔ پاک جسم۔ پاک جگہ نماز میں شرط ہے۔ اور ناپاک جوتا اتارنا واجب تو جو شخص ناپاک جوتی میں نماز پڑھے گا اس نے ترکِ واجب کیا اور ترکِ واجب گناہ ہے:۔ (توضیح ص۲۸) جن روایات سے یہ شائبۂ جواز پیدا ہوتا ہے۔ یا صحابہ کرام کے زمانۂ مقدسہ کے

ابتداء میں صلوٰۃ فی النعلین کا جو حکم ہوا تھا۔ اس کے متعلق تمام شارحین فرماتے کہ وہ حکم نرم اور پاک جوتی کے لیے ہی تھا۔ چنانچہ ماجہ شریف صـ۲ـ پر ہے۔ ملـ۹ قَوْلُهٗ يُصَلِّي فِي نَعْلَيْهِ هٰذَا اِذَا كَانَ طَاهِرَيْنِ۔ اور مرقات اوّل صـ۴۸۳ـ پر ہے۔ اَيْ يُصَلِّيْ فِيْهِمَا اَيْ كَانَ طَاهِرَيْنِ۔ (ترجمہ) نبی کریم رؤف ورحیم صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم کا صحابہ کرام کو یہ حکم جواز فرمانا کہ یا جوتی میں ہی نماز پڑھلے اس صورت میں تھا جب کہ وہ پاک ہوں پس ثابت ہوا کہ پلید جوتی سے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہ۔ اگر پڑھی گئی ہو تو نماز لوٹانا فرض ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ جس طرح ناپاک جوتی نرم یا سخت نماز میں مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ مدلل ثابت کیا گیا۔ اسی طرح تیسری قسم کی جوتی۔ جو سخت ہو بوٹ نما وہ بھی نماز میں پہننا اشد گناہ اور حرام و باطل ہے۔ پاک ہو یا پلید۔ اس کی چند دلیلیں ہیں۔ پہلی دلیل:۔ نماز میں سجدہ فرض ہے۔ اور سجدے میں سات اعضا کا زمین پر لگنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ شریف صـ۶۳ـ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ مُعَاذِ الضَّرِيْرُ (الخ) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰى سَبْعَةِ اَعْظُمٍ۔ (ترجمہ):۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا آقا صلے اللہ علیہ وسلم نے میں حکم دیا گیا ہوں کہ سات اعضا پر سجدہ کروں۔

ان سات اعضا میں۔ چہرہ۔ دو ہاتھ۔ دو گھٹنے دو قدم شامل ہیں۔ جوتی سخت ہو تو قدم زمین سے نہیں لگتا۔ اور جب دونوں قدم زمین سے نہ لگے تو سجدہ مکمل نہ ہوا جب سجدہ نہیں تو نماز نہیں۔ اس لیے سجدہ کی حفاظت کے لیے سخت قسم کے جوتے اتارنے فرض ہوگئے۔ اور بحالتِ نماز پہنے رکھنے باطل ہوگئے۔ دوسری دلیل:۔ سجدے میں قدم رکھنے کا مطلب ہے کہ انگلیاں زمین سے لگ کر کعبہ رخ ہو جائیں۔ چنانچہ کبیری شرح منیہ صـ۲۲۹ـ پر ہے:۔ ثُمَّ الْمُرَادُ مِنْ وَضْعِ الْقَدَمِ وَضْعُ اَصَابِعِهَا قَالَ الزَّاهِدِيُّ وَضْعُ رُؤُسِ الْقَدَمَيْنِ حَالَةَ السُّجُوْدِ فَرْضٌ (الخ) وَفُهِمَ مِنْ هٰذَا اَنَّ الْمُرَادَ بِوَضْعِ تَوْجِيْهُهَا نَحْوَ الْقِبْلَةِ۔ (ترجمہ) پھر مراد قدم رکھنے سے اس کی انگلیاں رکھنا ہے۔ امام زاہدی نے فرمایا کہ دونوں قدموں کے سروں یعنی انگلیوں کو سجدے کی حالت میں زمین پر لگنا فرض ہے۔ اور اس سے سمجھا گیا کہ بے شک مراد رکھنے سے انگلیوں کو قبلہ رخ کرنا ہے۔ نرم جوتی میں تو یہ بات ممکن ہے مگر سخت جوتی میں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جوتی اگرچہ پاک ہو نماز میں پہننا باطل ہے۔ اور اس سے نماز ٹوٹ جائے گی کہ سجدہ ہی درست نہ ہوا تو نماز کیسے ہو۔ دلیل سوم:۔ تمام شارحین نے روایاتِ جواز کی شرح کرتے ہوئے یہی فرمایا کہ اس وقت بھی صرف اسی جوتی کے بحالت نماز پہننے کی اجازت تھی جو پاک نرم ہو اور اس سے سجدہ درست

ہو سکے۔ سخت جوتی کا پہننا بحالت نماز سب نے ہی قطعاً ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ۔ جلال الدین سیوطی حافظ حدیث اپنی شرح ابن ماجہ مصباح الزجاجہ کے صفحہ ۷۲ پر فرماتے ہیں۔ ص قَوْلُہٗ یُصَلِّیْ فِیْ نَعْلَیْہِ هٰذَا اِذَا کَانَا طَاهِرَیْنِ وَیَتَمَکَّنُ مَعَهُمَا مِنْ اِتْمَامِ السُّجُوْدِ بِاَنْ یَّسْجُدَ عَلٰی جَمِیْعِ اَصَابِعِ رِجْلَیْهِ (الخ) وَمَعَ ذَالِكَ الْاَدَبُ خَلْعُ النَّعْلَیْنِ۔ وَاَمَّا اِذَا لَمْ یَکُوْنَا طَاهِرَیْنِ اَوْ لَمْ یَتَمَکَّنْ مِنْ اِتْمَامِ السُّجُوْدِ فَخَلْعُهَا وَاجِبٌ۔ (ترجمہ) راوی کا قول کہ اپنی نعلین پاک میں نماز پڑھ لیتے تھے یہ جواز اُس وقت اُس جوتی کے بارے میں تھا جب کہ جوتیں پاک ہوں اور ان کے ساتھ اس طرح سجدہ کرنا ممکن ہو کہ پاؤں کی تمام انگلیاں سجدے میں لگ جاویں اس کے باوجود اتار دینا ہی ادب ہے۔ اور لیکن جب نہ ہوں پاک یا سجدہ پورا کرنا ناممکن ہو تو جوتی اتارنا واجب ہے۔ مرأت شرح مشکوٰۃ جلد اول صفحہ ۲۶۹ پر اسی طرح ہے اور فتاویٰ برہنہ میں ہے قدم بر زمیں در سجدہ فرض است۔ د و ضع۔ دضع قدم اصابعاست ترجمہ:۔ سجدے میں قدم رکھنا فرض ہے اور رکھنے سے مراد۔ قدم کی انگلیاں لگانا ہے۔ ان عبارت سے ثابت ہوا کہ سخت جوتی بھی نماز کو توڑ دیتی ہے۔ اور سخت جوتی پہن کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی بلکہ حرام ہے۔ خلاصہ یہ کے کسی قسم کی جوتی سے نماز پڑھنا منع ہے۔ نرم پاک سے مکروہ تحریمی پلید یا سخت جوتی سے مکروہ تحریمی یا حرام۔ میرے نزدیک مکروہ تنزیہی بھی جائز نہیں کیونکہ نہی کی اقسام میں سے ہے۔ اگرچہ کراہت تنزیہی میں نہی کا ادنیٰ کا درجہ ہوتا ہے مگر چونکہ کچھ متقدمین اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اس لئے ہر دو کی مطابقت کے لیئے یہ قاعدہ باندھنا ضروری ہے کہ وہ کراہت تنزیہی جو بلا ضرر ہو نقصان دہ نہ ہو وہ جائز ہے۔ جیسے کہ نابالغ بچے کی صحیح اذان کہ مکروہ تنزیہی ہے مگر جائز۔ (شامی صفحہ ۲۶۴ جلد اول اور وہ مکروہ تنزیہی جو نقصان دہ ہے وہ ناجائز جیسے کہ بعض کے نزدیک پاک نہیں ہوتی نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے یا تحریمی کہ اس سے مسجد کی خرابی نماز کی بے ادبی کا نقصان۔ اور موجودہ کفار کی مشابہت اس لئے یہ مکروہ تنزیہی قطعاً ناجائز کے درجے میں ہے۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ مکروہ تنزیہی کی ممانعت زیادہ شدید نہیں ہوتی مگر تحریمی کی ممانعت شدید ہے۔ چنانچہ فتاویٰ ردالمحتار جلد اول صفحہ ۵۹۲ پر ہے۔ وَلٰكِنْ تَتَفَاوَتُ التَّنْزِیْهِیَّةُ فِی الشِّدَّةِ وَالْقُرْبِ مِنَ التَّحْرِیْمِیَّةِ (ترجمہ) اور لیکن فرق ہوتا ہے مکروہ تنزیہی کا شدت اور قرب حرمت میں مکروہ تحریمی سے۔ یعنی منع تو دونوں مگر کراہت تحریمی شدت سے منع ہے۔ پس نتیجہ نکلا کہ کسی قسم کی جوتی سے نماز پڑھنا شرعاً منع ہے۔ لہٰذا جو وہابی لوگ اس قسم کی بدتہذیبی کا رواج ڈالنا چاہتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو جڑ اکھنی سے مخالفت کر کے کچل دیں تاکہ مسلم قوم میں نئی بداخلاقی پیدا نہ ہو سکے۔ شریعت اسلامیہ کا یہ حکم ہر شخص کے لیئے ہر حالت میں قابلِ اتباع ہے۔ فوج ہو یا

پولیس۔ میدان جنگ ہو یا گھریلو امن امیر ہو یا غریب رعایہ ہو یا بادشاہ۔ ہرگز ہرگز کسی کو اجازت نہیں کہ مسجد میں یا کسی نماز میں مع جوتی آئے۔ اگر کوئی ہٹ دھری یا گستاخی پر اتر آئے تو یاد رکھو کہ میرے رب کی لاٹھی کمزور نہیں۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ہے۔ یہ بہانہ کرنا کہ میدان جنگ میں جوتی اتارنے کا موقعہ نہیں ہوتا اس لئے جوتی میں نماز کو جائز ہونا چاہیے قطعاً غلط ہے اوّلاً اس لئے کہ کون کہتا ہے کہ تم اپنے فضول جوتے فوج کو پہناؤ۔ یہ جوتے چند سالہ انگریزی رواج کے پیداوار ہیں۔ ختم کر ڈالو ایسے رواج کو جس سے دین میں رکاوٹ پیدا ہو پہلے بھی جنگیں ہوتی تھیں ہر طرح کی جوتی مستعمل تھی فتح و شکست فوجی بوٹ پر موقوف نہیں دوم اس لئے کہ۔ دینی رواجوں سے۔ اسلام نہیں بدلا جاسکتا۔ سوم اس لئے کہ کل کو کسی فوجی یا پولیس کے سپاہی کو بے وضو نماز کی بھی اجازت دیدینا یہ جوتی نہ اترنے کا بہانہ تو بہت دراز ہو سکتا ہے۔ جب میدان جنگ میں وضو کیلئے جوتا اتر سکتا ہے تو نماز کے لئے بھی اتر سکتا ہے تیمم کا بہانہ بھی قابل تسلیم نہیں۔ کہ جب میدانِ جنگ میں استنجے اور کھانے پینے کی مہلت حاصل کی جاسکتی ہے تو جوتے اتار کر نماز کی مہلت کیوں نہیں مل سکتی۔ پس فیصلہ شرعی یہ ہے کہ کسی قسم کے جوتے سے نماز پڑھنی جائز نہیں۔ نہ مسجد میں جانا جائز اور اپنے بزرگوں کے اسی پیارے طریقے پر قائم رہو کہ باداب مسجد کے دروازے پر جوتا اتار کر پہلے سیدھا پاؤں مسجد میں رکھو اور جوتا بائیں ہاتھ میں پکڑ کر ایسی جگہ رکھو جہاں چوری کا خطرہ نہ ہو نہ ہی بحالت نماز جوتے کے اندیشے سے نماز کے خشوع میں فرق پڑے جوتا نمازی اپنے سامنے بھی رکھ سکتا ہے۔ اور قبلہ رخ دیوار کے ساتھ بھی بعض بے وقوف اس سے منع کرتے ہیں یہ ان کی جہالت ہے حدیث پاک میں کوئی ممانعت ثابت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانوں سے فقط یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدموں کے ساتھ اپنا جوتا رکھے مگر یہ اس وقت کے لئے تھا کیونکہ جوتی چپل نازم اور مختصر ہوتی تھی جیسا کہ حاشیہ ابوداؤد کا پہلے حوالہ دیا گیا اب بہت بڑے بڑے جوتے ہوتے ہیں جو پیروں کے پاس۔ صف میں رکھنا ناممکن ہاں پیچھے جوتی رکھنا شرعاً منع ہے چنانچہ بذل المجہود اوّل صفحہ ۳۵۸ پر ہے۔ وَاِنَّمَا لَمْ يَقُلْ اَوْ خَلْفَهٗ لِئَلَّا يَقَعَ قُدَّامَ غَيْرِهٖ اَوْ لِئَلَّا يَذْهَبَ خُشُوْعُهٗ لِاحْتِمَالِ اَنْ يُسْرَقَ ترجمہ نبی کریم جوتے پیچھے رکھنے کا حکم نہ دیا تاکہ پچھلے نمازی کے سر کی جگہ نہ آئے یا تاکہ اس نمازی کی توجہ نہ ہٹے چوری کے احتمال سے۔ واللہ و رسولہ اعلم

کتبہ

سوال ۲۴ وتر کب واجب ہوئے اور دعاء قنوت کس رکعت میں پڑھی جائے

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ نماز پنجگانہ تو معراج کی رات اللہ تعالیٰ نے فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کے

مقام پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ جبریل امین بلاکر عطا کی اس طرح پانچ فرض نمازیں مسلمانوں کو ملیں اور سنتیں آقائے دوعالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرماکر مسلمانوں کو عطا فرمائیں۔ لیکن وتر واجب کب ہوئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ کس طرح اور کس وقت میں پہلے ادا کئے۔ اور دعاء قنوت کس رکعت اور کس وقت پہلی دفعہ پڑھنے کا حکم ملا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت سنت ایک فرض اور ایک واجب ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔ اور کیا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وبارک وسلم نے پہلے ہی تین رکعتیں پڑھیں ہیں یا کمی بیشی سے۔ السائل۔ قاضی نور حسین معرفت صوفی فضل حسین ٹی سٹال نزد ڈاکخانہ سکھو۔ (مندرہ) مقام خاص گوجر خان ضلع راولپنڈی۔ مورخہ ۸/۷۲ ۲۱

بعون العلام الوہاب

الجواب

آپ کا استفتاءِ گرامی دربارۂ وتر نماز تشریف لایا۔ واضح رہے کہ سابقہ انبیاءِ کرام پر صرف ایک ایک نماز فرض تھی اس لئے کہ وہ صرف ایک علاقے کے مخصوص نبی تھے۔ مگر چونکہ ہمارے نبی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہٖ وسلم عرش وفرش کے نبی بھی ہیں اور شہنشاہِ اعظم بھی اس لئے آپ کو خصوصی طور پر دو نمازیں عطا ہوئیں۔ ایک نماز تہجد اور دوسری نماز وتر۔ اور چونکہ آقاء کائنات کو رات زیادہ پسند ہے اس لئے باری تعالیٰ جل مجدہٗ نے اپنے پیارے حبیب کو نمازیں بھی رات میں عطا فرمائیں۔ اسی پسندیدگیٔ محبوب کی بنا پر امتِ مسلمہ کو افضل دن فقط ایک جمعہ عطا ہوا مگر راتیں چار عطا ہوئیں ۱۔ شبِ ولادت ۲۔ شبِ قدر ۳۔ شبِ برأت ۴۔ شبِ معراج۔ اور چونکہ دن مختلف وقتوں کا مجموعہ ہے ۱۔ اشراق ۲۔ چاشت ۳۔ مکروہ ۴۔ ظہر ۵۔ عصر ۶۔ مغرب ۷۔ فجر۔ مگر رات سب ایک ہی وقت ہے۔ اور قانونی طور پر ایک وقت میں ایک فرض ہو سکتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو چونکہ دونوں نمازیں رات کی عطا ہوئیں اس لئے ایک فرض ہوئی تو دوسری واجب۔ اور چونکہ فرض کا درجہ واجب سے زیادہ ہے اس لیے آقائے کائنات علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے ہمیشہ پہلے تہجد پڑھی بعدہ وتر یہی وجہ ہے کہ دیگر امتوں پر عبادت صرف فرض تھی نہ واجب نہ سنت۔ مگر امتِ مسلمہ کو فرائض کے علاوہ واجبات وسنن بھی عطا ہوئے۔ اور یہ زیادتیٔ عبادت افضلیت کی نشانی ہے۔ سابقہ امتوں کو ایک ایک فرض عطا ہوا امتِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو روزانہ چھ نمازیں ملیں پانچ فرض اور چھٹی نماز واجب آقائے دوعالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سات نمازیں عطیۂ بارگاہِ ربِ اکرم ہوئیں۔ پانچ فرضِ شرعی تعلیم امت کے لئے۔ ایک نماز تہجد کی عشقِ خداوندی کے انعام میں اور ایک نماز عرش یعنی وتر امت مسلم کی پانچ فرض نمازیں تو سابقہ انبیاءِ کرام کی یادگاریں ہیں اور نماز وتر

نبی کریم کی یادگار ہے۔ کیونکہ یہ وتر صرف نبی کریم کو عطا ہوئے چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ عَنْ خَارِجَةَ بْنِ حُذَافَةَ اَنَّهٗ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَمَدَّكُمْ بِصَلٰوةٍ هِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ۔ اَلْوِتْرُ جَعَلَهُ اللّٰهُ لَكُمْ فِيْمَا بَيْنَ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ اِلٰى اَنْ يَّطْلُعَ الْفَجْرُ (ترمذی شریف ص۶۱) (ترجمہ) حضرت خارجہ بن حذافہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اے میری امت تمہاری امداد فرمائی ایک نماز سے وہ نماز اچھی ہے تمہارے لئے سرخ قیمتی اونٹ سے۔ وہ وتر ہے۔ اللہ نے اس کو بنایا تمہارے لئے عشاء اور فجر کے درمیان۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ وتر کی نماز صرف مسلمانوں کو ملی ہے۔ حالانکہ دیگر پانچ نمازیں مختلف انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ کو ملیں چنانچہ تفسیر روح البیان جلد پنجم ص۱۲۹ اور مرقات شرح مشکوٰۃ شریف جلد اوّل ص۳۹۴ پر ہے

وَاَخْرَجَ الطَّحَاوِيُّ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ اٰدَمَ لَمَّا تِيْبَ عَلَيْهِ عِنْدَ الْفَجْرِ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فَصَارَتِ الصُّبْحَ۔ وَفُدِيَ اِسْحٰقُ عِنْدَ الظُّهْرِ وَصَلّٰى اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ فَصَارَتِ الظُّهْرَ وَبُعِثَ عُزَيْرٌ فَقِيْلَ لَهٗ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ يَوْمًا فَرَاَى الشَّمْسَ فَقَالَ اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَصَلّٰى اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ فَصَارَتِ الْعَصْرَ وَغُفِرَ لِدَاؤُدَ عِنْدَ الْمَغْرِبِ فَقَامَ فَصَلّٰى اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ فَجَهَدَ فِي الثَّالِثَةِ اَيْ تَعِبَ فِيْهَا عَنِ الْاِتْيَانِ بِالرَّابِعَةِ فَصَارَتِ الْمَغْرِبُ ثَلَاثًا وَاَوَّلُ مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ حِيْنَ خَرَجَ مِنْ مَدْيَنَ (بیان)۔ (ترجمہ):-

ام المومنین حضرت صدیقہ سے روایت ہے سب سے پہلے فجر کی نماز بوقت توبہ حضرت آدم نے بطورِ شکرانہ پڑھی۔ ظہر حضرت اسحاق نے پڑھی۔ اور عصر حضرت عزیر نے مغرب حضرت داؤد نے اور عشاء حضرت موسیٰ علیہم السلام نے پڑھی۔ یعنی سابقہ امتوں کو ایک ایک نماز ملی مگر پانچوں نمازوں کا مجموعہ امتِ مصطفوی کو ملا۔ چنانچہ مرقات اوّل ص۳۹۵ پر ہے۔ اِذْ مَجْمُوْعُ هٰذِهِ الْخَمْسِ مِنْ خُصُوْصِيَّاتِنَا ترجمہ کیونکہ ان پانچ نمازوں کا مجموعہ ہماری خصوصیت ہے۔ گویا کہ پانچ نمازیں ہم کو پہلے انبیاء کی طرف سے ملیں اور وتر کی واجب نماز ہم کو نبی کریم کی وجہ سے عطا ہوئی۔ کیونکہ وتر کی نماز سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہی ادا فرمائی۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد پنجم ص۱۲۹ پر ہے۔ وَاَوَّلُ مَنْ صَلَّى الْوِتْرَ نَبِيُّنَا عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ (ترجمہ) اور سب سے پہلے جس نے وتر کی نماز پڑھی وہ ہمارے نبی آقا دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں آپ ہی نے پڑھی۔ یہ بات عقلاً۔ نقلاً۔ تحریراً۔ تقریراً۔ تحقیقاً۔ متفقاً۔ ہر طرح ثابت ہے کہ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم۔ کی دیگر خصوصیات کی طرح ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ آپ تمام مخلوق اولین و آخرین۔ عرشی فرشی کے نبی بھی ہیں اور شہنشاہ بھی۔ بخلاف دیگر انبیاء کرام کے کہ ان میں سے بعض صرف اپنی قوم کے نبی ہوئے بعض نبی بعض بادشاہ بھی۔ اور بعض انبیاء نے کسی قوم کو امت نہ بنایا۔ نہ رعایا بنایا۔ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت تو تمام مخلوق پر عیاں ہیں کہ کہیں۔ چڑیوں ہرنیوں اونٹوں کے فیصلے فرمائے جارہے ہیں کہیں جن وانس کے مقدمات سنے جارہے ہیں اور قانون بنائے جارہے ہیں۔ کہیں وَزِیْرَانِ مِنْ اَہْلِ الْاَرْضِ وَوَزِیْرَانِ مِنْ اَہْلِ السَّمَاءِ کے کلام سے سلطنت مصطفوی کا یقین ثبوت ہوتا ہے۔ (ترمذی ص ۲۰۸ مشکوٰۃ ص ۵۶۰) مگر اولین و آخرین۔ عرشیوں فرشیوں کو امت بنانا بھی دلائل کثیرہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ معراج کی رات بیت المقدس میں تہجد کی نماز انبیاء کرام کو پڑھا کر تمام مرسلین انبیاء کو امت بنایا اور سدرۃ المنتہیٰ کے پاس بیت المعمور میں وتر کی نماز پہلی دفعہ تمام ملائکہ کو پڑھا کر فرشتوں کو امت میں داخل فرمایا۔ تفسیر روح البیان جلد چہارم ص ۲۱۴ پر ہے

لَمَّا اَمَّ الْاَنْبِیَاءَ فِیْ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ اَوْصَاہُ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنْ یُّصَلِّیَ لَہٗ رَکْعَۃً عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی (الخ) فَلَمَّا صَلّٰی رَکْعَۃً ضَمَّ اِلَیْہَا رَکْعَۃً لِنَفْسِہٖ فَلَمَّا صَلَّاہُمَا اَوْحَی اللہُ تَعَالٰی اِلَیْہِ اَنْ صَلِّ رَکْعَۃً اُخْرٰی فَلِذَالِکَ صَارَ وِتْرًا کَالْمَغْرِبِ فَلَمَّا [illegible] اِلَیْہَا یُصَلِّیْہَا غَشَّاہُ اللہُ بِالرَّحْمَۃِ وَالنُّوْرِ فَاَغَلَّ یَدَاہُ بِلَا اِخْتِیَارٍ مِّنْہُ فَلِذَالِکَ کَانَ رَفْعُ الْیَدَیْنِ سُنَّۃً (الخ) ثُمَّ جَمَعَ قَلْبَہٗ فَکَبَّرَ وَقَالَ اَللّٰہُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ (ترجمہ) جب کہ آپ نے انبیاء کی امامت فرمائی بیت المقدس میں تو حضرت موسیٰ نے کہا کہ ایک رکعت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس بھی میرے لئے پڑھائیے۔ جب آپ نے ایک رکعت اور پڑھا دی تو دوسری اور پڑھائی خود اپنے لئے پھر رب تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ اے پیارے حبیب ایک رکعت اور پڑھاؤ تب تیسری رکعت بھی پڑھائی اسی لئے یہ نماز وتر کہلائی جیسے کہ مغرب۔ جس وقت آپ تیسری رکعت میں تھے تو رب کریم جل وعلیٰ نے آپ کو نور و رحمت سے گھیر لیا آپ نے اس لذت میں دونوں ہاتھ بلند کئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی وتر کی تیسری رکعت میں رفع یدین سنت ہے۔ جب آپ نے وفور جذبات کے بعد اپنا دل ٹھیرایا تو تکبیر کہی اور عرض کیا۔ اللھم انا نستعینک تفسیر تیسیر میں ہے۔ اَمَّ رَسُوْلُ اللہِ مَلٰئِکَۃَ السَّمٰوَاتِ فِی الْوِتْرِ فَکَانَ اِمَامَ الْاَنْبِیَاءِ فِیْ بَیْتِ الْمَقْدِسِ وَاِمَامَ الْمَلٰئِکَۃِ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی فَظَہَرَ بِذَالِکَ فَضْلُہٗ عَلٰی اَہْلِ الْاَرْضِ وَالسَّمَاءِ۔ (روح البیان ص ۱۲۹) نبی کریم نے تمام آسمانوں کے فرشتوں کو وتر پڑھائے تو آپ انبیاء اور فرشتوں سب کے امام بنے بیت المقدس اور سدرۃ المنتہیٰ میں جس سے آپ کی فضیلت زمین و آسمان والوں پر ظاہر ہوئی۔ اس عبارت سے ثابت ہوا کہ نماز تہجد سب سے پہلے بیت المقدس میں ہمارے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم پر فرض

ہوئی اور سب نے آپ کی اقتدا میں پڑھی اور نماز وتر موجودہ طریقے مع دُعاءِ قنوت سب سے پہلے بیت المعمور میں نبی کریم پر واجب ہوئی اور ملائکہ نے آپ کی اقتدا میں پڑھی تفسیر صاوی نے فرمایا کہ یہ نماز تحیۃ المسجد کے نفل تھے چنانچہ جلد دوم ص۲۸۲ پر ہے۔ وَھٰذِہِ الصَّلٰوۃُ لَمْ یُعْلَمْ کَوْنُھَا فَرْضًا اَوْ نَفْلًا (الخ) وَیُحْتَمَلُ اَنَّ الرَّکْعَتَیْنِ الْمَذْکُوْرَتَیْنِ فِی الْحَدِیْثِ ھُمَا تَحِیَّۃُ الْمَسْجِدِ (ترجمہ) اور یہ نماز معراج نہ جانا گیا اس کا فرض یا نفل ہونا اور احتمال ہوتا ہے کہ یہ دونوں مذکورہ فی الحدیث رکعتیں تحیۃ مسجد ہوں۔ مگر یہ احتمال اور تفسیر صاوی کا یہ قول غلط ہے ٹھیک نہیں بلکہ بہت دلائل شرعیہ سے ان رکعتوں کا فرض ہونا ثابت ہے۔ پہلی دلیل۔ اگر شب معراج بیت المقدس کے نماز نفل ہوتے تو ان کی جماعت نہ ہوتی کیونکہ شریعت میں نفلوں کی جماعت، باہتمام منع ہے حالانکہ اس جماعت کا اہتمام اتنا عظیم ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار مرسلین وانبیاءِ کرام محض جماعت کی اقتدا کے لئے تشریف لائے ورنہ بات چیت اور فقط دیدار تو آسمانوں پر ہوا۔ ثابت ہوا کہ یہ نماز نفل نہیں۔ دوسری دلیل۔ اگر یہ نماز نفل ہوتے تو ان کے لئے اذان وتکبیر نہ ہوتی حالانکہ اذان وتکبیر دونوں ہوئی۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد چہارم ص۲۵ پر ہے فَاَذَّنَ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ ثُمَّ قَالَ یَا مُحَمَّدُ تَقَدَّمْ فَصَلِّ بِھِمْ (ترجمہ) پس اذان دی جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اور تکبیر کہی نماز کی پھر عرض کیا اے پیارے کائنات کی تعریف کئے ہوئے آگے بڑھئے اور نماز پڑھایئے۔ ثابت ہوا کہ معراج کی رات فرض نماز پڑھائی نہ کہ نفل۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرض تہجد کے تھے نہ کہ عشاء کے۔ اس کی چند دلیلیں ہیں۔ پہلی دلیل۔ عشاء کی چار رکعتیں ہوتی ہیں مگر شب معراج دو رکعتیں پڑھائی گئیں جیسا کہ ابھی تفسیر صاوی سے ثابت ہوا۔ دوسری دلیل۔ عشاء کی نماز سونے سے پہلے پڑھنی اشد لازم ہے مگر معراج کی نماز نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کچھ دیر سو کر پڑھائی۔ اور یہ تہجد کی نماز بھی وہ ہے جو سونے کے بعد ہو کیونکہ تہجد باب تفعل کا مصدر ہے ہجود سے مشتق ہے۔ ہجود کے لغوی معنٰی ہیں نیند کرنا۔ مگر اصطلاح میں ترکِ نیند کے لئے مستعمل ہوا پھر نماز تہجد کے لئے استعمال ہوا تفسیر ابن کثیر نے فرمایا سوم۔ ص۵۲ فَاِنَّ التَّھَجُّدَ مَا کَانَ بَعْدَ نَوْمٍ (ترجمہ) نماز تہجد وہ ہے جو سونے کے بعد پڑھی جائے۔ تیسری دلیل۔ معراج میں بیت المقدس کی نماز صرف دو رکعتیں تھیں اور تہجد بھی فقط دو رکعتیں فرض تھیں یہ چھ۔ چار کی زیادتی کمی نفلاً ہے۔ اب بھی تہجد اصل دو ہی رکعتیں ہیں چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد اوّل ص۱۱۲ پر ہے وَاَقَلُّہٗ رَکْعَتَانِ ترجمہ اور کم سے کم تہجد کی نماز دو رکعتیں ہیں۔ یہ جو روایات میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی دو پڑھیں کبھی چار کبھی چھ کبھی دس بارہ۔ یہ زیادتی نفل تھی۔ فرض صرف دو ہی رکعت تھیں فرض میں زیادتی کمی جائز نہیں۔ چوتھی دلیل۔ نماز عشاء تو سابقہ امتوں میں بھی پڑھی جاتی رہی اور یہ پہلی امتوں کی

نماز تھی جیسا کہ مرقات اور تفسیر روح البیان نے فرمایا شب معراج میں نبی کریم نے عرش و فرش پر اپنی نماز پڑھائی اس لئے کہ اس رات نبی کریم نے صرف امامت ہی نہ فرمائی بلکہ تمام انبیاء اور تمام ملائکہ کو اپنی امت میں شامل فرمایا۔ اس طرح کہ بیت المقدس میں تمام انبیاء و مرسلین کو اپنی نماز تہجد پڑھائی اور عرش کے پاس بیت المعمور میں تمام ملائکہ کو نماز وتر پڑھائی۔ تہجد اور وتر خاص نبی کریم کی نمازیں ہیں چنانچہ تہجد کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ترجمہ اے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ تہجد پڑھا کریں اس قرآن کریم کے ساتھ یہ نماز صرف آپ کے لئے ہی زائد عطا کی گئی ہے وتر کی خصوصیت روح البیان کی عبارت سے ابھی پہلے بتا دی گئی ان دلائل سے ثابت ہوا کہ شب معراج نماز تہجد اور نماز وتر ادا ہوئی۔ جس طرح نماز وتر کے وجوب میں اختلاف روایت ہے۔ اس طرح نماز تہجد کی فرضیت میں بھی مختلف اقوال ملتے ہیں مگر صحیح اور اکثر یہ قول ہے۔ کہ نماز تہجد دو رکعت نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم پر آخر تک فرض رہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد ہشتم ص ۱۳۸ ۔ تفسیر ابن کثیر جلد سوم ص ۵۴ تفسیر جلالین ص ۱۲۱ تفسیر صاوی جلد دوم ص ۳۰۴ ۔ تفسیر روح البیان جلد پنجم ص ۱۹۱ تفسیرات احمدیہ جلد چہارم ص ۹۰ پر ہے۔ وَكَانَتْ صَلٰوةُ اللَّيْلِ فَرِيْضَةً عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ترجمہ اور تہجد کی نماز نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر فرض تھی۔ دوسری وجہ یہ کہ علماء اصول کے نزدیک پانچ نمازیں وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے حکم کی بنا پر فرض ہوئیں۔ اس امر میں تمام مسلمانوں کو خطاب ہے۔ اور يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ ۔۔ میں بھی نماز قائم کرنے کا حکم ہے۔ مگر خطاب صرف نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہے۔ ثابت ہوا کہ صلوٰۃ لیل یعنی تہجد صرف نبی کریم پر فرض ہوئی نہ آپ سے پہلوں پر نہ آپ کے بعد کسی امتی پر۔ تیسری وجہ۔ یہ کہ نماز پنجگانہ نماز شرعی و قانونی ہے۔ اور نماز تہجد نماز عشق و معرفت ہے۔ اور نبی کریم حبیب و محبوب ہیں اس لئے نماز عشق انہی کے لائق تھی لہذا انہی پر فرض ہوئی۔ نہ کائنات میں کوئی دوسرا حبیب خدا تعالیٰ ہوا نہ ہوگا نہ کسی اور پر نماز تہجد فرض ہوئی نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رات کا درجہ دن سے افضل ہے کہ دن شریعت ہے اور رات معرفت۔ دن قانون ہے۔ اور رات قدرت۔ دن میں مختلف وقت ہیں اور رات سب کی سب ایک ہے پس چونکہ ایک وقت میں ایک ہی فرض ہوتا ہے اس لئے نبی پاک کی دونوں خصوصی نمازوں میں سے ایک۔ فرض اور ایک واجب ہوئی۔ اور فرض واجب سے افضل لہذا نبی پاک نے ہمیشہ پہلے تہجد پڑھی بعد میں وتر۔ وتر اصلاً تہجد کے لئے ہی بنے مگر چونکہ مسلمانوں پر تہجد فرض نہ ہوئی وتر واجب رہے اس لئے وتر عشاء کے ساتھ معین ہوئے۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ نماز تہجد نبی کریم پر فرض اور وتر واجب تھے اور یہ دونوں حکم آخر تک قائم رہے۔ مگر بعض مفسر فرضیت تہجد کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر مظہری پ ۱۵ ص ۷۲ پر لکھتے ہیں کہ تہجد کی نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نفل تھی اور دلیل میں حضرت مغیرہ کی حدیث شریف پیش کرتے ہیں کہ ایک

دفعہ قیام میں سے پاؤں مبارک پر ورم آگیا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ اتنی مشقت کیوں فرماتے ہیں کیا اللہ نے یہ نہ فرمایا کہ قَدْ غَفَرَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَأَخَّرَ تو نبی پاک نے جواب فرمایا کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں لہذا ثابت ہوا کہ تہجد کی نماز فرض نہ تھی ورنہ نبی کریم فرماتے کہ مجھ پر فرض ہے۔ یہ تھی دلیل تفسیر مظہری کی۔ مگر یہ دلیل بہت کمزور ہے اوّلاً اس لئے کہ اگر نماز کی فرضیت صرف گناہوں کی بخشش کے لئے ہوتی تو چاہئے تھا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر کوئی نماز۔ عصر، مغرب وغیرہ فرض نہ ہوتی۔ مگر وہ تو متفقاً فرض لہذا یہ بھی فرض ہو تو کوئی عار نہیں۔ دوم اس لئے کہ سوال تہجد کی نماز کے بارے میں نہیں بلکہ درازیٔ قیام کی مشقت اور محنت کے بارے میں ہے۔ لہذا نبی کریم کا جواب عین اس کے مطابق ہے۔ چونکہ سوال فرضیت کے بارے میں نہیں تھا اس لئے جواب میں بھی فرضیت کا ذکر نہ فرمایا خلاصہ کلام یہ کہ نماز تہجد نبی کریم پر فرض تھی مثل فجر ظہر۔ سوم اس لئے کہ تفسیر مظہری آگے چل کر کہتی ہے کہ بوجہ نفل ہونے کے یہ نماز اُمت کے لئے سنتِ مؤکدہ ہوئی۔ یہ بھی غلط ہے کیونکہ سنتِ مؤکدہ کا تارک گناہ گار ہے۔ حالانکہ کوئی مسلمان ترکِ تہجد سے گناہ گار نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ نماز صرف نبی کریم پر فرض تھی منکر کے پاس کوئی مضبوط دلیل نہیں ہاں اُمت مصطفیٰ پر یہ نماز محض نفل ہیں۔ اس لئے کہ یہ نماز۔ نماز معرفت ہے۔ پانچ نمازیں پڑھ کر بندہ مومن بنتا ہے مگر یہ نماز پڑھ کر عاشق۔ پانچ نمازوں کی حقیقت و مسائل جانئے تو بندہ عالم۔ محدث مفسر۔ فقیہ۔ کہلاتا ہے مگر نماز تہجد کی حقیقت و معرفت سے۔ ولایت۔ غوثیت قطبیت کا حصول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ پانچ نمازیں شریعت میں ہے۔ اس لئے پنجگانہ نمازیں فرض۔ اور چونکہ طلب معرفت فرض نہیں اس لئے مسلمانوں پر تہجد بھی فرض نہیں۔ نماز وتر نماز محبت ہے کہ ارشاد نبوی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ وِتْرٌ وَّیُحِبُّ الْوِتْرَ (ترمذی۔ ابو داؤد۔ نسائی۔ مشکوٰۃ صـ۱۱۲) اس لئے نمازِ وتر واجب ہے۔ کیونکہ محبتِ الٰہیہ کا طلب بھی ہر بندے پر واجب ہے۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ وَعَنْ بُرَیْدَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ یُوْتِرْ فَلَیْسَ مِنَّا۔ اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ یُوْتِرْ فَلَیْسَ مِنَّا۔ اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ یُوْتِرْ فَلَیْسَ مِنَّا (رواہ ابو داؤد) (ترجمہ) حضرت بریدہ سے روایت ہے۔ فرمایا کہ سنا میں نے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کہ وتر حق ہے جو وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔ وتر حق ہیں جو وتر نہ پڑھے ہم سے نہیں وتر حق ہے جو وتر نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں۔ اس روایت سے ثابت ہوا کہ نماز وتر واجب کیونکہ اتنی سخت وعید اور تین مرتبہ کی تاکید سے وجوب ہی ثابت ہو سکتا ہے بذل المجہود جلد دوم صـ۲۲۳ نے حق کے معنیٰ واجب کئے ہیں۔ یہ روایت بالکل قوی و صحیح ہے۔ اس کے راوی ابن مثنیٰ ابو اسحٰق طالقانی ثقہ راوی ہیں ان کو امام ابن معین نے اور ابو منیب نے ثقہ فرمایا مستدرک

حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا جامع بزار جلد اوّل اور بذل المجہور جلد دوم ص۳۲۲ پر ہے۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ۔ رَفَعَهٗ۔ اَلْوِتْرُ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (ترجمہ) حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ نماز وتر ہر مسلمان پر واجب ہے۔ بعض اگرچہ وتر کے وجوب کا انکار کرتے ہیں مگر صحیح تر یہی ہے کہ وتر واجب ہیں جس کے اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔ عقلاً و قیاساً بھی وتر واجب ہونے چاہئے۔ اس لیے کہ پہلی امتوں پر نماز صرف فرض تھی مگر امت محمدی پر عبادت چار قسم کی لازم ۱ فرض ۲ واجب ۳ سنت موکدہ ۴ نفل دن رات میں فرض نفل سنت تو بہت عبادات ہیں لیکن واجب بجز وتر کوئی نہیں۔ اگر اس کی واجبیت کو بھی تسلیم نہ کیا جائے تو واجب نماز روزمرہ کہاں سے آئے گی ثابت ہوا کہ وتر واجب۔ اب نہ یہ فرض ہے۔ نہ سنت۔ فرض تو اس لئے نہیں کہ فرض کی جماعت۔ اذان۔ تکبیر اور وقت معین ہوتا ہے۔ مگر وتر کے لئے نہ جماعت نہ اذان نہ تکبیر۔ چنانچہ شرح ابوداؤد جلد دوم ص۲۲۰ پر ہے۔ وَبِفَرَائِضِ الصَّلٰوتِ اَوْقَاتٌ وَّاَذَانٌ وَّاِقَامَةٌ وَّجَمَاعَةٌ (ترجمہ) اور فرض جماعت کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں وقت معین ۲ اذان ۳ تکبیر ۴ جماعت اور اس لئے بھی نہیں کہ شرعی قانون کے مطابق ایک وقت میں فرض ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرا فرض ادا کرنا جائز نہیں تمام رات چونکہ ایک ہی وقت ہے اور ایک فرض عشاء موجود ہے۔ تو دوسرا فرض ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔ پتہ لگا کہ وتر فرض نہیں ہیں نہ ہی یہ نفل اور سنت ہے اس لئے کہ حدیث پاک میں وتر کے لئے صیغۂ امر استعمال ہوا اور امر مطلق وجوب کے لیئے ہے (نور الانوار ص۳۲) اور دوم اس لئے کہ وتر کو حدیث پاک میں صلوٰۃ زائد کا نام دیا گیا چنانچہ طبرانی میں ہے! اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ زَادَكُمْ صَلٰوةً وَّهِيَ الْوِتْرُ (ترجمہ) بیشک اللہ تعالیٰ نے تم تمام مسلمانوں کے لئے ایک نماز زائد عطا کی اور وہ وتر ہے۔ اور زائد وہ ہوتا ہے جو مقدار معین سے اسی کی جنس سے سوا ہو۔ اور نمازوں میں صرف فرائض کی مقدار معین ہے نہ نوافل کی نہ سنن کی ثابت ہوا کہ وتر مقدار معین ہے۔ اور فرائض سے علاوہ ہے ۳ اور اس لئے کہ وتر کی قضا ہے نفل سنت کی قضا نہیں ہوتی۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص۱۱۲ پر ہے۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَنْ نَامَ عَنْ وِتْرِهٖ فَلْيُصَلِّ اِذَا اَصْبَحَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ (ترجمہ)۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے وتر پڑھے بغیر سو جائے اور وقت میں آنکھ نہ کھلے تو صبح کو پڑھے۔ ۴ اور اس لئے کہ وتر کا وقت معین ہے نفل سنت کا وقت معین نہیں ۵ اور اس لئے کہ نفل سنت چلتی سواری پر جائز ہیں بلا عذر۔ مگر بلا عذر چلتی سواری پر وتر پڑھنے تمام ائمہ کے اتفاق سے ناجائز ہیں ۶ اور اس لئے کہ وتر کی تین رکعت ہیں حالانکہ کسی نفل سنت کی تین رکعت نہیں ہو سکتیں ۷ اور اس لئے کہ خواجہ حسن بصری نے فرمایا۔ اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى اَنَّ الْوِتْرَ

حَقٌّ وَاجِبٌ (ترجمہ) تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وتر واجب ہیں حق ہیں۔ ان دلائل واضحہ سے ثابت ہوگیا کہ امت مسلمہ پر وتر واجب ہیں ہماری اس تمام گفتگو سے یہ واضح ہوگیا کہ وتر سب سے پہلے کب پڑھے گئے کس طرح پڑھے گئے کتنے پڑھے گئے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ وتر تمام امت پر واجب ہیں کیونکہ یہ نماز پنجگانہ نماز کی طرح قانونی شرعی نماز ہے اس طرح کہ پانچ نمازیں فرض ہیں اور وتر عرشی اس میں اختلاف ہے کہ اُمت پر وتر کی کتنی رکعات واجب ہیں کتب احادیث میں مختلف روایات ہیں جن میں سات۔ پانچ۔ تین۔ ایک۔ رکعت وتر کا ذکر ملتا ہے۔ گر فقہاء امت کے اقوال میں صرف تین رکعت اور ایک رکعت کا مذہب دستیاب ہے۔ ائمہ ثلاثہ ایک رکعت کے قائل ہیں مگر مسلک حنفی میں تین رکعت وتر پر بیشمار دلائل قویہ موجود ہیں۔ جن کا رد ناممکن ہے۔ لیکن چونکہ رکعاتِ وتر پر بہت سی مختلف روایات مختلف الفاظ کے ساتھ ملتی ہیں۔ اس لیے مطابقت کرنے کے لیئے دلائل علی ثلاثہ پیش کرنے سے پہلے چار باتیں ذہن نشین کرنی اشد ضروری ہیں پہلی یہ کہ لفظ وتر باعتبار لغت اس عدد کو کہتے ہیں جو برابر تقسیم نہ ہو سکے۔ جن میں پہلا ایک ہے۔ پھر تین۔ پھر پانچ۔ پھر سات۔ وغیرہ وغیرہ۔ حدیث پاک میں رب کریم کو وتر کہا گیا وہاں مراد ایک ہے یعنی اللہ ایک وتر ہے اور سب وتر ہی اسکو پسند ہیں۔ اصل وتر ایک ہی عدد ہے۔ باقی وتر اس ایک سے ہی بنتے ہیں مثلاً دو میں ایک لگا دو تین سے وتر ہوا چار میں ایک لگا دو پانچ کا وتر بن گیا۔ جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو دوسری بات یہ کہ حدیث پاک میں جہاں کہیں آتا ہے اَلْوِتْرُ رَكْعَةٌ وہاں وتر بمعنی واتر ہے یعنی وتر بنانے والی اور وتر لغوی معنیٰ میں ہوگا۔ تو اُس قسم کی تمام احادیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ طاق (یعنی برابر تقسیم ہونے والی) رکعتوں کو وتر (یعنی برابر نہ تقسیم ہونے والی رکعات) بنانے والی ایک رکعت ہے۔ مطلب اور منشاءِ فرمان نبوی یہ ہوا کہ جب تم دو کو وتر بنانا چاہو تو ایک رکعت اور شامل کر لو تمہارے وتر ٹھیک ہو جا ئینگے اس طرح جن روایات میں آتا ہے۔ اَوْتِرُوْا بِوَاحِدَةٍ۔ یا یُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ وہاں یہی مطلب ہے کہ اے مسلمانوں اپنی دو رکعت کی طاق نماز کو ایک مزید رکعت سے وتر بنا لو کیونکہ نبی کریم بھی رکعت سے وتر بنایا کرتے تھے۔ اس قسم کی روایات میں بار ہا یہ ہے۔ گویا کہ ان فرمودات میں نماز وتر کے حکم کے ساتھ ساتھ وتر بنانے کا طریقہ اور وتر کی لغوی تعریف فرمائی جارہی ہے یہی وجہ ہے کہ کہیں ارشاد ہوا۔ اَوْتِرُوْا بِخَمْسٍ کہیں فرمایا بِسَبْعٍ وغیرہ۔ وغیرہ یعنی۔ پانچ سے وتر بناؤ۔ سات سے وتر بناؤ۔ حالانکہ نہ کوئی پانچ وتر کا قائل ہے نہ سات کا۔ احادیث مبارکہ کی اِن باریکیوں کو نہ سمجھنے کی بنا پر ہی کسی نے ایک وتر بنا یا کسی نے کچھ۔ امام سفیان سوری نے ایک۔ تین۔ پانچ۔ سات سب کا اختیار دیا۔ مگر محققین کے نزدیک یہ سب باتیں غلط اور نادانی کی وجہ سے ہیں۔ ورنہ احادیث میں کوئی تضاد نہیں۔ احادیث سے صرف تین

رکعت وتر ثابت ہیں۔ تیسری بات یہ کہ محدثین کی مختلف روایات کی بنا پر فقہاءِ کرام ۔ آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے افعال طیبہ طاہرہ کو پانچ طرح تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ افعال جو آپ کے سفر میں ادا ہوئے دوسرے وہ افعال جو آپ کے حضر میں ادا ہوئے۔ تیسرے وہ افعال جو گھر میں ادا ہوئے چوتھے وہ افعال جو شروع زمانے میں ہوئے۔ پانچویں وہ افعال طیبہ جو آخر زمانے میں ہوئے۔ ان افعال کی احادیث میں فقہاءِ کرام اس راوی کی بات معتبر سمجھیں گے جو اس فعل کے وقت قریب تر ہو۔ دور والے یا غیر موجود کی بات نہ مانی جائے گی۔ مثلاً واقعہ معراج میں اجل صحابہ کچھ روایت کرتے ہیں مگر ام المومنین کچھ فرماتی ہیں۔ جب یہ ہر دو احادیث فقہاءِ کرام کے سامنے آئیں تو فقہا نے حضرت صدیقہ کی بات کو نہ مانا اور دیگر صحابہ کی بات کو مان لیا۔ کیونکہ معراج کے وقت جناب صدیقہ نبی کریم کے نکاح میں بھی نہ تھیں اور بہت چھوٹی تھیں اس طرح باہر کے اقوال وافعال میں امہات کی بات معتبر نہ ہوگی۔ اس طرح سفر کے افعال واقوال میں ہمسفر صحابہ کی بات ہی قابل قبول ہوگی۔ غیر ہم سفر کا اختلاف قابل قبول نہ ہوگا۔ اسی طرح شروع زمانے کے افعال میں بڑی عمر والے صحابہ کی بات معتبر ہوگی۔ نہ کہ چھوٹوں کی۔ جس طرح بڑی مجلس کے اقوال وافعال پاک میں قریبی صحابہ کی بات معتبر ہوگی نہ کہ دور والوں کی۔ فقہاءِ کرام کا یہ شاندار ضابطہ مکمل سمجھ لینے کے بعد اب چوتھی بات یہ سمجھو کہ نبی کریم نے وتر ہمیشہ گھر میں ادا فرمائے اور بعد تہجد ادا فرمائے۔ سفر کے موقع پر بھی رات کو اپنے خیمے شریف میں ہی ادا فرماتے رہے بجز ایک موقع کے جب کہ آپ نے رات کو کسی غزوے میں جاتے ہوئے سفر کیا تو تہجد کی نماز اور وتر سواری سے نیچے اتر کر ادا فرمائے۔ اور اتنی دیر قیام کیا۔ حضر میں ہمیشہ دولت کدے پر ہی وتر ادا کئے۔ پس جان لو کہ اُمّہاتُ المومنین خصوصاً عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن کو تو ہمیشہ آپ کے وتر اور صلاۃ تہجد دیکھنے کا موقعہ ملا مگر دیگر صحابہ کو یہ نعمت خال خال نصیب ہوئی پس فقہاءِ کرام کے قاعدۂ کلیہ کے مطابق وتر اور تہجد کے بارے میں معتبر جناب صدیقہ دیگر اُمّہاتُ الْمُؤْمِنِيْنَ رِضْوَانُ اللهِ تَعَالٰی عَلَيْهِنَّ کی روایات ہو سکتی ہیں۔ دوسرے لوگوں کی نہیں۔ لہٰذا اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ امہات طیبات وتر کے بارے میں کیا ارشاد فرماتی ہیں۔ چنانچہ صحیح البہاری ص ۵۵ پر بحوالہ حاکم مستدرک ہے۔ عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ الصِّدِّيْقَةِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا۔ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ لَا يُسَلِّمُ اِلَّا فِيْ اٰخِرِهِنَّ (ترجمہ) حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ کہ آقائے دوعالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمیشہ تین رکعت سے وتر ادا فرماتے تھے اور سلام آخری میں پھیرتے تھے۔

كَانَ يُوْتِرُ باب افعال کا ماضی استمراری ہے جو ہمیشگی پر دال ہے۔ یعنی سفر حضر ماہِ رمضان غیر رمضان۔ بحالتِ اعتکاف غیر اعتکاف ہمیشہ آپ نے ایک سلام سے تین وتر پڑھے۔ یہ وہ فرماتی ہیں جو ہر وقت حاضر بارگاہ

(۲) دوسری دلیل نسائی شریف جلد اول پر ص ۲۴۸ پر ہے:۔ عَنْ اَبِیْ سَلَمَۃَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّہٗ اَخْبَرَہٗ اَنَّہٗ سَاَلَ عَائِشَۃَ اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ (الخ) یُصَلِّیْ ثَلٰثًا (ترجمہ) عبدالرحمن نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ماہ رمضان کی تہجد اور وتر کی نماز کے بارے میں پوچھا تو آپ نے سب کیفیت بتائی اور آخر میں فرمایا کہ یُصَلِّیْ ثَلٰثًا پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم وتر تین رکعت ہی ادا فرماتے۔ تیسری دلیل نسائی شریف جلد اول ص ۲۴۹ پر ہے عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْتِرُ بِثَلٰثَ عَشْرَۃَ رَکْعَۃً (ترجمہ) ام المومنین حضرت ام سلمہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تیرھویں رکعت سے وتر بنایا کرتے تھے۔ اس طرح کہ دو نفل تحیۃ الوضو اور آٹھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر۔ یہ طریقہ مبارکہ رمضان غیر رمضان ہر دن تھا چنانچہ طحاوی شریف جلد اول ص ۱۶۲ پر ہے۔ عَنْ اَبِیْ لَبِیْدٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا سَلَمَۃَ یَقُوْلُ دَخَلْتُ عَلٰی عَائِشَۃَ فَسَاَلْتُہَا عَنْ صَلٰوۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِاللَّیْلِ فَقَالَتْ کَانَتْ صَلٰوتُہٗ فِیْ رَمَضَانَ وَغَیْرِہٖ ثَلٰثَ عَشْرَۃَ رَکْعَۃً مِنْہَا رَکْعَتَا الْفَجْرِ۔ (ترجمہ):۔ ام المومنین سیدہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ لیل یعنی تہجد کس طرح تھی تو آپ نے فرمایا کہ رمضان وغیر رمضان میں تیرہ رکعتیں تھیں ان میں ہی فجر کی سنتیں بھی تھیں۔ آپ نے اس طرح تقسیم فرمائی کہ آٹھ رکعتیں تہجد تین وتر اور دو سنت فجر یہ تھے اقوال امہات المومنین چونکہ تہجد اور وتر کے بارے میں اقوال امہات ہی معتبر ہیں اس لیے ہم نے صرف انہی کے قول نقل کیے ورنہ صحابہ کرام کے بھی تین وتر کے ثبوت میں اتنے کثیر مرویات ہیں جن کو اجماع امت ہی کہا جانا چاہیے۔ خود صحابہ کرام بھی وتر کے بارے میں امہات رضوان اللہ تعالےٰ علیہن سے پوچھا کرتے تھے کیونکہ وتر۔ گھریلو اور خلوت کی نماز ہے۔ تین وتر کے بارے میں تو صاف اور واضح روایات وارد ہیں۔ جن راویوں نے بِرَکْعَۃٍ وَّاحِدَۃٍ یا بِسَبْعٍ بِخَمْسٍ فرمایا ان کا مطلب بھی تین کی مخالفت نہیں۔ صرف سمجھ کا قصور ہے عقلی دلیل۔ بھی یہی چاہتی ہے کہ وتر تین ہی ہونے چاہیئے۔ اس لیے کہ تمام نمازیں فرائض ہوں یا سنن و نوافل حکم و نوافل میں تو مختلف ہیں کہ کوئی فرض۔ کوئی سنت۔ کوئی نفل۔ مگر کیفیت و کمیت میں سب ہم شکل ہیں اور ایک دوسرے سے متشابہ۔ لہٰذا وتر کے لیے بھی ضروری ہے۔ کہ بحیثیت نماز ہونے کے دیگر نمازوں سے منفرد اور الگ تھلگ نہ ہو۔ دیگر نمازیں تین قسم کی مقدار میں:۔ ۱ چار رکعت ۲ دو رکعت ۳ تین رکعت ان تین کے علاوہ

اور کوئی مقدار ثابت نہیں۔ پس وتر بھی ان تین مقداروں میں سے ایک سے مشابہ ہوں گے۔ چار رکعات یا دو رکعت تو ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ جفت ہیں یہ طاق۔ رہے مغرب کے تین فرض۔ پس وتر ان کے مشابہ ہوں گے۔ صرف ایک رکعت پڑھنا کہیں جائز نہیں۔ جو بیوقوف لوگ وتر ایک رکعت پڑھتے ہیں۔ وہ وتر کی علیحدہ حیثیت مان کر شریعت کی بالکل خلاف ورزی کرتے ہیں۔ چنانچہ حاشیہ مشکوٰۃ بحوالہ لمعات صلاا پر ہے:۔ عَنِ الطَّحَاوِیْ اَنَّہٗ قَالَ مَذْھَبُنَا قَوِیٌّ مِنْ جِھَۃِ النَّظْرِ لِاَنَّ الْوِتْرَ لَا یَخْلُوْ اِمَّا اَنْ یَّکُوْنَ فَرْضًا اَوْ سُنَّۃً فَاِنْ کَانَ فَرْضًا فَالْفَرْضُ لَیْسَ اِلَّا رَکْعَتَیْنِ اَوْ ثَلٰثًا اَوْ اَرْبَعًا وَکُلُّھُمْ اَجْمَعُوْا عَلٰی اَنَّ الْوِتْرَ لَا یَکُوْنُ ثِنْتَیْنِ وَلَا اَرْبَعًا فَثَبَتَ اَنَّ الْوِتْرَ ثَلٰثٌ وَاِنْ کَانَ سُنَّۃً فَلَمْ نَجِدْ سُنَّۃً اِلَّا وَلَھَا مِثْلٌ فِی الْفُرُوْضِ مِنْہُ اُخِذَتْ وَالْفَرْضُ لَمْ نَجِدْ مِنْہُ وِتْرًا اِلَّا الْمَغْرِبَ وَھُوَ ثَلٰثٌ۔ (لمعات)

(ترجمہ):۔ وہی ہے جو اوپر گزرا۔ دلیل قیاسی قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ وتر ایک نہ ہو۔ اس لئے کہ ایک رکعت یا ڈیڑھ رکعت نماز پڑھنا شرعاً گناہ ہے۔ دیکھو مسافر پر بحالتِ سفر قصر لازم ہے۔ اگر وہ چاہے کہ فجر کی ایک رکعت پڑھے یا مغرب کی ڈیڑھ رکعت پڑھے گناہگار ہوگا اور نماز باطل ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ فجر اور مغرب میں رب تعالیٰ نے قصر کا قانون ختم فرمایا تاکہ نماز ایک رکعت یا ڈیڑھ نہ پڑھی جائے۔ معلوم ہوا کہ ایک رکعت پڑھنا رب کی ناراضی کا سبب ہے۔ جب سفر جیسی اہم مشکل حالت میں رب تعالیٰ نے ایک رکعت منظور نہ فرمائی تو وتر میں ایک رکعت کیوں کر پسند ہوتی۔ پس ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ وتر ایک ہی رکعت ہرگز نہیں بلکہ صرف تین رکعات ہیں نہ کم نہ زیادہ۔ یہ بات مزید ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وتر کے بارے میں مسلمانوں نے اتنے اختلاف کیے کہ وتر کو سراپا اختلاف بنا دیا۔ اس کے حکم میں اختلاف اس کی رکعات میں اختلاف اس کے چلتی سواری پر پڑھنے میں اختلاف۔ اسی طرح اس کی دعائے قنوت میں چند اختلاف ایک یہ کہ کب پڑھی جائے قبل رکوع یا بعد رکوع۔ دوسرا یہ کہ دعائے قنوت پڑھنی سنت ہے یا واجب۔ تیسرا یہ کہ کونسی رکعت میں پڑھی جائے مگر بحمدہٖ تعالیٰ وتر کے بارے مذہب حنفی عقلاً نقلاً قیاساً بہت مضبوط اور صاف ہے۔ با دلائل کثیرہ ہے۔ مسلک احناف میں وتر میں تین رکعت ہیں۔ واجب ہیں۔ اور تیسری رکعت میں تلاوت فاتحہ و سورۃ کے بعد رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھنی واجب ہے:۔ چنانچہ۔ نسائی شریف جلد اوّل صفحہ ۲۴۸ پر ہے:۔ عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

كَانَ يُوْتِرُ بِثَلٰثِ رَكَعَاتٍ كَانَ يَقْرَأُ فِي الْأُوْلٰى بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى وَفِي الثَّانِيَةِ بِقُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ وَفِي الثَّالِثَةِ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ وَيَقْنُتُ قَبْلَ الرُّكُوْعِ - (الخ) ترجمہ:۔

حضرت ابی ابن کعب سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ بے شک آقائے دوعالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى کی سورت دوسری رکعت میں قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ۔ اور تیسری رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ تلاوت فرماتے تھے۔ اور اس کے بعد رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھتے تھے۔ اس حدیث مطہرہ نے جہاں دعائے قنوت قبل رکوع کا ثبوت عطا کیا وہاں نہایت ہی شاندار واضح طریقے سے تین رکعت وتر کا بھی ثبوت عطا فرمایا گویا کہ حدیث پاک سابقہ تمام حدیثوں کی شرح ہے۔ اس کے بعد کچھ بولنے کی گنجائش نہیں رہی۔ جن لوگوں نے دعائے قنوت کو بعد رکوع مانا ہے۔ ان کو غلط فہمی ہوئی اور وہ احادیث کی سمجھ پیدا نہ کر سکے۔ دراصل قنوت دو قسم کی ہے ایک دعائے قنوت دوسری قنوتِ نازلہ قنوت نازلہ آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ماہ مغرب۔ عشاء فجر کے فرضوں کی آخری رکعت رکوع کے بعد سمع اللہ کے بعد پڑھی۔ چنانچہ طحاوی شریف جلد اوّل صـ۱۴۲ پر ہے:۔ ۔

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا قَنَتَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ شَهْرًا وَإِنَّمَا الْقُنُوْتُ قَبْلَ الرُّكُوْعِ (الخ) کچھ آگے ارشاد ہے۔ وَإِنَّهُ قَدْ كَانَ تَرَكَ ذٰلِكَ فَصَارَ الْقُنُوْتُ مَنْسُوْخًا (ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ بیشک نبی کریم نے صرف ایک ماہ بعد رکوع قنوت پڑھی۔ دائمی اور اصل قنوت تو رکوع سے پہلے ہوتی ہے۔ یہ قنوت جو بعد رکوع تھی وہ آپ نے ترک کر دی تھی تو وہ عارضی قنوت منسوخ ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ اب مغرب وغیرہ کے فرائض میں قنوت کا کوئی قائل نہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قنوت صرف وتر میں ہوتی ہے اور رکوع سے پہلے ہوتی ہے۔ حالانکہ ابن مسعود مجتہد فقیہ صحابی ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ چنانچہ طحاوی صـ۱۴۹ پر ہے:۔ قَالَ كَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ لَا يَقْنُتُ فِيْ شَيْءٍ مِّنَ الصَّلَوَاتِ إِلَّا الْوِتْرَ فَإِنَّهُ كَانَ يَقْنُتُ قَبْلَ الرَّكْعَةِ۔ (ترجمہ):۔ دعائے قنوت بجز وتر کی نماز میں نہ پڑھی جائے خود حضرت ابن مسعود وتر میں رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھتے تھے۔ پس جن احادیث میں بعد الرکوع کے الفاظ ہیں وہاں قنوت نازلہ مراد ہے۔ جو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ پڑھی۔ اس کے الفاظ اس طرح احادیث میں آتے ہیں

اَللّٰھُمَّ اَنْجِ الْوَلِیْدَ بْنَ الْوَلِیْدِ وَسَلَمَۃَ بْنَ ھِشَامٍ وَعَیَّاشَ بْنَ اَبِیْ رَبِیْعَۃَ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَکَ عَلٰی مُضَرَ وَاجْعَلْھَا عَلَیْھِمْ کَسِنِیْ یُوْسُفَ اَللّٰھُمَّ اَلْعَنْ لِحْیَانَ وَرِعْلًا وَذَکْوَانَ وَعُصَیَّۃَ عَصَتِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ اصل قنوت نازلہ یہی ہے (طحاوی جلد اول صفحہ ۱۴۲ و مشکوٰۃ صفحہ ۱۱۳) یہ مدینہ منورہ میں ہجرت کے پہلے سال آخری ایک ماہ پڑھی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بد دعاؤں والے قنوت سے منع فرما دیا کہ یہ منصب رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کے خلاف تھی اس کے بدلے دوسری عرش اعظم والی قنوت ہمیشہ کے لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو مل گئی۔ جس کو سدرۃ المنتہی والی تین رکعتی نماز میں معین فرمایا گیا۔ اور چونکہ یہ دعا خصوصی طور پر اللہ کی طرف سے صرف ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے وتر کی اس تیسری رکعت میں اس کو واجب کیا جو خاص اللہ تعالیٰ کی رکعت ہے۔ کہ یہ رکعت شب معراج میں اللہ نے اپنے عشق کی زیادتی کرنے کے لیے پڑھوائی۔ اور رکوع سے پہلے ہوئی کیونکہ رکوع کے بعد رکعت ختم ہو جاتی ہے۔ اس دعا کے ابتدائی الفاظ تو اسی سدرۃ المنتہی کے پاس بیت المعمور والی صلوٰۃ ملائکہ کی امامت میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ادا فرمائے باقی اگلے الفاظ مشہورہ ہجرت کے دوسرے سال پہلے ماہ بروز جمعہ پہلی بار آپ نے اسی عرشی طریقے کے مطابق وتر کی تیسری رکعت میں پڑھے جس کے الفاظ از اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ تا بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ۔ ہر مسلمان نمازی کو یاد ہیں اور کبیری صفحہ ۳۶۶ پر بھی لکھے ہیں۔ اس لیے یہاں لکھنے ضروری نہیں یہ دعا ہمیشہ وتر کی تیسری میں واجب ہے چنانچہ صحیح بہاری صفحہ ۵۶ پر ہے:۔ عَنِ الْاِمَامِ مُحَمَّدٍ عَنِ الْاِمَامِ الْاَعْظَمِ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ اَنَّ الْقُنُوْتَ فِی الْوِتْرِ وَاجِبٌ فِیْ شَھْرِ رَمَضَانَ وَغَیْرِہٖ قَبْلَ الرُّکُوْعِ۔ ترجمہ:۔ روایت ہے امام محمد سے وہ روایت کرتے ہیں امام اعظم سے وہ امام حماد سے وہ حضرت ابراہیم سے کہ بے شک وتر میں دعائے قنوت واجب ہے ہمیشہ رمضان ہو یا غیر رمضان خیال رہے کہ امام شافعی بھی دعائے قنوت کو واجب مانتے ہیں مگر فقط رمضان کے آخری عشرے میں تو ثابت ہوا کہ اول یہی ہے کہ ہمیشہ وتر میں قنوت واجب ہے ہاں البتہ الفاظ معینہ مشہورہ کی دعائے قنوت واجب نہیں ان الفاظ سے دعا پڑھنا مستحب ہے۔ چنانچہ کبیری صفحہ ۴۱۷ اور مرقات شرح مشکوٰۃ جلد دوم صفحہ ۱۵۹ پر ہے:۔ وَالطَّحَاوِیُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ کَانَ یَقْنُتُ بِالسُّوْرَتَیْنِ اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ وَمِنْھَا اَخْرَجَ مُحَمَّدُ بْنُ نَصْرٍ عَنْ سُفْیَانَ قَالَ کَانُوْا یَسْتَحِبُّوْنَ اَنْ یَّجْعَلُوْا فِیْ قُنُوْتِ الْوِتْرِھَا تَیْنِ السُّوْرَتَیْنِ۔ (الخ) صفحہ ۱۶۰ پر ہے۔

لِاَنَّ الصَّحَابَۃَ اِتَّفَقُوْا عَلَیْہِ وَلَوْ قَرَءَ غَیْرَہٗ جَازَ۔ (ترجمہ) عمر فاروق رضی اللہ تعالٰے عنہ یہی دعاءِ قنوت اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ اور اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ والی اپنے وتر میں ہمیشہ پڑھتے تھے۔ حضرت سفیان تابعی سے روایت ہے کہ تمام صحابہ کرام انہی دونوں سورتوں والی قنوت کو اپنے وتر میں پڑھنا مستحب سمجھتے تھے۔ اس لیئے کہ تمام صحابہ نے اسی قنوت پر اتفاق کیا اگرچہ جائز دوسری دعاءِ قنوت بھی ہے۔ خیال رہے کہ صحابہ کے زمانے میں دعاءِ قنوت دو طرح کے الفاظ سے تھی ایک امام حسن رضی اللہ تعالٰی عنہ کی دعاءِ قنوت اور دوسری تمام صحابہ کی یہی مشہور مروجہ دعاءِ قنوت۔ پس مطلق قنوت کی دعاء واجب مگر الفاظ مستحب اور دعاءِ قنوت سے پہلے رفع یدین سنتِ صلوٰۃِ عرشی ہے۔ دعاءِ قنوت وتر کی آخری رکعت میں ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائی چنانچہ کبیری نے صـ۳۶ پر دار قطنی سے روایت کی کہ خلفاء اربعہ نے فرمایا۔ قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ تعالی علیہ وَسَلَّمَ فِیْ اٰخِرِ الْوِتْرِ۔ (ترجمہ) نبی کریم نے ہمیشہ آخری رکعت میں قنوت پڑھی۔ دعاءِ قنوت مشہورہ کے پہلے لفظ خود نبی کریم نے بیت المقدس میں ادا فرمائے باقی پوری دعاء حضرت جبریل نے بتائی (کبیری صـ۴۶۶ مراسیل ابی داؤد شریف صـ۸) خلاصہ یہ کہ تہجد دو رکعت اور وتر تین رکعت یہ ہر دو فرض و واجب نبی کریم کی خصوصی نمازیں ہیں۔ جن میں ایک پہلی بار بیت المقدس میں انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو پڑھائی اور دوسری بیت المعمور میں تمام ملائکہ کو پڑھائی وتر کی تیسری رکعت میں بعد سورت مع تکبیر رفع یدین بھی اور دعاءِ قنوت کے ابتدائی الفاظ بھی خود نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وہیں عرش مجید کے قریب ادا فرمائے۔ اس رات سے یہ دونوں نمازیں آپ پر فرض اور واجب ہوئیں۔ مگر امت مسلمہ کو ان میں سے ایک نفل ہو کر ملی اور ایک اپنی حالت پر رہی یعنی وتر تین رکعات واجب رہے۔ پس اس طرح سے امت نبی کریم کو پانچ فرض انبیاء سابقہ علیہم السلام کی یادگار میں ملے اور ایک نماز واجب ملائکہ کی عبادت سے علاوہ ہوئی اور ایک نماز عشق و معرفت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عطا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ بوجہ سہولت یہ نماز حکماً نفل بن گئی مگر اس کا ثواب اور نور فرض و واجب سے زیادہ۔ شب معراج کی یادگار کے طور پر یہ دونوں نمازیں رات ہی کو موقت ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ وتر نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ بعد تہجد ادا فرمائی اور ہمارے لیئے بھی مستحن و مستحب یہ ہی ہے کہ بعد نفلِ تہجد وتر پڑھیں۔ ہم پر پانچ فرض اور ایک واجب نماز ہے۔ جب کہ سابقہ انبیاء کرام و عظام پر ایک ایک نماز فرض اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم

پر چھ فرض ایک واجب نماز اس لیئے کہ آپ کی امت بہت وسیع۔ پانچ نمازیں تو آپ پر ہماری وجہ سے فرض ہوئیں اور ایک نماز عشق۔ انبیاء کرام کی وجہ سے اور وتر امت آسمانی کی وجہ سے۔ پھر یہ ہر نماز تمام مخلوق کی عبادات کا مجموعہ ہے۔ اس طرح کہ سابقہ امتوں میں کسی کی نماز میں رکوع نہ تھا کسی کی نماز میں التحیات نہ تھی کسی کی نماز میں فقط ایک سجدہ تھا۔ مگر مسلمانوں کی نماز تمام رکوع و سجود کا مجموعہ پھر ملائکہ میں کسی کی عبادت فقط قیام کسی کی فقط رکوع کسی کی فقط سجدہ کسی کی فقط التحیات بیٹھنا۔ اسی طرح نباتات میں درختوں کو تاعمر قیام عطا ہوا پھل دار پودوں کو رکوع چھوٹی سبزیوں کو التحیات اور بیلوں کو سجدہ ریزی عطا ہوئی اسی طرح جمادات میں پہاڑوں کو قیام غاروں کو رکوع گھاٹیوں کو التحیات اور زمین کو سجدہ ریزی عطا ہوئی۔ اسی طرح حیوانات میں پرندوں کو قیام۔ چرندوں چوپایوں کو رکوع۔ مینڈک کو التحیات اور حشرات کو سجدہ ریزی عطا ہوئی۔ پھر ان کے ذکر بھی علیحدہ علیحدہ۔ چنانچہ قمری سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم پڑھتی ہے اور کبوتری سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی پڑھتی ہے اور خطاف یعنی چھوٹی سیاہ چڑیا جس کو جھلا ابابیل کہتے ہیں وہ سورت فاتحہ مکمل پڑھتی ہے۔ (صاوی سوم صـ۱۵۶) یہ تمام مخلوقین ایک عبادت میں اپنی عمریں گزار دیں مگر کیا کرم ہے امت مسلمہ پر کہ وہ دو رکعت نماز میں عرش و فرش۔ لوح و قلم۔ خشکی۔ تری۔ کی عبادت ادا کرے۔ مسلمانوں کی نماز تمام مخلوق کی عبادت کا مجموعہ تامہ ہے۔ یہ نماز ہی ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا دیا اے میرے کریم رب مجھ کو سچا نمازی بنا۔ اور نماز عشق سے مجھ کو نواز دے۔ اور مجھ کو ایک مسجد اور مدرسہ عطا فرما۔ واللہ ورسولہ اعلم۔

کتبہ

بوقت تشہد انگلی اٹھانے کا جواز

سوال ۲۵: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ نماز کی التحیات میں شہادت کے وقت کلمے کی انگلی اٹھانا قانون شریعت اور حدیث مبارکہ و سودات مجتہدین کرام کے مطابق یہ اشارہ جائز ہے۔ یا حرام۔ چند دن پیشتر قریبی گاؤں ڈوگر ضلع گجرات نزد دولتانگر براستہ بھمبر سے ایک شخص نے بشکل فتویٰ یہ مسئلہ اس طرح لکھا ہے کہ انگلی اٹھانا حرام ہے اور حوالے میں مجدد الف ثانی کے مکتوبات جلد پنجم دفتر اول کی عبارت پیش کرتا ہے اور ابن ماجہ کا حوالہ بھی پیش کرتا ہے حالانکہ ہم نے ہمیشہ علماء کرام اور عوام الناس اور صوفیاء عظام کو اسی طرح وقت تشہد اشارہ کرتے دیکھا ہے یہ فعل مسلمانوں میں عام مروج ہے۔ اب موضع ڈوگر کی یہ تحریر اور مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کا

حوالہ ابن ماجہ کی دلیل کچھ تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔ شخص مذکور لکھتا ہے کہ مجدد صاحب نے اشارے والی روایات کو مضطرب لکھا۔ ہم تمام اہل علاقہ نے حق فیصلے کے لیے آپ کے فتوے کو ترجیح دی ہے۔ لہٰذا ہم کو مضبوط شرعی فتویٰ عطا فرمایا جائے کہ ہم اس پر عمل کریں بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا۔

السائل :۔ محمود احمد قادری نعیمی محلہ علی مسجد نزد اسلامیہ ہائی اسکول گجرات ۔۸۔۷۸۔

ہجری ۱۲۹۸ھ ۹-۹۸-۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّاب

الجواب

سوالِ مذکورہ کے جواب سے پہلے بطورِ تحقیق مرسلہ فتویٰ بھی دیکھا اور اس بے حوالوں میں زندگی میں پہلی مرتبہ حضرت قبلۂ عالم مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہوئے نمبر ۳۱۲ کا مکتوبات گرامی دفتر اول حصہ پنجم صہ ۱۶۲ پر دیکھا اس مکتوب کی تسامحات و کجیوں نے مجھ کو حیرت میں ڈال دیا۔ سوال میں مذکورہ فتوے کی عبارت ہی بتارہا کہ یہ تحریر کسی ایسے عام شخص نے لکھی ہے جس بیچارے کو اردو تک نہیں آتی۔ بھلا فتوئے اسلام کی باریکیوں کو وہ کیا سمجھ سکتا ہے۔ ایسی اغلاط والی تحریر کو فتویٰ کہنا ہی بے ادبی ہے۔ اس تحریر میں مکتوبات شریف کے علاوہ ابن ماجہ شریف کا بھی حوالہ دیا ہے۔ لہٰذا مندرجہ ذیل سطور میں اس مسئلہ پر مکمل تحقیقِ لئیق سے ایسی رحیقِ انیق ظاہر ہو گی کہ کسی امین کی شعبیق باقی نہ رہے۔ کیونکہ تمام مجتہدینِ اصول اور منفرّ یِ نصول اور تابعینِ فروع وتابعینِ جموع اس مسئلے پر متفق ہیں کہ بوقتِ تشہد انگشتِ سبّابہ جس کو شریعت اسلامیہ میں مسبّحہ بھی کہا جاتا ہے۔ اٹھانا سنت ہے چنانچہ رسائل عابدین جلد اول صہ ۱۲۱ پر ہے :۔ قَالَ نَجْمُ الدِّیْنِ الزَّاهِدِیُّ لَمَّا اتَّفَقَتِ الرِّوَایَاتُ عَنْ اَصْحَابِنَا جَمِیْعًا فِیْ کَوْنِهَا سُنَّةً وَكَذَا لِكَ عَنِ الْكُوْفِیِّیْنَ وَالْمَدَنِیِّیْنَ وَكَثُرَتِ الْاٰثَارُ وَالْاَخْبَارُ كَانَ الْعَمَلُ اَوْلٰی (ترجمہ) : فرمایا امام نجم الدین زاہدی نے جب کہ تمام روایات ہمارے اصحاب کی انگلی اٹھانے کی سنت پر متفق ہیں اور ایسے ہی کوفے اور مدینہ منورہ کے فقہاءِ امت کا مذہب ہے کہ انگلی اٹھانا سنت ہے اور بے حد احادیثِ طیبہ اور معتبر روایات اس بارے میں موجود ہیں تو یہ انگلی اٹھانا ہی بہتر ہے ثابت ہوا کہ شہادت کے وقت التحیات میں انگلی اٹھانا ہی سنتِ مطہرہ ہے۔ اور یہ سنت عارضی اور غیر مؤکدہ نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے چنانچہ حاشیہ طحاوی و طحطاوی شریف صہ ۱۴۷ پر ہے :۔

"اِتَّفَقَتِ الرِّوَایَاتُ عَنْ اَصْحَابِنَا جَمِیْعًا فِیْ کَوْنِهَا سُنَّةً مُؤَکَّدَةً"۔ ترجمہ:۔ ہمارے ساتھیوں کی بے شمار احادیث ہیں جن سے ثابت ہے کہ التحیات میں شہادت پر انگلی اٹھانا سنتِ مؤکدہ ہے۔ سنت مؤکدہ وہ ہوتی ہے جس پر نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلفاءِ صحابہ کرام نے ہیشگی فرمائی ہو۔ چنانچہ علامہ شامی ردالمحتار جلد اول کے صفحہ ۹۵ پر فرماتے ہیں اِنْ کَانَ مِمَّا وَاظَبَ عَلَیْهِ الرَّسُوْلُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوِ الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُوْنَ مِنْ بَعْدِهٖ فَسُنَّةٌ وَاِلَّا فَمَنْدُوْبٌ وَنَفْلٌ وَالسُّنَّةُ نَوْعَانِ سُنَّةُ الْهُدٰی (وَهِیَ مُؤَکَّدَةٌ صلا) وَتَرْکُهَا یُوْجِبُ الْاِسَاءَةَ وَالْکَرَاهِیَةَ۔ (ترجمہ) اگر فعل شریف ایسا ہو کہ جس پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یا آپ کے بعد خلفاءِ راشدین نے ہمیشگی فرمائی ہو تو سنت ہے ورنہ نفل یا مستحب ہیں اور سنت دو قسم کی ہے عا سنتِ ھدیٰ اور یہی سنتِ مؤکدہ ہے اس کے چھوڑنے پر گناہ اور کراہیت لازم آتی ہے۔ سنتِ مؤکدہ کا حکم یہ ہے کہ اس کو چھوڑنے والا نبی کریم رؤف ورحیم کی شفاعت سے محروم رہے گا۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد پنجم صفحہ ۲۹۵ پر ہے:۔ وَتَرْكُ السُّنَّةِ الْمُؤَکَّدَةِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْحَرَامِ یَسْتَحِقُّ حِرْمَانَ الشَّفَاعَةِ (الخ) فَاِنَّ تَارِکَهَا مُضَلِّلٌ وَّمَلُوْمٌ۔ (ترجمہ) سنتِ مؤکدہ کو بلا عذر جان بوجھ کر چھوڑنا حرام کے قریب ہے اور شفاعت سے محرومی ہے۔ اس لئے کہ اس کو چھوڑنے والا قابلِ ملامت اور گمراہ ہے:۔ سنتِ مؤکدہ کی شرعی تعریف یہ ہے کہ دلیل ظنی سے ثابت ہو اور اس کے ترک پر کوئی ممانعت کسی حدیث پاک میں نہ آئی ہو صرف مواظبت کی وجہ سے اس کام کو چھوڑنا مکروہ تحریمی ہو چنانچہ شامی شریف جلد اوّل صفحہ ۹۵ پر ہے فَمَا کَانَ فِعْلُهٗ اَوْلٰی مِنْ تَرْکِهٖ مَعَ مَنْعِ التَّرْکِ اِنْ ثَبَتَ بِدَلِیْلٍ قَطْعِیٍّ فَفَرْضٌ اَوْ بِظَنِّیٍّ فَوَاجِبٌ وَبِلَا مَنْعِ التَّرْكِ (الخ) فَسُنَّةٌ اِنْ کَانَ مِمَّا وَاظَبَ عَلَیْهِ (ترجمہ):۔ علامہ ابن عابدین یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عبادتِ الٰہی اور افعالِ پاکِ صاحبِ لولاک چار قسم کی ہیں پہلی فرض دوسری واجب تیسری سنتِ مؤکدہ۔ چوتھی نفل۔ جس کا کرنا کرنے سے افضل اور نہ کرنے پر ممانعت وارد ہوئی ہو اور اس کا حکم امر دلیلِ قطعی سے ثابت ہو وہ فرض ہے اور کرنا نہ کرنے سے افضل اور اس کے چھوڑنے پر جھڑک اور ممانعت حدیثِ پاک یا قرآن مجید میں آئی ہو اور اس کا امر دلیلِ ظنی سے ثابت ہو تو وہ واجب ہے۔ اور اگر کرنا افضل ہو اس کا امر دلیلِ ظنّی سے ہو لیکن اس کے چھوڑنے پر ممانعت کی کوئی حدیث شریف نہ آئی ہو۔ صرف ہیشگی فرمانے کی وجہ سے اس سنت کو چھوڑنے پر گناہ پڑے تو وہ سنتِ مؤکدہ ہے اس عبارت سے ثابت ہوا کہ سنتِ مؤکدہ اگرچہ دلیلِ ظنی سے ثابت ہوتی ہے مگر واجب کی طرح اس کے چھوڑنے پر گناہ لازم ہے گویا کہ سنتِ مؤکدہ ہر طرح مثلِ واجب ہے:۔

صرف اتنا فرق ہے کہ واجب کے ترک پر ممانعت وارد ہے۔ سنت مؤکدہ کے ترک پر صراحتًا ممانعت وارد نہ ہوئی صرف اس لیے اس کا چھوڑنا گناہ اور مکروہ تحریمی ہوا کہ پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس عمل شریف کو ہمیشہ ادا فرمایا اور امت کے لیے یہ ہمیشگی بھی واجب التعمیل ہے چنانچہ۔ اصولِ فقہ کی مشہور و مستند کتاب توضیح تلویح صفحہ ۴۱۲ پر ہے:۔

یَجِبُ عَلَیْنَا اِتِّبَاعُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اَفْعَالِہِ الَّتِیْ لَیْسَتْ بِسَہْوٍ وَلَا بِطَبْعٍ وَلَا مُخْتَصَّۃٍ بِہٖ (ترجمہ)۔ یعنی ہم مسلمانوں پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُن تمام افعالِ طیبہ کی اتباع واجب ہے جو نہ آپ سے سہوًا ہوئے نہ طبعًا نہ خصوصیت سے۔ نتیجہ یہ کہ سنتِ مؤکدہ درجۂ عبادت کے لحاظ سے سنت ہے مگر عمل کے لحاظ سے واجب الاتباع ہے۔ اس کا چھوڑنا گناہِ عظیم مکروہ تحریمی جیسا کہ شامی جلد اوّل صفحہ ۹۶ پر ہے اور محرومی شفاعت قریب حرام غرضیکہ سنتِ مؤکدہ عظیم درجے والی عبادت ہے۔ اور التحیات میں انگلی مسبحہ اٹھانا بھی سنتِ مؤکدہ ہے۔ عقلاً۔ نقلاً۔ درایۃً۔ روایۃً۔ شرعًا۔ وروایۃً اس کے دلائل موجود ہیں۔ اور اس عمل شریف کے سنت اور جائز ہونے پر اتنی زیادہ احادیث وارد ہیں کہ امام ابن عابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کثرتِ رواۃ کو متواتر کا درجہ دینا پڑا۔ اور تسلیم کرنا پڑا کہ التحیات میں شہادت کی انگلی اٹھانا متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ رسائل ابن عابدین جلد اوّل صفحہ ۱۲۲ پر ہے:۔ فَلَا شَکَّ فِیْ صِحَّۃِ اَصْلِ الْاِشَارَۃِ لِاَنَّ بَعْضَ اَسَانِیْدِھَا مَوْجُوْدٌ فِیْ صَحِیْحِ مُسْلِمٍ وَبِالْجُمْلَۃِ فَھُوَ مَذْکُوْرٌ فِی الصِّحَاحِ السِّتِّ مِمَّا کَانَ اَنْ یَّصِیْرَا مُتَوَاتِرًا بَلْ یَصِحُّ اَنْ یُّقَالَ اَنَّہٗ مُتَوَاتِرٌ مَعْنًی۔ (ترجمہ) اس بات میں بالکل شک نہیں کہ اصل اشارہ بالکل صحیح ہے۔ اس لیے بعض اسنادیں اشارہ والی احادیث کی صحیح مسلم میں موجود ہیں بلکہ جگہ جگہ صحاح ستہ میں ہیں جس سے قریب ہوگیا کہ یہ احادیث متواتر ہوں بلکہ صحیح یہی ہے کہ ان روایات کو متواتر معنوی کا درجہ حاصل ہو۔ اور پھر کثرتِ احادیث کو تو خود مجدد صاحب قدس سرہ نے بھی دبی زبان میں تسلیم کرلیا ہے کہ اس کے سوا چارہ نہیں چنانچہ اپنے اس مذکورہ بالا مکتوب شریف میں لکھتے ہیں۔ احادیث نبوی علی مصدرہا الصلوٰۃ والسلام درباب جوازِ اشارتِ سبابہ بسیار وارد شدہ اند ترجمہ۔ سبابہ انگلی کے اشارے کے جواز میں نبی علیہ السلام کی بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ اپنے مسلک کو برقرار رکھنے کے لیے کبھی کہہ دیا کہ یہ روایات نوادر ہیں اصول نہیں کبھی کہہ دیا کہ ان روایات میں اضطراب ہے:۔

حالانکہ اہلِ تفکر و تدبر کے نزدیک یہ دونوں باتیں ناقابلِ یقین ناقابلِ صحت ہیں۔ اس لیے کہ کسی روایت کو نادر یا نوادر کا نام دینا اپنا اختراع ہے اصولِ حدیث کے خلاف محدثین کرام کے نزدیک روایات کی صرف اور صرف پینتیس اقسام ہیں جن میں پہلی مرفوع ہے اور آخری مختلط ہے۔ (دیکھو مراۃ شرح مشکوٰۃ جلد ہشتم صہ ۶۱۲) خیال رہے کہ ان ہی کثرتِ روات واخبارات کی بنا پر ائمہ اربعہ مجتہدین و فقہاءِ متقدمین علماءِ متبحرین نے اشارۂ مسبحہ میں بالکل اختلاف نہ کیا بلکہ اجماعی طور پر سب نے عملاً و عقائداً اس کے جواز و صحت کو مانا اور انگلی کے اشارے کے سنت ہونے کے قائل رہے اس بارے میں ایک ہی مسلک ظاہر و باہر رہا۔ اسی کو سب نے نافذ کیا اس معاملے میں کسی نے اپنی عقل و فہم نہ دوڑائی سب نے ہی۔ ع۔ عقل قربان کن بہ پیشِ مصطفےٰ۔ کا مظاہرہ کیا بھلا کسی امتی کی کیا جرأت ہے کہ کثیر احادیث کے مقابل محض اپنی عقلی بات پیش کرے ہاں زمانے کی گردش نے جہال اور تفرقے ڈالنے اور عقل والوں کو عقلی الجھنوں میں پھنسایا اور ذہنی کاوشوں کو احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و فرامینِ حبیب اللہ کے مدِ مقابل کھڑا کیا وہاں چھوٹے بڑے ارکینِ اسلام و فرائض و سنتِ عباداتِ ایمان کے انکار کثیفہ روتاویلاتِ عجیبہ میں الجھایا یہاں تک کہ فی زمانہ تقریباً تمام ہی مسائل میں چھوٹا موٹا بلاسود جھگڑا چل پڑا کہ جس سے تمام مسلمان پریشان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اہلِ تحقیق علماء پر واجب ہے کہ ان حالات میں اہلِ خطاء و نسیان حضرات کی خطاؤں کو ظاہر کرکے حق ظاہر کرکے اہلِ عمل کے لیے راہِ اسلام واضح کریں۔ ان ہی مختلف فیہ مسائل میں انگشتِ شہادت کا اشارہ ہے۔ جس کو ہمارے چند متاخرین اکابر نے روایات و درایات سے ہٹ کر محض عقلی اور ذہنی طور پر مختلف فیہ بنا کر۔ متحد مسلمانوں کے دو گروہ بنا دیئے:۔

یہ اختلاف اس شدت تک پہنچا کہ پیر پرستی تک نوبت پہنچی۔ پہلے یہ اختلاف نہ تھا چنانچہ حاشیہ ترمذی شرح قرت المغتذی صہ ۲۰ پر ہے:۔ لَا یُعْرَفُ فِی الْمَسْئَلَةِ خِلَافٌ لِلسَّلَفِ مِنَ الْعُلَمَاءِ وَ اِنَّمَا خَالَفُوْا فِیْهَا بَعْضُ الْخَلَفِ فِیْ مَذْهَبِنَا مِنَ الْفُقَهَاءِ (ترجمہ):۔ مسئلہ انگلی کے اشارے کے جواز میں کوئی اختلاف متقدمین فقہاء علماء اور مجتہدین میں نہ تھا۔ یہ اختلاف تو فقط بعد والے بعض متاخرین فقہاء نے بنا لیا۔ اور سعایہ شرحِ شرحِ وقایہ جلد دوم صہ ۲۱۱ پر ہے:۔ وَکَذَا اِتَّفَقَ عَلَیْهِ اَئِمَّتُنَا الثَّلٰثَةُ وَقُدَمَاءُ اَتْبَاعِهِمْ وَالْخِلَافُ اِنَّمَا جَاءَ مِنْ مُتَاَخِّرِیْهِمْ فَلَا اِعْتِدَادَ بِخِلَافِهِمْ۔ اسی طرح حاشیہ موطا امام محمد رسالہ تعلیق صہ ۱۰۲ پر ہے:۔ لَا سَبِیْلَ اِلٰی اِنْکَارِهَا وَلَا اِلٰی رَدِّهَا وَقَدْ قَالَ بِهٖ غَیْرُهُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْمُتَاَخِّرِیْنَ:۔ ان ہر دو عبارات سے ظاہر ہوا کہ التحیات

میں انگلی اٹھانا تمام کے نزدیک جائز ہے مگر بعض دانشوروں نے اپنی دانش کے اشارہ پر ۹۹۹ھ میں اس مشہور و معروف مسئلے سے اختلاف کیا یہی زمانہ مجدد صاحب قدس سرہٗ کے تاب و تاب کا تھا چنانچہ مجدد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی اختلاف میں شامل ہوگئے اور ہمارے ان چند بزرگوں نے اختلاف میں اتنی شدت اختیار کی کہ بلا سوچے سمجھے اشارۂ سبابہ کو حرام کہنا شروع کردیا۔ چنانچہ خود مجدد صاحب اپنے ہم عصر علما کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ثُمَّ قَالَ فِیْهَا هٰذَا مَاذَکَرُوْا وَالصَّحِیْحُ اَنَّ الْاِشَارَۃَ حَرَامٌ۔ (ترجمہ) پھر کہا فتاوی غرائب نے کہ اس اشارہ کے حکم میں وہ جواب فقہاء امت نے ذکر کیا حالانکہ صحیح یہ ہے کہ اشارہ حرام ہے۔ خود مجدد صاحب بھی اسی نہج پر دائم ہوئے چنانچہ شروع اربعہ ترمذی صـ ۳۰۱ پر ہے۔ وعملِ آنحضرتؒ بر تحریمِ اشارت است (ترجمہ) ان حضرت مجدد الف ثانی کا مسلک اشارے کی حرمت پر ہے۔ بس اس اختلاف سے منکرین کے چند ٹولے بن گئے کسی نے اس کو حرام کہا کسی نے مکروہ تحریمی کسی نے مکروہ تنزیہی۔ ایک اسٹیج پر یہ بھی جمع نہ ہو سکے جیسا کہ خود صاحب مکتوب قدس سرہ کو اعتراف ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ قَالَ (الخ) اَنَّ الْاِشَارَۃَ حَرَامٌ وَفِی السِّرَاجِیَّۃِ مَکْرُوْهٌ (ترجمہ) یعنی فتاوی غرائب والے نے کہا کہ اشارہ حرام اور سراجیہ والے کہتے ہیں مکروہ ہے اور رسائل ابن عابدین جلد اوّل صـ ۱۲۲ پر ہے:۔ فَمِنْ مَشَائِخِنَا مَنْ یَّقُوْلُ بِاَنَّهٗ لَا یُشِیْرُ لِاَنَّ فِی الْاِشَارَۃِ زِیَادَۃُ رَفْعٍ لَا یُحْتَاجُ اِلَیْهَا فَیَکُوْنُ التَّرْکُ اَوْلٰی۔ (ترجمہ) پس ہمارے مشائخ میں ایک کہتا ہے کہ اشارہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اشارے میں اٹھانے کی زیادتی ہے جس کی کچھ ضرورت نہیں تو بہتر یہ ہے کہ اشارہ نہ کرے ان بزرگ صاحب کے نزدیک اشارہ کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ کیونکہ ترک اولیٰ مکروہ تنزیہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کتب اصول میں تصریح موجود ہے۔ غرضیکہ ان اکابر متقدمین متاخرین کا آپس میں ہی اتفاق و اعتقاد نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان سب ہمعصر علما کے پاس اپنے مسلک کو بچانے کے لیے کوئی شرعی دلیل نہیں صرف اپنی فکری اور ذھنی قیاس پر اس مذہب حادثہ کو ڈھالتے چلے گئے۔ ورنہ قانون شریعت کے مطابق حرام وہ ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو چنانچہ تلویح توضیح صـ ۲ پر ہے:۔ وَاِنْ کَانَ تَرْکُهٗ اَوْلٰی فَمَعَ الْمَنْعِ عَنِ الْفِعْلِ بِدَلِیْلٍ قَطْعِیٍّ حَرَامٌ (ترجمہ) قطعی دلیل سے جس کی ممانعت ثابت ہو وہ حرام قطعی ہے۔ اور دلیل ظنی سے جس کی ممانعت ثابت ہو وہ حرام ظنی یعنی مکروہ تحریمی ہے۔ بہر حال مکروہ ہو یا حرام تحریمی ہو یا تنزیہی ہر حکم کے لیے دلیل ضروری بغیر دلیل شریعت میں کسی کی بات نہیں مانی جائے گی۔

شریعتِ اسلامیہ کوئی عقلی اور ذہنی پیداوار نہیں کہ جس طرح چاہا نیا مسئلہ بنالیا اور جس مسئلے سے چاہا اختلاف کرکے عقلی ساخت کے پتوار پر چڑھادیا۔ اتنے اتنے بڑے مجتہد فی الاصول ائمہ اربعہ جن کی عقل وقیاس عرشِ اعظم اور بیرمانِ حدیث مبارکہ ثریا ستارے تک پہنچی ہوئی تھی اور جن کا طریقۂ استنباط علمی شاہکار رہیں منتِ مولٰی کے تھا وہ بھی اپنے آئندہ مقلدین کو خبردار کرتے تھے اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَهُوَ مَذْهَبِیْ (رسائل ابن عابدین جلد اوّل ص۱۲) (ترجمہ) جب کوئی صحیح حدیث نظر آجائے وہی ہمارا مذہب ہے۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابل اپنا قیاس کون بناسکتا ہے۔ بخلاف ہمارے ان اکابر کے کہ انہوں نے اتنی احادیثِ مطہرات اور اقوالِ فقہاء ومجتہدین کے ہوتے ہوئے انگشتِ شہادت کا انکار کیا اور اپنے انکار کی بنیاد صرف عقلی پیداوار پر بنائی کہ فرمایا۔ وَیُکْرَهُ اَنْ یُّشِیْرَ بِالسَّبَّابَةِ فِی الصَّلٰوةِ عِنْدَ قَوْلِهٖ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ هُوَ الْمُخْتَارُ وَفِی الْکُبْرٰی وَعَلَیْهِ الْفَتْوٰی۔ لِاَنَّ مَبْنَی الصَّلٰوةِ عَلَی السُّکُوْنِ وَالْوَقَارِ۔ (ترجمہ)۔ سراجیہ میں ہے کہ شہادت کے وقت سبابہ سے اشارہ مکروہ ہے نماز یہی لوگوں کے نزدیک یہی پسندیدہ ہے اور کبریٰ میں ہے یہ کہ لوگ اسی پر فتوٰی جاری کرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نماز سکون اور وقار کی جگہ ہے انگلی اٹھانے سے سکون ختم ہو جاتا ہے۔ بس یہی ایک دلیل ہے جو مخالفین کی ہر تحریر میں موجود ہے اور ہر موقعہ پر یہی ایک دلیل پیش کرتے رہتے ہیں۔ مجدد صاحب علیہ الرحمۃ نے بھی اپنے مکتوبات ص۱۶۳ پر اسی دلیل کا سہارا لیا ہے۔ ہمارے مخالفین کے پاس اس عقلی دلیل کے سوا کوئی دلیل نہیں ورنہ ضرور پیش کرتے میں تو کہتا ہوں کہ اگر ان محترمین کو۔ کوئی ضعیف روایت بھی عدمِ اشارہ پر مل جاتی تو اپنی کتابوں میں ضرور پیش کردیتے مگر ایسا نہ ہوا کیونکہ عدمِ اشارہ پر یا اشارے سے انکار پر کسی محدث یا راوی یا صاحب کتاب نے ضعیف تر روایت بھی نہ سنی۔ ہاں البتہ ان لوگوں کے پاس جو اشارہ کرنے کو جائز مانتے ہیں۔ بے شمار نقلیہ وعقلیہ دلائل موجود ہیں۔ مجدد صاحب قدس سرہ اور ان کے ہم مسلک حضرات کے پاس عقلی دلیل بھی صرف یہ ایک ہی ہے اور وہ بھی دو وجہ سے نہایت کمزور۔ پہلی وجہ یہ کہ یہ دلیل احادیث مشہورہ اور اجماعِ امت کے مقابل ہے۔ جیسا کہ آگے بتایا جائے گا۔ اسی لیے نزدِ محققین باطل ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ ارشارے سے سکون کس طرح ختم ہوسکتا ہے۔ اگر اسی طرح سکون ختم ہوتا رہا تو کل کوئی شخص نماز کے کسی اور جز یا عمل کا انکار کرسکتا ہے۔ اور پھر جتنی باوقار پُرسکون نماز حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کی ہوتی تھی بھلا کس انسان کی ہو سکتی ہے اور آپ سے اشارہ ثابت ہے جیسا کہ ابھی ہم ثابت کریں گے۔ اگر اشارہ سے سکون میں فرق پڑتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اس کو جاری نہ فرماتے بلکہ صحابہ کو منع فرماتے مگر ایسی کوئی ممانعت فرمانِ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت نہیں تو آج یہ کون سی عقل ہے جس نے ایسی اختراع کی۔ بس اسی دلیل کو بچانے کے لیے مجدد صاحب نے تمام اُن روایات کو جو اشارے کا جواز پیش کر رہی ہیں بے اصول اور نوادر کا لقب دے دیا۔ چنانچہ مکتوبات جلد دوم صفحہ ۱۶۳ دفتر اول حصہ پنجم میں ہے۔ اگر روایات نوادر است در روایاتِ اصول (ترجمہ) یہ اشارہ کا حکم دینے والی نادر روایتوں میں سے ہے کہ اصول روایات میں ہے۔ حضرت شیخ علیہ الرحمتہ کا یہ قول دو طرح قابلِ گرفت ہے پہلے اس طرح کہ لفظ نادر محدثین کی اصطلاح میں کسی روایت کے لیے مستعمل نہیں۔ احادیث کی جو اقسام کتب احادیث میں لکھی ہیں ان میں کسی روایت کا نام نادر نہیں۔ یہ نام مجدد صاحب قدس سرہ نے اپنے پاس سے بنا لیا پھر اس پر بھی کوئی دلیل نہ دی کہ نادر کیوں ہیں۔ ہاں البتہ ہو سکتا ہے کہ نادر سے مراد شاذ ہو تو صحیح نہیں کیونکہ اشارے کے ثبوت والی احادیث کلیۃً شاذ نہیں ہیں اس لیے کہ یہ احادیث صحاح ستہ میں ہیں اور ترمذی شریف میں بھی ہے حالانکہ ترمذی شریف کی کوئی روایت شاذ نہیں۔ چنانچہ تدریب الراوی اصولِ حدیث کی کتاب صفحہ ۸۰ پر ہے:۔ اَنَّ التِّرْمِذِیَّ حَدُّ الْحَسَنِ بِاَنْ لَّا یَکُوْنَ فِیْ اِسْنَادِہٖ مَنْ یُّتَّھَمُ بِالْکِذْبِ وَلَا یَکُوْنُ شَاذًّا:۔ (ترجمہ):۔ بے شک ترمذی کی حسن روایات کی حد میں ہے اس کی اسناد میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو کذب بیانی میں مشہور ہو۔ اور نہ ہی ترمذی شریف کی کوئی روایت شاذ ہے۔ محدثین کے نزدیک شاذ کی چار قسمیں ہیں ۱۔ شاذ مضبوط ۲۔ شاذ حسن ۳۔ شاذ منکر ۴۔ شاذ مردود۔ شاذ وہ ثقہ روایتِ واحد ہے جو عام راویوں کی روایتوں کے مخالف ہو لیکن اگر یہ شاذ ضابطہ حدیث کے عین مطابق ہو تو شاذ مضبوط ہے اور اگر قریب قریب ہو تو حسن اور اگر ضابطے سے دور ہو تو منکر اور اگر عوام کی روایت زیادہ مضبوط ہو تو شاذ منکر (اصول حدیث للجرجانی علی الترمذی صفحہ ۳ و بستان المحدثین للشاہ عبدالعزیز دہلوی صفحہ ۱۶) بہرحال ترمذی شریف میں کوئی روایت شاذ نہیں۔ دلیل ۱۔ اسی ترمذی کے صفحہ ۲۹ پر ہے:۔ عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ فِی الصَّلٰوۃِ وَضَعَ یَدَہُ الْیُمْنٰی عَلٰی رُکْبَتِہٖ وَرَفَعَ اِصْبَعَہُ الَّتِیْ تَلِی الْاِبْہَامَ یَدْعُوْ بِہَا اَیْ یُشِیْرُ بِہَا:۔ (ترجمہ) حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب نماز میں تشریف رکھتے تو اپنے داہنے ہاتھ پاک کو اپنے گھٹنے شریف پر رکھتے اور اپنی وہ انگلی مبارک اٹھاتے جو انگوٹھے سے ملی ہے اور اس سے اشارہ کرتے۔ دلیل ۲۔ مسلم شریف جو مراتب میں ترمذی سے بھی بلند ہے۔ اس کے صفحہ ۲۱۶ جلد اول میں ہے:۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ

مُعْمَرٍ (الخ) قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَعَدَ فِي الصَّلٰوةِ جَعَلَ قَدَمَهُ الْيُسْرٰى بَيْنَ فَخِذِهٖ وَسَاقِهٖ وَفَرَشَ قَدَمَهُ الْيُمْنٰى وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ الْيُسْرٰى وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهٖ :۔ (ترجمہ) :۔ محمد بن عمر نے ہم سے حدیث پاک بیان فرمائی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی التحیات میں بیٹھتے تو اپنے بائیں قدم شریف ران پاک اور پنڈلی شریف کے درمیان رکھتے اور اپنے داہنے قدم مبارک کو قبلہ رخ کھڑا کرتے اور اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر رکھتے اور داہیں کو داہیں ران پر اور اپنی انگلی پاک سے اشارہ فرماتے۔ اس روایت مطہرہ سے بالوضاحت مسئلہ ثابت ہو جاتا ہے۔ اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی اور یہ ہم پہلے بتا چکے کہ ترمذی شریف و مسلم شریف کی احادیث درجہ صحت پر ہیں۔ دلیل ع۳ ابو داؤد شریف جلد اوّل ص۱۴۲ پر ہے :۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَعَدَ فِي الصَّلٰوةِ (الخ) وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهٖ (ترجمہ) وہی ہے جو اوپر گذرا اس کی اسناد یعنی سلسلۂ روات یہ چھ راویانِ کرام ہیں ع۱ محمد بن عبد الرحیم ع۲ عفان ع۳ عبد الواحد بن زیاد ع۴ عثمان حکیم تابعی ع۵ عامر بن عبد اللہ تابعی ع۶ حضرت عبد اللہ بن زبیر صحابی اور یہ سب راوی ثقہ ہیں جیسا کہ اَسْمَاءُ الرِّجَال سے ثابت ہے۔ اور شرح نووی نے بھی فرمایا کہ یہ اسناد بالکل صحیح ہے چنانچہ حاشیہ ابو داؤد ص۱۴۲ پر ہے :۔ قَالَ النَّوَوِيُّ اِسْنَادُهٗ صَحِيْحٌ (ترجمہ) :۔ امام نووی نے فرمایا کہ اس حدیث پاک کی اسناد بالکل صحیح ہے دلیل ع۴ نسائی شریف جلد اوّل ص۱۷۳ پر ہے :۔ اَخْبَرَنِيْ زَكَرِيَّا بْنُ يَحْيَى السِّجْزِيُّ (الخ) قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ فِي الثِّنْتَيْنِ اَوْ فِي الْاَرْبَعِ يَضَعُ يَدَيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ اَشَارَ بِاِصْبَعِهٖ (ترجمہ) حضرت زکریا بن یحییٰ سجزی نے پوری اسناد سے مجھ کو روایت پہنچائی کہ پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب بھی دو رکعت والی یا چار والی نماز میں التحیات بیٹھتے تو اپنے دست مبارک کو اپنے گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی انگلی سے اشارہ فرماتے۔ دلیل ع۵ ابن ماجہ شریف ص۶۵ پر ہے :۔ حَدَّثَنَا وَكِيْعٌ عَنْ عِصَامِ بْنِ قُدَامَةَ عَنْ مَالِكِ بْنِ نُمَيْرٍ الْخُزَاعِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاضِعًا يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى فِي الصَّلٰوةِ وَيُشِيْرُ بِاِصْبَعِهٖ (ترجمہ) حضرت وکیع نے عصام بن قدامہ سے روایت کی وہ مالک ابن نمیر خزاعی سے وہ اپنے والد نمیر سے راوی فرمایا میں نے خود نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے داھنا ہاتھ داھنی ران پر رکھا نماز میں اور اشارہ فرمایا اپنی انگلی پاک سے۔ یہاں تک صحاح ستہ سے دلائل پیش کیے اب دیگر کتب معتبرہ سے

دلائل ملاحظہ ہوں دلیل ۶ کتاب فقہ السنن والاثار ص ۶۳ عَنْ اِبْنِ الزُّبَیْرِ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (الخ) وَاَشَارَ بِالسَّبَابَۃِ وَلِابْنِ مَاجَۃَ بِسَنَدٍ صَحِیْحٍ۔ یعنی صحیح سند والی حدیث پاک یہ ہے کہ نبی علیہ السلام التحیات میں اپنی سبابہ انگشت مبارک سے اشارہ فرمایا کرتے تھے ابن ماجہ میں بھی ایسی ہی روایت موجود ہے۔ دلیل ۷ موطا امام محمد ص ۵۳ پر ہے اَخْبَرَنَا مَالِکٌ اَخْبَرَنَا مُسْلِمٌ (الخ) قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ فِی الصَّلٰوۃِ وَضَعَ کَفَّہُ الْیُمْنٰی عَلٰی فَخِذِہِ الْیُمْنٰی وَقَبَضَ اَصَابِعَہٗ کُلَّہَا وَاَشَارَ بِاِصْبَعِہِ الَّتِیْ تَلِی الْاِبْہَامَ (ترجمہ) امام محمدؒ نے فرمایا کہ ہم کو امام مالک نے حدیث سنائی ان کو مسلم نے پہنچائی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب بھی التحیات میں بیٹھتے تو اپنی داہنی ہتھیلی داہنی ران پر رکھتے اور اپنی تمام انگلیوں کو بند فرماتے اور اپنی اس انگلی سے اشارہ فرماتے جو انگوٹھے کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ وہ موطا ہے جس سے بڑے بڑے محدثین و فقہا سند پکڑتے اور استنباط مسائل کرتے ہیں دلیل ۸ موطا امام مالک جلد اول ص ۸۵ پر ہے:۔ حَدَّثَنِیْ یَحْیٰی عَنْ مَالِکٍ عَنْ مُسْلِمٍ قَالَ کَانَ اِذَا جَلَسَ وَضَعَ کَفَّہُ الْیُمْنٰی عَلٰی فَخِذِہِ الْیُمْنٰی وَقَبَضَ اَصَابِعَہٗ کُلَّہَا وَاَشَارَ بِاِصْبَعِہِ الَّتِیْ تَلِی الْاِبْہَامَ (الخ) وَقَالَ ھٰکَذَا کَانَ یَفْعَلُ (ترجمہ) وہی ہے جو اوپر گزرا۔ یہ تھیں وہ منقولہ دلیلیں جو چند کتب سے ہم نے اختصاراً پیش کیں ورنہ ابھی بے شمار احادیث معتبرہ و روایات صحیحہ مستدرک مستخرج مراسیل دامالی کتب میں موجود ہیں بیہقی مسند احمد مستدرک حاکم وغیرہ میں منقول ہیں جس سے علماء اسلام واقف و دانا ہیں ان تمام پیش کردہ احادیث میں لفظ کان کو عمل شریف سے ملحق کیا گیا ہے۔ اور آخری روایت کا آخری لفظ کَانَ یَفْعَلُ ہے۔ نحوی قواعد کے مطابق جب کان علیحدہ ہو یا فعل مضارع کے ساتھ ہو تو مواظبت اور ہمیشگی کے معنی میں ہوتا ہے کیونکہ یہ ماضی استمراری کے لیے ہوتا ہے۔ اس سے عقلی طور پر ثابت ہوا کہ اشارہ کا عمل شریف ہمیشہ ہی ہوا کبھی ترک ثابت نہیں لہٰذا یہ اشارہ سنت مؤکدہ ہے۔ ابھی تک ہم نے روایات صحیحہ سے اپنا مسلک پیش کیا جس سے ثابت ہو گیا کہ مخالفین کا مسلک روایت کے خلاف ہے اب یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مذہب مخالفین درایت کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی یہی وجہ ہے کہ علماء محققین نے فرمایا کہ اشارۂ التحیات کا انکار روایت و درایت کے خلاف ہے۔ چنانچہ فتح القدیر جلد اول ص ۲۲۱ پر ہے:۔ وَعَنْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْمَشَائِخِ لَا یُشِیْرُ اَصْلًا وَھُوَ خِلَافُ الرِّوَایَۃِ وَالدِّرَایَۃِ (ترجمہ) اور بہت سے مشائخ سے مروی ہے کہ وہ بالکل اشارہ نہیں کرتے حالانکہ ان کا یہ فعل روایت اور درایت کے خلاف ہے۔ روایت آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے

قول وفعل اور صحابہ کے قول وفعل کو کہتے ہیں۔ اور روایات سے استنباط کردہ احکام کو درایت کہتے ہیں اسی طرح مجتہدین کے قیاس کو بھی درایت یا ظن کہتے ہیں احکام شرعیہ کی حکمتوں اور فوائد کو دلائل عقلیہ کہتے ہیں اس طرح دلائل کی چار قسمیں ہو گئیں ع۱ روایت ع۲ درایت ع۳ قیاس ع۴ دلیل عقلی۔ اشارہ سبابہ کی مخالفت کا مسلک نہ روایتًا ثابت نہ درایتًا نہ عقلاً نہ قیاسًا۔ البتہ انگشتِ شہادت کے اشارہ کا جواز چاروں دلائل سے واضح ثابت ہے روایاتِ کثیرہ تو پیش کر دی گئیں درایت میں بھی یہ مسئلہ بہت دلائل سے ثابت ہے دلیل ع۸ بعد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سب سے زیادہ معتبر قول مجتہدین عظام ائمہ اربعہ علیہم الرحمتہ والرضوان کا ہے کہ یہی مشعل راہِ امتِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء ہے۔ اسی کو اجماعِ ظنی اور اجماعِ امت کہا جاتا ہے۔ ائمہ اربعہ کا متفقہ قول حدیثِ مشہور کی طرح ہے۔ چنانچہ نبراس ص۵۶۵ پر ہے:۔ ثُمَّ اِجْمَاعٌ مِنْ بَعْدِ الصَّحَابَةِ عَلٰى حُكْمٍ لَمْ يَظْهَرْ فِيهِ خِلَافٌ مِمَّنْ سَبَقَهُمْ وَهُمَا كَالْحَدِيْثِ الْمَشْهُوْرِ (الخ) فَالْاِجْمَاعُ الْاَوَّلُ قَطْعِيٌّ وَالْبَوَاقِيْ ظَنِّيَّةٌ ؕ۔ (ترجمہ)

پھر دوسرا اجماعِ امت صحابہ کے بعد فقہاء کرام مجتہدین فی الاصول کا ہے ایسے حکم پر کہ جس میں خلاف نہ ظاہر ہوا ان بزرگوں سے جو پہلے ہوئے یعنی صحابہ کرام اور یہ دونوں اجماع حدیث مشہور کی طرح ہیں۔ صحابہ کا اجماع دلیل قطعی ہے اور باقی اجماع ظنی۔ التحیات میں اشارہ کرنا اس اجماع ظنیہ سے ثابت ہے چنانچہ شرح ابن ماجہ ص۶۵ پر ہے:۔ وَبِصُنْعِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاخُذُ وَهُوَ قَوْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ قَالَ الْقَارِيُّ وَكَذَا قَوْلُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَاَحْمَدَ ؕ۔ (ترجمہ):۔

ہم مسلمان اپنے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عمل اختیار کرتے ہوئے۔ التحیات میں اشارہ کرتے ہیں۔ یہی امام اعظم کا قول ہے قاری نے کہا اور ایسا ہی امام مالک امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مذہب ہے۔ ثابت ہوا کہ مسبحہ انگلی سے اشارہ کرنا تمام مجتہدین کے مذہب کے مطابق ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ مذکورہ فی السوال فتوے میں ابن ماجہ پر جھوٹ باندھا گیا ہے ابن ماجہ میں تو بڑے شدومد سے اشارے کو ثابت کیا جا رہا ہے جیسا کہ ابھی ثابت ہوا دلیل ع۹ فتاوٰی مالکیہ بلغۃ السالک جلد اوّل ص۱۲۰ پر ہے:۔ وَنُدِبَ عَقْدُ مَا عَدَا السَّبَابَةِ وَالْاِبْهَامِ مِنَ الْيَدِ الْيُمْنٰى حَالَ تَشَهُّدِهٖ (ترجمہ) اور تشہد کے وقت داہنی ہاتھ کی ساری انگلیوں کو بند کر لینا اور انگوٹھے وسبابہ انگلی کو نہ بند کرنا اور اشارہ کرنا مستحب ہے۔ دلیل ع۱۰ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب میں انگلی سے اشارہ کرنا سنت ہے۔ چنانچہ فقہ شافعی حاشیہ جلد اوّل ص۲۰۲ پر سنتوں کے باب میں ہے۔ وَيَقْبِضُ الْيَدَ الْيُمْنٰى اَيْ اَصَابِعَهَا اِلَّا الْمُسَبِّحَةَ مِنَ الْيُمْنٰى فَلَا يَقْبِضُهَا فَاِنَّهٗ يُشِيْرُ بِهَا رَافِعًا لَّهَا

حَالَ کَوْنِہٖ مُتَشَہِّدًا (ترجمہ) :۔ اور بند کرے داھنے ہاتھ کی انگلیاں لیکن مسبحہ انگلی نہ بند کرے بلکہ اس سے تشہُّد کی حالت میں اشارہ کرے ان ہر دو عبارات سے پتہ لگا کہ امام شافعی اور امام مالک علیہما الرحمتہ کے نزدیک التحیات میں بوقتِ شہادت انگلی سے اشارہ کرنا سنت و مستحب ہے۔ ایسے ہی امام احمدؒ کا مسلک ہے۔ دلیل ع۱۱ ہم اہلسنت حنفیوں کے ائمہ ثلاثہ کا مسلک یعنی امام اعظم ابوحنیفہ امام یوسف امام محمد رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین یہی ہے۔ موطا صـ۵۳ پر امام محمد فرماتے ہیں۔ قَالَ مُحَمَّدٌ وَبِصَنِيعِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَأْخُذُ وَهُوَ قَوْلُ اَبِي حَنِيفَةَ۔ یعنی امام محمد نے فرمایا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل شریف کو لیتے ہیں اور یہی فرمان امام اعظم کا ہے۔ اسی طرح فقہ حنفی کی مشہور کتاب شامی جلد اوّل صـ۵۰۷ پر ہے۔ اور شرح ترمذی قوت المقتذی حاشیہ ترمذی صـ۳۹ پر ہے :۔ وَيُحَلِّقُ الْوُسْطٰى وَالْاِبْهَامَ وَيُقِيمُ الْمُسَبِّحَةَ وَكَذَا عَنْ اَبِي يُوسُفَ فِي الْاَمَالِي۔ ترجمہ:۔ اور درمیانی انگلی سے اور انگوٹھے سے حلقہ بنائے اور مسبحہ انگلی کو کھڑا کرے ایسا ہی امام یوسف کا مذہب ان کی کتاب امالی میں درج ہے اب تک احادیثِ متعددہ اور مجتہدینِ معظمؒ سے ہم نے اپنے مسلک پر گیارہ دلائل پیش کیے جن سے واضح ہوا کہ تمام اکابر مجتہدین کا مسلک و مذہب یہی ہے کہ التحیات میں انگلی ضرور اٹھائی جائے اب وہ کون سے مجتہد ہیں جن کے قیاس کو احادیثِ کثیرہ پر مجدد صاحب اور ان کے ہم عصر بزرگوں نے فوقیت دی اور جن کے عقلی قول کو فرمودات ائمہ اربعہ و صواحب احناف سے بالاتر سمجھا۔ دلیل ع۱۲ ابھی تک تو تمام مذاہب کے مجتہدین کے مسالک بیان کیے گئے اب شارحین و محشیین حضرات کے اقوال بھی ملاحظہ ہوں ملا علی قاری مشکوٰۃ جلد اوّل صـ۵۵۳ پر فرماتے ہیں :۔ وَعِنْدَنَا يَرْفَعُهَا عِنْدَ لَا اِلٰهَ وَيَضَعُهَا عِنْدَ اِلَّا اللّٰهُ لِمُنَاسَبَةِ الرَّفْعِ لِلنَّفْيِ وَمُلَائِمَةِ الْوَضْعِ لِلْاِثْبَاتِ وَمُطَابَقَةٍ بَيْنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ حَقِيقَةً۔ (ترجمہ)۔ ہمارے نزدیک مذہب یہ ہے کہ لَآ اِلٰہ کے وقت انگلی اٹھائے اور اِلَّا اللہ کے وقت انگلی رکھ دے تاکہ نفی کے لیے اٹھانے کی مناسبت اور ثبوتِ توحید کے لیے رکھنے کی ملائمت ہو اور قول و فعل حقیقۃً مطابق ہو جائیں۔ دلیل ع۱۳ امام نووی مالکی شارح مسلم شریف جلد اوّل کے صـ۲۱۶ پر فرماتے ہیں :۔ اَمَّا الْاِشَارَةُ بِالْمُسَبِّحَةِ فَمُسْتَحَبَّةٌ عِنْدَنَا لِلْاَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ :۔ ترجمہ :۔ لیکن اشارہ کرنا مسبحہ انگلی سے پس ہمارے نزدیک مستحب ہے کیونکہ بہت سی صحیح احادیث سے اشارہ کرنا ثابت ہے۔ دلیل ع۱۴ کتاب بذل المجہود شرح ابوداؤد جلد دوم صـ۱۲۶ پر ہے اَيِ الْاِشَارَةُ بِالْاُصْبُعِ الْمُسَبِّحَةِ مِنَ الْيَدِ الْيُمْنٰى عِنْدَ الشَّهَادَةِ بِالتَّوْحِيدِ لِاَنَّهَا سُنَّةٌ لِثُبُوتِهِ بِالْاَحَادِيثِ الصَّرِيحَةِ الصَّحِيحَةِ وَعَدَمِ ثُبُوتِ تَرْكِهِ بِالْحَدِيثِ الصَّحِيحِ بَلْ

وَالضَّعِیْفِ وَلَا بِقَوْلِ الْاَئِمَّةِ (ترجمہ)۔ مسبحہ انگلی سے اشارہ کرنا تشہد کے وقت جائز ہے اس لیے کہ اس کا سنت ہونا بہت سی صریح واضح اور صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اس اشارے کے چھوڑنے کا کہیں ثبوت نہیں نہ صحیح حدیث میں نہ ضعیف روایت میں اور نہ ہی مجتہد اماموں کے قول میں یہ تھے وہ دلائل جو شارحین کرام کی کتب معتبرہ سے ماخوذ ہیں ہم نے روایت و درایت سے ثابت کر دیا۔ کہ التحیات میں انگلی اٹھانا ضروری اور استدلالی حکم ہے عقلی دلیل ع۱۵ عقل بھی چاہتی ہے کہ یہ انگلی تشہد کے وقت ضرور اٹھائی جائے۔ اس لیے کہ اللہ رب العزت نے انسان کے ہاتھ پیر میں بیس انگلیاں۔ عطا فرمائیں ان چاروں ہاتھ پاؤں میں اصل ہاتھ جس کو ہر طرح فضیلت حاصل ہے وہ داہنا ہاتھ ہے اس کی پانچ انگلیوں کے عربی میں مخصوص نام ہے۔ ع۱ چھوٹی انگلی خنصر ع۲ بنصر ع۳ وسطے ع۴ اس کے اس کے ساتھ والی انگلی کو زمانہ جاہلیت میں سبابہ کہتے تھے کیونکہ لڑائی کے وقت اس کے اشارے سے گالیاں دی جاتی تھیں لفظ سبابہ مؤنث ہے سباب کا سباب سبّ کا صیغہ مبالغہ ہے بروزن فعّال بمعنی بہت گالیاں دینے والے سبابہ بمعنے بہت گالیاں دینے والی انگلی۔ اس ہاتھ کی اتباع میں دوسرے ہاتھ پاؤں کی ان انگلیوں کے بھی یہی نام ہوئے۔ شریعت پاک نے جب سے تشہد کے اشارے کا مسنون حکم عطا فرمایا تو اس کا اس انگلی کا نام مسبحہ رکھ دیا گیا۔ مگر یہ نام خود سرے ہاتھ کی انگلی کا ہوا نہ پیر کی اس انگلی کا کیونکہ مسبحہ اسم مفعول مؤنث سبح کا ہے بمعنی التسبیح کی ہوئی چونکہ اس سے تشہد کا اشارہ ہوتا ہے اسی لیئے اس کا نام مسبحہ ہوا ہماری اصطلاح میں اس کو شہادت کی انگلی کہتے ہیں۔ فارسی لغت میں اس کو انگشتِ شہادت کہتے ہیں یہ نام شریعت پاک اہلِ اصطلاح لغت نے اسی لیئے دیا کہ اس سے اشارہ کیا جاتا ہے چنانچہ حاشیہ ابوداؤد ص۱۴۲ اور مرقات شرح مشکوٰۃ جلد اوّل ص۵۵۵ پر ہے۔ قَالَ ابْنُ حَجَرٍ سُمِّیَتْ بِالسَّبَّابَةِ لِاَنَّهٗ کَانَ یُشَارُ بِهَا عِنْدَ الْمُخَاصِمَةِ وَالسَّبِّ وَسُمِّیَتْ اَیْضًا مُسَبِّحَةً لِاَنَّهٗ یُشَارُ بِهَا اِلَی التَّوْحِیْدِ وَالتَّنْزِیْهِ وَهُوَ التَّسْبِیْحُ۔ (ترجمہ)۔ وہی ہے جو اوپر بتایا۔ دلیل ع۱۲ دوسری عقلی دلیل اشارے کرنے سے شیطان کو دور کرنا اور بھگانا ہے اور یہ اشارہ مثل ہتھیار کے ہے جس سے شیطان کو خنجر جیسی ضرب لگتی ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص۵۸ پر ہے۔ فصل ثالث:۔ عَنْ نَافِعٍ قَالَ کَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اِذَا جَلَسَ فِی الصَّلٰوةِ وَضَعَ یَدَیْهِ عَلٰی رُکْبَتَیْهِ وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهٖ وَاَتْبَعَهَا بَصَرَهٗ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَهِیَ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنَ الْحَدِیْدِ یَعْنِیْ سَبَّابَةَ۔ اس حدیث پاک سے جہاں اشارے کی عقلی حکمت ثابت ہوئی وہاں فقہاءِ صحابہ کا عمل بھی ثابت ہوا رسائلِ ابن عابدین ص۱۲۵ پر ہے اَخْرَجَ اِبْنُ السَّکَنِ فِیْ صِحَاحِهٖ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاشارۃ بالاصبع اشد علی الشیطان من الحدید

وعنہ ایضا عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال ھی مذعرۃ الشیطان (ترجمہ)

ابن سکن نے اپنی صحاح میں حدیث بیان کی کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کہ اشارہ انگلی سے زیادہ سخت ہے شیطان پر لوہے سے اور انہی سے روایت ہے کہ روایت ہے نبی کریم علیہ التحیۃ والثناء آپ نے فرمایا وہ (اشارہ) شیطان کو بھگانے والا ہے۔ سعایہ جلد دوم صفحہ ۲۱۹ پر ہے کہ اشارہ کرنے سے وسوسے پیدا نہیں ہوتے اور نماز میں خشوع پیدا ہوتا ہے۔ دلیل ۱۷ تیسری عقلی دلیل سعایہ جلد دوم صفحہ ۲۱۷ پر ہے:۔

وروی عبد الرزاق عن ابن التیمی قال سئل ابن عباس عن الاشارۃ فی الصلوٰۃ فقال ذالک الاخلاص وروی الحاکم فی تاریخہ کما اوردہ السیوطی فی الجامع الکبیر عن عقبۃ بن عامر قال یکتب فی کل اشارۃ یشیر بھا الرجل فی صلاتہ عشر حسنات (ترجمہ):۔ روایت کیا عبد الرزاق امام نے ابن تیمی سے انہوں نے فرمایا کہ صحابی پاک حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نماز میں اشارے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وہ اشارہ اخلاص پیدا کرنے والا ہے اور حاکم نے اپنی تاریخ میں روایت کیا جیسا کہ امام سیوطی نے جامع کبیر میں عقبہ ابن عامر سے روایت کیا فرمایا کہ ہر اس اشارے کے بدلے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں جو نمازی شخص نماز میں کرے یعنی ایک اشارے میں دس نیکیاں۔ مقام غور ہے جس میں فعل اتنے فوائد اور اتنی حکمتیں ہوں عقل کے نزدیک وہ منع کیوں ہوگا؟۔ لہٰذا عقل کے نزدیک بھی یہ اشارہ اچھا ہے۔ دلیل ۱۸ داہنے ہاتھ کو عربی میں یمین کہتے ہیں یمن سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں برکت۔ لہٰذا یہ ہاتھ سارے جسم میں برکت والا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے اس کی انگلی مسبحہ کی رگ قلب جسمانی سے متعلق۔ اسی لیے شریعت پاک نے اشارہ نماز کے لیے داہنے ہاتھ کی مسبحہ انگلی کو اشارۂ توحید کے لیے مخصوص فرمایا کہ اسکی حرکت سے قلب کو حرکت اور قلب میں تصدیق ایمانی کیونکہ قلب مومن ہی مرکز شریعت و طریقت ہے چنانچہ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف جلد اوّل صفحہ ۵۵۴ پر ہے:۔ ثم خصت المسبحۃ لانھا لھا اتصال بنیاط القلب فکان سببا لحضورہ والیمنی من الیمن بمعنی البرکت (ترجمہ) وہی ہے جو اوپر گذرا۔ یعنی صرف مسبحہ انگلی سے اشارہ جائز ہے جو صرف داہنے ہاتھ میں ہے۔ اسی لیے نووی شریف مسلم نے صفحہ ۲۱۶ پر فرمایا:۔ ویشیر بمسبحۃ الیمنی لا غیر۔ (ترجمہ):۔ اور اشارہ صرف داہنے ہاتھ کی مسبحہ انگلی سے کرے نہ کہ اس کے علاوہ کسی اور سے چنانچہ ایک دفعہ کسی نمازی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آپ کی موجودگی میں لاعلمی سے درمیانی اور شہادت کی دونوں انگلیوں کو اشارہ میں اٹھا دیا تھا

تو نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فوراً منع فرمایا چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب التشہد فصل ثانی صـ۵۸ پر ہے:۔ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اِنَّ رَجُلًا كَانَ یَدْعُوْا بِاِصْبَعَیْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحِّدْ اَحِّدْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَالْبَیْهَقِیُّ۔ ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ بے شک ایک نمازی اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے یعنی وسطے اور مسبحہ سے اشارہ کر رہا تھا تو حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک سے اشارہ کر۔ اس حدیث پاک کو ترمذی اور نسائی جلد اوّل نے صـ۱۸۷ پر اور بیہقی شریف نے بھی اپنی کتاب دعواتِ کبیر میں روایت کیا اس حدیث پاک سے ایک تو عقلی دلیل ثابت ہوئی کہ دل کی تصدیق والی صرف ایک مسبحہ انگلی ہے تو دوسری کو کیوں شامل کر رہا ہے پھر شار الیہ رب تعالیٰ واحد ہے تو اشارہ دو انگلیوں سے کیوں ہو۔ دوسری اس حدیث پاک سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ التحیات میں تشہد کے وقت مسبحہ انگلی سے اشارہ کرنا صرف عملی سنت نہیں بلکہ قولی اور حکمی بھی ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود بھی اشارہ فرمایا جیسا کہ ابھی پہلے بہت سی احادیث صحیحہ سے ثابت کیا گیا۔ اور اس اشارہ کا حکم بھی دیا جیسا کہ اس حدیث سے ثابت ہوا۔ دلیل عـ۱۹ عقلی پانچویں دلیل۔ سابقہ امتوں میں کسی کو رب کریم نے صرف شریعت پاک کی نعمت عطا فرمائی کسی امت کو صرف معرفت و طریقت کی نعمت سے نوازا مگر کتنا عظیم کرم ہے اس خالق ارض و سما کا جس نے اپنے حبیب کریم رؤف و رحیم کے طفیل ہم امت مسلم کو شریعت و طریقت دونوں نعمتوں سے نوازا اور یہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ جس کو انعام زیادہ اس پر شکر بھی زیادہ واجب پس ہم پر شریعت کے طریقے کا شکر بھی واجب اور معرفت کے طریقے کا بھی۔ اور شکر نام ہے اظہارِ عبودیت کا اور اقرارِ وحدانیت کا اور نماز جو مومن کی معراج ہے سب سے بڑا مقامِ شکر ہے۔ اس لیے ہم پر زبان سے تشہد پڑھ کر شرعی شکر بھی لازم اور انگلی سے نفی اثبات کر کے طریقت کا شکر بھی لازم ہاں چونکہ شریعت غالب ہے اس لیے کہ ظاہر ہے لہٰذا شرعی شکر واجب ہوا۔ اور طریقت مقامِ محبت ہے اس لیے کہ باطن اس لیے شکر بھی واجب نہ ہوا بلکہ سنتِ مؤکدہ۔ ظاہر کا شکر بھی ظاہر زبان کے کلمات سے اور باطنی کا شکر بھی صرف باطنی اشارے سے اب سوچنے کا مقام ہے کہ ہم اتنی عظیم الشان اتنی عقلیہ و نقلیہ دلائل کے ہوتے ہوئے صرف چند غیر مجتہد اکابر متاخرین کی بات کس طرح مان سکتے ہیں۔ اَن پڑھ اور کم علم حضرات کی بات نہیں کرتا البتہ مجدد صاحب قدس سرہ کے معتقد پڑھے لکھے سمجھدار متبحر علماء کرام بھی مجدد صاحب کی اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اور وہ بھی اشارہ کرنے کے جواز پر شدت سے قائم اور مکتوبات شریف کے اس مسئلے کو ناقابل فہم سمجھتے ہوئے اس کی عدم تائید میں بات کرتے ہیں۔ چنانچہ دلیل عـ۲۰ کے تحت

حاشیہ انجاح الحاجہ شرح ابن ماجہ کے مصنف محشی الشیخ عبدالغنی دھلوی مدنی جو مجددی ہیں یعنی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کی نسبت مریدی رکھتے ہیں جن کا انتقال ۱۲۹۵ھ ہجری میں ہوا بڑے کروفر سے اس مسئلے میں مجدد صاحبؒ کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اسی طرح خود مکتوبات شریف کے محشی مولانا نواز احمد نقشبندی مجددی امرتسری جو شیخ العرفا حضرت شاہ ابوالخیر مجددی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کے خلیفہ تھے اس مکتوب گرامی کی تائید نہ کرتے ہوئے شیخ اعظم امام ربانی کی ہر بات کا جواب دیتے چلے جاتے ہیں اور ظاہر ظہور الفاظ میں یہ ثابت کر رہے ہیں کہ التحیات کا اشارہ نہ صرف جائز بلکہ اشد ضروری ہے۔ اور مفید ہے۔ اتنے کثیر دلائل سے ہم نے ثابت کر دیا کہ بوقت تشہد انگشتِ شہادت اٹھانا بہت ضروری ہے اور اٹھانے والا گنہگار نیکیوں اور انعامات الٰہیہ خصوصیہ سے محروم۔ لیکن چونکہ فی زمانہ ہمارے بعض نقشبندی حضرات اور بزرگ دوست بالکل ہی ناسمجھی کی بنا پر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم وآلہٖ وبارک وسلم کے فرمودات اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کی احادیث کے مقابل اور مجتہدین کرام کے فرمودات سے ہٹ کر اشارہ کرنے کے خلاف لاعلمی سے نہایت بے باکانہ زبان کھول دیتے ہیں صرف اس لیے کہ مکتوبات میں لکھا ہے۔ اور اسطرح وہ اپنے سچے مرید ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ پیری مریدی ولایت وصوفیت سب بعد کی چیزیں ہیں سب سے زیادہ تو آقائے کائنات علیہ التحیۃ والثنا کی غلامی واتباع لازم ہے کہ اسی کے صدقے میں سب کو مدارج و مرتبے حاصل ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سب کو نبی پاک صاحبِ لولاک کی وجہ سے مانو۔ مگر بہت سے لوگ اس کو نہیں سمجھتے اس لیے بامر مجبوری ہم مکتوبات شریف کے اُس مذکورہ فی السوال مکتوب کی چند چشم پوشیاں ظاہر کرتے ہوئے ان کا مکمل جواب عرض کرتے ہیں۔ اللہ کریم ہم سب کو سچی سمجھ عطا فرمائے۔ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ عَلٰی اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ۔ مکتوبات صفحہ ۱۶۳ پر فرماتے ہیں۔

از روایاتِ نوادر است نہ روایاتِ اصول۔ ترجمہ۔! یعنی جتنی بھی احادیث اشارے کے حق میں وارد ہوئیں وہ تمام اصولی احادیث نہیں ہیں بلکہ نوادر یعنی اجنبی ہیں **جواب** ۔ مجدد صاحب کی یہ بات مدلل نہیں۔ اس لیے کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ لفظ نادر کسی حدیث کا نام نہیں محدثین کرام نے جو اسماء احادیث کے لیے منتخب کیے ہیں اس فہرست میں لفظِ نادر کا نشان تک نہیں ملتا۔ نہ معلوم مکتوبات میں یہ لفظ کہاں سے آگیا اور کیا اس کی مراد ہے اس لیے اس بات کو نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ آگے فرماتے ہیں۔ ھٰذَا مَاذَکَرُوْا وَالصَّحِیْحُ اَنَّ الْاِشَارَۃَ حَرَامٌ۔ ترجمہ۔ یعنی وہ احادیث وا قوال ہیں جو فقہاء امت اور مجتہدین ملت نے ذکر کیے اور صحیح یہ ہے کہ اشارہ حرام ہے **جواب**۔ کتنی حیران کن

لغزش ہے کہ فقہاءِ کرام تو اشارہ کے ثبوت میں ایسی مضبوط و مستند احادیث پیش کریں جن کو متواتر بالمعنٰی کا درجہ دینا پڑے مگر یہ چند احباب یک دم سب پر پانی پھیرتے چلے جائیں۔ اور بغیر کسی دلیل کے حرام جیسی سخت چیز کا حکم وارد کردیں مصنف قدس سرہٗ آگے فرماتے ہیں۔ ہرگاہ در روایات معتبرہ حرمتِ اشارت واقع شدہ باشد۔ ترجمہ۔ یعنی جب کبھی معتبر روایات اشارے کی حرمت پر واقع ہوگی۔ تو وہ اصولی ہوگی۔
جواب۔ کیسی عجیب عبارت اور کیسا انوکھا مسئلہ ہے۔ گویا کہ جواز اشارہ پر تو احادیث نبوی علٰی مصدرہا الصلوٰۃ والسلام بسیار وارد شدہ اند۔ بہت وارد ہوچکی ہیں ان کو تو میں نہیں مانتا لیکن اگر کبھی حرمت پر روایات وارد ہوں تو وہ اصولی ہوں گی اور ان کو ایک دم مان لیں گے اگرچہ انتظار میں عمر بیت جائے اس عبارت میں لفظ شدہ باشد ماضی احتمالی ہے جو شک کو پیدا کرتی ہے۔ کہ شاید ایسی روایات آچکی ہوں جو شک کو پیدا کرتی ہیں۔ نہ معلوم وہ روایات کہاں ہیں جواب تک نہ خود ان کو نظر آئیں نہ مجھ کو نظر آئیں نہ امام اعظم کو نظر آئیں نہ امام مالک شافعی و امام احمد کو رضی اللہ تعالٰی عنہم اجمعین نہ شارحین کو نظر آئیں نہ فقہاء کو نہ متقدمین کو نہ متاخرین کو صرف ایک احتمال پر پورا مسئلہ کھڑا کردیا گیا ص۱۶۴ پر فرماتے ہیں ما مقلدان را نمی رسد کہ بمقتضائے احادیث عمل نمودہ جرأت در اشارت نمائیم و بہ فتاوٰئے چندیں علماءِ مجتہدین مرتکب امرِ محرم و مکروہ و منھی گردیم۔ ترجمہ۔ یعنی ہم مقلدوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان احادیث کے حکم پر کریں۔ اور عمل کرکے اتنے مجتہدین علماء کے فتوے کی رو سے حرام اور مکروہ ممنوع کام کے مرتکب ہوجائیں۔ **جواب** اس عبارت کے پہلے الفاظ اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہت سخت ہیں اگر یہ الفاظ امام ربانی کے نہ ہوتے تو نہ معلوم اس پر کیا فتوٰی لگتا۔ رہا یہ کہنا کہ چندیں علماءِ مجتہدین اتنے علماءِ مجتہدین کے فتوے تو یہ سراسر نادرست ہے۔ اس لیے کہ تمام مجتہدین فی الاصول و فی الفروع کا مسلک باحوالہ کتب ہم پہلے بیان کرچکے کہ سب کے سب مجتہدین اصولی ہوں یا فروعی اشارے کے قائل ہیں انگشت شہادت کے اشارے کو نماز میں ضروری اور مفید سمجھتے ہیں کسی مجتہد نے اشارے کا انکار نہ کیا بلکہ صرف آٹھ دس علماء جو اپنے وقت کے صرف مفتی تھے انہوں نے ہی اپنی ذہنی دلیل سے اشارے کا انکار کیا چنانچہ حاشیہ موطا امام محمد ص۱۰۶ پر ہے:۔ مِنْ اَصْحَابِ الْفَتَاوٰی کَصَاحِبِ الْخُلَاصَۃِ وَالْبَزَّازِیَۃِ وَالْکُبْرٰی وَالْعَقَائِدِ وَالْغِیَاثِیَۃِ وَالْوَلْوَالِجِیَۃِ وَعُمْدَۃِ الْمُفْتِیْ وَالظَّھِیْرِیَۃِ وَغَیْرِھَا حَیْثُ ذَکَرُوْا اَنَّ الْمُفْتٰی بِہٖ ھُوَ عَدَمُ الْاِشَارَۃِ۔ ترجمہ:۔ صرف چند صاحب فتوٰی لوگ ہیں جیسے کہ مصنف خلاصہ ع۱ اور ع۲ بزازیہ اور کبرٰی ع۳ اور مصنف عقائدیہ ع۴ اور صاحب غیاثیہ ع۵ اور ع۶ مصنف فتاوٰی کا ع۷ والوالجیہ۔ اور عمدۃ المفتی ع۸ اور مصنف فتاوٰی ظہیریہ وغیرہ

کہ انہوں نے اشارے کو نہ اختیار کیا۔ ثابت ہوا کہ ان بزرگوں نے صرف اپنی مرضی سے اشارے کو حرام اور مکروہ و ممنوع کہا ہے کسی شرعی دلیل سے نہیں یہ لوگ مجتہد نہیں مجدد صاحب نے خواہ مخواہ ان کو مجتہد کہہ دیا۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ اس عبارت میں حرام مکروہ ممنوع تینوں حکم بیکدم وارد کیے ہیں حالانکہ اگر حرام سے حرام قطعی مراد ہے تو اس عبارت سے اجتماع ضدین لازم آتا ہے کیونکہ حرام قطعی اور مکروہ میں نسبت تباین ہے۔ اور مجھ کو اس بات پر بالکل تعجب نہیں کہ مجدد صاحب قبلہ بلا دلیل حرام مکروہ ممنوع کہتے چلے گئے۔ اور کسی حکم پر کوئی دلیل پیش نہ فرمائی اس لیے کہ ان تمام بزرگوں کے پاس اس مسئلے میں کوئی دلیل ہے ہی نہیں میں نے تمام کتب کا مطالعہ بغور کیا بجز عبارات تفسیہ کے کچھ نہ پایا۔ آگے فرماتے ہیں کہ مارا علم بآں دلیل نیست :۔ ترجمہ۔ یعنی ہم کو حرمت یا کراہت کی اس دلیل کا علم نہیں جس دلیل کی بنا پر ہمارے مقتیوں نے اشارے کو حرام قرار دیا۔ جواب:۔ گویا کہ مجدد صاحب قبلہ اس بات کے قائل و معترف ہو گئے کہ ان مخالفین بزرگوں نے صرف حرمت و کراہت پر زور دیا دلیل کو ظاہر نہ کیا کیونکہ اگر ظاہر کرتے تو مجدد صاحب علیہ الرحمتہ کو ضرور علم ہوتا مگر اس لاعلمی کے باوجود پھر ان بزرگوں کی بات تسلیم کرنا اور منکرین میں شامل ہونا محض ادب اور احترام ہی ہے جو مجدد صاحب نے ان بزرگوں کا کیا ورنہ بہتر یہ تھا کہ صاف کہہ دیا جاتا کہ یہ مسئلہ بے دلیل ہے اس لیے ناقابل قبول۔ آگے لکھتے ہیں۔ دریں باب ظنِ مجتہد معتبر است۔ ترجمہ :۔ اس باب میں مجتہد کی ظنی بات معتبر ہے۔ جواب :۔ یہ قاعدہ جزئیہ مجتہد کے لیے تو درست ہو سکتا ہے مگر جن کا حوالہ پکڑ رہے ہو وہ تو مجتہد ہی نہیں ان کا ظن کیا حقیقت رکھتا ہے۔ اور پھر علم اصول کے مطابق جب صریح صحیح حدیث پاک موجود ہو تو مجتہد اعظم کی بات بھی معتبر نہیں چہ جائیکہ کسی گھریلو مجتہد کی ان عبارات سے ثابت ہوا کہ مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ جیسے مفکر اسلام معزز ترین ہستی کو بھی اس مسئلہ میں کوئی دلیل نہ ملی تو ما و شما کس شمار میں ہے۔ اگرچہ یہاں تک ہی پتہ لگ کر یہ مسلک بے دلیلا ہے۔ مگر ہم اتمام حجت کے لیے ابھی کچھ اور عرض کرتے ہیں۔ چنانچہ۔ آگے لکھتے ہیں کہ۔ و ظاہر اصول اصحاب حنفیہ را باطل ساختن۔ ترجمہ :۔ یعنی اشارہ کی حرمت و کراہت کو نہ ماننا حنفی اصحاب کی ظاہر اصولی بات کو باطل کرنا ہے :۔ جواب :۔ علماء احناف کو خواہ مخواہ ملوث کیا جا رہا ہے۔ ہم نے پہلے بتا دیا کہ تمام حنفی از امام یوسف تا ایں زمانہ امام اعظم کی اسی بات کو تسلیم کرتے چلے آرہے کہ التحیات میں مسبحہ انگلی سے اشارہ کرنا سنتِ مؤکدہ ہے۔ وہ حضرات جو اس کے منکر ہیں۔ جن کا ہم نے ذکر کیا وہ تقریباً مجدد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہم زمانہ ہیں وہ اگر حنفی ہیں تو ان کو ہرگز جائز نہیں کہ اشارے کا انکار کریں۔ کیونکہ کسی مقلد کو جائز نہیں کہ اپنے امام کی مخالفت کرے یا مخالف فتویٰ دے۔ چنانچہ عقود رسم المفتی صد ۲۳ پر ہے۔

لَيْسَ لِلْقَاضِيْ وَلَا لِلْمُفْتِيْ الْعُدُوْلُ عَنْ قَوْلِ الْإِمَامِ :- (ترجمہ) ۔ کسی حنفی یا غیر حنفی قاضی اور مفتی کو جائز نہیں کہ اپنے امام کے قول سے علیحدہ ہو۔ مصنف علیہ الرحمۃ نے جن بزرگوں کو حنفی اور مجتہد کہا ہے وہ نہ حنفی معلوم ہوتے ہیں نہ مجتہد حنفی تو اس لیے نہیں کہ اگر حنفی ہوتے تو کبھی امام اعظم اور امام محمد و امام یوسف کی مخالفت میں اپنا مسلک نہ بناتے اور مجتہد اس لیے نہیں کہ کسی نے بھی ان کو مجتہد نہ مانا اور اگر فرضًا ان کو مجتہد مان بھی لیں تو مجتہد کے لیے بھی جائز نہیں کہ ائمہ اربعہ کے خلاف کوئی بات کرے ۔ چنانچہ عقود رسم المفتی ص۱۷ پر ہے ۔ وَيُفْتِيْ بِقَوْلِهِمْ وَلَا يُخَالِفُهُمْ بِرَأْيِهٖ وَإِنْ كَانَ مُجْتَهِدًا مُتْقِنًا ۔ (ترجمہ) اور حنفی عالم اپنے اماموں کے قول پر ہی فتویٰ دے قطعًا ان کے فرمودات کی مخالفت نہ کرے اپنی رائے سے اگرچہ یقینی مجتہد ہو۔ کیونکہ ان کا اجتہاد اس کے اجتہاد سے بہتر ہے ۔ اس لیے کہ وہ اصولی و فروعی مجتہد ہیں اور یہ محض تصحیح و تخریج کا ۔ یہی وجہ ہے ائمہ اربعہ کے سوا نہ کسی کا قول جائز نہ کسی کی تقلید جائز ۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اول ص۴۴ ۔

لَا يَجُوْزُ إِحْدَاثُ قَوْلٍ خَارِجٍ عَنِ الْمَذَاهِبِ الْأَرْبَعَةِ	چار مذہبوں کے علاوہ کوئی مسئلہ بنانا قطعًا ناجائز ہے :۔

چاروں مجتہدین کے اقوال اور مجتہدین فروع وغیرہم کے مذاہب تو ہم پہلے بتا چکے کہ وہ اشارے کو جائز کہتے ہیں یہ کیسے بزرگ ہیں کہ سب سے ہٹ کر بات کر رہے ہیں ماننا پڑے گا کہ یہ مجتہد نہیں ۔ امام شیخ احمد طاب ثراہ آگے ص۱۶۵ پر فرماتے ہیں ۔ روایاتِ احادیث در کیفیتِ اشارت و عقد اختلاف بسیار دارند و کثرتِ اختلافِ ایشاں اضطراب در نفسِ اشارت پیدا کردہ است ۔ ترجمہ ۔ انگلیاں باندھنے اور اشارہ کرنے کے طریقے میں احادیث کی روایتوں میں اختلاف بہت ہے ۔ اور اس اختلاف کی زیادتی نے خود اشارہ کرنے میں اضطراب پیدا کر دیا ہے :۔

جواب

مکتوب کی یہی وہ عبارت ہے جس کی بناء پر مذکورہ فی السوال فتوے میں تمام صحیح احادیث کو فقط بے علمی سے مضطرب کہہ دیا ۔ حالانکہ امام ربانی نے حدیث کو مضطرب نہ فرمایا بلکہ فقط ذاتی اضطراب یعنی پریشانی کا ذکر فرمایا اگرچہ میرے نزدیک اختلافِ کیفیت کے باوجود نہ مضطرب ہے نہ اضطراب جیسا کہ ابھی بیان کیا جائے گا ۔ خیال رہے لفظ اضطراب اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہوتا ہے یعنی پریشانی لیکن لفظِ مضطرب علم اصولِ حدیث کے مطابق ایک مخصوص لفظ ہے اور اسماء احادیث میں اس حدیث کا نام ہے جس میں اختلاف ہو ایسا کہ دور نہ کیا جا سکے چنانچہ رسالہ اصولِ حدیث للجرجانی ص۳ پر ہے ۔ اَلْمُضْطَرِبُ مَا اخْتَلَفَ الرُّوَاةُ فِيْهِ ۔ ترجمہ ۔ مضطرب وہ حدیث ہے جس میں روایت کا اختلاف ہو ۔ مضطرب کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم مضطرب فی الاسناد دوسری قسم مضطرب فی المتن چنانچہ مقدمہ مشکوٰۃ شریف ص۳ پر ہے ۔ وَإِنْ وَقَعَ فِيْ إِسْنَادٍ أَوْ مَتْنٍ اخْتِلَافٌ مِنَ الرُّوَاةِ (الخ) فَالْحَدِيْثُ مُضْطَرِبٌ (ترجمہ)

ترجمہ اگر اسناد یعنی سلسلہ رواۃ یا متن میں روایت کی وجہ سے اختلاف واقع ہو تو اس کو حدیث مضطرب کہتے ہیں۔ مضطرب فی الاسناد یہ ہے کہ ایک شیخ کی طرف سے مختلف لوگ روایت کریں اور ان میں کسی شخص کا حسب نسب معلوم نہ ہو سکے نہ یہ پتہ لگے کہ یہ لوگ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ اور پھر حدیث سے شیخ کا بھی علم نہ ہو سکے یا کسی اسناد میں شیخ کے باپ کی طرف نسبت روایت ہو کسی میں شیخ کے دادا کی طرف ایسی حدیث مضطرب کہلاتی ہے اور ضعیف ہوتی ہے۔ مضطرب فی المتن یہ ہے کہ دو ثقہ اسناد سے ایک ہی حدیث مروی ہو۔ محدث بھی ایک ہو نسبت بھی ایک ہی کی طرف ہو۔ مگر الفاظ حدیث بالکل جداگانہ ہوں حکماً بھی عبارۃً بھی۔ مثلاً ترمذی شریف میں ہے۔ عَنْ فَاطِمَةَ سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الزَّكَاتِ فَقَالَ اِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ :۔

ترجمہ۔ فاطمہ بنت قیس سے روایت ہے کہ نبی کریم سے پوچھا گیا زکوٰۃ کے بارے تو آپ نے فرمایا بیشک مال میں البتہ حق ہے زکوٰۃ کے سوا۔ یہی حدیث انہی فاطمہ سے ابن ماجہ سے انہی الفاظ میں روایت ہوئی تو متن حدیث اس طرح بدل گیا۔ لَيْسَ فِي الْمَالِ حَقٌّ سِوَى الزَّكٰوةِ :۔ ترجمہ :۔ زکوٰۃ میں کوئی حق نہیں سوائے زکوٰۃ کے۔ دیکھو کتنا فرق پڑ گیا ترجیح کسی کو نہیں دی جا سکتی کیونکہ ہر دو طرف مضبوط اسناد ہے یہ تھیں مضطرب کی دو قسمیں اشارے والی اور احادیث میں یہ اضطراب قطعاً نہیں کیونکہ مجدد صاحب جس چیز سے پریشان ہوئے وہ متن میں ہے۔ نہ کہ اسناد میں۔ اشارے کی جتنی بھی احادیث ہیں ان میں ثبوت ہی ثبوت ہے انکار کہیں بھی نہیں اور انگشت شہادت سے اشارہ کرنے کا ہی ذکر ہے نہ کرنے کا کہیں بھی نہیں تو پھر حدیث مضطرب کیونکر ہوگی۔ مضطرب تو تب ہوتی جب کسی حدیث میں صراحتاً اشارے سے ممانعت ثابت ہوتی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ان میں کوئی حدیث مضطرب نہیں۔ اسی طرح اضطراب بھی کوئی نہیں۔ مصنف قدس سرہ کو جو اضطراب ہوا وہ ان کا تفکر ہے اس لئے کہ جنس اشارہ میں کوئی اختلاف نہیں البتہ طریقہ ادا میں پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دانستہ طور پر تین مختلف طریقے صرف امت کی سہولت کے لیے ادا فرمائے کہ کسی کی انگلیاں نرم ہوتی ہیں وہ ایک طرح اشارہ کرے کسی کی انگلیاں سخت ہوتی ہیں:۔ وہ دوسری طرح اشارہ یہ اختلاف باعث اضطراب نہیں باعث اطمینان ہے یہ سب کچھ امت کی آسانی کے لیے اسی آسانی پر امت کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن کریم کی سات قرأتیں فرما دیں کہ لوگوں کی زبانیں نرم و سخت ہوتی ہیں تو جس طرح ہر ایک کی تلاوت آسان کرنے کے لیے کلام پاک کی سات قرأتیں اسی طرح اشارہ آسان کرنے کے لیے انگلیوں کو بند کرنے کے صرف تین طریقے اگر یہ قابل اعتراض اور باعث اضطراب ہے۔ تو کل آئندہ کوئی شخص سات قرأتوں پر بھی حرمت یا کراہت کا فتویٰ لگا دے گا۔ شارحین کرام نے احادیث مطہرات کی وساطت سے اشارہ کرنے کے تین طریقے ثابت کیے ہیں۔ اور فرمایا ہے۔ کہ نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کبھی اس طرح اشارہ فرماتے کبھی اس طرح چنانچہ

حاشیہ ابوداؤد صـ۱۴۲ اور انجاح الحاجہ شرح ابن ماجہ صـ۶۴ پر ہے:۔ فِیْ کَیْفِیَّةِ عَقْدِهَا وُجُوْهٌ اَحَدُهَا اَنْ یَّعْقِدَ الْخِنْصَرَ (الخ) وَالثَّانِیْ اَنَّهٗ یَضُمُّ اِبْهَامَ (الخ) وَالثَّالِثُ اَنْ یَّقْبِضَ الْخِنْصَرَ وَالْبِنْصَرَ وَیُرْسِلَ الْمُسَبِّحَةَ وَیُحَلِّقَ الْاِبْهَامَ وَالْوُسْطٰی۔ وَالْاٰخِرُ هُوَ الْمُخْتَارُ عِنْدَنَا۔ قَالَ الرَّافِعِیُّ اَلْاَخْبَارُ وَرَدَتْ بِهَا جَمِیْعًا وَکَاَنَّهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَصْنَعُ مَرَّةً هٰکَذَا وَمَرَّةً هٰکَذَا۔ (ترجمہ):۔ انگلیوں کو اشارے کیلئے بند کرنیکے چند طریقے ہیں پہلا یہ کہ چھنگلیا اور ساتھ والی کو مکمل بند کرے ایسے کہ عقد انامل کے حساب سے انگلیوں میں ۵۳ کا عدد پیدا ہو دوسرا یہ کہ انگوٹھے کو درمیانی انگلی سے اس طرح بند کرے کہ ۲۳ کا عدد بن جائے تیسرا یہ کہ چھنگلیا اور ساتھ والی کو بند کرے انگوٹھے اور درمیانی کا حلقہ بنائے اور مسبحہ انگلی سے اشارہ کرے۔ ہمارے نزدیک پسندیدہ طریقہ آخری ہے۔ امام رافعی نے فرمایا ان طریقوں میں بہت سی احادیث آئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے گویا کہ آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کبھی اس طرح اشارہ کیا کبھی اس طرح۔ احادیث سے فقط یہ تین طریقے ثابت ہوئے جن سے دوسروں کو پریشانی لاحق ہوئی حالانکہ یہ تین مختلف طریقے لائق پریشانی نہ تھے بلکہ مفید ہیں۔ ہاں امام مالک نے ایک طریقہ اپنی سمجھ سے اور بنالیا جو صحیح نہیں صرف سمجھ کی غلطی ہے چنانچہ چوتھا طریقہ بتاتے ہوئے امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:۔ وَنُدِبَ تَحْرِیْکُهَا دَائِمًا یَمِیْنًا وَشِمَالًا۔ (بلغة السالک صـ۱۲۲ جلد اول) ترجمہ اور مستحب ہے مسبحہ انگلی کا ہلانا دائمی دائیں اور بائیں۔ یہ طریقہ صرف امام مالکؒ نے اختیار کیا باقی مسلمان اس کے خلاف ہیں امام مالک کی دلیل وہ حدیث ہے جو مشکوٰۃ صـ۸۵ پر ہے:۔ فصل ثانی کی پہلی حدیث کے آخری الفاظ ثُمَّ رَفَعَ اُصْبُعَهٗ فَرَاَیْتُهٗ یُحَرِّکُهَا یَدْعُوْ بِهَا رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالدَّارِمِیْ:۔ ترجمہ:۔ وائل بن حجر سے روایت کہ نبی کریم التحیات پڑھ کر پھر اپنی انگلی مبارک اٹھائی تو میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انگلی کو ہلاتے ہیں اشارہ کرتے ہیں آپ انگلی سے۔ امام شافعی تو فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس لیے ہلانے کا ثبوت درست نہ ہوا مگر ہمارے امام اعظم فرماتے ہیں کہ اگر اس کو ضعیف نہ بھی مانا جائے تب بھی امام مالک کا مسلک ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہاں ہے یُحَرِّکُهَا۔ جس کا ترجمہ ہے اس کو ہلاتے ہیں۔ یہ لفظ مجمل ہے یہاں یہ وضاحت نہیں ہے کہ کس طرف کو ہلاتے تھے۔ اس کا مطلب احناف کے نزدیک یہ ہے کہ اوپر نیچے کو اس طرح حرکت دیتے تھے کہ نفی میں اوپر کرتے تھے اور الا اللہ کے ثبوت کے وقت نیچے کو حرکت ادا فرماتے تھے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔ بہر حال خلاصہ یہ کہ التحیات میں شہادت کے وقت انگشت شہادت اٹھانا سنت مؤکدہ ہے۔ اور اشارے کے تین طریقے احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔

مجدد صاحب قدس سرہ اسی اضطرابِ اشارہ کو رے کر کچھ آگے مطابقتِ روایاتِ مختلفہ کا بہترین اور صحیح طریقہ بیان کرنے کے بعد خود ہی توڑتے ہوئے ایک کمزور سا اعتراض وارد فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ان مختلف کیفیتِ اشارہ والی احادیث پر عمل اس لیئے ناممکن ہے کہ ان میں کسی طریقے سے مطابقت اس لیے نہیں ہو سکتی کہ اکثر روایات میں لفظ کانَ ارشاد ہوا۔ اور کانَ کلیت اور ہمیشگی کو ثابت کرتا ہے۔ جب تمام روایات میں ہمیشگی ہے تو سب مشکوک ہو گئیں۔ کیونکہ مختلف طریقوں میں ہمیشگی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ دربسیارے از روایات لفظِ کانَ واقعشدہ است نزدِ غیر منطقیاں از رواتِ کلیہ است فَلَا یُمْکِنُ التَّوْفِیْقُ۔ ترجمہ:۔ جو اوپر بتایا ہے۔

جواب:۔ مولانا قبلہ کی یہ توجیہ خاصی کمزور ہے۔ اس لیئے کہ لفظ کانَ کسی اہل فن کے نزدیک کلیہ نہیں بلکہ نحویوں کے نزدیک یہ لفظ استمرار کے لیئے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو فعل مضارع سے ملحق کیا جائے تو ماضی استمراری بنتا ہے اور استمرار کے معنٰی تکرارِ فعل کے ہیں نہ کہ کلیت یا ہمیشگی کیلئے دوام کے لیئے مفید نہ ہو گی۔ اور اگر فرضاً یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ کانَ کُلیّت یا دوام کے لیئے ہے۔ تو پھر بھی ہم کو مضر نہیں۔ اس لیئے کہ احادیث میں لفظِ کانَ لفظِ یشیر سے مل کر آیا ہے اور کانَ یشیر کا معنٰے ہو گا کہ ہمیشہ اشارہ فرماتے تھے اور کانَ سے جنسِ اشارہ کی کلیّت ثابت ہوئی نہ کہ طریقۂ مختلفہ کی کیونکہ اختلاف واضطراب صرف نوعیت میں ہے۔ نہ کہ جنسیت میں۔ ہم نے جتنی بھی احادیث پیش کیں اُن میں صرف اشارے کا ذکر ہے نہ کہ طریقۂ ادا کا۔ اور وہاں کانَ موجود ہے۔ ثابت ہوا کہ کانَ صرف اشارے کے دوام کو ثابت کرتا ہے۔ نہ ادا کو ورنہ کانَ یُشیر نہ ہوتا کانَ یَحْلِقُ یا یَقْبِضُ ہوتا اور کان یشیر ہم کو مفید ہے۔ آگے صـ۱۶۶ پر فرماتے ہیں۔ ما بقیاس احادیثِ عدمِ رفع را ترجیح میدہیم۔ ترجمہ:۔ ہم قیاس کے ذریعے انگلی نہ اٹھانے والی احادیث کو ترجیح دیتے ہیں۔ **جواب:**۔ اس عبارت میں دو باتیں قابلِ جواب ہیں ایک یہ کہ ع۱ مجدد علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔ ہم قیاس پر عمل کرتے ہیں۔ ع۲ دوسری یہ کہ عدمِ رفع یعنی انگلی نہ اٹھانے والی احادیث پر قیاس۔ یہ دونوں باتیں قطعاً صحیح نہیں دوسری تو اس لیئے کہ عدمِ رفع کی احادیث کسی کتاب میں نہیں نہ صحیح ع۱ جامع ع۲ سنن میں نہ ع۴ مسند ع۵ معجم ع۶ مستخرج میں اور نہ ع۷ مستدرک ع۸ جزء ع۹ مفرد میں نہ رسالہ ع۱۰ غریبہ ع۱۱ ع۱۲ اربعین میں اسی طرح ع۱۳ نہ مراسیل ع۱۴ امالی ع۱۵ اطراف میں نہ ہی کسی مؤطا ع۱۶ کا تذکرہ ت میں کتبِ حدیث صرف یہی سولہ اقسام ہیں ان میں تو مجھ کو کوئی صحیح تو درکنار ضعیف روایت بھی ایسی نظر نہ آئی جس میں انگلی کے

اشارے سے منع کیا گیا ہو۔ ہمارے ان اکابر کو نہ جانے کہاں سے ایسی حدیث نظر آگئی جس کو تحریر نہ فرمانے میں کیا راز ہے۔ اور پھر یہ میری نظر کی ہی بات نہیں متقدمین و متاخرین میں سے کسی کو نظر آئی جیسا کہ ہم نے بذل المجہود جلد دوم کے صـ۱۳۶ سے ابھی پہلے، ثابت کر دیا۔ پہلی بات یہ کہ مجدد صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ ہم نے قیاس بزرگان پر عمل کیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں اس لیے کہ مجدد صاحب کے پاس اپنے مسلک کے لیے صرف دو دلیلیں ہیں جن کو اپنے اس مکتوب میں درج فرما رہے ہیں اور وہ دونوں دلیلیں عقلی ہیں۔ نہ کہ قیاسی۔ نہ اُن کو لغوی قیاس کہا جا سکتا ہے۔ نہ شرعی اصطلاحی۔ قیاس کے لغوی معنی ہیں تو لنا اندازہ کرنا چنانچہ حسامی صـ۹۶ پر ہے۔ فَالْقِيَاسُ هُوَ التَّقْدِيْرُ لُغَةً يُقَالُ قِسِ النَّعْلَ بِالنَّعْلِ اَیْ قَدِّرْهُ بِهٖ (ترجمہ) لغت میں قیاس کہتے ہیں اندازہ لگانے کو۔ جیسے کہ کہا جاتا ہے جوتی کا جوتی سے اندازہ لگاؤ یعنی برابر کرو۔ تولنے اور اندازہ کرنے کا مطلب ہے برابری۔ اور برابری تب ہو سکتی ہے جب کہ دوسری شئی بھی موجود ہو جس سے برابری کرتی ہے۔ اشارے کے مسئلے میں دوسری کون سی چیز ہے جس کے برابر کر کے آپ نے اُس کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح اصطلاحی قیاس بھی یہاں نہیں ہو سکتا اس لیے کہ شریعت میں قیاس اس کو کہتے ہیں کہ قانونِ نقلیہ کا حکم علتِ حکم کی مطابقت کی وجہ سے غیر منقول چیز پر جاری کرنا یعنی اصل کا حکم فرع پر لگانا علت کے ایک ہونے کی سے چنانچہ حسامی صـ۹۰ پر ہے۔ وَالْفُقَهَاءُ اِذَا اَخَذُوْا حُكْمَ الْفَرْعِ مِنَ الْاَصْلِ سَمَّوْا ذٰلِكَ قِيَاسًا لِتَقْدِيْرِهِمُ الْفَرْعَ بِالْاَصْلِ فِي الْحُكْمِ وَالْعِلَّةِ۔

ترجمہ:۔ اور فقہاءِ کرام نے جب لیا فرع کا حکم اصل سے تو انھوں نے نام رکھا اُس کا قیاس اُن کے برابر کرنے کی وجہ سے فرع کو اصل کے ساتھ حکم اور علت میں۔ یعنی فقہاءِ کرام نے جب ایک چیز میں ایک شرعی حکم دیکھا پھر اس حکم کی وجہ دیکھی جس وجہ سے یہ چیز شریعت نے حرام یا حلال کی ہے وہی وجہ ایک ایسی چیز میں بھی موجود تھی جس کا ذکر قرآنِ پاک میں نہیں ہے۔ تو فقہا نے اس علت اور وجہ کی بنا پر وہی حکم بذاتِ خود اس چیز میں بھی لگا دیا اور اُس کو حرام یا حلال کر دیا۔ اِسی کو قیاس شرعی کہتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ قیاس اس چیز کو کہا جائے گا جس کا ذکر اصل قانون میں نہ ہو اور اصل قانون قرآن مجید اور حدیث پاک ہے جن کا ذکر اصل میں آ گیا اُن کا قیاس ناممکن ہے۔ جب یہ سمجھ لیا تو یاد رکھو کہ انگلی کا اشارہ کرنا احادیثِ کثیرہ میں آ چکا۔ اور آقائے کائنات کے عمل اور حکم سے اُس کا جواز ثابت ہو چکا اب اس کو قیاس کرنا بالکل ہی عجیب بات ہے۔ قرآن و حدیث مُثبِت قانون ہیں قیاس مُظہِر قانون چنانچہ حاشیہ حسامی صـ۹۰ پر ہے وَالْقِيَاسُ مُظْهِرٌ وَلَيْسَ بِمُثْبِتٍ (ترجمہ) یعنی قیاس صرف حکم کو ظاہر کرنے والا ہے۔ ثابت کرنے والا اور بنانے والا نہیں۔ مُظہِر تب ہوتا ہے جب کوئی پہلے مثبت ہو جب مُثبِت ہی نہیں تو مظہر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مثبت میں شرط ہے کہ مقیس کا ذکر نہ ہو صرف علتِ مقیس کا ذکر ہو۔ لہٰذا جب مجدد صاحبؒ نے اشارے کی حرمت کو قیاسی مسئلہ بنایا تو واجب تھا کہ حرمت کی ایسی مثبت دلیل بیان کرتے جس میں قاعدۂ اصولیہ کے مطابق اشارہ کا ذکر نہ ہوتا صرف علتِ متّحدہ کا ذکر ہوتا اگر بفرضِ محال کوئی حدیث ایسے اکابر کے پاس

پاس اشارے کی ممانعت کی ہے تب بھی یہ مسئلہ قیاسی نہ رہا اصل بن گیا اور مکتوبات کی یہ بات ناقابل فہم ہو گئی۔ منطق کے لحاظ سے بھی یہ قیاس درست نہیں۔ کیونکہ منطقیوں کے نزدیک قیاس یہ ہے کہ دو ایسے قضیوں سے مرکب کیا جائے کہ جس میں پہلے کو تسلیم کر لینے سے دوسرے کا ماننا لازم ہو اسی طرح منطق کی مرقات ص ۳۰ پر ہے۔ بہر حال یہاں کوئی قیاس نہیں بنتا کیونکہ ہر لحاظ سے قیاس کے لیے مقابلے کی چیز شرط ہے مگر اس مسئلے میں مقابلے کی کوئی شئی نہیں اس لیے کہ اشارے کا مسئلہ مثبتی مسئلہ ہے کہ بہت سی احادیث میں جواز صراحتاً موجود لہٰذا مظہری قیاسی نہیں۔ ان بزرگوں نے جو دلائل پیش کیے وہ ذہنی اور عقلی ہیں شلاً ایک دلیل تو ہم نے پہلے ذکر کردی کہ اشارہ چونکہ نماز کے اطمینان کو ختم کرتا ہے لہٰذا منع اس کا ہم نے جواب بھی دے دیا تھا، یہ بھی محض عقلی اختراع ہے دوسری دلیل یہ ہے۔ کہ چونکہ رافضی شیعہ اشارہ کرتے ہیں لہٰذا اہل سنت کو نہیں کرنا چاہیے کیونکہ روافض کی مشابہت منع ہے۔ یہ بھی محض عقلی اور ذہنی بات ہے اس لیے کہ روافض انگلی کا اشارہ نہیں کرتے بلکہ وہ سلام کے وقت دونوں ہاتھوں سے مثل ماتم کے اشارہ کرتے ہیں جس کو رفع یدین کی تکرار بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور اس لیے کہ مشابہت صرف ان چیزوں میں منع ہے جو دینی شعار بن گیا ہو۔ جیسا کہ شامی میں لکھا ہے۔ ورنہ اگر ہر بات میں مشابہت منع ہو جائے تو وہ نماز پڑھتے ہیں رکوع سجود کرتے ہیں تم کچھ نہ کرو۔ وہ کپڑے پہنتے ہیں تم برہنہ رہو وہ روٹی کھاتے ہیں تم نہ کھاؤ۔ پھر تو مصیبت پڑ جائے۔ بس یہی وہ دو دلیلیں ہیں جو مخالفین کی تمام کتب میں درج ہیں۔ جن کا مکمل و مدلل ہم نے جواب دے دیا اور دلائل کثیرہ سے اپنا مسلک ثابت کر دیا کہ التحیات میں تشہد کے وقت لَا اِلٰہ پر انگشت شہادت اٹھائے اور اِلَّا اللہ پر نیچے رکھ دے اس طرح حرکت دے کہ اشارہ کرے کہ دو انگلیوں کو مکمل بند کرے اور تیسری انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنائے۔ یہ اشارہ سنتِ مؤکدہ باعثِ ثواب ہے ترک کرنے سے گناہِ صغیرہ لازم آتا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم۔

کتاب الجمعہ

جمعہ کے دن قانونی چھٹی کرنا ضروری ہے

سوال نمبر ۲۶ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ۔ جمعۃ المبارک مسلمانوں کے نزدیک اور اتوار عیسائیوں کے نزدیک مقدس دن ہے مسلمانوں کے لیے ان دونوں دنوں میں کونسا

دن عام تعطیل کے لیے بہتر ہے۔ جس میں ملکی اور انفرادی طور پر ہفتہ وار تعطیل کی جائے۔ اب جب کہ ہمارے ملک پاکستان میں ہفتہ وار چھٹی قانونی طور پر جمعہ مقرر ہو چکا ہے تو بعض نام نہاد مسلمان اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں کہ اس چھٹی کا کوئی جواز نہیں۔ کبھی کہتے ہیں اس چھٹی سے لوگ غفلت میں پڑ گئے جو پہلے جمعے کی نماز دفتر سے اٹھ کر پڑھ لیتے تھے۔ اب وہ گھر میں لیٹے رہتے ہیں یا دوستوں سے ملنے یا تفریح کرنے نکل جاتے ہیں یا شکار کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مرضی یہ ہے کہ پھر اتوار کی ہی چھٹی ہو جائے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اسلامی ملکوں میں اتوار کی چھٹی عیسائی محبت اور ان کی دلجوئی و چاپلوسی کے مترادف ہے۔ اگر مسلمان ایسا کرے یا کہے تو اس حدیث پاک کے تحت مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ کے تحت اغیار کی مشابہت سے مجرم شرعی ٹھہریں گے یا نہیں بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا۔

المسائل: عبدالجبار معرفت عبداللطیف عبدالغنی ۶/۵۔۳۵ فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ

قانون شریعت کے مطابق تمام ایام میں افضل ترین دن روز جمعہ ہے اور اس کی فضیلت کی وجوہ کثیرہ میں سے بڑی وجہ یہ ہے کہ رب کریم کو پسند ہے اسی لیے افضل الخلق ابو البشر حضرت آدم کو اسی دن پیدا فرمایا گیا چنانچہ مسلم شریف جلد اوّل ص۲۸۲ پر ہے۔ وَحَدَّثَنِیْ حَرْمَلَۃُ بْنُ یَحْیٰی (الخ) اَنَّہٗ سَمِعَ اَبَا ھُرَیْرَۃَ یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْہِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ فِیْہِ خُلِقَ اٰدَمُ (الخ) ترجمہ: حرملہ بن یحییٰ نے پوری اسناد سے حدیث بیان فرمائی آخری راوی فرماتے ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا انہوں نے فرمایا کہ حضور اقدس سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنے بھی روشن دن ہیں ان میں سب سے زیادہ خیر والا دن جمعہ ہے اسی دن حضرت آدم پہلے نبی پیدا ہوئے۔ مختلف کتب میں وارد ہے کہ حضرت آدم نے پیدا ہوتے ہی ذکر اللہ کیا اور سارا دن آپ ذکر الٰہی کرتے رہے۔ اور ذکر الٰہی کی ابتدا آپ کی چھینک مبارک سے ہوئی آپ کو چھینک آئی تو رب تعالیٰ نے تعلیم فرمائی کہ کہو الحمد للہ رب العالمین آپ نے اسی الفاظ سے ذکر الٰہی کی ابتدا فرمائی چنانچہ اسی طرح تفسیر روح البیان ص۱۰۲ جلد اوّل میں ہے۔ آدم علیہ السلام کے اس ذکر اللہ کے بعد رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم تم کو اسی ذکر الٰہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے چنانچہ تفسیر بیان اوّل کے ص۱۰۲ پر ہے:۔ وَلِذَا خَلَقْتُکَ یَا اٰدَمُ (ترجمہ):۔ اور اے آدم اسی ذکر الٰہی کے لیے تم کو پیدا کیا یعنی تفسیر روح البیان کی ایک روایت

ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے پیدا ہو کر درود شریف پڑھا چنانچہ جلد ہفتم ص۲۲۳ پر ہے۔ وَ اَیْضًا لَمَّا خُلِقَ اٰدَمُ رَاٰی اَنْوَارَ مُحَمَّدٍ عَلَیْہِ السَّلَامُ عَلٰی جَبِیْنِہٖ فَصَلُّوْا عَلَیْہِ وَقْتَئِذٍ۔ ترجمہ۔ جب حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے تو انہوں نے اپنی پیشانی میں انوار محمدی دیکھے تو اسی وقت درود پاک پڑھنے لگ گئے۔ تفسیر خزائن ص۶ اور تفسیر نعیمی جلد اوّل ص۲۵۱ پر ہے کہ ملائکہ نے سجدۂ آدم بھی جمعہ کے دن ہی کیا ان تمام اقوال سے ثابت ہوا کہ جمعہ کا دن ابتداء ہی سے اللہ تعالیٰ نے فقط ذکر الٰہی کے لیے بنایا ہے پیارے آقا حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود شریف پڑھا کرو، چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص۱۲۰ پر ہے۔ فَاَکْثِرُوْا عَلَیَّ مِنَ الصَّلٰوۃِ فِیْہِ۔ (الخ) ترجمہ۔ جمعہ کے دن میں مجھ پر کثرت سے درود پاک پڑھا کرو ان الفاظِ طیبہ سے بھی یہی ثابت ہوا کہ جمعہ صرف ذکر الٰہی کے لیے بنایا گیا۔ اور چونکہ ایک وقت میں دو کام مشکل بلکہ ناممکن کی حد تک ہیں اور اصل جمعہ ذکر اذکار و عبادت الٰہی کے لیے ہی وجود میں آیا تو لازم آیا کہ یہ دن دنیوی تمام کاموں سے فراغت کا دن ہے اور ہر شخص پر سارے دن کی چھٹی واجب ہونی چاہیے جیسا کہ شروع زمانوں سے ہوتا چلا آیا پچھلی امتوں پر اُن کے مقدس و معظم دن کی تعظیم فرض تھی اور تعظیم یہی تھی کہ اس دن تمام وقت عبادت میں مشغول رہیں اور اپنے کاروبار ترک کر کے مکمل چھٹی کریں بلکہ چھٹی نہ کرنے پر ان پر عذاب آتے رہے جیسا کہ آگے ثابت کیا جائے گا۔ لیکن چونکہ امت مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم بارگاہ خداوندی میں بڑی لاڈلی اور پیاری امت ہے اس لیے اس امت سے دیگر تمام مشقتوں کے ساتھ ساتھ یہ مشقت بھی اٹھالی گئی کہ پورے دن کی چھٹی کریں لہٰذا قانونِ شرعی کے اعتبار سے مسلمانوں پر جمعہ کی چھٹی تین طرح پر ہے ع۱ پورے دن کی چھٹی مستحب ہے جو شخص یا جو قوم یا جو مسلمان حکومت پورے دن چھٹی کرے اور سارا دن اللہ کے لیے اپنا کاروبار بند کر دے اور یوم جمعہ کی تعظیم کی نیت سے وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ سے اجر عظیم حاصل کرے گا ع۲ پہلی اذان سے چھٹی کرنا واجب ہے ع۳ اور دوسری اذان سے دعاء اخیری مانگنے تک چھٹی کرنا فرض ہے۔ تو جمعہ کے دن مسلمان پر تین طرح چھٹی ہوئی مستحب چھٹی واجب چھٹی فرض چھٹی۔ ان تینوں کے دلائل حسب ذیل ہیں۔ دلیل ع۱ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وَاِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ۔ اس آیت کریمہ کی عبارت النص تو یہ بتا رہی ہے کہ اذانِ جمعہ کے وقت سعی کرنا یعنی چل پڑنا اللہ کے ذکر کی طرف اور کاروبار چھوڑنا ہر مسلمان پر اشد لازم ہے مگر اسی آیت پاک کی دلالۃ النص جو لفظ فاسعوا سے ثابت ہو رہی ہے وہ بھی یہ کہ ہر وہ کاروبار جو سعی میں رکاوٹ پیدا کرے ناجائز ہے اگر رکاوٹ یقینی ہے تو جمعہ کے دن ایسا کام چھوڑنا واجب یا فرض ہے اور اگر اس کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے سعی الیٰ ذکر اللہ یا جامع

مسجد کی طرف جانے میں سستی، کاہلی یا مجبوری واقعہ ہونے کا اندیشہ ہے تو جمعہ کے دن وہ کاروبار چھوڑنا مستحب ہے اگرچہ وہ کام چھوٹا ہو یا لمبا۔ مثلاً جمعہ کے دن جج یا حاکمِ وقت کو یقین ہے کہ اگر میں نے فیصلے یا حکومت کے دفتری کام کرنے شروع کیے تو جمعہ نہ پڑھ سکوں گا تو اس پر جمعہ کے دن چھٹی کرنا فرض ہے اور اگر اندیشہ ہو تو چھٹی کرنا مستحب ہے اسی طرح اگر دکان دار قصائی آڑھتی وغیرہ کو یقین ہو کہ اگر ہم نے دکان کھولی تو جمعہ نہ پڑھ سکیں گے تو ان پر جمعہ کی چھٹی سارا دن کی فرض لیکن اگر صرف اندیشہ ہو کہ دکان کھولنے سے سستی کسل پیدا ہو گی یا گاہکوں خریداروں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے شاید جمعہ رہ جائے تو ان پر سارا دن چھٹی کرنا مستحب ہے اور ان اندیشناک مشکوک حالات میں مسلمانوں کو جمعہ کے دن دکانیں علاقیں کھولنا بہتر نہیں۔ ہاں البتہ اگر مسلمانوں کو کامل یقین ہو کہ ہم کاروبار دنیوی کرنے کے باوجود پھر جمعہ کے وقت تمام تیاریوں کے ساتھ جمعہ پڑھ سکیں گے تب ان کو اذانِ جمعہ کے بعد بھی بیع کرنا جائز ہے۔ جیساکہ اصول فقہ کی کتاب اصول شاشی نے صـ۳ــــ پر اسی آیت کی دلالۃ النص سے ثابت فرمایا ہے کہ وَلَوْ فَرَضْنَا بَیْعًا لَایَمْنَعُ الْعَاقِدَیْنِ عَنِ السَّعْیِ اِلَی الْجُمُعَۃِ بِاَنْ کَانَ فِیْ سَفِیْنَۃٍ تَجْرِیْ اِلَی الْجَامِعِ لَایُکْرَہُ الْبَیْعُ (ترجمہ) اور اگر ہم پتہ لگالیں ایسی خرید فروخت کا جو بیچنے اور خریدنے والے دونوں حضرات کو جمعہ کی سعی سے نہ روکیں اس طرح کہ دونوں تاجر اس کشتی میں دکان لگائے بیٹھے ہیں جو جامع مسجد کی طرف ہی جا رہی ہے تو ان کی یہ بیع (خرید و فروخت) مکروہ نہ ہو گی۔ علماء اصول نے یہ حکمِ قانونی اس آیت کی دلالۃ النص سے لیا ہے تو جب باوجود وذروا البیع کے وجوبی حکم کے اس طریقے سے بیع کرنا جائز ہے تو اسی طرح باوجود اِذَا نُوْدِیَ کے تعیّنِ وقتی کے مندرجہ بالا خطرات و اندیشے کے پیشِ نظر سارا دن کی چھٹی بروز جمعہ اسی دلالت النص سے مستحب ہے۔ فقہاءِ کرام کا یہ بیان فرمودہ حکم دلالت النص سے ثابت ہے کیونکہ یہ قانون لفظ وَذَرُوا الْبَیْعَ کے لغوی معنٰے کی دلالت سے ظاہر ہوا ہے اصطلاحِ اصول میں دلالۃ النص کی تعریف یہ ہے کہ آیت کے الفاظ کے لغوی معنٰے بلا فکر معض و اجتہادی کوشش سے وہ حکم خود بخود معلوم ہو جائے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یتیم کو اُف نہ کہو تو لفظاً اُف باعتبار عبارت فقط اُف اور معمول افسوس کو ظاہر کر رہا ہے مگر اپنے لغت کے اعتبار سے ہر قسم کی جھڑک مار پیٹ گالی گلوچ کو شامل ہے۔ اسی کو دلالت النص کہتے ہیں بس اسی طرح وذروا البیع کی دلالت بھی ہر اس چیز کو منع کرتی ہے جو سعی میں خلل ڈالے اور وہ چیز جائز ہے جو خلل نہ ڈالے لہٰذا اصولی طور پر ثابت یہ ہوا کہ جمعے کے دن ہر مسلمان کے لیے جمعے کے پورے دن چھٹی کرنا مستحب ہے۔ اور مستحب کام پر ثوابِ دنیا و آخرت یقینی تو لاجرم جو شخص جمعے کے دن جمعے

کی تعظیم کی نیت سے سارا دن چھٹی کرتا ہے وہ ضرور ثواب آخرت یعنی رضاء اللہ رسول و ثواب دنیوی یعنی برکت فی الاموال حاصل کرے گا ۔ دلیل دوم ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ (الخ) ترجمہ :۔ ترجمہ جب ندا کی جائے نماز کیلئے جمعہ کے دن ۔ لفظ نُوْدِیَ میں فقہاء کرام و مفسرین عظام کا اختلاف ہے کہ پہلی اذان مراد ہے یا دوسری کچھ مفسرین فرماتے ہیں کہ دوسری اذان مراد ہے مگر اکثر مفسرین اس کی تردید کرتے ہیں ۔ اور فرماتے ہیں دونوں اذانیں نبی کریم کے زمانے میں رائج تھیں حضرت عثمان نے صرف اذان اول کی جگہ بدلی تھی بعض نے کہا حضرت عثمان نے پہلی اذان سے بھی پہلے صرف منادی اور تیاری جمعہ کا اہتمام فرمایا تھا بہرحال اقوال مفسرین سے نُوْدِیَ کی تفسیر میں بہت اختلاف ملتا ہے جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں اس اختلاف سے پہلی اذان کے وقت کاروبار چھوڑنے کا حکم ظنی ہوا کیونکہ یہ آیت پہلی اذان کے ثبوت کیلئے نص ظنی ہوئی اور نص ظنی سے حکم کا وجوب ثابت ہوتا ہے نہ کہ فرضیت چنانچہ فتاویٰ ردالمحتار جلد اول ص۷۸ پر ہے :۔ اَقُوْلُ بَیَانُ ذٰلِکَ اَنَّ الْاَدِلَّۃَ السَّمْعِیَّۃَ اَرْبَعَۃٌ اَلْاَوَّلُ قَطْعِیُّ الثُّبُوْتِ وَالدَّلَالَۃِ کَنُصُوْصِ الْقُرْاٰنِ الْمُفَسَّرَۃِ وَالْمُحْکَمَۃِ وَالسُّنَّۃِ الْمُتَوَاتِرَۃِ الَّتِیْ مَفْهُوْمُهَا قَطْعِیٌّ ۔ اَلثَّانِیْ قَطْعِیُّ الثُّبُوْتِ ظَنِّیُّ الدَّلَالَۃِ کَالْاٰیَاتِ الْمُؤَوَّلَۃِ (الخ) فَبِالْاَوَّلِ یَثْبُتُ الْفَرْضُ وَالْحَرَامُ وَبِالثَّانِیْ وَالثَّالِثِ الْوَاجِبُ وَکَرَاهَۃُ التَّحْرِیْمِ ۔ ترجمہ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ۔ میں کہتا ہوں شریعت میں سمعی دلائل چار ہیں پہلی دلیل ۔ قطعی ثبوت اور قطعی دلالت ۔ دوسری دلیل قطعی ثبوت ظنی دلالت تیسری دلیل ظنی ثبوت اور قطعی دلالت ۔ پہلی دلیل سے فرضیت حاصل ہوتی ہے اور حرمت اور دوسری و تیسری دلیل سے جو ظنی دلیل ہے اس سے واجب اور کراہت تحریمی ثابت ہوتی ہے ظنی دلیل جیسے تاویل کردہ آیت اس فرمان سے ثابت ہوا کہ اذا نودی سے پہلی اذان مراد لینا چونکہ اختلافی ہے اس لئے یہ دلیل پہلی اذان کے لئے ظنی ہوئی لہذا پہلی اذان جمعہ سے تمام مسلمانوں کا ہر قسم کی دنیوی کاروبار ترک کرنا اور چھٹی کردینا واجب ہوا ۔ اور واجب پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے جیسا کہ علم اصول میں لکھا ہے چنانچہ تلویح ص۱۲۵ هُوَ طَلَبُ الْفِعْلِ جَازِمًا وَهُوَ الْوُجُوْبُ ۔ ترجمہ ۔ امر پر توقف کا مطلب وہ فعل کا طلب ہے جازماً اور وہ وجوب ہے ۔ ان تمام عبارات سے ثابت ہوا کہ اذا نودی کی دلالت ظنی سے پہلی اذان کے وقت جمعہ کے دن چھٹی کرنا واجب ہے ۔

تیسری دلیل ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ :۔ (ترجمہ) ۔ جب جمعہ کے دن اذان دی جائے تو چل پڑو اللہ تعالیٰ

کے ذکر کی طرف اور بیع یعنی تمام دنیوی کاروبار چھوڑ دو۔ قانون شریعت کے مطابق جمعہ کے لیے دنیوی کاروبار چھوڑ دینا اس کے بارے میں جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا مفسرین کے دو گروہ ہیں، پہلا گروہ کہتا ہے، کہ ترک بیع کا حکم پہلی اذان سے فرائض جمعہ کے سلام پھیرنے تک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے۔ کہ نہیں بلکہ! دوسری اذان خطبہ سے سلام پھیرنے تک پس بلاحتہٗ ثابت ہوا کہ دوسری اذان کے وقت ترک بیع متفقًا لازم ہے۔ لہٰذا اس اتفاق کی بنا پر وَذَرُوا کا حکم دوسری اذان سے قطعی الدلالت بھی ہوا۔ اور جب دلالت قطعی ہو تو اس کا حکم فرض ہوتا ہے۔ لہٰذا دوسری اذان سے چھٹی کرنا فرض ہے۔ پس اسی آیت کریمہ کی دلالت النص سے سارے دن کی چھٹی کا استحباب ثابت ہوا۔ اور اسی آیات کی نص ظنی سے واجب چھٹی پہلی! اذان سے سلام پھیرنے تک ثابت ہوئی۔ اور اسی سے فرض چھٹی ثابت ہوئی۔ چھٹی کی فرضیت اور وجوب کے لیے۔ یہ ہی دلیلیں کافی ووافی ہیں۔ کہ اس میں ان کا باعث گناہ ہے۔ لیکن سارے دن کی چھٹی منانا چونکہ محض مستحب ہے اس لیے اس کا انکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور سوال بھی ساری چھٹی سے متعلق ہے۔ لہٰذا مزید دلائل اشد ضروری تھا کہ اس یوم تعظیم کی عظمت پوری کی جا سکے۔ اور مجھے منکروں کو درستی کا راہ نصیب ہو۔ اسی بنا پر مندرجہ ذیل باقی دلائل سارے دن کی چھٹی سے متعلق ہیں۔ دلیل نمبر چار ۴:۔ قانون شریعت کے مطابق جمعہ کے دن مسلمانوں پر ایسے کام سنت فرما دیئے گئے ہیں۔ جو جمعہ کی حاضری سے پہلے کرنے ضروری ہیں اور جن کے کرنے میں اتنا وقت خرچ ہوتا ہے۔ اور انسان کو ان کاموں میں مشغول ہو کر لازمی طور پر چھٹی کرنی پڑ جاتی ہے۔ اور اگر تمام دن کی چھٹی اس دن نہ کرے تو وہ کام نہیں کر سکتا۔ مثلاً نبی کریم رؤف رحیم آقائے کائنات صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں پر بروز جمعہ نماز جمعہ کے لیے جو اشغال لازم فرمائے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔ ع۱:۔ طہارت اس میں کپڑے دھونے ناخن تراشنے زیر ناف بال صاف کرنے اپنے کپڑے دھونے حجامت کرانا سب شامل ہیں۔ ایسا ہی مرقات شرح مشکوٰۃ شریف ص۲۱۸ جلد اول میں ہے۔ ع۲ غسل کرنا ع۳ دھلے کپڑے پہننا یا دوسرا جوڑا پہننا:۔ ع۴:۔ خوشبو لگانا وغیرہ وغیرہ اب ہر شخص خود اندازہ لگا سکتا ہے۔ کہ جمعہ سے پہلے یہ کام کرنے میں کتنا وقت لگتا ہے اور جمعہ سے پہلے ہی کاروبار کا وقت ہوتا ہے۔ ثابت ہوا کہ منشاء اسلام ہی یہ ہے کہ جمعے کے دن سارا دن چھٹی کی جائے۔ اور یہ سارا وقت اپنی پاکیزگی اور عبادت و ریاضت میں گزاریں چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۱۲۲ پر ہے:۔

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَ يَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهٖ اَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيْبِ بَيْتِهٖ ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ

بَیْنَ اِثْنَیْنِ ثُمَّ یُصَلِّیْ مَا کُتِبَ لَہٗ ثُمَّ یُنْصِتُ اِذَا تَکَلَّمَ الْاِمَامُ اِلَّا غُفِرَ لَہٗ مَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَۃِ الْاُخْرٰی رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ۔ ترجمہ۔ روایت ہے حضرت سلمان سے فرمایا کہ فرمایا پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے۔ نہیں ہے یہ بات کہ کوئی مسلمان جمعہ کے دن غسل کرے اور ہر طرح طہارت و پاکیزگی حاصل کرے جتنی بھی طاقت رکھتا ہو پاکیزگی کی اور بالوں وغیرہ میں تیل لگائے یا اپنے ہی گھر میں جو خوشبو عطر رکھا ہو وہ لگا ئے پھر جمعہ کی طرف نکلے تو دو نمازیوں کے درمیان سے چیرتا ہوا نہ نکلے پھر جہاں جگہ ملے نماز پڑھے جو فرض کی گئی اُس کے لیے پھر خاموشی بھی اختیار کئے رہے جب خطبہ پڑھے امام مگر بخشے جائیں گے اُس کے وہ گناہ جو پورے ہفتے اگلے جمعہ تک ہوئے ہونگے۔ اس حدیث پاک کی اشارت اور اقتضاء النص سے ثابت ہوا کہ جمعہ کے پورے دن چھٹی کرنی ہر مسلمان پر مستحب ہے کیونکہ ہر مسلمان پر جمعہ فرض اور جس پر جمعہ فرض اس پر یہ فرمودہ کام سنتِ لازمہ اور ان کاموں کے ہوتے ہوئے کاروبار نہیں کیا جاسکتا اور اہتمام بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور کاروبار کے ہوتے ہوئے یہ کام نہیں ہوسکتے یہ بات بالکل ظاہر ہے۔ لہٰذا چھٹی لازم کہ یہ کام جو حدیث پاک نے بیان فرمائے سنت اور عبادت ہونے کے علاوہ فطری طور پر بھی ضروری کہ اگر آٹھویں دن بھی ایک انسان نہ نہائے دھوئے تو گندہ ریچھ بن جائے رات میں تو یہ کام ہو نہیں سکتے نہ روزانہ عادتاً نہ ہوسکتا تو ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی دن میں ہی کریگا اور جس دن بھی اتنے ڈھیر سارے صفائی و طہارت کے کام کریگا اس دن چھٹی کرنی پڑے گی تو بہتر ہے کہ جمعہ کو ہی چھٹی منائے۔ دلیل عـ۵ مشکوٰۃ شریف باب الجمعہ فصل اوّل میں ہے۔ وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجُمُعَۃِ لَسَاعَۃً لَا یُوَافِقُہَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ یَسْاَلُ اللّٰہَ فِیْہَا خَیْرًا اِلَّا اَعْطَاہُ اِیَّاہُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ (ترجمہ) حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ فرمایا آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ وآلہٖ وسلم نے۔ بیشک جمعہ کے دن میں البتہ ایسی ایک ساعت ہے کہ نہیں موافقت کرتا ہے اس میں کوئی بندہ مسلم کہ دعا مانگے رب کریم سے اس ساعت میں کوئی بھلائی کی مگر عطا فرما دیتا ہے اس کو اللہ جل شانہ وہ چیز۔ (یہ مسلم بخاری کی روایت ہے)۔ اس حدیث میں اشارۃً بتایا گیا کہ۔ سارے دن کی چھٹی جمعہ کے دن ہی مستحب ہے۔ کیونکہ ارشاد ہوا جمعہ کے سارے دن میں ایک گھڑی ہے جس گھڑی مومن بندہ عبادت میں مشغول ہوکر جو بھی دعا مانگے قبول ہوگی۔ نبی کریم نے اس گھڑی کا تعین و تقرر نہ فرمایا اجمالاً سارے دن کا نام لیا جس سے منشأ رب العزت کا پتہ لگا کہ بندہ سارا دن ہی عبادت و ریاضت ذکر و فکر میں مشغول رہے کہ کچھ حصہ دن کا تیاری جمعہ میں صرف ہو اور کچھ حصہ ذکر اللہ کرنے سننے سنانے میں۔ اور جب سارا دن اس ساعت کی تلاش میں عبادت کرتے گزرے گا تو لازماً سارا دن کی چھٹی کرنی پڑیگی۔ مرقاہ شرح مشکوٰہ شریف نے بھی اس حدیث پاک کے ماتحت یہی فرمایا۔ چنانچہ مرقات

جلد دوم صـــ ۲۰۵ـــ پر ہے۔ وَالْحِكْمَةُ فِیْ اِخْفَائِهَا لِيَشْتَغِلَ النَّاسُ بِالْعِبَادَةِ فِیْ جَمِيْعِ اَجْزَائِهَا رَجَاءَ اَنْ تُوَافِقَ دُعَائَهُمْ وَعِبَادَتَهُمْ اِيَّاهَا۔ ترجمہ اور حکمت و راز یعنی منشا اس ساعت قبولیت کے چھپانے و ظاہر نہ کرنے میں یہ تھا کہ مسلمان دن کے سارے حصّوں میں عبادت کے ساتھ مشغول رہیں اس امید پر کہ توفیق پائے ان کی دعا اور ان کی عبادت اِن حصّوں میں تاکہ سارے مسلمان ہر قسم کا دنیوی کاروبار چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جائیں خیال رہے کہ جس طرح ذکر اللہ درود شریف نماز۔ سجدہ سجود عبادت ہے اسی طرح تیاریِ جمعہ کی نیت سے اور عظمتِ جمعہ کے ارادے سے مکمل چھٹی کر کے غسل۔ طہارت۔ نہانا۔ دھونا۔ بھی عبادت ہے اور ہر عبادتِ صبر ورہ کا دنیوی۔ اخروی ثواب ثابت ہے۔ دنیوی ثواب ہے خیر و برکت کا حصول اور دعا کی قبولیت اور اُخروی ثواب ہے۔ رضاءِ ربِّ کریم اور لقاءِ احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور عطاءِ جنت لہٰذا جو شخص جمعہ کے لیے غسل کر رہا ہے اور اسی وقت ساعت آگئی تو عند اللہ اس کی مشغولیت غسل بھی عبادت ہے اور اس عبادت کی بنا پر اس ساعت کی آمد کی وجہ سے کوئی بھی نیکی دعا یا اگلی پچھلی دعا قبول ہو جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ ثابت ہوا کہ بندۂ مومن کے لیے جمعہ کے دن چھٹی کرنا ہی مستحب ہے۔ دلیل ع۹ روز جمعہ رب کا پیارا دن ہے جیسا کہ پہلے ثابت کیا نیز کثیر روایات صحیح سے ثابت ہے۔ اور جو چیز رب کی پیاری ہے وُہ شعائرِ اسلام میں داخل ہے۔ اور شعائرِ اسلام کی تعظیم واجب اور کبھی مستحب ہے اور کبھی فرض ہے چنانچہ رب قدیر نے فرمایا۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ ترجمہ۔ اور کون بندہ ہے جو تعظیم کرے اللہ کی پیاری چیزوں کی کیونکہ وہ تعظیم دلوں کا تقویٰ ہے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر معظم کی تعظیم مختلف ہے کسی کی تعظیم ہے اس کو چومنا کسی کی تعظیم ہے کھڑا ہونا کسی کی تعظیم غلاف و طواف کسی کی تعظیم اس کی خدمت گزاری کسی کی تعظیم فرمانبرداری کا۔ پس یاد رکھو کہ دنوں اور ایام متبرکہ کی تعظیم یہ ہے کہ ان دنوں میں دنیوی سارے کاروبار چھوڑ کر رب تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ یہی وجہ علماءِ عظام فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن کل وقت چھٹی کر کے عبادت کی جائے اس دن اگر کھانا بھی کھائے تو عبادت اور رضاءِ الٰہی کی نیت سے بلکہ صحابہ کرام جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ کھانا کھاتے تھے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔ جمعہ کے دن صرف جمعہ کی تعظیم کے لیے چھٹی کرنا عبادت مستحبہ ہے۔ اگر کوئی نیت خیر سے صرف چھٹی کر دے اور اپنی جہالت و غفلت سے جمعہ نہ پڑھے تب بھی اس کو کم از کم اس چھٹی کا دنیوی ثواب ضرور ملے گا اگرچہ اُخروی ثواب سے محروم رہا بلکہ امید ہے کہ اس تعظیم جمعہ کے صدقے میں اس کو توفیقِ نماز و عبادت بھی نصیب ہو جائے جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ وُہ آوارہ منش اوباش لوگ جو نماز روزے کے نزدیک نہیں جاتے مگر رمضان پاک مساجد اور محافلِ مقدسہ درود و سلام آذان۔ قرآن۔ اور بزرگانِ دین کی عظمت کرتے ہیں۔ کسی موقعے پر اللہ ان پر ایسا کرم فرماتا ہے کہ دنیا سے پاک و طیب ہو کر جاتے ہیں۔ اسی لئے تفسیر حقانی جلد ہفتم صـــ ۱۲۶ـــ پر ہے

کہ جو اس تمام روزِ مبارک میں خیرات و عبادات کے لیے تعطیل کرے تو بڑی برکت ہوگی۔ یعنی کوئی مسلمان جمعہ کی چھٹی سے نہ گھبرائے اور یہ اندیشہ نہ کرے کہ ہائے میرے گاہک ٹوٹ گئے بلکہ تجربہ ہے کہ پُر خلوص انسان کو بروز سنیچر اگلے دن زیادہ آمدنی ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی اس برکت پر بھی بھروسہ نہ کرے کہ اصل مقصود اس چھٹی... سے اللہ رسول کی رضا ہے دلیل سے پروردگارِ عالم خلاقِ کائنات کا ازل سے یہ قانونِ فطرت ہے کہ انسان کے ذمے دو قسم کے حقوق مرتب و معین اور لازم فرمائے۔ حق اللہ و حق العبد کریم نے اپنے حقوق کم رکھے اور بندوں کے حقوق خود بندوں پر زیادتی اور اہمیت سے رکھے اُن ہی حقوقِ کثیرہ میں وقت اور ایام کے تقسیم شدہ حقوق میں رب تعالیٰ نے بندۂ خاکی کو زمین و آسمان سے اس طرح متعلق فرمادیا کہ زمین پر بندوں کے لیے سات دن اور آسمان پر اپنے بندوں کے لیے سات سیارے مقرر فرمائے اور پھر ہر دن کا تعلق ایک سیارہ آسمانی سے پیدا کیا۔ اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ (ترجمہ) اور آسمان میں تمہاری قسمت کا رزق ہے لیکن اپنی تقدیر کے حصول کے لیے باری تعالیٰ جل مجدہٗ نے ہر انسان کو اعضاءِ عاملین بھی سات ہی عطا فرمائے دو پیر دو گھٹنے دو ہاتھ ایک چہرہ اور ان اعضاءِ ظاہرہ سے کام کرنے کے لیے دن بھی سات بنائے گئے۔ کہ اے بندو چھ دن حقوق العباد پورے کرتے رہو اور ساتویں دن حقوق اللہ کی ادائگی میں مشغول رہو اور اپنے ساتوں اعضا کو ساتویں دن رب کی رضا و روحانی غذا کے لیے بجائیں صرف کر دنیا یہ چھ ایام میں محنت و مشقت کرو اور ساتویں دن اپنے رب کے ذکرِ پاک سے اپنے قلب و قالب کو سکون پہنچاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ از حضرتِ آدم تا اُمتِ مسلم ہر اُمت کے لیے ایک دن مکمل چھٹی اور ذکر اذکار و عبادات کے لیے مخصوص ہوا۔ چنانچہ رسالہ السبعیات لِاِمَامِ اَبِی نصر ہمدانی ص ۲ پر ہے: اَكْرَمَ بِهٰذِهِ الْاَيَّامِ السَّبْعَةِ سَبْعَةً مِّنَ الْاَنْبِيَاءِ۔ اَكْرَمَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالسَّبْتِ وَعِيْسٰى ابْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ بِالْاَحَدِ وَدَاوٗدَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ بِالْاِثْنَيْنِ وَسُلَيْمَانَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ بِالثُّلَاثَاءِ وَيَعْقُوْبَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ بِالْاَرْبِعَاءِ وَاٰدَمَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ بِالْخَمِيْسِ وَمُحَمَّدًا رَّسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله تعالى عليه وآله وأصحابه وبارك وسلم۔ وَاُمَّتَهٗ بِالْجُمُعَةِ ۔

(ترجمہ) سات دن پیدا فرمانے کے بعد ان دنوں کو سات انبیاءِ کرام کی نسبت سے مکرم فرمایا سنیچر کو حضرت موسیٰ سے اتوار کو حضرت عیسیٰ سے پیر کو حضرت داؤد سے منگل کو حضرت سلیمان سے بدھ کو حضرت یعقوب علیہ السلام سے جمعرات کو حضرت آدم سے اور جمعہ مبارک کو پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اور آپ کی بابرکت امت سے سابقہ امتوں میں ہر نبی کی اُمت پر لازم تھا کہ اپنے اپنے مخصوص دن میں مکمل چھٹی کرے اور سارا دن عبادتِ الٰہی میں گزارے یہی دن کی عظمت اور خصوصیت کا اظہار تھا تو جس طرح ان امتوں پر اپنے قابلِ تعظیم دن کی عزت کے لیے مکمل کاروبار بند کرنا لازم تھا اسی طرح ہم امتِ مسلم پر جمعہ

کی عظمت کرنے کے لیئے۔ پورے دن کی چھٹی ضروری۔ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ ان پر سارا دن چھٹی اور اس میں عبادت فرض تھی مگر بطفیل نبی کریم رؤف و رحیم ہم پر سارا دن چھٹی کرنا مستحب ہے بعد نماز جمعہ بھی بہتر یہی ہے کہ بندہ مغرب تک دکان نہ کھولے بلکہ عبادت اور فضل ربی کی تلاش میں رہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (ترجمہ) پس جب ادا کر دی گئی نمازِ جمعہ تو اے مسلمانو زمین میں پھیل جاؤ (یعنی مسجد جمعہ سے نکل جاؤ اور زمین کے مختلف مقام پر چلے جاؤ اور تلاش کرو (مختلف نیک محفلوں میں) اللہ کے فضل کو اور اللہ تعالیٰ کا بہت ذکر کرو تاکہ تم کامیابیاں پالو سبحان اللہ اس آیت کریمہ نے صاف صاف بیان فرما دیا کہ نماز جمعہ کے بعد بھی دنیوی کاروبار میں مشغول مت ہوؤ۔ بلکہ شام تک ذکر کی محفلیں ڈھونڈتے رہو اور ذکر اللہ کرتے رہو۔ اکثر مفسرین کرام اس آیت مبارکہ کا یہی مطلب بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی صـ۷۹۵ تفسیر خازن صـ۹۵ تفسیر مدارک التنزیل صـ۲۴۵ تفسیر تنویر المقباس من ابن عباس صـ۳۵۵ اور تفسیر روح المعانی صـ۲۰۲ جلد چہار دہم اور تفسیر روح البیان جلد نہم صـ۵۲۵ پر تمام مفسرین نے اسی بات کو ترجیح دی ہے کہ بعد نماز جمعہ بھی ذکر اللہ میں مشغول رہنا مستحب ہے۔ عبارت اس طرح ہے۔ اِذَا فَرَغَ الْاِمَامُ مِنْ صَلٰوةِ الْجُمُعَةِ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَفَرَّقُوْا فِي الْمَسْجِدِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ اُطْلُبُوْا مَا هُوَ اَفْضَلُ لَكُمْ يَعْنِيْ عِلْمَ الرَّبِّ التَّوْحِيْدِ وَالزُّهْدِ وَالتَّوَكُّلِ۔ (ترجمہ) جب امام نماز جمعہ سے فارغ ہو جائے۔ تو زمین یعنی عبادت گاہوں میں منتشر ہو جاؤ اور اس چیز کی طلب و تلاش کرو جو تمہارے لیئے سب کائنات سے افضل ہو یعنی معرفتِ الٰہی توحید باری تعالیٰ اور زھد و توکل علی اللہ کا علم واضح رہے کہ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ کی فا سے پہلے جتنے امر ہیں اِذَا نُوْدِيَ کے بعد وہ سب امر وجوبی ہیں اور ف کے بعد جتنے امر ہیں وہ سب استحبابی ہیں اس لیئے کہ جب امر میں کوئی قرینہ ایسا نہ ہو جو دلالت کرے استحباب پر تو مراد وجوب ہوتا ہے۔ لیکن جب قرینہ علیٰ استحباب ہو تو استحباب یا اباحت ہی مراد ہوگا یہ قاعدہ اصول فقہ کا ہے چنانچہ التلویح علی التوضیح صـ۲۳۰ پر ہے۔ اَنَّ الْاَمْرَ الْمُطْلَقَ لِلْوُجُوْبِ وَلَا نِزَاعَ فِيْ اَنَّهٗ قَدْ يَكُوْنُ لِغَيْرِهٖ مَجَازًا بِمَعُوْنَةِ الْقَرَائِنِ۔ (ترجمہ) بیشک اصل امر مطلق طور پر واجب کرنے کے لیئے ہے۔ اور اس قانون میں کسی کا اختلاف نہیں کہ قرینے پائے جانے کے وقت مجازی طور پر غیر وجوب یعنی مستحب وغیرہ کے لیئے ہوتا ہے۔ اس جگہ فَاِذَا قُضِيَتْ کے لفظ سے قرینہ حاصل ہوا کہ صلوٰۃ سے پہلے پہلے فرضیت اور واجب تھا اس کے بعد فرضیت ختم اب تمام کام رات تک مستحب ہیں بجز نماز عصر وہ علیحدہ دائمی روزمرہ کی چیز ہے۔ اس خصوصی استحباب سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہ خصوصیت صرف یوم جمعہ کی ہے۔ تفسیر کبیر نے بھی یہی قرینہ

بیان فرما کر ان اوامر کو استحبابی فرمایا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد ہشتم صـ۱۴۲ پر ہے۔ هٰذَا صِيغَةُ الْأَمْرِ بِمَعْنَى الْإِبَاحَةِ كَمَا أَنَّ إِبَاحَةَ الْإِنْتِشَارِ زَائِلَةٌ بِفَرْضِيَّةِ أَدَاءِ الصَّلٰوةِ فَإِذَا زَالَ ذَالِكَ عَادَتِ الْإِبَاحَةُ (ترجمہ) یہ امر اباحت یعنی استحباب وغیرہ کے معنیٰ میں ہیں اس لئے کہ منتشر ہونے کی رکاوٹ نمازِ جمعہ کی وجہ سے تھی جب یہ رکاوٹ ختم ہوئی تو اباحت نے ہی لوٹنا ہے۔ یہ قرینہ بالکل ظاہر کیونکہ جو روکا جائے تو جب رکاوٹ ختم ہو تو وہی آئیگا نہ کہ غیر۔ ان تمام فرمودات سے ثابت ہوا کہ جمعہ کے دن صبح سے رات تک چھٹی کرنا مستحب ہے۔ دلیل ۸ تفسیر روح البیان جلد نہم صـ۵۲۵ پر ہے۔ فَإِنَّهُ لَوْ لَبِثَ فِي الْمَسْجِدِ إِلَى اللَّيْلِ يَجُوْزُ بَلْ هُوَ مُسْتَحَبٌّ (ترجمہ) پس بیشک اگر نمازی لوگ مسجد میں رات تک بیٹھے رہیں تو جائز بلکہ مستحب ہے۔ اس دلیل سے بھی ثابت ہوا کہ سارے دن کی چھٹی مستحب ہے دلیل ۹۔ حدیث پاک سے اشارۃً واقتضاءً اور اقوالِ فقہاء سے عبارۃً یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جس طرح اور جس کام و مقصد کے لیئے سابقہ امتوں کو ہفتہ اتوار وغیرہ دئے گئے تھے اسی مقصد کے لیئے ہم کو جمعہ دیا گیا چنانچہ امام ہمدانی کی کتاب سبعیات صـ۲۵ پر ہے۔ قال علیہ السلام السَّبْتُ لِلْيَهُوْدِ وَالْجُمُعَةُ لَكُمْ فَلَا تُخَالِفُوْا فِيْهَا أَمْرَ اللّٰهِ تَعَالٰى كَمَا خَالَفَ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى (ترجمہ)۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا سنیچر (ہفتہ) یہود کے لیئے تھا اور جمعہ تمہارے لئے پس نہ مخالفت کرو تم اس میں اللہ تعالیٰ کے امر کی جیسے مخالفت کی یہود نے اپنے دن میں اور عیسائیوں نے اپنے دن میں۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوئیں پہلی یہ کہ اپنے اپنے مخصوص دن میں صرف یہود و نصارٰی نے مخصوص نافرمانی اور مخالفت کی ان کے علاوہ کسی امت نے اپنے دن کی بےحرمتی نہ کی بلکہ پیر منگل بدھ جمعرات والی امتیں اپنے دنوں میں مکمل چھٹی کرکے عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوتی رہیں یہی وجہ ہے قرآن و حدیث میں بجز ان دو قوموں کے کسی اور امت کی اس نافرمانی کا ذکر نہ ہوا دوسری بات یہ کہ سنیچر یعنی روزِ ہفتہ صرف یہودیوں کو ملا اور انھوں نے اس کی تعظیم نہ کی عیسائیوں کو اتوار ملا اس روایت میں ان کی نافرمانی کا ذکر ہے تیسری بات یہ ثابت ہوئی کہ جمعہ ہم مسلمانوں کے لیئے ہے۔ اور ہم کو اس قسم کی مخالفت سے روکا جا رہا ہے جس قسم کی مخالفت یہودیوں نے ہفتے میں عیسائیوں نے اتوار میں کی ۔ ثابت ہوا کہ جمعہ کی عظمت ہمارے لیئے اسی نوعیت کی ہے جس نوعیت کی عظمت ہفتہ اتوار وغیرہ ایام کی سابقہ قوموں کے لئے تھی تفسیر ابن کثیر جلد اوّل صـ۱۰۶ پر ہے۔ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّ اللّٰهَ إِنَّمَا افْتَرَضَ عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ الْيَوْمَ الَّذِيْ افْتَرَضَ عَلَيْكُمْ فِيْ عِيْدِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَخَالَفُوْا إِلَى السَّبْتِ فَعَظَّمُوْهُ وَتَرَكُوْا مَا أُمِرُوْا بِهٖ۔ (ترجمہ)۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر وہی دن مقرر و فرض فرمایا تھا جو تم پر تمہاری عید میں جمعہ کے دن مقرر فرمایا تو انھوں نے مخالفت کرکے ہفتہ لیا تو اس کی تعظیم کی اور جس کا حکم دے گئے تھے اس کو ترک کر دیا۔ اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ

اُن کے دن اور ہمارا جمعہ مبارک عظمت کے لحاظ سے ایک طرح پر ہیں۔ سابقہ اُمتوں خصوصاً یہود پر تو یہ فرض تھا کہ سارا دن کی چھٹی کریں اور اپنا یہ معظم دن عبادت الٰہی میں گزاریں۔ چنانچہ السبعیات لامام ہمدانی ص۲۲ پر ہے اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اَکْرَمَ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ فِیْ یَوْمِ السَّبْتِ وَاَمَرَ قَوْمَہٗ اَنْ لَّا یَشْتَغِلُوْا فِیْہِ بِشُغْلٍ مِّنْ اَشْغَالِ الدُّنْیَا مِثْلَ الْبَیْعِ وَالتِّجَارَۃِ وَالْوَصِیَّۃِ وَغَیْرِ ذٰلِکَ۔ (ترجمہ):۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے اکرام فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر سنیچر کے دن میں اور حکم دیا ان کی قوم کو کہ نہ مشغول ہوں اس دن میں کسی بھی دنیوی کام کاج میں مثلاً خرید و فروخت اور وصیت وغیرہ کی لکھت پڑت میں۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہود پر سارا دن کی چھٹی فرض تھی پہلی نسل یہود نے اس پر عمل بھی کیا بعد کی نسلیں گمراہ ہوئیں۔ تفسیر خازن جلد اول ص۱۴۷ پر ہے یُقَالُ سَبْتُ الْیَہُوْدِ لِاَنَّہُمْ یُعَظِّمُوْنَہٗ وَیَقْطَعُوْنَ فِیْہِ اَعْمَالَہُمْ وَاَصْلُ السَّبْتِ الْقَطْعُ ترجمہ مشہور ہے یہود کا سبت اس لیے کہ وہ ہی اس کی تعظیم کرتے ہیں اور بند رکھتے ہیں اس دن اپنے سب دنیوی کاروبار اور سبت کا لغوی ترجمہ بھی منقطع کرنا ہے۔ تفسیر بیضاوی ص۱۲۸ پر ہے۔ اُمِرُوْا بِاَنْ یُّجَرِّدُوْہُ لِلْعِبَادَۃِ (ترجمہ) وہ لوگ حکم دیے گئے تھے کہ اس دن کو خالی کریں عبادت کے لیے یعنی مکمل چھٹی کرکے سارا دن عبادت کرتے رہیں۔ یہی دِن کی تعظیم تھی جب ہفتہ اتوار وغیرہ کی تعظیم و عزت یہ ہے کہ اس میں عبادت و ذکر الٰہی کیا جائے تو جمعہ جو سب سے افضل دِن ہے اس کی تعظیم بھی یہی ہے کہ اس دن تمام وقت عبادت اور تیاری عبادت میں گزاری جائے۔ اور جب یہود پر یہ چھٹی ضروری تھی تو مسلمانوں پر یہ شکرانے کی چھٹی بدرجہ اولیٰ ضروری لہٰذا جب چھٹی کرنا اس دن کی عزت اور تعظیم ہے تو چھٹی نہ کرنا یقیناً جمعہ کی بے عزتی کے مترادف ہوگا۔ اور اللہ کی معظم چیز کی عزت نہ کرنا بلکہ بیعزتی کرنا باعث عذاب ہے۔ اس دلیل سے بھی ثابت ہوا کہ مثل یہود وغیرہ کے جمعہ کی عزت و توقیر یعنی دنیوی کاموں سے چھٹی کرکے عبادت کرنا مسلمانوں پر ضروری ہے۔ ہاں البتہ مسلمانوں پر یہ ضروری مستحب کے درجے میں ہے صرف نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے۔ امام نووی اپنی کتاب الاذکار میں فرماتے ہیں ص۳۰ پر اِعْلَمْ اَنَّ کُلَّ مَا یُقَالُ فِیْ غَیْرِ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ یُقَالُ فِیْہِ وَیَزْدَادُ اِسْتِحْبَابُ کَثْرَۃِ الذِّکْرِ فِیْہِ عَلٰی غَیْرِہٖ (ترجمہ)۔ یعنی جمعہ کے دن بہت زیادہ ذکر کرنا مستحب ہے باقی سب دنوں سے زیادہ۔ دلیل نمبر۱ سب دنوں کا سردار جمعہ کا دن ہے چنانچہ جامع صغیر ص۳۵ پر ہے۔ سَیِّدُ الْاَیَّامِ عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ اَعْظَمُ مِنْ یَّوْمِ النَّحْرِ وَالْفِطْرِ (الخ) ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب دنوں کا سردار جمعہ کا دِن ہے زیادہ معظم ہے نحر اور فطر کے دِن سے اس دلیل سے صاف صاف ثابت ہوا کہ جمعہ سب دنوں سے زیادہ عزت کے لائق ہے۔ یہاں تک کہ عید الفطر و اضحٰی سے بھی زیادہ جب ان دونوں عیدوں میں مسلمان ہر کام سے چھٹی کرتے ہیں اور قوموں کو دکھاتے ہیں کہ یہ دو دن ہماری عزت افزائی و قابلِ تعظیم دن ہیں تو مسلمانوں

پر یہ بھی مستحب ہے کہ جمعہ کے دن کی بھی عزت کریں اور چھٹی کر کے اقوام عالم کو بتادیں کہ یہ جمعہ بھی ہمارے لیے عزت کا دن ہے۔ بلکہ مندرجہ حدیث پاک کی رو سے جمعہ کا عیدین سے زیادہ اہتمام کریں۔ کیونکہ یہ دن اُن دونوں سے بھی زیادہ عزت والا ہے۔ دلیل ۱۱۔ عقل سلیم بھی چاہتی ہے۔ کہ جمعہ کے دن تمام وقت رات تک چھٹی کی جائے چار وجہ سے۔ پہلی وجہ یہ کہ ہر قوم خواہ دینی ہو یا دنیوی اپنی تفریح اور آرام وسکون کے لیے فطری طور پر چھ دن کام کر کے ساتویں دن آرام کی طالب ہوتی ہے لہذا تاریخ کائنات سے ثابت ہے کہ ہر شخص ہر طبقہ بلکہ ہر ملک چھ دن کام کر کے ساتویں دن لازمی تعطیل کرتا ہے۔ دین والے اس یوم تعطیل میں عبادت کرتے ہیں جب کہ دنیا دار کھیل کود میں گزار دیتے ہیں۔ اور دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ اپنے دینی معظم دن کو چھٹی کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ جب یہ بات شائع ہے تو مسلمانوں کو ہی کیا مصیبت ہے کہ وہ اپنے معظم دینی ایمانی دن میں چھٹی نہ کریں۔ دوسری وجہ یہ کہ دوسرے دن عظمت وعبادت کے لیے خود منتخب کیے گئے مگر جمعہ خود رب تعالیٰ کا تحفہ اور عطیہ ہے جو خاص مسلمانوں کے لیے ہے۔ چنانچہ مسلم شریف جلد اوّل صـ ۲۸۲ پر ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (الخ) هٰذَا یَوْمُهُمُ الَّذِیْ فُرِضَ عَلَیْهِمْ فَاخْتَلَفُوْا فِیْهِ فَهَدَانَا اللّٰهُ لَهٗ۔ (الخ) حَدَّثَنَا اَبُوْ كُرَیْبٍ (الخ) فَكَانَ لِلْیَهُوْدِ یَوْمُ السَّبْتِ وَكَانَ لِلنَّصَارٰی یَوْمُ الْاَحَدِ فَجَاءَ اللّٰهُ بِنَا فَهَدَانَا اللّٰهُ لِیَوْمِ الْجُمُعَةِ (الخ) عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هُدِیْنَا اِلَی الْجُمُعَةِ وَاَضَلَّ اللّٰهُ عَنْهَا (ترجمہ) :- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ فرمایا پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے۔ یہ جمعہ ان کا وہ دن تھا جس کی چھٹی اور عبادت ان پر فرض تھی تو انہوں نے جمعہ کو لینے میں جھگڑا کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ اپنا پیارا دن ہم کو دے دیا دوسری حدیث شریف ابو کریب سے روایت ہے۔ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا جمعہ میں یہودیوں عیسائیوں نے جھگڑا کیا تو یہودیوں کے لیے سنیچر اور عیسائیوں کے لیے اتوار مقرر ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے جمعہ ہم کو عطا فرمایا تیسری حدیث پاک حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ فرمایا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے۔ ہدایت دئیے گئے ہم جمعہ کی طرف اور گمراہ کیا اللہ تعالیٰ نے باقی سابقہ امتوں کو اس مبارک دن سے۔ ان احادیث مبارکہ سے جمعہ کی عظمت ثابت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دیگر ایام تو لوگوں کے اپنے منتخب اور پیارے ہیں مگر جمعہ اللہ کا پیارا ہے جب وہ قومیں اپنے دنوں کی تعظیم کر رہی ہیں تو کون بد نصیب کم فہم مسلمان ہے جو جمعہ کی عظمت نہ کرے عقل سلیم اور ایمان کامل والا تو کبھی اس دن کی چھٹی کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ تیسری وجہ جس طرح رمضان مبارک میں ہوٹل بند کرنے سے شام تجارت میں قدرتی زیادتی ہوتی ہے جیسا کہ ایمان والوں کا تجربہ ہے اور جس طرح کم زکوٰۃ سے مال بڑھتا ہے اسی طرح جمعہ کے دن پوری چھٹی

کرنے والے کی روزی بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ برکت دینے والا تو خدا تعالیٰ ہے بخلاف حریص لوگوں کے کہ ہمیشہ حرص سے روزی گھٹتی ہے۔ چوتھی وجہ یہ کہ جب سابقہ امتیں اپنے منتخب [illegible] دنوں [illegible] چھٹی کرکے بھوکے مر نہیں جاتے ہیں تو مسلمان جمعہ کے دن چھٹی کرکے کیوں مرنے لگے جس رب نے ان کو چھٹی کا فرض حکم دیا تھا کیا وہ اُن پر رحیم کریم نہ تھا۔ تم کوئی زیادہ نازک مزاج ہو جو یہ فضول اندیشے کرتے ہو کہ ہائے پوری چھٹی کرنے سے کیسے گزارا ہوگا۔ جیسا کہ بعض جہلاء کو کہتے سنا ہے۔ یہ تھیں وہ چند وجوہ جس کو عقل سلیم بھی تسلیم کرتی ہے۔ کہ واقعی جمعہ کی مکمل چھٹی ہر مسلمان کو ضرور کرنی چاہیے۔ دلیل ۱۱ جمعہ کی تعظیم سابقہ امتوں پر بھی واجب تھی تو اگر مسلمان اس کی تعظیم نہ کریں جو [illegible] تو افسوس کا [illegible] بدبختی تمام امتوں سے [illegible] امام محی الدین نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شرح مسلم میں فرمایا۔ جلد اول ص ۲۸۲ پر۔ اَلظَّاهِرُ اَنَّهُ فُرِضَ عَلَيْهِمْ تَعْظِيْمُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ بِغَيْرِ تَعْيِيْنٍ وَوُكِلَ اِلَى اجْتِهَادِهِمْ لِاِقَامَةِ شَرَائِعِهِمْ فِيْهِ فَاخْتَلَفَ اجْتِهَادُهُمْ فِيْ تَعْيِيْنِهٖ وَلَمْ يَهْدِهِمُ اللّٰهُ لَهٗ وَفَرَضَ عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ مُبَيَّنًا وَلَمْ يَكِلْهُ اِلَى اجْتِهَادِهِمْ فَفَازُوْا بِتَفْضِيْلِهٖ قَالَ وَقَدْ جَاءَ اَنَّ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ اَمَرَهُمْ بِالْجُمُعَةِ وَاَعْلَمَهُمْ بِفَضْلِهَا فَنَاظَرُوْهُ اَنَّ السَّبْتَ اَفْضَلُ فَقِيْلَ لَهٗ دَعْهُمْ۔ ترجمہ۔ یہ بات ہر طرح ظاہر ہے کہ پچھلی امتوں پر جمعہ کی تعظیم واجب تھی بغیر کسی خصوصیت قومی کے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے دن کا انتخاب اُن کے اپنے ہی غور و فکر کے سپرد کر دیا تاکہ اُس دن میں اُن کی عبادت شرعیہ قائم ہو سکے۔ تو اُن امتوں نے اپنے اپنے اجتہاد میں اختلاف کیا اُس دن کے انتخاب میں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بارے میں کوئی ہدایت نہ دی اور اللہ کریم جلّ مجدہٗ نے اس پیاری امت پر ظاہر طور پر خود جمعہ کو منتخب و مقرر فرمایا اور نہ سونپا ان مسلمانوں کے اپنے اجتہاد یعنی غور و فکر پر پس مسلمان اس دن کی فضیلت کی وجہ سے کامیاب ہو گئے فرمایا اور بیشک روایت آئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کو جمعے کی چھٹی کا حکم دیا اور جمعہ کی فضیلت بتائی تو وہ مناظرہ کرنے لگے کہ بیشک ہفتہ کا دن افضل ہے تو رب کی طرف سے فرمایا گیا کہ چھوڑ دیجئے اُن کو۔ ان بارہ دلائل سے یقینی طور پر واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کو ضروری یہ کہ جمعے کے سارا دن چھٹی کریں کیونکہ یہی اس دن کی تعظیم ہے۔ اور دن بھر عبادت کریں۔ دلیل ۱۲ بحمدہٖ تعالیٰ پاکستان میں تو اب چند ماہ سے جمعہ کی قانونی چھٹی شروع ہوئی ہے جس کو پاکستان کے سابق سربراہِ مملکت ذوالفقار علی بھٹو نے رائج کیا۔ خدا اس کو راحتیں دے سیاسی یا مذہبی طور پر اس کو کتنا ہی برا کہا جا سکتا ہے مگر تاریخ میں دو یادگاریں اس کی نہیں مٹائی جا سکیں ایک جمعہ کی چھٹی جو اسلامی مملکت کا عظیم نشان ہے۔ دوسری مرزائیوں کو اقلیت قرار دینا یہ ایسا کارنامہ ہے کہ تاریخ پاکستان میں کسی سربراہ نے ایسا نہ کیا حالانکہ پاکستان اسی لئے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ان ہی نشانات اسلامیہ کو قائم کرنے کے لیے مسلمانوں نے اپنے بچوں کے خون

منا رہے تھے۔ یہ توفیق ذوالفقار علی بھٹو کی قسمت میں تھی پاکستان کی تیس سالہ زندگی میں انگریز کی غلامی کا طوق پاکستانیوں کی ذہنی گردنوں سے نہ اترا اور تمام عیسائی قانون کی طرح اتوار کی چھٹی ہی مسلمانوں پر مسلط رہی۔ اب اگر چند ماہ سے پاکستان کی قسمت جاگی تو نام نہاد مسلمان بلکہ بعض بھولے بھالے بیوقوف نادان مسلمان اس پر معترض ہونے شروع ہوئے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اتوار کی چھٹی پر کبھی اعتراض نہ کیا۔ تاریخ اسلام سے پتہ چلتا ہے کہ شروع اسلام سے تمام اسلامی مملکتوں اور ہزار سالہ دور اسلامی میں جن سلاطین نے اپنی اپنی حدود سلطنت میں اسلامی قانون جاری کیا انہوں نے سب سے پہلے جمعہ کی مکمل چھٹی کو قانونی حیثیت دی اور خود بھی چھٹی کی رعایا سے بھی چھٹی کرائی۔ بلکہ مغل دور تک جمعہ کا دن مسلمانوں میں چھٹی کا دن مشہور رہا۔ چنانچہ قانون کی مشہور کتاب فوائد اسعد ابن رشد اور رموز ارشاد۔ جلد سوم صفحہ ۵۲۳ پر ہے۔ كَانَتِ الْبَطَالَةُ مَعْرُوفَةً فِي يَوْمِ الثُّلَاثَاءِ وَالْجُمُعَةِ وَفِي رَمَضَانَ وَالْعِيدَيْنِ (ترجمہ) ممالک اسلامیہ میں تعطیلِ یومیہ منگل اور جمعہ اور تعطیلِ سالانہ پورے رمضان المبارک اور عید الفطر و عید الاضحیٰ کی چھٹیاں اسلامی کیلنڈر میں شروع سے ہی جاری اور مشہور تھیں۔ یہی نہیں بلکہ آج بھی جہاں جہاں اسلامی سلطنت ہے اور اسلامی قانون جاری ہے وہاں جمعہ کی چھٹی ہفتہ وار منائی جاتی ہے۔ چنانچہ افغانستان ایران، لیبیا۔ ترکی۔ جاوا۔ سماٹرا، شام، عراق، مصر، حجاز مقدس (موجودہ سعودیہ عرب) کویت، قطر۔ دبئی، اسلامی افریقہ وغیرہ ملکوں میں جمعہ کے دن قانونی چھٹی ہوتی ہے اور جمعہ کی چھٹی کو ایک عظیم الشان اسلامی نشان سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ والد محترم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وقدس سرہٗ ۔ نے اپنے سفر نامہ حصہ سوم فی الحال قلمی نسخہ میں ایک مکالمہ اس طرح درج فرمایا کہ ایک پاکستانی اور ایک شامی عرب میرے قریب بیٹھے ہوئے اس طرح گفتگو کر رہے تھے یہ مکالمہ دور ایوب سے پہلے کا ہے۔ سابق صدر ایوب خان مرحوم کا بھی پاکستانیوں پر احسان ہے کہ انہوں نے پاکستان کو دیگر اسلامی دنیا میں ایک شاندار اسلامی سلطنت کی حیثیت سے مشہور کیا اور پاکستان کا وقار بلند کیا۔ ورنہ اس سے پہلے عوامی دنیا میں کوئی مسلمان پاکستان اور یہاں کے مسلمانوں سے متعارف نہ تھا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل مکالمے سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ مکالمہ۔

پاکستانی۔ آپ عربی لوگوں نے ایک کافر سربراہ مملکت کو اپنے علاقوں میں بلا کر اس کو رسولِ امن کا لقب دیا یہ تو بڑا ظلم عظیم ہے۔ شامی عرب۔ کون کافر سربراہ کون سا ملک آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟ پاکستانی۔ ہندوستان جو مشرکین کا ملک ہے اس کا سربراہ مشرک پنڈت نہرو اس کو نجدی وہابیوں نے اپنے ملک بلایا اور رسولِ امن کے نعرے لگا کر اس کا جلوس نکالا۔ شامی عرب۔ کیا ہندوستان میں کافر ہیں؟ بڑی حیرت کی بات ہے۔ ہم عوام میں تو حکومتوں نے یہی مشہور کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ہے پاکستانی

یہ بخود کو اس حکومت کی ذاتی شرارت ہے۔ حالانکہ حکومتی سطح پر سب کو معلوم ہے کہ وہ کافر ہیں بت پرست ہیں ہندوستان کے مدرسہ دیوبند کے وہابی مشرک نواز کافر نواز ہیں۔ اور ہم مسلمانوں کے دشمن ہیں حکومت ہند تو مسلمانوں کی سخت دشمن ہے۔ شامی عرب۔ آپ کون سے ملک میں رہتے ہیں وہاں کس کی حکومت ہے پاکستانی۔ ہم پاکستان میں رہتے ہیں ہمارا ملک سچا مسلمانوں کا ملک ہے اور ہم عرب لوگوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ شامی۔ یا للعجب واللہ۔ کیا تم پاکستانی ہو۔ پاکستان کافروں کا ملک ہے بڑا ظالم ہے ہم کو یہی بتایا۔ سکھایا جاتا ہے۔ اچھا بتاؤ کیا پاکستان میں اسلامی قانون جاری ہے۔ پاکستانی۔ شرمندہ ہو کر۔ نہیں۔ شامی۔ کیا پاکستان میں جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے۔ پاکستانی جمعہ کو چھٹی نہیں ہوتی اتوار کو ہوتی ہے۔ شامی عرب تو پھر تم کیسے کہتے ہو کہ پاکستان اسلامی ملک ہے۔ حضرت حکیم الامت نے اس کے بعد سفرنامے میں تحریر فرمایا کہ پاکستانی بچارا بالکل خاموش ہوگیا۔ تو میں نے بڑھ کر ہندوستان اور پاکستان کی تاریخی زندگی اور بہت طریقے سے اس کو سمجھایا کہ ہندوستان در پردہ کیا ہے اور پاکستان کا دل آپ عرب لوگوں کے ساتھ کس طرح محبت رکھنے والا ہے میری پر اثر اور حقیقت پر مبنی پندرہ منٹ تقریر سن کر اس عربی کے آنسو نکل آئے اور بغل گیر ہوا مگر ہندوستان کو تو میرے سمجھانے پر کفرستان مان لیا لیکن پاکستان کو اسلامی ماننے پر تیار نہ ہوا اور تعجب سے بار بار کہتا تھا کہ جب جمعہ کی چھٹی تک نہیں ہوتی تو وہ اسلامی ملک کیا ہے۔ جس سے پتہ لگا کہ آج بھی اہل عرب کے نزدیک جمعہ کی چھٹی اسلام کا بڑا شعار ہے۔ بلکہ جہاں جمعہ کی قانونی چھٹی نہ ہو اس ملک کو اسلامی ملک کہنے کے لیئے اُن کا ذہن تیار نہیں ہوتا اب پاکستانی مسلمان خود اندازہ لگالیں کہ جمعہ کی چھٹی اسلامی برادری میں کتنی اہم ہے۔ جس کی بیوقوف مخالفت کر رہے ہیں۔ اور پھر خود پاکستان کی سرزمین میں بھی انگریز خبیث کے سو سالہ دور کی بنا پر اتوار کی چھٹی مسلط ہوئی ورنہ انگریزی دور سے پہلے یہاں بھی جمعہ کو ہی چھٹی ہوتی رہی۔ اسی کی برکت سے اسلامی حکومتیں پنپتی اور اقوامِ عالم پر مسلط ہوتی رہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ عقلی نقلی بے شمار دلائل سے ثابت کر دیا گیا کہ جمعہ کی چھٹی مسلمانوں کو لازم اور مستحب ہے۔ یعنی حکماً شرعاً مستحب اور اسلامی سیاست کے لحاظ سے ضروری و لازم ہے۔ رہا یہ کہنا کہ لوگ غفلت میں پڑ گئے ہیں۔ یہ بالکل بے معنی بات ہے۔ دو وجہ سے پہلی وجہ یہ کہ جو لوگ خوفِ خدا و عشقِ جنابِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعمت عظمیٰ سے مزین ہیں وہ تو کبھی بھی نماز جمعہ اور ذکرِ الٰہی کی لذت سے دور اور غافل نہیں ہو سکتے اور جو غافل ہیں اُن کے لئے ہزار بہانے وہ پہلے بھی کب پڑھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ جو لوگ نماز کی اہمیت کو سمجھتے ہیں وہ جہاں بھی چلے جائیں وہیں نماز پڑھ لیں گے کوئی ضروری نہیں کہ اپنے علاقے میں ہی جمعہ پڑھے جہاں جائیں وہیں جمعہ پڑھ سکتے ہیں۔ جو لوگ اس فتوئے شرعی اور اس کے عقلی نقلی و تاریخی مضبوط دلائل کو ملاحظہ کر کے اب بھی جمعہ کی تعطیل کی مخالفت کریں اور اتوار کی ہی حمایت کریں وہ یہود و نصاریٰ کے مشابہ ہیں اللہ

مسلمانوں پر رحم فرمائے اور ان کی بے توفیقی کو دور فرمائے۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

کتبـــا

نماز میں علمِ تجوید کے اصول کے مطابق تلاوت کرنے کا حکم

سوال ۲۷ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ہماری جامع مسجد میں ایک حافظِ قرآن نئے نئے خطیب آئے ہیں وہ دورانِ نماز قرأت سورۂ اخلاص اس طرح پڑھتے ہیں اور دانستہ طور پر اس طرح کرتے ہیں اللہ الصمد کو ان اللہ الصمد پڑھتے ہیں تو کیا اس طرح لفظوں کی زیادتی جائز ہے یا نہیں نمازی کہتے ہیں کہ اس طرح پڑھنا جائز نہیں ہے۔ خطیب صاحب کہتے ہیں کہ جائز ہے۔ نمازیوں اور امام صاحب میں کافی جھگڑا چل رہا ہے۔ ہم لوگ کافی پریشان ہیں امام صاحب اور تمام نمازیوں نے بالآخر آپ کے فتوے کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ بحمدہٖ تعالیٰ آپ کا فتویٰ مسلمانوں میں سب سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کو جلد از جلد فتویٰ عطا فرمایا جائے۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا دستخط سائل۔ از قاضی نور حسین۔ معرفت صوفی فضل حسین زمیندارہ ٹی سٹال نزد ڈاکخانہ سکھو تحصیل گوجرخان۔ ضلع راولپنڈی۔ ۱۰/۹/۱۱

بعون العلام الوھاب

الجوابـــ

سوال مذکورہ میں تلاوت کا جو نقشہ سائل مستفتی نے لکھ کر بھیجا ہے اس سے اقتضاءً یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ خطیب مذکور سورۂ اخلاص کی پہلی آیت قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدْ کے وقفِ جواز پر وقف اختیار کرتا ہے اور لفظِ احد کی دال کو ساکن پڑھتا ہے۔ اس کے بعد۔ دوسری آیت۔ اَللہُ الصَّمَد سے پہلے دو حرف الف اور نون۔ اپنے پاس سے بڑھاتا ہے۔ اور الف کو پیش۔ نون کو زیر۔ اور لفظ اللہ کی آخری ہا کو زیر یعنی اَللہِ پڑھتا ہے۔ چونکہ یہ تلاوت صرف آپ کی تحریر سے ہی اس طرح ثابت ہو رہی ہیں نے خود قاری صاحب مذکور کی زبان سے نہیں سنا۔ اور سوال سے ہی یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ قاری صاحب مذکور اس طرح پڑھنے کو بالکل جائز مانتے ہیں اور صحیح سمجھتے ہیں لہٰذا صرف سائل کی تحریر کے مطابق قانونِ شرعی کا فتویٰ جاری کیا جاتا ہے کہ ان حالات میں اس طرح تلاوت کرنے والا سخت گناہگار ہے۔ اور اس کے پیچھے نماز فاسد ہے۔ اور خود پڑھنے والے کی بھی نماز نہیں ہوتی۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد اوّل صـ۸۲ پر ہے۔ لَوْ قَرَءَ الْقُرْآنَ فِی الصَّلٰوۃِ بِالْاِلْحَانِ اِنْ غَیَّرَ الْکَلِمَۃَ تُفْسِدُ (ترجمہ) اگر کسی شخص نے نماز میں قرآن مجید کی الحان سے قرأت کی تو اگر کسی لفظ میں تبدیلی آگئی (جو مدّ دین کے علاوہ ہیں) پس نماز فاسد ہو جائے گی۔ فقہاءِ کرام فرماتے

ہیں کہ کسی شخص نے نماز میں اس طرح قرآن پاک پڑھا کہ ایک لفظ یا ایک حرف یا زیادہ حروف ایسے نکل آئے جو قرآن مجید میں اس جگہ نہیں ہیں۔ اس کی حکماً دو صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ پڑھنے والا ذہنی طور پر یہی اعتقاد رکھتا ہو کہ صحیح تلفظ وہ ہے جو مجبوراً میرے منہ نکل رہا ہے۔ مثلاً ش کو س پڑھتا ہے مگر اعتقاد یہی ہے کہ یہاں ش نہیں ہے بلکہ س ہی ہے نماز ٹوٹ جائے گی۔ چنانچہ۔ فتاوٰی درمختار مطبوعہ صـــ۸۲ پر اور فتاوٰی شامی جلد اوّل۔ صـــ۵۹۱ پر ہے۔ اَوْ بِزِيَادَةِ حَرْفٍ فَاَكْثَرَ فَالْتُرَوَاتِ اِعْتَقَدَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ كَذَالِكَ تَفْسُدُ ترجمہ یعنی تلاوت کرتے ہوئے ایک حرف یا زیادہ حرف نماز کی قرأت میں اپنی طرف سے بڑھائے اور عقیدہ یہ رکھا کہ قرآن پاک اسی طرح ہے۔ جس طرح میں نے پڑھا تو نماز ٹوٹ جائے گی دوسری یہ کہ وہ پڑھنے والا یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ جو میرے منہ سے نکل رہا ہے وہ اس طرح ہے۔ تو نماز نہ ٹوٹے گی۔ سوال ہٰذا میں جس طریقۂ تلاوت کا ذکر ہے اس کے متعلق قاری صاحب مذکور کا یہی عقیدہ ہے کہ جس طرح میں نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ پڑھا ہے وہ درست اور اسی طرح پڑھنا چاہیے جیسا کہ سائل کی تحریر سے ثابت ہوا تو شرعاً نماز ٹوٹ گئی اور اس طرح غلط پڑھنے کا گناہ علاوہ از یں ہے لیکن اگر فی الواقع قاری صاحب نے پڑھا تو اسی طرح جس طرح سوال کی تحریر سے میں نے سمجھا۔ مگر وہ اس پڑھنے میں الف نون کو حروفِ قرآن نہیں مانتے اور ایسا پڑھنے کو اپنی زبانی غلطی تصور کرتے ہیں۔ تو اس طرح پڑھنے سے نماز نہیں ٹوٹے گی۔ اگرچہ بچنا اشد لازم ہے۔ کیونکہ اصولِ شریعت کے مطابق اگر نماز میں تلاوت کرتے ہوئے صرف دو حرف زائد نکلے تو نماز نہ ٹوٹے گی دو سے زائد حرف نکلے تو نماز فاسد ہوگی۔ چنانچہ فتاوٰی فتح القدیر جلد اوّل صـــ۲۸۲ پر ہے۔ وَقِيْلَ الْاَصْلُ عِنْدَهٗ اَنَّ الْكَلِمَةَ اِذَا اشْتَمَلَتْ عَلٰى حَرْفَيْنِ وَهُمَا زَائِدَتَانِ اَوْ اَحَدُهُمَا لَا تَفْسُدُ ترجمہ۔ اور کہا گیا ہے کہ اصل قانون امام اعظم کے نزدیک یہ ہے کہ جب لفظ شامل دو زائد حرفوں پر یا ایک زائد حرف پر تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ امام شافعی کے نزدیک اگر دو حرف بھی کسی نے تلاوت میں اپنے پاس سے شامل کر دئیے تو بھی نماز ٹوٹ جائے گی۔ احناف کے نزدیک کم از کم غلطی سے تین حرف نکلیں تب نماز ٹوٹے گی احناف کے مسلک کی بنیاد اس قاعدۂ نحویہ پر ہے کہ اصل عربی کلمہ یعنی پورا لفظ کم از کم تین حرف کا ہوتا ہے جن میں پہلا حرف ابتدا کے لیئے۔ تیسرا حرف اعراب کے لیئے اور وقف کے لیئے اور دوسرا حرف یعنی درمیانی فاصلے کے لیئے ہے اسی طرح شرح غایہ صـــ۲۸۲ پر ہے مذکورہ فی السوال صورت میں قاری صاحب نے بظاہر طور دو حرف زائد لگائے حالانکہ فقہاءِ کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی نمازی کھانسا یا کھنکارا یا سٹھارا اور تین حرف زائد ظاہر ہو گئے تو بھی نماز ٹوٹ جائے گی۔ چنانچہ فتاوٰی۔ فتح القدیر جلد اوّل صـــ۲۸۲ پر ہے۔ وَاِنْ تَنَحْنَحَ بِغَيْرِ عُذْرٍ وَحَصَلَ بِهِ الْحُرُوْفُ يَنْبَغِيْ اَنْ يَفْسُدَ عِنْدَهُمَا (ترجمہ) اور اگر نمازی کھنکارا بلا وجہ اور حاصل ہوئے اُس سے حروف چند تو لائق ہے کہ

نماز ٹوٹ جائے صاحبین کے نزدیک۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ حروف دو سے زائد ظاہر ہوں اور نمازی اپنی غلطی تسلیم کرتا ہو اور ان کھنکار یا سٹھار یا کسی تلاوتی غلطی سے نکلے ہوئے حروف کو زائد اور غلطی ہی سمجھتا ہو۔ تب تین کی قید ہے۔ لیکن اگر پڑھنے والا یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ جو حرف زاید میرے منہ سے نکلا وہ درست ہے تو اگر ایک حرف بھی زائد نکلا تب بھی نماز ٹوٹ جائے گی۔ جیسا کہ اوپر فتاوٰی شامی کے حوالے سے ثابت کیا گیا۔ دیکھو وَلَا الضَّالِّیْنَ کا اصل آواز لِسَانُ العرب میں۔ پر دال کے طریق پر ہے۔ جیسا کہ قرآءِ عرب سے مسموع ہے اب اگر کوئی شخص اس ایک ہی حرف کو اس کی اپنی آواز سے چھوڑ کر ظا یا زیا ذ کی آواز بنا کر پڑھے تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ چنانچہ۔ فتاوٰی قاضی خان جلد اوّل صـ ۱۴۲ پر ہے۔ ولو قرا۔ وَنَخْلٌ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ قَرَءَ بِالظَّاءِ اَوْ بِالذَّالِ تَفْسُدُ صَلَاتُهٗ۔ وَكَذَا لَوْ قَرَءَ اِلَّا مَا ذُطِرُ تُمْ۔ بِالذَّالِ مَكَانَ الضَّادِ۔ تَفْسُدُ صَلَاتُهٗ (ترجمہ)۔ کسی نمازی نے یہ آیت پڑھی وَنَخْلٌ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ لفظ ہضیم کی ض کو ظ یا ذال بنا کر پڑھتا ہے تو نماز ٹوٹ جائے گی اور اگر مَا اضْطُرِرْتُمْ کو بجائے ض سے پڑھنے کے ذال سے پڑھتا ہے۔ تو بھی نماز ٹوٹ جائے گی یہ تمام گفتگو اس صورت میں ہے جب کہ مذکورہ خطیب صاحب لفظِ اَحَدْ کو وقف پڑھتے ہوں اور جس طرح زبر۔ زیر۔ ڈال کر سائل نے تلاوت کا نقشہ سمجھایا ہے وہ حقیقتاً بھی درست ہو تب مندرجہ بالا قانون و دلائل شرعیہ و عباراتِ فقہیہ کے تحت۔ امام مذکور کو اس طرح پڑھنے سے منع کیا جائے۔ اگر بضد ہوں تو امامت سے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ غلط قرآن پڑھنے والے کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ لیکن اگر اس طرح تلاوت نہیں کرتے جس طرح سائل نے نقشہ کھینچا ہے تو یاد رکھئے کہ شرعی طور پر وہ اختلاف کی گنجائش کی بقواعدِ علمِ تجوید۔ تین طریقے سے تلاوت جائز ہے۔ اور سورتِ ھٰذا کی پہلی دو آیات کو پہلی صورت میں اس طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۔ زیر۔ زبر کو بغور دیکھا جائے۔ یہی قرأتِ مشہورہ ہے۔ اور یہی بہتر ہے دو۲ وجہ سے۔ اوّلاً اس لیے کہ کاتبینِ قرآن مجید حضرات ہر آیت کے اختتام پر تکمیل کی علامت گول ۃ کو ○ اس طرح گول دائرہ بنا کر لکھتے ہیں علمِ قرأت کے مطابق آیت تو۔ یہاں مکمل ہو جاتی ہے۔ لیکن بحیثیتِ سیاق و سباق۔ بعض جگہ وقفِ فرض ہوتا ہے بعض جگہ واجب بعض جگہ جائز۔ بعض جگہ ممنوع۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کے بعد آیت پر وقفِ جواز کا نشان ج لکھا ہے جس میں ٹھہرنا۔ نا ٹھہرنا۔ اگرچہ دونوں جائز ہیں۔ مگر بہتر ٹھہرنا ہے یعنی وقف کرنا اور لفظِ اَحَدْ کی دال کو ساکن پڑھنا ہی بہتر ہے۔ رموزِ قرآنیہ میں۔ دو رمز۔ ایسے ہیں جو وقف جواز کو ثابت کرتی ہیں ع ا۔ ج۔ ع ۲۔ ز۔ مگر ہر دو میں فرق یہ ہے کہ ج میں وقف بہتر۔ اور۔ ز۔ میں نا وقف بہتر۔ سورۂ اخلاص کی۔ اس پہلی آیت میں چونکہ حرفِ ج علامت جواز ہے لہٰذا لفظ اَحَدْ پر وقف ہی بہتر ہے۔ پس ہر قاری کے لیے یہاں سانس

توڑ کر وقف کرنا ضروری بعدہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ کو با فصل ابتدائً پڑھنا ضروری۔ اس طرح کہ لفظِ اللہ کے الف ہمزہ کو زبر دی جائے۔ اسی طرح پڑھنا بہتر ہے۔ ثانیاً اس لیئے کہ۔ عام طور پر سب مسلمان اسی طرح پڑھتے ہیں یہ طریقہ عوام میں جاری و ساری اور مشہور ہے۔ اور فقہ اسلام کے فرمودہ قانون کے مطابق۔ جب فتنے اور پریشانی عوام کا اندیشہ ہو تو تلاوت قرأتِ مشہورہ کرنا ضروری ہے نہ کہ شاذہ میں۔

دوسری صورت اس آیت مبارکہ کے پڑھنے کی اس طرح ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدُنِ اللّٰهُ الصَّمَدُ۔ یعنی لفظ اَحَدُ پر ایک پیش اور ساتھ ہی چھوٹی نون تنوین۔ زیر سے۔ لفظِ اللہ کے آخر میں پیش لگا کر۔ یہ طریقۂ تلاوت اگرچہ جائز ہے مگر بہتر نہیں۔ دو وجہ سے پہلی وجہ یہ کہ لفظِ اَحَدُ پر وقف استحباباً منع ہے جیسا کہ اوپر بتایا کہ نا وقف بہتر۔ دوسری وجہ یہ کہ اس طرح کرنا قرأتِ شاذہ ہے۔ اور قرأتِ شاذہ سے قرآن پاک پڑھنا منع ہے۔ چنانچہ اَلْاِتْقَان جلد اوّل صـ۱۰۹ پر ہے۔ لَا تَجُوْزُ الْقِرَاءَةُ بِالشَّاذِ (ترجمہ) شاذ یعنی غیر مشہور طریقہ سے تلاوت کرنا منع ہے۔ خاص کر عوام کے سامنے۔ مقام تلاوت دو ہیں۔ اندرونِ نماز اور بیرونِ نماز۔ اس میں سب علماء و فقہا کا اتفاق ہے کہ نماز کے اندر قرأتِ شاذہ منع ہے گو بیرونِ نماز امام جزری شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک قرأت باشاذ جائز دیگر ائمہ کے نزدیک عوام کے سامنے بیرونِ نماز بھی قرأتِ شاذہ سے تلاوت منع ہے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ سورۂ اخلاص اس طرح نہ پڑھی جائے بلکہ صاف صاف مشہور طریقہ سے پڑھی جائے۔ جو مروّج ہے۔ ہاں البتہ پڑھ لینے کی صورت میں نماز نہ ٹوٹے گی کیونکہ طریقۂ جواز میں سے ہے۔ جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لفظِ اَحَدُ کے بعد بصورتِ آیت وقفِ جواز ہے جس میں نہ ٹھیرنا بھی جائز ہے۔ اس آیت کے بعد لفظِ اللہ ہے مفسّرین کے اقوال سے یہ ثابت ہے کہ لفظِ اللہ میں۔ الف لام معرفے کا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد اوّل صـ۵۲ پر ہے۔ وَاللّٰهُ اَصْلُهُ اَلْاِلٰهُ كَمَا فِي الصِّحَاحِ اَوِ الْاِلٰهُ كَمَا فِي الْكَشَّافِ وَبِكُلٍّ جِهَةٍ فَحُذِفَتِ الْهَمْزَةُ اِعْتِبَاطًا عَلَى الْاَظْهَرِ وَعُوِّضَ عَنْهَا الْاَلِفُ وَاللَّامُ۔ (ترجمہ)۔ لفظ اللہ دراصل اِلٰہ تھا پہلی ہمزہ یعنی الف زیر والا گرا کر بغیر کسی ظاہری علت کے اُس کے بدلے میں۔ الف لام تعریفی لگایا۔ الف لام کا الف تمام نحات کے نزدیک ہمزہ وصلی ہے۔ علمائے تجوید کے نزدیک ہمزہ تین قسم کی ہے۔ ۱ ہمزہ قطعی ۲ ہمزہ اصلی ۳ ہمزہ وصلی۔ ہمزہ اصلیہ وصلیہ کو ہمزہ زائدہ کہتے ہیں۔ لفظ کے ابتدا میں تو تینوں ہمزہ باقی رہتی ہیں مگر درمیانِ کلام ہمزہ وصلیہ گر جاتی ہے قطعی اور اصلی ہمزہ نہیں گرتی۔ یہ ہم نے ابھی پہلے بتا دیا کہ تمام علماءِ اصول کے مسلک کے مطابق لفظِ اللہ میں بوجہ مُعَرَّفْ بِاللَّام ہونے کے ہمزہ وصل ہے لہذا جب لفظِ اَحَدُ پر وقف کر دیا گیا تو وہ آیت وہیں پر مکمل ہو گئی اور اَللّٰہُ الصَّمَدُ دوسری آیت نئی شروع ہوئی۔ اس طرح پر لفظِ اللہ کی ہمزہ چونکہ ابتدا میں آئی لہذا باقی رہی گی۔

اور پڑھا جائے گا قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدُ ﴿۱﴾ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔ یہ تھا پہلا طریقہ۔ اور جب اَحَدُ پر وقف نہ کیا۔ تو یہ کلام اگلے کلام سے ضرور ملایا جائے گا کیونکہ احد پر اس صورت میں دو پیش آئی واجب ہیں جس کو عربی میں تنوین کہتے ہیں۔ تنوین میں نون پوشیدہ ہے جس کو تجوید والے نونِ قطنی کہتے ہیں۔ یہ نون حالتِ وقف میں گر جاتی ہے۔ لیکن اگر وقف نہ کیا جائے تو باقی رہتے ہوئے اگلے لفظ سے اس لفظ کو جوڑ دیتی ہے اس لئے اَحَدُ کی نون نے جب لفظِ اللّٰہ سے جوڑ پیدا کیا تو لفظ اللّٰہ کی ہمزۂ وصلیہ بیچ کلام میں آگئی۔ پس گر گئی اور نون۔ قطنی لام سے جڑ گئی۔ یہ قانون ہے کہ نونِ تنوین جب تک اکیلی ہو ساکن رہتی ہے مگر جب کسی اگلے حرف سے جڑے تو متحرک یعنی زیر۔ زبر پیش والی ہو جاتی ہے۔ اور قاعدۂ نحویہ مشہورہ ہے کہ اَلسَّاکِنُ اِذَا حُرِّکَ حُرِّکَ بِالْکَسْرِ (ترجمہ) حرف ساکن جب متحرک ہو تو زیر سے متحرک ہوگا۔ یعنی حرفِ ساکن کو زیر کی حرکت ہی دے سکتے ہیں۔ پس نونِ قطنی ساکنہ متحرک ہو کر لام سے جڑ گئی اور اب تلاوت اس طرح ہوگی قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدُنِ اللّٰہُ الصَّمَدُ یہ طریقۂ تلاوت اگرچہ جائز ہے مگر نماز میں بوجہ شاذ ہونے کے پڑھنا بہتر نہیں لہٰذا اس فتوئے شرعیہ کے حکم سے خطیب مذکور کو اگر وہ اسی طرح پڑھتے ہیں تو آئندہ کے لئے منع کیا جائے۔ اور کہا جائے کہ یہ قرأتِ شاذہ چھوڑ کر قرأتِ مشہورہ سے تلاوت کیا کرو اگر وہ اسی پر اصرار کریں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا بہتر نہیں۔ اخلاص کی ان آیات کی تلاوت کا تیسرا طریقہ اس طرح ہے۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدَ نِ اللّٰہُ الصَّمَدُ۔ یعنی لفظِ اَحَدٌ کی دال پر زبر لگائی گئی۔ یہ قرأت بھی اگرچہ جائز ہے مگر شاذ ہے۔ کیونکہ اس طرح پڑھنے کو صرف امام ساداتُ القرّاء ابو جعفر یزید بن تعقاع مدنی جائز مانتے ہیں ان کی قرأت قراءۃِ عشرہ میں سے ایک ہے مگر شاذ ہے۔ لفظِ اَحَدٌ کی دال پر زبر پڑھنا اہلِ کوفہ کے نحویوں کے نزدیک جائز ہے۔ وہ نحاۃِ کوفہ فرماتے ہیں کہ حالتِ متحرک میں ہمزہ وصلیہ کی حرکت ماقبل کو دے دینا جائز ہے۔ چنانچہ نحو کی کتاب اَلْاِنْصَافُ فِیْ مَسَائِلِ الْخِلَافِ جلد دوم ص ۱۳۲ پر ہے۔ ذَھَبَ الْکُوْفِیُّوْنَ اِلٰی اَنَّہٗ یَجُوْزُ نَقْلُ حَرَکَۃِ ھَمْزَۃِ الْوَصْلِ اِلَی السَّاکِنِ قَبْلَھَا (ترجمہ) کوفے کے نحوی اس طرف گئے ہیں کہ ہمزۂ وصل کی حرکت اس کے پہلے حرف کی طرف منتقل کرنی جائز ہے جو ساکن ہو۔ تو اس صورت میں طریقۂ تلاوت اس طرح بنتا ہے کہ لفظِ اَحَدٌ کو وقف کرو پھر لفظِ اللّٰہ کی حرکتِ ہمزہ اَحَدٌ کی دال پر لگا دو۔ اور چونکہ اَحَدٌ میں مانع تنوین کوئی نہیں اس لئے وہ منتقلہ حرکت بجائے ایک زبر کے دو زبر کی تنوین ہو کر تلاوت ہوگی اور بوجہ وصل مابعد۔ نونِ تنوین ظاہر مکسور ہو گئی۔ مگر یہ قرأت بھی شاذ ہونے کی بنا پر ممنوع ہے۔ اگرچہ اس طرح پڑھنے سے بھی نماز نہ ٹوٹے گی۔ یہ تھیں وہ تین قرأتیں جن میں جواز کی صورتیں نکلتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سورۂ اخلاص کی ان آیات کے پڑھنے کے چار طریقے ظاہر ہوئے جن میں تین جائز اور ایک ناجائز ہے۔ پہلے تین قرّاء اکابر کی عبارت

سے ظاہر اور ایک آخری طریقہ جو سوال سے ظاہر ہے وہ بالکل ناجائز ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدُ ۚ اَنِ اللّٰهُ الصَّمَدُ یہ طریقہ قطعاً غلط ہے اگر دھوکے اور لغزش سے پڑھیگا تو نماز باکراہت ہوگی لیکن اگر صحیح سمجھ کر پڑھے گا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ پس بہتر یہی کہ پہلا طریقہ مشہورہ ہی اختیار کیا جائے۔ تاکہ نہ گناہگاری لازم آئے نہ قوم کی پریشانی۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

دوسری جماعت کیلئے اذان و تکبیر کہنا منع ہے

سوال نمبر ۲۸ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ ایک آباد اور بستی کی مسجد میں وقت مقررہ پر اذان اور تکبیر کے ساتھ جماعت نماز امام مسجد نے پڑھادی ہے۔ پھر کچھ لوگ جمع ہوگئے تو انہوں دوسری جماعت کرائی۔ ایک مقتدی نے تکبیر پڑھی اور امام صاحب جو عالم بھی مشہور ہیں انہوں نے جماعت کرائی۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ دوسری جماعت کے لیے تکبیر نہیں ہوتی تو انہوں نے فرمایا کہ تکبیر ہر جماعت کے لیے ہونی چاہئیے فرمایا جائے کہ کیا مسئلہ اسی طرح ہے جس طرح ان عالم صاحب نے فرمایا۔ جواب باصواب عطا فرمایا جائے۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا

سائل ذوالفقار علی شاہ اچھرہ لاہور۔ ۲۲ $\frac{۴}{۷۹}$

الجواب بعون العلام الوھاب

قانون شریعت کے مطابق آباد شدہ بستی کی مسجد میں جب پہلے مقررہ و معینہ جماعت امام مسجد نے پڑھادی ہو تو دوسری جماعت صحیح مسلک یں جائز ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اُس دوسری جماعت میں نہ اذان ہو نہ تکبیر ہو اور نہ محراب مسجد کی مقابل امام کھڑا ہو یہ تینوں چیزیں جس طرح اول جماعت کے لیے لازم ہیں اسی طرح جماعت ثانیہ کے لیئے منع ہیں۔ بہت سے فقہاء کرام تو جماعت ثانیہ کو صریحے سے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فتاوی بزازیہ برحاشیہ عالمگیری جلد اول صـ۵۶ـ پر ہے۔ تَكْرَارُ الْجَمَاعَةِ يُكْرَهُ اِلَّا اِذَا كَانَ الْمَسْجِدُ عَلٰی قَارِعَةِ الطَّرِيْقِ۔ (ترجمہ)۔ بستی کی مسجد میں دوسری جماعت کرانا مکروہ ہے۔ لیکن راستوں جنگلوں اسٹیشن کی مسجد میں جس میں امام مقرر نہیں ہوا کرتا وہاں دوسری تیسری جماعتیں جائز ہیں۔ اس طرح فتاوی دُرِّ مختار نے بھی ان لوگوں کا قول اس طرح نقل فرمایا ہے کہ۔ یُکْرَهُ ۔۔۔ فِعْلُهُمَا وَتَكْرَارُ الْجَمَاعَةِ اِلَّا فِي مَسْجِدٍ عَلٰی طَرِيْقٍ فَلَا بَأْسَ بِذٰلِكَ (ترجمہ) بعض کے نزدیک دوبارہ اذان و تکبیر بھی مکروہ ہے اور

جماعت بھی ہاں راستوں کی مساجد میں یہ سب کچھ بلامضائقہ جائز ہے۔ یہ مسلک امام خیر الدین رملی کا ہے اور اُن کے چند ہم نواؤں کا اور امام علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ اور امام ابن عبد اللہ تمرتاشی صاحب فتاوٰی تنویر الابصار کا ہے۔ اور ان کے اِس مسلک کی بنیاد دو روایتوں پر ہے۔ پہلی روایت حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ تعالٰی عنہما کی اور دوسری روایت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ کی۔ مگر یہاں مقصود جماعتِ ثانیہ کے مسلک سے بحث نہیں لہٰذا اِن روایات کا جواب بھی اس جگہ موضوع کے خلاف ہوگا۔ مگر بتا دینا ضروری ہے کہ صحیح مسلک یہی ہے کہ جماعت اوّل کے بعد اسی مسجد میں دوسری تیسری جماعت بالکل جائز ہے۔ اسی پر کثرتُ الآرائے ہے۔ لیکن جواز کے قائل فقہاءِ کرام فرماتے ہیں کہ دوسری جماعت کے جائز ہونے میں شرط یہ ہے کہ۔ پہلی جماعت کی ہیئت سے بالکل مختلف ہو۔ پہلی جماعت کی ہیئت یعنی شکل یہ ہے کہ۔ اُس کے لئے اذان پھر تکبیر اور پھر امام کا مقابلِ محراب کھڑا ہونا سنتِ مؤکدہ ہے۔ یہ تینوں چیزیں پہلی جماعت کے لئے بنی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دوسری جماعت کے لیے اِن میں سے کوئی نہ ہو تب ہیئت تبدیل ہوگی۔ اقوالِ فقہاءِ اسلام کو بغور دیکھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت پاک میں نماز کی پہلی جماعت کی بہت اہمیت ہے حتّی الامکان دوسری جماعت سے بچنے کا ہی حکم دیا ہے۔ اور جن بزرگوں نے اس کو جائز قرار دیا ہے وہ بھی جماعتِ ثانیہ کے لئے بہت سی قیود لگاتے ہیں۔ صرف اس لئے تاکہ لوگوں کی غفلت و سستی دور ہو اور پہلی جماعت میں شامل ہو کر شانِ اسلام کا اظہار کریں۔ دوسری جماعت کے عادی نہ بن جائیں دوسری جماعت صرف بحالتِ مجبوری میں ہی ہو سکے۔ پہلی جماعت کی اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے جہاں فقہاءِ ملّت نے مندرجہ بالا متفقہ قیود مقرر فرمائے ہیں وہاں بعض اکابرِ دین نے اور بھی کچھ قیود لگائے ہیں جو اگرچہ متفقہ نہیں مگر پھر بھی قابلِ احترام ضرور ہیں۔ مثلاً ایک روایت امام اعظم سے اس طرح ہے کہ تین آدمی اگر جمع ہو جائیں تو جماعتِ ثانی کرا سکتے ہیں۔ تین سے زائد ہوں تو جماعت ثانی ان کے لئے مکروہ ہے چنانچہ کبیری شرح منیۃ المصلی صـ ۲۲۳ پر ہے۔ وَعَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ لَوْ کَانَتِ الْجَمَاعَةُ الثَّانِیَةُ اَکْثَرَ مِنْ ثَلٰثَةٍ یُکْرَهُ التَّکْرَارُ وَاِلَّا فَلَا۔ (ترجمہ) وہی ہے جو اوپر گزر گیا۔ مقامِ فکر ہے کہ آخر یہ قید کیوں لگی؟ محض اس لئے کہ یہ دوسری جماعت اپنی کثرت کی بنا پر جماعت اولیٰ کی شکل ہو کر دیکھنے والوں کو شبہ نہ کردے۔ امتیازِ قلّت باقی رہے۔ بس اسی بنا پر کثیر فقہاء نے یہ قید بھی لگا دی کہ دوسری جماعت شکل و صورت لوازمات و مقام میں پہلی جماعت سے بالکل مختلف ہو اور جو چیزیں پہلی جماعت کی ہیئت میں شامل ہیں وہ فقط تین ہیں۔ فتاوٰی بزازیہ جلد اوّل صـ ۴۵ پر ہے۔ اِذَا لَمْ یَکُنْ عَلَی الْهَیْئَةِ الْاُوْلٰی لَا یُکْرَهُ وَاِلَّا یُکْرَهُ وَهُوَ الصَّحِیْحُ (ترجمہ) جب دوسری جماعت پہلی جماعت کی شکل پر نہ ہو۔ تو بالکل جائز ہے۔ مکروہ نہیں ہے۔ اور اگر نماز کی دوسری جماعت میں پہلی کی ذرا شباہت پائی گئی تو دوسری۔

جماعت مکروہ ہوگی۔ اور جن تین چیزوں سے جماعت اوّل کی ہیئت کو مزیّن کیا گیا وُہ ۔ اذان ۔ اقامۃ اور محرابِ مسجد ہے ۔ محراب سے مراد وسطِ مسجد ہے نہ کہ موجودہ دور کی منشکّل محراب کا طاق کیونکہ یہ طاقنما محراب تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانۂ پاک میں تھا ہی نہیں بعد کی ایجاد ہے ۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد سوم ص ۲۲۲ پر ہے ۔ وَلَیْسَ الْمُرَادُ بِہَا الطَّاقَاتُ الَّتِیْ تَقِفُ فِیْہَا الْاَئِمَّۃُ فِی الْمَسَاجِدِ اِذْ ہِیَ حَادِثَۃٌ فِی الْمَسَاجِدِ بَعْدَ مَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَسُمِّیَتْ بِالْمَحَارِیْبِ تَشْبِیْہًا لَّہَا بِالْاَبْنِیَۃِ الْمُرْتَفِعَۃِ لِاَنَّہَا رَفِیْعَۃُ الْقَدْرِ وَلِذَا خَصُّوْہَا بِالْاَئِمَّۃِ ۔ (ترجمہ) محراب سے مراد وُہ طاق نہیں جن میں امام کھڑے ہوتے ہیں مسجدوں کے اندر کیونکہ وُہ تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے بعد ایجاد ہوئے ہیں ان کا نام محراب صرف امتیاز بلندی کی وجہ سے رکھا گیا اس لیے کہ محراب یعنی وسطِ مسجد شرعًا بلند عزت والا ہے اور امام بھی قوم میں مرتبہ بلند پر فائز ہوتا ہے للٰہذا محراب امام کے لیے خاص کیا ۔ پس ثابت ہوا کہ دوسری جماعت کے لیئے محراب نہیں ہو سکتا ۔ چنانچہ فتاویٰ ردّ المحتار جلد اوّل ۔ ص ۳۶۷ پر ہے ۔ وَعَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ اِذَا لَمْ تَکُنْ عَلَی الْہَیْئَۃِ الْاُوْلٰی لَا تُکْرَہُ وَاِلَّا تُکْرَہُ وَہُوَ الصَّحِیْحُ وَبِالْعُدُوْلِ عَنِ الْمِحْرَابِ تَخْتَلِفُ الْہَیْئَۃُ (ترجمہ) اور امام یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جب کہ نہ ہو وُہ جماعتِ ثانیہ پہلی جماعت کی شکل پر تو مکروہ نہ ہوگی ورنہ مکروہ ہوگی اور یہی صحیح مسلک ہے یعنی اس پر فتویٰ ہے ۔ اور مصنّف کا فرمان ہے کہ محراب سے ہٹ کر جماعت کرانا بھی ہیئت کو بدل دیتا ہے ۔ للٰہذا معلوم ہوا کہ دوسری بار جماعت کرانے کے لیئے محراب سے ہٹ کر دائیں بائیں ہونا لازم ہے کیونکہ محراب یعنی وسطِ مسجد پہلی جماعت کے لیئے بنا ہے ۔ اس طرح اذان و تکبیر بھی پہلی جماعت کیلیے بنا ہے ۔ چنانچہ فتاویٰ تنویر الابصار مع درمختار اوّل ص ۳۵۶ پر ہے ۔ وَہُوَ سُنَّۃٌ لِلرِّجَالِ فِیْ مَکَانٍ عَالٍ مُؤَکَّدَۃٌ ہِیَ کَالْوَاجِبِ فِیْ لُحُوْقِ الْاِثْمِ (ترجمہ) :۔ اذان پنجوقتہ فرائض کے لیئے سُنّتِ مؤکدہ ہے مرد کے لیئے اُونچی جگہ میں مثل واجب کے ہے اس کے ترک پر گناہ لاحق ہے ۔ اور تکبیر بھی اسی درجے کی ہے بعض کے نزدیک اقامت اذان سے بھی افضل اور مؤکدہ ہے ۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے :۔ وَالْاِقَامَۃُ کَالْاَذَانِ ۔ اَیْ وَہِیَ سُنَّۃٌ لِلْفَرَائِضِ (ترجمہ) اور تکبیر جماعت مثل اذان کے سُنّتِ مؤکدہ ہے ثابت ہوا کہ یہ دونوں چیزیں پہلی جماعت کے لیئے ہی ہیں پس دوسری جماعت کا ان سے خالی ہونا ضروری ہے بدیں وجہ فقہاءِ اُمت نے جہاں کہیں بھی جماعتِ دوم کی اجازت بلا کراہت دی ہے وہاں یہی فرمایا ہے کہ بغیر اقامۃ اور بغیر اذان چنانچہ ارشاد ہے ۔ فتاویٰ دُرِّ مختار جلد اوّل ص ۵۱۶ پر ۔ وَیُکْرَہُ تَکْرَارُ الْجَمَاعَۃِ فِیْہِ بِاَذَانٍ وَّاِقَامَۃٍ فِیْ مَسْجِدِ مَحَلَّۃٍ لَا فِیْ مَسْجِدِ طَرِیْقٍ :۔ اسی طرح فتاویٰ شامی جلد اوّل

ص ۵۱۶ پر ہے۔ یُکْرَہُ تَکْرَارُ الْجَمَاعَۃِ فِیْ مَسْجِدِ مُحَلَّۃٍ بِاَذَانٍ وَّاِقَامَۃٍ (ترجمہ)۔ دوسری جماعت محلے کی آباد مسجد میں اذان اور تکبیر سے مکروہ ہے۔ کبیری شرح منیہ ص ۴۶۴ پر ہے۔ اَمَّا لَوْ کَانَ لَہٗ اِمَامٌ وَّمُؤَذِّنٌ مَعْلُوْمٌ فَیُکْرَہُ تَکْرَارُ الْجَمَاعَۃِ فِیْہِ بِاَذَانٍ وَّاِقَامَۃٍ۔ (ترجمہ) اگر مسجد کا امام اور موذن معلوم اور مقرر ہو یعنی وقت پر اذان و جماعت ہوتی ہو تو دوسری جماعت اذان اور اقامت یعنی تکبیر کے ساتھ منع ہے ہم سب فقہا کے نزدیک۔ فتاوٰی حلیہ جلد اوّل ص ۲۰۱ پر امام ابن امیر حلبی نے فرمایا۔ اَلْمَسْجِدُ اِذَا کَانَ لَہٗ اَہْلٌ مَعْلُوْمٌ فَصَلَّوْا فِیْہِ بِاَذَانٍ وَّاِقَامَۃٍ کُرِہَ بِغَیْرِ اَہْلِہٖ وَلِلْبَاقِیْنَ مِنْ اَہْلِہٖ اِعَادَۃُ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَۃِ (ترجمہ) مسجد جب کہ اُس کا امام وغیرہ اہل معلوم ہوں اور وُہ سب یا ان کے بعض اذان تکبیر کے ساتھ جماعت کرا جائیں تو دوسرے باقی غیر اہل کے لیئے جو بعد میں نماز پڑھنے آئیں مکروہ ہے اذان دوبارہ پڑھنا اور تکبیر دوبارہ پڑھ کر جماعت کرانا۔ اِن عبارات سے کس طرح صاف صاف معلوم ہو گیا کہ دوسری جماعت کے لیئے اذان بھی مکروہ ہے اور تکبیر بھی اور محراب کے مقابل امام کا کھڑا ہونا بھی۔ بغرض کہ تمام فقہاء کرام کا یہی مسلک ہے کہ تکبیر بھی دوسری جماعت کے لیئے منع ہے۔ بعض فقہا نے اس مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے صرف اذان کی کراہت کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ فتاوٰی بحر الرائق جلد اوّل ص ۳۰۳ اور فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل ص ۸۲ پر ہے۔ اَلْمَسْجِدُ اِذَا کَانَ لَہٗ اِمَامٌ مَعْلُوْمٌ وَّجَمَاعَۃٌ مَعْلُوْمَۃٌ فِیْ مَحَلَّۃٍ فَصَلّٰی اَہْلُہٗ فِیْہِ بِالْجَمَاعَۃِ۔ لَا یُبَاحُ تَکْرَارُہَا فِیْہِ بِاَذَانٍ ثَانٍ اَمَّا اِذَا صَلَّوْا بِغَیْرِ اَذَانٍ یُبَاحُ اِجْمَاعًا (ترجمہ) محلہ کی مسجد میں امام مقررہ نے وقت مقررہ پر اذان و تکبیر سے جماعت اوّل کرا دی تو دوسری جماعت دوسری اذان سے جائز نہیں بغیر اذان جائز ہے تمام کے اتفاق سے۔ اِن کتب میں اگرچہ صرف اذان کا ذکر ہے اقامت کا نہیں۔ مگر اس سے تکبیر کا جواز نہیں ثابت ہوتا۔ اس لیے کہ عبارتِ مذکورہ میں حصر پر دال کوئی نہیں اور جب حصر نہ ہو تو فقط ذکر نہ کرنے سے جواز ثابت کس طرح ہو سکتا ہے۔ مثلاً میں کہوں کہ زید آیا تھا تو اس زید کے آنے کا تو ثبوت ہو سکتا ہے خالد کے نہ آنے کا ثبوت کس طرح ہوگا۔ ہاں اگر میں حصر کروں اور یہ کہوں کہ صرف زید ہی آیا تھا تب خالد کی نفی ہوگی۔ پس اسی طرح اگر بحر الرائق و عالمگیری یہ کہتے کہ فقط اذان ثانی منع ہے۔ تب اُن عبارتوں سے اقامت کا جواز نکل سکتا تھا۔ حالانکہ یہ کسی نے نہ کہا کہ جماعت دوم کے لیئے تکبیر پڑھنا جائز ہے۔ جواز کا ثبوت صاف صاف عبارات سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ فقط اپنے خیالات سے۔ بلکہ خود عالمگیری نے اگلی سطور میں اس طرح رقم فرمایا۔ وَفِی الْاَصْلِ لِلصَّدْرِ الشَّہِیْدِ اَمَّا اِذَا صَلَّوْا بِجَمَاعَۃٍ بِغَیْرِ اَذَانٍ وَّاِقَامَۃٍ فِیْ نَاحِیَۃِ الْمَسْجِدِ لَا یُکْرَہُ (ترجمہ) اور صدر شہید رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کی اصل میں ہے کہ جب لوگ دوسری جماعت سے نماز پڑھیں مسجد کے کونے

میں بغیر اذان بغیر تکبیر تو مکروہ نہیں ۔ اس عبارت نے صاف بتایا کہ دوسری جماعت کے لیئے اذان ۔
تکبیر ۔ محراب کے مقابل کھڑے ہونا تینوں منع ہیں ۔ بلکہ خاموشی سے ایک طرف ہوکر کونے میں جاکر دوسری
جماعت کرائیں تاکہ کسی کو زیادہ ظاہر نہ ہو کر یہ اشخص جماعت اوّل کے ترک کا گناہ کر بیٹھے ہیں ۔ یہاں تک کی
عبارت سے مسئلہ بادلائل ثابت ہوگیا اب کسی کو انکار کی یا مخالفت کی مجال نہیں ۔ لیکن یہ سوال ہو سکتا ہے کہ
آخر کیا وجہ ہے کہ جماعت ثانی کی اجازت مل گئی مگر اذان ۔ اقامت ۔ اور محراب کے سامنے کھڑے ہونے کی
اجازت شرعی نہ ملی ۔ تو خیال رہے کہ جماعت ثانی کی اجازت اس بنا پر ہوئی کہ آقائے کائنات صلی اللہ نے اس
کا حکم استحبابی فرمایا ۔ چنانچہ ابوداؤد شریف جلداوّل صـ ۸۵ پر ہے ۔ حَدَّثَنَا مُوْسٰی بْنُ اِسْمٰعِیْلَ ثنا
وُهَيْبٌ عَنْ سُلَيْمَانَ الْاَسْوَدِ عَنْ اَبِي الْمُتَوَكِّلِ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْصَرَ رَجُلًا يُصَلِّيْ وَحْدَهٗ فَقَالَ اَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّيَ مَعَهٗ (ترجمہ)۔
حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے ۔ کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو
جماعت ہوچکنے کے بعد آیا تھا تو آپ نے دوسرے لوگوں کو فرمایا کہ کون شخص اس سے مل کر باجماعت نماز پڑھ
کر اس کو اجر پہنچائے گا ۔ اس حدیث پاک سے تین مسئلے معلوم ہوئے ۔ پہلا مسئلہ کہ جماعت اوّل کے بعد
دوسری جماعت بھی جائز بلکہ بہتر ہے ۔ دوسرا مسئلہ ۔ اکیلے پڑھنے کا اتنا ثواب نہیں جتنا باجماعت اگرچہ
دوسری ہو ۔ دیکھو نبی کریم نے فرمایا کہ اس کو ثواب عطا کرے ۔ نماز کا ثواب تو اس کو ملنا ہی تھا یہ ثواب
کون سا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ ثواب جماعت کا ہے ۔ تیسرا مسئلہ ۔ دوسری جماعت میں نہ اذان نہ اقامت
نہ مقابل محراب ۔ اس لیئے کہ اذان تکبیر کا ذکر ہی نہیں ۔ اور محراب میں اس وقت خود نبی اکرم نور مجسم
صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اسی حدیث شریف سے استدلال کر کے امام احمد بن حنبل امام یوسف
اور امام اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہم اجمعین نے جماعت ثانیہ کو جائز کہا امام مالک اور امام شافعی جماعت ثانیہ سے
منع کرتے ہیں ۔ چنانچہ ترمذی شریف صـ ۳۰ ج اوّل پر ہے ۔ وَهُوَ قَوْلُ غَيْرِ وَاحِدٍ مِّنْ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ
اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَغَيْرِهِمْ مِنَ التَّابِعِيْنَ قَالُوْا لَا بَاْسَ اَنْ يُّصَلِّيَ الْقَوْمُ فِيْ
مَسْجِدٍ قَدْ صُلِّيَ فِيْهِ وَبِهٖ يَقُوْلُ اَحْمَدُ وَاِسْحٰقُ ۔ وَقَالَ اٰخَرُوْنَ مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ يُصَلُّوْنَ
فُرَادٰى وَبِهٖ يَقُوْلُ سُفْيَانُ وَابْنُ الْمُبَارَكِ وَمَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ يَخْتَارُوْنَ الصَّلٰوةَ فُرَادٰى (ترجمہ)
جماعت ثانیہ کا جواز صرف اس حدیث پاک سے ثابت نہیں بلکہ تمام صحابہ تمام تابعین کا بھی یہی فرمان ہے کہ
دوسری جماعت بالکل جائز ہے ان سب نے فرمایا کہ پہلی جماعت ہوچکنے کے بعد اسی مسجد میں دوسری
جماعت کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ یہی مسلک امام احمد بن حنبل کا ہے اور یہی ابو اسحٰق کا اور دیگر اہل

علم نے کہا کہ علیحدہ نماز پڑھ لینا بہتر ہے۔ اس مسلک کو امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اختیار فرمایا یہ حضرات علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ لینے کو پسند کرتے ہیں۔ ان بزرگوں کی دلیل دو روایتیں ہیں پہلی روایت۔ کتاب الحدیث فقہ السنن صـ۱۷ پر ہے۔ عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْبَلَ مِنْ نَوَاحِی الْمَدِیْنَۃِ یُرِیْدُ الصَّلٰوۃَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا فَمَالَ اِلٰی مَنْزِلِہٖ فَجَمَعَ اَھْلَہٗ فَصَلّٰی بِھِمْ (ترجمہ) روایت حضرت ابو بکرہ سے ہے کہ بیشک تشریف لائے آقا صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں نماز کے ارادے سے تو دیکھا کہ جماعت ہو چکی ہے تو آپ گھر تشریف لے گئے اور وہاں اپنے اہل بیت کو جمع کیا اور جماعت کرائی۔ یہ روایت طبرانی نے نقل فرمائی۔ غالباً اسی روایتِ شاذہ سے امام مالک و شافعی استدلال عدمِ جواز پر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر دوسری جماعت جائز ہوتی تو نبی پاک علیہ الصلوٰۃ السلام اسی جگہ مسجد میں کیوں نہ جماعت کراتے گھر جا کر کیوں جماعت کرائی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ استدلال نہایت کمزور ہے۔ دو وجہ سے۔ پہلی یہ کہ یہ روایت شاذہ بھی ہے اور مجمل بھی شاذہ تو ظاہر ہے۔ مجمل اس لیئے کہ پتہ نہیں کون سی نماز ہے عصر یا ظہر وغیرہ ہو سکتا ہے عصر ہو اور بعد عصر آپ کے پیچھے نفل کون پڑھتا۔ دوسری وجہ یہ کہ نبی اکرم کے ساتھ کوئی اور نماز پڑھنے والا نہ تھا آپ تنہا تھے ورنہ صحابہ کو وہیں نماز پڑھاتے گھر میں نہ لے جاتے۔ اہل سے مراد ساتھی نہیں بلکہ اہل خانہ ہیں خواہ چھوٹے بچے مستورات۔ ورنہ جمع کا کیا مطلب ہوگا۔ یہ وجہیں سیاقِ کلام سے پتہ لگیں نہ کہ خیالات سے لٰہذا اس روایت سے یہ دلیل لینا کہ جماعتِ ثانیہ منع ہے ہرگز درست نہیں پھر یہ روایت ان مخالفین کے بھی خلاف ہے کیونکہ یہ مطلقاً جماعتِ ثانیہ کو منع کرتے ہیں حالانکہ یہاں گھر میں جماعتِ ثانیہ کا ثبوت مل رہا ہے۔ دوسری روایت فتاویٰ شامی جلد اوّل صـ۳۶۷ پر ہے۔ کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جماعتِ اول کے بعد علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنا بہتر ہے۔ یہ دلیل بھی کمزور ہے دو وجہ سے۔ پہلی وجہ یہ کہ۔ اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ اِذَا فَاتَتْھُمُ الْجَمَاعَۃُ صَلَّوْا الصَّحَابَۃُ فُرَادٰی (ترجمہ) جب صحابہ کی جماعت فوت ہو جاتی تو اکیلے اکیلے پڑھتے یہاں اکیلے پڑھنے میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آتے ہی اکیلے اکیلے ہوں پڑھ پڑھ کر تشریف لے جاتے ہوں۔ کیونکہ لفظِ فرادیٰ اسم عدل ہے بروزنِ ثُلٰثَ بمعنی فرد فرد یعنی اکیلے اکیلے اس صورت میں جماعت ثانیہ ناممکن ہے۔ دوسری جماعت تو تب ہو سکتی ہے جب کہ کچھ لوگ جمع ہوں یا جمع ہو کر آئیں دوسری وجہ یہ کہ حضرت انس صحابہ کو دیکھ کر یہ فرما رہے ہیں اور محض خبر دے رہے ہیں اپنا مسلک جواز یا عدم پر نہ بتایا حالانکہ ہم ابھی ترمذی کی روایت سے صحابہ و تابعین کا مسلک بیان کر چکے ہیں تو اتنے کثیر صحابہ کے مسلک کے مقابل صرف ایک حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی خبر کو عدمِ جواز پر کس طرح دلیل بنایا جا سکتا ہے پس ماننا پڑے گا کہ جماعتِ دوم بالکل جائز ہے اور اسی وجہ سے بھی جماعتِ دوم کی اجازت ضروری ہے کہ لوگ جماعت کے عادی رہیں۔ علیحدہ پڑھنے

کی عادت نہ پڑ جائے ۔ اور دوسری جماعت کے جواز میں یہ بھی حکمت ہے کہ بعض موقعے پر انسان ۔
بشدتِ مجبوری جماعتِ اولیٰ کو حاصل نہیں کر سکتا حالانکہ سخت پابندِ جماعت ہوتا ہے تو دوسری جماعت
سے اس کی علیحدہ پڑھنے کی کوفت ختم ہو جائے گی یہ بھی حکمت ہے کہ بعض دفعہ مسافرت سے لوٹنے
والے کو اپنی ہی مسجد کا صحیح وقت معلوم نہیں رہتا اور جماعتِ اولیٰ فوت کر بیٹھتا ہے ۔ تو اپنے ساتھیوں
کو جماعت کرا کر ثوابِ جماعت حاصل کر لیتا ہے ۔ بہر حال بہت حکمتیں ہیں جماعتِ دوم کے جواز
میں لہٰذا اس کو ناجائز کہنا درست نہیں ہاں دوسری جماعت کیلئے اذان کہنا تمام فقہاءِ کرام نے منع فرمایا
اس کی حکمت یہ ہے کہ اذانِ نماز میں اگرچہ بہت سی حکمتیں و فوائد ہیں مگر سب سے بڑی حکمت نمازیوں
کو بلانا مقصود ہے ۔ چنانچہ فتاویٰ قاضی خان جلد اوّل صـــ ۶۹ ـــ پر ہے ۔ وَالْاَذَانُ شُرِعَ لِاِحْضَارِ
النَّاسِ اِلَى الْمَسْجِدِ لِاَدَاءِ الصَّلٰوةِ وَاِعْلَامِهِمْ بِدُخُولِ وَقْتِ الصَّلٰوةِ (ترجمہ) اذان جائز کی گئی ہے
نمازیوں کو مسجد کی طرف بلانے کے لیئے نماز کو ادا کرنے کے لیئے اور لوگوں کو بتانے کے لیئے کہ نماز
کا وقت شروع ہو گیا ۔ یہ بات تو پہلی اذان سے پوری ہو گئی اب دوبارہ جماعت کے لیئے اذان بیکار
ہے کہ نمازی تو پہلے ہی جمع ہیں جنہوں نے مل کر دوسری جماعت کرنی کرانی ہے ۔ اور وقت دخول اب نہیں
ہوا بلکہ وہ پہلے داخل ہو چکا ہے جس کا اعلان پہلی اذان سے ہو گیا ۔ اب تحصیلِ حاصل ہو گا جو محال ہے دوسری
حکمت یہ کہ پہلی جماعت کو چھوڑنا گناہ ہے اور گناہ کو چھپانا واجب یہ اذان اس جرم کو ظاہر کر دے گی اور لوگوں
کو پتہ لگ جائے گا کہ فلاں عالم صاحب یا سلمان صاحب نے جماعتِ اولیٰ ترک کر دی ہے ۔ تیسری حکمت
یہ کہ ۔ ایک نماز کے وقت ایک ہی مسجد میں دوبارہ اذان فتنے اور فساد کا باعث ہو سکتی ہے ۔ اور
فرقِ باطلہ کو فساد کا ذریعہ ہاتھ آ سکتا ہے ۔ جس سے وحدتِ ملی کو نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ ان حکمتوں کی بنا پر دوسری
جماعت کے لیئے اذان اشد مکروہ ہوئی ۔ اور جس طرح کہ اذانِ ثانی سے مندرجہ بالا نقصانات کا اندیشہٴ
عظیم تھا اسی طرح جماعتِ دوم کے امام کا محراب میں یا اس کے مقابل کھڑا ہونا مندرجہ ذیل نقصان کا
باعث ہو سکتا ہے ۔ ۱ دیکھنے والے کو وہم گزرے گا کہ یہ جماعتِ اوّل ہے ۔ ۲ جو لوگ پہلی
نماز پڑھ چکے ہیں وہ متحیر ہوں گے بلکہ فتنہ بپا کر سکتے ہیں ۳ جماعتِ ثانی کو جماعتِ اوّل کا مقام
دینا گناہ ہے ۴ اس طرح کرنے سے جماعتِ اوّل کا وقار بھی مجروح ہو گا اور ہر شخص من مانی کرتا پھرے
گا ۔ ۵ محراب کے سامنے جماعتِ ثانیہ میں نوافل سے فارغ ہو کر گزرنے والوں کو بھی تکلیف ہو گی جو جھگڑنے کا باعث ہو سکتا ہے یہ ہیں
نقصان محراب کے سامنے جماعتِ ثانیہ میں ۔ مگر یہ نقصان اذان کے نقصان سے قدرے کم ہیں اب جب ایک کونے میں کھڑے ہو
کر جماعت دوم ہونے لگی ہے تو تکبیر کہنا اگرچہ آہستہ ہو قریبی لوگوں کو شبہ میں ڈال سکتی ہے اور تکبیر اسی لیئے کہی جاتی ہے کہ مسجد میں بکھرے بیٹھے لوگ جلد

صفوں شامل ہو جائیں مگر یہاں یہ بات نہیں کیونکہ اکثریت نماز پڑھ چکی ہے اور چند احباب بقیہ ہیں وہ خود ہی قریب ہیں ۔ لہٰذا
اقامہ کہنا عبث ہوا ۔ یہ حکمتیں ہیں تکبیر نہ کہنے میں ۔ مگر یہ ظاہری نقصان نہیں کیونکہ بہت کم کسی کو تکبیر کا پتہ
لگ سکتا ہے ۔ رہا قرأت میں جہر کرنا تو وہ بھی بقدر حاجت کیا جائے گا نہ کہ زیادہ بلند تاکہ دیگر نمازیوں
کی نماز میں خلل نہ پڑے اور نہ ہی اہل محلہ کو اچنبھا ہو ۔ یہ تھیں حکمتیں اذان تکبیر ۔ محراب کا تقابل نہ ہونے میں مگر
کراہت کا ہونا ان حکمتوں پر موقوف نہیں ۔ اس کی بین وجہ یہی ہے کہ جماعتِ ثانیہ جماعتِ اول سے ہیئت
و شکل و شباہت و عظمت و شان میں بالکل جدا رہے ۔ بدیں وجہ اذان ۱ ۔ ۲ تکبیر ۔ تقابلِ ۳ جانبِ محراب تینوں
یکساں مکروہ تحریمی ہو گئے ۔ جیسا کہ مندرجہ بالا کثیر دلائلِ عقلیہ نقلیہ و عباراتِ فقہ سے ثابت کر دیا گیا ۔ مذکورہ
فی السؤال عالم صاحب کو غالباً اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ رضویہ جلد سوم صـ ۲۹۲ والے مسئلے کی اس
عبارت سے دھوکہ لگا جو آپ نے اس طرح لکھی کہ " تکبیر میں حرج نہیں " ۔ اگر یہ ہی عبارت دیکھ کر وہ جماعت
ثانیہ کے لئے تکبیر کے جواز کے قائل ہوئے پھر رہے ہیں تو یہ ان کی کم فہمی ہے ۔ تکبیر بہر حال جماعتِ دوم کے لئے
مکروہ تحریمی ہے ۔ اعلیٰ حضرت کی یہ عبارت بلا کراہت جواز پر دلیل نہیں بن سکتی تین وجہ سے پہلی وجہ یہ کہ
فتاویٰ رضویہ کی یہ عبارت مجمل ہے جب کہ ہم نے فقہاء کرام کی عباراتِ مفسّر واضحہ پیش کیں جن سے
صاف لکھا دکھایا کہ تکبیر بھی مکروہ ہے ۔ لفظ حرج لغت کے اعتبار سے گیارہ معنی میں مشترک ہے ۱
رکاوٹ ۲ غیر فرض ۳ تنگی ۴ مضائقہ ۵ اعتراض ۶ مواخذہ ۷ گناہ ۸ سختی ۔
۹ جرم ۱۰ آنکھ چندھیانا ۱۱ غصہ میں دانت پیسنا ۔ بحوالہ لغات کشوری صـ ۱۵۱ اور المنجد عربی
مصری صـ ۱۲۱ ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ پندرہ جگہ آیا مختلف معنیٰ میں ۔ اعلیٰ حضرت کا صرف یہ کہہ دینا کہ تکبیر میں
حرج نہیں بدیں وجہ مجمل کلام ہے اور کلام مجمل سے کوئی حکم صادر نہیں ہو سکتا ۔ دوسری وجہ ۔ جب
معنیٰ مشترک ہے تو تعیین کرنا شرط ہے ۔ پس یہ عربی لفظ بمحاورۂ اردو عام طور پر تین معنیٰ میں مستعمل ہے ۱ تنگی ۲ نقصان ۳ اعتراض
اور چونکہ میری مادری زبان ہے اس لئے میں بخوبی جانتا ہوں کہ یہ تینوں معنیٰ کس طرح استعمال ہوتے ۔
ہیں ۔ جب کہا جائے " اس کے لئے حرج نہیں " تو لفظِ حرج بمعنیٰ تنگی ہوگا ۔ جب کہا جائے " اس
میں حرج نہیں " تو بمعنیٰ نقصان ہوگا ۔ اور جب کہا جائے " اس پر حرج نہیں " تو بمعنیٰ ۔ اعتراض ہو
گا ۔ اس استعمالی رواج کی رو سے ۔ اعلیٰ حضرت کی یہ عبارت کہ تکبیر میں حرج نہیں بمعنیٰ نقصان ہے
اور مطلب یہ ہے کہ ۔ جماعتِ دوم کے لئے اذان کہنے میں تو سراسر فتنہ کا نقصان ہے محراب
میں کھڑے ہونے سے اندیشۂ نقصان ہے ۔ مگر تکبیر میں حرج نہیں ۔ یعنی دنیوی ظاہری فتنے کا ۔
نقصان نہیں ۔ رہا گناہ تو عند اللہ ضرور ہوگا اگرچہ تھوڑا ہو بشرطیکہ جماعتِ ثانیہ کے لئے تکبیر کی ۔

عادت بنائے اور اس پر مصر ہو۔ ہاں شاذ و نادر میں بھول چوک کی معافی بھی ہو سکتی ہے۔ تیسری توجیہ کثیر فقہاء کی عبارات کے ہوتے ہوئے صرف اعلٰے حضرت کا یہ فرمانا کہ تکبیر میں حرج نہیں۔ عجیب کہ کراہت تکبیر کے اقوال نظرِ اعلٰے حضرت سے بھی گزرے اور ان کی تردید بھی نہ کی گئی۔ ضرور ضرور قابلِ توجیہ و تاویل ہے۔ پس ہماری یہ توجیہ و تاویل کہ حرج کا معنی نقصانِ دنیوی ہے۔ اس لئے بھی درست ہے کہ تصادم و تقابل کا راہ مسدود ہو کر۔ توافق و مطابقت ظاہر ہو جائے لہٰذا بات با دلائل ثابت ہوئی کہ جماعتِ دوم کے لیے تکبیر کردہ تحریمی ہے۔ تحریمی اس لیے کہ فقہاءِ کرام جب بھی مطلق کراہت بولتے ہیں تو تحریمی ہی مراد ہوتی ہے (فتاوٰی شامی۔ فتح القدیر۔ بحر الرائق) میرا یہ فتوٰی اُن عالم صاحب کو دکھایا جائے اگر واقعتاً عالم ہونگے تو سرِ تسلیم خم کر دینگے۔ کیونکہ علماءِ حق ضد نہیں کیا کرتے تصلّب اپنی جگہ درست مگر تعصب سراسر مضر، وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ:۔

کتبـــــــــــــــــــہٗ

اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کا ثبوت

سوال ۹۹ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں۔ کہ آج کل ریڈیو پاکستان لاہور سے تقریباً دو پہر کو ایک پروگرام نشر ہوتا ہے۔ جس پروگرام کا نام " حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ " ہے۔ نام تو اس کا حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ہے۔ مگر سننے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خالص وہابیت کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ وہابیت کے جتنے جاہلانہ عقیدے ہیں۔ وقتاً فوقتاً اُن کی اشاعت کی جاتی ہے۔ کبھی نعت پاک رسول اللہ کی مخالفت نشر ہوتی ہے۔ کبھی درود پاک کی مخالفت میں مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ اور بولنے والا بہت گستاخی کے لہجے میں خطاب کرتا ہے۔ آج کل چند دنوں سے اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کے متعلق ناجائز ہونے کا فتوٰے بار بار سنایا جا رہا ہے۔ اور کبھی کبھی اس کو دبے لفظوں میں گناہ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ جیساکہ سب جانتے ہیں۔ کہ پاکستان کی اکثریت اہلِ سُنّت والجماعت اور درود شریف پڑھنے والوں کی ہے۔ جیساکہ اکثر مساجد سے قبل اذان درود پاک پڑھنے کی صدائیں سن کر اس اکثریت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن آٹے میں نمک کے برابر چند وہابی ریڈیو سے ایسی دل آزار تقریریں نشر کر کے اپنی بداخلاقی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ لہٰذا جنابِ عالی کی خدمت میں یہ استفتاء حاضر ہے۔ ہمیں فتوٰے عطا فرمایا جائے۔ اور دلائل سے ثابت فرمایا جائے۔ کہ اذان سے پہلے الفاظِ اذان کے علاوہ کوئی ذکر یا دعا یا درود شریف

پڑھنا جائز ہے۔ یا نہیں۔ اور کیا پہلے زمانوں میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مخالف کے پاس صرف مندرجہ ذیل دلائل ہیں (۱) درود شریف اذان سے پہلے پڑھنا اذان میں زیادتی ہے۔ لہٰذا درود شریف قبل اذان پڑھنا گناہ ہے۔ (۲) اذان سے پہلے کسی ذکر کا ثبوت قرآن و حدیث میں نہیں ہے (۳) اذان اللہ اکبر سے شروع ہونی چاہیے۔ ذکر کسی اور سے ان باتوں کے علاوہ وہابیوں کے پاس اذان سے قبل درود شریف کے ناجائز کہنے کی کوئی دلیل نہیں۔ لیکن شور اتنا ہے۔ کہ جیسے شریعت انہی کے گھر کی ہے اور ہم نے پیر صاحب پیر کرم شاہ صاحب سے زبانی پوچھا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اذان سے پہلے درود شریف نہیں پڑھنا چاہیے کیونکہ ثبوت نہیں۔ آپ ہمیں مدلل فتوٰے عطا فرمائیں۔

السائل :۔ محمد رفیق گرجاکھی محلہ گوجرانوالہ شہر

نوٹ :۔ ہم یہ فتوٰے اشتہار میں شائع کریں گے۔ اور ریڈیو پاکستان میں بھیجیں گے۔ تاریخ ۱۰ $\frac{۱}{۸۱}$

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

اَلْجَوَابُ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ۔ بعد حمد صلوٰۃ کے فقیر حقیر اقتدار بدایونی قادری نعیمی رضوی۔ عرض گزار ہے کہ اہل اسلام اور اسلام کے نزدیک تمام عبادات میں سب سے اعلیٰ ترین بحیثیتِ ثواب کے عبادت۔ درود شریف پڑھنا ہے۔ اہلِ عشق اکابر فرماتے ہیں کہ نماز پنجگانہ اور سنن و نوافل بھی اگر لازم ہوئے ہیں تو صرف صلوٰۃ وسلام کے لیے ہی۔ بلکہ نماز کا نام اگر صلوٰۃ رکھا گیا تو صلوٰۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم کی اصلیت و مقصدیت کو ظاہر کرنے کے لیے۔ دنیاو اسلام کی کوئی ایسی نیکی نہیں جس کی ابتداء نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نام پاک اور درود شریف کے بغیر ہو۔ بجز ذبح کے کردہ مقام جبر و قہر ہے۔ وہابیانِ زمانہ کو کیا کہا جائے یہ تو صرف نبی اکرم رحمۃ اللعالمین راحۃ العاشقین کے دشمن و گستاخ ہیں اسی لیے برے سے برے ذکر کو پسند کر لیتے ہیں۔ اگر سوت پڑتی ہے تو ذکرِ مصطفٰے سے۔ ان کو شرک کفر یہیں پر نظر آتا ہے۔ ریڈیو لاہور اگر اس طرح کی وہابیانہ اور احمقانہ جہالت کی نشریات جاری کرتا ہے تو یہ صرف فرقہ پرستی کو ہوا دینا ہے۔ ان فضول نشریات سے اہلسنت کو تو قلبی دکھ اور روحانی تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ مگر آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پاک کو روکا نہیں جاسکتا۔ حمقاءِ دیوبند صرف درود شریف کا بڑے زوردار طریقے سے ثبوت مانگتے ہیں یا نعت خوان حبیب کردگار پر ان کو درد اٹھتا ہے اور ثبوت

ثبوت کی آہیں بھرتے ہیں۔ لیکن فی زمانہ ہزاروں کام وہ خود ایسے کرتے ہیں جن کا پہلے زمانوں میں وجود تک نہ تھا ان لوگوں نے اُن کو دین میں داخل کر لیا۔ اگر یہ ثبوت کے اتنے ہی سچے شیدائی ہیں۔ تو ان کو چاہیئے کہ موجودہ مسجدوں کی مضبوط اور پختہ بناوٹ ٹائلوں کی سجاوٹ برقی پنکھوں کی لگاوٹ کا ثبوت پیش کریں۔ کبھی بھی ان کا ثبوت نہیں دے سکتے تو ان ثبوت کے شیدائی وہابیوں کو چاہیئے کہ اپنی ان بے ثبوتی بدعتی مسجدوں کو ڈھادیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ ان وہابی بدعتیوں کے سب کام بے ثبوت ہونے کے باوجود بنے چلے جا رہے ہیں نہ وہاں شرک لازم آتا ہے نہ کفر نہ بدعت پس ثابت ہوا کہ ان ظالموں کو ثبوت سے کوئی محبت نہیں یہ تو صرف ذکرِ مصطفٰے کے دشمن ہیں اسی کو بند کرانا چاہتے ہیں۔ مگر کائناتِ عالم نے دیکھ لیا کہ ذکرِ مصطفٰے علیہ التحیۃ والثناء دن بدن ترقی پر ہے۔ بحمدہٖ تعالٰی اہلسنت کے پاس ہر مسئلے ہر عمل پر دلائل موجود ہیں۔ ثبوت مہیا ہیں۔ بے ثبوتی نسل تو ان ہی گستاخوں کی ہے۔ ہم اہلسنت تو۔ عبارۃً اقتضاءً اشارۃً۔ دلالۃً ہر طرح اپنے مذہب اور عقائد و عملیات پر دلائل دے سکتے ہیں۔ مصیبت تو ان حمقا کو ہے جو بے دھڑک منہ سے بات نکال دیتے ہیں مگر ثبوت کسی چیز کا نہیں دے سکتے۔ جس طرح اہلسنت کے اور سب کام دلائل اور ثبوت کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح اذان سے پہلے درود شریف بآوازِ بلند لاؤڈ سپیکر پر یا بلا لاؤڈ سپیکر پڑھنا بالکل جائز ہے۔ جو منع کرتا ہے وہ بندۂ ابلیس اور جاہل ہے۔ محض دشمنی میں عناد کا اظہار کرتے ہوئے منع کرتا ہے۔ اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کی آٹھ دلیلیں ہیں۔

پہلی دلیل :۔ اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے :۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (ترجمہ) بے شک اللہ تعالٰے اور اس کے تمام فرشتے درود فرماتے ہیں اپنے نبی کریم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اے ایمان والو تم بھی درود شریف پڑھو اُن ہی نبی محمد پر اور خوب خوب سلام بھیجو یہ امر مطلق ہے۔ اور مطلق ہمیشہ ہی مطلق رہتا ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ اس میں قید لگائے نہ الفاظ کی نہ وقت کی پس اس اطلاق سے ثابت ہوا کہ کامل طریقے پر درود شریف ہر طرح کے الفاظ سے ہر وقت پڑھنا جائز ہے۔ خواہ اذان سے پہلے ہو یا بعد میں۔ ہر وہ درود شریف جس میں سلام بھی ہو کامل ہے۔ جس میں سلام نہیں وہ کامل نہیں اس کا پڑھنا منع ہے لہٰذا نماز والا درود ابراہیمی کامل نہیں اس لیئے نماز سے باہر پڑھنا جائز نہیں ہاں نماز کے اندر اس لیئے جائز ہے کہ سلام پہلے پڑھ لیا گیا۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد گیارھویں پارہ ۲۲

صفحہ نمبر ص۸۳ پر ہے :۔ وَاسْتَدَلَّ النَّوَوِیُّ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی بِالْاٰیَۃِ عَلٰی کَرَاھَۃِ اِفْرَادِ الصَّلٰوۃِ عَنِ السَّلَامِ وَعَکْسِہٖ بِوُرُوْدِ الْاَمْرِ بِھِمَا مَعًا فِیْھَا۔ (ترجمہ) امام نووی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے اس آیتِ درود شریف سے دلیل لی ہے کہ فقط ایسا درود شریف پڑھنا جس میں سلام نہ ہو مکروہ تحریمی ہے اور اسی طرح اس کا الٹ کرنا بھی مکروہ ہے یعنی سلام بغیر درود صلوٰۃ پڑھنا بھی منع ہے۔ امام نووی شارح مسلم رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے جلد اوّل ص۱۷۵ پر ایک صحیح حدیث نقل فرمائی کہ صحابہ نے درود شریف کا جب سوال عرض کیا تھا۔ تو وہ یہی تھا کہ ہم نماز میں درود شریف کیسے پڑھیں تب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے درودِ ابراہیمی کی تعلیم فرمائی بہرحال اذان سے پہلے ہر طرح درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ اور قرآن مجید کی اس آیت کے اطلاق سے اقتضاءً ثابت ہے: **دوسری دلیل**:۔ مشکوٰۃ شریف باب الاذان ص۶۴ پر ہے:۔ عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا یَقُوْلُ ثُمَّ صَلُّوْا عَلَیَّ۔ (الخ) (ترجمہ) عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالٰی عنہ نے فرمایا۔ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے مسلمانوں جب تم اذان سنو تو اُس کی مثل الفاظ تم بھی کہتے جاؤ۔ پھر جب اذان ختم ہو جائے۔ تو سب مسلمان مجھ پر درود شریف پڑھو۔ (رَوَاہُ مُسْلِمٌ) اس حدیث شریف سے بالوضاحت ثابت ہوا کہ اذان اور درود شریف کا ابتداء سے ہی تعلق ہے۔ ورنہ اذان کے ساتھ فوراً بعد درود پاک کو حکم نہ دیا جاتا۔ اور جب اذان و درود شریف کی یکدی کی نسبت ثابت ہو گئی تو لازمی بات ہے کہ اذان کے ساتھ درود شریف پڑھنے والا اللہ رسول کا پیارا ہے۔ اور جس طرح ولاالضالین کے بعد آمین کہنے کا ظاہری حکم مقتدیوں کو ہے مگر امام بھی آمین کہتا ہے۔ وہ بھی مقتدیوں کے ساتھ اس حکم میں شامل ہے۔ اسی طرح اذان دینے والا بھی بعد میں درود شریف ضرور پڑھے۔ اور امرِ صَلُّوْا عَلَیَّ نے درود شریف کو واجب کر دیا۔ ثابت ہوا کہ اذان کے بعد درود پاک پڑھنا واجب ہے ہر سننے والے کہنے والے پر اور واجب عبادت کا اظہار اسلام میں ضروری ہے۔ لہٰذا اونچی آواز سے درود شریف پڑھنا ضروری ہوا۔ مگر وہابیوں دیوبندیوں کو دیکھو۔ کہ اُن کی مسجدوں سے اذان کے بعد بھی درود شریف کی آواز نہیں آتی۔ حالانکہ رسول اللہ نے صاف حکم فرمایا۔ ظاہر ہو گیا کہ وہابیوں کو ثبوت سے کوئی غرض نہیں وہ تو ذکرِ مصطفٰے روکنا چاہتے ہیں۔ ریڈیو لاہور سے درود شریف قبل اذان بند کرنے کی تقریریں نشر

ہوتی ہیں مگر ان کو کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ بعد اذان درود شریف پڑھنے کا حکم نشر کریں اور وہابیوں سے پڑھوائیں۔ ایسی جاہلانہ نشریات سن کر عوام یہی تاثر لیتے ہیں کہ ریڈیو لاہور پر وہابی قابض ہیں اور درود شریف کے دشمن ہیں صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اذان کے بعد درود شریف پڑھنا حکم حدیث کے تحت ہے جس سے اذان و درود کا تعلق ظاہر ہوا اور اسی تعلق کا بنا پر قبل اذان درود شریف پڑھنا مستحب ہوا۔ لہٰذا جسطرح بعد والے حکم پر عمل کرنے والا اللہ رسول کا پیارا اسی طرح اذان سے پہلے اپنے عشق سے درود شریف پڑھنے والا اللہ رسول کو زیادہ پیارا ہے کیونکہ عمل خیر کو اپنی محبت سے زیادہ کرنے والا زیادہ محبوب ہے جبکہ ممانعت بھی نہ ہو ثابت

تیسری دلیل :۔ بحوالہ ابن ماجہ و ترمذی مشکوٰۃ شریف جلد اوّل صہ ۶۲ پر ہے۔

وَعَنْ بِلَالٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ لَا تُثَوِّبَنَّ فِیْ شَیْءٍ مِّنَ الصَّلٰوتِ اِلَّا فِیْ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ۔ (ترجمہ): حضرت بلال رضی اللہ تعالٰے عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ مجھ کو آقا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صرف فجر کی نماز کے وقت میں تثویب کیا کرو۔ اس روایت میں حرف فی ظرفیہ ہے اس کا مظروف پورا وقتِ نماز ہے اول فرض سے پہلے پہلے اور پورے وقت میں اذان و تکبیر ہر دو شامل ہیں پس ثابت ہوا کہ فجر کے وقت اذان سے پہلے تثویب جائز ہے اور اذان کے بعد تکبیر ہونے کے وقت تکبیر سے پہلے بھی تثویب جائز ہے۔ تثویب کا لغوی ترجمہ ہے کپڑا ہلا کر کسی کو اپنی طرف متوجّہ کر کے پھر کوئی پیغام سنانا یہ ثوّبَ بابِ تفعیل کا مصدر ہے ثوبٌ کے معنے ہیں کپڑا اور تثویب کے معنی ہیں کپڑا ہلانا اصطلاح میں تثویب کا معنی ہوا اذان سے پہلے لوگوں کو متوجّہ کرنا۔ کہ اذان ہونے والی ہے۔ متوجّہ ہو جاؤ اور اذان سنو اذان سننا بھی عبادت ہے۔ اور اس کا جواب دینا بھی عبادت جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ اسی عبادت کی طرف توجہ دلانے کا نام تثویب ہے مرقات شرح مشکوٰۃ شریف میں تثویب کی لغوی اور اصطلاحی تعریف مرقوم ہے۔ چنانچہ جلد اوّل صفحہ نمبر صہ ۴۱۸ پر ہے۔ اَلْاَصْلُ فِی التَّثْوِیْبِ اَنَّ الرَّجُلَ اِذَا جَاءَ مُسْتَصْرِخًا لَوَّحَ بِثَوْبِہٖ فَیَکُوْنُ ذٰلِکَ دُعَاءً (الخ) (ترجمہ)۔ تثویب کا اصل معنی یہ ہے کہ مرد جب کسی دہشت سے چیختا ہوا آئے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لیے کپڑا ہلائے جب لوگ جمع ہو جائیں۔ تو ان کو بلانے کا مقصد سمجھائے۔ حَتّٰی سُمِّیَ الدُّعَاءُ تَثْوِیْبًا وَقِیْلَ ھُوَ تَرْدِیْدُ الدُّعَاءِ۔ اسی وجہ سے بلانے کا نام تثویب رکھا گیا۔ بعض کے نزدیک تثویب کا معنیٰ ہے دوبارہ بلانا۔ صاحبِ ترمذی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ کیونکہ اس کا ایک راوی ابو اسرائیل شیعہ تھا۔ اس ضعف کی وجہ سے تثویب کا حصر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مرقات نے فرمایا ہے

وَاسْتَحْسَنَ الْمُتَاَخِّرُوْنَ التَّثْوِيْبَ فِي الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا (ترجمہ) :۔ تثویب ہر نماز کے وقت بہت اچھی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ تثویب غفلت اور بے توجہی دور کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ پہلے زمانۂ صحابہ میں صرف قدرتی غفلت کو دور کرنے کے لیے تثویب کا حکم دیا گیا تھا۔ اس وقت صرف فجر کے وقت غلبۂ غنید کی غلفت ہوتی تھی۔ اور کسی وقت غفلت کا شائبہ بھی نہ تھا، اس لیے صرف فجر کے وقت تثویب کا حکم دیا گیا۔ اب ہمارے زمانوں میں۔ لوگ ہر وقت بے توجہ اور غافل رہتے ہیں۔ اس لیے بقولِ مرقات ہر نماز کے وقت تثویب ضروری ہے۔ تاکہ لوگ تثویب کو سن کر اذان سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور اذان کو سن کر نماز کے لیے تیار ہو جائیں۔ جب لوگ دیکھ رہے ہوں۔ تو کپڑا ہلا دینا یا جھنڈا لہرا دینا تثویب ہے۔ مگر جب نظروں سے دور والوں کو متوجہ کرنا مقصود ہو تو تثویب لفظوں سے ادا کرنا پڑتی ہے اور لفظوں میں سب سے بہتر اللہ و رسول کے نزدیک درود شریف کے الفاظ ہیں لہٰذا بنیتِ تثویب ہر اذان سے پہلے درود شریف پڑھنا سنت سے ثابت ہوئی۔ اور اس کا منکر حدیثِ تثویب کا منکر ہے۔ **چوتھی دلیل** :۔ تمام صوفیاء اولیاء اور علماءِ قرآن و فقہاءِ اسلام کا متفقہ مسئلہ ہے کہ ہر دعا سے پہلے اور بعد درود شریف پڑھنا واجب یا مستحب ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد گیارھویں صفحہ نمبر ص۱۸ پر اور تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۲۲۲ پر ہے :۔ وَكَذَالِكَ تَجِبُ الصَّلٰوةُ فِيْ كُلِّ دُعَاءٍ فِيْ اَوَّلِهٖ وَاٰخِرِهٖ۔ (ترجمہ) :۔ اور اسی طرح ہر دعا کے اوّل اور آخر درود شریف پڑھنا واجب ہے۔ یعنی ضروری ہے۔ لغوی اور اصطلاحی اعتبار سے اذان بھی دعا ہے۔ کیونکہ دعا کا معنیٰ ہے پکارنا بلانا مادۂ اشتقاق کے لحاظ سے اس کا معنیٰ ہے دعوت دینا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ۔ یہاں نَدْعُوْ کے معنیٰ ہیں ہم بلائیں گے۔ اس معنیٰ سے اذان بھی بلاوا اور دعا ہے۔ اور بقولِ فقہاءِ عظام ہر دعا کے اول آخر درود شریف پڑھنا لازم لہٰذا اذان سے پہلے اور بعد درود شریف لازم ہے۔ جو اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کو ناجائز کہتا ہے۔ وہ فرمودات فقہاء و مفسرینِ اسلام کا منکر ہے :۔ **پانچویں دلیل** :۔ منکر کہتا ہے :۔ کہ درود شریف اذان سے پہلے پڑھنا اذان میں زیادتی کرنا ہے :۔ میں کہتا ہوں اذان کے الفاظ مشہور ہو چکے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ درود شریف کے الفاظ یہ ہیں۔ اذان کے یہ

ملاوٹ کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ اور پھر زیادتی تب ہوتی جب بیچ میں شامل کیے جاتے۔ جس طرح رافضی شیعہ نے شامل کر لیے اول یا آخر کچھ الفاظ تثویب یا ادب کی نیت سے کہنا گناہ یا زیادتی نہیں۔ آج ہر دیوبندی وہابی اہل حدیث تلاوت کے بعد بالکل متصل کر کے کہتا ہے:۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْم۔ نہ اس کا کوئی ثبوت ہے نہ یہ الفاظ صحابہ نے کہے نہ تابعین نے نہ قرآن وحدیث میں اس کا ثبوت مگر یہ لوگ کہے چلے جا رہے ہیں۔ کیا یہ قرآن مجید میں زیادتی نہیں؟ ثابت ہوا کہ دکھ صرف درود شریف سے ہی ہے۔ ورنہ یہ دیوبندی ہزاروں کام خود بغیر ثبوت کر رہے ہیں:۔ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ اگر ہم اہلسنت درود شریف پڑھیں تو ان ظالموں کو مرچیں لگ جائیں۔ حالانکہ ہم اہلسنت اذان سے پہلے درود شریف پڑھ کر تھوڑا سا وقفہ کرتے ہیں۔ مگر یہ حمقا تلاوت سے متصل ہی۔ صَدَقَ اللّٰہُ۔ کے عربی الفاظ، تلاوت کے لہجے میں ہی ادا کر کے سراسر قرآن مجید میں ملاوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید کے الفاظ اپنی کثرت کی وجہ سے عوام میں متعارف نہیں عام آدمی ان لفظوں کو بھی آیات سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے پاس تو صَدَقَ کے جواز کی بھی دلیل موجود ہے:۔ مگر وہابی کیا دلیل دے گا:۔ بجز ڈھٹائی کے کوئی بچنے کی راہ نہیں:۔

چھٹی دلیل:۔ سوالِ مذکورہ میں منکرِ درود شریف کی دوسری لغو دلیل یہ بیان ہوئی کہ اذان سے پہلے کسی ذکر کا قرآن وحدیث میں ذکر و ثبوت نہیں۔ تیسری دلیل یہ کہ اذان لفظ اللہ سے شروع کرنی چاہیے۔ اس کے سوا لفظ نہ کہنا چاہیے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ یہ دیوبندی وہابیوں کی کم علمی اور احادیث و روایات سے جہالت کی دلیل ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالٰی عنہ جب کبھی اذان دیتے تھے تو وہابیوں کی طرح ایک دم اللہ اکبر سے شروع نہ کرتے تھے بلکہ باآواز بلند اذان دینے سے پہلے دعائیں پڑھتے تھے۔ چنانچہ ابو داؤد شریف جلد اول اور اس کی شرح بذل المجهود جلد اول صفحہ ۲۹۰ پر ہے۔ باب الاذان فوق المنارۃ:۔ فَكَانَ بِلَالٌ يُؤَذِّنُ عَلَيْهِ الْفَجْرَ فَيَأْتِي بِسَحَرٍ فَيَجْلِسُ عَلَى الْبَيْتِ يَنْظُرُ إِلَى الْفَجْرِ فَإِذَا رَآهُ تَمَطَّى ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَحْمَدُكَ وَأَسْتَعِينُكَ عَلَى قُرَيْشٍ أَنْ يُقِيمُوا دِينَكَ قَالَتْ ثُمَّ يُؤَذِّنُ قَالَتْ وَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُهُ كَانَ تَرَكَهَا لَيْلَةً وَاحِدَةً يَعْنِي هٰذِهِ الْكَلِمَاتِ.

(ترجمہ):۔ پوری حدیث شریف کا اس طرح ہے کہ۔ ابراہیم بن سعد روایت کرتے ہیں:۔ محمد بن اسحاق سے وہ محمد بن جعفر بن زبیر سے وہ عروہ بن زبیر سے وہ قبیلہ بنی نجار کی ایک صحابیہ عورت سے کہ ان کا گھر مسجد نبوی شریف سے بہت ہی قریب تھا حضرت بلال اس کی

چھت پر کھڑے ہو کر فجر کی اذان دیا کرتے تھے وہ عورت فرماتی ہیں کہ ہر روز حضرت بلال رضی اللہ تعالےٰ عنہ اذان سے پہلے یہ پڑھا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَحْمَدُکَ وَاَسْتَعِیْنُکَ عَلٰی قُرَیْشٍ اَنْ یُّقِیْمُوْا دِیْنَکَ۔ وہ صحابیہ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی قسم حضرت بلال ہمیشہ ہی اذان سے پہلے یہ دعا پڑھا کرتے تھے میں نے کبھی نہ دیکھا کہ حضرت بلال نے یہ دعا چھوڑی ہو۔ اور اس کے بغیر ہی اذان شروع کر دی ہو۔ سبحان اللہ کیسی مضبوط دلیل ہے اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کی۔ اس روایت سے تین باتیں معلوم ہوئیں پہلی یہ کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اذان سے پہلے دعائیہ کلمات فرمایا کرتے تھے پھر اذان کہتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی منع نہ فرمایا اگر اذان سے پہلے کچھ پڑھنا ناجائز ہوتا تو پیارے آقا صلے اللہ علیہ وسلم فوراً منع فرما دیتے دوسری بات یہ کہ حضرت بلال وہ کلماتِ دعائیہ بہت بلند آواز سے کھڑے ہو کر اذان کی جگہ اذان سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔ اسی لیئے وہ عورت صحابیہ نیچے گھر میں بیٹھی ہوئی یا چارپائی پر بستر میں لیٹی ہوئی اتنے صاف طریقے سے سن لیتی تھیں کہ وہ تمام الفاظ ان کو بھی یاد ہو گئے تھے۔ تیسری بات یہ کہ حضرت بلال نے یہ کلماتِ دعائیہ ایک یا دو دفعہ ہی نہ کہے ہمیشہ ہی ایسا کہتے تھے۔ حضرت بلال کی کوئی اذان ان دعاؤں کے بغیر شروع نہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحابیہ عورت قسم کھا کر فرما رہی ہیں کہ میں نے اپنی ساری زندگی کبھی نہ دیکھا کہ حضرت بلال نے ان کلمات کو چھوڑ کر اذان شروع کر دی ہو۔ جس طرح حضرت بلال اسلام کے پہلے مؤذن۔ ایک دم اذان شروع نہ کرتے تھے بلکہ پہلے دعائیہ کلمات کہہ کر پھر اذان شروع فرماتے تھے اسی طرح آج اور آج سے پہلے ہر اہلسنت مؤذن ایک دم شروع نہیں کر دیتا بلکہ دعائیہ کلمات پڑھ کر اذان شروع کرتا ہے۔ اور جو شخص ایک دم اذان شروع کر دے وہ اذان سنتِ بلالی اور حدیثِ پاک کے خلاف ہے اسی لیئے وہابیوں کی سب اذانیں غلط ہیں۔ کیونکہ حدیث پاک کے خلاف ہیں۔ اہل سنت کی اذانیں چونکہ بغیر درود شریف شروع نہیں ہوتیں اس لیئے نبی پاک کی رضا اور خوشنودی کے مطابق ہیں کیونکہ حضور اقدس نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت بلال کی اُن اذانوں سے راضی تھے جن میں آپ پہلے کلماتِ دعائیہ پڑھ لیا کرتے تھے اسی طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہماری اذانوں سے بھی خوش ہوتے ہیں۔ الحمد للہ تعالےٰ یہ ثابت ہو گیا کہ اذان سے پہلے دعائیں پڑھنا جائز ہیں۔ حضرت بلال پڑھا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے حضرت بلال رضی

قبیلۂ قریش مکہ کی ہدایت کی دعا مانگا کرتے تھے اور دوسرے مؤذن مسلمان درود شریف کے دعا مانگتے ہیں۔ اور حضرت بلال رضی اللہ تعالٰے عنہ۔ کفارِ مکہ کو درست کرنے کی خواہش رکھ کر یہ دعا مانگا کرتے تھے ہم لوگ موجودہ وہابیوں کو درست کرنے کی خواہش رکھ کر اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی درود شریف والی دعا مانگتے ہیں۔ طریقہ ایک ہی ہے فرق صرف الفاظ کے تغیر و تبدل کا ہے۔ اگر حضرتِ بلال کا وہ طریقہ اذان سے پہلے صحیح تھا تو یہ ہمارا طریقہ بھی صحیح ہے۔ اگر اِس کو غلط کہتے ہو تو حضرتِ بلال کے طریقۂ مبارکہ کو کیا کہوگے۔ ہم نے ابوداؤد شریف کی صحیح روایت سے ثابت کردیا کہ اذان سے پہلے درود شریف پڑھنا بالکل جائز ہے۔ اگر اب بھی کوئی وہابی نہ مانے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ابوداؤد شریف صحاح ستہ میں شامل ہر مدرسہ میں دورۂ حدیث کے اسباق میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان احادیث سے سب واقف ہیں۔ لیکن چونکہ وہابیانِ زمانہ کو صرف درود شریف سے دکھ ہے ذکرِ پاکِ مصطفٰے سے عداوت ہے ثبوت سے کوئی دلچسپی نہیں اسی لیے صرف درود شریف اذان سے پہلے پڑھنے کو روکتے ہیں ہم نے کئی دفعہ سنا کہ وہابی لوگ اذان سے پہلے اپنی گم شدہ چیزوں اور جلسوں کا اعلان کرتے ہیں اسی طرح کئی دفعہ بعد اذان بھی مگر وہ سب جائز ہیں۔ اگر ناجائز کا فتوٰے لگتا ہے تو صرف درودِ پاک پر۔ اگر یہ عداوتِ درود شریف نہ ہوتی تو بعد اذان درود شریف کا تو بالکل صاف ثبوت احادیثِ متعددہ میں موجود ہے۔ اس پر عمل کرکے یہ لوگ بعد اذان درود شریف کیوں نہیں پڑھتے اِن کے اعلانوں کی آوازیں دور تک سنائی دیتی ہیں درود شریف کی آوازاِن کے سپیکروں ان کی مسجدوں سے کیوں نہیں سنائی دیتی؟

ساتویں دلیل:۔ بیہقی شریف جلد اوّل صـ۴۲۵ پر۔ ابوداؤد شریف والی حدیث۔ بالکل اُن ہی الفاظ سے اس طرح منقول ہے:۔ ثُمَّ یَنْظُرُ اِلَی الْفَجْرِ فَاِذَا رَاٰہُ تَمَطّٰی ثُمَّ قَالَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَحْمَدُکَ:۔ (الخ) :۔ ترجمہ:۔ وہی قبیلہ بنی نجار کی صحابیہ عورت فرماتی ہیں کہ میرے گھر کی چھت پر حضرت بلال طلوعِ فجر کا انتظار کرتے تھے۔ اور جب فجر کے طلوع کو آپ دیکھ لیتے تھے تو پہلے وہ دعا پڑھتے تھے بعد میں اذان فرماتے تھے۔ ثابت ہوا کہ اذان سے پہلے دعا مانگنی جائز ہے۔ درود شریف بھی دعا ہے لہٰذا وہ بھی جائز۔ حدیثِ پاک کے ابتدائی الفاظ ہیں:۔ کَانَ بِلَالٌ یُؤَذِّنُ:۔ یہ فعل ماضی استمراری کا ہے اور ماضی استمراری دوام اور ہمیشگی کو ثابت کرتا ہے۔ لہٰذا اس فعل استمراری اور حدیث شریف کے آخری لفظ اُن صحابیہ کی قسم کے ہیں کہ وہ قسم کھاکر فرماتی ہیں کہ

حضرت بلال نے یہ دعا کبھی نہ چھوڑی۔ اور اذان سے پہلے یہ دعا ضرور پڑھی اس ابتداوانتہا سے ہمیشگی؛ ثابت ہوئی۔ اور پھر یہ تو ایک بی بی صاحبہ کا فرمان صرف اذانِ فجر سے متعلق ہے دوسری اذانیں بھی یقیناً اسی طرح ہوتی ہوں گی ان صحابیہ نے وہ کسی مصروفیت کی بنا پر نہ سنی ہوگی۔ اور ہم کہتے ہیں کہ جواز کا ثبوت تو اتنا ہی کافی ہے۔ اِن منکروں کو چاہیے کہ کم از کم فجر میں ہی درود شریف پڑھ لیا کرو۔ اور اگر اوّلِ اذان پر تم کو مصیبت آتی ہے تو بعد اذان کیوں رُکتے ہو۔ ثابت ہو گیا کہ تم کو صرف دشمنی ہے جو مسلمانوں کو درود شریف سے روکتے ہو ورنہ اتنے مضبوط دلائل کے ہوتے ہوئے پھر کونسا عذر باقی رہ گیا۔ ہم نے تو صاف قبل اذان سنتِ بلال سے ثبوت دکھا دیا۔ تم صرف کسی تابعی تبع تابعی کا ہی ایسا قول دکھا دو جس میں اذان سے پہلے درود شریف یا کچھ پڑھنے کی ممانعت موجود ہو:۔

آٹھویں دلیل:۔ وہابی دیوبندی ہزار ہا بدعتوں میں مبتلا ہیں مگر ان کی پرواہ نہیں کرتے جب اہلسنت حضرات اذان سے پہلے درود شریف پڑھتے ہیں تو اس کو منع کرتے ہیں حالانکہ قانون شریعت کے مطابق منع کی آٹھ قسمیں ہیں اور ہر قسم کی ممانعت دلیل سے ثابت ہوتی ہے چنانچہ علمِ اصولِ فقہ کی مسلّم کتاب التوضیح کے صفحہ نمبر ۲۱۴ پر ہے:۔ اَلنَّهْیُ لِاِسْتِعْمَالِهٖ فِیْ مَعَانٍ هِیَ التَّحْرِیْمُ وَالْكَرَاهَةُ وَالتَّنْزِیْهُ۔ وَالتَّحْقِیْرُ وَبَیَانُ عَاقِبَتٍ۔ وَالْاِرْشَادُ وَالشَّفْقَةُ وَالْیَاسُ:۔ (ترجمہ) ممانعت آٹھ قسم کی ہے۔ ۱ حرمت یعنی اس طرح کا عمل کرنا حرام ہو ۲ مکروہ تحریمی ۳ مکروہ تنزیہی ۴ حقارت دلانے کے لیئے:۔ ۵ خراب انجام بتانے کے لیئے ممانعت ہو ۶ صرف روکنے کے لیئے شریعت نے منع کیا ہو۔ ۷ دنیوی نقصان کے خدشے سے ممانعت ہو:۔ ۸ جس سے مایوسی ہو۔ اس سے رکنے باز رہنے کے لیئے ممانعت ہو۔ ہر قسم کی ممانعت کے لیئے شرعی دلیل چاہیئے۔ چنانچہ فتاوٰی درِّ مختار و ردّ المحتار جلد اوّل صفحہ نمبر ۶۱۱ پر ہے:۔ لَا یَلْزَمُ مِنْهُ اَنْ یَّكُوْنَ مَكْرُوْهًا اِلَّا بِنَهْیٍ خَاصٍّ لِاَنَّ الْكَرَاهَةَ حُكْمٌ شَرْعِیٌّ فَلَا بُدَّ لَهٗ مِنْ دَلِیْلٍ:۔ (ترجمہ):۔ بخلاف مکروہ تنزیہی۔ (الخ) نہیں لازم آتا اس ترک سے مکروہ تنزیہی ہونا۔ مگر خاص حدیث و قرآن کے منع کرنے سے اس لیئے کہ مکروہ تنزیہی ہونا بھی شریعت کا حکم ہے۔ پس ضروری ہے اس کے لیئے دلیل کی اب میں ان وہابیوں سے پوچھتا ہوں جو اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کو منع کرتے ہیں کہ ہم نے تو عبارۃً دلالۃً اقتضاءً اور اشارۃً اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کا ثبوت دے دیا اور دورِ صحابہ سے ثابت کر دیا

مگر تم اس کو منع کرتے ہو تو یہ ثابت کرو کہ یہ پڑھنا۔ حرام ہے یا مکروہ تحریمی۔ یا مکروہ تنزیہی۔ یا کراہت تحقیری یا کراہتِ عاقبت یا کراہتِ ارشاد یا سفقت یعنی بے وقاری بے عزتی۔ یا کراہتِ مایوسی کون سی ممانعت ہے۔ اور جو ممانعت بھی مانتے ہو۔ اس کی دلیل اس طرح قرآنِ مجید یا حدیثِ پاک یا اقوالِ فقہا او رمفسرین سے پیش کرو۔ پھر پتہ لگے گے کہ تم کتنے دل گردے والے ہوا ور ہم کو یقین ہے کہ تا قیامت تم کوئی دلیل نہ دے سکو گے۔ جیساکہ ہزار بار کا تجربہ ہے تو ان ریڈیو نشریات میں گستاخی ہر حبیب کریم اور عداوت و دشمنی ہر درود پاک کا اظہار کرکے کیونکر راہِ جہنم کو ہموار کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمام کو ہدایت کاملہ عطا فرمائے رہا محترم پیر محمد کرم شاہ صاحب کا قول تو وہ اگرچہ ہماری جماعت کے بزرگ ہیں اور ہمارے نزدیک قابلِ احترام ہیں مگر بڑی غیر ذمہ داری سے کلام فرما دیتے ہیں غالباً اُن کی یہ اغیار نوازی صلح کلی کے نظریات پر مبنی ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں بھی بہت غیر ذمہ دارانہ جلد بازیاں و چشم پوشیاں کی ہیں جن کی نشان دہی مجاہدِ ملت ابو داؤد مولانا محمد صادق صاحب نے اپنی تحریر میں رضاء مصطفےٰ کے صفحات پر کی ہے۔ اور یہ غلطیاں صرف اِن ہی سے سرزد نہیں، ہوئیں ہمارے بہت سے اکابر نے نادانی میں کیا سے کیا کر دیا ہے۔ مثلاً۔ عارفِ کھڑی شریف میاں محمد صاحب علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب منظوم سیف الملوک میں بہت سے اشعار شریعت کے خلاف لکھ ڈالے۔ غوثِ اعظم کی تعریف کرتے ہوئے بہت نازیبا اشعار لکھ دیے جو قطعًا غلط اور اسلام و حقیقت کے خلاف ہیں۔ اور ایک شعر ان کا اس طرح سے۔ شعر

عیسیٰ خاک انہاں دے دردی گھن تیمم کردا !!!

ایسے کارن ہتھ انہاندا شفا ہر ضرر دا !

یہ شعر واقعتًا غلط ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی درِ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مٹی پر تیمم نہ کیا۔ کسی حدیث و تاریخ سے ثابت نہیں۔ یہ شعر نہ تمثیل بن سکتا ہے نہ ادب و احترام یہ ہمارے بزرگوں کی چشم پوشیاں ہیں۔ جس سے قوم کے گمراہ ہونے کا خطرہ۔ بلکہ نادان عقیدت مند غلط عقیدہ بنا بیٹھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَحْمَدُکَ وَاَسْتَعِیْنُکَ عَلٰی دُعَاۃٍ یَّنْ اَنْ یُّقِیْمُوْا دِیْنَکَ وَحُبَّ حَبِیْبِکَ یَا رَبِّ یَا رَبِّ۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

* * * *

کتاب الجنائز

غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا قطعاً ناجائز ہے۔

سوال ۱۳۰ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ابھی چند دن پیشتر طائف شریف کے قریب حجاج کرام کا ایک ہوائی جہاز گر کر تباہ ہوگیا اور خبروں کے مطابق تمام انسانی ٹکڑوں کو جمع کرکے سعودی حکام علماء اور عوام نے ان کی نماز پڑھی۔ لیکن پاکستانی عوام خاص کر وہابی مولوی حضرات غیر مقلد جو خود کو اہل حدیث کہتے ہیں۔ فوت شدگان کا غائبانہ نمازِ جنازہ جگہ جگہ پڑھ رہے ہیں۔ بلکہ ہمارے علاقے میں ایک ایک وہابی مولوی چھ چھ دفعہ غائبانہ جنازہ پڑھا رہا ہے۔ ابھی ایک محلہ میں پڑھی اور اخباری فوٹو گرافر کو بلایا نماز باجماعت کا فوٹو کھنچوالیا پھر دوڑ کر دوسرے محلے والوں کو مجبور کیا وہاں جماعت کھڑی کردی اور اخباری نمائندے دیہڑا دیہڑ فوٹو کھینچ رہے ہیں ہم نے ان سے پوچھا کہ اس طرح بھی کبھی نمازِ جنازہ ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہاں ہوتی ہے اور یہ عبادتِ الٰہی جتنی دفعہ بھی کی جائے اچھی ہے باعثِ ثواب ہے پھر ہم نے پوچھا کہ کس کی نمازِ جنازہ پڑھ رہے ہو۔ تو جواب دیتے ہیں کہ سب مرنے والوں کی ہم نے پوچھا کہ مرنے والے کہتے ہیں کون ہیں مذکر ہیں مؤنث ہیں چھوٹے ہیں بڑے ہیں کہاں ہیں تو کہتے ہیں کہ اِس کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب ایک سے زیادہ میت ہو تو مرد والی دُعا پڑھ کر سب کی نماز جائز ہے۔ یہاں کے اہلسنت علماء عوام ایسی نماز جنازہ غائبانہ کو ناجائز کہتے ہیں اور سب متفقہ رائے و مشورے سے آپکے پاس سوال بھیجا جا رہا ہے۔ مدلل جوابی فتویٰ صادر فرماکر مشکور و ممنون فرمائیں۔

دستخط سائل غلام احمد رئیسوی میمن کراچی ۱۸؍ ناظم آباد، ۱۱؍۲۶ مطابق محرم شریف ۱۴۰۳ھ

بعون العلام الوھاب

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق۔ فقہ ائمہ اربعہ امام اعظم۔ امام مالک۔ امام حنبل۔ امام شافعی کے غائبانہ نمازِ جنازہ۔ پڑھنے سے متعلق دو قول ہیں۔ ایک قول امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اور اُن کے شاگردِ فقہ امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا۔ اِن دونوں اماموں کے نزدیک مطلقاً غائبانہ نمازِ جنازہ ناجائز ہے دوسرا قول امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے استادِ فقہ امام شافعی جو امام مالک کے فقہ میں شاگرد ہیں۔ اِن دونوں اماموں

کے نزدیک صرف اس شخص کا نمازِ جنازہ غائبانہ جائز ہے۔ جس کا نمازِ جنازہ کسی نے نہ پڑھا ہو اور یقین سے پتہ لگ جائے کہ فلاں مسلمان بغیر جنازہ کی نماز کے دفن کر دیا گیا یا جس کو دریا کی مچھلیاں یا جنگل کا شیر وغیرہ کھا گیا اور اس کا بقیہ ڈھانچہ بھی نہ مل سکا یا دریا میں ڈوب کر لاپتہ ہو گیا۔ یا شر کو نکے علاقے میں مر گیا یا میدانِ جنگ میں لاش ڈھونڈی نہ جا سکی۔ امام احمد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک صرف ان ہی صورتوں میں نمازِ جنازہ غائبانہ جائز ہے یعنی جب حاضر میت کا جنازہ نہ پڑھا گیا تب غائبانہ جنازہ جائز ہے امام شافعی امام احمد کے نزدیک بھی غائبانہ جنازہ کی اس صورت مذکورہ بالا میں بھی دو شرطیں ہیں پہلی یہ کہ رشتے دار ہی غائبانہ جنازہ پڑھ سکتے ہیں نہ کہ دوسرے غیر متعلق لوگ دوسری یہ کہ صرف ایک دفعہ نماز غائبانہ پڑھی جائے بس اور اگر حاضرانہ نمازِ جنازہ غیروں نے پڑھ لیا ہے۔ تو غائبانہ کسی کو جائز نہیں نہ رشتے داروں کو نہ غیروں کو۔ اتنی شرطیں لگا کر تب ان ہر دو اماميں کریمین نے غائبانہ جنازے کی اجازت دی ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک قطعاً منع کرتے ہیں۔ یہ اتنی بندشیں کیوں ہیں اس لئے کہ مذہب اسلام بہت ہی شاندار اصول و ضوابط و قواعد کا مذہب ہے۔ نمازِ جنازہ بھی فرائض اسلام میں سے ایک فرض ہے اسکے لئے بھی قانون مرتب ہیں تو جسطرح دیگر فرائض اپنے ضابطوں کے پابند ہیں اسی طرح یہ فریضہ بھی کوئی شخص نمازِ ظہر عصر مغرب وغیرہ اسی طرح زکوٰۃ صیام۔ حج۔ قربانی۔ میں اپنی من مانی بے قاعدگیاں نہیں کر سکتا۔ دو دو تین تین ظہریں۔ عصریں یا کم و بیش رکعتیں یا وقت سے ہٹا کر آگے پیچھے نہیں پڑھ سکتا اگر پڑھیگا تو گناہ گار ہوگا۔ اگر ضد سے مصر ہوگا تو کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح نمازِ جنازہ بھی قانونِ شرعی کے خلاف پڑھنا پڑھانا سخت ترین جرم ہے۔ بلکہ فی زمانہ دو سو سالہ نوزائیدہ فرقہ غیر مقلد نے تو نمازِ جنازہ کو کھیل کو ہنسی مذاق و دل لگی بنا لیا۔ سوال مذکورہ میں جس صورت حال کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان غیر مقلد وہابی جو خود کو اہل حدیث کہتے ہیں کی سیاسی چالیں ہیں۔ اس طرح وہ حکومت اور مرنے والے کے لواحقین کے منظورِ نظر بننا چاہتے ہیں اور ہمارے نوجوان جوشیلے لوگ ان کی چال کو نہ سمجھتے ہوئے جوشِ جوانی میں آکر بادشو ٹوپیاں بن کر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ بلکہ ان ہی وہابیوں نے نوجوانوں ان پڑھوں کو پھانسنے کے لیے ننگے سر نماز پڑھنے کا رواج نکال لیا۔ حالانکہ فی زمانہ جبکہ ننگا سر رکھنا فیشن ہے۔ ننگے سر نماز پڑھنا شرعاً گناہ کبیرہ ہے اور نماز مکروہ تحریمی ہے یہی نہیں بلکہ ان باطل فرقے والوں نے دین اسلام کو ہی کھیل سمجھ لیا ہے اور زمانے کو دکھانا بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح موجودہ یہودی دین۔ عیسائی دین بے اصول ہے۔ اسلام بھی ایسا ہی ہے۔ خدا ان کے ارادوں کو باطل کرے۔ بھلا یہ کہاں کی عبادت ہے کہ نہ کوئی دلیل نہ آیت نہ حدیث نہ قاعدہ نہ ضابطہ۔ نہ ثبوت۔ حاکم یا مشہور یا سیاسی آدمی مر جائے تو دھڑا دھڑ غائبانہ جنازہ اور کوئی غریب مر جائے غیر مشہور مر جائے نہ جنازے کی غائبانہ نماز نہ اخبار نہ فوٹو۔ بس سمجھ آ گئی کہ وہابی مذہب چڑھتے سورج کی پوجا ہے۔ ان کم عقلوں کو نہ دلائل کی ضرورت نہ ثبوت کی حاجت دین و مذہب کے اصولوں ضابطوں سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ غیر مقلد نے ہی اس لیے ہیں تاکہ یہ

رگام ہونے کی آزادی ملی ہے۔ اصول وضابطے پر تو صرف مقلدین ہی کاربند رہتے ہیں۔ اس لئے کہ ائمہ اربعہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جو بھی مسلک بنایا ہے وہ بے حد دلائل کے تحت بنایا ہے بڑے اصول وفروع کو سوچ کر بنایا۔ قرآن وحدیث کا سہارا لے کر بنایا یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی امام کا غور وتدبر حقیقت کو نہ پاسکا۔ تفکر وتعقل میں کمی رہ گئی۔ مگر کسی کی فکر ثباتی نے۔ درجۂ کمال کو پاکر حقیقت تدبر کو جالیا مندرجہ ذیل سطور میں نمازِ جنازہ غائبانہ سے متعلق ائمہ اربعہ کے دلائل پیش کئے جاتے ہیں اولاً ان بزرگوں کے دلائل ہوں گے جو غائبانہ جنازے کے قائل ہیں ثانیاً ان کی کمزوری اور ان کا توڑ بتاکر پھر ان بزرگوں کے دلائل پیش کئے جائیں گے جو غائبانہ صلاۃ جنازہ کو بالکل غلط کہتے ہیں۔

دلیل ۱:۔ ابوداؤد شریف جلد دوم صفحہ ۴۵۵ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا الْقَعْنَبِيُّ قَالَ قَرَأْتُ عَلٰى مَالِكِ ابْنِ اَنَسٍ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَى لِلنَّاسِ۔ عَنِ النَّجَاشِيِّ فِي الْيَوْمِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ فَخَرَجَ بِهِمْ اِلَى الْمُصَلّٰى فَصَفَّ بِهِمْ وَكَبَّرَ اَرْبَعَ تَكْبِيْرَاتٍ۔ (ترجمہ) حضرت قعنبی نے ہمیں حدیث بیان کی فرمایا کہ میں نے یہ حدیث حضرت مالک بن انس کے سامنے پڑھی بروایت ابن شہاب انہوں نے روایت کی ابن مسیب سے انہوں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہ بیشک آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (اپنے غیب سے) نجاشی کی وفات کی خبر دی لوگوں کو اسی دن جس دن نجاشی فوت ہوئے اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام لوگوں کے ساتھ جنازہ گاہ کی طرف گئے وہاں صفیں باندھیں اور نمازِ جنازہ کی چار تکبیریں پڑھیں۔ اس حدیثِ مقدسہ سے امام شافعی اور امام احمد بن حنبل دلیل پکڑتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان کسی ایسی جگہ فوت ہو جائے جہاں اس کا نمازِ جنازہ پڑھنے والا کوئی نہ ہو تو جہاں کہیں مسلمانوں کو یہ پتہ لگے تو فوراً اس میت مسلمان کا نمازِ جنازہ پڑھیں۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نجاشی کا غائبانہ جنازہ پڑھا اس لئے کہ حضرت نجاشی خفیہ مسلمان تھے اور ان کا جنازہ کسی نے نہ پڑھنا تھا وہاں سب کافر بستے تھے یہ دلیلِ اوّل ہی ان ہر دو بزرگوں کے نزدیک اصل دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام شوافع اور تمام حنابلہ نے اپنی معتبر کتب میں غائبانہ جنازے کے لئے صرف اسی حدیث پاک کو دلیل بنایا ہے۔ اور جن بزرگانِ دین محدثین دین نے صلاۃِ غائبانہ علی اَمْوَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ:۔ کا باب باندھا ہے اس میں صرف اسی حدیث کا ذکر فرمایا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں اعلان فرمایا کہ تمہارے بھائی حضرتِ نجاشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوت ہو گئے ہیں ان کا نمازِ جنازہ پڑھو چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ جلد دوم صفحہ ۱۵۱ پر یہی حضرت نجاشی کی نمازِ جنازہ والی روائیت آٹھ سندوں سے مروی جن میں ایک سند ابن سیرین والی حدیث کے متن کو مرسل بتاتی ہے۔ امام ہیثمی نے اپنی کتاب موارد الظمآن باب الصلاۃ علی الغائب مکمل ایک جلد صفحہ ۱۹۲ پر صرف اسی حدیث کو روائیت فرمایا۔ مسند احمد بن محمد بن حنبل مسند ابی ہریرہ کے باب میں غائبانہ نماز کے متعلق صرف حضرت نجاشی کی ہی روایت پیش کی۔ امام ابن حنبل جو بڑے

اہتمام سے غائبانہ نمازِ جنازہ کے قائل ہیں اگر کوئی اور حدیث بھی جواز میں ہوتی تو ضرور پیش فرماتے فتح الباری شرح بخاری باب التکبیر علی الجنازہ جلد سوم صفحہ ۱۶۲ پر یہی حدیث درج ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ ان بزرگوں نے یہ جواز صرف اسی حدیث پاک سے لیا ہے باقی وہ روایات جن سے متاخرین حنابلہ و شوافع استدلال کرتے ہیں۔ وہ متقدمین بلکہ خود امام شافعی اور امام حنبل نے کیوں نہ اختیار فرمائیں؟ اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ روایات اُن اکابر کو نظر نہ آئیں (حالانکہ یہ توجیہ بعید از قیاس ہے) اور یا یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ روایات بعد کی پیداوار ہے۔ بہر حال مجھ پر واجب ہے کہ میں متقدمین و متاخرین کے سب دلائل روایتاً درایتاً نقل کر دوں تاکہ فتوے میں کوئی پہلو تشنۂ وضاحت نہ رہ جائے اور مخالف کو مزید بولنے کا یارانہ رہے دلیلِ دوم:۔ امام الحنابلہ حضرت امام واقدی نے اپنی کتاب الحدیث کے کتاب المغازی صفحہ ۷۶ پر ایک روایت نقل فرمائی۔ فَقَالَ حَدَّثَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ صَالِحٍ عَنْ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ بْنِ قَتَادَۃَ وَحَدَّثَنِیْ عَبْدُ الْجَبَّارِ بْنِ عِمَارَۃَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَا لَمَّا الْتَقَی النَّاسُ بِمُوْتَۃَ جَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمِنْبَرِ وَکُشِفَ لَہٗ مَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الشَّامِ فَھُوَ یَنْظُرُ اِلٰی مُعْتَرَکِھِمْ۔ فَقَالَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخَذَ الرَّایَۃَ زَیْدُ بْنُ حَارِثَۃَ فَمَضٰی حَتّٰی اسْتُشْھِدَ وَصَلّٰی عَلَیْہِ وَدَعَا لَہٗ الخ ثُمَّ اَخَذَ الرَّایَۃَ جَعْفَرُ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ فَمَضٰی حَتّٰی اسْتُشْھِدَ فَصَلّٰی عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَدَعَا لَہٗ الخ (ترجمہ) واقدی نے کہا حدیث بیان کی مجھے محمد بن صالح نے ان سے روایت کی عاصم بن عمر بن قتادہ نے واقدی نے کہا کہ اور یہی حدیث بیان کی مجھے عبد الجبار بن عمارہ نے اُن سے روایت کیا عبد اللہ بن ابی بکر نے واقدی نے کہا کہ دونوں محدثوں نے فرمایا کہ جب کہ لوگوں نے مقامِ موتہ میں جہاد کیا تو سرورِ کائنات روحِ موجودات عَلَیْہِ التَّحِیَّۃُ وَالصَّلٰوۃُ وَاَبْرَکَاتٌ لِکُلِّ ذَاتِ مُحَمَّدٍ وَّالْاَمْنِیَاتُ منبر پاک پر تشریف فرما ہوئے اور سب پردے کھل گئے وہ جو آپ کے اور ملک شام کے درمیان تھے پس وہ آقا حاضر و ناظر مشکل کشا حاجت روا فریاد رس دیکھ رہے تھے ان لوگوں کی جنگ کی طرف۔ تو زبانِ مقدس سے ارشاد پاک فرمایا جھنڈا پکڑا زید بن حارث نے پس وہ میدان جنگ میں گئے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ اور نماز پڑھی نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن پر اور دعا کی اُن کے لئے۔ پھر لیا جھنڈا جعفر بن ابو طالب نے تو وہ میدانِ جنگ میں گزرے یہاں تک کہ شہید ہو گئے تو نماز پڑھی اُن پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اور دعا فرمائی اُن کے لئے۔ متاخرین شوافع وحنابلہ فرماتے ہیں کہ اس سے بھی غائبانہ نمازِ جنازہ کا ثبوت ملتا ہے تیسری دلیل:۔ امام ابن حجر شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی۔ کتاب الاصابہ جلد سوم صفحہ ۱۶۴ پر ایک روایت تین سندوں سے نقل فرمائی چنانچہ ارشاد ہوا۔ اَخْرَجَ الطَّبَرُ انِیُّ وَمُحَمَّدُ بْنُ اَیُّوْبَ بْنِ الضُّرَیْسِ وَابْنُ مَنْدَہٗ وَالْبَیْھَقِیُّ کُلُّھُمْ مِنْ طَرِیْقِ مَحْبُوْبِ بْنِ ھِلَالٍ

عَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِیْ مَیْمُوْنَۃَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ نَزَلَ جِبْرَائِیْلُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ مَاتَ مُعَاوِیَۃُ بْنُ مُعَاوِیَۃَ الْمُزَنِیُّ اَتُحِبُّ اَنْ تُصَلِّیَ عَلَیْهِ قَالَ نَعَمْ۔ فَضَرَبَ بِجَنَاحِیْهِ فَلَمْ یَبْقَ اَکَمَۃٌ وَلَا شَجَرَۃٌ اِلَّا تَضَعْضَعَتْ فَرَفَعَ سَرِیْرَہٗ حَتّٰی نَظَرَ اِلَیْهِ فَصَلّٰی عَلَیْهِ۔ دوسری سند اسی روایت کی اس طرح ہے نَبَّانَا الْعَلَاءُ اَبُوْ مُحَمَّدِ نِ الثَّقَفِیُّ سَمِعْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ یَقُوْلُ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَزْوَۃَ تَبُوْكٍ فَطَلَعَتِ الشَّمْسُ یَوْمًا بِنُوْرٍ۔ (الخ) اِذْ اَتَاہُ جِبْرَائِیْلُ فَقَالَ مَاتَ مُعَاوِیَۃُ بْنُ مُعَاوِیَۃَ اللَّیْثِیُّ فَهَلْ لَكَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلَیْهِ فَاَقْبِضُ لَكَ الْاَرْضَ قَالَ نَعَمْ فَصَلّٰی عَلَیْهِ۔ اس روایت کی تیسری سند اس طرح ہے۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ اَبِیْ عِتَابٍ عَنْ یَحْیَی بْنِ اَبِیْ مُحَمَّدٍ اَنَّ الْحَسَنَ اَخْبَرَ عَنْ قِصَّۃِ مُعَاوِیَۃَ الْمُزَنِیِّ الخ (ترجمہ)

طبرانی نے یہ روایت بیان کی اور محمد بن ایوب بن غریس اور ابن مندہ اور بیہقی تمام نے محبوب بن ہلال کے طریقے پر اس روایت کو نقل کیا پہلی سند کے ۲ راوی عطا بن ابی میمونہ اور انس بن مالک انہوں نے کہا کہ حضرت جبرائیل بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے پس عرض کیا یارسول اللہ معاویہ بن معاویہ مزنی فوت ہوگئے کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ ان پر نماز جنازہ پڑھیں۔ فرمایا ہاں تو حضرت جبرائیل نے اپنے پر مارے پس نہ باقی رہا کوئی ٹیلہ نہ درخت مگر جھک گیا تو اٹھایا جبرائیل نے ان کے جنازے کو یہاں تک کہ دیکھا اس کو تو نمازِ جنازہ پڑھی اُن پر۔ دوسری سند میں دو ۲ راوی علاء ابو محمد ثقفی۔ انس بن مالک یہاں اس طرح ہے۔ کہ حضرت جبرائیل نے عرض کیا معاویہ بن معاویہ لیثی فوت ہوگئے کیا آپ کے لیے مرغوب ہے کہ آپ اُن پر نمازِ جنازہ پڑھیں اور میں آپ کے لیے ساری زمین قبض کردوں فرمایا ہاں۔ تو آپ نے اُن پر نماز پڑھی۔ تیسری سند میں تین راوی ہیں انس بن ابی عتاب یحیٰی بن ابو محمد۔ اور حسن ۳۔ انہوں نے بھی معاویہ مزنی کے اِس قصّے کی خبر دی۔ (الخ) حنبلی اور شافعی لوگ فرماتے ہیں کہ اس سے بھی ثابت ہوا کہ نمازِ جنازہ غائبانہ جائز ہے

چوتھی دلیل :۔ سابقہ تین دلائل منقولیہ ہیں جن میں روایۃً استدلال ہے منقولی دلائل میں آج تک صرف تین روایات ہی دستیاب ہوسکیں باقی دلائل درایۃً ہیں چنانچہ ابن تیمیہ کے شاگرد (ابن تیمیہ خود کو حنبلی کہتے ہیں حالانکہ اکابر حنابلہ انکو حنبلی تسلیم کرنے پر تیار نہیں) دیکھو تفسیر صاوی صفحہ ۲ بہرحال ابن تیمیہ کے شاگرد شمس الدین ابن قیم اپنی کتاب زاد المعاد جلد اوّل صفحہ ۱۴۱ پر لکھتے ہیں :۔

وَقَالَ شَیْخُ الْاِسْلَامِ اِبْنُ تَیْمِیَہ۔ اَلصَّوَابُ اَنَّ الْغَائِبَ اِنْ مَاتَ بِبَلَدٍ لَمْ یُصَلِّ عَلَیْهِ۔ صُلِّیَ عَلَیْهِ صَلٰوۃُ الْغَائِبِ کَمَا صَلَّی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَی النَّجَاشِیِّ لِاَنَّهٗ مَاتَ بَیْنَ کُفَّارٍ وَلَمْ یُصَلَّ عَلَیْهِ۔ وَاِنْ صُلِّیَ عَلَیْهِ حَیْثُ مَاتَ لَمْ یُصَلَّ عَلَیْهِ صَلٰوۃُ الْغَائِبِ لِاَنَّ الْفَرْضَ قَدْ سَقَطَ بِصَلٰوۃِ الْمُسْلِمِیْنَ عَلَیْهِ۔ وَالنَّبِیُّ صَلّٰی عَلَی الْغَائِبِ وَتَرَکَهٗ فَفِعْلُهٗ وَتَرْکُهٗ سُنَّۃٌ۔ هٰذَا لَهٗ مَوْضِعٌ۔ وَهٰذَا لَهٗ مَوْضِعٌ۔ (ترجمہ)۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے کہا کہ درست یہ ہے کہ غائب مسلمان اگر مرا ایسے شہر میں اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی گئی تو

اس پر غائبانہ جنازہ پڑھا جائے گا۔ جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نجاشی پر نمازِ جنازہ پڑھا اس لیے کہ وہ کافروں میں فوت ہوئے تھے اور وہاں اُن پر نمازِ جنازہ حاضرانہ نہ پڑھا گیا تھا۔ ہاں اگر کسی غائب پر فوت ہونے کی جگہ حاضر میت ہونے کی حالت میں پڑھ لیا گیا ہو جہاں وہ فوت ہوا ہے تو اس پر ہرگز غائبانہ جنازہ نہ پڑھا جائے اس لئے کہ مسلمانوں کی اس حاضر میت نمازِ جنازہ سے فرض ساقط ہوگیا۔ اب کسی کی غائبانہ کسی کو جائز نہیں نہ اپنوں کو نہ غیروں کو۔ یہ تھا حنبلی مسلک۔ شافعی حضرات بھی اسی شرط سے غائبانہ جنازہ جائز مانتے ہیں، پانچویں دلیل:۔ علامہ عینی شرح بخاری عمدۃ القاری جلد چہارم کے صـ۲۳ پر مسلکِ شوافع بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں فَعَلٰی ھٰذَا اِذَا مَاتَ الْمُسْلِمُ بِبَلَدٍ مِّنَ الْبُلْدَانِ وَقَدْ قُضِیَ حَقُّہٗ مِنَ الصَّلٰوۃِ عَلَیْہِ فَاِنَّہٗ لَا یُصَلّٰی عَلَیْہِ مَنْ کَانَ بِبَلَدٍ آخَرَ غَائِبًا عَنْہُ فَاِنْ عَلِمَ اَنَّہٗ لَمْ یُصَلَّ عَلَیْہِ لِعَائِقٍ اَوْ مَانِعِ عُذْرٍ کَانَ السُّنَّۃُ اَنْ یُّصَلّٰی عَلَیْہِ وَلَا یُتْرَکُ ذٰلِکَ لِبُعْدِ الْمَسَافَۃِ فَاِذَا صَلُّوْا عَلَیْہِ اِسْتَقْبَلُوا الْقِبْلَۃَ وَلَمْ یَتَوَجَّھُوْا اِلٰی بَلَدِ الْمَیِّتِ اِنْ کَانَ فِیْ غَیْرِ جِھَۃِ الْقِبْلَۃِ۔ (ترجمہ)

پس اس بنا پر جب مرگیا کوئی مسلمان شہروں میں سے کسی شہر میں اور بیشک ادا کر دیا گیا اس میت کا حق نمازِ جنازہ پڑھ کر اس پر تو خبردار کوئی شخص اس پر غائبانہ جنازہ نہ پڑھے۔ ہاں اگر یقین سے پتہ لگ گیا کہ بیشک اس پر جنازے کی نماز حاضراً نہیں پڑھی گئی ہے کسی کفریہ نفرت کی وجہ سے یا کسی مانع عذر کی وجہ سے تو سنت یہ ہے کہ اس پر غائبانہ نمازِ جنازہ ضرور پڑھی جائے اور وہ نمازِ غائبانہ چھوڑی نہ جائے مسافت کی دوری کی بنا پر۔ پھر جب مسلمان کسی ایسی مسلمہ میت کی غائبانہ نماز پڑھنے لگیں تو منہ قبلہ کی طرف کریں اس شہر کی طرف نہ کریں جس میں وہ فوت ہوا ہے اگر سمتِ کعبہ کے علاوہ سمت والے شہر میں فوت ہوا ہو۔ اس دلیل سے یہ ثابت ہوا کہ حنابلہ کی طرح شوافع بھی غائبانہ نمازِ جنازہ میں بہت قیدیں لگاتے ہیں یعنی حاضر میت کی نماز کسی نے نہ پڑھی ہو بغیر نمازِ جنازہ ہی دفن کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ قیدیں صرف اسی لئے لگائی گئیں کہ ان اکابر کو اور امام حنبل و امام شافعی کو بجز حضرت نجاشی کی حدیث کے کوئی اور حدیث شریف ملی ہی نہیں اور چونکہ ان کو بغیر جنازہ دفن کیا گیا تھا بدیں وجہ ان کی نمازِ جنازہ غائبانہ ہوئی اسی پر قیاس کرکے ان اماموں نے جواز کا مسئلہ انہی قیود کے تحت صادر فرمایا۔ عمدۃ القاری شرح بخاری جلد چہارم صـ۲۲ پر ہے:۔

قَالَ الْخَطَّابِیُّ النَّجَاشِیُّ رَجُلٌ مُّسْلِمٌ قَدْ اٰمَنَ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَصَدَّقَہٗ عَلٰی نُبُوَّتِہٖ اِلَّا اَنَّہٗ کَانَ یَکْتُمُ اِیْمَانَہٗ وَالْمُسْلِمُ اِذَا مَاتَ وَجَبَ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ اَنْ یُّصَلُّوْا عَلَیْہِ اِلَّا اَنَّہٗ کَانَ بَیْنَ ظَھْرَانَیْ اَھْلِ الْکُفْرِ وَلَمْ یَکُنْ بِحَضْرَتِہٖ مَنْ یَّقُوْمُ بِحَقِّہٖ فِی الصَّلٰوۃِ عَلَیْہِ۔ (ترجمہ) یعنی حضرت نجاشی پر غائبانہ جنازہ اس لئے پڑھا گیا کہ حضرت نجاشی کفرستان میں تھے اور مسلمان ہو چکے تھے اپنے ایمان کو چھپائے رکھا یہاں تک کہ فوت ہو گئے کوئی شخص وہاں مسلمان نہ تھا جو اُن پر نمازِ جنازہ پڑھ کر ان کا آخری حق ادا کرتا۔ کیونکہ نمازِ جنازہ پڑھنا مسلمانوں پر لازم

ہے جو میت مسلمان کا حق ہے۔ یہ وجہ تھی حضرت نجاشی کے نماز غائبانہ کی۔ چھٹی دلیل :۔ مذہب حنبلی کی معتبر کتاب المغنی لابن قدامہ جلد دوم صفحہ ۳۸۲ پر ہے۔ وَتَجُوْزُ الصَّلٰوۃُ عَلَی الْغَائِبِ فِیْ بَلَدٍ اٰخَرَ بِالنِّیَّۃِ (الخ) وَبِھٰذَا قَالَ الشَّافِعِیْ۔ وَقَالَ مَالِکٌ وَ اَبُوْحَنِیْفَۃَ لَایَجُوْزُ (الخ) وَلَنَا مَارُوِیَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ نَعَی النَّجَاشِیَّ صَاحِبَ الْحَبَشَۃِ فِی الْیَوْمِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْہِ وَصَلّٰی بِہِمْ بِالْمُصَلّٰی فَکَبَّرَ عَلَیْہِ اَرْبَعًا۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ (ترجمہ)۔ غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہے دوسرے شہر میں نیت سے۔ یہی امام شافعی کا مسلک ہے اور امام مالک و امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا کہ غائبانہ نماز ناجائز ہے۔ اور ہماری دلیل حضرت نجاشی کے نمازِ جنازہ غائبانہ والی وہ روایت ہے جس کو مسلم بخاری نے روایت کیا۔ اس دلیل سے ثابت ہوا کہ متقدمین حنبلیوں کے پاس غائبانہ جنازے کے جواز کی صرف نجاشی والی روایت ہے۔ باقی دو روایتوں کو وہ دلیل نہیں بناتے۔ ساتویں دلیل :۔ شافعی مذہب کی معتبر کتاب مغنی المحتاج جلد اوّل صفحہ ۳۴۴ پر ہے۔ وَیُصَلّٰی عَلَی الْغَائِبِ عَنِ الْبَلَدِ (الخ) خِلَافًا لِاَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَمَالِکٍ لِاَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَ النَّاسَ وَھُوَ بِالْمَدِیْنَۃِ بِمَوْتِ النَّجَاشِیِّ فِی الْیَوْمِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْہِ وَھُوَ بِالْحَبَشَۃِ۔ (ترجمہ) جو میت شہر سے غائب ہو اس پر نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھی جائے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک کے خلاف ہے شوافع کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے خبر دی کہ نجاشی حبشہ میں آج فوت ہوئے۔ اس روایت کو شیخین یعنی بخاری و مسلم نے روایت کیا نجاشی کی وفات شریف ماہ رجب ۹ھ میں ہوئی اس دلیل سے بھی ثابت ہوا کہ شوافع کے نزدیک بھی غائبانہ نمازِ جنازہ کے جواز پر صرف یہی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شافعی حضرات بھی غائبانہ جنازہ میں یہ قید لگاتے ہیں کہ اس میت پر حاضرانہ نماز نہ پڑھی گئی تب غائبانہ ہوگی ورنہ نہیں۔ دلیل ہشتم عقلیہ :۔ عقل کا بھی تقاضا ہے کہ غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہو اس لیئے کہ مسلمان کا آخری حق نمازِ جنازہ جو ساری کائنات کے مسلمانوں پر لازم و واجب اور فرض کفایہ ہے جب کسی نے حاضرانہ ادا نہ کیا تو غائبانہ ضرور ہونا چاہیئے تاکہ کوئی مسلمان بغیر جنازہ دنیا سے نہ جائے اسی لیئے حضرت نجاشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غائبانہ جنازہ پڑھا گیا۔ اور پھر فرض کفایہ کو اگر کوئی ادا نہ کرے تو سب مسلمان گناہ گار ہوتے ہیں۔ اور جب ایک بھی ادا کرے تو باقی گناہ سے بچ جاتے ہیں۔ لہٰذا جنازہ کی نماز ضرور ہونی چاہئے خواہ حاضر خواہ غائب۔ یہ تھے وہ دلائل جو حنبلی اور شافعی لوگ غائبانہ جنازہ کے لیئے بیان کرتے ہیں۔ یہ دلیلِ عقلی عمدۃ القاری نے بیان فرمائی جیسا کہ دلیل پنجم میں بیان کیا اگرچہ کما حقہ ہم نے ان کو بیان کر دیا مگر حق یہ ہے کہ یہ دلائل بہت ہی کمزور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظم اور امام مالک رضی اللہ عنہ اجمعین نے نمازِ جنازہ غائبانہ کو مطلقاً ناجائز قرار دیا خواہ کسی نے حاضرانہ ادا کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ یہ تمام دلائل اُن کے سامنے

بھی تھے مگر پھر بھی انہوں غائبانہ جنازہ کی نماز سے منع کیا اس کی وجہ یہی تھی کہ دلیلیں سب کمزور تھیں۔ چنانچہ ان دلائل کی کمزوری ملاحظہ ہو۔ پہلی دلیل کا تردیدی جواب:۔ حضرت نجاشی کا نمازِ جنازہ غائبانہ نہیں تھا بلکہ حاضرانہ تھا اور اس جنازہ پر نماز کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ جہاں حضرت نجاشی نے انتقال فرمایا وہاں سب کافر تھے کوئی شخص نمازِ جنازہ پڑھنے والا نہ تھا آپ کا اصل نام اصحمہ تھا نجاشی ملکِ حبشہ کے بادشاہ کا نام ہوا کرتا تھا البذیہ آپ کا قانونی لقب تھا۔ اور ۹ھ ماہِ رجب جمعہ کے دن رات کے وقت آپنے کمرۂ عبادت میں فوت ہوئے آپ کے فوت ہونے کے تقریباً ایک دن بعد آپ کے گھر والوں کو پتہ لگا۔ اس دوران ملائکہ کی جماعت سکینہ آپ کا تختہ اٹھا کر بارگاہ نبوت میں لے آئے نبی کریم رؤف الرحیم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے آپ کی نمازِ جنازہ کا اعلان فرمایا اور تمام صحابہ کو اس میدان میں لے گئے جہاں میت فرشتوں نے اٹھا رکھی تھی نبی کریم نے باقاعدہ نمازِ جنازہ ادا فرمائی نبی کریم میت کو دیکھ رہے تھے مگر پہلی صف کے صحابہ نے نہ دیکھی اس لئے کہ ملائکہ نے اٹھا رکھی تھی۔ اور ملائکہ یا رجال الغیب کے جسم سے جو چیز مس ہو جائے وہ بھی نظروں سے غائب رہتی ہے۔ کیونکہ ملائکہ جسم لطیف ہیں اور جسم لطیف پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ جیسے جنات۔ ہوا وغیرہ۔ نظروں سے پوشیدہ ہونا کوئی تعجب ناک بات نہیں ہے دنیا بہت سی چیزیں انسانی نظر سے غائب رہ سکتی ہیں۔ شفاف شیشے کو پانی میں ڈال دو نظر نہیں آئے گا۔ جماعتِ اولیا اللہ میں ایک گروہ افراد کا ہے۔ انکو رجال الغیب بھی کہتے ہیں۔ وہ نظروں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں اور ان سے جو لگ جائے وہ بھی پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً کپڑے وغیرہ۔ تو کوئی تعجب نہیں اگر حضرتِ نجاشی کی میت صحابہ کو نظر نہ آئی۔ اور پھر جنازے کیلئے میت کا نظر آنا شرط نہیں۔ ورنہ پھر تو نابینا آدمی نہ نماز پڑھا سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر حضرتِ نجاشی کی حاضریِ میت کو مخالف نہ مانے اور ہماری مندرجہ بالا تقریر کا انکار کرے تو اس کا کیا جواب ہے کہ ہجرت کی تیرہ سالہ زندگیٔ مبارکہ میں نبی کریم نے صرف حضرتِ نجاشی کی ہی نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھی کسی اور صحابی کی کیوں نہ پڑھی۔ اور پھر صحابہ کرام نے غائبانہ نمازیں کیوں نہ پڑھیں حالانکہ ہزاروں ایسے واقعات پیش آئے کہ لوگ دور دور فوت ہوئے۔ اور یہ جواب واحتمال صرف میں نے ہی نہ نکالے بلکہ پہلے علما۔ نے بھی حنابلہ وشوافع کے اس استدلال پر اسی قسم کے جواب دئے چنانچہ ابن قیم صاحب کی کتاب زاد المعاد جلد اول ص۱۴۸ پر ہے:۔ وَلَمْ یَکُنْ مِنْ هَدْیِهٖ وَسُنَّتِهِ الصَّلٰوةُ عَلٰی کُلِّ مَیِّتٍ غَائِبٍ، فَقَدْ مَاتَ خَلْقٌ کَثِیْرَۃٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَهُمْ غُیَّبٌ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْهِمْ وَصَحَّ عَنْهُ اَنَّهٗ صَلّٰی عَلَی النَّجَاشِیِّ صَلٰوتَهٗ عَلَی الْمَیِّتِ فَاخْتُلِفَ فِیْ ذٰلِكَ (الخ) قَالَ اَبُوْ حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ وَمَالِكٌ رَحِمَهُ اللّٰهُ هٰذَا خَاصٌّ بِهٖ وَلَیْسَ ذٰلِكَ لِغَیْرِهٖ قَالَ اَصْحَابُهُمَا وَمِنَ الْجَائِزِ اَنْ یَّکُوْنَ رُفِعَ لَهٗ سَرِیْرُهٗ۔ فَصَلّٰی عَلَیْهِ وَهُوَ یَرٰی

فَصَلَاتُهٗ عَلَى الْحَاضِرِ الْمُشَاهِدِ۔ وَاِنْ كَانَ عَلٰى مَسَافَةٍ مِّنَ الْبُعْدِ۔ وَالصَّحَابَةُ وَاِنْ لَمْ يَرَوْهُ فَهُمْ تَابِعُوْنَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الصَّلٰوةِ۔ قَالُوْا وَيَدُلُّ عَلٰى هٰذَا اَنَّهٗ لَمْ يُنْقَلْ مِنْهُ۔ اَنَّهٗ كَانَ يُصَلِّيْ عَلٰى كُلِّ الْغَائِبِيْنَ غَيْرَهٗ (الخ) وَلَا سَبِيْلَ اِلٰى اَحَدٍ بَعْدَهٗ اِلٰى اَنْ يُعَايِنَ سَرِيْرَةَ الْمَيِّتِ مِنَ الْمَسَافَةِ الْبَعِيْدَةِ وَيُرْفَعُ لَهٗ حَتّٰى يُصَلِّيَ عَلَيْهِ فَعُلِمَ اَنَّ ذٰلِكَ مَخْصُوْصٌ لَّهٗ۔ (ترجمہ)

ابن قیم حنبلی کہتے ہیں کہ غائبانہ نمازِ جنازہ نہ نبی کریم کی سنت ہے نہ آپ کا ہدیہ۔ کیونکہ بہت سے لوگ حضورِ اقدس کے زمانہ مبارکہ میں فوت ہوئے وہ غائب بھی تھے اور ان پر نمازِ جنازہ بھی نہ پڑھی گئی تھی ہاں البتہ نجاشی کا جنازہ غائبانہ صحیح ہے مگر اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے یہ کہ حاضرانہ نماز تھی یا غائبانہ۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے فرمایا کہ یہ نبی کریم کی خصوصیت ہے۔ یا یہ نجاشی کی خصوصیت ہے کہ ان کی اس طرح نماز ہوئی اُن کے علاوہ کسی کی غائبانہ نمازِ جنازہ نہ ہوا مالکی اور حنفی اصحاب نے فرمایا کہ یہ کہنا بالکل جائز ہے کہ نجاشی کی میت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے اٹھائی گئی تو آپ نے اُس پر نمازِ جنازہ پڑھی حالانکہ آپ اُس میّت کو دیکھ رہے تھے تو آپکی نماز جنازہ حاضر پر تھی۔ اور مشاہدے والی میت پر تھی اگرچہ دور کی مسافت پر تھی۔ اور صحابہ کرام کا اس میّت کو نہ دیکھنا ٹھیک ہے دیکھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ صحابہ نبی کریم کے تابع تھے۔ کہ وہ نماز کے مقتدی تھے۔ اس توجیہ کی بنا پر تمام فقہا نے فرمایا کہ کوئی روایت ایسی منقول نہیں کہ نبی پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی کسی کی غائبانہ نماز پڑھی ہو نجاشی کے سوا لہٰذا آپ کے بعد بھی کسی کو جائز نہیں کہ جب تک میت کا سریر یعنی ڈولی وغیرہ نہ دیکھلے اُس وقت تک نمازِ غائبانہ نہ پڑھے کیونکہ صرف نبی کریم کے لیے صرف نجاشی کی میت ہی لائی گئی تھی اسلئے یہ جانا گیا کہ یہ نجاشی کی خصوصیت تھی۔ شرح زرقانی جلد دوم ص۹۵ پر ہے۔ قَالُوْا ذٰلِكَ خُصُوْصِيَّةٌ لَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ قَالَ وَدَلَائِلُ الْخُصُوْصِيَّةِ وَاضِحَةٌ لَا يَجُوْزُ اَنْ يَّشْرَكَهٗ فِيْهَا غَيْرُهٗ لِاَنَّهٗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ اُحْضِرَ رُوْحُهٗ بَيْنَ يَدَيْهِ اَوْ رُفِعَتْ لَهٗ جَنَازَتُهٗ حَتّٰى شَاهَدَهَا كَمَا رُفِعَ لَهٗ بَيْتُ الْمَقْدِسِ (الخ) فَتَكُوْنُ صَلَاتُهٗ كَصَلَاةِ الْاِمَامِ عَلٰى مَيِّتٍ رَاٰهُ وَلَمْ يَرَهُ الْمَاْمُوْنَ وَلَا خِلَافَ فِيْ جَوَازِهَا (الخ) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُشِفَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ سَرِيْرِ النَّجَاشِيِّ حَتّٰى رَاٰهُ وَصَلّٰى عَلَيْهِ (ترجمہ)

اکثر علماء نے فرمایا کہ وہ نمازِ غائبانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے فرمایا امام نے خصوصیت کے دلائل بہت واضح ہیں کسی کو جائز نہیں کہ اس خصوصیت میں شریک ہو بجز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے کہ نجاشی کی روح یعنی میت کو بحالتِ روحانیت آقائے کائنات کی حاضری کے سامنے پیش کیا یا پورا جنازہ ہی اٹھایا گیا یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسکا مشاہدہ فرمایا جیسے ایک دفعہ

شبِ معراج میں آپ کے سامنے بیت المقدس اٹھا کر لایا گیا تھا۔ تو آپ کی یہ نمازِ غائبانہ نہیں تھی بلکہ ایسی حاضرانہ تھی جیسے امام کی نمازِ جنازہ اس میت پر جس کو دیکھ رہا ہو حالانکہ مقتدی نہ دیکھتے ہوں اور ایسی نمازِ جنازہ بلا اختلاف جائز ہے اور یہ حضرت ابنِ عباس صحابیِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ فرمایا نجاشی کی میت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائی گئی تھی یہاں تک کہ جب آپ نے اس کو دیکھ لیا تھا تب اس پر نمازِ جنازہ پڑھی۔ عمدۃ القاری شرح بخاری جلد چہارم صـ۲۲ پر ہے۔ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رُفِعَ سَرِیْرُہٗ فَرَاٰہُ فَیَکُوْنُ الصَّلٰوۃُ عَلَیْہِ کَمَیِّتٍ رَاٰہُ الْاِمَامُ وَلَا یَرَاہُ الْمَأْمُوْمُ۔ فَاِنْ قُلْتَ ھٰذَا یَحْتَاجُ اِلٰی نَقْلٍ یُّثْبِتُہٗ۔ قُلْتُ وَرَدَ مَا یَدُلُّ عَلٰی ذَالِکَ فَرَوَی ابْنُ حِبَّانَ فِیْ صَحِیْحِہٖ مِنْ حَدِیْثِ عِمْرَانَ بْنِ الْحُصَیْنِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَخَاکُمُ النَّجَاشِیَّ تُوُفِّیَ فَقُوْمُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ (الخ) وَھُمْ لَا یَظُنُّوْنَ اَنَّ جَنَازَتَہٗ بَیْنَ یَدَیْہِ (الخ) وَیَدُلُّ عَلٰی ذَالِکَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ یُصَلِّ عَلٰی غَائِبٍ غَیْرِہٖ (ترجمہ) بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنازے کو دیکھا جو اٹھایا گیا تھا تو آپ کی نمازِ جنازہ اس پر پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے اس میت کی نماز جس کو امام دیکھ رہا ہو۔ حالانکہ مقتدی نہ دیکھیں پس اگر تو اعتراض کرے کہ یہ نجاشی کی میت کا اٹھایا جانا اور نبی کریم کا اس کو دیکھ کر نمازِ جنازہ پڑھانا اس کی کوئی منقولی دلیل ہونی چاہیئے حدیث کے بیان کے بغیر ہم آپ کی توجیہ کیوں مان لیں تو میں جواباً کہوں گا کہ عمران بن حصین کی مروی حدیث جس میں ذکر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو فرمایا کہ تمہارا بھائی نجاشی فوت ہو گیا اٹھ کھڑے ہو جاؤ اس پر نمازِ جنازہ پڑھو صحابہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے جہاں آپ نے جا کر نماز پڑھائی چپ چاپ نماز پڑھی ان صحابہ نے کوئی گمان نہ دوڑایا کہ میت سامنے ہے نبی کریم کے یا نہیں یعنی صحابہ کرام ہر نئی بات کے متعلق سوال فرماتے تھے آج اگر غائبانہ جنازہ ہوتا تو یہ ایک انوکھی بات اور پہلی نماز ہوتی مگر صحابہ نے کوئی سوال نہ کیا اور پھر اگر یہ غائبانہ جنازہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صَلُّوْا عَلَیْہِ نہ فرماتے بلکہ صَلُّوْا عَلٰی غَیْبُوْبَتِہٖ عَلَیْہِ فرماتے صحابہ کرام حضورِ اقدس علیہ السلام کے طرزِ تکلم سے حقیقتِ حال کو خود ہی سمجھ گئے پھر صحابہ نے اس بات سے بھی خود ہی اندازہ لگا لیا کہ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے کبھی بھی جنازہ غائبانہ کسی کا نہ پڑھایا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کو واضح نہ کرنا صحابہ کرام کا استفسار نہ کرنا آئندہ بھی صحابہ کرام کا کسی شخص پر غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھنا۔ خود پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی اور صحابی پر غائبانہ نماز نہ پڑھنا یہ سب باتیں دلالت کر رہی ہیں کہ حضرتِ نجاشی کا جنازہ غائبانہ نہ تھا بلکہ حاضر میت تھی۔ اور فقیر حقیر اقتدار احمد خان بدایونی کہتا ہے کہ یقیناً بہت سے صحابہ نے بھی وہ میت دیکھی ہو گی یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس نے اپنا مکاشفہ ظاہر فرما دیا دیگر صحابہ نبی کریم کی خاموشی کی بنا پر خاموش رہے۔ اور پھر یہ خرقِ عادات

باتیں ماوشما کے لئے حیران کن ہو سکتی ہیں جہاں دن رات ایسے مشاہدات ہوتے رہتے ہیں وہاں نہ اچنبھا ہوتا ہے نہ اظہار کی حاجت یہ عمدۃ القاری کی عبارت ہے جہاں لَا یَظُنُّوْنَ بَیْنَ یَدَیْہِ ہے بیہقی شریف جلد چہارم ص۵۱ پر یہی۔ حدیث پاک اس طرح ہے۔ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَخَاکُمُ النَّجَاشِیَّ قَدْ مَاتَ فَصَلُّوْا عَلَیْہِ فَقَامَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَصَفَفْنَا خَلْفَہٗ فَکَبَّرَ عَلَیْہِ اَرْبَعًا وَمَا نَحْسِبُ الْجَنَازَۃَ اِلَّا بَیْنَ یَدَیْہِ (ترجمہ)۔ عمران بن حصین مشہور صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں جب نبی کریم نے نجاشی کا نمازِ جنازہ پڑھا تو ہم کو ایسا پختہ گمان ہوتا تھا کہ نجاشی کی میت آپ کے سامنے ہے۔ اس حدیث سے صاف ثابت ہوا کہ صحابہ نے بھی میت کو دیکھا۔ عمدۃ القاری میں یقیناً لفظ الّا رہ گیا ہے یہی حدیث پاک مسند احمد بن حنبل جلد چہارم ص۴۴۶ پر اس طرح ہے۔ وَمَا نَحْسِبُ الْجَنَازَۃَ اِلَّا مَوْضُوْعَۃً بَیْنَ یَدَیْہِ۔ اگرچہ بعض بزرگوں نے حضرت نجاشی رضی اللہ تعالٰی عنہ کی نماز کو لغوی صلاۃ یعنی دعا و استغفار قرار دیا ہے۔ چنانچہ فتاوٰی دُرِّ مختار بلا شرح مکمّل ایک جلد کے ص۱۱۹ پر ہے۔ وَصَلٰوۃُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی النَّجَاشِیِّ لُغَوِیَّۃٌ اَوْ خُصُوْصِیَّۃٌ (ترجمہ) حضرت نجاشی کی میت پر نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کا صلوٰۃِ جنازہ لغوی تھا۔ یا پھر اُن کی خصوصیت تھی۔ لغوی صلوٰۃ پر استدلال اِس حدیث شریف سے ہے جو مؤطا مالک کی شرح زرقانی جلد دوم کے ص۵۸ پر ہے۔ وَفِی الْبُخَارِیِّ عَنْ عُقَیْلٍ وَصَالِحِ بْنِ کَیْسَانَ عَنِ الزُّھْرِیِّ عَنْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ سَلَمَۃَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ نَعٰی لَنَا النَّجَاشِیَّ یَوْمَ مَاتَ فَقَالَ اِسْتَغْفِرُوْا لِاَخِیْکُمْ (ترجمہ) بخاری شریف میں ہے عقیل سے روایت اور صالح بن کیسان سے روایت وہ زہری سے راوی وہ سعید سے اور ابو سلمہ سے راوی وہ حضرت ابوہریرہؓ سے راوی کہ ہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی وفات کی۔ خبر دی جس دن وہ فوت ہوئے۔ تو فرمایا کہ اپنے بھائی کے لیئے استغفار کرو۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضرت نجاشی پر نمازِ جنازہ بالکل ہی نہ ہوا مگر تحقیق یہ ہے کہ نجاشی پر باقاعدہ صفیں باندھ کر جنازہ گاہ میں جاکر نماز پڑھائی گئی حنابلہ و شوافع کے علاوہ حنفی حضرات بھی اس بات کو ترجیح دیتے ہیں ہاں البتہ حنفی لوگ اپنے مضبوط دلائل کے تحت حضرت نجاشی کی نمازِ جنازہ کو حاضرانہ نماز قرار دیتے ہیں نہ کہ غائبانہ اور جو توجیہات ہم نے پہلے درج کی ہیں وہی توجیہ فتاوٰی شامی جلد اوّل ص۸۱۱ پر اور فتاوٰی فتح القدیر جلد اوّل ص۴۵۶ پر اور فتاوٰی بحر الرائق جلد دوم ص۱۲۹ پر مرقوم ہیں۔ دلیل دوم کا تردیدی جواب:۔ سائلِ محترم نے اندازہ لگا لیا ہوگا امام شافعی و حنبل کا اس پہلی حدیث پاک سے غائبانہ نماز پر استدلال کرنا کمزور ہوا لہٰذا اس حدیثِ نجاشی سے استدلال کر کے اپنا مسلک بنا لینا محض چشم پوشی اور عدمِ تدبر پر دال ہے۔ قانون بھی یہی ہے کہ نادرُ الوقوع واقعات پر مسلک بنا لینا اور عمل شروع کر دینا ممنوع ہے یہی وجہ ہے کہ امام اعظم و مالک نے اس حدیث کو دیکھنے کے باوجود فرمایا کہ غائبانہ نماز ناجائز ہے۔ یہ یقیناً پہلی

استدلالی عبارت کی کمزوریاں شوافع وحنابلہ کا دوسری روایت سے استدلال اور بھی زیادہ کمزور ہے بعض متاخرین حنابلہ وشوافع امام واقدی کی اس روایت سے دلیل پکڑتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب المغازی میں غزوہ موتہ" کے متعلق زید بن حارث اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالٰی عنہما کی شہادت و نمازِ جنازہ کے بارے نقل فرمائی حالانکہ اہلِ تحقیق فرماتے ہیں کہ اس روایت سے غائبانہ نماز کے جواز میں دلیل پکڑنا قطعاً غلط ہے چند وجہ سے۔ پہلی وجہ عمدۃ القاری شرح بخاری جلد چہارم ص۲۵ پر لکھا ہے۔ قُلْتُ ھُوَ مُرْسَلٌ مِّنَ الطَّرِیْقَیْنِ الْمَذْکُوْرَیْنِ وَالْمُرْسَلُ لَیْسَ بِحُجَّۃٍ۔ (ترجمہ)۔ میں نے کہا کہ یہ روایت واقدی نے دو سندوں سے روایت کی اور دونوں طریقوں سے یہ مرسل ہے۔ اور مرسل روایت (بدیں وجہ کہ مشکوک ہوتی ہے) اس لئے وہ دلیل نہیں بن سکتی۔ دوسری وجہ! امام واقدی کے متعلق محدثین نے بہت باتیں کی ہیں کوئی بھی اُن کے بارے اچھی رائے نہیں رکھتا۔ اور جو شخص محدثین کے نزدیک غلط رائے والا ہو اُس کی روایت معتبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ امام بدر الدین عینی شارح بخاری اپنی کتاب شرح میں ص۲۵ میں لکھتے ہیں کہ عَلٰی اَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ فِی الْوَاقِدِیِّ مَقَالٌ (ترجمہ)۔ علاوہ ازیں محدثین نے واقدی کے بارے میں تحقیق و تفتیش کے بعد بہت باتیں فرمائی ہیں یعنی اُن کو غلط قرار دیا اور کہا کہ واقدی روایت میں جلد بازی کر جاتے ہیں اس لئے ان کی مرویات کا اعتبار نہیں۔ تیسری وجہ۔ فتح القدیر جلد اوّل ص۴۵۱ پر ہے۔ فَمَا فِی الْمَغَازِیْ مُرْسَلٌ مِّنَ الطَّرِیْقَیْنِ (ترجمہ)۔ وہ روایت جو واقدی صاحب کی کتاب المغازی میں ہے وہ مرسل ہے دونو طریقوں سے۔ ان تمام وجوہ سے ثابت ہوا کہ یہ روایت ضعیف اور مشکوک ہے۔ چوتھی وجہ محدثین کرام نے اس روایت کو مرسل کہا جیسا کہ ابھی آپ نے ثبوت پایا اور مرسل روایت ضعیف ہوتی ہے۔ امام شافعی اور جمہور محدثین اس سے دلیل پکڑنا منع کرتے ہیں۔ چنانچہ تدریب الراوی ص۱۱۷ پر ہے۔ اَنَّ قَوْلَ التَّابِعِیِّ الْکَبِیْرِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَذَا اَوْ فَعَلَہٗ کَذَا یُسَمّٰی مُرْسَلًا۔ اور اسی کے ص۱۱۹ پر ہے۔ ثُمَّ الْمُرْسَلُ حَدِیْثٌ ضَعِیْفٌ لَا یُحْتَجُّ بِہٖ عِنْدَ جَمَاھِیْرِ الْمُحَدِّثِیْنَ وَالشَّافِعِیِّ وَکَثِیْرٍ مِّنَ الْفُقَھَاءِ وَاَصْحَابِ الْاُصُوْلِ۔ (ترجمہ)۔ تابعی کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا۔ ایسا کیا تو وہ روایت مرسل ہوتی ہے۔ پھر مرسل حدیث ضعیف ہے اس سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی جمہور محدثین اور امام شافعی اور کثیر فقہاء اور علم اصولِ حدیث والے۔ پانچویں وجہ۔ کتب اسماء الرجال میں بھی واقدی صاحب کو غلط کہا گیا ہے چنانچہ تقریب التہذیب ص۳۱۲ پر ہے مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ بْنِ وَاقِدِ الْاَسْلَمِیِّ الْوَاقِدِیُّ الْمَدَنِیُّ الْقَاضِیْ نَزِیْلِ بَغْدَادَ مَتْرُوْکٌ مَعَ سِعَۃِ عِلْمِہٖ مِنَ التَّاسِعَۃِ مَاتَ سَبْعٌ وَّثَمَانِیْنَ۔ (ترجمہ)۔ محمد بیٹے عمر کے وہ بیٹے واقد اسلمی کے جو مدنی ہیں یہی واقدی ہیں بغداد کے قاضی تھے۔ باوجود اس کے کہ بہت علم والے تھے مگر محدثین کے نزدیک متروک ہیں یعنی اُن کی روایت ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔ علم اصول

حدیث میں یہ واقدی نویں درجہ کے راوی ہیں ۲۰۷ھ میں فوت ہوئے ان کی کل عمر ا ستھتر ۷۸ سال ہوئی۔ اسی تقریب التھذیب کے صفہ پر ہے ، اَلتَّاسِعَۃُ مَنْ لَمْ یَرْوِعَنْہُ غَیْرُ وَاحِدٍ وَلَمْ یُوْثَقْ وَاِلَیْہِ الْاِشَارَۃُ بِلَفْظِ مَجْھُوْلٍ (ترجمہ) نویں درجہ کا راوی وہ ہوتا ہے جس سے صرف ایک شخص نے روایت لی ہو اور کوئی اس سے روایت لینا پسند نہ کرے اور نہ وہ قابل بھروسہ ہو اور اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے مجہول کے لفظ سے یعنی ایسا راوی مجہول ہوتا ہے۔ ان وجوہ سے ثابت ہوا کہ یہ روایت نہایت ناقابل قبول اور ضعیف اور کمزور ہے کسی محدث فقیہ۔ عالم نے اس روایت کو نہ مانا بلکہ اس روایت کے راوی واقدی کے خلاف بہت باتیں کیں پس ایسی ضعیف روایت کا سہارا لے کر غائبانہ جنازہ کی نماز کا جواز اور مسلک بنانا کسی ذی عقل کا کام نہیں۔ یہی وجہ کہ کسی حنفی مالکی نے غائبانہ نماز جنازہ جائز نہ مانا۔ بلکہ اس روایت سے امام حنبل و شافعی نے بھی استدلال نہ کیا نہ ان کے متقدمین نے ایسا کمزور استدلال تو متاخرین کو بھی میسر ہوا۔ چھٹی وجہ۔ یہاں تک تو اس روایت کی کمزوری کو فرمودات محدثین و ناقدین سے ثابت کیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ روایت کو درست مان کر بھی غائبانہ نماز کا استدلال اس سے منع ہے اور دلیل لینے والے کی کم فہمی ہے اس روایت میں ذرا بھی تدبر و تفکر کیا جائے تو مندرجہ ذیل باتیں منظر عام پر نمودار ہوتی ہیں۔ پہلی بات غزوۂ موتٰی کے اس مذکورہ وفد شہدائے کرام حضرت زید بن حارث اور حضرت جعفر بن ابو طالب پر کسی نے بھی غائبانہ نماز نہ پڑھی نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کسی صحابی نے۔ بلکہ صرف دعاء رحمت و بخشش کی گئی تھی دوسری بات ، اگر غائبانہ نماز ہوتی تو جنازہ گاہ جانے اور صفیں باندھنے اور صحابہ کو نماز جنازہ پڑھنے کا حکم ہوتا۔ جیسا کہ حضرت نجاشی کی وفات کی خبر کے ساتھ ہوا۔ حالانکہ حضرت واقدی کی اس روایت میں صحابہ کی صفیں باندھنے جنازہ گاہ جانے چار تکبیروں سے نماز پڑھنے کا قطعاً ذکر نہیں بلکہ الفاظ حدیث اس طرح ہیں۔ جَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمِنْبَرِ (ترجمہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف فرما ہوئے۔ اور حضور اقدس کے سامنے جنگ موتہ کا سارا نقشہ صاف منکشف ہو گیا غیب کے سارے پردے کھل گئے۔ فَقَالَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخَذَ الرَّایَۃَ زَیْدُ بْنُ حَارِثَۃَ فَمَضٰی حَتّٰی اُسْتُشْھِدَ وَصَلّٰی عَلَیْہِ وَدَعَالَہٗ وَقَالَ اسْتَغْفِرُوْا لَہٗ (ترجمہ)۔ راوی فرماتے ہیں کہ ہم صحابہ ممبر پر بیٹھے تھے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جھنڈا زید بن حارثہ نے پکڑ لیا ہے وہ جنگ کے میدان میں گئے اور شہید ہو گئے اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن پر رحمت و صلوٰۃ بھیجی اور اُن کے لئے دعا فرمائی اور ہم سے فرمایا کہ تم استغفار ان کے لئے کرو۔ ثُمَّ اَخَذَ الرَّایَۃَ جَعْفَرُ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ فَمَضٰی حَتّٰی اُسْتُشْھِدَ فَصَلّٰی عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَدَعَالَہٗ وَقَالَ اسْتَغْفِرُوْا لَہٗ (ترجمہ)۔ پھر فرمایا آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے۔ کہ پھر جھنڈا پکڑ لیا جعفر بن ابو طالب نے اور وہ بھی میدان میں گئے یہاں تک کہ شہید ہو گئے تو نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن

پر صلوٰۃ بھیجی اور دعا کی اور صحابہ سے فرمایا کہ ان کے لئے استغفار پڑھو۔ یہ تھے الفاظِ حدیث اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ نماز نہیں۔ کیونکہ نماز ممبر پر بیٹھ کر نہیں ہوتی۔ یہاں ممبر پر بیٹھنے کا ذکر ہے اترنے کا نہیں پھر صلوٰۃ کا فاعل صرف نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا۔ حالانکہ نمازِ جنازہ باجماعت ہوتی ہے۔ پھر زید بن حارثہ کی صلوٰۃ و دُعائے ذکر کے بعد جعفر بن ابو طالب کی شہادت کا ذکر ہے وہ بھی یقیناً ممبر پر بیٹھ کر ہی ہوا ہوگا۔ پھر مقام غور ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام خود تو صلوٰۃ و دعا فرما رہے ہیں اور وہیں بیٹھے ہوئے باقی صحابہ کو استغفار کا حکم دے رہے ہیں صاف ظاہر ہے کہ یہ نمازِ جنازہ نہیں بلکہ صرف دعاءِ رحمت و بخشش ہے۔ تیسری بات۔ شریعت میں نبی کریم کی دعا کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ سورۃ توبہ آیت ۱۰۳ (ترجمہ) یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے اور ان کو جسمِ ظاہری سے پاک کیجئے اور ان کو روحانی و قلبی پاک کیجئے اور ان پر رحمت بھیجئے بیشک آپ کی دعاءِ رحمت ان کے لئے سکونِ قلبی ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ صلوٰۃ کے معنیٰ دعا ہیں تو جس طرح یہاں آیت پاک میں صَلِّ عَلَيْهِمْ سے دعا ہی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ جن سے صدقہ لیا جا رہا ہے ان پر ہی صلاۃ پڑھنے کا حکم ہوا اور وہ تو زندہ لوگ ہیں تو نمازِ جنازہ کس طرح مراد ہو سکتی ہے جن لوگوں نے یہاں صلاۃِ جنازہ کا احتمال نکالا ہے وہ احمق ہیں یہاں صَلِّ عَلَيْهِمْ میں دعاءِ نبی کریم ہی مراد ہے پس اسی طرح غزوۂ موتہ کی حدیث شریف میں بھی۔ صَلّٰى عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہی ہے۔ کہ نبی اکرم آقاءِ اکمل صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہیدین طیبین طاہرین پر ممبر پر بیٹھے بیٹھے دعاءِ رحمت بھیجی اور دوسری دعائیں دیں اور صحابہ کو بھی صرف استغفار کا حکم فرمایا۔ نہ کہ نمازِ جنازہ کا صاف پتہ لگ گیا کہ اس حدیث سے بھی غائبانہ نمازِ جنازہ کا ثبوت لینا کم عقلی ہے مخالفین کی دو مایۂ ناز دلیلیں ہم نے توڑ دیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تیسری دلیل کا تردیدی جواب:۔ مخالف نے تیسری دلیل میں معاویہ بن معاویہ مزنی کی روایت پیش کی تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معاویہ بن معاویہ مزنی کی نمازِ جنازہ مقامِ تبوک میں غائبانہ پڑھی جب کہ معاویہ مذکور مدینے منورہ میں فوت ہوئے تھے میں کہتا ہوں یہ دلیل بھی بہت کمزور ہے اس سے استدلال قطعاً غلط ہے۔ اور جو لوگ ایسے استدلال کرکے اپنا مذہب بناتے وہ لوگ غلط مسلک لئے پھرتے ہیں اور ان کے ایسے استدلال نہایت باطل و فاسد ہیں چند وجہ سے۔ پہلی وجہ۔ یہ روایت سنداً و متناً مضطرب ہے۔ سنداً تو اس لئے کہ اس کی سندیں مختلف ہیں اور راویوں کا اختلاف ہے۔ الاصابہ نے جلد سوم کے ص۱۳۲ اس طرح سند بیان کی عَنْ اَنَسٍ اِبْنِ اَبِي عَتَّابٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ اَبِي مُحَمَّدٍ۔ الاستیعاب جلد سوم ص۲۷۲ تا ص۲۷۳ تین سندوں سے اس کو روایت

کیا۔ اور تینوں میں اختلاف ہے۔ محدثین ان سندوں کو کمزور کہتے ہیں چنانچہ الاصابہ نے کہا ص۱۴۷ پر قَالَ ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ اَسَانِیْدُ هٰذَا الْحَدِیْثِ لَیْسَتْ بِالْقَوِیِّ وَلَوْ اَنَّهَا فِی الْاَحْکَامِ لَمْ یَکُنْ فِیْ شَیْءٍ مِنْهَا حُجَّةٌ۔ ترجمہ۔ ابن عبدالبر نے فرمایا اس حدیث کی کوئی سند بھی قوی نہیں اور اگر یہ حدیث احکام شرعیہ میں ہوتی تو قطعاً حجۃ اور دلیل شرعی نہ بن سکتی۔ امام قرطبی مالکی اپنی کتاب الاستیعاب جلد سوم ص۳۲۵ پر لکھتے ہیں قَالَ اَبُوْ عُمَرَ اَسَانِیْدُ هٰذِهِ الْاَحَادِیْثِ لَیْسَتْ بِالْقَوِیِّ (ترجمہ) محدث ابو عمر نے فرمایا کہ ان روایتوں کی اسناد بالکل کمزور ہیں۔ یہ روایت متناً بھی مضطرب ہے۔ اس لئے کہ متنِ حدیث میں جس معاویہ کے جنازے کا ذکر ہے۔ اس کا نام کہیں تو معاویہ بن معاویہ مزنی ہے کہیں معاویہ بن معاویہ لیثی ہے۔ کہیں معاویہ بن مقرن مزنی ہے۔ جیسا کہ الاستیعاب سوم ص۴۲۷ پر ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ معاویہ بن معاویہ مزنی کوئی صحابی نہ گزرے چنانچہ الاصابہ جلد سوم ص۴۱۷ پر ہے فیْ مُعَاوِیَةَ بْنِ مُعَاوِیَةَ بْنِ مُقَرِّنٍ مُزَنِیٍّ اور ان کے بھائی مشہور محدثین ہیں لیکن معاویہ بن معاویہ کوئی مشہور صحابی اس نام کا نہیں نہ ہی میں اس کو پہچانتا ہوں۔ اس کے متن میں اس طرح بھی اضطراب ہے کہ امام ابن حجر شافعی نے اس روایت میں صرف فَصَلّٰی عَلَیْهِ فرمایا۔ مگر فتاوی فتح القدیر نے بحوالہ طبقات و طبرانی فَصَلّٰی عَلَیْهِ کے بعد لکھا وَخَلْفَهٗ صَفَّانِ مِنَ الْمَلَائِکَةِ اسی طرح عمدۃ القاری جلد چہارم نے ص۲۵ پر یہی لکھا۔ یعنی ایک جگہ متن میں صرف یہ ہے کہ نبی کریم نے صلوۃ پڑھی اور دوسری متن میں ہے جب آپ نے نماز جنازہ پڑھی تو آپ کے پیچھے ملائکہ کی دو صفیں تھیں۔ اگر یہ بات صحیح مانی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت نجاشی کی نماز میں تمام صحابہ کو نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم ملا اور سب نے پڑھی یہاں ایسا کیوں نہ ہوا صرف نبی کریم پڑھتے ہیں باقی صحابہ کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہوا کہ یہ روایت جس کسی نے بھی بنائی جلد بازی میں بلا سوچے سمجھے بنا ڈالی۔ دوسری وجہ۔ پھر اس میں صرف اضطراب ہی نہیں بلکہ اس کی سندوں کے راوی بھی ضعیف و غیر ثقہ اور مطعون ہیں۔ چنانچہ ابن قیم کی کتاب زاد المعاد جلد اوّل ص۱۴۸ پر ہے۔ وَقَدْ رُوِیَ عَنْهُ اَنَّهٗ صَلّٰی عَلٰی مُعَاوِیَةَ بْنِ مُعَاوِیَةَ اللَّیْثِیِّ وَهُوَ غَائِبٌ وَلٰکِنْ لَا یَصِحُّ لِاَنَّ فِیْ اِسْنَادِهِ الْعَلَاءَ ابْنَ زَیْدٍ یُقَالُ زَیْدُ بْنُ یَزِیْدَ قَالَ عَلِیُّ بْنُ الْمَدِیْنِیِّ کَانَ یَضَعُ الْحَدِیْثَ وَرَوَاهُ ابْنُ هِلَالٍ عَنْ عَطَاءِ بْنِ مَیْمُوْنٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ الْبُخَارِیُّ لَا یُتَابَعُ عَلَیْهِ۔ فتاوی فتح القدیر جلد اوّل ص۳۵۶ پر ہے۔ وَمَا فِی الطَّبَقَاتِ ضَعِیْفٌ بِالْعَلَاءِ وَهُوَ ابْنُ زَیْدٍ وَیُقَالُ ابْنُ یَزِیْدَ اِتَّفَقُوْا عَلٰی ضُعْفِهٖ۔ (ترجمہ) اور بیشک روایت کیا گیا اسی طبرانی سے کہ بیشک نماز پڑھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ بن معاویہ لیثی پر حالانکہ وہ غائب تھے۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں علاء ابن زیاد ہے

جس کو زید بھی کہا جاتا ہے علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ یہ شخص بہت حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ ابن حلال نے عطاء بن میمون سے روایت کی انہوں نے انس سے بخاری نے فرمایا کہ اس راوی پر اتباع نہ کیا جائے۔ فتح القدیر نے کہا کہ۔ طبقات کی یہ روایت معاویہ بن معاویہ والی ضعیف ہے علاء ابن زید کی وجہ سے ابن زید کو ابن یزید بھی کہا جاتا تھا۔ تمام محدثین نے اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق کیا ہے زرقانی شرح مؤطا مالک جلد دوم صـ ۵۹ پر ہے۔ وَاَمَّا حَدِیْثُ صَلَاتِہٖ عَلٰی مُعَاوِیَۃَ بْنِ مُعَاوِیَۃَ اللَّیْثِیِّ فَجَاءَ مِنْ طُرُقٍ لَا تَخْلُوْا مِنْ مَقَالٍ: (ترجمہ) لیکن معاویہ بن معاویہ لیثی کی نمازِ جنازہ والی حدیث وہ چند مختلف طریقوں سے مروی ہے اور سارے طریقوں پر جرح اور غلط رائے ہے یعنی کوئی قابلِ اعتماد نہیں۔ تیسری وجہ۔ یہ کہ مضطرب روایت ضعیف ہوتی ہے۔ چنانچہ اصولِ حدیث کی مشہور کتاب تدریب الراوی صـ ۱۶۹ پر ہے وَالْاِضْطِرَابُ مُوْجِبٌ ضُعْفَ الْحَدِیْثِ لِاِشْعَارِہٖ بِعَدَمِ الضَّبْطِ مِنْ رُوَاتِہِ الَّذِیْ ھُوَ شَرْطٌ فِی الصِّحَّۃِ وَالْحُسْنِ۔ (ترجمہ) روایت کا مضطرب ہونا روایت کو ضعیف کر دیتا ہے کیونکہ ضبط نہیں رہتا حالانکہ راویوں کا ضبط حدیث کی درستی اور حسن ہونے کے لئے شرط ہے۔ چوتھی وجہ۔ مندرجہ عبارات سے تو اس روایت کے متعلق محدثین کی جرح دکھائی گئی جس سے ثابت ہوا کہ اہل عقل و خرد کے نزدیک یہ۔ روایت مضطرب بھی ہے بناوٹی بھی اور ضعیف بھی اور ایسی غلط روایت سے دلیل لینا محض نادانی ہے لیکن باوجود کمزوریوں کے پھر بھی اگر کوئی استدلال کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جس نے بھی اس روایت کو بیان کیا اس نے کہا کہ۔ فَنَزَلَ جِبْرَائِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ مُعَاوِیَۃَ بْنَ مُعَاوِیَۃَ الْمُزَنِیَّ مَاتَ بِالْمَدِیْنَۃِ اَتُحِبُّ اَنْ تُطْوٰی لَکَ الْاَرْضُ فَتُصَلِّیَ عَلَیْہِ قَالَ نَعَمْ فَضَرَبَ بِجَنَاحِہٖ عَلَی الْاَرْضِ وَرَفَعَ لَہٗ سَرِیْرَہٗ۔ فَصَلّٰی عَلَیْہِ۔ (ترجمہ) مقامِ تبوک میں لشکرِ صحابہ موجود تھا کہ حضرت جبریل حاضرِ بارگاہ ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ معاویہ بن معاویہ مزنی مدینے منورہ میں فوت ہوئے کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ زمین لپیٹی جائے آپ کے لئے تو آپ اُن پر نمازِ جنازہ پڑھیں نبی کریم نے فرمایا۔ ہاں۔ تو حضرت جبریل نے اپنے پنکھ کو زمین پر مارا اور میت کو اٹھا کر آپ کے قریب سے آئے تو آپ صاف نمازِ جنازہ پڑھی۔ امام ابن حجر شافعی بھی اس دلیل کو اس توجیہ سے توڑ رہے ہیں۔ الاصابہ سوم صـ ۳۱۶ پر فرماتے ہیں۔ قَدْ یَحْتَجُّ بِہٖ مَنْ یُجِیْزُ الصَّلٰوۃَ عَلَی الْغَائِبِ۔ وَیَدْفَعُہٗ مَا وَرَدَ اَنَّہٗ رُفِعَتِ الْحُجُبُ حَتّٰی شَھِدَ جَنَازَتَہٗ۔ (ترجمہ) بیشک دلیل پکڑتا ہے اس روایت سے وہ شخص جو غائبانہ جنازے کی نماز کو جائز مانتا ہے حالانکہ توڑ دیتا ہے اس دلیل کو اسی روایت کا یہ کلام کہ بیشک اٹھا دیا گیا تھا پردہ یہاں تک

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازے کا مشاہدہ فرمایا تھا تو نماز پڑھی تھی۔ پس یہ تو حاضرانہ نماز ہوئی نہ کہ غائبانہ۔ بعینہٖ امام زرقانی نے اپنی شرح جلد دوم ص۶۹ پر۔ اس طرح اس روایت سے استدلال کرکے غائبانہ نماز کو جائز کہنے والوں کا رد فرمایا۔ بلکہ صاحب شرح زرقانی تو صاف صاف جھڑکتے ہوئے فرماتے ہیں وَلَا تَخْتَرِعُوْا حَدِیْثًا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ۔ (ترجمہ): اے کم عقلو اپنے مسلک کو بچانے کے لئے۔ اپنے پاس سے حدیثیں مت گھڑو۔ اس بناوٹ سے تمہارا مذہب مضبوط نہ ہوگا بلکہ تم رسوا ہو جاؤ گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس روایت کو بنانے والے سے جلد بازی میں دو بدحواسیاں ہوئیں ایک یہ کہ رَفَعَ لَہٗ سَرِیْرُہٗ کہہ کر اپنا ہی منشا اور مذہب بھی مجروح کر دیا اور محنت ضائع گئی دوسری یہ کہ ایک طرف تو ثابت کر گیا کہ مقام تبوک میں سارے صحابہ موجود تھے دوسری طرف بتاتا ہے کہ کسی صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صف نہ باندھی بلکہ صحابہ دور کھڑے دیکھتے رہے اور فرشتوں نے صف باندھی۔ یہ تھیں اس بناوٹی روایت کی بدحواسیاں جس سے یہ تیسری دلیل بھی ناقابل قبول ہوگئی۔ یہ تین دلائل حنابلہ و شوافع کے نزدیک مایۂ ناز تھے اور موجودہ دور کے وہابی غیر مقلد بھی ان ہی سے استدلال کرکے غائبانہ نمازِ جنازہ کو جائز سمجھتے ہیں۔ مگر میری اس تنقیدانہ تحریر اور محققانہ گرفت اور عالمانہ گفتگو سے ہر ذی علم پر بخوبی واضح ہو گیا کہ اسلام میں غائبانہ جنازہ کسی حال میں بھی ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے اور پتہ لگ گیا کہ امام اعظم کے مقابل امام حنبل و شافعی کے دلائل کتنے کمزور ہیں۔ شوافع کی چوتھی دلیل کا عقلی رد۔ پہلی تین دلیلیں چونکہ منقولی اور روایتاً تھیں اس لئے ان کا جواب محدثانہ جرح سے دیا گیا۔ یہ اور باقی دلائل صرف درایتاً و عقلاً ہیں اس لئے ان کا جواب بھی عقلی ہوگا۔ ہمارے مخالف نے کہا کہ جن کا جنازہ حاضرانہ نہ پڑھا جائے ان کا غائبانہ پڑھا جائے گا تاکہ حق تلفی نہ ہو میں کہتا ہوں کہ اس حق تلفی کا خیال آپ سے زیادہ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اور خلفاءِ راشدین کو ہو سکتا تھا کہ وہ۔ رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ بھی ہیں اور رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ بھی۔ مگر تاریخ اور احادیث سے ثابت ہے کہ ان مبارک ادوارِ ثلاثہ میں اس طرح کے واقعاتِ کثیرہ رونما ہوئے کہ صحابہ کرام دور دور فوت ہوئے مگر باوجود اس کے کہ ان کی حاضرانہ نماز نہ ہوئی۔ پھر بھی کسی نے کبھی غائبانہ جنازہ نہ پڑھی۔ چنانچہ زاد المعاد ص۱۲۸ جلد اول میں ہے۔ فَقَدْ مَاتَ خَلْقٌ کَثِیْرٌ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَھُمْ غُیَّبٌ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْھِمْ:۔ (ترجمہ) زمانہ صحابہ میں بہت سے مسلمان دور دور فوت ہوتے تھے مگر ان میں سے کسی پر بھی غائبانہ جنازہ نہیں پڑھا گیا زرقانی دوم ص۵۹ پر ہے۔ فَاِنَّہٗ لَمْ یُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مَاتَ غَائِبًا مِّنْ اَصْحَابِہٖ۔ (ترجمہ)۔ بہت سے صحابہ نبی کریم سے غائب ہو کر فوت ہوئے مگر ان پر نبی کریم ﷺ غائبانہ نماز نہ پڑھی۔ اور کسی نے

بھی نہ پڑھی۔ جب کہ دُنیا بھر میں بجز صحابہ کوئی بھی مسلمان نہ تھا اور نہ کوئی کسی مسلمان پر حاضرانہ نماز پڑھنے والا تھا۔ پانچویں دلیل کا جواب۔ حقیقتاً تو سابقہ جواب میں اس کا بھی جواب ہو گیا مگر یہاں اتنا سمجھ لو کہ نمازِ غائبانہ کو سنت کہنا قطعاً ٹھیک نہیں اس لئے کہ اولاً تو حضرت نجاشی کا غائبانہ جنازہ حدیث ہے سنت نہیں ہر دو میں فرق یہ ہے حدیث مطلقاً فعل و قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہیں خواہ خصوصی فعل ہی کیوں نہ ہو اور سنت غیر خصوصی فعل کو کہتے ہیں بدیں وجہ نبی کریم علیہ التحیۃ والثناء نے فرمایا۔ عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ یہ نہ فرمایا عَلَیْکُمْ بِحَدِیْثِیْ حضورِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ۹ ازواج بیک دم اختیار فرمانا حدیث ہے نہ کہ سنت۔ اسی طرح نجاشی کی نماز حدیث ہے نہ کہ سنت۔ ثانیاً۔ وہ نماز خلاف قیاس تھی اور خلاف قیاس اپنے مورد پر رہتی ہے۔ لہٰذا اگر ویسا ہی مرحلہ پیش آجیا کہ وفاتِ نجاشی میں پیش آیا کہ رُفِعَ لَہٗ سَرِیْرُہٗ تب غائبانہ نماز کو جائز کہا جا سکتا ہے ورنہ نہیں ثالثاً۔ میت کا سمتِ قبلہ نہ ہونا اور پھر بھی اس پر نماز کا جائز رہنا حنفیوں کا اختلافی مسئلہ ہے۔ اس لیئے یہ دلیل بھی انتہائی کمزور ہے۔ چھٹی دلیل کا جواب۔ اس دلیل کا دارومدار بھی حضرت نجاشی کی نماز پر ہے اور اس سے استدلال کی کمزوری ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ساتویں دلیل۔ اس کا جواب بھی ہو چکا ہے۔ مگر مزید اتنا سمجھ لو کہ امام شافعی و امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تو اس سے دلیل پکڑ سکتے ہیں مگر موجودہ وہابیوں کیلئے تو حضرتِ نجاشی اور غزوۂ موتہ کا واقعہ بالکل موت ہے۔ کیونکہ اگر احادیث کو صحیح مانتے ہیں تو نبی کریم کا حاضر و ناظر ہونا غیب داں ہونا ثابت ہوتا ہے جس سے اُن کے مذہب بیہودہ کی موت ہے۔ اور اگر اپنے باطل مذہب کو بچاتے ہوئے اِن احادیث کا انکار کرتے ہیں تو غائبانہ جنازہ ثابت نہیں کر سکتے۔ آٹھویں عقلی دلیل کا جواب۔ نمازِ جنازہ مسلمان کا آخری حق نہیں بلکہ عظمتِ شانِ امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار ہے اور صرف نمازِ جنازہ ہی نہیں بلکہ غسل طہارت وضو کفن وغیرہ اور زندوں کا اجتماع کرکے بشکلِ جلوس میت کے ساتھ آہستہ آہستہ پُر وقار طریقے سے جانا۔ اور بعض اقوال کے بموجب میت کے آگے آگے نہ چلنا۔ اور چلتے جنازے کے لیئے کھڑا ہو جانا اور ملائکۂ رحمت کا ہمراہ ہونا۔ اور جنازے کی حاضری کے لیئے باقاعدہ اعلان کرنا اور اعلان کا سنت ہونا۔ (اگرچہ بعض علماء نے اعلان کو منع فرمایا ہے مگر وہ غلط رسموں کے لیئے اعلان مراد ہے۔) بہرحال میتِ مسلمہ سے بعدِ مُردن یہ سب سلوک اظہارِ عظمت کے لیئے ہیں اور یہ نمازِ جنازہ کی عظمت بھی صرف مسلمانوں کو عطا ہوئی ہے نہ کہ سابق امتوں کو چنانچہ ہدایہ شریف جلد اوّل صفحہ ۱۶۵ پر ہے وَنَحْنُ نَقُوْلُ الصَّلٰوۃُ عَلَی الْمَیِّتِ لِاِظْہَارِ کَرَامَتِہٖ ترجمہ: ہم کہتے ہیں کہ نمازِ جنازہ میت کی شانِ خداداد کے اظہار کے لیئے ہے۔ جب یہ میت کے سارے کام میت کے جسم کے اظہارِ شان کے لیئے ہیں میت کے غائب ہونے کی صورت میں کیسے جائز ہو سکتے

ہیں عقل ایمانی و عرفانی کا تقاضہ صرف یہ نہیں کہ اس کا نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھ دو جیسا کہ تم نے سمجھا۔ بلکہ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ میّت کے سارے کام غسل کفن دفن سب کچھ کرو تو جس طرح غسل کفن دفن کے لیئے میّت حاضر موجود ہونا شرط ہے۔ اسی طرح نمازِ جنازہ کے لیئے بھی میت کا حاضر ہونا شرط ہے۔ اور پھر غسل و کفن تو نماز کے لیئے بھی شرط ہے بغیر غسل و کفن تو نماز ہی جائز نہیں۔ تو جو میّت غائب ہے اس کے بارے میں کیا معلوم کہ اس کو غسل و کفن دیا گیا یا نہ لہٰذا عقلاً بھی یہی ثابت ہو رہا ہے کہ غائبانہ نمازِ جنازہ ہرگز ہرگز جائز نہ ہو۔ خواہ پہلے حاضرانہ کسی نے نماز پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو۔ یہی مسلکِ حقہ امامِ اعظم اور امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے شوافع و حنابلہ کے مذہبی دلائل مع جواب ہم نے بیان کر دیئے اب مزید عدمِ جواز پر دلائل پیش کرنے کی ضرورت تو نہ تھی کیونکہ جواز کے دلائل کا خاتمہ ہی عدمِ جواز کی دلیل ہے۔ مگر ہم سائل کی مزید تسلّی کے لیئے اور مسلکِ حنفی کی حقّانیت اور مضبوطی ثابت کرنے کے غرضِ اصلیہ سے چند دلائل بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ پہلی دلیل۔ جیسے ابھی پہلے مخالفین کی کتب سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ امامِ اعظم اور امام مالک علیہما الرحمۃ کے نزدیک کسی بھی میت کا کسی بھی حالت میں غائبانہ نماز منع ہے۔ تو اب سب سے پہلے ضروری ہے یہ بتایا جاتا کہ یہ ممانعت کس درجے کی ہے۔ چنانچہ عمدۃ القاری حنفی شرح بخاری جلد چہارم ص۲۲ پر ہے۔ وَقَدْ ذَهَبَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ اِلَى كَرَاهَةِ الصَّلٰوةِ عَلَى الْمَيِّتِ الْغَائِبِ اور اسی کے ص۲۵ پر ہے وَلَمْ اَجِدْ لِاَحَدٍ مِّنَ الْعُلَمَاءِ اِجَازَةُ الصَّلٰوةِ عَلَى الْغَائِبِ۔ ترجمہ: امام عینی فرماتے ہیں بعض علماءِ کرام اس طرف گئے کہ غائبانہ نمازِ جنازہ مکروہ ہے یعنی مکروہ تحریمی کیونکہ اصطلاحِ فقہا میں مطلقاً مکروہ سے تحریمی مراد ہوتا ہے دیکھو فتح القدیر جلد دوم ص۱۸۰۔ اور امام عینی فرماتے ہیں دنیائے اسلام کے کسی بھی عالم نے غائبانہ نمازِ جنازہ کی اجازت نہیں دی۔ ثابت ہوا کہ غائبانہ نماز مکروہ تحریمی ہے جس کو حرام ظنی بھی کہتے ہیں۔ دوسری دلیل۔ قرآنِ کریم دسواں پارہ رکوع ع۱۶ آیت ۸۴ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (ترجمہ): اور نہ پڑھو ان منافقوں میں سے کسی پر نمازِ جنازہ کبھی بھی جو مر جائے اور نہ کھڑے ہو ان کی قبر کے پاس بھی۔ اس آیت کریمہ سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ منافق کی نمازِ جنازہ منع ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ غائبانہ نماز منع ہے نماز ہوتی ہی وہ ہے جو حاضر میّت پر ہے۔ اس لیئے کہ ہر علم والا جانتا ہے کہ قانونی آیاتِ قرآنیہ میں ہر آیت کا کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ نص۔ کچھ مفسّر ہوتا ہے کچھ محکم۔ نص وہ ہے جس کے لیئے کلام لایا جائے چنانچہ اصول شاشی ص۲۱ پر ہے۔ وَالنَّصُّ مَا سِيْقَ الْكَلَامُ لِاَجْلِهٖ۔ (ترجمہ) آیت کی نص وہ ہوتی ہے جس کے لیئے کلام لایا گیا ہو۔ فَالظَّاهِرُ اِسْمٌ لِكُلِّ كَلَامٍ ظَهَرَ الْمُرَادُ بِهٖ

لِلسَّامِعِ بِنَفْسِ السَّمَاعِ مِنْ غَیْرِ تَامُّلٍ (ترجمہ) : آیت کا ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سننے والے کو بغیر غور و فکر کے صرف سننے سے ہی مراد کا پتہ لگ جائے پس قانونِ اصول کے مطابق یہ آیت کریمہ نصاً تو منافقین کے غائبانہ نمازِ جنازہ کو بتا رہی ہے اور اس کا حکم بتا رہی ہے لیکن ظاہراً نمازِ غائبانہ کی ممانعت بھی ثابت ہو رہی ہے۔ اور حاضرانہ نماز کا ہی حکم ثابت ہو رہا ہے۔ اس طرح کہ لَا تُصَلِّ کے بعد فوراً لَا تَقُمْ کی نہی پائی گئی اور دونوں نہی ممانعتِ شرعیہ کی ہیں۔ ہر دو کا تعلق صرف عطف واؤ سے ہے اور واؤ اصلاً جمع کے لیئے ہوتی ہے۔ لغاتِ عربیہ میں حرفِ واؤ نو قسم کا ہے جن میں عطف کی واؤ جمع کے لیئے ہی ہوتی ہے۔ دیکھو ہدایۃ النحو صفحہ ۲۸ اور کافیہ وغیرہ۔ اس آیتِ پاک میں وَلَا تَقُمْ کی یہ واؤ عاطفہ ہے لہذا جمع کیلئے ہے اور اس جمع نے بتایا کہ صلاۃ اور قبر دونوں ہوتی ہیں۔ یعنی صلوٰۃ اسی کی ہوگی جس کی قبر ہوگی اور قبر تو حاضر میت کی ہوتی ہے لہذا نمازِ جنازہ بھی حاضر میت کی ہوتی ہے۔ اور چونکہ اسلامی قانون کے مطابق نماز کے بعد دفن ہوتا ہے اس لیئے دونوں کا اکٹھا آیات میں ذکر آیا۔ تو جب منافق کافر کے لیئے دونوں کی یکدم ممانعت ہوئی تو مومن مسلمان کے لیئے دونوں یکدم لازم ہونگے کہ نمازِ فرضِ کفایہ تو دفن واجب کفایہ ان دونوں حکموں پر تب ہی عمل ہو سکتا ہے جب میت حاضر ہو۔ غائبانہ میت کی قبر پر تمہارا پہنچنا اور دفن میں شمولیت ناممکن ہے۔ بدیں استدلال غائبانہ نماز ہی ممنوع ہوئی۔ اسی آیت کے نص اور ظاہر سے تو مندرجہ امور ثابت ہوئے مگر اس کے اقتضاء سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ نمازِ جنازہ پہلے ہو بعد میں قبر ہو لیکن غائبانہ جنازہ میں نہیں معلوم کہ قبر پہلے بن چکی اور اب نماز ہو رہی یا سرے سے بنی ہی نہیں ہماری تعمیری دیں۔ سنتِ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ میت مرد ہو تو امام سر کے نزدیک کھڑا ہو جائے اور اگر میت عورت ہو تو درمیان میں یعنی کولہے کے پاس کھڑا ہو۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۴۷ پر ہے۔ فصل ثانی میں۔ عَنْ نَافِعٍ اَبِیْ غَالِبٍ قَالَ صَلَّیْتُ مَعَ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَلٰی جَنَازَۃِ رَجُلٍ فَقَامَ حِیَالَ رَاْسِهٖ ثُمَّ جَاؤُا بِجَنَازَۃِ امْرَاَۃٍ مِنْ قُرَیْشٍ فَقَالُوْا یَا اَبَا حَمْزَۃَ صَلِّ عَلَیْهَا فَقَامَ حِیَالَ وَسْطِ السَّرِیْرِ فَقَالَ لَهُ الْعَلَاءُ بْنُ زِیَادٍ هٰكَذَا رَاَیْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (الخ) قَالَ نَعَمْ (ترجمہ) نافع ابی غالب نے فرمایا کہ میں نے مرد کا جنازہ انس بن مالک کے پیچھے پڑھا آپ سر کے قریب کھڑے ہوئے پھر لوگ قریش کی ایک عورت کا جنازہ لائے تو ابو حمزہ یعنی انس بن مالک نے کمر کے مقابل کھڑے ہو کر پڑھایا علاء ابن زیاد نے سوال کیا کہ ایسا کیوں کیا۔ کیا رسولِ پاک کا ہی یہ حکم ہے۔ فرمایا۔ ہاں۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ نبی کریم کا حکم ہے۔ کہ میت کے سر کے مقابل یا کمر کے مقابل کھڑے رہیں اس سنت اور اس حکم پر کب عمل ہو سکتا ہے جب میت غائب نہ ہو بلکہ حاضر ہو اشارۃ النص سے ثابت ہوا کہ نمازِ غائبانہ

منع ہے۔ ہماری چوتھی دلیل۔ کتاب الصلوٰۃ فقہ السنن ص ۱۳۲ - عَنِ ابْنِ عُمَرَ اِذَا انْتَهٰى اِلَى الْجَنَازَةِ قَدْ صُلِّيَ عَلَيْهِ دَعَا وَانْصَرَفَ وَلَمْ يُعِدِ الصَّلٰوةَ اَخْرَجَهٗ عَبْدُ الرَّزَّاقِ وَهُوَ صَحِيْحٌ ۔ (ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عمر ایک جنازے پر تشریف لائے جس پر نماز ہوچکی تھی تو آپ نے صرف دُعا مانگی اور واپس لوٹ آئے نمازِ جنازہ نہ پڑھی۔ اس حدیثِ مقدس سے ثابت ہوا کہ جس پر ایک دفعہ نماز پڑھی گئی ہو دوبارہ منع ہے تو آج کل کے یہ جاہل غیر مقلد جس کا جنازہ غائبانہ دھڑا دھڑ پڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ معلوم ہے کہ ان کا حاضرانہ جنازہ ہوچکا ہے۔ پس یہ سیاسی شرارت اور اسلام سے روگردانی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ لوگ حماقت سے اس کو عبادت سمجھ رہے ہیں۔ کیا ابن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ کو اس عبادت کا پتہ نہ تھا۔ ہماری پانچویں دلیل۔ بیہقی جلد چہارم ص ۵۱ پر ہے۔ وَلَوْ جَازَتِ الصَّلٰوةُ عَلٰى غَائِبٍ لَصَلّٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلٰى مَنْ مَاتَ مِنْ اَصْحَابِهٖ وَلَصَلَّى الْمُسْلِمُوْنَ شَرْقًا وَغَرْبًا عَلَى الْخُلَفَاءِ الْاَرْبَعَةِ وَغَيْرِهِمْ وَلَمْ يُنْقَلْ ذٰلِكَ ۔ (ترجمہ) اگر غائب میت پر نمازِ جنازہ جائز ہوتی تو آقاءِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اُن صحابہ پر ضرور نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھتے۔ جو دُور کے ملکوں میں فوت ہوئے یا جنگوں میں شہید ہوئے اور پھر اطرافِ عالم کے مسلمان شرق و مغرب میں خلفاءِ راشدین پر غائبانہ جنازہ ضرور پڑھتے حالانکہ ایسا کوئی واقعہ منقول نہیں۔ امام بیہقی کی اس عبارت سے کتنی عظیم وضاحت ہوگئی اگر انسان ذرا بھی عقل و تدبر سے کام لے تو ہرگز غائبانہ نمازِ جنازہ کو جائز نہیں کہہ سکتا۔ ہماری چھٹی دلیل۔ قانونِ اسلامیہ شرعیہ کے مطابق مسلمان میت کے لئے نمازِ جنازہ کی چھ شرطیں ہیں جن میں ائمہ اربعہ کا بھی اتفاق ہے۔ چنانچہ فتاوٰی درمختار شامی جلد اوّل ص ۸۱۱ اور فتاوٰی فتح القدیر جلد اوّل ص ۴۵۶ پر ہے وَشَرْطُهَا سِتَّةٌ ثَلَاثَةٌ فِي الْمَتْنِ وَثَلَاثَةٌ فِي الشَّرْحِ وَهِيَ سَتْرَةُ الْعَوْرَةِ ۱ وَحُضُوْرُ الْمَيِّتِ ۲ وَاِسْلَامُ الْمَيِّتِ ۳ وَطَهَارَتُهٗ ۴ (ام ترجمہ) اور نمازِ جنازہ کے لیے چھ شرطیں ہیں جن میں چار میت کے اندر ہونی لازم ہیں ایک ستر کا ڈھکنا دوم میت کا موجود ہونا غائب نہ ہونا سوم میت کا مسلمان ہونا چہارم میت کا پاک و صاف ہونا۔ ان شرطوں میں ایک شرط ہے میت کا حاضر ہونا جب میت کا حاضر ہونا فرض ہے تو ثابت ہوا کہ غائبانہ جنازہ منع ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ کے مذہب میں بھی میت کا سامنے ہونا بلا اختلاف فرض ہے چنانچہ فقہ شافعی حاشیہ بیجوری جلد اوّل ص ۲۹۴ پر ہے۔ وَقَالَ ابْنُ قَاسِمٍ بِاشْتِرَاطِ الْمُحَاذَاةِ (ترجمہ) ابنِ قاسم شافعی بھی قائل ہوئے کہ میت کا سامنے ہونا بوقتِ نماز فرض ہے۔ اگرچہ وہ یہ قید لگاتے ہیں کہ اگر میت شہر میں ہو تب سامنے ہونا فرض گھوڑے پر یا سامنے بلندی پر یا بیٹھے پیچھے منع ہے۔ لیکن محاذاۃ کے وہ بھی قائل ہیں۔ اس دلیل سے بھی ثابت ہوا کہ حاضرِ میت کا نمازِ جنازہ جائز ہے غائب کا نہیں۔ ان تمام دلائل سے اور استدلالاتِ مخالف کے بطریقِ احسن توڑ دینے کی وجہ سے مسئلہ بالکل واضح ہوگیا کہ شرعًا غائبانہ جنازہ

بالکل ناجائز ہے۔ ہماری اس تمام گفتگو سے مسلک غیر مقلد وہابی کا تو بالکل ہی ستیاناس ہو گیا۔ البتہ مذہب شوافع وحنابلہ کی کمزوری اور مذہب حنفی کی مضبوطی بڑے واضح انداز میں اُجاگر ہو گئے۔ جس طرح ہم نے مخالف کے دلائل کو بیان کر کے توڑا ہے۔ اللہ کے فضل سے مخالف وہابی کو ہمارے دلائل توڑنے کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ اس تمام گفتگو کا مقصد یہ نہیں کہ اہلسنت شوافع یا اکابر اہلسنت حنابلہ کی توہین کی جائے حاشا حاشا ایسی کوئی بات نہیں بتانا صرف یہ ہے کہ اکابر امت سے بھی بعض اوقات ایسی چشم پوشیاں وقوع پذیر ہو جاتی ہیں جن کا نقصان دِہ اثر دُور تک پہنچ جاتا ہے اور یہ کمی بھی محض بتقاضائے بشری ہوتی ہے۔ مگر چونکہ ان پیاروں کی ہر فکر پر تدبر بعد تحقیق میں خلوص و للّٰہیت ہی ہوتی ہے نہ کہ سیاسی چالیں لہٰذا اِن ائمہ کی خطا پر بھی اِن کو ثواب مل جاتا ہے۔ اور اس طرح کے نسیان وعدمِ تفکر امام بخاری جیسے محتی محدث سے بھی وارد ہوئے چنانچہ علامہ غلام رسول سعیدی کی کتاب میں تذکرہ محدثین میں اِس پر کافی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور یہ چشم پوشیاں صرف شوافع وغیرہ سے ہی واقع نہیں ہوئیں دیگر علما سے بھی ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ امام ابن عابدین عرف علامہ شامی صاحب فتاوٰی منحۃ الخالق علی بحر الرائق اپنی اِسی کتاب جلد اوّل کے صـ۱۸۲ پر کتاب الجنائز میں دعاء جنازہ پر ایک سوال قائم فرماتے ہیں اور جواب سے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے غلط جواب دے گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ قَوْلَ الْمُصَنِّفِ۔ وَلَا یَسْتَغْفِرُ لِصَبِیٍّ۔ یَرِدُ عَلَیْہِ مَا فِی الْحَدِیْثِ۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاھِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا (الخ) اَللّٰھُمَّ۔ اِلَّا اَنْ یُّجَابَ بِاَنَّہٗ لَا یَسْتَغْفِرُ لِلصَّبِیِّ عَلٰی سَبِیْلِ التَّخْصِیْصِ (الخ) ثُمَّ رَأَیْتُ الْقُھُسْتَانِیْ اَجَابَ بِذٰلِکَ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ (ترجمہ)۔ مصنف بحر الرائق کا یہ فرمان کہ بچے کے لیے جنازے میں استغفار نہ پڑھے بخشش نہ مانگے اس پر اعتراض پڑتا ہے کہ حدیث پاک میں تو آیا ہے کہ اے اللہ بخش دے ہمارے زندہ کو ہمارے مردہ کو ہمارے موجود کو ہمارے غائب کو اور صغیر کو اور ہمارے کبیر کو۔ یا اللہ اس اعتراض کا ہمارے پاس جواب کوئی نہیں۔ مگر یہ کہ بخشش بچے کے لیے خصوصیت کے ساتھ منع ہے۔ یہ مطلب مصنف کی عبارت کا ہے اور حدیث پاک کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ عمومی طور پر سب کو شامل کرو۔ یہ جواب لکھنے کے بعد فتاوٰی قہستانی کو میں نے دیکھا تو وہاں بھی یہی جواب تھا۔ شکر الحمد للّٰہ۔ یہ تھی علامہ شامی اور فتاوٰی قہستانی کی جواب میں غفلت۔ آج سے تقریباً دس سال پہلے جب میری نظر اس اعتراض جواب پر پڑی تو میں نے حاشیے پر لکھ دیا۔ ھٰذَا الْجَوَابُ عِنْدِیْ لَیْسَ بِصَحِیْحٍ بَلْ اَوْلٰی اَنْ یُّجَابَ اَنَّ الصَّغِیْرَ لَا یُطْلَقُ عَلٰی غَیْرِ بَالِغٍ فَقَطْ بَلْ مَرَّۃً عَلٰی بَالِغٍ وَمَرَّۃً عَلٰی غَیْرِ بَالِغٍ وَھٰکَذَا قَدْ یُطْلَقُ الصِّغَارُ عَلَی الْفُرُوْعِ وَالْکِبَارُ عَلَی الْاُصُوْلِ مَعَ قَطْعِ النَّظَرِ مِنَ الْبُلُوْغَۃِ وَغَیْرِ الْبُلُوْغَۃِ فَانْظُرْ مُکْتَبَ اللُّغَتِ وَالْمُرَادُ فِی الْحَدِیْثِ بِصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا اِمَّا سِنًّا بِسِنِّ الْمُتَکَلِّمِ وَاِمَّا فُرُوْعُ الْمُتَکَلِّمِ اُصُوْلُہٗ وَلِذَا

اِخْتَارَ مُصَنِّفُ الْبَحْرِ لَفْظَ الصَّبِیِّ وَتَرَکَ الصَّغِیْرَ وَفِی الْحَدِیْثِ عَکْسُہٗ نَعْلَمُ مِنْہُ فَرْقَ الصَّبِیِّ وَالصَّغِیْرِ اَنَّ الصَّبِیَّ مَخْصُوْصٌ لِغَیْرِ الْبَالِغِ (ترجمہ)

میرے نزدیک یہ جواب صحیح نہیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ جواب دیا جائے اس طرح کہ لفظِ صغیر نہیں بولا جاتا ہے غیر بالغ پر فقط بلکہ کبھی یہ لفظ بالغوں کے لیئے بھی استعمال ہو جاتا ہے کبھی نابالغوں کے لیئے اور ایسے ہی کبھی یہ لفظِ فرع یعنی اولاد کیلئے بولا جاتا ہے اور لفظِ کبیر اپنے بزرگوں بڑوں کے لیئے بولا جاتا ہے۔ وہاں غیر بلوغت یا بلوغت کا خیال نہیں ہوتا جیساکہ کتب لغت میں ہے حدیث پاک میں صغیرنا وکبیرنا سے مراد یا پڑھنے والے کی عمر کے اعتبار سے چھوٹا بڑا مراد ہے یا متکلم کے اصل نسل مراد۔ خواہ بالغ خواہ نابالغ اسی لیئے بحر الرائق نے لفظِ صبی کہا نہ کہ لفظ صغیر اور حدیث پاک میں اس کا اُلٹ ہے۔ پس مصنف اور حدیث شریف کے اس طریقۂ استعمال سے صبی اور صغیر کا فرق بھی۔ معلوم ہو گیا۔ کہ بیشک صبی صرف نابالغ بچے کو ہی کہتے ہیں۔ یہ بعض امام قہستانی اور امام عابدین کی چشم پوشیاں اور عدمِ تفکر۔ مگر اس کے اظہار کی چنداں حاجت نہیں تھی لیکن چونکہ فی زمانہ اس قسم کی خطاؤں سے غلط فائدہ اٹھا کر فساد کا باعث بن جاتے ہیں۔ جیساکہ وہابی لوگ شوافع وحنابلہ کی ذراسی خطاء اجتہادی سے آڑے کر غائبانہ جنازے کو سیاسی رنگ دیرہے اور محض دھوکہ دہی کے لیئے اس کو عبادت کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ ایسی بے ضابطہ چیزیں اور ایسے بے اصولے کام نہ عبادت ہو سکتے ہیں نہ کارِ ثواب۔ بلکہ خیال رہے سخت گناہ لازم آتا ہے لہٰذا کوئی سنی حنفی مسلمان ہرگز ہرگز نہ وہابیوں کے ساتھ ملکر نہ ان کی دیکھا دیکھی علیحدہ غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھے۔ ٭ ٭ ٭

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتاب

ختم ایصال ثواب کا غلط طریقہ اور اس کا رد

سوال ۳۱

کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین مفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ لوگ جب درود پاک کا ختم کرتے ہیں۔ تو دائرہ بنا کر بیٹھتے ہیں ایک جگہ اس طریقے سے درود پاک شروع تھا۔ کہ ایک شخص مسمی غلام یسین اکا اپنی جائے نماز یعنی مصلیٰ کو عین درمیان دائرے کے قبلہ رو بچھا دیتا ہے اور جائے نماز کے کونوں پر ٹھیکریاں بھی رکھ دیتا ہے۔ خود دائرہ میں بیٹھ جاتا ہے جب اس سے پوچھا گیا کہ اس مصلیٰ کو اس طرح ٹھکریاں رکھ کر کیوں بچھایا۔ تو لوگوں نے کہا کہ یہ مصلیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے ہے اور بعض لوگ مصلیٰ کی بجائے پلنگ رکھتے ہیں۔ ایک شخص نے منع کیا تو دوسرا شخص غلام احمد حامی بولا۔ اگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہٖ وسلم نہیں آتے تو پھر حاضر و ناظر کیں

کس طرح ہوتے ہیں۔ ہمارے علاقہ ڈیرہ غازی خان کے دیہاتی لوگوں میں مسجدوں کے اماموں نے یہ اور اس طرح کے بہت سے عجیب عجیب طریقے نکالے ہوئے ہیں۔ ہم چند احباب نے جب ان پر اعتراض اور سوال کیے تو یہ امام لوگ بضد ہوئے اور کہا کہ کسی عالم دین جو اہلسنت میں معتبر ہو اس کے پاس سے فتویٰ منگاؤ۔ لہٰذا ہمیں فتویٰ دیا جائے کہ کیا یہ عقیدہ اور طریقہ صحیح ہے یا غلط۔ اور کیا مصلّی نہ بچھایا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر نہیں ہوتے اور جا نماز بچھانا عقیدۂ اہلسنت پر جائز ہے یا نہیں

بینوا توجروا

دستخط سائل۔ محمد ایوب خان قادری

مقام ڈیرہ غازی خان چوک پاکستان۔ $\frac{11}{66}$ ۷

بعون العلام الوھاب

الجواب

سوال مذکورہ میں جو طریقہ کیا گیا ہے۔ وہ بالکل بے کار اور بے فائدہ ہے۔ عقائد اہل سنت میں یہ مذکورہ مصلّے یا پلنگ بچھانے کا طریقہ داخل نہیں ہے۔ یہ سب کام بالکل فضول اور طریقے جہلاء کے ہیں۔ نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہر مومن کے دل میں جلوہ افروز ہیں۔ خواہ وہ کہیں ہوں اور آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہر امتی کا درود شریف سنتے ہیں۔ چنانچہ جلاء الافہام (مصنفہ شیخ الاسلام محفوظ شمس الدین منطقی) صفحہ ۶۳ پر ہے طبرانی سے نقل فرماتے ہیں عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وسلم لیس من عبد لا یصلی علیّ الا بلغنی صوتہ حیث کان قلنا وبعد وفاتک قال وبعد وفاتی ط۔ لہٰذا ثابت ہوا۔ کہ جہاں کہیں بھی کوئی مومن خلوص دل سے آقائے دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہے۔ تو وہ نبی پاک صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے۔ اور نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہر مومن کے پاس حاضر و ناظر ہیں۔ اور ہر وقت ہر مقام پر موجود ہیں پلنگ، چٹائی یا مصلّے اس لیئے بچھانا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس پر تشریف فرما ہوں گے۔ سب بے کار ہے نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا مقام پلنگ، چٹائی یا مصلّے نہیں بلکہ مومن کا دل ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم ط

کتبــــــــــــــہ

گھر میں کسی ولی اللہ کا مزار بنانے کا بیان

سوال ۳۲ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کسی ولی اللہ کا مزار گھر میں بنانا جائز ہے یا کہ نہیں۔ ایک وہابی دیوبندی مولوی نے کہا ہے۔ کہ ناجائز ہے۔ ہماری بستی میں ایک ولی اللہ فوت ہوئے اُن کا مزار اور قبر اُن کے گھر میں بنائی گئی۔ تو وہابیوں نے اعتراض کیا۔ کہ یہ ناجائز ہے۔ صرف انبیاء کرام کی خصوصیت ہے۔ کہ جس گھر میں فوت ہوں۔ وہاں پر ہی دفن کیا جاتا ہے۔ دیوبندی کے اپنے اس دعوے کی تین دلیلیں ہیں۔ دلیل ۱:۔ حدیث پاک مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۵۴۸ پر اور شمائل ترمذی شریف صفحہ نمبر ۲۸ پر ہے۔ کہ حَدَّثَنَا اَبُوْ كُرَيْبٍ مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَكْرٍ هُوَ ابْنُ الْمُلَیْكِیِّ عَنْ اَبِیْ مُلَیْكَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اخْتَلَفُوْا فِیْ دَفْنِهٖ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ شَیْئًا مَا نَسِیْتُهٗ قَالَ مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِیًّا اِلَّا فِی الْمَوْضِعِ الَّذِیْ یُحِبُّ اَنْ یُّدْفَنَ فِیْهِ اُدْفُنُوْهُ فِیْ مَوْضِعِ فِرَاشِهٖ ط (ترجمہ):۔ ابوکریب نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہم سے حدیث بیان کی ابو معاویہ نے انہوں نے روایت کی عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے وہ ابن ملیکی ہیں۔ انہوں نے روایت کی ابو ملیکہ سے انہوں نے روایت کی حضرت عائشہ صدیقہ سے انہوں نے فرمایا۔ کہ جب نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہ کرام نے آپ کے دفن مبارک میں اختلاف کیا تو صدیق اکبر نے فرمایا۔ کہ میں نے آقائے دوعالم رسول اللہ صلے اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے ایک چیز سنی کہ جس کو میں بھولا نہیں فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فوت کیا اللہ تعالٰی نے کسی نبی مکرم کو مگر اسی جگہ میں کہ جس میں نبی مکرم نے دفن ہونا پسند فرمایا۔ لہٰذا اے صحابہ تم بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے بستر کی جگہ میں دفن کرو۔ دلیل ۲:۔ شامی شریف جلد اول صفحہ نمبر ۸۳۳ پر ہے:۔ وَلَا یُدْفَنُ صَغِیْرٌ وَكَبِیْرٌ فِی الْبَیْتِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْهِ فَاِنَّ ذَالِكَ خَاصٌّ بِالْاَنْبِیَاءِ بَلْ یُنْتَقَلُ اِلٰی مَقَابِرِ الْمُسْلِمِیْنَ ط۔ (ترجمہ):۔ نہ دفن کیا جائے چھوٹا اور نہ بڑا اس گھر میں مرا ہے جس میں کیونکہ

یہ خاص ہے انبیاء سے بلکہ منتقل کیا جائے اُس کو مسلمانوں کے قبرستان کی طرف دلیل ع۳
بعینہٖ یہی عبارت مذکورہ بالا، فتح القدیر جلد اول صفحہ نمبر ۳۰۴ میں بھی درج ہے۔ اب ان تین دلائل
سے حتماً ثابت ہوا کہ کسی شخص کو اگرچہ ولی اللہ ہو۔ گھر میں دفن کرنا منع ہے فرمایا جائے کہ کیا
یہ بات درست ہے۔ اور ان دلائل کا جواب کیا ہے :۔ بیّنوا وتوجروا :۔

السائل :۔ (محترم قبلہ استاد العلماء) حافظ سید علی خطیب عیدگاہ گجرات و امام مسجد
میاں جلال محلہ خواجگان گجرات مورخہ : ۲ ۔

بعون العلام الوھاب

الجواب

قانونِ شریعتِ اسلامیہ کے مطابق کسی مسلمان کی قبر بنانے کے لیئے قرآن و حدیث نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ بجز تین جگہوں کے ہر جگہ بوقتِ ضرورت مسلمان (عام ہو یا خاص) کی قبر قبرستان کے علاوہ بنانی بھی جائز ہے۔ جس کی متعدد مثالیں عالمِ اسلام میں موجود ہیں۔ جو کہ آگے بیان کی جائیں گی۔ ہاں صرف ایسے تین موقعے ہیں۔ کہ کسی مسلمان کی گھر میں یا کسی علیحدہ جگہ قبر بنانی منع ہے :۔
ع۱ :۔ کسی غیر کی ملکیتی زمین پر (ع۲) عام رہ گزر سڑک یا گلی وغیرہ :۔ ع۳ :۔ خود فوت ہونے والے کی میراث کی زمین جب کہ نہ تو خود میّت نے وصیّت کی ہو۔ نہ تمام وارثوں نے اجازت دی ہو۔ یا وارثوں میں کوئی نابالغ وارث ہو۔ فقط ان تین اقسام کی زمینوں میں قبر بنانا قطعاً ناجائز ہے اس کے علاوہ ہر مسلمان کی قبر جہاں چاہو۔ بناؤ۔ شرعاً ممانعت کا کوئی ثبوت نہیں ہے :۔
وصیّت کی صورت میں ثلث مال کی شرعی قید کا بھی خیال رکھا جائے گا اس کے علاوہ نہ حرام اور نہ شرک، ہاں افضلیت کے لحاظ سے فقہاءِ کرام کا فرمان جداگانہ، اور اس بیانِ افضلیت میں فطری قانون کے مطابق عام اور خاص کا فرق لازماً رکھا گیا ہے۔ کیونکہ قانون کے اعتبار سے اسلامی مساوات صرف دنیوی امور میں ہے۔ لیکن اُخروی طور پر ہرگز ہرگز مساوات جائز نہیں چنانچہ اسلامی روایات میں یہ تو ثابت ہے۔ کہ کالے اور گورے، امیر غریب، آقا، غلام خادم، مخدوم، بادشاہ، رعایا، حاکم اور محکوم میں شرعاً کوئی امتیاز نہیں۔ لیکن اُستاد۔ شاگرد، باپ، بیٹا، پیر، مرید، عالم، جاہل، ولی اللہ اور غیر ولی اللہ، صحابی، غیر صحابی، تابعی، تبع تابعی نبی اور اُمّتی، یہاں تک کہ نبی اور رسول، مرسل، خالق و مخلوق میں بے شمار فرق ہے۔ جن کو ہر مقام پہ قائم رکھنا عین ایمان کی بنیاد ہے۔ اور اس فرق کو ختم کرنا دین و ایمان کو ختم کرتا ہے

نجدی ذریت اور دیوبند کے بدنصیبوں نے دنیوی فرق تو بڑے اہتمام اور شدومد سے باقی رکھا۔ حالانکہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہ نے اس کو مٹانے کا حکم فرمایا:۔ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ط (ترجمہ):۔ زمین میں اکڑ کر مت چل۔ بلکہ عام لوگوں کی طرح چلو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ط:۔ یعنی سب امیر غریب کالے، گورے مل کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور دنیوی بڑائیوں کو ختم کر کے ایسا نقشہ بناؤ۔ کہ شعر:۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز!!

تیسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ط (ترجمہ):۔ یعنی اے دنیا والو، بے شک ہم نے تم کو مذکر، مؤنث اور قبیلے قبیلے اس لیے پیدا کیا۔ تاکہ صرف ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ نہ کہ بڑائی کے لیے۔ ان دنیوی باتوں میں فرق مٹانا لازم ہے۔ مگر دیوبندی ان فرق اور امتیازات کو مسلمان تو درکنار کافر بھی باقی رکھتے ہیں۔ اس لیے آئے دن دیوبند میں ہندو امراء، وزراء کے نعرے جھنڈیاں، روشنیاں، خصوصی اسٹیجیں وغیرہ لگ جاتی ہیں لیکن دینی بزرگوں کا فرق جس کو رب کریم کے کلام قرآن و حدیث (اَدَامَ اللّٰهُ تَعَالٰی فُیُوْضَهُمَا) نے متعدد جگہ قائم و دائم رکھا۔ چنانچہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ الخ ط ع ۲:۔ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط ع ۳:۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ط ع ۴:۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ الخ ط ع ۵۔ اِنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ط ع ۱:۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط (ع ۷) اَیُّكُمْ مِثْلِیْ ط ان جیسی آیات احادیث میں یہی فرمایا گیا ہے کہ میرے خصوصی بندوں میں اور تم میں بہت فرق ہیں۔ اس فرق کو قائم رکھنا انبیاء کرام و صحابہ کرام تو درکنار ولی اللہ کی برابری کا بھی دعوٰے نہ کرنا، ورنہ ایمان سے خارج ہو جاؤ گے:۔

شعر

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

مگر جہلاء وہابیہ نے یہاں خدائی فرق کو اٹھانے کی ناپاک کوشش کی۔ کسی دیوبندی نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم جیسے ہیں۔ اور ان کا ادب بڑے بھائی سے زیادہ نہ کرو۔ کسی نے کہا۔ کہ مخلوق کی طرح خالق بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ) حالانکہ انبیاء و اولیاء ہر لحاظ سے دیگر مخلوق سے ممتاز اور بالاتر ہیں۔ اور ان کو بالاتر ممتاز سمجھنا ہی ایمان ہے۔ ان کو دنیوی اور اخروی زندگی کی طرح عالم برزخ، قبر و حشر میں بھی ممتاز ہی سمجھنا چاہیئے۔ اور ہر لحاظ سے ان کی بالادستی کائنات پہ ظاہر

کہ ولی مومن کامل اور سچے مسلمان کی نشانی ہے۔ اس لیے فقہاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ عوام کی قبریں کچی بنانی بہتر ہیں۔ لیکن مشائخ، علماء، اور اولیاء کی قبور پختہ کرنی جائز ہیں۔ بلکہ بہتر اور ضروری ہیں۔ چنانچہ فتاوٰے درمختار کی شرح ردالمحتار جلد اوّل صفحہ نمبر ۶۰۳ پر ہے:۔ وَقِيلَ لَا يُكْرَهُ الْبِنَاءُ إِذَا كَانَ الْمَيِّتُ مِنَ الْمَشَائِخِ وَالْعُلَمَاءِ وَالسَّادَاتِ ط (ترجمہ):۔ اور فرمایا گیا۔ کہ قبر کو پختہ بنانا اور گنبد بنانا جب میت اولیاء اللہ یا سادات کی ہو۔ بالکل مکروہ نہیں (بلکہ جائز ہے) یہ جواز کیوں ہے صرف بزرگوں کے تعظیمی فرق کے لیے۔ اگرچہ عوام کی قبریں بھی اوپر کی سطح سے ضرورۃً پختہ کرنا جائز ہیں۔ کہ چند روایات سے ثابت ہے۔ مگر ان کی افضلیت یہی ہے۔ کہ ان کو کچا ہی رکھا جائے۔ اس افضلیت میں بھی حکمت یہ ہے۔ کہ پھول، سبزہ سے میت کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ بخلاف اولیاء اور علماء کے۔ کہ ان کی خصوصیت فضیلت قبر کو پختہ کرنے گنبد بنانے میں ہے۔ تاکہ زائرین کے آرام کے ساتھ ساتھ قلوبِ اغیار میں رعب، عظمت قائم اور بجائے مندروں کی پرشکوہ عمارت کی طرف دل مائل ہونے کے ان مزارات کی طرف متوجہ ہوں۔ اور لوگوں کی حاجات بتوں کے سامنے پوری نہ ہوں۔ بلکہ اللہ کے ان آستانوں پر آئیں۔ اور اسی خصوصی فضیلت کو برقرار رکھنے اور ثابت کرنے کے لیے آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود دستِ اقدس سے حضرت عثمان کی خصوصی قبر کو بہت اونچا کیا۔ اور اس پر بہت سے پتھر لگوائے تاکہ نشان قائم رہے۔ پس جس طرح قبر کی پختگی میں اولیاء۔ اور علماء کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح قبر کو بنانے اور اس کی جگہ میں بھی فرق و امتیاز رکھنا اشد ضروری ہے۔ کہ عوام کی قبور۔ بہتر ہے کہ قبرستان میں بنائی جائیں اور علماء و مشائخ کی قبور علیحدہ کسی علیحدہ مکان وغیرہ میں یہ صرف استحبابی حکم ہے۔ ورنہ اس کا عکس بھی جائز ہے۔ یہ مسلکِ حنفی فقہاءِ کرام کے علاوہ دیگر آئمہ عظام کا بھی ہے۔ چنانچہ فقہ شافعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ احاشیہ بجوری جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۹۵ پر ہے:۔ وَالدَّفْنُ فِي الْمَقْبَرَةِ أَفْضَلُ مِنْهُ فِي غَيْرِهَا:۔ (ترجمہ):۔ اور دفن کرنا عام میت کا قبرستان میں زیادہ بہتر ہے۔ اس کے علاوہ دفن کرنے کے اور اس کی حکمت یہ ہے۔ کہ يَنَالُ الْمَيِّتُ دُعَاءَ الْمَارِّينَ:۔ (ترجمہ):۔ یعنی اس مستحبات کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ میت گزرنے والوں کی دعاء فاتحہ وغیرہ پالے۔ عوام کو اس کے علاوہ لوگوں کی فاتحہ، ایصالِ ثواب میسر نہیں آسکتا۔ جیسے کہ لاہور میں سلطان ایبک کا مزار اکثر اقبال کی قبر کہ وہاں کبھی کسی کو بجز شاذ و نادر فاتحہ پڑھتے نہ دیکھا۔ بخلاف دیگر اولیاء و علماء کے، اسی طرح جس کتاب میں بھی لکھا ہے۔ کہ قبرستان میں میت کو دفن کیا جائے۔ وہ استحبابی حکم صرف عوام کیلئے ہے فتاوٰے تنویر الابصار جلد اوّل صفحہ نمبر ۶۰۳ پر ہے

وَلَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُدْفَنَ فِی الدَّارِ وَلَوْ صَغِیْرًا ہ یعنی لائق نہیں۔ کہ میت گھر میں دفن کی جائے۔ اگرچہ چھوٹی ہو۔ اس عبارت میں لفظ لا ینبغی۔ سے استحباب کا فائدہ حاصل ہوا۔ کیونکہ یہ لفظ اصول فقہ میں مستحب کے لیئے مستعمل ہے۔ اور اگلی عبارت ولو صغیرًا ہ سے عمومیت ظاہر ہوئی پس نتیجہ نکلا۔ کہ یہ مسئلہ عوام کے لیئے ہے نہ کہ خواص کے لیئے اور وہ بھی بہتر نہ کہ واجب وہابی صاحب نے جو تین دلیلیں بنا کر پیش کی ہیں۔ وہ دراصل دو ہیں۔ اور وہ اُن کے مسلک و دعوئے پر دلیل نہیں بلکہ ان کی کم فہمی و حقیر معقق ہونے پر دال ہیں۔ پہلی دلیل حدیث۔ بحوالہ ترمذی و مشکوٰۃ پیش فرمائی۔ حالانکہ اس روایت نمبر اسے نہ ان کا مدعا ثابت ہوتا ہے۔ اور نہ ہی یہ روایت درست اور صحیح ہے۔ پس دو طرح سے یہ روایت اُن کی دلیل نہیں بن سکتی۔ ۱۔ الفاظ روایت اس چیز کو واضح کر رہے ہیں۔ کہ انبیاء کرام جس جگہ دفن ہونا پسند کرتے ہیں رب کریم وہیں اُن کو وفات دیتا ہے اُس سے صرف پسندیدگی ہی ثابت ہوگی۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کی رضا چاہتا ہے۔ اس طرح پر یہ روایت وہابی کش دیوبندیت سوز ثابت ہوگی۔ اس سے یہ ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ کہ انبیاء کرام کو صرف مکانوں، گھروں میں ہی دفن کرو نیز ثابت ہوا۔ کہ کسی اور کو گھر میں دفن نہ کرو۔ بلکہ صرف انبیاء کی پسند کا ذکر ہے۔ اُن کو جو جگہ بھی جنگل پہاڑ، گھر اپنا یا کسی کا پسند آجائے تو اُن کی وہاں ہی وفات شریف ہوتی ہے۔ اور یہ وفات گویا اُن کی پسند کی نشانی ہے۔ تو گھر میں دفن ہونا، انبیاء کی خصوصیت نہ ہوا۔ اور اگر اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تب بھی وہابی صاحب کا دعوائے ثابت نہیں ہوتا۔ دوم:۔ یہ کہ یہ روایت شارحین و محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ چنانچہ مرقات شرح مشکوٰۃ جلد پنجم صفحہ آخری ص۹۱ پر ہے:۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ غَرِیْبٌ وَفِیْ اِسْنَادِہٖ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ الْمُلَیْکِیِّ بْنِ اَبِیْ بَکْرٍ یُضَعَّفُ ہ یعنی یہ حدیث غریب ہے کیونکہ عبدالرحمٰن بن ابوبکر بن ملیکی ضعیف راوی ہے:۔ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمتہ نے بھی اپنی شرح مشکوٰۃ جلد ہشتم صفحہ نمبر ص۲۹۲ پر اس کے ضعف کا ذکر بحوالہ ترمذی کیا ہے:۔ اگرچہ آپ دیگر وجوہ کی بنا پر اس کی صحت پر راغب ہیں مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ واقعاتی طور پر اس روایت کو ضعیف ماننے کے سوا چارہ نہیں۔ اس کے ضعف پر چند حقیقت پسندانہ وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے۔ کہ اس کی سند میں عبدالرحمٰن ابن ملیکی ہے۔ کہ جس کو تمام علماءِ اسماء الرجال ضعیف راوی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ تقریب التہذیب لابن حجر عسقلانی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ صفحہ نمبر ص۱۹۹ پر ہے۔ کہ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ عُبَیْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ مُلَیْکَۃَ الْمَدَنِیُّ ضَعِیْفٌ مِّنَ السَّابِعَۃِ ہ:۔ یعنی عبدالرحمٰن ابن ملیکی راوی ضعیف ہیں۔ اور راویوں کے ساتھ ساتویں درجے سے تعلق رکھتے ہیں اور

دوسری وجہ اس روایت کے ضعف کی یہ ہے۔ کہ متعدد انبیاءِ کرام کے واقعات میں اس طرح مرقوم ہے کہ آپ فوت کسی اور مقام پر ہوئے۔ اور آپ کے مزارات مقدس کہیں دُور بنائے گئے۔ چنانچہ حضرت موسٰی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی وفاتِ طیبہ مقامِ تیہ میں ہوئی۔ لیکن حضرت موسٰی علیہ السلام کا مزار پاک بیت المقدس کے قریب فلسطین میں۔ اور حضرتِ ہارون علیہ السلام کا مزار شریف ایک معروف روایت کے مطابق مدینہ پاک میں اُحد پہاڑ کے بالکل اوپر چوٹی پر بنا ہے۔ چنانچہ تفسیر جلالین اور تفسیر صاوی جلد اول صفحہ نمبر ۲۱۳ پر ہے وَمَاتَ ھٰرُوْنُ وَمُوْسٰی فِی التِّیْہِ۔ وَمَاتَ مُوْسٰی بَعْدَ ھٰرُوْنَ بِسَنَۃٍ ط یعنی حضرات کریمین طیبین موسٰے وھٰرون علیہما السلام مقامِ تیہ میں فوت ہوئے۔ ہارون علیہ السلام کے سال بعد موسٰی علیہ السلام فوت ہوئے۔ حضرت موسٰے علیہ السلام نے وفات کے وقت تمنا کی یا اللہ میری قبر ارضِ مقدس کے قریب ہو جائے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۵۰۶ پر ہے:۔ وَعَنْہُ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ جَاءَ مَلَکُ الْمَوْتِ اِلٰی مُوْسٰی بْنِ عِمْرَانَ فَقَالَ لَہٗ اَجِبْ رَبَّکَ قَالَ فَلَطَمَ مُوْسٰی عَیْنَ مَلَکِ الْمَوْتِ فَفَقَأَھَا الخ۔ رَبِّ اَدْنِنِیْ مِنَ الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَۃِ رَمْیَۃً بِحَجَرٍ۔

(ترجمہ:۔ اس کا اوپر گزر گیا) چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی۔ اور آپ کا جنازہ بیت المقدس کے قریب کر دیا گیا۔ یا فرشتوں کے ذریعہ یا کسی اور طرح۔ حضرت ہارون کا مزار ایک گمان میں جبل احد پر ہے:۔ چنانچہ وفاء الوفا جلد سوم صفحہ نمبر ۱۰۳ پر ہے:۔ یَزْعُمُوْنَ اِنَّ قَبْرَ ھٰرُوْنَ عَلَیْہِ السَّلَامُ فِیْ اَعْلَاہُ:۔

ترجمہ:۔ لوگ گمان کرتے ہیں۔ کہ حضرت ہارون کا مزار جبل احد پر ہے۔ اور سب عرب میں یہی مشہور ہے۔ میں نے بھی اس مزار شریف کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔ اگرچہ ایک روایت اس کے خلاف وفاء الوفاء میں مذکور مگر خود مصنف علیہ الرحمۃ نے اس کی تردید کی ہے:۔ ع ۲:۔ یوشع علیہ السلام جب سارے ملک شام کو فتح کر چکے۔ تو اپنے ملک میں ہی آپ کا انتقال ہوا۔ اور میت شریف کو جبل ابراہیم کے دامن میں لا کر مزار شریف بنایا گیا۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۴۲ پر ہے:۔ کہ حَتّٰی غَلَبَ عَلٰی جَمِیْعِ اَرْضِ الشَّامِ وَصَارَتِ الشَّامُ کُلُّھَا لِبَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ وَفَرَّقَ عُمَّالَہٗ فِیْ نَوَاحِیْھَا ثُمَّ مَاتَ یُوْشَعُ وَدُفِنَ بِجَبَلِ اِبْرَاھِیْمَ ط (ترجمہ وہی ہے جو ابھی گزرا)۔

ع ۳:۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات باب العوالی میں ہو گی۔ یہ محلہ جنت بقیع سے بھی بہت دُور ہے۔ اور آپ کا دفن شریف روضۂ مقدس میں ہو گا۔ محشی علیہ الرحمۃ نے ترمذی کی اسی مذکورہ فی السوال روایت پر تنقیدی جرح کرتے ہوئے۔ وفاتِ مسیح کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ حاشیہ ترمذی شریف صفحہ نمبر ۲۰۳ پر ہے:۔ وَفِی الشَّرْحِ اَنْ یُّعْلَمَ اَنَّ مَوْتَ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ یَکُوْنُ فِی الْمَدِیْنَۃِ

لِمَا نُقِلَ اَنْ یُدْفَنَ فِیْ جَنْبِ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَقَدْ تُرِکَ لَہٗ فِی الْحُجْرَۃِ مَکَانُ قَبْرٍ ھٰذَا اَوْ فِیْہِ اَنَّ مُقْتَضَی الْحَدِیْثِ اَنْ یُدْفَنَ فِیْ مَوْضِعٍ یُقْبَضُ لَا فِی الْحُجْرَۃِ۔ (ترجمہ) یعنی شرح میں جانا گیا۔ کہ وفاتِ مسیح شہرِ پاک میں ہوگی۔ اس وجہ سے کہ نقل کیا گیا۔ کہ دفن کیے جائیں اس جگہ میں جو روضۂ پاک میں چھوڑی ہوئی ہے اور اس روایت سے اقتضاءً یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ حجرے میں دفن نہ ہوں بلکہ مقامِ وفات میں :۔ عث :۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات شریف ملک مصر میں ہوتی ہے۔ اور آپ کی میت شریف کو شام لے جاکر دفن کیا جاتا ہے۔ فتاوٰے فتح القدیر جلد اوّل صفحہ نمبر ۴۷۲ اور فتاوٰی بحر الرائق جلد دوم صفحہ نمبر ۱۹۵ پر ہے :۔ ثُمَّ قَالَ الْمُصَنِّفُ فِی التَّجْنِیْسِ فِی النَّقْلِ مِنْ بَلَدٍ لَا اِثْمَ لِمَا نُقِلَ اَنَّ یَعْقُوْبَ عَلَیْہِ السَّلَامُ مَاتَ بِمِصْرَ فَنُقِلَ اِلَی الشَّامِ الخ۔ ترجمہ اوپر کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان پانچ انبیاءِ کرام حضرتِ ہارون، حضرتِ موسٰے، حضرتِ یوشع، حضرتِ عیسٰی علیہ السلام حضرتِ یعقوب علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وفات کسی جگہ اور دفن شریف ابتداءً دوسری جگہ روایاتِ مشہورہ سے ثابت ہوا اور ان روایات کو کسی نے ضعیف بھی نہ کہا۔ تو اُن کے مقابل ایک روایت کہ جس سے اُن روایاتِ کثیرہ کا خلاف ظاہر ہو رہا ہے۔ اور اس ایک روایت کو شارحین نے ضعیف بھی کہا۔ تو کسطرح قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس ایک کے قبول کرنے سے تمام روایات کا ترک ورد لازم آتا ہے، جو غیر ممکن ہے۔ اور ترجیح بلا مرجح ناجائز ہوتی ہے (دیکھو توضیح تلویح) اس مذکورہ روایت کے ضعف کی تیسری وجہ یہ ہے۔ کہ اس میں ایک لفظ اِلَّا فِیْ مَوْضِعِ الَّذِیْ ہے۔ مَوْضِع کا معنٰی ہے جگہ اس پر بھی جرح ہے۔ کہ جگہ سے کیا مراد ہے؟ کیا وہ بستر کی جگہ یا وہ پورا حجرہ یا وہ پورا مکان یا وہ پورا محلہ یا وہ پورا شہر۔ یہ جرح اس لیے ہے۔ کہ کثیر انبیاء مثل قبرستان بیت المقدس میں مدفون ہیں :۔ اور خود حضرت یوسف علیہ السلام کا وصال پاک اپنے دار الخلافہ اپنے گھر میں ہوتا ہے۔ لیکن دفن شریف بستی سے باہر ایک چھوٹے سے باغ میں جیسا کہ آپ کے قصوں میں لکھا ہے۔ اور وہ باغ مرورِ زمانہ سے دریائے نیل کے اندر آگیا تو جسمِ یوسف کو موسٰے علیہ السلام بحکمِ ربی نکلوا کر شام میں لے گئے جیسا کہ احادیث میں آتا ہے۔ بہر حال اِن تمام دلائل سے ثابت ہو رہا ہے۔ کہ انبیاءِ کرام کی تدفین گھر میں یا مقامِ وصال میں ہونا کچھ ضروری نہیں۔ یہ تھی اِس روایت کے ناقابلِ قبول ہونے کی تحقیق سائل کہ دوسری اور تیسری دلیل کو سائل نے اپنی کم علمی کی بنا پر سمجھا نہیں۔ اِن مذکورہ عبارات سے فقہاءِ کرام کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کسی کو چھت والے مکان یا اس کے اپنے گھر میں دفن کرنا منع یا حرام ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ عوام کو قبرستان میں دفن کرو۔ اُن کے اپنے گھر میں جو کہ اب میراث بن گیا دفن

کرنا اس لیے منع ہے کہ وارثوں کو اس سے نقصان ہوگا کیا تو یتیم وارث کا اتنا حصہ چھن جائے گا اور یا غیر موجود وارث کا بلا اجازت اُن کی ملکیت میں وقف شدہ قبر بنے گی۔ جو ظلم ہے، ہاں اگر سب وارث بالغ ہوں موجود ہوں۔ سب اجازت دیں۔ تو اس حصہ مکان کو۔ پہلے زبانی یا تحریری وقف کر دیں۔ تب جائز ہے اگر ان قیود کے بعد اپنے گھر ہی دفن کر دیا۔ مگر انبیاء کرام کی تدفین کے لیے یہ قیود نہیں۔ اُن کی خصوصیت ہے۔ کہ بغیر قیود مطلقاً دفن مبارک جائز ہے۔ کسی سے پوچھنے، اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے آقا دو عالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تدفین طیبہ کے وقت نہ حضرت عائشہ صدیقہ سے پوچھا گیا۔ نہ حضرت فاطمہ زہرا سے۔ فقہاء کرام کا یہ جملہ (ذَالِكَ خَاصٌّ لِلْاَنْبِيَاءِ) اسی چیز کا مظاہر ہے۔ اور بے قیود نہ ہونے کی خصوصیت کی وجہ وہی ہے۔ جو حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خاں رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے مراٰۃ شرح کی جلد ہشتم میں صفحہ نمبر ۱۰۳ پر بیان فرمائی۔ کہ ارشاد فرمایا۔ "یہ حضور کی خصوصیت ہے۔ کہ حضور انور اپنے گھر میں دفن ہوئے۔ کیونکہ آپ کا گھر آپ کی وفات کی بعد کسی وارث کی ملک نہ بنا۔ بلکہ وقف ہو گیا۔ اور وقف میں قبر بنائی جا سکتی ہے (الخ) یہ تھی مراٰۃ کی عبارت۔ پس یہی ثابت ہوا۔ کہ انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اُن کا مکان وغیرہ ابتداءً خود بخود وقف ہو جاتا ہے۔ اس لیے۔ اُن کے مکان میں بلا روک ٹوک مزار بنانا جائز۔ لیکن دیگر لوگوں کے لیے مکان ہوں یا کھلی زمین بلا اجازت وارثوں اور وقف کرنے کے بغیر بالکل جائز نہیں۔ کہ گھر میں قبر بنائی جائے۔ ہاں با اجازت وقف کرنے کے بعد بالکل جائز ہے۔ کہ گھر میں قبر بنائی جائے۔ یا میت کی ملکیتی کھلی زمین میں فقہاء کرام کا بھی یہی نظریہ ہے۔ اس عبارت سے چنانچہ خود علامہ شامی صاحب ردّ المحتار نے جلد اوّل صفحہ نمبر ۶۲۹ پر قیل سے فرمایا۔ اور اس قیل کا ضعف علامہ شامی کی نیچے والی تائید کی عبارت سے خود بخود ختم ہو گیا۔ اور تردید نہ کرنا بھی تائید ہے۔ عبارت یہ ہے:۔ قِيْلَ لَا يُكْرَهُ الْبِنَاءُ اِذَا كَانَ الْمَيِّتُ مِنَ الْمَشَائِخِ وَالْعُلَمَاءِ وَالسَّادَاتِ قُلْتُ لٰكِنْ هٰذَا فِىْ غَيْرِ الْمَقَابِرِ الْمُسَبَّلَةِ كَمَا لَا يَخْفٰى (ترجمہ) اولیاء، علماء اور متقی سادات کی قبور پر قبہ بنانا جائز ہے۔ جب کہ یہ قبور قبرستان کے علاوہ علیحدہ بنائی گئی ہوں۔ دلالۃً اشارۃً۔ ثابت ہوا۔ کہ بزرگوں کی قبور علیحدہ بنانا جائز ہیں۔ یہ انبیاء کی خصوصیت نہ ہوئی۔ اگر بزرگوں کی قبور علیحدہ بنانا منع ہوتا۔ تو اعظم سے لے کر آج تک تمام اولیاء کاملین کے مزار ناجائز ہو جاتے۔ حالانکہ مزار بنوانے والے بھی اولیاء علماء ہی تھے۔ اسی طرح بزرگوں کے مزارات اُن کے اپنے گھر میں بنانا جائز ہیں۔ جب کہ دفن سے پہلے شرعی وقف ہو جائے۔ اگر شرعی وقف مکمل نہ ہو۔ تو فقط مزار بننے سے وقف نہ ہو گا۔ بلکہ مزار ناجائز ہو گا:۔

اس کا اکھیڑنا واجب ہے۔ کیونکہ اب ملکِ غیر میں ہے۔ صحیح وقف کے بعد بلا کراہت گھر میں قبر بنانا جائز ہے صحابہ کرام کے زمانے میں اس کے بہت سے ثبوت موجود ہیں۔ (۱)۔ صدیق اکبر کا مزار عام قبرستان میں نہ بنایا گیا (۲) فاروق اعظم کا مزار عام قبرستان میں نہ بنایا گیا۔ بلکہ اِن حضرات شیخین کرام کا مزار مقدس روضۂ پاک میں جیسا کہ تواتر سے ثابت ہے اور صحابہ نے بنایا۔ کیا آن کو مذکورہ روایت نہ سمجھ میں آئی۔ آج وہابی صاحب اُن سے زیادہ سمجھدار بن گئے۔ اور فتح القدیر اور شامی کی عبارات کا مطلب اگر وہی کیا جاوے۔ جو کہ وہابی صاحب نے کیا ہے تو کیا شان صحابہ پر اس سے زد نہیں پڑتی اور فقہاء کی جانب یہ گستاخی نہ بن جائیگی افسوس ہے۔ کہ ایک اپنی بات پالنے کے لیے فقہاء کرام کو گستاخی میں ملوث کرنے کی ناجائز کوشش کی گئی ہے۔

(۳) حضرت فاطمۃ الزہرا کا مزار مقدس ایک قول کے مطابق آپ کے حجرے ہی میں بنایا گیا اس وقت وہ حجرہ بھی روضۂ پاک میں شامل ہے۔ اور اس پر سبز چادر کا غلاف پڑا ہے۔ جالی مبارک سے نظر آتا ہے، حاجی صاحبان کو معلمین حضرات بتاتے اور زیارت کراتے ہیں۔ میں نے بھی دور سے جھانک کر زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔ اسبات میں اگرچہ اختلاف ہے مگر صحیح یہی ہے۔ کہ خاتونِ جنت کا مزار پاک آپ کے حجرے مبارکہ میں ہے۔ چنانچہ تاریخ مدینہ منورہ کی کتاب "جذب القلوب" اور "وفاء الوفاء"، جلد دوم صفحہ نمبر ۴۶۹ پر ہے۔ اور یہی کتاب جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۰۲ پر ہے۔ وَاَخْبَرَنِیْ عَبْدُ الْعَزِیْزِ بْنُ عِمْرَانَ عَنْ حَمَّادِ بْنِ عِیْسٰی عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ دَفَنَ عَلِیٌّ فَاطِمَةَ لَیْلَةً فِیْ مَنْزِلِهَا الَّذِیْ دَخَلَ فِی الْمَسْجِدِ۔ یہی حدیث دوسری اسناد سے اسی صفحہ پر اسی طرح ہے۔ کہ قَبْرُ فَاطِمَةَ فِیْ بَیْتِهَا الَّذِیْ اَدْخَلَهٗ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ فِی الْمَسْجِدِ۔ اور تیسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔ کہ اَنَّهَا دُفِنَتْ فِیْ بَیْتِهَا الخ۔ چوتھی روایت کے الفاظ بھی اس طرح ہیں۔ اِنَّهَا دُفِنَتْ فِیْ مَوْضِعِ فِرَاشِهَا۔ کچھ لفظی تغیر کے ساتھ ترجمہ سب روایات کا یہی ہے۔ کہ حضرت فاطمہ کی قبر مبارک اُن کے حجرے اقدس ہی میں ہے (۴) ایک صحابی رضی اللہ تعالٰی عنہ ابوسفیان بن عبد المطلب کا مزار مقدس بھی ایک دوسرے صحابی کے ذاتی ملکیتی گھر میں ہے۔ چنانچہ "وفاء الوفاء" جلد سوم صفحہ نمبر ۹۱۶ پر ہے کہ۔ قَالَ عَبْدُ الْعَزِیْزِ بَلَغَنِیْ اَنَّ عَقِیْلَ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ رَاٰی اَبَا سُفْیَانَ ابْنَ الْحَارِثِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ یَجُوْلُ بَیْنَ الْمَقَابِرِ فَقَالَ یَا ابْنَ عَمِّ مَالِیْ اَرَاكَ هٰهُنَا قَالَ۔ اَطْلُبُ مَوْضِعَ قَبْرِیْ فَاَدْخَلَهٗ دَارَهٗ وَاَمَرَ بِقَبْرٍ فَحُفِرَ فِیْ قَاعَتِهَا فَقَعَدَ عَلَیْهِ اَبُوْ سُفْیَانَ سَاعَةً ثُمَّ انْصَرَفَ فَلَمْ یَلْبَثْ اِلَّا یَوْمَیْنِ حَتّٰی تُوُفِّیَ فَدُفِنَ فِیْهِ۔

(ترجمہ): حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ کے بھائی عقیل رضی اللہ تعالٰی عنہ نے دیکھا۔ کہ ابوسفیان

بن حارث بن عبدالمطلب قبرستان میں کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ پوچھا کیا تلاش ہے کہا قبر کی جگہ تلاش کر رہا ہوں۔ فرمایا۔ میرے ساتھ آؤ۔ اُن کو ساتھ لے کر اُن کے ہی یا اپنے گھر تشریف لائے۔ اور گھر میں ایک جگہ اُسی وقت قبر کھدوائی۔ حضرت سفیان بن حارث کچھ دیر وہاں بیٹھے اور پھر چلے گئے۔ ڈو دن بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ تو وہیں گھر میں دفن کئے گئے۔ یہ سب افعال صحابہ کرام کے ہیں۔ کیا فقہاء کو یہ مزارات یاد نہیں۔ باوجود اس کے پھر بھی فرما رہے ہیں۔ گھر میں دفن نہ کرو۔ قبرستان میں دفن کرو اور گھر میں دفن کرنا خاص لِلْاَنْبِیَاء۔ مطلب وہی ہے جو پہلے بیان کیا گیا۔ کہ فقہاء کا یہ حکم صرف عوام کے لیئے استحبابی ہے۔ اور وجہ اس کی وہی ہے جو پہلے بیان ہوئی کہ گنہگار مسلمان قبرستان میں دفن کیا جائے۔ شاید کسی اللہ والے کے طفیل بخشا جائے اگر یہ مطلب نہ لیا جائے۔ تو اُن مزاراتِ صحابہ اور علیؓ مرتضٰے کے بارے میں کون سا جہالت کا فتوی لگاؤ گے۔ کیا وہ نہ جانتے تھے۔ کہ گھر میں مزار بنانا انبیاء کی خصوصیت ہے۔ افسوس ہے۔ کہ آنکھیں بند کر کے یک دم ممانعت اور حرام کی مشین کھول دیتے ہیں۔ ع۵ خود میں نے ۱۹۷۳ء میں پہلا حج کیا۔ بحمدہٖ تعالٰی ساڑھے تین ماہ شہرِ مقدّسین کی حاضری نصیب رہی میرے آقا صلی اللہ تعالٰے علیہ وآلہٖ وسلم کا کرم ہے۔ کہ جس نے روسیاہ گناہگار غلام کو اپنے رشکِ ملائکہ شہر اقدس میں رہنے کی اجازت دی۔ میں نے دل و جگر کو خوب ٹھنڈا کیا۔ کبھی باغ دیکھے کبھی کعبت، کبھی کوچے گلیوں کی خاک سر آنکھوں سے لگائی۔ بہت مزاراتِ مقدّسہ کی زیارت کی نبی کریم کے والدِ محترم سیدنا حضرت عبداللہ موحّدین کے سردار کے مزار والے مکان کو باہر سے دیکھا۔ اُس سے ذرا ہٹ کر حضرت عکاشہ جن سے قریش کی نسل چلی۔ کی قبر اُن کے اپنے مکان کے اندر بنی ہے۔ بہت سے حاجی اُس کی زیارت کرتے ہیں۔ بعدہٗ سنا ہے۔ کہ نجدی حکومت نے اُس مکان کو بھی شہید کر دیا۔ مَعَاذَ اللہ ۱۹۷۳ء تک تو وہ اپنے گھر میں موجود تھی۔ ع۳ حضرت مالک بن سنان کی قبر بھی اسی طرف ہے۔ وہ اُن کے گھر میں ہی بنی ہے۔ حضرت مسلم کا مزار شریف کوفے کے ایک گھر میں ہے۔ یہ مزارات سارے زائر دیکھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ صحابہ، تابعین تبع تابعین کے سامنے ہوتا رہا۔ کسی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ نبی پاک نے اپنے والدِ محترم کی قبر گھر میں دیکھی کچھ بھی ارشاد نہ فرمایا۔ بلکہ رب کریم سے استغفار اور حاضری کی اجازت طلب کی۔ تو فقط حاضری کی اجازت مل گئی۔ نہ رب کریم نے اِس قبر کو غلط فرمایا۔ امام فخر الدین رازی جو ایک قول کے مطابق اپنے زمانے کے چھٹی صدی کے مجدد گزرے ہیں۔ اُن کا مزار شریف اُن کے گھر میں بنا ہے۔ چنانچہ کتابُ النفس والرّوح صہ پر حالاتِ امام میں لکھا ہے کہ۔ وَالْحَقِیْقَۃُ اَنَّہٗ دُفِنَ فِیْ دَارِہٖ غرضیکہ صحابہ سے لے کر اب تک کسی نے گھر میں قبر بنانے کو ناجائز نہ کہا۔ نہ حرام کہا۔

نہ اشارۃً نہ کنایۃً۔ اب چودہ سو سال کے بعد کس کو خارش ہوئی۔ کہ ایسے غلط فتوے دینے شروع کیے اب کس کی جرأت ہوئی۔ کہ اس کو غیر شرعی کام کہے۔ خود ہمارے شہر میں سیّد ننگے شاہ ایک فقیر بزرگ نے وفات پائی۔ اور گھر میں قبر بنائی گئی۔ اور حضرت حکیم الامت نے بھی دیکھا۔ اس پر اور طرح تو اعتراض کیا گیا۔ مگر گھر میں دفن کو قابلِ اعتراض نہ کہا گیا۔ حضرت حکیم الامت کی وفات کے بعد اُن کے وارثان نے گھر کا آدھا حصہ وقف کر کے اسی جگہ مزار مقدس بنایا۔ جس وقت بن رہا تھا۔ تو اس وقت علامہ محمد شریف صاحب نوری، علامہ احمد حسن صاحب نوری، قاری غلام رسول صاحب، سید حامد علی شاہ صاحب، سید حاجی احمد شاہ صاحب جیسے بزرگ علماء کرام موجود تھے۔ کسی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ بلکہ اپنے ہاتھوں سے مزار بنایا۔ دوسرے دن بڑے بڑے اکابر اہل سنت نے تجہیز و تکفین و تدفین میں شرکت کی قبلہ سیدابوالبرکات مہتمم حزب الاحناف لاہور، مفتی محمد حسین صاحب نعیمی، مفتی اعجاز ولی اعلیٰ حضرت کے بھانجے چند دن کے بعد علامہ کاظمی صاحب صاحبزادہ افتخار الحسن، جناب مولانا غلام علی صاحب اوکاڑوی جیسے اکابر نے بھی فاتحہ خوانی کی۔ مگر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ غیر مقلد کے بیشتر و حافظ عنایت اللہ صاحب اثری وزیر آبادی خطیب جامع مسجد اہل حدیث گجرات میرے پاس کئی مرتبہ مسئلہ پوچھنے آئے۔ تو مزار پر فاتحہ پڑھی مگر کوئی اعتراض نہ کیا۔ گجرات کے کسی دیوبندی نے آج تک اس بات کا اعتراض نہ کیا۔ اب یہ معترض صاحب دیوبندی وہابی کہاں سے نکل آئے۔ جن کو یہ جوش چڑھا کہ سائل مذکور پر اعتراض کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ قانونِ شرعی کے اعتبار سے ہر شخص کی قبر بجز تین مذکورہ مقامات کے ہر جگہ بنائی جاتی ہے اور بنائی جا سکتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص وصیت کر گیا ہو۔ کہ میری قبر گھر میں بنائی۔ تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ کیونکہ تہائی میراث پر وصیت جاری کرنا لازم ہے۔ وصیت کی صورت میں کسی وارث کی اجازت بھی شرط نہیں۔ جب کہ قبر کی جگہ اس کی تہائی میراث تک یا کم ہی ہو۔ ہاں افضلیت میں عام خاص کا فرق ہے۔ عوام کے لیے بہتری قبرستان کی تدفین ہی ہے۔ خواص اولیاء، علماء کے لیے بہتری علیحدگی میں۔ یہی مطلب ہے۔ فقہاء کی عبارات کا اللہ تعالیٰ سچی اور صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

مزارات پر حاضری دے کر دعا مانگنے کا ثبوت

سوال نمبر ۳۲ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں۔ اگر کوئی شخص کسی بزرگ کے مزار پر

یہ دعا کرے۔ کہ اے اللہ تعالیٰ صاحبِ قبر کی برکت اور طفیل سے یہ میرا کام کر دے۔ آیا یہ الفاظ جائز نہیں یا ہیں؟ زید کہتا ہے۔ کہ کسی کی قبر پر جا کر ایسی دعا کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ سب سے بہتر جگہ مسجد ہے۔ تو وہاں ہی دعا کرنی چاہیئے۔ قبر کے پاس ایسی دعا کرنے سے دو گناہ لازم آتے ہیں۔ ایک یہ کہ وسیلہ ماننا پڑتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ غیر اللہ سے مدد مانگنی پڑتی ہے حالانکہ یہ دونوں سخت گناہ بلکہ شرک ہے۔ فرمایا جائے کہ کیا مزارات کے پاس ایسی دعا مانگنا اور وسیلہ پکڑنا اور غیر اللہ سے مدد مانگنا گناہ اور شرک ہے۔ ہم نے زید کو مسجد سے دھکے دے کر نکال دیا ہے۔ امامت سے علیحدہ کر دیا ہے۔ سب کا متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ جب تک حضرت حکیم الامت کا فتوےٰ نہیں آتا۔ ہم زید کو نہیں آنے دیں گے۔ براہِ کرم جلد فتوےٰ صادر فرمایا جائے۔ اور بتایا جائے کہ زید کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۲ دیو پری کی حقیقت کیا ہے۔ اس پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ کیا یہ نام بناوٹی ہے؟ یا واقعی کوئی مخلوق ہے:۔ بیّنوا وتوجروا ط

بعون العلام الوهاب ط

الجواب

جواب ۱:۔ قانونِ شریعت کے مطابق زید کا قول قطعاً غلط خلافِ قرآنِ کریم اور احادیثِ طیبہ طاہرہ ہے۔ اس لیئے کہ بعد از وفات ہر انسان اپنے اعمال و ایمان اور عقائد کے اعتبار سے دنیا والوں سے تعلق رکھتا ہے۔ خواہ کافر ہو یا مومن، فاسق ہو یا متقی، ولی اللہ، غوث، قطب ہو یا عالم دین۔ ہاں یہ تعلقات مختلف درجے پر ہیں۔ کافر فقط اتنا تعلق ہوتا ہے۔ کہ وہ حیاتِ ظاہری والوں کی بات سن سکتا ہے۔ نہ جواب دے سکتا ہے۔ نہ مدد۔ عام مسلمان۔ بات سن بھی سکتا اور جواب بھی دے سکتا ہے۔ چنانچہ کافروں کے لیئے وہ روایتِ صحیحہ مشہور ہے جس میں جنگِ بدر کے فوت شدہ کفار سے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطاب فرمانا مرقوم ہے:۔ حَدَّثَنِیْ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مُحَمَّدٍ سَمِعَ رَوْحَ بْنَ عُبَادَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سَعِیْدُ بْنُ اَبِیْ عُرُوْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ قَالَ ذَکَرَ لَنَا اَنَسُ بْنُ مَالِکٍ عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اَمَرَ یَوْمَ بَدْرٍ (الخ) حَتّٰی قَامَ عَلٰی شَفَةِ الرَّکِیِّ فَجَعَلَ یُنَادِیْ بِھِمْ بِاَسْمَائِھِمْ یَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ اَیَسُرُّکُمْ اَنَّکُمْ اَطَعْتُمُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا فَھَلْ وَجَدْتُمْ (الخ)۔ فَقَالَ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا تُکَلِّمُ مِنْ اَجْسَادٍ لَا اَرْوَاحَ لَھَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ مِنْھُمْ (الخ)

بخاری شریف جلد دوم صفحہ نمبر ص ۵۶۶ پر ہے:- بَابُ قَتْلِ اَبِیْ جَہْلٍ الخ (ترجمہ) نبی کریم آقائے دو عالم حضور اقدس صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اے فلاں بن فلاں بدر کے مقتولو ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ درست پالیا۔ کیا تم نے بھی وعدۂ عذاب پایا۔ کہ نہیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہ نے عرض کیا:۔ یَا رَسُوْلَ اللہِ کیا بلا روح جسموں سے بھی کلام کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا آقا صلی اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم نے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد مصطفٰے کی جان ہے تم زندہ لوگ میری بات کو کچھ زیادہ نہیں سنتے۔ ان مُردوں سے۔ اسی روایت کو مسلم شریف نے اتنی زیادتی سے روایت کیا۔ غَیْرَ اَنَّھُمْ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ اَنْ یَّرُدُّوْا عَلَیَّ شَیْئًا الخ (ترجمہ):۔ مگر یہ کفار بعد موت میری بات کا جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس حدیث پاک کو فتاوٰی والے شامی جلد سوم صفحہ نمبر ص ۱۸۰ اور شرح صدور صفحہ نمبر ص ۶۲ پر سماع موتی کے استدلال میں پیش کیا ہے نووی شارح مسلم شریف نے فرمایا۔ اِنَّ الْمَیِّتَ یَسْمَعُ عملاً بظاہر ہٰذَا الْحَدِیْثِ الخ (ترجمہ)۔ اس حدیث مطہرہ سے ظاہر ثابت ہوا۔ کہ مردہ سنتا ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام مُردوں سے تین دن بعد ہوا۔ جب آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ جیسا کہ بخاری شریف کی اسی حدیث میں لکھا ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ مردہ کافر سن سکتا ہے بول نہیں سکتا۔ لیکن گنہگار عام مسلمان نیک آدمی کلام بھی سن سکتا ہے اور جواب بھی دے سکتا ہے۔ مگر مدد نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ متعدد احادیث مطہرات میں مرقوم ہے۔ آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد طیبہ طاہرہ ہے کہ جب مسلمان۔ مسلمانوں کے قبرستان میں جائیں۔ تو فوت شدگان کو سلام کریں۔ چنانچہ بلوغ المرام بحوالہ مسلم شریف صفحہ نمبر ص ۱۱۷ پر ہے:۔

وَعَنْ سُلَیْمَانَ بْنِ بُرَیْدَۃَ عَنْ اَبِیْہِ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ۔ کَانَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ یُعَلِّمُہُمْ اِذَا خَرَجُوْا اِلَی الْمَقَابِرِ اَنْ یَّقُوْلُوْا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ:۔ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللہُ تَعَالٰی بِکُمْ لَاحِقُوْنَ نَسْاَلُ اللہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ رَوَاہُ مُسْلِمٌ

(ترجمہ):۔ حضرت سلیمان بن بریدہ اپنے والد محترم بریدہ رضی اللہ تعالٰے عنہما سے راوی کہ آقائے دو عالم حضور اقدس صلے اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو قبرستان جانے کی تعلیم فرمایا کرتے تھے کہ جب قبرستان کی طرف نکلو تو فوت شدگان کو اس طرح سلام کیا کرو۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یعنی اے فوت شدہ لوگو تم پر سلام ہو۔ اس روایت مطہرہ سے تین باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ قبر والے سنتے ہیں۔ اس لیے علیکم کے خطاب سے سلام کرنے کا حکم ہے۔ اگر صرف

سلام پہنچانا مقصود ہوتا۔ تو غائب کی ضمیر ہوتی۔ نہ کہ حاضر کی۔ دوسری یہ کہ سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اس لیے کہ قانون شریعت کے مطابق صرف اس کو سلام کرنا جائز ہے۔ جو جواب دے سکتا ہو۔ چنانچہ فتاوےٰ شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۴۰۰ پر ہے۔ یُکْرَہُ السَّلَامُ عَلَى الْعَاجِزِ عَنِ الْجَوَابِ حَقِیْقَۃً الخ (ترجمہ) اور اس کو سلام کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ جو جواب دینے سے عاجز ہو جواب نہ دے سکتا ہو۔ تیسری یہ کہ جب عام قبرستانوں میں جاؤ۔ تو اپنے لیے اور اُن کے لیے دعا کرو۔ مگر خصوصی مزارات پر یہ حکم نہیں وہاں جاکر صرف اپنے لیے دعا کرو۔ بلکہ اپنے لیے فریاد کامل صاحب مزار سے بھی حاجت طلب کر سکتے ہو۔ جیسا کہ آگے ثابت ہوا۔ کہ مسلمان فوت ہوکر بھی سنتا اور بولتا ہے۔ ورنہ حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کبھی بھی یہ تعلیم نہ فرماتے۔ اور پھر قبرستانوں میں ہر قسم کا مسلمان۔ فاسق، فاجر مسلمان بھی مدفون ہوتا ہے۔ پھر بھی اُن کو سلام دعا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ثابت ہوا۔ کہ فاسق مسلمان بھی بعد وفات سنتا بولتا ہے۔ اور یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے۔ عام نیک مسلمان بھی بات چیت کرتے ہیں۔ چنانچہ بخاری شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۷۴ بَابُ حَمْلِ الرِّجَالِ الْجِنَازَۃَ دُوْنَ النِّسَاءِ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِیْزِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ (الخ) اَنَّہٗ سَمِعَ اَبَا سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وُضِعَتِ الْجِنَازَۃُ وَاحْتَمَلَہَا الرِّجَالُ عَلٰی اَعْنَاقِہِمْ فَاِنْ کَانَتْ صَالِحَۃً قَالَتْ قَدِّمُوْنِیْ وَاِنْ کَانَتْ غَیْرَ صَالِحَۃٍ قَالَتْ یَا وَیْلَہَا اَیْنَ تَذْہَبُوْنَ بِہَا یَسْمَعُ صَوْتَہَا کُلُّ شَیْءٍ اِلَّا الْاِنْسَانَ۔

(ترجمہ):۔ ابوسعید نے فرمایا۔ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ کہ جنازہ رکھتے لگتے ہیں۔ تو نیک میت کہتی ہے۔ کہ مجھ کو اور آگے لے چلو۔ اور فاسق میت کہتی ہے۔ کہ کہاں لے کر جا رہے ہو۔ اس آواز کو سوائے انسان کے ہر شخص ہر چیز سنتی ہے۔ شرح صدور بحوالہ مرسل عبید بن مرزوق صفحہ نمبر ۶۲ پر ہے۔ کہ ایک عورت اُمّ محجن رضی اللہ تعالےٰ عنہا فوت ہو گئی۔ نبی کریم نے اس کی قبر پر جنازے کی نماز پڑھی۔ بعد میں آپ نے میت سے گفتگو فرمائی صحابہ نے تعجب کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْہَا فَذَکَرَ اَنَّہَا اَجَابَتْہُ قَمُّ الْمَسْجِدِ تم زندہ لوگ اس فوت شدہ سے زیادہ نہیں سنتے۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اس نے یہ کہا کہ میرا قیام مسجد کا عمل بہت قبول ہوا۔ اِن تمام روایات سے ثابت ہوا کہ بعد وفات ہر شخص دنیا والوں سے جان پہچان رکھتا ہے

اور کلام سنتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ کافر جواب نہیں دے سکتا۔ عام مسلمان غیر صالح بات کر سکتا ہے۔ جب کافر اور مسلمان میں یہ فرق ہے۔ تو حیاتِ اولیاءِ کاملین اُس سے بھی زیادہ قوی ہونا لازم ہے۔ پھر صحابہ کرام اور انبیاء کرام کی تو شان ہی خیال و گمان سے ارفع ہے۔ اور یہ فرقِ حیات اس لیے ہے۔ کہ کافر اور گناہگار کی روح بعد موت اُن کے جسم سے صرف متعلق ہوتی ہے۔ لیکن اولیاء اللہ کی روح اور ارواحِ انبیاء مقدسہ مطہرہ، اُن کے مقدس اجسام میں اُسی طرح دخول فرماتی ہے۔ جس طرح حیات ظاہری میں نبراس صفحہ نمبر ۲۲۲ پر ہے:۔ اَنَّ الْمُسْتَلْزِمَ لِاِعَادَةِ الرُّوْحِ اِنَّمَا هُوَ الْحَیٰوةُ الْکَامِلَةُ وَاَمَّا الْاِدْرَاكُ الْاَلَمِ وَاللَّذَّةِ اَنَّ الْحُصُوْلَ بِاَدْنٰی تَعَلُّقِ الرُّوْحِ بِالْبَدَنِ۔ (ترجمہ):۔ جسم میں روح داخل ہونے کی صورت میں حیاتِ کاملہ نصیب ہوتی ہے۔ لیکن لذت اور تکلیف کا محسوس ہونا تو روح کے جسم سے ادنٰی تعلق سے ممکن ہے مرقات جلد دوم صفحہ نمبر ۲۱۲ پر ہے:۔ اَوْلِیَاءُ اللّٰهِ لَا یَمُوْتُوْنَ وَلٰکِنْ یَنْتَقِلُوْنَ مِنْ دَارٍ اِلٰی دَارٍ وَفِیْهِ اِشَارَةٌ اِلٰی اَنَّ الْعَرْضَ عَلٰی مَجْمُوْعِ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ مِنْهُمْ بِخِلَافِ غَیْرِهِمْ۔ (ترجمہ):۔ اللہ تعالٰی کے ولی مرتے نہیں۔ بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتے ہیں۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ اُن کی ارواح جسموں کے ساتھ ہی رہتی ہے بخلاف دیگر انسانوں کے گنہگار اور کافر کی روح ریڑھ کی ہڈی سے متعلق ہوتی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی گلتا نہیں۔ اگرچہ سارا جسم جل جائے۔ یا گل سڑ جائے۔ جسم کا جلنا اور گلنا سڑنا یا ڈوبنا یا جانور کا کھا جانا بھی صرف کفار و فساق کے لیے ہے۔ انبیاءِ کرام کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اُن کے سچے غلام علماءِ عظام و اولیائے کاملین کے اجسام کو کوئی چیز فنا نہیں کر سکتی۔ نہ جانور کھا سکے، نہ آگ جلا سکے، نہ پانی ڈبو سکے، نہ قبر کی مٹی ختم کر سکے۔ دنیا میں کوئی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ کہ کسی ولی اللہ کی وفات آگ میں جلنے یا درندے کے کھانے سے واقع ہوئی ہو اِس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُن کی ارواح صرف ایک آن کے لیے خروج کرتی ہیں۔ پھر اُسی طرح جسم میں ہوتی ہے۔ جس طرح پہلے تھی۔ صرف کیفیات میں فرق ہوتا ہے۔ صوفیاءِ کرام فرماتے ہیں۔ کہ اولیاء اللہ کی موت مثل خواب کے ہے۔ یہی مطلب اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ کا ہے۔ قانونِ فطرت ہے۔ کہ جب تک جسم میں روح رہے گی۔ جسم فنا نہ ہوگا۔ خواہ کافر ہو خواہ مومن دیکھو ہزاروں کافر سو سو سال تک زندہ رہتے ہیں۔ مگر اُن کے جسم صحیح سلامت رہتے ہیں۔ اسی طرح فساق بھی لیکن روح جسم سے نکل گئی۔ تو جسم بگڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس

لیئے کر دوبارہ جسم کے اندر روح نہیں جاسکتی مگر اولیاء پاک کے اجسام ہرگز خراب نہیں ہوتے کیونکہ اُن کے اجسام میں بالکل ظاہری زندگی کی شکل روح داخل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نہ مٹی خراب کرے نہ پانی۔ اصحابِ کہف ہزاروں سال سے اسی مٹی میں سو رہے ہیں مگر جسم خراب نہیں۔ کیونکہ روح جسم میں موجود ہے۔ آج کوئی بھی زمین پر تین چار دن مدہوش پڑا رہے مگر جسم نہ گلتا ہے نہ خراب ہو۔ اس لیئے کہ جسم میں روح موجود ہے۔ ثابت ہوا کہ جب تک روح جسم کے اندر قائم و موجود ہوگی جسم فنا نہ ہوگا اگرچہ سینکڑوں سال بیت جائیں۔ لہٰذا جس کے جسم کو اللہ تعالیٰ نے بچانا ہو۔ اُس کی روح اُس کے جسم میں قائم اور داخل رہتی ہے، جس کے جسم کو فنا کرنا ہو۔ اُس کے جسم سے روح متعلق تو رہتی ہے مگر داخل نہیں ہوتی۔ اِس دنیا میں تو ہر شخص کو ہر شخص کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے۔ جو انسان بھی اس دنیا میں رہتا ہے۔ خواہ کافر ہو یا غیر کافر سب کے اجسام میں روح ودیعت ہوتی ہے۔ مگر عالمِ برزخ میں صرف اُن ہی لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو یہاں رہ کر اپنے اجسام کو عبادت و ریاضت سجدہ سجود میں مشغول رکھیں۔ اور نورِ معرفت سے جسم خاکی کو مضبوط و مامون کریں۔ اُن ہی پاک باز جسموں کی وہاں تواہش ہے۔ جنہوں نے عبادتِ بے ریا کے ذریعے خود کو قوتِ لم یزل سے مزین کیا۔ اُنہوں نے خود کو اِس جہان میں مارا۔ رب کریم نے اُن کو اُس جہان میں نوازا۔ رب کریم نے اُن کو اُس عالم میں حیاتِ ابدی سے پالا۔ اِس دنیا میں جس کے جسم میں روح ہے۔ اس سے کسی طرح کی دینی اور دنیاوی مدد طلب کرنا۔ اُس کے قریب جانا، اُس کو اپنی حاجات کا وسیلہ بنانا نہ شرک، نہ گناہ، نہ کفر، نہ گمراہی، نہ بدعت نہ برائی۔ ورنہ نظامِ کائنات معطل ہو جائے۔ یہاں ہر شخص کو ایک دوسرے کا محتاج پیدا کیا گیا ہے۔ مومن ہو یا کافر، دن رات ہم ایک دوسرے سے اپنی حاجات پوری کراتے رہتے ہیں۔ بیماری میں ڈاکٹر طبیب، چوری میں پولیس، غذا میں ڈپو والا وغیرہ علمِ دین میں علماء اولیاء، استاد، اور مدرسین کتب خانے، مدرسے یہ تمام ہماری مختلف ضروری حاجتیں پوری کرتے ہیں۔ وہابی اور دیوبندی بھی اپنی مشکلوں میں خدا کا دوارہ چھوڑ کر اِن ہی لوگوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ اگرچہ یہ ڈاکٹر وغیرہ غیر مسلم ہی ہوں۔ نہ کوئی اُس کو شرک کہتا ہے۔ نہ کفر۔ آخر کیوں؟ اِس لیئے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے۔ کہ اے بندو۔ ایک دوسرے کی مدد طلب کرو۔ مگر یہ حکم ربانی قرآن کریم میں صراحتاً نہیں بلکہ اشارۃً و کنایتاً۔ کیونکہ جسمِ انسانی میں روح کے دخول کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ ذی روح جسموں سے مدد طلب کی جائے۔ اور مدد وہی کر سکتا ہے۔ جس میں امداد کی قوت ہو۔ اور جسم کی قوت محض روح سے ہی ہے۔ پس جب اِس دنیا میں فقط وہی مدد کر سکتا جس میں اللہ کریم نے روح ڈالی ہو

تو عالم برزخ اور اہل قبور میں بھی وہی مدد کرسکتا ہے۔جو ذی رُوح ہو۔اللہ ربّ العزّت نے بعد وفات اولیاء اللہ کو اسی لیے دوبارہ دخول روح سے مرحمت فرمایا کہ وہ کائنات والوں کی مدد کرسکیں۔اسی لیے لمعات شرح مشکوٰۃ نے فرمایا۔اِتِّخَاذُ مَسْجِدٍ بِجَوَارِ نَبِیٍّ اَوْصَالِحٍ وَالصَّلٰوۃُ عِنْدَ قَبْرِہٖ لَا لِتَعْظِیْمِہٖ وَالتَّوَجُّہِ نَحْوَہٗ بَلْ لِحُصُوْلِ مَدَدٍ مِّنْہُ (الخ) فَلَا حَرَجَ فِیْ ذٰالِکَ ط (ترجمہ)۔نبی اللہ یا ولی اللہ کے قرب میں مسجد بنانا اور اس میں صرف اس لیے نماز وغیرہ پڑھنا۔تاکہ قبر والے سے مدد حاصل کرے اس میں کوئی حرج نہیں۔
(محولہ ۱۸ حاشیہ نمبر ۲۔ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۶۹ باب المساجد فصل اوّل)

پس جس طرح چلتے پھرتے زندہ لوگوں سے حاجت طلب کرنا گناہ یا شرک نہیں۔کیونکہ اُن میں روح اور زندگی بھی اسی طرح اولیاء اللہ سے بعد وفات مدد مانگنی شرک یا گناہ نہیں۔بلکہ اُن سے طلب حاجات میں رب تعالیٰ کی خوشنودی و رضا ہے کہ اسی لیے رب نے ان کو دوبارہ روح کا دخول بھی عطا فرمایا۔اگر یہ لوگ اولیاء کاملین مدد نہ کرسکتے۔یا اُن سے مدد مانگنا اور قبر والوں کے پاس جانا عند اللہ گناہ یا شرک ہوتا۔تو پروردگار عالم کبھی بھی اِن کو رُوح عطا نہ فرماتا۔اور شکل دیگر وفات شدگان کے اُن کی ارواح بھی صرف جسم سے متعلق ہو جاتیں۔داخل نہ ہوتیں یہ فرق مراتب ثابت کررہا ہے۔کہ اولیاء اللہ علماء ملت صحابہ کرام انبیاء ومرسلین عَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کے مزارات پر حاضری دینا وہاں جانا اُن سے دُنیا و آخرت کی مشکل کشائی حاجت روائی چاہنا عین ایمان ہے۔قانونِ شریعت میں صرف اُن سے مانگنا شرک ہے۔جو بے جان ہوں۔اسی لیے بت پرست، چاند، سورج، ستارہ پرست آتش کے پرستار، مشرک و کافر ہوئے۔کہ وہ ان بے جان چیزوں کو مشکل کشا، حاجت روا سمجھتے ہیں۔لیکن اگر کوئی مسلمان، ولی اللہ کے مزار پر۔اس کو اللہ کا بندہ سمجھتے ہوئے اُس سے حاجت چاہتا ہے۔تو بالکل جائز ہے۔قرآن و حدیث اور عمل بزرگان سے ثابت ہے۔چنانچہ دلائل ملاحظہ ہوں۔دلیل نمبر ۱:۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔پارہ نمبر ۲۸ سورت ممتحنہ میں ہے۔یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَۃِ کَمَا یَئِسَ الْکُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ط (ترجمہ)

اے ایمان والو۔اُن لوگوں کو دوست نہ بناؤ۔جو آخرت سے مایوس ہوگئے۔جیسے کہ کافر قبر والوں سے مایوس ہوگئے۔اس آیتِ کریمہ میں مفسرین نے اگرچہ چند قول روایت کیے ہیں مگر زیادہ صحیح یہی قول ہے۔کہ کافر لوگ قبر والے اہل اللہ کی امداد اور اُن کی خیر پہنچانے سے مایوس ہوگئے۔چنانچہ تفسیر انوار التنزیل علی تفاسیر اربع جلد ششم صفحہ نمبر ۲۲۲ پر ہے۔

كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ ای اَنْ يُبْعَثُوْا اَوْ يُثَابُوْا اَوْ يَنَالَهُمْ خَيْرٌ مِنْهُمْ (ترجمہ):- یا یہ کہ اُٹھائے جائیں قیامت میں۔ یا کافر اس سے مایوس ہو گئے۔ کہ ثواب دیئے جائیں۔ یا اس بات سے مایوس ہو گئے کہ قبر والوں سے اُن کو کوئی بھلائی پہنچے۔ یہاں صاحبِ تفسیر علیہ الرحمت نے اس آیت میں تین احتمال نکالے۔ پہلے دو میں تو کفار سے مردہ کافر مراد ہوتے ہیں۔ مِنْ اَصْحَابِ کا حرفِ مِنْ تبعیضیہ ہوگا۔ لیکن تیسرے احتمال میں کفار سے زندہ کافر مراد ہیں۔ اور اصحابِ قبور سے عام اہلِ قبر۔ تب حرفِ مِنْ بیانیہ ہوگا۔ اس تیسرے احتمال کو مفسرین نے ترجیح دی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر نے فرمایا۔ جلد چہارم صفحہ نمبر ۳۵۶ پر ہے۔ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ الْاَحْيَاءُ (ترجمہ) یعنی اہلِ قبور سے مایوس ہونے والے زندہ کافر لوگ ہیں۔ وہ ہی کہتے ہیں۔ کہ قبر والے کچھ نہیں دے سکتے اُن کے پاس نہ جاؤ۔ اُن سے نہ مانگو۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ پاک میں ایسے ہی کفار سے مسلمانوں کو دور رہنے کا حکم دیا ہے۔ تفسیری نکات سے قطعِ نظر اگر قرآنِ پاک کے ظاہری لفظوں پر بھی بنظرِ تعصب غور کر لیا جائے۔ تو یہ مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ کہ وفات یافتہ اہلُ اللہ سے مانگنا حکمِ ربی اور نہ مانگنا علامتِ کفار۔ اس آیتِ طیبہ میں دو لفظ قابلِ غور ہیں۔ ۱۔ يَئِسَ ۲۔ كَمَا حرفِ تشبیہ۔ لفظ يَئِسَ، يَأْسٌ کا ماضی مطلق ہے۔ یاس یعنی مایوس ہونا۔ ہر اصطلاح میں کسی شخص سے اپنی امید یا لالچ کو ختم کرنا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد نہم صفحہ نمبر ۴۹۲ پر ہے:- اَلْيَأْسُ اِنْقِطَاعُ الطَّمَعِ (ترجمہ):- مایوسی کسی سے لالچ اور امید کو توڑنے کا نام ہے۔ عربی لغت مجمع البحار جلد سوم صفحہ نمبر ۵۰۹ پر ہے:- اَلْيَأْسُ ضِدُّ الرَّجَاءِ (ترجمہ):- مایوسی۔ کسی سے امید لگانے کے مخالف ہے جو شخص دیتا ہو۔ اور بھکاری اس کے پاس آ کر حاجتیں بر لاتے ہوں۔ اس کی ذات پر لوگوں کو امید ہوتی ہے۔ جو کچھ نہ دے یا نہ دے سکے۔ تو لوگ اس سے مایوس ہو جاتے ہیں لغوی طور پر لفظِ مایوسی۔ ایسے ہی موقعوں پر مستعمل ہے۔ قرآنِ کریم نے صاحبِ قبر لوگوں سے مایوس ہونے کو گناہ بلکہ کفر فرمایا۔ پس ثابت ہوا۔ کہ اہلِ قبور اپنی طاقت و قوت کے مدارج سے حاجت مندوں کی حاجات پوری کرتے ہیں۔ اور حاجت روائی وہی کر سکتا ہے۔ جو کامل و اکمل زندہ ہو۔ اس آیت نے اقتضاءً ثابت فرما دیا۔ کہ بعد وفات اللہ تعالیٰ کے ولی کے پاس جانا اُن سے مانگنا عین ایمان ہے۔ اور اُن کی عطا سے مایوسی اُن کی زندگی کا انکار ہے۔ اور یہ انکار بحکمِ قرآنی کفر ہے۔ اس آیت کریمہ میں دوسرا قابلِ غور لفظ كَمَا ہے عربی میں اس کو حرفِ تشبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ دو جملوں یا دو اسموں کے درمیان آتا ہے

پہلا جملہ مشبہ کہلاتا ہے اور دوسرا جملہ مشبہ بہ کہلاتا ہے۔ اس آیت میں قَدْ یَئِسُوْا۔ مشبہ ہے۔ اور یَئِسَ الْکُفَّار مشبہ بہ ہے۔ اور تشبیہ صرف مایوسی میں ہے۔ نہ کہ نوعیت میں۔ ورنہ مِنَ الْاٰخِرَۃِ اور مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ میں تغیر لفظی نہ ہوتا۔ کیونکہ تشبیہ زوالِ تغیر کا مقتضی ہے۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ میں بھی آخروی زندگی و حشر نشر ہی مراد جیساکہ اکابرِ وہابیہ سے مسموع ہے۔ وہ محض نادانی ہے۔ اس لیئے کہ آخروی زندگی کا ذکر تو مِنَ الْاٰخِرَۃِ۔ سے حاصل ہوا۔ اگر یہ لفظ بھی اِسی طرف راغب ہو۔ تو لزومِ تحصیلِ حاصل ہوگا۔ جو محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہاں قبر والوں سے مانگنا ہی مراد ہے۔ اور اِن سے مایوس ہونا بھی کفر ہے ؛: دلیل نمبر دوم تفسیر عزیزی فارسی پارہ نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۱۳ پر ہے۔ و روحِ آنہا را در صورت ہائے رنگارنگ سطالعہ می نماید و متلذذ و متالم میگر دد و ایں حالت عوام مردگان است۔ و بعضے از خواص اولیاء اللہ را کہ۔ دریں حالت ہم تصرف در دنیا دادہ و استغراق آنہا بجہت کمال وسعت و ارباب حاجات و مطالب حلِ مشکلات خود از آنہا میطلبند و می یابند (ترجمہ)۔ عام لوگ تو مرنے کے بعد لذت یا تکلیف پاتے ہیں۔ لیکن خاص اولیاء اللہ کا تصرف و اختیار دنیا میں اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور حاجت مند لوگ ان فوت شدگان سے اپنی حاجتیں اور مشکلیں حل کراتے ہیں۔ اور مرادیں قبر والوں سے پا لیتے ہیں ؛ دلیل نمبر سوم:۔ ابھی تک تو قرآنِ کریم اور مفسرین و محدثین کے اقوال اور لغت و عقل کے قواعد سے یہ بات ثابت ہوئی۔ کہ خود صاحبِ قبر سے مانگنا بھی جائز۔ چہ جائیکہ اُن کا وسیلہ کر کے رب تعالےٰ سے مانگے۔ مگر زید اور دیگر وہابی تو وسیلہ کے بھی منکر ہیں۔ حالانکہ ربِ کریم قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے:۔ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ۔ (ترجمہ):۔ اسے مسلمانوں اللہ تعالےٰ کے قرب اور بخشش کے لیئے کسی وسیلے کی تلاش کرو۔ یعنی بے وسیلہ کوئی بات قبول نہ ہوگی۔ نہ دعا۔ نہ نماز، نہ حج، نہ روزہ، نہ زکوٰۃ اس آیت نے کس طرح وضاحت سے ثابت کر دیا کہ اللہ کا ولی حیات ظاہری میں ہو یا حیات ابدی کے ساتھ قبر میں اس کے وسیلے سے ہی دعا وغیرہ کی قبولیت ہوتی ہے۔ مسجدوں کی عزت و حرمت سے کون مسلمان منکر ہے۔ لیکن بے وسیلہ مسجد میں جانا بھی بے بیکار ہے۔ حقیقتِ مسجد تو بس اتنی ہے۔ کہ ملو شما کے پیسے سے ایک گھر بن گیا۔ اور اپنی رقومات کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے۔ اگر طیب ہے تو مسجد طیب و مقام رحم و کرم۔ اگر مالِ خبیث سے تعمیر مسجد ہوئی۔ تو مسجدِ ضرار کا حکم اور بجائے قبولیت کے مقام غضب و عذاب۔ لہٰذا مسجد میں حتمی قبولیت کا کسی کو یقین نہیں ہو سکتا۔ ہر مسجد کو

بھی نسبت کی حاجت۔ صحیح مسجد بھی تو اللہ کی کچہری ہے۔ وہاں تو عدل وانصاف کی میزان ہے۔ جیسا برتن ویسا ہی بھیک ملے گا۔ اور جس کے پاس وسیلے کا برتن نہ ہوگا۔ وہ خائب وخاسر ومحروم ہی لوٹے گا۔ مگر رحم وکرم اور غفاریِ ذی الجلال کے اسٹیشن تو اصلاً یہ آستانے ہی ہیں۔ یہاں بے برتن والے کو ننگا ہوں سے بھی پلا دیا جاتا ہے۔ اسی لیئے رب کریم نے فرمایا:۔ وَاِذْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ الخ (ترجمہ):۔ اے پیارے حبیب کریم جب یہ ظالم گندے منہ سے لوگ آپ کے پاس آجائیں بخشش مانگتے۔ (عاجزی کرتے۔ جھک جھک کر ہاتھ باندھ کر صلوٰۃ وسلام پڑھتے) قیامت تک، تو وہیں رب تعالیٰ کو شانِ رحیمی کریمی سے پائیں گے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ایسے بے کس بے بس کو اپنی مسجد میں نہ بھیجا۔ بلکہ فرمایا،۔ جَآءُوْكَ:۔ اے نبی آپ کے پاس آجائیں۔ اس لیئے کہ بے یار ومددگار جسے کوئی نہ پوچھے۔ ایسوں کا تمہیں یار ومددگار بنایا۔ جب نبی پاک کے وسیلہ سے معطر ومزین ہو جاؤ تب مسجد میں جاؤ۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (ترجمہ):۔ اے انسانوں مسجدوں کے پاس زینت لے کر آؤ۔ بغیر وسیلہ دعا قبول نہیں ہوتی ہوتی۔ حضرت شیخ سعدی جن کی ولایت کاملہ مخالفین کو بھی مسلّم ہے۔ دعا میں عرض گذار ہیں شعر

الٰہی بحق بنی فاطمہ ∴ کہ بر قول ایماں کنم خاتمہ

ترجمہ:۔ اے اللہ امام حسن حسین کے وسیلہ سے میرا خاتمہ ایمان پر ہو۔ مزاراتِ اولیاء اللہ رب تعالیٰ کے وسیلہ عظمیٰ ہیں:۔ **دلیل نمبر ۴**:۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ اپنے وطن فلسطین سے سفر کر کے امام اعظم کے مزار مقدس پر حاضری دیتے تھے۔ چنانچہ فتاوے شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۸ پر ہے۔ اَنَّهٗ قَالَ اِنِّیْ لَاَتَبَرَّكُ بِاَبِیْ حَنِیْفَةَ وَاَجِیْءُ اِلٰی قَبْرِهٖ فَاِذَا عَرَضَتْ لِیْ حَاجَةٌ صَلَّیْتُ رَكْعَتَیْنِ وَسَاَلْتُ اللهَ تَعَالٰی عِنْدَ قَبْرِهٖ فَتُقْضٰی سَرِیْعًا (ترجمہ):۔ امام شافعی علیہ الرحمت نے فرمایا۔ کہ میں امام ابو حنیفہ رحمت اللہ تعالیٰ علیہ کی قبر کے پاس آتا ہوں۔ اور امام صاحب سے برکت حاصل کرتا ہوں۔ پس جب کبھی مجھ کو کوئی مشکل پیش آتی ہے۔ تو بھی امام اعظم کی قبر کے پاس آکر نفل پڑھتا۔ اور اللہ پاک سے دعا مانگتا ہوں۔ تو فوراً دعا قبول ہوتی ہے۔ بتائیے۔ امام شافعی کو مسجد کا پتہ نہ تھا؟ کیا ان کے شہر میں کوئی مسجد نہ تھی؟ پھر وہ اتنی دور کا سفر کر کے کیوں آتے۔ ثابت ہوا۔ کہ مزاراتِ اولیاء اللہ کے پاس جا کر دعائیں مانگنا عبادتِ خدا ہے۔ اور مقبولِ بارگاہ ہے۔ اور یہ کہ قبر والے ولی اللہ حاجت مند کو برکت عطا کرتے ہیں:۔ **دلیل نمبر ۵**:۔ بہجۃ الاسرار صفحہ نمبر ۶۳ پر ہے

وَلَقَدْ رَأَیْتُ أَرْبَعَۃً مِّنَ الْمَشَایِخِ یَتَصَرَّفُوْنَ فِیْ قُبُوْرِہِمْ کَتَصَرُّفِ الْاَحْیَاءِ الخ

(ترجمہ) :۔ شیخ القدوۃ ابوالحسن علی قرشی فرماتے ہیں۔ میں نے چار ولیوں کو دیکھا۔ کہ اپنی قبروں میں ایسا ہی ! تصرف اور کام کر رہے ہیں۔ جیسے ظاہراً زندہ لوگ اس سے بھی ثابت ہوا۔ کہ قبر والے مدد دے سکتے ہیں۔ لہٰذا اُن کا وسیلہ پکڑنا بالکل جائز۔ بلکہ قبولیتِ دعا کے لیئے ضروری ہے۔ زید اور دیگر گستاخ وہابیوں کے نزدیک غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ سب سے بڑے مشرک دیوبندی وہابی ہیں۔ کیونکہ دن رات ڈاکٹر، حکیم، پولیس وغیرہ سے مدد مانگتے رہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے۔ کہ پولیس وغیرہ اللہ نہیں۔ بلکہ غیر اللہ ہیں۔ یہ وہابی تو اپنے منہ خود مشرک بنتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ غیر اللہ کی مدد کو شرک نہیں فرماتا۔ بلکہ غیر اللہ سے تعاون مانگنے کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (الخ) ترجمہ :۔ ایک دوسرے کی مدد کرو۔ نیکی اور تقوے پر۔ وہابیوں کو خدا ہدایت دے۔ یہ ہر اُس چیز کا انکار کرتے ہیں۔ جس کا رب تعالیٰ حکم دیتا ہے۔ گویا اللہ جل جلالہٗ سے مقابلے کی ٹھانی ہے۔ اِن تمام دلائل سے ثابت ہوا۔ کہ مزاراتِ مقدسہ پر حاضری دینا، حاجت مانگنا، وسیلہ پکڑنا عینِ ایمان ہے۔ زید عقیدۃً وہابی ہے۔ ایسے بدعقیدہ شخص کو امامت سے ہٹا دینا اشد ضروری ہے

جواب :۔ نمبر ۲ :۔ سائل کے دوسرے سوال کا جواب :۔ اِسلامی نظریات کے مطابق مخلوقاتِ الٰہیہ میں ایک مخلوق جنات بھی ہے۔ یہ مخلوق خلقتِ انسانی سے پہلے وجود میں آئی۔ جس طرح انسانوں کی بہت اقسام ہیں۔ اسی طرح اُن میں بھی بہت اقسام ہیں۔ بعض بہت طاقتور اُن کو عربی میں عِفریت کہا جاتا ہے بعض بدصورت۔ بعض خوبصورت وغیرہ وغیرہ۔ اِسی طرح بعض جِنات نیک اور بعض بُرے بعض مومن، بعض کافر، مذکر بھی مؤنث بھی غرضیکہ بالکل انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ چنانچہ حاشیہ نبراس صفحہ نمبر ۲۶۶ پر ہے :۔ قَالَ السُّدِّیُّ اَلْجِنُّ اَمْثَالُکُمْ فِیْہِمْ مُرْجِیَۃٌ وَقَدَرِیَۃٌ وَرَافِضَۃٌ وَشِیْعَۃٌ (مج ۲۱-۱۲۱ ادن ۷ نبراس علی شرح عقائد صفحہ نمبر ۲۶۶ پر ہے :۔ وَاَیْضًا اَلْجِنُّ ذُکُوْرٌ وَّاِنَاثٌ مُّتَنَاسِلُوْنَ مُکَلَّفُوْنَ مُخَاطَبُوْنَ بِالْوَعْدِ وَالْوَعِیْدِ مِثْلُ بَنِیْ اٰدَمَ الخ (ترجمہ) :۔ امام سدیؒ نے فرمایا۔ کہ جنات تم انسانوں کی مثل ہیں۔ اُن میں سے بعض مرجیہ، بعض قدریہ، بعض وہابی، بعض شیعہ، نبراس نے کہا کہ جنات میں مذکر بھی ہوتے ہیں۔ مؤنث بھی۔ اِن کی نسلیں بھی چلتی ہیں۔ شریعت کے مکلّف اور جنت کے وعدے جہنم کی وعید کے مخاطب بھی ہوتے ہیں۔ اور جس طرح انسانوں کی مختلف طبیعتوں کے اعتبار سے اُن کے مختلف نام پڑ جاتے ہیں۔ اِسی طرح جنات کے بھی۔ مختلف زبانوں میں مختلف نام ہیں

خوبصورت نازک عورت کو اردو میں میم کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے کہ انگریز عورتوں کا نام ہمارے علاقے میں میم ہے۔ اسی طرح فارسی زبان میں خوبصورت نازک جناتنی کو پری کہہ دیا جاتا ہے۔ بڑے آدمی کو شرارتی یا شریر کہا جاتا ہے۔ فارسی میں بڑے جن کو دیو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فارسی زبان کے بے مثل عالم حضرت شیخ سعدی ولی کامل۔ لفظ پری کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں :۔ شعر

دھد نطفہ را صورتے چوں پری — کہ کرد است برآب صورت گری

ترجمہ :۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ خلاقی کیسی عجیب تر ہے۔ کہ نطفے کو پری کی طرح خوبصورت شکل دے دی یہ پانی پر صورت گری ہے۔ امیر خسرو اپنی مشہور نظم :۔

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو

میں اس طرح فرماتے ہیں :۔ ع

پری پیکر نگارِ سرو قدِ لالہ رخسارِ

ان دونوں جگہ لفظِ پری کو خوبصورتی کے لیے استعارۃً استعمال فرمایا۔ جیسے کہ لفظِ شیر۔ بہادر اور لفظِ بکری بزدلی اور لفظِ گدھا بیوقوفی کے لیے مستعمل ہے۔ لیکن اُن کا اپنا بھی علیحدہ وجود ہے اسی طرح پری اور دیو کا علیحدہ بھی وجود ہے۔ یہ جنات کی نسل ہے۔ نہ کہ علیحدہ مخلوق۔ دیو بہادر جن کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور شرارتی کو بھی۔ بہادر جنات کو عربی میں عفریت کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ (ترجمہ :۔ بہت بہادر جن نے کہا۔ حضرت شیخ سعدی گلستان میں ایک حکایت کے ماتحت لفظِ دیو کو اس طرح استعمال فرماتے ہیں :۔ و معلمے دوم را اخلاقِ نیکی دیدند دیو یک یک شدند (ترجمہ :۔ جب مدرسے کے چھوٹے طلباء نے دوسرے استاد کو نرم طبیعت دیکھا تو ایک ایک شیطان بن گیا۔ یہاں لفظِ دیو کو شیطان کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں ایک مدرسے کا نام دیوبند ہے۔ جس کا مطلب ہے شیطان کے ٹھہرنے کی جگہ۔ یا شیطانوں کی جیل۔ بہرحال دیو پری کا وجود مسلم حقیقت ہے :۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

شیعہ ماتم کی حرمت کا بیان

سوال ع۲۳ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں۔ کہ ایک شیعہ کہتا ہے۔ حضرت

امام حسین کی یاد میں پیٹنا ماتم کرنا جائز ہے۔ اور دلیل یہ دیتا ہے۔ کہ جب ایک جنگ میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دو دندان مبارک شہید ہوئے۔ تو حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم کی محبت میں سب دانت توڑ دیئے۔ جب حضرت اویس قرنی نے سب دانت توڑ دیئے تو لازماً خون نکلا ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ کسی کی محبت میں خون نکالنا جائز و مستحسن ہے۔ اسی لئے ہم شیعہ لوگ بھی پیٹ کر امام حسین کی یاد میں خون نکالتے ہیں۔ لہٰذا اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ اور وہ حدیث پاک جس میں نبی کریم نے فرمایا۔ جو شخص اپنے رخساروں پر طمانچے مارے۔ اور گریبان پھاڑے اور جاہلوں کا کام کرے۔ وہ ہم میں سے نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ حدیث نبی کریم نے ہمارے لئے نہیں فرمائی بلکہ یہ اُن کے لئے ہے۔ جو اپنے رشتے داروں باپ دادوں، بھائی، بھتیجے کو پیٹے۔ کیونکہ فوتیدگی کے وقت اکثر عورتیں اپنے چہروں پر طمانچے مارتی ہیں۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ ماتم کے وقت یا حسین یا حسین کا نعرہ لگانا، یا نعرۂ حیدری لگانا گناہ نہیں۔ اور تم اہل سنت لوگ بھی نعرہ رسالت، نعرۂ حیدری اور نعرۂ غوثیہ، یا علی یا غوث کہتے ہو۔ ماتم کے جائز ہونے پر یہاں کے شیعہ عالم یہ جواب دیتے ہیں۔ لہٰذا فرمایا جائے۔ کہ ماتم حسین جائز ہے یا حرام۔ اگر حرام ہے۔ تو اُس کے دلائل کیا ہیں؟ اور شیعوں کی ان باتوں کا جواب کیا ہے۔ بیّنوا توجروا۔

سائل عمر بخش چک عبدالخالق، ضلع جہلم۔ مورخہ ۲ ۳/۱۹۷۲

بعون الملک العلّام الوھّاب

الجواب

دُنیائے دُوں میں اس وقت بے شمار دین ہیں۔ اور ہر دین کا ایک بنیادی شعار ہوتا ہے۔ اس شعار کے ذریعہ ہی اُس دین کی پہچان ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوؤں کی پہچان اور نشان ہے۔ رام لیلا کے سوانگ نکالنے اور بازاروں میں پھرنا۔ اسی طرح دوسرے کفار کے مختلف شعار ہیں۔ مسلمانوں میں اہل سنت کا شعار ہے۔ کہ اُن کی مساجد میں۔ یا اللہ، یا رسول اللہ لکھا ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نعت گوئی وغیرہ۔ وہابی حضرات کا نشان یہ ہے۔ کہ ہر نیک کام کو شرک بدعت کہہ دیتے ہیں اسی طرح شیعوں کا شعار بلکہ نشانِ اعظم ہے۔ محرّم شریف کے دس دن ماتم کرنا پیٹنا اور پیٹ کوٹنا۔ اگر شیعہ لوگ ماتم نہ کریں۔ تو اِن کی کوئی پہچان باقی نہیں رہتی۔ گویا ماتم پیٹنا کوٹنا۔ اُن کے دین کا بنیادی نشان ہے۔ دین کی فروعات سے قطع نظر، ہر دین کی سچائی اور غیر سچائی کا بڑا معیار اُس کے شعار کی مضبوطی ہے۔ سچے دین کے شعار مضبوط دلائل سے ثابت ہوتے ہیں۔ جن کو حقیقۃً توڑنا ناممکن ہے۔ شعار بنیادی

کی کمزوری دین کی کمزوری کے ہم معنیٰ ہے۔ شیعہ دین کے اِس بنیادی نشان کا اولاً اُن ہی کی کتب سے اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کہ اُن کے اکابرین پٹنے کوٹنے کے بارے کیا کہتے ہیں۔ پھر دیکھا جائے گا۔ کہ قرآنِ کریم و حدیثِ رسول اللہ۔ اس ماتم کے متعلق کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔ پھر سوالِ مذکورہ کے کمزور دلائل وقیاسات کا جواب دیا جائے گا۔ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللہِ۔ وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ وَ اِلَیْہِ اَلْتُکْلَانُ۔ خیال رہے۔ کہ رافضی شیعہ حضرات جس طرح بازاروں، گلی کوچوں میں ماتم کرواتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو کھیل تماشہ سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ یا غم اور مصیبتِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بنا پر پہلی صورت کو کوئی شیعہ تسلیم نہ کرے گا۔ اگرچہ شیعہ مذہب کی مشہور کتاب ذخیرۃ المعاد میں لکھا ہے۔ کہ آلاتِ لہو یعنی طبلہ سارنگی کے ساتھ بھی ماتم کرنا بہت اچھا ہے۔ اِس عبارت سے صراحتاً یہی ثابت ہو رہا ہے۔ کہ ماتم بطور دل بہلاوا کھیل تماشہ کیا جاتا ہے۔ مگر میں کسی پر اِس قسم کا الزام دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ کھیل تماشے والا ماتم سب سے پہلے واقعۂ کربلا کے فوراً بعد کوفے والوں نے کیا۔ اور اِس ماتم اور گریہ زاری کو دیکھ کر بقولِ شیعہ مورخین۔ حضرت زینب ہمشیرہ امام عالی مقام نے اُن رونے والے ماتمین کو غدار فرمایا۔ چنانچہ مشہور شیعہ کتاب (عاشورہ چہ روز زیست) مطبوعہ شرکت سہامی تہران تالیف علامہ عمادالدین اصفہانی صفحہ نمبر ۲۹۵ پر ہے:۔ (ترجمہ) خطبۂ حضرت زینب در بازارِ کوفہ اَی مردمِ کوفہ ای اہلِ غدر و مکر۔ بر من گریہ میکنید۔ آبِ چشمِ شما نایستد و نالۂ شما ساکت نہ گردد۔ الخ آیا بر ما گریہ و زاری میکنید۔ اِی واللہ بسیار بگریید و کم بخندید (الخ) حضرت زینب کے عربی خطبہ کا فارسی ترجمہ:۔ اے کوفے کے لوگو! اے غداری اور مکر کرنے والو میرے سامنے ماتم کرتے ہو۔ خدا کرے۔ تمہاری آنکھ کا پانی نہ ٹھہرے۔ اور تمہاری شور و فریاد پٹنا کوٹنا کبھی بند نہ ہو۔ اے غدارو کیا ہمارے سامنے رونا پیٹنا شروع کرتے ہو۔ اللہ کی قسم بہت روتے رہو۔ اور تھوڑا ہنسو۔ یہ تھی حضرت زینب کی بددعا جو شیعہ مؤرخین نے اِس کتاب میں درج کی ہے۔ ثابت ہوا۔ کہ سب سے پہلے ماتم کوفے کے لوگوں نے کیا۔ اور ظاہر بات ہے۔ کہ یہ ماتم بطورِ مصیبت اور بوجہِ غم و ملال نہ تھا۔ ورنہ زینب اُن کو مکار اور غدار نہ فرماتیں۔ بلکہ بطریقہ کھیل کود اور تماشہ تھا۔ رہی دوسری صورت کہ بوجہ غم و رنج مصیبت ماتم کیا جائے۔ تو ایسے ماتم کو ہر لغت میں بے صبری کہا جاتا ہے۔ چنانچہ لغوی طور پر صبر کے معنیٰ ہیں رکنا یا خود کو روکنا۔ اصطلاحِ شریعت میں صبر کا معنیٰ ہے۔ مصیبت اور غم کے اظہار سے خود کو باز رکھنا۔ المنجد مصری عربی صفحہ نمبر ۴۲۶ پر ہے:۔ صَبَرْتُ نَفْسِیْ عَنْ کَذَا اَیْ حَبَسْتُھَا (ترجمہ) میں نے اپنے نفس کو صبر کرایا۔ یعنی میں نے خود کو فلاں کام سے روکا۔ پھر آگے لکھا ہے:۔ اَلصَّبْرُ اَلتَّجَلُّدُ وَعَدَمُ

الشَّکْوٰی مِنَ اَلَمِ الْبَلْوٰی (ترجمہ):۔ صبر کا معنی ہے مصیبت کی تکلیف کا شکوی نہ کرنا کتابِ لغت مجمع البحار جلد دوم صفحہ نمبر ص۲۲ پر ہے:۔ وَالصَّبْرُ اَلْحَبْسُ فِیْ ضِیْقٍ وَّیَخْتَلِفُ بِحَسْبِ الْمَوَاقِعِ فَفِی الْمُصِیْبَۃِ صَبْرٌ (ترجمہ):۔ صبر کا معنی ہے۔ تنگی تکلیف میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا۔ اور مختلف حالات میں اس کے نام مختلف ہوتے ہیں۔ پس مصیبت میں شور و فریاد نہ کرنے کا نام صبر ہے۔ لغت کے ان حوالوں سے ثابت ہوا۔ کہ صبر غم و مصیبت کے اظہار نہ کرنے کا نام ہے۔ تو لازم آیا۔ کہ اپنے عمل سے اظہار کرنا بے صبری ہوگا۔ اب مختلف حالات اور مختلف اشخاص کے لحاظ سے صبر اور بے صبری بھی مختلف ہوگئی۔ لہٰذا طاقت والا اپنی طاقت کے اعتبار سے اپنی مصیبت کا بدلہ کسی سے لیتا ہے۔ تو یہ اس کی بے صبری ہے۔ کوئی اپنی تکلیف کو جلدی ختم کرنے کے لئے جائز ناجائز کام کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی بے صبری ہے۔ ایک مجبور بے کس کسی کے ظلم پر اس کو گالیاں دیتا ہے۔ یا برا بھلا کہتا ہے۔ یا روتا پیٹتا ہے۔ یہ بھی بے صبری میں شمار ہے۔ اس طرح کسی کی وفات پر پیٹنا ماتم کرنا، سب کچھ بے صبری اور اظہارِ مصیبت ہے۔ اور مصیبت کا اظہار عام ہے۔ اس بات کو کہ اپنی مصیبت ہو۔ جیسے اپنا کوئی بیٹا، بھتیجا مر جائے تو گھر والے پیٹنا شروع کر دیں۔ یا کسی کی مصیبت ہو۔ جیسے دورِ جاہلیت میں کرایہ پر پیٹنے والی عورتیں بلائی جاتی تھیں۔ یا آج کل دیہات کی عورتیں دوسرے محلوں میں صرف اس لئے پیٹنے جاتی ہیں۔ کہ کل وہ بھی ہمارے گھر پیٹنے آئے گی حالانکہ ان پیٹنے والیوں کو نہ کوئی غم ہوتا ہے اور نہ ان کے آنسو نکلتے ہیں۔ عام طور پر پیچھے غم کا نشان آنسو ہیں۔ باوجود غم نہ ہونے کے پیٹنے کوٹنے کو بے صبری کا لقب دیا جائے گا۔ جب کہ کسی کی مصیبت کا اظہار ہو۔ صبر کی اس جامع مانع لغوی تعریف سے۔ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ شیعہ حضرات کا کربلا کی مصیبت کو یاد کرکے ماتم کرنا عین بے صبری ہے۔ اور جتنی آیات و احادیث و اقوالِ بزرگان صبر کے حکم اور بے صبری کی ممانعت میں وارد ہیں۔ وہ تمام شیعوں کے ماتم کو بھی شامل ہے۔ اور جس طرح دیگر بے صبریاں خود شیعہ بزرگوں کے نزدیک منع ہیں۔ اسی طرح ماتم بھی خود شیعہ اکابر کے نزدیک گناہ۔ چنانچہ شیعہ تفسیر قمی مطبوعہ نجف لابی الحسن علی بن ابراہیم قمی جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۹۷ پر ہے۔ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْکَ بِالصَّبْرِ فِیْ جَمِیْعِ اُمُوْرِکَ (ترجمہ) ابو عبد اللہ امام جعفر نے فرمایا۔ کہ لازم پکڑو۔ صبر کو اپنے تمام معاملات میں۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ بے صبری مت کرو۔ کیونکہ بے صبری صبر کی ضد ہے پیٹنا کوٹنا کبھی بھی کسی عقل والے کے نزدیک صبر نہیں۔ بلکہ سخت ترین بے صبری ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تفسیر قمی کے مذہب میں، جو شیعہ تفسیر ہے۔ ماتم کرنا گناہ ہے۔ اسی تفسیر میں آگے لکھا ہے:۔ اَلصَّبْرُ مِنَ الْاِیْمَانِ کَالرَّاْسِ مِنَ الْبَدَنِ (ترجمہ):۔ صبر اس طرح

ایمان کے ساتھ ہے جس طرح سر بدن کے ساتھ۔ اس عبارت نے صبر کی کتنی اہمیت بتائی۔ گویا کہ جو بے صبری کا ماتم کرتا ہے۔ وہ سر بریدہ مُردہ ایمان والا ہے۔ یہ پہلے بتایا گیا ہے۔ کہ ماتم دو قسم کا ہے:۔ ع۱:۔ بے صبری کا ماتم جو کتبِ لغت سے ثابت ہوا۔ ع۲:۔ کھیل تماشے کا ماتم۔ جو شیعہ کتاب سے ثابت اسی تفسیر قمی جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۹۱ پر ہے:۔ مَنْ صَبَرَ ظَفَرَ ط (ترجمہ) جس نے صبر کیا۔ وہ دونوں جہان میں کامیاب ہوا۔ معلوم ہوا۔ کہ بے صبری کا ماتم کرنے والا دونوں جہان میں ناکام ہے۔ ابھی تک صبر کی تعریف کتبِ لغت سے کی گئی ہے۔ اب ذرا شیعہ کتب سے بھی سن لو۔ کہ صبر کیا ہے۔ اور بے صبری کیا ہے؟ چنانچہ فروع کافی جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۲۱ مطبوعہ لکھنؤ میں ہے۔ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ (علیہ) قَالَ قُلْتُ لَہٗ مَا الْجَزَعُ۔ قَالَ اَشَدُّ الْجَزَعِ۔ اَلصُّرَاخُ بِالْوَیْلِ وَالْعَوِیْلِ وَلَطْمُ الْوَجْہِ وَالصَّدْرِ وَجَزُّ الشَّعْرِ مِنَ النَّوَاصِیْ وَمَنْ اَقَامَ النَّوْحَۃَ فَقَدْ تَرَکَ الصَّبْرَ ط (ترجمہ):۔ امام جعفر نے فرمایا۔ کہ میں نے محمد باقر سے پوچھا بے صبری کیا ہے۔ فرمایا۔ کہ سب سے بڑی بے صبری کا چیخ چیخ کر ماتم کرنا ہے۔ اور چہرے پر تھپڑ مارنے اور سینہ کو ہاتھ مارنا اور پیشانی کے بال نوچنا یہ سب کچھ بے صبری ہے۔ اور نوحہ قائم کرنا یا ہر سال جس نے نوحہ قائم رکھا۔ اُس نے یقیناً صبر کو چھوڑا۔ یہ تھی فروع کافی عربی کی عبارت۔ فروع کافی شیعوں کی معتبر مشہور و معروف کتاب ہے جس نے اس مندرجہ عبارت میں بالکل شیعوں کے ماتم کا نقشہ کھینچ کر بتا دیا۔ کہ یہ بے صبری ہے۔ جو بقولِ قمی ایمان سے خارج کر دیتی ہے۔ یہی کچھ سینہ کوٹنا اور بازاروں میں نوحہ پڑھنا۔ شیعوں کے ماتم میں ہوتا ہے۔ بے صبری کرنے کا گناہ کیا ہے؟۔ یہ بھی شیعوں سے پوچھتے ہیں۔ اصول کافی کے باب الصبر جلد دوم طبع کراچی صفحہ نمبر ۱۱۰ پر ہے:۔ اِذَا ذَھَبَ الصَّبْرُ ذَھَبَ الْاِیْمَانُ ط (ترجمہ):۔ جب صبر ختم ہوا۔ تو ایمان بھی ختم ہوا۔ اسی طرح نہج البلاغہ صفحہ نمبر ۱۸۵ پہ ہے:۔ قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ (الخ) وَمَنْ ضَرَبَ یَدَہٗ عَلٰی فَخِذِہٖ عِنْدَ مُصِیْبَتِہٖ حَبِطَ عَمَلُہٗ ط:۔ (ترجمہ):۔ جس نے مصیبت کے وقت اسی طرح ماتم کیا کہ اپنی رانوں کو ہاتھوں سے پیٹا۔ تو اُس کے سب عمل برباد ہو گئے۔ شیعہ مذہب کی اردو کتاب تحفۃُ العوام مطبوعہ لاہور صفحہ نمبر ۱۰۵ پر ہے:۔ صاحبِ مصیبت کے لیے اپنا منہ پیٹنا طمانچہ لگانا اپنے آپ کو زخمی کرنا اور بال نوچنا وغیرہ حرام ہے۔ خواہ اعزہ کے مرنے میں ہو۔ یا غیروں کے۔ اِس عبارت نے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ شیعوں کا یادِ کربلا میں ماتم کرنا حرام ہے۔ کیونکہ چھریوں سے بلیڈوں سے سر کو زخمی کرنا۔ بجز شیعہ ماتم کے اور کہیں نہیں دیکھا، سُنا گیا۔ اسی طرح شیعہ کتب جلاء العیون

-تفسیر عمدۃ البیان مَن لا یحضرہ الفقیہ میں بھی لکھا ہے۔ کہ نوحہ ماتم ناجائز ہے۔ مشہور شیعہ مجتہد مُلّا باقر مجلسی اپنی کتاب حیاتُ القلوب قلمی جلد اول صفحہ نمبر ۶۲۳ پر اور شیعہ کتاب امارۃ البصائر ص ۲۹۷ پر بھی ماتم کو حرام لکھتے ہیں۔ جن سے صاف حرمتِ ماتم ثابت ہے۔ سچے شیعہ کے لیے تو یہ دلائل کافی اور اُن بڑوں کی باتیں سُن کر ہی ماتم سے باز آ جانا چاہیئے۔ شیعوں کو دوسری کتابوں سے دلائل پیش کرنا کچھ ضروری نہیں۔ کیونکہ جو اپنوں سے نہ مانے وہ دوسروں کی کب مانے گا۔ مگر اِتمامِ حجت کے لیئے قرآنِ کریم سے بھی حرمتِ ماتم کے دلائل پیش کیئے جاتے ہیں۔ عقل کا بھی تقاضا ہے۔ کہ بازاروں میں ماتم منع ہو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ کوئی صاحبِ خرد خود ماتم نہیں کرتا۔ نہ کسی امیر مہذب شیعہ کو ماتم کناں دیکھا گیا ہے۔ بلکہ اُمراء شرفاء صرف ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ بے وقوف غرباء دھڑا دھڑ ماتم کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر یہ ماتم بقولِ شیعہ عوام عبادت ہوتا۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ ہر وقت ہر شیعہ کرتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ تو پتہ لگا۔ کہ شرفاء اس کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ جَلّ شانہٗ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے۔ :یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِؕ-اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (ترجمہ) :- اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد مانگو۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس آیتِ پاک میں اللہ کریم نے صبر پر بہت اہمیت فرمائی۔ جس سے ثابت ہوا۔ کہ اللہ تعالےٰ بے صبروں سے متنفر ہے۔ اور یہ پہلے بتا دیا۔ کہ غم اور مصیبت میں پیٹنا ماتم کرنا بھی بے صبری ہی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے :- (سورۃ رعد آیت ۲۴)

سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِؕ :- (ترجمہ) :- سلامتی ہو تم پر اس وجہ سے کہ تم نے دنیا میں مصیبتوں پر صبر کیا تھا۔ پس اچھا ہے آخری گھر۔ اس میں بھی صبر کرنے والوں کی تعریف فرمائی۔ بلکہ بتایا گیا۔ کہ جنت صبر کرنے والوں کو ملتی ہے :- نہ کہ بے صبری سے پیٹنے کوٹنے والوں کو۔ قرآنِ کریم میں ایک سو تین جگہ صبر کرنے کا حکم اور صبر کی تعریف بیان فرمائی گئی ہے۔ اور بے صبری کا کہیں بھی ذکر نہیں۔ بلکہ اُس کی بُرائی کی گئی۔ اور فرمایا گیا۔ کہ بے صبری کافروں کا طریقہ ہے۔ چنانچہ ارشادِ قرآنِ پاک ہے۔ کہ جب کافر قریب قیامت قبروں سے نکلیں گے۔ تو پیٹتے کوٹتے ہائے وائے شور و غل مچاتے نکلیں گے :-

سورتِ یٰسین آیت نمبر ۵۲ :- قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ﱃ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ (الخ) :- (ترجمہ) :- قبروں سے نکلتے وقت سب کافر چیخ پکار کرتے ہوں گے۔ یا وَیْلَنَا۔ ہائے ہماری ہلاکت کس نے ہم کو اٹھایا ہماری قبروں سے

کیا یہ اللہ کے وعدے والا دن ہے۔ قرآنِ کریم نے کیسا عظیم نقشہ کھینچا ہے۔ کیا حالت ہوگی اُس گھڑی کہ سارے کافر ننگے بدن یا ویل۔ یا ویل کرتے نکل رہے ہوں گے۔ بالکل آج کل شیعہ ماتموں جیسا سما ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہوگا۔ کہ آج کل شیعہ لوگ یا حسین۔ یا حسین کرتے ہیں۔ مگر وہ یا ویل۔ یا ویل کر رہے ہوں گے۔ کتنا خوفناک ہوگا۔ وہ دنیا کا آخری ماتم۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس اور اُس ماتم سے بچائے۔ اللہ تعالے نے بروں انسانوں کا قرآن کریم میں اس طرح ذکر فرمایا ہے۔ سورت معارج آیت نمبر ۱۹ تا ۲۳ میں ہے:۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ط۔ (ترجمہ):۔ بے شک انسان پیدا کیا گیا۔ بہت جلد باز۔ کہ جب اس کو مصیبت پہنچے۔ تو بہت بے صبری کرنے والا ہے۔ اور جب اُس کو مال و دولت وغیرہ کی بھلائی پہنچے۔ تو کنجوسی سے روکنے والا مگر وہ نمازی جو اپنی نماز میں ہمیشگی کرنے والے ہیں۔ اِس آیت نے صاف فرما دیا۔ کہ جو ہم سے دُور ہونے والے بے نمازی ہیں۔ وہ ہی مصیبتوں میں بے صبری کے کام کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کے نیک بندے ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔ عربی زبان میں جزع کا معنیٰ ہے۔ بے صبری چنانچہ تفسیر روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ۱۶۲ پر ہے:۔ جَزُوْعًا۔ مُبَالِغَةٌ فِى الْجَزَعِ وَهُوَ ضِدُّ الصَّبْرِ (ترجمہ):۔ لفظ جزوع۔ صیغۂ مبالغہ ہے۔ جزع سے بنا ہے۔ صبر کی ضد ہے۔ یعنی بے صبری اِس آیت نے اچھے برے کی ایک شاندار نشانی بتا دی۔ اس لیے کہ لفظ اِلَّا حرفِ استثناء متقضی ہے۔ اس بات کا کہ مستثنیٰ مِنْہُ کی جنس یا نوع ہو۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے۔ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۶۷ باب المساجد فصلِ اوّل میں ہے:۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰى ثَلٰثَةِ (الخ) ط (ترجمہ):۔ حضرت ابی سعید خدری رضی اللہ تعالے عنہ سے روایت ہے۔ فرمایا کہ فرمایا آقائے دو عالم صلے اللہ تعالے علیہ وسلم نے کہ کسی مسجد کی طرف سفر کرکے اہتمام سے سامان سفر مت باندھا جائے۔ سوائے تین مسجدوں کے۔ یہاں اِلَّا کا مستثنیٰ مِنْہُ لَا تُشَدُّ کا جملہ ہے۔ لَا تُشَدُّ متعدی بدو مفعول اس کا ایک مفعول منفی ہم پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد اِلَّا حرف استثناء ہے۔ اُس کا مستثنیٰ مسجدیں ہیں۔ مندرجہ بالا قاعدہ سے ثابت ہو گیا۔ کہ پہلے بھی مسجدوں کا ہی ذکر ہے۔ نہ کہ کسی اور سفر کا۔ ورنہ اقتضاءِ اِلَّا غلط ہوتا ہے۔ اِسی طرح یہاں انسان سے عام جنسِ انسان مراد ہے۔ پھر اِلَّا نے اسی جنسِ انسانی میں

تخصیص کر کے ثابت کر دیا۔ کہ بُرے انسان ہی مصیبتوں میں بے صبری کا ماتم کرتے ہیں۔
وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھیں وہ دلیلیں جو قرآن کریم میں اقتضاءً و اشارۃً حرمتِ ماتم ثابت کر رہی ہیں۔ کتب حدیث میں بھی متعدد احادیث سے نوحہ، ماتم، پیٹنا کوٹنا حرام ثابت ہو رہا ہے چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۵۰ میں ہے :۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ النَّائِحَۃَ وَالْمُسْتَمِعَۃَ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ (ترجمہ) :۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے لعنت فرمائی۔ نوحہ، مرثیہ پڑھنے والی پر اور سننے والی پر شیعوں کے ماتم میں نوحہ اور مرثیہ بھی ہوتا ہے۔ پس خود فیصلہ کر لو۔ کہ یہ کام باعثِ لعنت ہوا یا نہیں۔ لیکن چونکہ ماتم میں صرف نوحہ خوانی ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ بال نوچنے، چہرہ وغیرہ زخمی کرنا، ہاتھوں سے پیٹنا بھی ہوتا ہے :۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان چیزوں کو بھی حرام فرما دیا۔ چنانچہ ابو داؤد شریف جلد دوم کتاب الجنائز صفحہ نمبر ۸۴ پر ہے :۔ عَنْ یَزِیْدِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ۔ (الخ) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ حَلَقَ وَمَنْ سَلَقَ وَمَنْ خَرَقَ۔ :۔ (ترجمہ) آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ وہ ہم میں سے نہیں۔ (یعنی ایمان والا نہیں) جو مصیبت کے وقت بال منڈائے اور ہائے ہائے کر کے زور سے چیخے اور جو کپڑے پھاڑے اس روایت پاک میں مَنْ حَلَقَ وغیرہ تینوں صیغے مذکر ہیں۔ حالانکہ اُس زمانے میں عام طور پر عورتیں ماتم کرتی تھیں۔ بلکہ دُور دُور سے اچھا ماتم کرنے والیوں کو کرائے پر بلایا جاتا تھا اُس وقت یہ کام صرف عورتوں کا تھا۔ مگر نبی کریم کا مذکر کا صیغہ استعمال فرمانا ایک غیبی پیشگوئی ہے۔ کہ آئندہ زمانوں میں مرد بازاروں میں نکل کر ماتم کیا کریں گے تو اسے مسلمانوں سمجھ لینا۔ کہ ہم میں سے نہ ہوں گے۔ لہٰذا یہ حدیثِ مطہرہ صاف صاف شیعوں کے ماتم کی طرف اشارہ فرما رہی ہے :۔ اس لیے کہ آج کل بجز شیعوں کے کوئی بھی مرد ماتم نہیں کرتا۔ نہ دورِ صحابہ کرام بلکہ نہ دورِ جہالت میں کبھی مردوں نے ماتم کیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے کبھی کسی مرد سے اس بات پر بیعت نہ لی۔ کہ تو آئندہ ماتم نہ کرنا۔ بخلاف عورتوں کے اُن کو مسلمان کرتے وقت اس چیز کی بھی بیعت لی جاتی تھی۔ کہ خبردار آئندہ ماتم نہ کرنا۔ چنانچہ ابو داؤد شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۸۴ پر ہے :۔ حَدَّثَنِیْ اُسَیْدُ بْنُ اَبِیْ اُسَیْدٍ عَنْ اِمْرَأَۃٍ مِنَ الْمُبَایِعَاتِ قَالَتْ کَانَ فِیْمَا اَخَذَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فِی الْمَعْرُوْفِ الَّذِیْ اَخَذَ عَلَیْنَا اَنْ لَّا

نُعْصِيَكَ فِيْهِ اَنْ لَّا نَخْمِشَ وَجْهًا وَّلَا نَدْعُوَا وَيْلًا وَّلَا نَشُقَّ جَيْبًا وَّلَا نَنْشُرَ شَعْرًا ؕ [1] ۔ (ترجمہ)۔ اسید بن ابی اسید نے حدیث بیان فرمائی۔ کہ بیعت کی ہوئی عورتوں رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُنَّ میں سے ایک عورت بی بی صاحبہ رضی اللہ تعالٰی عنہا نے روایت فرمائی، کہ جن اچھی باتوں کی بیعت نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم ہم سے لیتے تھے! انہیں یہ کہ پھر آئندہ نافرمانی ہم نہ کریں۔ یہ باتیں بھی تھیں۔ کہ مصیبت میں چہروں کو زخمی نہ کریں۔ اور نہ یا فلاں ہائے فلاں کہہ کر واویلا کریں اور نہ گریبان پھاڑیں اور نہ بال نوچیں۔ یہاں عورتوں کے ماتم کا ذکر ہے۔ کہ آئندہ ایسا نہ کرنا کیونکہ وہ پہلے کرتی تھیں۔ مردوں کے متعلق ماتم کی ایک اور روایت ہے۔ وہاں بھی بیعت یا وعدہ نہ لیا گیا بلکہ اسی طرح کہ لفظ ہیں۔ جو پہلے گزرے ثابت ہوا۔ کہ مردوں کا ماتم آئندہ ہونا تھا۔ اور وہ ماتم کرنے والے خود کو مسلمان کہا کہتے ہوں گے۔ اِس وجہ سے نبی کریم نے فرمایا۔ کہ لَیْسَ مِنَّا۔ وہ خود جو کچھ کہتے رہیں مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ لَیْسَ مِنَّا وہ ہم میں سے نہ ہوگا یا اب ہم میں وہ لوگ نہیں ہیں۔ بلکہ آئندہ پیدا ہوں گے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص۱۵۰ پہ ہے۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُیُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَی الْجَاهِلِيَّةِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ؕ [2] (ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ فرمایا آقائے دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جو مرد اپنے منہ پر چپیت مارے اور گریبان پھاڑے۔ اور جاہلیت کی باتیں کرے۔ وہ ہم میں سے نہیں۔ یہ حدیثِ پاک بخاری شریف اور مسلم شریف میں بھی ہے اسی روایت شریفہ میں آئندہ ہونے والے شیعہ ماتموں کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ سوائے شیعوں کے کسی مرد کو ماتم کرتے کسی موت پر نہ اپنوں کی اور نہ غیر کی۔ کبھی نہ دیکھا مسلمانوں کو تو درکنار کافر مرد بھی اس طرح نہیں کرتے۔ نہ معلوم شیعوں کو کہاں سے ایسی عادت پڑ گئی ماتم ایسی بری چیز ہے۔ کہ اس کی اچھائی نہ قرآن میں نہ حدیث میں نہ اپنوں میں نہ غیروں میں۔ بلکہ ہر طرف برائی سننے میں آئی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا۔ قرآنِ پاک حدیث مبارکہ اور شیعہ کتب سے ثابت کر دیا۔ رہا شیعہ صاحب مذکورہ فی السوال کا ماتم کو جائز کہنا۔ اور سیدنا حسین رضی اللہ تعالٰی عنہ پر سینہ کوبی کو اچھا سمجھنا یہ ان کو اپنی اختراع اور خواہش نفسی ہے یہی وجہ ہے۔ کہ دنیا بھر کے شیعوں کے پاس آج تک کوئی واضح اور صاف مضبوط دلیل میسر نہ ہوئی۔ سوال میں پیش کردہ شیعہ علماء کی تین باتیں ہرگز ان کے ماتم کو ثابت نہیں کرتیں۔

بلکہ اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو ان کے ہی خلاف ہو جاتی ہیں۔ حضرت اویس قرنی کا واقعہ کہ آپ نے اپنے دندان مبارک شہید کر دیئے۔ کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں۔ نہ حدیث پاک میں اِس کا ذکر ہے نہ تاریخ میں۔ علامہ یافعی علیہ الرحمت نے اپنی کتاب روضۃ الریاحین صفحہ نمبر ۸۵ تا صفحہ نمبر ۸۹ پر تحقیق سے حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا ذکر کیا۔ مگر دانتوں کے شہید کرنے کا ذکر قطعاً نہیں ہے۔ اسی طرح محقق اہل سنت علامہ نبہانی نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا تذکرہ اپنی کتاب کراماتِ اولیاء جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۰۲ پر فرمایا۔ مگر اِس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔ بنظرِ تحقیق بھی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ اِس لیے کہ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کا دندانِ مبارک کبھی شہید نہ ہوا۔ جنگِ احد شریف میں آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نیچے والا دائیں طرف سامنے کا ایک دانت مبارک کا صرف کنارہ شہید ہو کر گر گیا تھا۔ باقی سب دانت مبارک اپنی جگہ صحیح و سالم اور قائم رہا تھا۔ ہلاک نہ تھا۔ چنانچہ مدارج النبوت جلد دوم صفحہ نمبر ۱۲۷ پر ہے۔ سنگے بجانبِ حضرت مقدس نبوی فرستاد و برلبِ زیرینِ آں سرور در آمد و دندانِ مبارک پیشین از جانب شکستہ شد۔ ترجمہ:- عتبہ بن ابی وقاص ملعون کافر خبیث نے ایک پتھر پھینکا۔ جو پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے نیچلے ہونٹ مبارک پر لگا۔ جس سے آپ کے نچلے دانت شریف کا ایک جانب سے کنارہ اکھڑ گیا (مدارج ۲/۱۴۷ طبع لکھنو۔)

اسی طرح حاشیہ نمبر ۲ بخاری شریف جلد دوم مطبوعہ نورمحمد دہلی باب مَا اَصَابَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ یَوْمَ اُحُدٍ۔ صفحہ نمبر ۵۸۲ پر ہے:- وَلَمْ یَکُنْ بِاَنَّہٗ مِنْ اَصْلِھَا بَلْ ذَھَبَتْ مِنْھَا فَلْقَۃٌ ط۔ ترجمہ:- آقائے دو عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کا دانت مبارک جڑ سے نہیں ٹوٹا تھا۔ بلکہ نیچے کے ایک دانت شریف کا تھوڑا سا ٹکڑا علیحدہ ہوا تھا۔ اِن عبارات سے ثابت ہوا۔ کہ نبی کریم علیہ التحیہ والثناء کا کوئی دانت مبارک شہید نہ ہوا۔ جب آپ کا کوئی دانت شہید ہی نہ ہوا۔ تو حضرت اویس قرنی نے کیوں دانت اکھیڑے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ کسی محدث مفسر نے یہ بات نہ لکھی۔ ہاں البتہ شیخ فرید الدین عطار علیہ الرحمت نے اپنی تصنیف تذکرۃ الاولیاء مطبوعہ فخر المطابع دہلی باب نمبر ۱۶ پر لکھا ہے۔ پس اویس گفت شما دوستِ محمد اید گفتند بلی گفت اگر در دوستی درست بودہ اید آں روز کہ دندانِ مبارکِ او شکستند۔ شما چرا طریقِ موافقت دندانِ خود نشکستید کہ شرطِ موافقت است۔ و دندانِ خود بنمود۔ ہمہ دندان شکستہ بود۔ ترجمہ:- اویس نے کہا۔ کیا تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست ہو۔ حضرت فاروق اعظم اور علی المرتضٰی نے

فرمایا ہاں۔ تو حضرت اویس نے کہا۔ کہ تم اگر دوستی میں درست ہو۔ تو اُس دن جب کہ اُن کے دانت مبارک ٹوٹے تھے۔ تم نے اپنے دانت کیوں نہ توڑ لیے۔ دوستی کی بنا پر کیونکہ یہ تو مطابقت کی شرط ہے۔ اور پھر اویس قرنی نے اپنے دانت دکھائے۔ تمام ٹوٹے ہوئے ہوئے۔ (خالی منہ تھا) یہ تھی شیخ فرید الدین کی عبارت مگر مجھ کو یہ دو۲ وجہ سے قابلِ قبول نہیں پہلی وجہ یہ ہے۔ کہ اس عبارت کی روش میں توہینِ صحابہ کرام ہے۔ اور مغروریت کی جھلک ہے دانت توڑنے کوئی فرض یا واجب نہ تھے۔ تو بھلا اویس قرنی ایک مجذوبانہ فعل کی بنا پر اولوالعزم جان نثار صحابہ کی دوستی اور عشقِ مصطفےٰ پر کس طرح طعن کر سکتے تھے۔ صحابہ کرام کی اتنی بڑی بڑی قربانیوں کو پسِ پشت ڈال کر اپنے صرف دانت توڑنے کو بجائے حقِ غلامی سمجھنے کے دوستی کا معیار بنا رہے ہیں۔ ایسی بات کا اظہار کرنا متکبرانہ چال میں شمار ہو سکتی ہے۔ اور تمام صحابہ پر بلکہ خود علی شیرِ خدا پر بھی طعنے بازی کا دروازہ کھول رہی ہے۔ بھلا اویسِ قرنی سے ایسی بے ادبی کیسے سرزد ہو سکتی ہے حضرت اویس تو صحابہ کرام کے باادب تھے۔ بلکہ جب حضرت فاروق و علی مرتضےٰ ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ تو آپ نے اپنی نماز چھوٹی کر دی۔ اور ایک دم باادب کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ روضۃ الریاحین صفحہ نمبر ۸۶ پر ہے:۔ فَاسْتَوٰى اُوَيْسٌ قَائِمًا وَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَمِيْرَالْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ (ترجمہ) دونوں بزرگوں کو دیکھ کر حضرت اویس ایک دم باادب کھڑے ہو گئے۔ اور سلام ادب کیا۔ اِس سے ثابت ہوا۔ کہ تذکرۃ الاولیاء کی یہ عبارت غلط ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے:۔ کہ حضرتِ عطار کے تذکرے میں اور بھی بہت غلط باتیں غالباً کسی متعصب نے مخلوط کر دی ہیں۔ اور مخلوط شدہ کتاب پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اُسی تذکرے کے صفحہ نمبر ۵۸ پر رابعہ بصریہ کے حالات میں ایک ایسی غلط عبارت ہے۔ جس سے بارگاہِ رسالت میں رابعہ بصریہ کی طرف سے گستاخی ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے نقلست کہ گفت رسولِ خدا را بخواب دیدم گفت یا رابعہ مرا دوست داری۔ گفتم یا رسول اللہ کے بود کہ ترا دوست ندارد لیکن محبتِ حق مرا چناں فرو گرفتہ است کہ دشمنی و دوستی غیر او را در دلم جائے نماندہ است مترجم:۔ نقل ہے۔ کہ خود رابعہ بصری نے کہا۔ کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو خواب میں دیکھا، نبی پاک نے پوچھا۔ کہ اے رابعہ کیا تو مجھ سے محبت رکھتی ہے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کون ہوگا۔ جو تم کو دوست نہ رکھے۔ لیکن اللہ کی محبت نے مجھ کو اسطرح پکڑا ہے۔ کہ اُس کے غیر کی دوستی یا دشمنی کی میرے دل میں جگہ ہی نہ رہی۔ (اَسْتَغْفِرُ اللهَ نَعُوْذُ بِاللهِ) کیسی گستاخی ہے۔ بھلا رابعہ بصریہ کی کیا مجال کہ آقائے دو عالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایسا تنکا توڑ جواب دیں۔ کہ نڈھال رابعہ

اس آستانے پر ایک نظرِ محبت کی بھیک مانگتی پھرتی ہیں حضرتِ رابعہ کا تو شمار ہی کیا۔ مولانا روم فرماتے ہیں:۔

اے ہزاراں جبرائیل اندر بشر ‌ ‌ ‌ ‌ بہرِ حق سوئے غریباں یک نظر

(ترجمہ):۔ ہزاروں جبرائیل بشکلِ بشریت آستانۂ اقدس پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ کہ اے پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم خدا کے لیے ایک نظرِ محبت ہم غریبوں کی طرف فرمایئے۔ جن کی نظرِ محبت کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمنا کی۔ وہ نبی اکرم جن کی محبت کے بغیر اللہ کی محبت آہی نہیں سکتی۔ اور اور جن کے ادب کے بغیر اللہ تعالیٰ کا ادب آسکے نہ قرآن کا، نہ کعبے کا۔ دیکھ لو۔ نجدیوں کے دل میں نبی پاک کا ادب نہیں ہے۔ اِس لیے اُن کے دل میں نہ خدا کا ادب رہا۔ کہ اُس کو جھوٹ کی تہمت لگا بیٹھے۔ نہ قرآن کا ادب رہا، نہ کعبے کا سعودی عرب میں جاکر تجربہ کر لو۔ کیا حضرتِ رابعہ کو یہ حدیثِ مطہرہ یاد نہ تھی

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ (ترجمہ):۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ کہ اے صحابہ تم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ میں اُس کو ساری مخلوق سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں یہ صحابہ کرام کو خطاب ہے۔ تو دوسرے کس شمار میں یعنی خدا کی محبت تو بڑی اور بعد کی چیز ہے۔ نبی کریم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت کے بغیر تو ایمان بھی نہیں ملتا۔ نبی پاک کی محبت سب سے پہلے قلب میں آتی ہے۔ تب ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کی محبت ایمان کے بعد میسر ہوتی ہے۔ ایک آن بھی اگر کسی کا دل محبتِ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے خالی ہو۔ تو بندہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت کی مثال بالکل ایسی ہے۔ کہ اندھیرے میں چیز ڈھونڈنے کے لیے بتی یا چراغ روشن کیا۔ تو چیز کے مل جانے پر بتی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگرچہ اصل مقصود تو وہ چیز ہی تھی۔ جو مل گئی۔ مگر چیز کو دیکھتے رہنے کے لیے بھی تو چراغ کی حاجت ہے۔ یونہی اصل مقصود تو اللہ کی محبت ہے۔ مگر اُس کو پانے اور پاکر دیکھتے رہنے کے لیے چراغِ محبتِ مصطفےٰ لازم ہے۔ ایک ساعت کے لیے بھی اگر یہ چراغِ محبت بجھایا۔ تو پھر محبتِ حق تعالےٰ کہیں بھی نظر نہ آئے گی۔ اس لیے حضرتِ رابعہ بصریہ عدویہ ہرگز ایسے کلام کا یارا نہیں رکھتیں یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ اور یقیناً کسی بدبخت نے حضرت شیخ عطار کے تذکرے میں یہ ملا دیں کی ہیں جیسے کہ امام غزالی کی تفسیر احسن القصص میں کسی گستاخ نے بہت زیادہ گستاخیاں بھر دی ہیں یہی وجہ ہے کہ محققین کے نزدیک یہ تذکرہ اور تفسیر قابل اعتماد نہیں۔ پس ثابت ہوا۔ کہ حضرت اویس قرنی کے دانت شہید کرنے کا واقعہ تحقیقی طور پر درست

نہیں۔ لیکن اگر تسلیم بھی کر لو کہ یہ واقعہ درست ہے۔ تب بھی اس سے شیعوں کے ماتم پر دلیل نہیں بنائی جا سکتی۔ اوّلاً اس لیے کہ حضرت اویس قرنی کا یہ فعل حالتِ جذب میں ہوگا۔ اور مجذوب کے فعل پر شرعی حکم مرتب نہیں ہو سکتے۔ **دوم :-** اس لیے کہ حضرت اویس قرنی کا یہ فعل محض خون بہانے کیلیے نہ تھی۔ ورنہ وہ بھی کسی جگہ سے خون نکال دیتے۔ بلکہ مقصدِ عشق و محبت یہ تھا۔ کہ جب آقا صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کے دانت مبارک نہ رہے۔ اور آپ کو یہ لذت حاصل نہیں۔ تو میں کیوں اپنے دانت اپنے منہ میں رکھوں۔ یہ دلیل ہے۔ سچے عشقِ رسول کی۔ اس بنا پر اگر شیعوں کو بھی امام عالی مقام؛ سیدنا امام حسین شہیدِ کربلا رضی اللہ تعالٰی عنہ سے سچی محبت ہے۔ تو بجائے سینہ کوٹنے کے اور چھوٹی چھوٹی چھریوں، بلیڈوں سے زخم لگانے کے۔ اسی طرح پوری پوری نقل کریں۔ جیسے کہ اویس قرنی دانتوں کا سن کر اپنے دانت توڑ بیٹھے۔ آپ لوگ شیعہ حضرات امام حسین رضی اللہ تعالٰی عنہ کی گردن کٹنے کا سن کر اپنی گردنیں کاٹا کریں اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ بقولِ شیعہ ثواب زیادہ ملے گا۔ دوسرے یہ کہ دیگر مسلمانوں کو ان کی گستاخیاں اور ان کے تبرّے سننے سے نجات مل جائے گی۔ سائل کے سوال میں شیعوں کی دوسری دلیل بھی غلط ہے۔ کیونکہ حدیث پاک میں مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ ہے۔ لفظ مَنْ عام ہے ہر شخص کے لیے خواہ اپنا غم کرنے والا ہو۔ یا کسی کا۔ خواہ بیٹے بھتیجے کا کرے یا کسی پیر فقیر بزرگ، ولی کا۔ حدیث شریف میں کوئی قید نہیں۔ خود شیعہ بھی اس کو جاہلیت کے ماتم کی طرف نسبت دے رہا ہے۔ حالانکہ دورِ جہالت میں عورتیں بھی صرف اپنوں کو ہی نہیں پیٹتی تھیں۔ بلکہ بعض جگہ بدلہ چکانے کے لیے اور بعض جگہ کرایہ پر بھی پیٹتی تھیں۔ اور یہ پیٹنا ایک فخریہ رواج تھا۔ خود شیعہ کتاب تحفۃ العلوم کا حوالہ پہلے دیا گیا انہوں نے صاف لکھا کہ خواہ اعزہ کے مرنے میں ہو۔ یا غیروں کے ماتم بہرحال حرام ہے۔ مذکورہ فی السوال شیعہ کا اپنے بیٹے بھتیجے کے ماتم کی قید لگانا اس کی اپنی اختراع ہے۔ مذکورہ حدیثِ پاک ہر قسم کے ماتم پیٹنے کوٹنے کو شامل ہے۔ خاص کر موجودہ شیعہ ماتم کی حرمت اِس حدیث مطہرہ سے ثابت ہو رہی ہے مذکورہ فی السوال تیسری بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لیے۔ کہ جہاں تک نعرۂ حیدری، نعرۂ غوثیہ نعرۂ تحقیق اور یا علی یا غوث کا تعلق ہے۔ تو کوئی مسلمان بھی ان کو ناجائز نہیں کہتا۔ اگرچہ بہتر یہ ہے کہ صرف دو ہی نعرے لگانے چاہیئے :- ۱ :- نعرۂ تکبیر : ۲ نعرۂ رسالت :- کیونکہ احادیثِ مشہورہ سے صرف اِن دو نعروں کا ہی ثبوت ملتا ہے۔ باقی نعرے اپنی مرضی سے ہی بنائے گئے ہیں۔ اور یہ نعرے جھنڈوں کی طرح ہر گروہ نے بنائے۔ چنانچہ شیعوں کے

نعرے علیحدہ، دیوبندیوں نے اپنے نعرے علیحدہ بنا لیے۔ تحریکِ ختم نبوت اور دیگر سیاسی جلسے جلوسوں کے لیے وہابیوں، دیوبندیوں نے ہزارہا نعرے بنائے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ پہلے وہابی ہم سے کہا کرتے تھے تم نعرۂ حیدری کا ثبوت دو۔ اب جب ہم نے اُن کے سیاسی نعروں کا ثبوت طلب کیا تو صُمٌّ بُکْمٌ ہوگئے۔ بہر حال نعرہ کیسا ہی ہو۔ اُس کو حرام یا ناجائز نہیں کہا سکتا۔ مگر شیعہ لوگوں کا بوقتِ ماتم یاحسین۔ یاحسین کہنا نہ نعرہ ہے نہ ندا۔ بلکہ نُدبہ ہے لہٰذا اِس کو ہمارے نعرے پر قیاس کرکے جواز کا راستہ نہیں نکالا جاسکتا۔ پس اِن دلائل مذکورہ سے ماتم کی حرمت واضح طور پر ثابت ہوئی۔ خواہ سر پر ماتم کیا جائے یا منہ پر یا سینے پر اور پیٹھ پر۔ حالانکہ یہ ماتم شیعوں کا عظیم الشان بنیادی نشان ہے جس کی کمزوری آپ نے ملاحظہ فرمالی۔ جب بنیاد اتنی کمزور ہے تو باقی عمارت کا خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے۔ بحمدہٖ تعالٰے اس مجموعۂ فتاویٰ میں شیعہ مذہب کی سر سے پیر تک تردید کی گئی۔ یہ سب تحقیقی گفتگو اُس وقت ہے جب یہ شیعہ لوگ غم کی بنا پر ماتم کرتے ہوں۔ لیکن اگر کھیل تماشہ سمجھ کر ماتم کرتے ہوں۔ جیسا کہ شیعہ ماتمی کی اکثریت نیچ قوم ہوتی ہے۔ دِن بھر جوئے بازی، بھنگ چرس و شراب نوشی رہی۔ رات کو مُحِبِّ امام و اہلِ بیت بن کر ماتم کر لیا۔ وضو تک کرنے کا سلیقہ نہیں بوقتِ ماتم مذاق بھی جاری کا ہے۔ پہلا ایسے ماتم کے لیئے شیعہ کتب سے ہی حضرت زینب رضؓ کا خطبہ سنا دیا۔ اور آپ کی بددعا بھی جو یقیناً قبول ہوئی۔ اُس سے بخوبی ماتم کی حیثیت کا پتہ لگایا جاسکتا ہے:۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتبہ

حیاتِ اولیاءُ اللہ کا بیان

سوال ع۲۵ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین و شرعِ متین حسبِ ذیل مسائل کے بارے میں کہ: (۱) دیوبندی وہابی کے پیچھے سنی کی نماز ہوسکتی ہے یا نہیں ؟ (۲) اگر نہیں تو اسکی وجہ کیا ہے (۳) اگر کوئی اہلِ سنت والجماعت کا آدمی کہے کہ ہو جاتی ہے۔ تو اُس کے لیئے کیا حکم ہے۔ براہِ کرم جواب دیں۔ نوازش ہوگی ؟ (۴) بعد از وفات اللہ تعالٰی کے ولی زندہ ہوتے ہیں ؟ (۵) اگر کوئی اُن کو مُردہ کہے۔ تو اُس کے لیئے کیا حکم ہے ؟ (۶) یہ جو تبلیغی جماعت نکلی ہے۔ وہ کس عقیدے کی ہے ؟ (۷) اُن کے ساتھ تبلیغ میں جانا جائز ہے یا نہیں۔ براہِ کرم جواب سے نوازیں۔ نوازش ہوگی:۔

الجواب بعونِ العلّام الوھّاب ۷۸۶

(۱):۔ دیوبندی کے پیچھے سنی کی نماز قطعاً نہیں ہوتی۔ کیونکہ دیوبندی نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے سخت

گستاخ ہیں۔ اور جو شخص نبی پاک صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کا گستاخ ہو۔ اس سے تو بات بھی نہیں کرنی چاہیئے چہ جائے کہ اُس کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔ جب ہم اپنے دشمن سے بات نہیں کرتے۔ اور ناراض رہتے ہیں تو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمْ کے دشمن سے بات کرنا قطعًا گوارہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ مومنوں کے آقا صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کا دشمن اللہ تعالٰی کا دشمن ہے۔ اور اللہ ورسول کا دشمن سب مومنوں کا دشمن ہے۔ کیونکہ مومن وہ ہے جن کی محبت اللہ تعالٰی کے لیئے ہو۔ اور دشمنی اللہ تعالٰی کے لیئے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ ط۔ اور اُس کی نماز تو رسول اکرم کی گستاخی کی بنا پر باطل ہے۔ اگر پڑھانے والے کی نماز باطل ہے۔ تو پڑھنے والے کی کیسے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ نماز اللہ کی امانت ہے۔ اور امانت برے شخص کو دینا منع ہے۔ چنانچہ عالمگیری جلد اوّل باب الامانت میں ہے لَا یَجُوْزُ اَمَانَتُہٗ لِرَجُلٍ الَّذِیْ کَرِہَ الْقَوْمُ مِنْہُ ط۔ (۳) اور جو شخص کہے کہ جائز ہے۔ وہ غلطی پر ہے۔ اس کو چاہیئے۔ کہ مندرجہ بالا جواب نمبر ا کا ملاحظہ کرکے اپنے غلط خیال سے توبہ کرے (۴) بعد وفات کے اللہ تعالٰی کے ولی زندہ ہوتے ہیں۔ باری تعالٰی فرماتا ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ط۔ یعنی جو اللہ تعالٰی کی راہ میں قتل کئے گئے وہ زندہ ہیں۔ مگر تم اتنا شعور ہی نہیں رکھتے۔ یہ آیت کریمہ اللہ تعالٰی کے ہر ولی کو شامل ہے۔ اس کا موضوع باری تعالٰی نے فرمایا ہے۔ پس وضع عام ہے اگرچہ موضوع لہٗ خاص ہے اسلیئے کہ شہید جس کے ٹکڑے ہوگئے جب وہ زندہ تو مقتل عشق میں شہید ہونے والا ولی جو ظاہرًا صحیح سالم دنیا سے گیا بدرجہٗ اولٰی اُس کی زندگی ثابت ہوئی اس لیئے ہر وہ شخص شامل ہے جو اللہ تعالٰی کے راستے میں مارا گیا۔ (۵) جو شخص اُن کو مردہ کہے۔ وہ قرآن پاک کا انکار کرتا ہے اُس کو چاہیئے کہ اپنے باطل عقیدے سے توبہ کرے ورنہ گمراہی کا خطرہ ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق گذشتہ صفحات پر ملاحظہ ہو۔ (۶) جو لوگ مسجدوں میں آکر تبلیغ کرتے ہیں وہ اور چند لوگ ان کے ساتھ کبھی کبھی مل جاتے ہیں۔ یہ جماعت وہابی ہے۔ اُن کا ناظم مولوی الیاس وہابی تھا۔ وہ فوت ہو گیا ہے۔ پہلے پہلے یہ اپنا مذہب ظاہر نہیں کرتے۔ مگر جب کوئی آدمی اُن کے جال میں پھنس جائے۔ تو یہ اُس کو اپنا عقیدہ بناتے ہیں۔ جیسے تمام وہابیوں کا شروع سے پُر فریب طریقہ ہے اُس کے پورے حالات مشہور کتاب بنام تبلیغی جماعت میں دیکھو:۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

مفتی اقتدار احمد خان

کتاب الصوم

ماہ رمضان و عید کے چاند کی ریڈیو خبر کا حکم

سوال نمبر ۳۶ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے۔ ریڈیو کے اعلان پر عید الفطر کر لی جائز ہے۔ کیونکہ ہلال کمیٹی میں یا ریڈیو اسٹیشن پر بولنے والا مسلمان ہی عید کے چاند کا اعلان کرتا ہے، لہٰذا ایسے اعلان پر عمل کرنا بحکم شرعی لازم و ضروری۔ کیونکہ حدیث پاک میں آتا ہے :۔ اَنْتُمْ شُھَدَاءُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ وَالدَّعْوٰی لَا یُسْمَعُ بِلَا شَاھِدٍ ۃ (ترجمہ) :۔ اے قیامت تک کے مسلمانو! تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ دوسری حدیث پاک میں آتا ہے۔ مَا رَاٰہُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَنًا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حَسَنٌ ۔ ۃ (ترجمہ) :۔ جس کو مسلمان ٹھیک سمجھیں۔ وہ اللہ تعالٰے کے نزدیک بھی ٹھیک ہوتا ہے۔ ثابت ہوا کہ عام مخلوق کی زبانوں پر جس کی تصدیق آجاتی ہے۔ وہ درست و برحق ہی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی مشہور روایت ہے۔ کہ اللہ کی مرضی کے بغیر برگ بھی نہیں ہلتا۔ تو یہ اعلان وغیرہ بھی اُس کی مرضی سے ہی ہو رہے ہیں۔ اگر علماء لوگ ریڈیو کی عید نہیں مانتے۔ اور ریڈیو کی نشریات پر یقین نہیں رکھتے۔ تو یہی مولوی ریڈیو سے گھڑیاں کیوں ملاتے ہیں۔ دیکھو حال ہی میں نواب کالا باغ قتل کیا گیا۔ وفات کی خبر ریڈیو سے نشر کی گئی۔ سب نے بیک دم سچ تسلیم کر لیا۔ مولوی صاحبان نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ جب یہ خبر سچی ہو سکتی ہے۔ تو چاند کی خبر بھی سچی ہونی چاہیے۔ چونکہ عید قریب ہے۔ اس لیے روزانہ زید ریڈیو پر بھی اس قسم کی تقریریں کرتا ہے مسلمانوں کو ورغلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بکر کہتا ہے۔ کہ ایک شہر میں چاند کا نظر آنا صرف اُسی شہر کے لیے کافی ہے دوسری بستی والے اپنا روزہ یا عید شروع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہر شہر کے لیے اُس کی اپنی گواہی معتبر ہے۔ اس لیے ہم سب شہر والے آپ کے فتوے کے خواہش مند ہیں :۔

بَیِّنُوْا دَتُؤْجَرُوْا ۃ

سائلان :۔ اہالیان شہر بہاولپور کے متعدد دستخط مورخہ ۵-۲-۱۹۶۳

* * * * * *

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

اَلْجَوَاب

صورتِ مسئولہ میں زید کا قول قطعاً غلط ہے۔ اور اس کے تمام قیاسی دلائل صرف ناسمجھی کی بنا پر ہیں۔ اسی طرح بکر کا قول بھی درست نہیں۔ خیال رہے۔ کہ قانونِ شریعت میں ہر دعوے دار کو گواہی پیش کرنا اشد لازم ہے۔ خواہ کسی طرح کا دعوے ہو۔ چنانچہ علم مناظرہ کی مشہور کتاب۔ صادق علی العضدیہ صفحہ نمبر صـ۱۸ پر ہے:۔ وَالدَّعْوٰی لَا يُسْمَعُ بِلَا شَاهِدٍ ہ (ترجمہ):۔ اور شریعت میں گواہی کے بغیر دعوے نہیں سنا جاتا۔ علمِ اصول کا قاعدۂ کلیہ ہے:۔ لِكُلِّ دَعْوٰی دَلِيْلٌ ؕ (ترجمہ) ہر دعوے کے لیے دلیل لازم ہے۔ اسی لیئے کہ مقصدِ دعوے ثبوت ہے۔ اور ثبوت بغیر دلیل ناممکن ہے، چنانچہ مناظرہ رشیدیہ صفحہ نمبر صـ۱۶ پر ہے:۔ وَالدَّعْوٰی قَضِيَّةٌ يَشْتَمِلُ عَلَى الْحُكْمِ اِشْتِمَالُ الْكُلِّ عَلَى الْجُزْءِ۔ اَلْمَقْصُوْدُ اِثْبَاتُهٗ بِالدَّلِيْلِ ؕ (ترجمہ):۔ دعوے وہ قضیہ ہے۔ جو شامل ہو حکم پر جیسے کہ کل کا جز پر شامل ہونا۔ اور دعوے کا مقصود دلیل سے ثابت کرنا ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ جس دعوے میں گواہی یا کوئی اور دلیل نہ ہو وہ دعوے بیکار ہے۔ اِن قواعد کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ سمجھنا بھی ضروری ہے۔ کہ دُنیا میں بے شمار دعوے ہیں۔ اور تمام دعوے باعتبار نوع جنس فصل مختلف ہیں کثرتِ دعاوی کی بنا پر:۔ اَدِلَّةٌ كَثِيْرَةٌ ط درکار اور قانون میں یہ بھی شرط ہے۔ کہ دلیل مطابق دعوی ہو اس لیئے اہل سنت والجماعت نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالے علیہ وآلہٖ وسلم کے حاضر وناظر، غیب دانی اختیارِ کلی، علم ماکان ومایکون، نور، رحیمیت کریمیت وغیرہ صفاتِ قدسیہ کے قائل ہیں۔ کیونکہ بمطابق قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ ؕ آقائے دو عالم حضورِ اقدس صلے اللہ تعالٰی علیہ والہٖ وسلم دلیلِ خداوندی ہیں۔ چونکہ دعاویِ قدرت بے شمار پس بوجہ قاعدۂ مطابقت دلیل میں یہ صفات ضروری، شریعت کے قانون سے لازم ہوا۔ کہ جیسا دعوے ویسی دلیل ہونی چاہیئے بعض دعوے معمولی اُن کی معمولی دلیل بھی کافی بعض دعوے بہت بڑے اُن کے لیئے دلیل بھی بڑی ہونا ضروری ہے۔ غیر اہم دعوے تھوڑی گواہی سے ثابت ہو جاتے ہیں۔ جتنا اہم دعوے ہوگا۔ اتنا ہی گواہی میں اہتمام۔ اُس کی دلیلیں مضبوط۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں کوئی دعوے ایک گواہ سے ثابت ہو جاتا ہے۔ کوئی دو گواہ سے۔ کوئی ایک عورت سے ہی مکمل ثابت ہو جاتا ہے کوئی چار گواہوں سے۔ کسی دعوے میں دس میں سے کام چلتا ہے۔ اور کوئی پچاس سے۔ کم میں تسلیم نہیں۔ شریعتِ مطہرہ کی اِن باریکیوں کے ہوتے ہوئے تمام دعووں کو ایک ہی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ اور نہ ہی ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جا سکتا ہے مگر زید

مذکورہ آن اصول سے اوجھل ہے۔ زید کا یہ کہنا کہ ریڈیو پر کسی کی موت کی خبر شائع ہو۔ تو بلا چون وچرا تسلیم کر لی جاتی ہے۔ لہٰذا عید کے چاند کا اعلان بھی اسطرح مان لینا چاہیئے۔ قطعاً غلط قیاس ہے۔ اس لیئے کہ اعلانِ موت ایک خبر ہے۔ جس کو محض بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مگر اعلانِ چاند دعوٰے ہے۔ جس کو ثابت اور لازم کرنا مقصود ہے۔ خبر اور دعوے میں اور بھی بہت سے فرق ہیں۔ اعلان تین قسم کے ہوتے ہیں ۱:۔ خبر ۲:۔ دعوٰے ۳:۔ اِشتہار۔ تینوں نوعیتوں میں دینی و دنیوی لحاظ سے بے شمار فرق ہیں۔ پھر فقہ خبر کی دو قسمیں ہیں ۱:۔ خبر اقراری۔ ۲۔ خبر اِطلاعی مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں کے میں نے دو روپے دینے ہیں۔ یہ قول خبر اقراری ہے۔ اِس بات کے کہنے میں حاکم بغیر گواہی کے قائل مقر کے ذمے دو روپے فلاں کے لیئے واجب کردے گا۔ یہاں تحقیق و تفتیش کی چنداں حاجت نہیں۔ ایک اور کہتا ہے۔ آج زید مرگیا یہ کلام خبرِ اِطلاعی ہے یہاں بھی دلائل اور گواہی کی ضرورت نہیں۔ ایک تیسرا آدمی کہتا ہے۔ کہ فلاں شخص نے میرے دو روپے دینے ہیں۔ یہ جملہ دعوٰے ہے۔ کیونکہ یہاں لزوم بھی ہے اور ثبوت دینا بھی۔ لہٰذا یہ بات بغیر گواہی اور دلائل قابلِ تسلیم نہ ہوگی۔ فی زمانہ ریڈیو سے یا خبریں نشر ہوتی ہیں۔ یا اشتہارات۔ اسی لیئے یہ تو کہا جاتا ہے۔ کہ ریڈیو پاکستان سے خبریں سنیئے۔ یہ کبھی نہیں کہا جاتا۔ کہ دعوے سنیئے۔ نحوی قاعدے کے مطابق خبر کو ماننا نہ ماننا ہر دو جائز ہیں۔ کیونکہ جملہ خبریہ میں سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ پس چونکہ ریڈیو کے اعلانات اکثر خبریں ہیں۔ پس اس کا ماننا واجب نہیں۔ بلکہ بزمانۂ جنگ دشمن کی خبروں کو سننا بھی نقصان دِہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اکثر جھوٹی ہوتی ہیں۔ جیسے کہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں۔ بی۔ بی۔ سی لندن نے خبر دی تھی۔ کہ بھارت نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ یہ بالکل کھلا جھوٹ تھا۔ اس کو زید نے بھی تسلیم نہ کیا ہوگا۔ پس جان لو۔ کہ چاند کا اعلان خبر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ رویتِ ہلال قانونِ شرعی سے ایک دعوٰے ہے۔ اگر اِس کو بطورِ خبر نشر کیا جائے۔ تو ہرگز قبول نہ ہوگا۔

چونکہ شریعتِ پاک میں چاند کے دیکھنے پر عباداتِ الٰہیہ کا دار و مدار ہے۔ یہاں تک کہ اسلام کے تمام تیوہار، ریاضات و عبادات اسی چاند کے حساب سے وابستہ ہیں۔ اِس لیئے چاند کا دعوٰی شریعت میں بہت عظیم دعوٰے ہے۔ اس بنا پر فقہائے کرام نے ماہِ رمضان اور عیدین کے چاند کے ثبوت کے لیئے چار صورتیں بیان فرمائی۔ پہلی:۔ شہادت۔ دوم:۔ حکایت۔ سوم:۔ خبر۔ چہارم:۔ خبر مستفیض

پہلی صورت چاند کی گواہی اس میں شریعت کی بہت قیدیں ہیں۔ اگر ہلالِ رمضان دیکھتے وقت جانبِ مغرب غبار تھا۔ تو ایک متقی مسلمان کی گواہی کافی ہے۔ چنانچہ فتاوٰے عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۹۷ پر ہے:۔ اِنْ كَانَ بِالسَّمَآءِ عِلَّةٌ فَشَهَادَةُ الْوَاحِدِ عَلٰى هِلَالِ

رَمَضَانَ مَقْبُوْلَۃٌ اِذَا کَانَ عَدْلاً مُسْلِماً ۔ (ترجمہ) :۔ اگر آسمان میں بادل کا غبار ہو۔ تو ایک شخص کی گواہی ماہِ رمضان کے چاند میں قبول ہے۔ جب کہ وہ شخص متقی، عادل مسلمان ہو۔ فتاوٰے فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۵۹ پر ہے :۔ وَتُشْتَرَطُ الْعَدَالَۃُ لِاَنَّ قَوْلَ الْفَاسِقِ فِی الدِّیَانَاتِ غَیْرُ مَقْبُوْلٍ ۔ (ترجمہ) :۔ گواہی میں متقی ہونا ضروری واجب ہے۔ اس لیے کہ فاسق فاجر کی بات دیانت داری میں معتبر نہیں ہے۔ لیکن مطلع صاف ہو۔ تو کثیر جماعت کی گواہی سے چاند کو مانا جائے گا۔ چنانچہ فتاوٰے عنایہ علی الہدایہ جلد دوم صفحہ نمبر ۶۰ پر ہے :۔ وَاِذَا لَمْ تَکُنْ بِالسَّمَآءِ عِلَّۃٌ لَمْ تُقْبَلِ الشَّہَادَۃُ حَتّٰی یَرَاہُ جَمْعٌ کَثِیْرٌ یَقَعُ الْعِلْمُ بِخَبَرِہِمْ ۔ (ترجمہ) :۔ اور جب آسمان میں غبار نہ ہو گا۔ تو گواہی قبول نہ ہو گی۔ یہاں تک کہ بڑی جماعت چاند دیکھے جن کے خبر دینے پر یقین ہوتا ہے۔ یہ تھی ماہِ رمضان کی صورتیں عید الاضحٰی اور عید الفطر کے چاند پر اگر غبار ہو۔ تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں متقیہ گواہی دیں۔ فتح القدیر صفحہ نمبر ۱۶۱ پر اس طرح لکھا ہے۔ کہ اگر رویتِ ہلالِ عیدین میں مطلع صاف ہو۔ تو جماعتِ کثیرہ کی گواہی پر ہی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ قاضی، جج، یا مفتیِ اسلام اس طرح گواہی لے کر چاند کے ہونے کا حکم جاری کر سکتا ہے۔ شریعت کا یہ قانون حکام کے لیے ہے۔ لیکن عوام حاکم کے اِس شرعی فیصلے پر عمل کریں۔ ہر شخص کو علیحدہ گواہی لینے کی ضرورت نہیں رویتِ ہلال کی دوسری صورت ہے حکایت :۔ اس کی شکل یہ ہے۔ کہ کوئی یہ کہے فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھ لیا۔ یا ریڈیو، اخبارات میں نشر کریں۔ کہ فلاں شہر چاند ہو گیا۔ اور وہاں کے غیر معیّن لوگوں کے بارے میں کہا جائے۔ کہ اس ملک کے باشندوں نے چاند دیکھ لیا۔ یا کہا جائے۔ کہ فلاں ملک کے لوگ روزہ رکھ رہے ہیں۔ یا عید کر رہے ہیں۔ یہ نہ پتہ لگے کہ اُن کو کس نے روزہ رکھنے یا عید کرنے کا حکم دیا۔ نہ یہ معلوم ہو سکے۔ کہ اُن لوگوں سے کس طرح گواہی لی گئی یا دی گئی۔ جیسا کہ ہر سال اخباروں میں اطلاع آ جاتی ہے۔ کہ آج افغانستان میں چاند نظر آ گیا۔ انہوں نے روزہ رکھ لیا۔ یہ سب خبریں حکایت چاند ہیں۔ شریعتِ مطہرہ اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتی دوسرے ملک یا شہر والے اس پر قطعاً عمل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ شہر بالکل قریب ہوں۔ مثلاً پاکستانی سرحد، تورخم والے یا لنڈی کوتل والے، افغانستان والوں کو عید کرتے دیکھیں۔ یا روزۂ رمضان رکھتے دیکھیں۔ تو ان کو جائز نہیں۔ کہ یہ عید کریں۔ یا روزہ فرضی شروع کر دیں۔ کیونکہ یہ دیکھنا اور سننا۔ حکایتِ ہلال ہے اسلامی قانون میں اس کا بالکل اعتبار نہیں۔ چنانچہ فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۲۲۸ پر ہے :۔ لَا لَوْ شَہِدُوْا بِرُؤْیَۃِ غَیْرِہِمْ لِاَنَّہٗ حِکَایَۃٌ ۔ دُرِّ مختار میں ہے :۔ فَاِنَّہُمْ لَمْ یَشْہَدُوْا بِالرُّؤْیَۃِ وَلَا عَلٰی شَہَادَۃِ غَیْرِہِمْ وَاِنَّمَا حَکَوْا

رُؤْیَۃَ غَیْرِھِمْ ط (ترجمہ) نہیں معتبر اگر گواہی دی لوگوں نے اپنے غیروں کے دیکھنے کی اس لیے کہ یہ فقط حکایت ہے۔ نہ کہ گواہی شرعی۔ کیونکہ اُن لوگوں نے گواہی نہ دی چاند دیکھنے کی اور نہ ہی دوسروں کے دیکھنے کی گواہی دی۔ بلکہ فقط دوسروں کے دیکھنے کی حکایت کی ہے۔ اِس عبارت سے ثابت ہوا۔ کہ چاند دیکھنے کی حکایت پر چاند کا حکم جاری نہیں ہو سکتا۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں۔ اگر یہ بھی معلوم ہو جائے۔ کہ اس دوسرے ملک کے لوگوں کو وہاں کے بادشاہ یا حاکم نے عید وغیرہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ تب بھی باقی مسلمانوں کے لیے قابلِ عمل نہیں ہے۔ چنانچہ ردّ المحتار جلد دوم صفحہ نمبر ۲۲۱ پر ہے:۔ وَاِنْ قَاضِیَ تِلْکَ الْمِصْرِ اَمَرَ النَّاسَ بِصَوْمِ رَمَضَانَ لِاَنَّہٗ حِکَایَۃٌ لِفِعْلِ الْقَاضِیْ اَیْضًا وَلَیْسَ بِحُجَّۃٍ ط (ترجمہ) اور بے شک یہ پتہ لگا۔ کہ دوسرے شہر کے حاکم نے لوگوں کو فرضی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ تب بھی غیروں کے لیے عمل جائز نہیں۔ اس لیے کہ یہ بھی قاضی حاکم کے فعل کی محض حکایت ہے اور حکایت دلیل شرعی نہیں ہو سکتی۔ ریڈیو وغیرہ کے اعلانات بالکل اسی نوعیت کی حکایات ہوتے ہیں۔ زید نے اُس پر دلیل چاند قائم کر لی۔ اور شرعی گواہی سمجھ لیا۔ یہ سراسر ناسمجھی ہے۔ اسلام واقعی بہت آسان ہے مگر اِس کو سمجھنے کے لیے عقلِ سلیم چاہیے۔ شہادت و حکایت کا یہ عمیق فرق یاد رکھنا لازم ہے۔ تیسری صورت خبر ہے۔ اِس کا طریقہ اِس طرح ہوتا ہے۔ کہ جس علاقے میں کوئی حاکم یا قاضی یا مفتی نہ ہو۔ وہاں کے باشندے شہر سے گولوں کی آواز سنیں۔ یا عید کے چراغاں کو دیکھیں۔ یا دف کی آواز سنیں۔ پوچھنے پر اُن کو کوئی بتائے کہ شہر میں چاند ہونے کا اعلان ہے خود ان دیہاتیوں نے چاند دیکھا ہو۔ یا نہ ہو۔ اس اعلان کا حکم اُن پر بھی جاری ہوگا۔ اس لیے اُن پر بھی روزہ یا عید لازم ہوگا۔ کیونکہ یہ خبرِ چاند ہے۔ جس کا شریعت میں اعتماد ہے:۔

چنانچہ فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۲۲۵ پر ہے:۔ وَالظَّاھِرُ اَنَّہٗ یَلْزَمُ اَھْلَ الْقُرٰی الصَّوْمُ بِسَمَاعِ الْمَدَافِعِ وَرُؤْیَۃِ الْقَنَادِیْلِ مِنَ الْمِصْرِ لِاَنَّہٗ عَلَامَۃٌ تُفِیْدُ غَلَبَۃَ الظَّنِّ وَغَلَبَۃُ الظَّنِّ حُجَّۃٌ مُوْجِبَۃٌ لِلْعَمَلِ ط (ترجمہ):۔ اور ظاہر یہ ہے۔ کہ لازم ہوتا ہے۔ گاؤں والوں پر روزہ۔ چراغاں اور ڈھول کی آواز سے جو شہر سے آئے۔ اس لیے کہ یہ ایسی نشانی ہے۔ جو غلبۂ ظن کا فائدہ دیتا ہے۔ اور غالب گمان دلیلِ شرعی ہے۔ جس پر عمل واجب ہے۔ تنویر الابصار جلدِ دوم صفحہ نمبر ۲۲۵ پر ہے:۔ لَوْکَانَ بِبَلْدَۃٍ لَاحَاکِمَ فِیْھَا صَامُوْا بِقَوْلِ ثِقَۃٍ وَاَفْطَرُوْا بِاَخْبَارِ عَدْلَیْنِ:۔ (ترجمہ):۔ اس بستی کے باشندے جہاں حاکم نہ ہو۔ وہ شہر سے متعلق ایک متقی مسلمان کی بات پر عمل کرتے ہوئے فرضی روزہ رکھ لیں۔ اور دو متقی مسلمانوں کی خبر پر عید کریں۔ لہٰذا اگر شہر میں چاند

نظر آجائے۔ اور مفتی اسلام یا حاکم وقت شرعی طریقے پر گواہی لے کر عید یا ماہِ رمضان کا فیصلہ کر دے۔ تو اردگرد کی تمام بستیوں کو بھی یہ فیصلہ ماننا پڑے گا۔ کہ یہ خبر ہے۔ اور اس میں غلبہ ظن سے پتہ لگ جاتا ہے۔ کہ ہمارے قاضی یا جج نے شرعی فیصلہ کیا ہے۔ بخلاف دیگر ملکی خبروں کے کہ وہاں شرعی فیصلے کا پتہ لگانا محال ہوتا ہے رویت ہلال کی چوتھی قسم خبر مستفیض کہلاتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے۔ کہ ملک کا سربراہ بادشاہ۔ یا وزیر اعظم یا حاکم اسلام کسی مفتی یا قاضی یا علماء کی جماعت کو اس بات پر مقرر کرے۔ کہ وہ لوگوں سے چاند دیکھنے کی گواہی لے کر شریعتِ مطہرہ مقدسہ کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اور پھر وضاحت کے ساتھ خود بادشاہ یا مفتی اسلام اپنے ذرائع سے شہر یا ملک بھر میں ان لفظوں سے اعلان کر دے۔ کہ شریعت کے مطابق گواہی لے کر چاند دیکھنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ اور اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ صبح روزہ یا عید ہے۔ یہ اعلان ملک بھر میں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہے۔ ایسے اعلان کو شریعت کی زبان میں خبر مستفیض کہا جاتا ہے۔ شریعت میں قابلِ قبول ہے۔ یہاں تک کہ ایک شہر کے قاضی کے شرعی فیصلہ پر دوسرے شہر یا ملک کا قاضی بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ جب کہ حتمی طور پر ثابت ہو جائے۔ کہ اس قاضی نے شریعتِ پاک کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ خود اس دوسرے قاضی کو از سرِ نو گواہی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ردالمحتار جلد دوم کے صفحہ نمبر ۱۲۸ پر فرماتے ہیں شهدوا انه شهد عند القاضي مصر كذا شاهدان برؤية الهلال في ليلة كذا وقضى القاضي به ووجد استجماع شرائط الدعوى قضى اى جاز لهذا القاضي ان يحكم بشهادتهما لان قضاء القاضي حجة وقد شهدوا به (ترجمہ)۔ چند متقیوں نے گواہی دی۔ کہ فلاں شہر کے قاضی کے پاس دو گواہوں نے گواہی دی۔ چاند دیکھنے کی کسی رات میں اور قاضی نے اس پر عید وغیرہ کا فیصلہ بھی کر دیا ہے۔ اور گواہوں میں شریعت کی سب شرطیں بھی پائی جاتی تھیں۔ ان متقیوں کی یہ بات سن کر اس قاضی نے عید وغیرہ کا فیصلہ کر دیا۔ تو اس شرعی گواہی کی وجہ سے یہ دوسرے قاضی کو فیصلہ بھی جائز ہے اس لیے کہ پہلے قاضی کا فیصلہ اس کے لیے دلیل شرعی ہے۔ اور پہلے فیصلہ کی گواہی تو متقیوں نے دی فتاویٰ تنویر متن در مختار جلد دوم صفحہ نمبر ۱۲۸ پر ہے۔ لَوْ اسْتَفَاضَ الْخَبَرُ فِي الْبَلْدَةِ الْأُخْرَى لَزِمَهُمْ عَلَى الصَّحِيحِ (ترجمہ)۔ اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں چاند کے فیصلے کی خبر پہنچی۔ تو اس کو بھی تسلیم کرنا لازم ہے۔ یہی صحیح مسلک ہے۔ اس قانون کی شرح میں علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ جس شہر میں بھی حاکم اسلام شریعت کے مطابق رویتِ ہلال کا فیصلہ کر دے تو دیگر تمام جگہ ہر قاضی مفتی و عوام کو یہ فیصلہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ جن جن لوگوں کو اس فیصلے کی حقانیت کا علم ہو جائے گا۔

اُن کو علیحدہ تحقیق وتفتیش کرنے کی حاجت نہیں۔ بلکہ اس ایک قاضی کے شرعی فیصلہ پر عمل واجب ہے۔ اِس لیے کہ یہ خبرِ مستفیض ہے۔ موجودہ وقت میں حکومت کی جانب سے ریڈیو سے فقط یہ اعلان ہوتا ہے۔ کہ فلاں جگہ چاند نظر آگیا ہے۔ لہٰذا صبح عید ہے۔ اس بات کو شریعت نہیں مانتی یہی وجہ ہے کہ ہر سال علماءِ کرام حکومت سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور ایک محاذ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ جو داخلی امور کے علاوہ خارجی سیاست میں بھی نقصان دہ ہے۔ اگر حکومت عید و رمضان جیسے دینی معاملے واقعۃً پُر خلوص ہے۔ تو اُس کو چاہیئے۔ کہ عید و چاند کے اعلانات میں خبرِ مستفیض کی صورت پیدا کرے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ مقرر کردہ ہلال کمیٹی میں صرف علماءِ کرام کو شامل کیا جائے۔ جو مذہبی تحقیق کے ساتھ ساتھ پُر خلوص بھی ہوں۔ وہ علماء یا خود چاند دیکھیں۔ یا جانفشانی کے ساتھ شرعی گواہی حاصل کریں۔ پھر فیصلہ کریں۔ اور تفصیل وار اُس فیصلے کا اعلان کریں۔ تاکہ دیگر علماء کو شک وشبہ نہ رہے۔ اور ریڈیو پر یہ بھی بتایا جائے۔ کہ ہلال کمیٹی میں اتنے علماء اور اہلِ فتوےٰ نے حصہ لیا ہے۔ اِس طرح سے شرعی اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس قسم کا اعلان ہر مسلمان کے لیئے قابلِ قبول اور واجب العمل ہے۔ اسی خبرِ مستفیض کے لیئے فقہاءِ کرام نے فرمایا۔ کہ اگر مغرب کے بعید ترین علاقے میں چاند نظر آجائے۔ تو مشرق والوں پر عمل کرنا واجب ہے۔ چنانچہ فتاوےٰ تنویر الابصار جلد دوم صفحہ نمبر ص ۱۳۲ پر ہے :۔ فَیَلْزِمُ اَھْلَ الشَّرْقِ بِرُؤْیَۃِ اَھْلِ الْمَغْرِبِ اِذَا اُثْبِتَتْ عِنْدَھُمْ رُؤْیَۃُ اُولٰئِکَ بِطَرِیْقٍ مُوْجِبٍ ؕ (ترجمہ) :۔ مشرق والوں پر عمل کرنا لازم ہے۔ جب کہ موجبِ شرعی طریقے سے مغربی لوگوں کا چاند دیکھنا ثابت ہو جائے۔ یعنی مشرقی لوگوں کو پتہ لگنا شرط ہے۔ اِسی لیئے عبارت میں عِنْدَھُمْ کی قید ہے۔ اگر مغرب میں چاند کا شرعی فیصلہ ہوا ہو۔ لیکن مشرق والوں کو اس کا علم نہ ہو۔ صرف فیصلے کا پتہ لگے۔ تب بھی ہرگز اُن پر قابلِ قبول نہ ہوگا۔ لہٰذا افغانستان۔ سعودی عرب کے اعلانات پر ہم اہلِ پاکستان عمل نہیں کر سکتے۔ اس لیئے کہ ہم کو نہیں معلوم۔ کہ وہ لوگ کس طرح فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بلکہ بادیُ النظر میں اُن کے فیصلے معیارِ شریعت سے غلط ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ سعودی عرب میں چاند کا اعلان ہمیشہ اکہری رات کو ہوتا ہے۔ اور رمضان و عیدین کا بھی اُنتیس تاریخ کو ہمیشہ اعلان ہوتا ہے۔ حالانکہ اَلشَّھْرُ ھٰکَذَا والی روایت سے تیس و اُنتیس ہر دو کا ثبوت و تجربہ ہے۔ بہر حال قانونِ شریعت کے مطابق خبرِ مستفیض ساری دنیا کے لیئے معتبر ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ دو طریقے پر عید یا رمضان کا فیصلہ ہو سکتا ہے یا

شرعی گواہی۔ یا خبرِ مستفیض۔ شامی جلد دوم صفحہ نمبر ص۱۳۲ پر ہے :۔ اَوْ یَشْھَدُ عَلٰی حُکْمِ الْقَاضِیْ اَوْ یَسْتَفِیْضُ الْخَبَرُ مطلب (ترجمہ) یا دو متقی مسلمان فیصلہِ رویت ہلال کی گواہی دیں۔ یا خبرِ مستفیض حاصل ہو۔ اگر ہماری ہلال کمیٹی اپنے اعلان کو خبرِ مستفیض بنائے تو یقیناً سب سالانہ اختلافات ختم ہو جائیں فی الحال اعلانات کے بارے زید کا قول غلط ہے۔ اِسی طرح بکر کی بات بھی کہ ایک شہر کا اعلان دوسرے شہر کے لیئے قبول نہیں۔ غلط ہے۔ کیونکہ حکایتِ ہلال تو اُس شہر کے لیئے بھی معتبر نہیں۔ اور خبرِ مستفیض ساری دنیا کے لیئے معتبر۔ جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا :۔

خلاصہ :۔ یہ کہ رؤیت ہلال کی چار صورتوں میں تین صورتیں شرعاً معتبر ہیں۔ اور ایک صورت حکایتِ چاند غیر معتبر۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

ٹیکہ

ٹیکہ لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال نمبر ۳۷ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ایک بیمار شخص ماہ رمضان میں روزہ رکھ کر کسی قسم کا ٹیکہ لگوا سکتا ہے۔ یا نہیں۔ اور تندرست آدمی حج پر جانے کی وجہ سے ٹیکہ لگوا سکتا ہے، یا نہیں رمضان مبارک میں سفر کی تیاری ہے۔ قانونی طور پر ٹیکہ لگوانا لازمی ہے۔ اور روزہ رکھنا بھی فرض ہے۔ اور بعض لوگوں نے شک ڈالا ہے۔ کہ ٹیکے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ٹیکہ دو قسم کا ہے :۔ ۱ :۔ وہ جو کہ گوشت میں لگایا جاتا ہے اور ۲ :۔ دوسری قسم کا ٹیکہ رگ میں لگایا جاتا ہے۔ اور اُن دونوں کا حکم بیان فرمایا جائے۔ نیز فرمایا جائے۔ کہ اگر روزہ ٹوٹ جائے۔ تو کیا صرف ایک روزے کی قضاء لازم ہو گی۔ یا ساٹھ روزے کفارے کے بھی واجب ہوں گے

بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا

سائل :۔ محمد شفیع دیوبندی محلہ شیخ بھاٹہ راولپنڈی۔ مورخہ ۔ ۲-۱۹۷ - ۸ - ۷

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ ط

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق کسی قسم کا ٹیکہ لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگرچہ گلوکوز کا ٹیکہ لگوایا جائے۔ اِس لیئے کہ تمام ٹیکے دو ہی طرح لگوائے جاتے ہیں۔ یا گوشت میں یا رگ میں۔ اور گوشت یا کسی رگ میں ٹیکہ لگوانے سے روزہ قطعاً نہیں ٹوٹتا۔ اگرچہ ٹیکہ لگانے سے بھوک اور

پیاس بھی ختم ہو جائے۔ ہاں بلاواسطہ پیٹ میں یا دماغ میں ٹیکہ لگایا گیا۔ تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ فقہاء کرام نے ہر چیز میں فقہ اسلامی سے قواعد کلیہ مقرر فرمائے ہیں۔ جزئیات اُن ہی کلیات سے مستنبط ہوتی ہیں۔ مثلاً فقہاء کرام نے قرآن کریم وحدیث مطہرہ کے استنباط سے ایک قاعدہ کلیہ وضع فرمایا۔ کہ انقلاب، حقیقت سے حکم بدل جاتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰے فتح القدیر جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۳۹ اور شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۰۹ اور درمختار جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۹۱ پر مجتہدین کرام نے کچھ جزئیات بیان فرما کر ارشاد فرمایا:۔ فَاِنَّ ذَالِکَ کُلَّہٗ اِنْقِلَابُ حَقِیْقَۃٍ اِلٰی حَقِیْقَۃٍ اُخْرٰی (ترجمہ):۔ یہ تمام جزئی تبدیلیاں انقلابِ حقیقت کی بنا پر ہیں۔ یہ مندرجہ بالا عبارت شامی باب الانجاس کی ہے۔ یہ ہے فقہاء کا مقرر کردہ قانونِ کلیہ۔ اب اِسی قانون کے تحت ہزارہا جزئی مسائل نکلتے چلے جائیں گے۔ کچھ تو خود کتبِ فقہ میں مرقوم ہیں۔ جیسے کہ فرمایا گیا۔ بھسا ہوا سالن روٹی وغیرہ ناپاک ہے۔ کیونکہ مطبوخ چیز جب بھس جائے اور بدبو والی ہو جائے۔ تو حقیقت بدل گئی۔ اور حقیقت کے بدلنے سے شی کا حکم بدل گیا۔ لہٰذا سالن پہلے پاک تھا۔ اب ناپاک ہو گیا۔ اور ناپاک شی کا کھانا حرام۔ پس بدبودار بھسے ہوئے کھانے کو کھانا حرام ہے۔ چنانچہ فتاوٰے عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۳۹ پر ہے۔ وَاللَّحْمُ اِذَا اَنْتَنَ یَحْرُمُ اَکْلُہٗ۔ (ترجمہ):۔ اور سالن جب بھس جائے۔ تو اُس کو کھانا حرام ہے۔ اِسی کے صفحہ نمبر ۲۸۹ پر ہے:۔ یَتَغَیَّرُ لَحْمُہَا وَیَنْتَنُ فَیُکْرَہُ اَکْلُہٗ کَالطَّعَامِ الْمُنْتِنِ۔ (ترجمہ):۔ گوشت متغیر ہو گیا۔ اور بدبو چھوڑ گیا۔ تو اُس کا کھانا مکروہ تحریمی ہے۔ جیسے کہ بدبودار طعام کھانا مکروہ تحریمی ہے۔ یہ تھا ایک جزئی حکم جس کو کتبِ فقہ میں اسی قاعدۂ کلیہ کے تحت درج کیا گیا۔ اسی طرح دوسرا جزئی مسئلہ علامہ کمال الدین محمد رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اپنے فتاوٰے فتح القدیر جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۳۹ پر لکھا۔ کہ اگر شیرہ شراب بن گیا۔ تو ناپاک ہو گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے وَالْعَصِیْرُ طَاہِرٌ فَیَصِیْرُ خَمْرًا فَیَنْجُسُ۔ (ترجمہ):۔ جب پاک شیرہ شراب بن جائے تو ناپاک ہو جائیگا۔ یہ جزئی حکم بھی اسی قاعدۂ کلیہ کے تحت ہے۔ اسی طرح اور بھی کچھ جزئیات مختلفہ مرقوم ہیں۔ مگر سب جزئیات نہ درج ہو سکتی ہیں۔ نہ ضروری ہے۔ یہ کام مفتیٔ اسلام کا ہے۔ کہ مختلف جزئی چیزوں کا حکم اُسی کلی قاعدے کے تحت قیاساً بوقتِ استفسار جاری کرے چنانچہ فتوے شرعی کی رُو سے گندا انڈہ حرام ہے۔ کیونکہ انقلابِ حقیقت ہے۔ اور ہر انسان و چوپائے کا بول و براز پلید ہے۔ کیونکہ بدبودار ہے۔ اور غیر بدبو والی چیز میں بو پیدا ہونا انقلابِ حقیقت ہے۔ روٹی بدبو والی نہیں ہے تو پاک ہے۔ جب معدے میں پہنچی۔ تو براز بن گئی

بدبو پیدا ہوئی۔ تو پلید ہوئی۔ یہی حال پیشاب کا ہے۔ پانی تھا۔ بدبو نہ تھی۔ تو پاک تھا اور پاک رہا جب مسامات میں گیا۔ پیشاب بنا۔ جب نکلا تو بدبودار تھا اس لیے بوجہ انقلابِ حقیقت ناپاک ہوا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک حلال چوپایوں کا پیشاب ناپاک ہے۔ مگر شوافع وغیرہ کا اس کو پاک ماننا۔ اپنے ہی قاعدۂ کلیہ کی خلاف ورزی ہے۔ اس لیے کہ یہ مندرجہ بالا قاعدہ انقلابِ حقیقت متفقہ کلیہ ہے۔ مزید یہ بھی ثابت ہو چکا۔ کہ شئی میں بدبو پیدا ہونا حقیقت کی تبدیلی ہے۔ اور ہر انسان جانور، چرندہ، پرندہ، کے پیشاب میں بھی بدبو ضروری ہوتی ہے۔ خواہ وہ ذی روح چھوٹا ہو یا بڑا، شیرخوار ہو یا نان خوار، یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ بدبو تھوڑی ہو یا زیادہ بہر حال ہوتی ضرور ہے۔ وہابیوں کا یہ کہنا۔ کہ شیرخوار بچے کے پیشاب میں بدبو نہیں ہوتی غلط ہے۔ لہٰذا یہ سب بول و براز پلید ہوں گے۔ اب واضح ہو گیا۔ کہ انبیاء کرام کے بول و براز پاک و طیب ہیں۔ کیونکہ اُن میں تو اور زیادہ خوشبو پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ فقط بدبو کا ختم ہو جانا بھی اسی قاعدے کے تحت پلید کو پاک کر دیتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ کہ شراب کو سرکہ بنا لیا گیا۔ تو پاک ہو گیا۔ آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ بدبو ختم ہو گئی۔ اور تبدیلی حقیقت ہوئی اسی طرح اگر سرے سے بدبو پیدا ہی نہ ہو۔ تب بھی شئی پلید نہیں ہوتی۔ جیسے کہ حلال پرندوں کی بیٹ۔ چنانچہ فتاوٰے عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۴۶ پر ہے:۔ وَخُرْءُ مَا يُؤْكَلُ لَحْمُهُ طَاهِرٌ (ترجمہ):۔ حلال پرندوں کی بیٹ پاک ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے:۔ کہ بدبو پیدا نہ ہوئی۔ اور حلال پرندہ گندگی نہیں کھاتا۔ اس کی غذا دانے وغیرہ کھانے سے پہلے بدبودار نہ تھے۔ اس لیے پاک تھے۔ اور اب کھانے کے بعد بھی بدبو نہ آئی۔ پس چونکہ کسی قسم کی تبدیلی حقیقت نہ ہوئی۔ پلیدی بھی نہ آئی۔ غذا کا براز بن جانا تبدیلی حقیقت نہیں۔ ورنہ اس مذکورہ قاعدے کے ماتحت یہ بیٹ پاک نہ رہتی۔ جب یہاں ناپاکی متحقق نہ آسکی:۔ تو تو انبیاء عظام کے بول و براز کی شان ہی جدا گانہ اس کی پوری تفصیل سابقہ فتاوٰے میں دیکھو۔ رہا یہ سوال کہ امام اعظم نے گائے، بکری کے بول کو نجاست خفیفہ فرمایا۔ تو جواب یہ ہے۔ کہ اس سے مذکورہ قاعدے پر کچھ زد نہیں پڑتی۔ کیونکہ نجاست خفیفہ اختلافِ آئمہ کی بنا پر ہے۔ نجاستِ خفیفہ ہوتی ہی وہ ہے۔ جس کے نجس ہونے میں آئمہ کا اختلاف ہو:۔ (دیکھو کبیری شرح منیہ صفحہ نمبر ۱۲۸) یہ سب جزئیات منقولہ غیر منقولہ فقط اس ایک ہی قاعدے کلیہ کی بنا پر ہوئیں۔ ثابت ہوا کہ قواعدِ کلیہ کے ذریعے ہر دور میں مختلف جزئیات کلی قاعدے کے سانچے میں ڈھالنے کا مفتیٔ اسلام کو اختیار ہے۔ اگرچہ صراحۃً

کتب اکابر میں ان جزئیات کا وجود بھی نہ ہو تاتی دراز گفتگو کو ذہن نشین کرا دینے کے بعد اسی بنا پر میں کہتا ہوں۔ کہ ٹیکے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اگرچہ کسی قسم کا کسی طریقے سے لگوایا جائے۔ بجز دو جگہ کے۔ کیونکہ روزے کے ٹوٹنے کے لیے بھی فقہائے اسلامی نے ایک بہترین قاعدہ مقرر فرمادیا۔ جو آئمہ اربعہ کے نزدیک کلیتاً مسلّم ہے۔ قاعدہ یہ ہے۔ کہ جسمِ صائم سے تین طرح کوئی چیز باہر نکلے۔ تب روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور دو طرح کوئی چیز اندر جائے۔ کل پانچ طریقے ہوئے۔ پہلی صورت یہ ہے۔ کہ بحالتِ روزہ منہ بھر کے قے کرے اور قے میں غذا یا پانی یا پلی پتّی ہو۔ بلغم نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے۔ کہ کسی سے ایسا جماع کرے۔ جس سے غسل واجب ہوتا ہو، انزال ہو یا نہ ہو، روزہ فاسد ہو جائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ خود انزالِ منی کرنا، ان صورتوں میں نکلنے سے روزہ ٹوٹتا ہے۔ جماع بغیر انزال بھی حکماً اس میں شامل ہے۔ کیونکہ مقصد اخراجِ منی ہی ہے۔ چوتھی صورت یہ ہے۔ کہ کوئی شئے بذاتِ خود دماغ میں پہنچ جائے۔ پانچویں صورت یہ ہے۔ کہ کوئی چیز بذاتِ خود اصل شئے پیٹ یا معدے میں پہنچائی جائے۔ یہ ہے فقہائے کرام کا بیان کردہ قاعدۂ کلیہ جسم سے باہر نکلنے والی چیزیں چونکہ معیّن ہیں۔ اس لیے ان کے لیے قاعدہ مقرر کرنے کی حاجت نہیں وہ صرف چند جزئیات ہیں۔ لیکن باہر سے اندر جانے والی چیزیں بھی بے شمار اور جانے کے طریقے بھی بے شمار اس لیے ان کے لیے ایک مضبوط قاعدہ معیّن کرنا اشد ضروری تھا۔ اس شدّت کے پیشِ نظر ہمارے فقہائے کرام نے۔ قاعدۂ کلیہ مقرر فرمادیا۔ کہ ہر وہ چیز جو بعینہٖ دماغ میں چلی جائے۔ یا پیٹ میں پہنچائی جائے۔ فقط اس سے روزہ ٹوٹتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰے درِ مختار جلد دوم صفحہ نمبر ۱۳۵ پر ہے۔ وَمَفَادُہٗ اَنَّ اِسْتِقْرَارَ الدَّاخِلِ فِی الْجَوْفِ شَرْطٌ لِلْفَسَادِ (ترجمہ)۔ اور ان قیود کا فائدہ یہ ہے۔ کہ پیٹ میں داخل ہو کر غائب ہو جانا ہی روزہ ٹوٹنے کی شرط ہے۔ اور اصل مقام پیٹ ہی ہے دماغ میں جو چیز چلی جائے۔ تو اس سے روزہ صرف اس لیے ٹوٹتا ہے کہ دماغ کی بڑی شاہراہ پیٹ کی طرف جاتی ہے جو چیز دماغ میں چلی جائے۔ اس نے پیٹ میں یقیناً پہنچ جانا ہے۔ یہ وجہ ہے۔ کہ دماغ میں جانے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے اگر دماغ سے کوئی چیز پیٹ کی طرف نہ جاسکتی تو دماغ میں جانے سے روزہ نہ ٹوٹتا فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۳۰ پر ہے۔ وَالتَّحْقِیْقُ اَنَّ بَیْنَ جَوْفِ الرَّاْسِ وَجَوْفِ الْمِعْدَۃِ مَنْفَذًا اَصْلِیًّا فَمَا وَصَلَ اِلٰی جَوْفِ الرَّاْسِ یَصِلُ اِلٰی جَوْفِ الْبَطْنِ (ترجمہ)۔ تحقیق یہ ہے۔ کہ بے شک جوفِ دماغ اور جوف کے معدہ کے درمیان اصلی منفذ ہے۔ پس جو چیز دماغ میں جائے وہ پیٹ میں

ضرور جائے گی۔ پس یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ بعینہٖ کوئی چیز روزے دار کے پیٹ میں چلی جائے۔
تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ پیٹ میں جانے کے چار راستے قدرت کیطرف سے مخلوق
ہیں۔ ۱: دماغ ۔ نمبر ۲: ذَکر۔ یہ دونوں سب سے بڑے راستے ہیں۔ کوئی چیز بھی ان میں
جائے۔ پیٹ میں ضرور جائے گی۔ پانی ہو یا تیل خشک ہو یا تر سخت ہو یا نرم۔ نمبر ۳:
ناک۔ اس کے راستے جانے والی چیز پہلے دماغ میں جاتی ہے۔ پھر پیٹ میں لہٰذا اس
راستے سے بھی روزے دار جو چیز چڑھائے گا۔ تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ نمبر ۴:
چوتھا راستہ کان ہے۔ مگر یہ راستہ بہت تنگ ہے۔ پانی یا خشک چیز اس راستے
سے اندر نہیں جاسکتی۔ ہاں تیل وغیرہ چکنی چیز کان کے ذریعہ پیٹ میں چلی جاتی ہے۔ اس
لیئے اگر کان میں تیل وغیرہ ڈالا جائے گا۔ تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اگر پانی پڑ گیا۔ یا
ڈالا گیا۔ تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ لہٰذا قاعدۂ کلیہ کے مطابق اگر کوئی چیز بعینہٖ حقیقتاً۔ ان
راستوں کے ذریعے پیٹ میں پہنچ جائے۔ تو ہی روزہ ٹوٹے۔ ان کے علاوہ کسی طرح
کوئی شخص بحالتِ روزہ اپنے جسم میں کوئی چیز پہنچائے۔ تو روزہ نہ ٹوٹے گا۔ کیونکہ روزہ
ٹوٹتا ہے۔ پیٹ میں جانے سے اور پیٹ کے صرف چار راستے جو اوپر بیان
ہوئے۔ باقی راستوں کے ذریعے گوشت کھال اور خون میں تو چیزیں پہنچائی جاسکتی
ہیں۔ مگر ان راستوں سے کوئی چیز پیٹ میں نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ روزے
دار سارے جسم کی تیل سے مالش کرائے۔ سر کی مالش کرائے۔ بہت سا تیل بھی اس
کے جسم میں جذب ہو جائے۔ تب بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ آقائے دو عالم حضور اقدس صلی
اللہ تعالٰے علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ حکم اس وقت ارشاد فرمایا جب کہ ابھی ڈاکٹری اور
طبی تحقیقیں عالمِ وجود میں بھی نہ آئی تھیں۔ آج طبی تحقیقیں یہ ثابت کر رہی ہیں۔ کہ ظاہری کھال
کے مسامات پیٹ کا منفذ نہیں۔ اور مسامات کے ذریعہ کوئی چیز پیٹ میں نہیں جا
سکتی اگرچہ خون اور چربی وغیرہ کو تیل اور دیگر ادویہ کی مالش تقویت پہنچاتی ہے
اسی طرح فتاوٰی ردالمحتار جلد دوم صفحہ نمبر ۱۵۸ پر ہے۔ اتنی گفتگو سے
یہ ثابت ہو گیا۔ کہ روزہ کے لیئے فقہائے کرام نے ایک قاعدہ کلیہ بنا دیا۔ کہ جو چیز
پیٹ میں نہ جائے۔ اگرچہ خون، گوشت، پوست بلکہ سارے جسم میں پھیل جائے
روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اور پھر پیٹ میں پہنچنے کے لیئے بھی قید ہے۔ کہ بعینہٖ وہ چیز

پہنچے۔ اگر چیز کا صرف اثر معدے میں پہنچ گیا۔ تب بھی روزہ نہ ٹوٹے گا۔ چنانچہ شامی دوم صفحہ نمبر ۱۰۱ پر ہے:۔ فَالْمُعْتَبَرُ حَقِیْقَۃُ الْوُصُوْلِ ؁ (ترجمہ):۔ اعتبار اس چیز کا ہے۔ کہ حقیقۃً خود چیز پیٹ میں پہنچے۔ لہٰذا معدے میں کسی شئی کا اثر پہنچ جانا روزے کو نہیں توڑتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ غسل کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ اگرچہ مسامات کے ذریعے پانی کھال میں پہنچ جاتا ہے۔ اور پانی کی ٹھنڈک، دماغ، پیٹ اور معدے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۰۳ پر ہے:۔ مَنِ اغْتَسَلَ فِیْ مَآءٍ وَجَدَ بَرْدَہٗ فِیْ بَاطِنِہٖ لَا یُفْطِرُ ؁ یہ حکم بھی اسی بیان کردہ قاعدۂ کلیہ کے تحت ہے۔ اسی طرح اور بہت سے جزیئے نکلتے چلے آئیں گے۔ اگرچہ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہو۔ یا نہ۔ اس کلیئے کے تحت یہ مسئلہ بھی واضح ہے۔ کہ سانپ، بچھو، بھڑ وغیرہ روزے دار کو ڈنگ مار دے۔ تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ کتبِ سابقہ میں اگرچہ اس کی صراحت نہیں۔ مگر اقتضاءً یہی حکم ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰے بحرالرائق جلد دوم صفحہ نمبر ۲۸۳ پر ہے:۔ وَکَذَا لِکَ الرَّجُلُ اِذَا لَدَغَتْہُ حَیَّۃٌ فَاَفْطَرَ بِشُرْبِ الدَّوَآءِ ؁ (ترجمہ):۔ ایسے ہی گناہ نہیں ہے۔ کہ جب کسی روزے دار شخص کو سانپ نے ڈنگ مارا۔ تو اس نے دوائی پیکر روزہ توڑ لیا۔ قَالُوْا اِنْ کَانَ ذَالِکَ یَنْفَعُہٗ ؁ (ترجمہ):۔ فقہاء نے فرمایا۔ یہ روزہ توڑنا دوائی سے تب جائز ہے۔ جب کہ اس کو زہرماری کا فائدہ پہنچتا ہو۔ اور بندہ اس پر مجبور ہو۔ نتیجہ نکلا۔ کہ اگر نفع یا مجبوری نہ ہو۔ تو روزہ توڑنا جائز نہیں۔ اور باوجود ڈنگ لگ جانے کے روزہ باقی رہے گا۔ یہی حکم مع کچھ تغیر شامی دوم صفحہ نمبر ۱۵۸ پر بھی ہے۔ ڈنگ سے روزے نہ ٹوٹنے کا مسئلہ اقتضاءً اس لیے ثابت ہوا۔ کہ مندرجہ بالا عبارت میں لفظ اَفْطَرَ ہے۔ اور اَفْطَرَ فعل متعدّی کا صیغہ ہے۔ کیونکہ بابِ افعال ہے۔ اور تعدّی سے فعل اختیاری ہوتا ہے۔ جس میں اکسب کا سبب کو دخل ہے۔ اضطرار اختیار کی ضد ہے۔ ورنہ فقہاء اَفْطَرَ کہہ کر توڑنے کا استحبابی حکم نہ دیتے۔ اور مطلب ہوا۔ کہ اگر ڈنگ لگ جائے۔ تو روزہ توڑنے کا اختیار ہے۔ خود بخود نہ ٹوٹے گا۔ اگر یہاں اقتضاءً یہ مطلب نہ نکالا جائے۔ اور فرضاً تسلیم کیا جائے۔ کہ ڈنگ لگنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، تو اجتماعِ ضدّین بھی اور لفظ اَفْطَرَ سے تحصیلِ حاصل بھی لازم آئے گا۔ حالانکہ یہ دونوں محال بالذّات ہیں۔ محلِ غور یہ ہے۔ کہ ڈنگ لگنے سے روزہ کیوں نہیں ٹوٹتا؟ حالانکہ زہر کا اثر سارے جسم بلکہ پیٹ اور معدے میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ بعینہٖ زہر معدے میں نہ پہنچا۔ جو صورت ڈنگ کی ہوتی بالکل وہی شکل آج کل کے

ٹیکوں کی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ ڈنگ ہلاک کرتا ہے۔ مگر ٹیکہ شفا کرتا ہے۔ وہ حیوان لگاتا ہے۔ یہ انسان۔ اس سے موت ہے۔ اس سے زندگی کی امید لیکن تاثیر میں کچھ فرق نہیں۔ وہ بھی سارے جسم میں پھیلتا ہے اور یہ بھی۔ بعینہٖ پیٹ میں نہ وہ جاتا ہے نہ یہ، لہٰذا جب تمام فقہاء کرام کے نزدیک ڈنگ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ تو ٹیکے سے کیوں کر ٹوٹے بعض حمقاء کا یہ فرق نکالنا۔ کہ ٹیکہ اختیاری ہے۔ اور ڈنگ اضطراری۔ شریعت میں ہر جگہ اختیار و اضطرار کا فرق ہے۔ باب الصیام میں بھی بہت جگہ روزے کے فساد وغیرہ۔ فساد میں اضطرار و اختیار کا فرق کیا گیا۔ بہت سی اشیاء اختیاراً مفسد روزہ ہیں اضطراراً نہیں جیسے دھواں وغیرہ۔ کہ اضطراراً اگر پیٹ میں چلا جائے تو مفسد نہیں اختیاراً چلا گیا۔ تو مفسد مثلاً سگریٹ۔ اضطراراً نہیں۔ جیسے کہ دھواں وغیرہ۔ اضطراراً اگر پیٹ میں چلا جائے۔ تو مفسد نہیں۔ اختیاراً چلا گیا تو مفسد مثلاً سگریٹ حقہ، بیڑی کے ذریعے دیکھو بحر الرائق جلد دوم صفحہ نمبر ۲۷۲ پر۔ اسی پر ڈنگ کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ڈنگ سے اس لیے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ کہ وہ اضطراری ہے۔ مگر چونکہ ٹیکہ اپنے اختیار میں لہٰذا اس سے روزہ یقیناً فاسد ہوگا۔ یہ تھا معترض کا قول مع دلیل۔ مگر یہ بالکل غلط قیاس ہے۔ اور اس کے غلط ہونے کی تین وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے۔ کہ باب الصیام میں اختیار و اضطرار کا فرق قاعدہ کے مطابق اُن چیزوں اور اُن طریقوں میں ہے۔ جو بعینہٖ پیٹ میں چلی جائیں، ٹیکہ اور ڈنگ تو اس قاعدہ سے ہی مستثنیٰ ہے۔ پھر یہاں اضطرار و اختیار کا وہ کلیہ کیوں جاری ہوگا

دوسری وجہ یہ ہے :۔ کہ فقہاء کی فرمودہ عبارت میں اِذَا اَلَدَغَتْهُ ہے:۔ حرف اذا یہاں ظرفیۃ کا نہیں۔ بلکہ کُلَّمَا کے معنی میں ہو کر استمرار یہ ہے۔ جس سے اطلاق کا فائدہ ہوا۔ منطق کے لحاظ سے یہ عبارت موجبہ کلیہ شرطیہ ہے۔ جس میں تمام تقدیروں پر حکم لگتا ہے۔ مقصد یہ ہے۔ کہ جب کبھی جس طرح بھی کسی روزے دار کو سانپ کاٹ لے خواہ بلا مرضی اچانک جیسے کہ کبھی کبھی جنگلوں میں یا دیہاتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ خواہ بالارادہ جیسے کہ بعض بیماریوں میں سانپ سے کٹوایا جاتا ہے۔ ایک خاص طریقے سے سپیرا اپنے آپ کو ڈسواتے ہیں۔ اسی طرح کسی کو سانپ کاٹ لے یا کچا زہر کھلا دیا جائے۔ تو دوسرے سانپ سے کٹوایا جاتا ہے، تاکہ پہلا زہر ختم ہو جائے۔ بعض دفعہ سانپ خود مر جاتا ہے۔ اور بیمار کا پہلا زہر ختم ہو جاتا ہے۔ بہر حال بہت صورتیں ہیں۔ کہ سانپ سے انسان بخوشی ڈنگ لگواتا ہے۔ بحر کی عبارت سب کو شامل یعنی خود کاٹ لے، یا اس سے ڈنگ لگوایا۔ روزہ نہیں ٹوٹتا۔

تیسری وجہ یہ ہے :۔ کہ معترض نے اضطرار و اختیار کی حقیقت کو نہ سمجھا :۔ خیال رہے۔ کہ اضطرار وہ ہے۔ جس سے بچنا محال ہے۔ جیسے دھواں، آندھی کی دھول

غبار وغیرہ۔ اس سے دن رات واسطہ پڑتا ہے۔ خواہ کسی جگہ رہے، ایسے ہی مکھی، مچھر، ان چیزوں سے بچنا محال ہے۔ اس لیے یہاں اضطرار ہے۔ لیکن پانی کا ناک یا منہ یا دُبر سے پیٹ میں بلا ارادہ پہنچ جانا اضطرار نہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ خود بخود کسی راستے سے پانی پیٹ میں چلا جائے۔ تو اضطراری حکم جاری نہ ہوگا۔ بلکہ روزہ ٹوٹ جائے گا۔ بخلاف دھوئیں وغیرہ کے کہ وہاں روزہ نہ ٹوٹے گا۔ کیونکہ وہاں اضطرار ہے۔ ڈنگ میں بات یہ ہے۔ کہ سانپ سے بچنا محال نہیں۔ لہٰذا اگر سانپ یا بچھو سے خود کٹوایا۔ تب بھی روزہ نہ ٹوٹے گا۔ اسی طرح ٹیکے سے بھی۔ اس لیے کہ پیٹ میں ٹیکے سے حقیقۃً دوا نہیں جاتی۔ فقہاءِ کرام تو یہاں تک فرماتے ہیں۔ کہ اگر دانت سے کوئی چیز تھوک یا منہ کے پانی سے مل کر اندر معدے میں چلی گئی۔ اور تھوک یا پانی غالب تھا۔ تب بھی روزہ نہ ٹوٹے گا۔ چنانچہ فتاویٰ درِّ مختار صفحہ نمبر ۱۴۳ پر ہے:۔ اَمَّا اِذَا وَصَلَ اِلَی الْجَوْفِ فَاِنْ غَلَبَ الدَّمُ اَوْ تَسَاوِیَا فَسَدَ اِلَّا لَا (ترجمہ):۔ لیکن جب پیٹ میں دانت کا خون پہنچا۔ تھوک سے مل کر تو اگر خون زیادہ یا برابر تھا۔ تو روزہ ٹوٹ گیا۔ ورنہ نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ تر شئی۔ شئی نہیں رہتی بلکہ صرف اثر بن جاتی ہے۔ اسی طرح ٹیکے کا اثر تو پہنچ جاتا ہے۔ مگر دوائی نہیں پہنچتی۔ اس لیے اس سے بھی فسادِ صوم نہیں۔ ٹیکے کے متعلق اس حکم میں ہر قسم کا ٹیکہ شامل ہے۔ اگرچہ گلوکوز کا ہو اس لیے کہ گلوکوز بھی پیٹ میں نہیں جاتا۔ بلکہ صرف خون میں سرایت کرتا ہے۔ جس سے خون کو تقویت ہوتی ہے۔ اور اس کا اثر دل و دماغ اور معدے پر ہوتا ہے۔ اگر گلوکوز پیٹ میں جاتا تو یقیناً پیٹ اسی طرح پھولتا جس طرح پانی پینے یا انیمہ کرانے سے، پھولتا ہے۔ کیونکہ گلوکوز کی بوتل کم از کم آدھ سیر کی ہوتی ہے۔ مگر پیٹ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بخلاف انیمہ کے کہ اس سے پیٹ ابھرتا محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے انیمہ کرانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۶۳ پر اور فتاوےٰ ہندیہ جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۰۴ پر ہے:۔ وَمَنِ احْتَقَنَ اَوْ اَقْطَرَ فِیْ اُذُنَیْہِ دُھْنًا اَفْطَرَ۔ (ترجمہ) جس روزے دار نے انیمہ کرایا۔ یا کان میں تیل کا قطرہ ڈالا۔ اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ یہ دونوں منفذِ بطن ہیں۔ رہی یہ بات کہ ٹیکے کا اثر معدے میں پہنچ جاتا ہے مگر اس سے۔ روزہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جیسے کہ نہانے کی ٹھنڈک اور مالش کی تقویت کا روزے پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ نہانے سے پیاس کی شدت بھی کم ہو جاتی ہے زیادہ غسل سے بھوک بھی محسوس نہیں ہوتی یہ سب کچھ پانی کے اثر کی وجہ سے ہے۔ اثر ایک

عجیب چیز ہے۔ اللہ کریم نے جسم انسانی و حیوانی کو ایسے عجیب اور بہترین انداز سے خلقت فرمایا ہے۔ کو سر سے پیر تک ہر چیز کے اثرات قبول کر لیتا ہے۔ اور کسی چیز سے تاثیر کرنے سے خود اس چیز کا وہاں پہنچنا لازم نہیں۔ دیکھو جگر کی گرمی کے مریض کو طبیب لوگ صبح کی شبنم پر ننگے پیر چلنے کا حکم دیتے ہیں اس شبنم کے اثر سے جگر کی گرمی کے مریض تندرست ہو جاتے ہیں۔ کہاں جگر کہاں پیر۔ نہ کوئی راستہ نہ سوراخ نہ وہاں شبنم کے قطرے کی پہنچ مگر گرمی دور۔ یہ سب کچھ تاثیر شبنم کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے شبنم پر چلنے سے روزہ بھی نہیں ٹوٹتا۔ بالکل اسی طرح ٹیکے کا اثر معدے میں جا سکتا ہے۔ دوائی نہیں جاتی اثر کی وجہ سے منہ کا مزہ تک تبدیل ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی روزہ نہ ٹوٹے گا اگرچہ اس دوائی کا مزہ منہ میں آ جائے چنانچہ فقہاء کرام فرماتے ہیں۔ از عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر ۲۰۳ پر ہے:۔ وَلَوْ اَقْطَرَ شَیْئًا مِّنَ الدَّوَآءِ فِیْ عَیْنِہٖ لَا یَفْطُرُ صَوْمُہٗ عِنْدَنَا وَاِنْ وَجَدَ طَعْمَہٗ فِیْ حَلْقِہٖ (ترجمہ)۔ اگر کسی روزے دار نے اپنی آنکھ میں دوائی کا قطرہ ڈالا۔ تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا اگرچہ اس کا مزہ اپنے حلق میں پائے کیونکہ یہ مزہ صرف اثر ہے۔ نہ کہ اصل دوائی۔ بدیں وجہ کہ یہ منفذ پیٹ نہیں ہے۔ بعض ناواقف یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اور ٹیکوں سے تو واقعی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ لیکن غذائی ٹیکے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ غذائی ٹیکہ پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں۔ کہ چونکہ اس ٹیکہ سے بھوک پیاس ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ پانی پینے، روٹی وغیرہ کھانے سے۔ تو جس طرح پانی پیٹ میں جانے سے پیاس ختم کرتا ہے۔ اسی طرح غذائی ٹیکہ بھی پیٹ میں جا کر ہی بھوک پیاس مٹاتا ہے میں کہتا ہوں۔ کہ یہ دلیل بالکل لغو ہے اس لیے کہ قانونِ فطرت میں بھوک، پیاس کا تعلق پیٹ سے نہیں۔ بلکہ حلق سے ہے۔ اسی لیے انیمہ کرانے سے پیٹ تو پانی سے بھر جاتا ہے۔ مگر پیاس نہیں بجھتی۔ ثابت ہوا کہ پیٹ بھر جانے سے بھوک، پیاس نہیں مٹتی۔ بلکہ ہر ذی روح انسان و حیوان کے حلق میں دو رگیں ہیں۔ جن کا تعلق دل سے ہے۔ ایک پیاس کی رگ ہے ایک بھوک کی۔ جب کوئی ان میں سے خشک ہوتی ہے۔ تو بھوک یا پیاس محسوس ہوتی ہے۔ جب اُن کو منشاء کے مطابق تر کر دیا جائے۔ تو بھوک پیاس ختم ہو جاتی ہے۔ اُن کا تر ہونا بہت طرح کا ہے۔ اکثر تو اصل پانی اور اصل غذا سے ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا کی نمی سے۔ اسی لیے سردی میں پیاس کم لگتی ہے۔ کبھی پانی کے فقط اثر سے اسی لیے روزے میں نہانے سے پیاس کم۔ بلکہ بعض دفعہ ختم ہو جاتی ہے۔ بس بالکل اسی طرح غذائی ٹیکہ حلق کی ان دونوں رگوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جس سے بھوک پیاس ختم ہو جاتی ہے۔ اور دوائی خون کو تقویت پہنچاتی ہے۔ بھوک پیاس مٹانے کے لیے

پیٹ میں پہنچنا کچھ ضروری نہیں دیکھو۔ بہت دفعہ پانی سے پیٹ بھرا ہوتا ہے۔ مگر پیاس پھر بھی ختم نہیں ہوتی۔ جس کو استسقاء کی بیماری کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کو دیکھا گیا۔ کہ پیٹ کھانے سے بھرا ہے۔ مگر بھوک نہیں مٹتی۔ اس کو ہوکے کی بیماری کہا جاتا ہے۔ ایسے ہی اس کے الٹ کا بھی تجربہ شاہد ہے۔ کہ پیٹ بالکل خالی ہے۔ مگر بھوک پیاس بالکل نہیں۔ پتہ لگا۔ کہ بھوک پیاس کا تعلق پیٹ میں پہنچنے سے نہیں۔ کھانا صرف اس لیئے کھایا جاتا ہے۔ کہ اس سے حسبِ ضرورت قوتِ خون میسر آئے۔ کیونکہ جو قوت روٹی وغیرہ کو پیٹ میں ڈال کر حاصل ہوتی ہے۔ وہ کسی ٹیکے وغیرہ سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ پھلوں کا جوس اور رس پینے سے بھی وہ قوت نہیں آسکتی یہ رب کریم کا عجیب پیارا نظام ہے۔ بہت سے بے وقوف مرن بھرت یا بھوک ہڑتال کرتے ہیں۔ صرف پھلوں کا رس پیتے ہیں مگر ان کو وہ قوت نہیں ملتی جو پیٹ کی غذا سے ملتی ہے اس لیئے کمزور ہو کر حرام موت مر جاتے ہیں۔ لیکن قوت کا تعلق پیٹ سے نہیں بلکہ حلق سے ہے

اللہ کریم نے فرمایا۔ وَاِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ؕ (ترجمہ):۔ اور اونٹ کی طرف دیکھو کیا عجیب پیدا کیا گیا۔ مخلوقاتِ کائنات میں اونٹ کی طرف دیکھو۔ کیا ہی عجیب قدرتِ الٰہی کا کرشمہ ہے۔ یہ بندۂ تسلیم و رضا بھی ہے۔ اور غیرت مند خادم قوم بھی احادیث و آیات میں اس کے بہت سے خصائل و طبائع مذکور ہیں شارحین و مفسرینِ کرام اس کے بہت سے خصوصی اطوار بیان فرماتے ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔ پندرہ پندرہ دن تک پانی نہیں پیتا۔ اور گرم ریگستان میں سفر کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد چہارم صفحہ نمبر ص۲۶۵ پر ہے۔ حیوٰۃ الحیوان صفحہ نمبر ص۱۳ پر ہے۔ تفسیر روح البیان جلد دھم صفحہ نمبر ص۴۱۶ اربع تفاسیر جلد ششم صفحہ نمبر ص۵ پر ہے:۔ وَتَحْتَمِلُ الْعَطَشَ اِلٰى عَشْرٍ فَصَاعِدًا ؕ (ترجمہ) اونٹ دس پندرہ دن تک پیاس برداشت کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اونٹ کا پتہ نہیں ہوتا۔ اور پتے کی جگہ ایک بڑا تھیلہ ہوتا ہے۔ اونٹ جب پانی پیتا ہے تو پہلے اپنے تھیلے کو بھرتا ہے۔ (حیاتُ الحیوان صفحہ ۱۶) پر لکھا ہے۔ كُلُّ الْحَيْوَانِ لَهٗ مَرَارَةٌ اِلَّا الْاِبِلِ ؕ (ترجمہ):۔ ہر جانور کا پتہ ہوتا ہے۔ سوائے اونٹ کے جب پیٹ کا پانی ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنے تھیلے سے پانی نکال کر حلق کی رگوں کو تر کر لیتا ہے۔ اور کوہان کی چربی سے غذاء والی رگ کو قوت پہنچاتا ہے۔ ان بیانات سے بھی ثابت ہوا۔ کہ بھوک پیاس پیٹ سے متعلق نہیں ہے۔ اونٹ کا یہ تھیلا اس کے پتے کی ہم شکل ہوتا ہے چنانچہ حیاتُ الحیوان جلد اوّل میں ہے:۔ اِنَّمَا يُوْجَدُ عَلٰى كَبِدِهَا

شَیْئٌ یَشْبَہُ الرِّئَۃَ وَھِیَ جِلْدَۃٌ وَیُخْرِجُ الشِّقْشِقَۃَ وَھِیَ جِلْدَۃٌ اَلْحَمْرَاءُ الَّتِیْ یُخْرِجُھَا مِنْ جَوْفِہٖ۔ (ترجمہ) :۔ اونٹ کی کلیجی پر پتے کی تم شکل تھیلہ نما ایک چیز ہوتی ہے اور وہ کھال کی طرح ہوتی۔ اور سا ونٹ ایک سرخ رنگ کا لوتھڑا نکال کر اس تھیلے کے جوف سے یا اپنے پیٹ سے تر کرکے باہر لاتا ہے۔ یہ لوتھڑا منہ سے باہر بھی نکال لیتا ہے۔ جس کا بہت دفعہ مشاہدہ ہوا ہے۔ اسی لوتھڑے کی تری سے رگوں کو تر کرتا رہتا ہے۔ جس سے پیاس بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح غذائی ٹیکے سے بھی رگوں کی تری ہوتی ہے۔ تب پیاس وغیرہ ختم ہوتی ہے۔ ثابت ہوا۔ کہ روزے کی حالت میں ٹیکہ لگانا منع نہیں۔ اور ہر قسم کا ٹیکہ لگانا جائز ہے ہاں البتہ بلا ضرورت بحالتِ تندرستی روزے دار کو غذائی ٹیکہ لگا کر شدتِ بھوک پیاس ختم کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ کہ اس سے ثواب کی کمی کا اندیشہ ہے۔ جیسے کہ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ روزے کی حالت میں بہت زیادہ کثرت سے نہانا مکروہ ہے۔ حالانکہ۔ کثرت غسل سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ اسی طرح غذائی ٹیکے سے بھی روزہ فاسد نہ ہو گا۔ کراہت صرف قلتِ ثواب کے اندیشے پر ہے۔ باقی دیگر علاجی ٹیکے ہر حالت میں ہر قسم کے اور جسم کے ہر حصّہ میں لگانا بلا کراہت جائز ہے ہاں البتہ کوئی سر کی کھوپڑی اور پیٹ کے گوشت میں نہ لگایا جائے اس لیے کہ اس صورت میں دوائی پیٹ اور دماغ میں بذاتِ خود چلی جائے گی۔ اور روزہ ٹوٹ جائے :۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کتاب الزکوٰۃ باب الربوا

نوٹ اور پیسوں کا مسئلہ

سوال نمبر ۲۸ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہماری موجودہ حکومتِ پاکستان کے زیرِ تحویل بینک مثلاً سیونگ بینک، حبیب بینک، کمرشل یا بیمہ کمپنیاں وغیرہ ان بینکوں میں جو لوگ اپنے روپے جمع کراتے ہیں۔ ان کو حکومت اپنی طرف سے اصل رقم پر تقریباً پانچ فی صد سالانہ کے حساب سے زائد رقم دیا کرتی ہے۔ تو کیا وہ زائد رقم عوام کے لیے شرعاً سود کا حکم

رکھتی ہے یا کہ نہیں ۔ اور کیا یہ زائد رقم جمع کرانے والے لوگوں کو اپنے پر یا اپنی طرف سے کسی پر خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) ۔ تفسیر نعیمی جلد سوم صفحہ ۱۹۰ پر سود سے بچنے کی تدبیر اس طرح لکھی ہوئی ہے۔ کہ دس کا نوٹ پندرہ میں اور سو کا نوٹ سوا سو میں فروخت کیا جا سکتا ہے۔ تجارت کے معاملے میں حکومتی سطح پر غالباً ایسا ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ملک میں کسی بینک میں آپس کے لین دین میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ پھر اس تفسیر کی عبارت کا کیا مطلب ہے۔ تفسیر نعیمی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۹۱ پر ہے۔ کہ (بینک کا سود) چونکہ پاکستان کے سرکاری وغیرہ سرکاری مسلمان ہی کے ہیں۔ اس لیے ان بینکوں سے نفع لینا حرام ہے۔ جیسا کہ کتاب الخلا میں ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ نوٹ کے لین دین سے نفع لیا جا سکتا۔ آج کل تو سب کاروبار ہی نوٹ سے ہے سکہ (چاندی سونا وغیرہ) کا لین دین تو ختم ہی ہے۔ لیکن نوٹ سکے کا ہی بدل ہے۔ تو جب نوٹ میں نفع جائز ہوا، تو ناجائز کون سا سکہ ہوا۔ ذرا وضاحت فرمایئے مثلاً ایک شخص امیر ایک غریب کے ساتھ دس کا نوٹ پندرہ میں فروخت کر سکتا ہے۔ یا سو کا نوٹ سوا سو میں دے کر ادھار کرے۔ اور یہ شرط لگائے۔ کہ ایک ماہ بعد ایک سو پچیس روپے لوں گا۔ کیا یہ جائز ہے۔ معاملہ سب نوٹ میں ہو۔

بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا

سائل:۔ قاضی نور حسین معرفت سید شواظ الحق مقام و ڈاکخانہ للیال سکھو۔ تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی:۔

۱۲/۱۱/۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

نمبر ۱ صورت مسئولہ میں دورِ حاضرہ کے جتنے بینک ہمارے ملک پاکستان میں رقوماتِ عوام سے لین دین کرتے ہیں۔ طریقہ مروجہ کے مطابق شرعاً وہ سب سود اور حرام ہیں۔ اور لینے دینے والے عند اللہ مجرم ہیں ہمارے یہاں مروجہ طریقہ پر نوٹ کی شکل میں مال جمع کیا جاتا ہے۔ اور بینک والے اسی جمع شدہ پر سود متعینہ لگا دیتے ہیں۔ یہ قطعاً حرام ہے۔ اسی صورت کی حرمت قرآن و حدیث میں مذکور ہے۔ اسی طرح سے نوٹ کا لینا دینا حرام ہے۔ خواہ بذریعہ بینک ہو یا ڈاک خانہ یا پاکستان کے مسلمانوں کا آپس میں جس طرح جہت سے مسلمان سود خواری کی لعنت میں مبتلا ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ نجات کی توفیق دے) جس مسلمان نے بھی یہ رقم بینک وغیرہ

سے لی ہوگی۔ اس رقم کو نہ خود کھا سکتا ہے اور نہ اپنے کسی تعلق دار کو کھلا سکتا ہے۔ ہاں کسی غریب حاجت مند کو دیدے۔ اور یہ دینا صدقہ نہ خیرات نہ کارِ ثواب، چنانچہ شیخ کامل طرابلسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے فتاویٰ کاملیہ صفحہ نمبر ۱۵ پر فرماتے ہیں۔ کہ لَا تَجِبُ عَلَيْهِ الزَّكٰوةُ فِيْهِ بَلْ يَلْزَمُهُ التَّصَدُّقُ بِجَمِيْعِ مَالِهٖ عَلَى الْفُقَرَاءِ لَا بِنِيَّةِ الثَّوَابِ ۵ یعنی اس طرح کے حرام مال پر زکوٰۃ بھی نہیں۔ اور وہ سب مال غریبوں کو بانٹ دے۔ یہ بانٹنا باعثِ ثواب نہ ہوگا۔ کیوں یہ اس کا مال ہی نہیں۔ یہاں تک کہ سودی پیسے سے خریدا ہوا سامان گھر کے برتن بلکہ اگر خالص سود سے گھر بھی خریدا ہے تو وہ بھی غریب کو دے دے۔ اور جلد از جلد جہنم کے گھوارے اور آگ کے جلنے سے بچے۔ (وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ) یہ اُن نوٹوں اور مالوں کا ذکر ہے۔ جو بینک سے سود فنڈ سے نکلوایا جا چکا ہے۔ لیکن آئندہ ایسا نہ کرے۔ کہ نکلوا کر غریبوں کو بانٹے۔ کہ اس کا لینا اور دینا اور نکلوانا ہی حرام ہے۔ بلکہ اولاً بینک والوں کو منع کرے۔ کہ میری رقم پر سود نہ لگایا جائے۔ ثانیاً خود بھی اپنی خالص رقم کا حساب لگاتا رہے۔ کہ میری ذاتی حلال رقم اب تک اتنی جمع ہو چکی ہے۔ بس اسی سے سروکار رکھے۔ اسی کو اپنی رقم خیال کرے۔ اگر کچھ رقم جمع شدہ میں سود لکھ بھی دیں۔ تو تا عمر نہ نکلوائے۔ دوستو بڑی احتیاط کرو۔ بڑی احتیاط کرو۔ اس آگ سے اپنے پیٹ کو بچاؤ۔ یہ کانٹے ہیں۔ یہ آگ ہے۔ اور یہ سانپ اور بچھو ہیں۔ لینے دینے والا دونوں برابر کے گناہگار ہیں۔ ص۲ :۔ تفسیر نعیمی سوم میں اس رائج شدہ بے حودہ اور حرام طریقے سے بچنے کے لیے ایک طریقہ جو جائز اور حلال ہونے کے ساتھ نفع اور فائدے والا بھی ہو۔ اور سائل پاکستان کا یہ بہانہ کہ سودی کاروبار کے بغیر ہم دوسرے دنیاوی ملکوں سے کاروباری لین دین نہیں کر سکتے۔ یا پاکستان کے دیگر تجار کی یہ مجبوری کہ ان کو اپنی تجارت اور فوری خرید و فروخت کے لیے کوئی شخص بغیر سود قرضہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا جس سے تجارت کو عظیم نقصان بلکہ دیوالیہ کا خطرہ ہوتا ہے۔ حالانکہ فی زمانہ ملک اور حکومتوں سے لے کر نجی اور علاقائی اداروں تک سب کے سب تجارت ہی کے بل بوتے پر ہیں۔ ایسے سخت ترین حالات میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے یہ طریقہ اس لیے فرمایا ہے۔ تاکہ لوگ سود کی لعنت سے بچ جائیں۔ اور جائز منافع لے سکیں۔ سائل کا یہ کہنا کہ ہمارے ملک کے کسی بینک میں یہ طریقہ نہیں۔ یہ ٹھیک مگر حکومتی سطح پر اگر اس کو رائج کیا جائے۔ تب مفید ہوگا۔ حکومت کے بغیر ایسا کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ سائل کا یہ کہنا۔ کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ غلط ہے۔ نوٹ ہو یا کوئی بھی سکہ موجودہ دور کا لوہے پیتل، تانبے کا (علاوہ سونے چاندی کے) ان تمام میں یہ بات رواج دی جا سکتی ہے۔

بر درست ہے کہ نوٹ، سکے کا بدل ہے۔ یعنی سونے چاندی کا بدل ہے۔ اسی لیے اس میں زیادتی بطریقہ رائج سود بن جاتی ہے۔ جیساکہ پہلے بیان کیا گیا۔ مگر سونے چاندی کا اور دیگر سکوں نوٹ اور پیسوں وغیرہ میں ہر طرح یکسانیت نہیں بلکہ بہت طرح فرق ہیں۔ جن کی بنا پر سونے چاندی میں ہر وقت ہر طرح زیادتی سود ہی ہوگی۔ جب کہ ہم جنس کی خرید و فروخت ہو۔ لیکن نوٹ اور پیسوں کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جو آج کل ہمارے بینکوں، ڈاکخانوں میں جاری ہیں۔ یہ سب حرام ہیں۔ اور سود ہیں۔ اس کا ذکر ابھی پہلے کیا گیا۔ دوسری صورت کا اجمالی طور پر تفسیر نعیمی اور ہمارے دیگر فقہاء کرام (اَدَامَ اللّٰہُ فُیُوْضَھُمْ عَلَیْنَا) نے بیان کیا۔ اور حتی المقدور سمجھانے اور اختصار کی کوشش کی مگر میں مزید آسانی کر کے مختصراً بیان کرتا ہوں۔ تاکہ فہم و ادراک کے قریب تر ہو جائے۔ یہ خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔ کہ شریعت مطہرہ کی زبان میں جن چیزوں کا تجارت میں عظیم دخل ہے۔ وہ کل چھ ہیں۔ (۱) مال ع۲ مبیع (جو چیز فروخت کی جائے) ع۳ ثمن جو بدلے میں دی جاتی ہے (۴) قیمت ع۵ سود ع۶ نوٹ کی حقیقت۔ سائل کے سوال کا جواب مکمل سمجھنے کے لیے۔ ان چھ چیزوں کا فرق اور تعریف سمجھنا ضروری ہے:۔ (۱) مال:۔ قانون شریعت کے مطابق مال چار قسم کا ہے۔ پہلی وہ جو ہر حال ہر وقت ثمن ہی ہوتی ہے۔ جیسے سونا، چاندی اسی لیے اس پر ہمیشہ ہر صورت میں زکوٰۃ پڑ جاتی ہے گھر میں استعمال ہو یا برائے فروخت اصل مال یہی ہے۔ باقی سارے اس کے تابع ہیں۔ دوسری قسم ہر حال میں مبیع یعنی قابل فروخت سامان ہو جیسے جانور فرنیچر کپڑے وغیرہ اسی لیے گھریلو سامان پر زکوٰۃ نہیں ہوتی مال کی تیسری قسم یہ ہے۔ کہ وہ چیز ایک اعتبار سے ثمن ہو ایک اعتبار سے مبیع ہے۔ جیسے وہ چیزیں جو ناپ تول اور گن کر فروخت کی جاتی ہیں۔ مثلاً۔ گندم، چاول، سبزی، انڈے وغیرہ۔ اب یہ کہ یہ کس صورت میں مطلقاً ثمن بنے گی۔ کس صورت میں مطلقاً مبیع اس میں دراز گفتگو ہے۔ فقہاء کرام نے بہترین قواعد بیان فرمائے مگر اس کی یہاں چنداں حاجت نہیں چوتھی قسم یہ کہ وہ چیز اصل میں تو سامان ہو۔ مگر لوگوں (عوام یا حکومت کی) اصطلاح اور رواج میں اس کو ثمن بنایا ہو۔ جیسے لوہے تانبے، پیتل کے روپے پیسے وغیرہ۔ ساری کائنات میں بس مال کی چار قسمیں ہیں۔ جن میں پہلی تین کا ذکر فتاویٰ تنویر الابصار جلد چہارم میں مرقوم ہے۔ چنانچہ صفحہ نمبر ص۲۲۷ پر ارشاد ہے:۔ وَالْاَمْوَالُ ثَلَاثَۃٌ ثَمَنٌ بِکُلِّ حَالٍ وَھُوَ النَّقْدَانِ وَمَبِیْعٌ بِکُلِّ حَالٍ کَالثِّیَابِ وَالدَّوَابِّ وَثَمَنٌ مِنْ وَجْہٍ مَبِیْعٌ مِنْ وَجْہٍ کَالْمِثْلِیَاتِ۔

(ترجمہ):۔ یعنی مال تین قسم کے ہیں۔ ثمن ہر لحاظ سے اور وہ نقدان یعنی سونا اور چاندی ہیں۔ اور مبیع ہر حال میں جیسے کپڑے اور جانور اور ثمن کسی وصف سے اور مبیع کسی وصف سے جیسے مثلیات یعنی

ناپی، تولی، گنی ہوئی چیزیں، مال کی مذکورہ چوتھی قسم فتاوٰے بحرالرائق جلد ششم میں ہے چنانچہ علامی شامی نے جلد چہارم کے صفحہ ۲۳ پر ارشاد فرمایا۔ یُسْتَفَادُ مِنَ الْبَحْرِ اَنَّهَا اَقْسَامٌ اَرْبَعٌ حَیْثُ قَالَ وَثَمَنٌ بِالْاِصْطِلَاحِ وَهُوَ سِلْعَةٌ فِی الْاَصْلِ کَالْفُلُوْسِ ۔ (ترجمہ) ۔ یعنی چوتھی قسم بحرائق ص۱۳۱ جلد ۶ پر سے مستفاد ہے۔ کیونکہ انہوں نے فرمایا۔ ایک وہ چیز ہوتی ہے جو اصطلاح اور رواج میں ثمن بنا لی جاتی ہے۔ حالانکہ اصل میں وہ سامان ہوتا ہے۔ جیسے پیسے۔ جب آپ نے مال کی یہ تقسیم سمجھ لی۔ تو یہ بھی سمجھ لو کہ مبیع کیا ہے شریعت کے قانون میں مبیع حقیقی اور اصلی طور پر وہ چیز ہے کہ جس کو فروخت کیا جائے اور خریدار خریدے۔ اور اس کا ذاتی طریقے پر کچھ نفع میسر ہوتا ہو۔ چنانچہ فتاوٰی شامی جلد چہارم صفحہ نمبر ۳ پر ہے۔ وَبِاِبَاحَةِ الْاِنْتِفَاعِ بِهٖ شَرْعًا یعنی وہ چیز جس سے شرعی حلال نفع حاصل ہو دنیا کی ہر چیز سے کسی نہ کسی طرح حلال نفع حاصل ہوتا ہے۔ سوائے سونے چاندی کے۔ اسی لیے ہر شئی اصل میں مبیع ہے۔ اگرچہ دنیا والے اس کو مبیع کے درجے سے نکال کر وقتی اور عارضی طور پر اپنی ضرورت کے لیے ثمن بنالیں مگر وہ حقیقی ثمن نہ ہوں گی۔ تیسری چیز جو قابل فہم ہے۔ وہ ثمن ہے۔ شرعی لحاظ سے ثمن وہ ہے۔ جو کسی شئے کی قیمت تو بن سکے۔ مگر اس کا نفع مقصود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حقیقی ثمن وہ ہے۔ کہ جس کا کوئی حلال نفع حاصل نہیں کیا جاسکتا جیسے۔ سونا، چاندی کہ شریعتِ اسلامیہ میں ان دونوں کو محض قیمت بنایا گیا ہے۔ ان سے کسی قسم کا نفع لینا ہر مرد وعورت کو اسی وجہ سے حرام قرار دیا گیا۔ تاکہ یہ کسی دور میں سامان کے درجے میں نہ آسکیں۔ دانتوں پر سونے کا چڑھانا محض زینت کے طور پر استعمال کرلیا جاتا ہے۔ کہ جس سے ذاتی نفع کچھ مقصود نہیں ہوتا۔ طبی لحاظ سے کچھ نفع پہنچ جائے۔ تو یہ دور کی بات ہے۔ سونے کے ثمن صرف اس لیے جائز ہیں۔ کہ بوقت ضرورت سفر میں بطور قیمت استعمال کیئے جاسکیں۔ چاندی کی انگوٹھی بھی کچھ نفع نہیں پہنچاتی۔ بہرحال جس طرح بھی دیکھو سونا چاندی صرف قیمت ہی کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ عورتوں کا بطریقہ زیور پہننا یہ کوئی ذاتی نفع کے لیے نہیں نہ اس کو سامان میں شامل کیا جاتا ہے۔ صرف ہندوستانی عورتوں کی ایک عادت ہے۔ اس زمانے میں بھی فارس وروم ومغربی علاقوں میں کوئی عورت سونا چاندی نہیں پہنتی۔ کیونکہ زیور نہ نفع دیتا ہے۔ نہ زینت۔ یہ صرف قیمت کے لیے بنا ہے۔ اسی لیے شریعت میں اس سے بطور سامان نفع لینا حرام ہے چوتھی چیز قیمت ہے کہ جس کسی چیز کا بازاری بھاؤ آپس میں طے ہوجاتا ہے۔ قیمت کہلاتا ہے۔ وہ بھاؤ چیز کی حیثیت سے اور معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ اور جو بھاؤ آپس میں طے ہوجائے۔ خریدار اور بیچنے والا آپس میں اس پر رضامند ہوجائیں۔ عربی میں اس کو ثمن کہتے ہیں۔ چنانچہ فتاوٰی ردالمحتار جلد چہارم صفحہ نمبر ۵۱ پر ہے:-

وَالْفَرْقُ بَیْنَ الثَّمَنِ وَالْقِیْمَةِ اَنَّ الثَّمَنَ مَا تَرَاضٰی عَلَیْهِ الْمُتَعَاقِدَانِ سَوَاءٌ زَادَ عَلَی الْقِیْمَةِ اَوْ نَقَصَ وَالْقِیْمَةُ مَا قُوِّمَ بِهِ الشَّیْءُ بِمَنْزِلَةِ الْمِعْیَارِ مِنْ غَیْرِ

زِیَادَۃٌ وَّلَا نُقْصَانٌ ؎ اس عبارت کا ترجمہ جو اوپر بیان ہوا۔ وہی ہے۔ ع۵ سب سے زیادہ سمجھنے کی چیز سود ہے۔ سود کی مختصر اور جامع تعریف وہ ہے۔ جو شامی تنویر الابصار میں جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۴۵ پر بیان فرمائی :

هُوَ فَضْلُ خَالٍ عَنْ عِوَضٍ بِمِعْيَارٍ شَرْعِيٍّ (الخ) (ترجمہ) یعنی سود جس کو شریعت میں ربٰی کہا جاتا ہے وہ زیادتی ہے۔ جو شریعتِ مطہرہ کے معیار سے بغیر عوض ہو۔ اس مختصر عبارت کی وضاحت مجدد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فرمودات کے مطابق اس طرح ہے۔ کہ جب کبھی ناپ یا تول کر فروخت کی جانے والی چیزوں کو ایک شی ہم جنس کے عوض فروخت کی۔ تو زیادتی اور ادھار دونوں حرام اور سود ہوں گے۔ جیساکہ حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ کہ گندم کو بھی فروخت کیا گندم کے بدلے، چاول چاول اور نمک نمک سے۔ ادھار بھی سود اور زیادتی بھی سود۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے۔ کہ دو طرفہ تولی یا ناپی تو ہوں۔ مگر جنس ایک نہ ہو تو زیادتی جائز ہے۔ ادھار حرام۔ اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ طرفہ کیلی، ناپی اور تولی چیز ہو۔ نہ ہم جنس ہو وہاں زیادتی بھی جائز ہے اور ادھار بھی جائز ہے شکل ثانی کی مثال صورت جیسے گندم کو چاول سے فروخت کیا یا نمک سے۔ تو زیادتی جائز ہے اور ادھار حرام ہے۔ تیسری شکل کی مثال جیسے انڈے کو فروخت کیا اخروٹ سے زیادتی ادھار دونوں جائز، چوتھی شکل یہ ہے۔ کہ ناپی یا تولی چیز کو غیر مقداری اور غیر جنس سے فروخت کیا۔ تو یہاں بیشی اور ادھار ہر دو جائز ہیں۔ علامہ شامی نے ردالمحتار جلد چہارم باب الربٰو میں فرمایا۔ کہ جہاں زیادتی حرام ہوتی ہے ادھار بھی حرام ہوتا ہے لیکن اس کا اُلٹ نہیں۔ اور جہاں ادھار جائز ہے زیادتی بھی جائز۔ خلاصہ یہ کہ سود صرف تب بنتا ہے۔ جب کہ دو طرفہ خرید و فروخت میں وزنی یا کیلی اور ہم جنس اشیاء ہوں اُن میں زیادتی یا ادھار کیا جائے۔ اتنی باتوں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب نوٹ کی حقیقت سمجھنی اشد ضروری ہے۔ تاکہ تفسیر نعیمی کی عبارت فہم میں آجائے۔ ع۶ نوٹِ مروجہ کے بارے میں بعض دیوبندی سفہاء نے بہت غلط نظریئے قائم کیے۔ وہ سب خام خیال ہیں۔ صحیح اور مضبوط بضوابط شرعیہ بات یہ ہے۔ کہ نوٹ نہ تولی چیز ہے۔ نہ ناپی ہوئی اور نہ ہی سونے چاندی کے ہم جنس ہے نہ ہم قدر۔ بلکہ نوٹ مال کی مذکورہ اقسام میں سے چوتھی قسم میں ہے۔ یعنی اصلیت کے اعتبار سے یہ سامان ہے کیونکہ کاغذ ہے اور اپنے رواج کے اعتبار سے یہ ثمن ہے پس کیلی وزنی نہ ہونے کی وجہ سے اس کو جس طرح چاہے فروخت کر سکتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد ہے :- عَنْ عُبَادَةَ بْنِ صَامِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ ؎ (ترجمہ) یعنی حضرت عبادہ بن صامت نے فرمایا۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب ان چیزوں کی جنس قدر وغیرہ مختلف ہو۔ تو جس طرح چاہو۔ فروخت کرو۔ اسی حدیث کی رعایت کی بنا پر فقہاء کرام

فرماتے ہیں۔ کہ ایک انڈا دو انڈوں سے فروخت کرسکتا ہے۔ کیونکہ قدریت اور جنسیت مختلف ہے۔ پس اسی طرح جائز ہے۔ کہ ایک نوٹ دو نوٹ کے بدلے خریدے یا فروخت کرے۔ شرعاً یہ سود نہ ہوگا۔ کاغذ کو نوٹ کس نے بنایا۔ خود انسان نے بنایا اور انسانی حکومت نے ہی اس پر دس ۱۰ بیس ۲۰ پچاس ۵۰ اور سو ۱۰۰ وغیرہ لکھ دیئے۔ کہ جب تک چاہے حکومت اُس کو اسی درجے پر رکھے۔ جب چاہے یہ درجہ ختم کر دے۔ تو جب تک یہ درجہ قائم رہے گا اس وقت وہ قیمت معینہ پر فروخت ہوتا رہے۔ جب اس کا یہ درجہ حکومت ختم کردے۔ تو وہی نوٹ اسی طرح خوب صورت حالت میں رہنے اور کتابت کی موجودگی کے باوجود اس قیمت پر نہیں بک سکتا۔ جیسا کہ زمانہ ماضی قریب میں اپنے ہی ملک پاکستان کے پانچ سو والے نوٹ کی حالت دیکھ لی تو معلوم ہوا۔ کہ قیمت نہ کتابت کی ہے اور نہ خوبصورتی کی بلکہ حکومت کی ذاتی رائے کی اور حکومت یا کسی شخص کی ذاتی رائے کوئی قرآن و حدیث کا فیصلہ نہیں جو جبراً مسلط کیا جائے لہٰذا جب حکومت دو پیسے کے کاغذ کو دس ۱۰ روپیہ میں فروخت کرسکتی ہے۔ تو میں بھی دس ۱۰ کے نوٹ کو پندرہ ۱۵ یا سو ۱۰۰ کو سوا ۱۲۵ سو میں فروخت کرسکتا ہوں۔ جب کہ خریدار عاقل بالغ، سمجھ دار لینے پر برضا و رغبت تیار ہو۔ اس میں نہ سود ہوگا۔ نہ حرام۔ جس طرح پہلے زمانے میں پیسے آنے تکے لوہے اور پیتل وغیرہ کے۔ چنانچہ فقہاء کرام ایک پیسہ دو پیسے کے بدلے فروخت کرنا جائز فرماتے ہیں۔ چنانچہ بحر الرائق جلد ششم صفحہ نمبر ۱۳۱ پر ہے۔ وَالْفَلْسِ بِالْفَلْسَيْنِ بِاَعْيَانِهِمَا اَیْ وَصَحَّ بَيْعُ الْفَلْسِ الْمُعَيَّنِ بِفَلْسَيْنِ مُعَيَّنَيْنِ عِنْدَ هُمَا الخ (ترجمہ):۔ ایک پیسہ دو پیسوں کے بدلے فروخت کرنا جائز ہے شیخین کے نزدیک اور یہ فروخت کرنا کیوں جائز ہے۔ اس لیئے کہ نوٹ یا پیسہ دراصل کاغذ کا ایک ٹکڑا اور لوہے، پیتل کا پترا ہے اُن کی معینہ قیمت لوگوں کی اپنی اصطلاح سے مقرر ہوئی۔ لہٰذا کمی اور زیادتی سود نہ ہوگی۔ جائز ہوگی۔ اور شریعتِ مطہرہ نے ہر شخص کی اصطلاح پر اس کو پورا پورا جائز اختیار دیا ہے۔ جس پہ کسی غیر کا جبر اور تسلط نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ہدایہ شریف میں ہے۔ جلد دوم صفحہ نمبر ۸۳ پر ہے کہ (يَجُوزُ بَيْعُ الْفَلْسِ بِالْفَلْسَيْنِ بِاَعْيَانِهِمَا (الخ) وَلَهُمَا اَنَّ الثَّمَنِيَّةَ فِي حَقِّهِمَا تَثْبُتُ بِاصْطِلَاحِهِمَا اِذْ لَا وِلَايَةَ لِلْغَيْرِ عَلَيْهِمَا۔ (الخ) (ترجمہ):۔ یعنی آپس میں خرید و فروخت کرنے والے جس بھاؤ پر راضی ہو جائیں۔ شرعاً بالکل جائز ہے۔ اس لیئے فتاویٰ فتح القدیر جلد پنجم صفحہ نمبر ۴۲۵ پر اور فتاویٰ ردّ المحتار لابن عابدین رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۸۳ پر ارشاد ہے:۔ حَتّٰى لَوْ بَاعَ كَاغِذَةً بِاَلْفٍ يَجُوزُ وَلَا يُكْرَهُ (وَسْطُ بَيْعِ كَفَالَتِ عِنْدَ مَطْلَبِ بَيْعِ الْعِيْنَةِ) (ترجمہ) یہاں تک کہ اگر کسی شخص نے ایک کاغذ کا ٹکڑا ہزار روپیہ میں فروخت کیا۔ تو بالکل جائز ہے بغیر کراہت۔ خلاصہ یہ کہ نوٹ مروجہ ہر شخص زیادتی، کمی سے فروخت کرسکتا ہے۔ جس طرح کہ ہر سامان برتن وغیرہ اپنے بھاؤ سے فروخت کیئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح نوٹ اور پیسے بھی کیونکہ یہ دراصل سامان ہی ہیں ان کو سونے اور چاندی کے

درجے میں لانا عوام کا کام ہے۔ جس کو ہر وقت تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بخلاف سونے اور چاندی کے۔ کہ اُن کو شریعت اور قدرت نے ثمن بنایا۔ کوئی حکومت بھی اس کو ثمنیت سے نہیں گرا سکتی۔ اس کی زیادتی سود ربوٰ ہوگی۔ تفسیر نعیمی نے یہی فرمایا ہے کہ اس جائز طریقے سے لین دین کیا جائے۔ اور اس کو سامان کا درجہ دے کر آپس میں خرید و فروخت کیا جائے۔ تو زیادتی اور ادھار دونوں جائز بھی رہیں گے۔ ایک دوسرے کی ضرورت بھی پوری ہوتی رہے گی۔ مگر یہ حکومتی سطح پر اگر کیا جائے۔ تو پاکستان میں بلا مشقت سودی کاروبار کی حرمت سے لوگ بچ سکتے ہیں۔ رہا موجودہ طریقہ اس میں سود بھی ہوتا ہے۔ جو حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس کا دوسرا درجہ بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ کیونکہ اصطلاحاً ثمن بنا یا گیا۔ اسی لیے اس پر زکوٰۃ بھی فرض ہو جاتی ہے۔ پس جب ثمنیت کا لحاظ رکھ کر سونے اور چاندی کے درجے میں لایا جائے گا۔ تو زکوٰۃ بھی فرض ہوگی۔ اور زیادتی سود بھی موجودہ دور میں بینکوں، ڈاکخانوں سے سود خوار لوگ نوٹ کو ثمن کے درجے میں رکھ کر پھر زیادتی لیتے ہیں۔ اس لیے اس لین دین کو قرضہ کا نام دیا جاتا ہے۔ دیوبندی مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے فتاوٰی رشیدیہ صفحہ ۱۶۱ میں نوٹ کی جو کیفیت بیان کی ہے۔ وہ ان کی نا سمجھی ہے۔ اس کو شرعاً قابل قبول نہ سمجھا جائے گا۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

دارالاسلام اور دارالحرب کون ہے:۔

اور کیا دارالحرب کے مسلمان سے سود لینا مسلمان کو جائز ہے

سوال نمبر ۲۹ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ برطانیہ انگلینڈ دارالحرب ہے یا دارالاسلام، جب کہ یہاں عام طور پر جمعہ۔ عیدین۔ اذان۔ قربانی۔ وغیرہ کی اجازت ہے۔ لیکن تاریخ کی روشنی میں کبھی اسلامی حکومت کے قیام کا پتہ نہیں چلتا۔ نیز یہاں کے عیسائیوں یہودیوں و دیگر کفار و مشرکین سے سود لینا کیسا ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے شراب کی تجارت یا مردار گوشت کی خرید و فروخت کے بارے کیا حکم ہے کیا اس ملک میں شراب کا فروخت کرنا درست ہے اور خریدنا یا بنانا کیسا ہے حرام یا حلال۔ اگر کوئی مسلمان شراب خرید کر یہاں بلا امتیاز مذہب و ملت فروخت کرے۔ تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا

سائل محمد حسین خان چیرمین اسلامک سنٹر المرکز الاسلامی :۔

۱۲ اے صدر لینڈ اسٹریٹ لیسٹر۔ ۸۷ ۱۸۵

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

صورتِ مسئولہ میں جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے۔ وہ تو صرف آپ کے بیان تک محدود ہے۔ میں نے بذاتِ خود برطانیہ کا ماحول نہیں دیکھا صرف آپ کے بیان سے ظاہر ہے کہ وہاں اسلامی عبادات و شعائر پر کوئی پابندی نہیں۔ جمعہ۔ عیدین۔ اذان۔ قربانی وغیرہ کی منجانبِ حکومت برطانیہ اجازت عام ہے اور ہر مسلمان ان عباداتِ شرعیہ کو مکمل آزادی سے ادا کر سکتا ہے۔ آپ کے اس بیان کی درستگی کی صورت میں قانون شریعت کے مطابق۔ برطانیہ کا علاقہ دارالاسلام ہے نہ کہ دارالحرب اور وہاں کے مسلمان باشندوں کو مسلمانوں سے سود لینا یا دینا قطعاً حرام ہے۔ جس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔ دلیل ۱:۔ اس لیے کہ لغوی و اصطلاحی اعتبار سے۔ دارالاسلام کے معنی ہیں سلامتی کا دار اور لفظ دار کے معنیٰ اس جگہ ایک ملک اور ایک پورا علاقہ ہے۔ خواہ سارے علاقے کا بادشاہ ہو یا چند۔ دارالاسلام کا فقہی معنیٰ ہے۔ وہ ملک جس میں دو طرفہ سلامتی ہو۔ مسلمانوں کی طرف سے اس طرح کہ وہاں جہاد کرنا اور اس ملک پر بادشاہت پر حملہ کرنا واجبِ شرعی نہ ہو۔ اور کافروں کی طرف سے اس طرح کہ مسلمانوں کو اپنی عبادات پوری آزادی سے ادا کرنے میں کوئی قانونی یا تعصبانہ رکاوٹ نہ پڑے۔ لفظ دارالحرب میں حرب کے معنیٰ ہیں جنگ کرنا۔ یعنی وہ ملک جس پر جہاد کرنا واجب ہو جائے۔ وہاں سلامتی شرعی باقی نہ رہے نہ کافروں کی طرف سے اس طرح کہ وہ کفار مسلمانوں کو عباداتِ شرعیہ مثلاً۔ قربانی، اذان، جمعہ، عیدین۔ نکاح۔ طلاق وغیرہ رسوماتِ اسلامیہ میں اسلامی رواج پہ پابندی لگائیں۔ اور نہ مسلمانوں کی طرف سے وہاں سلامتی باقی رہے۔ اس طرح کہ ان سے جہاد واجب ہو۔ خیال رہے کہ مذہبِ اسلام میں ہر کفرستان سے جہاد کرنا لازم نہیں بلکہ صرف دارالحرب سے جس کو دارالکفر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مقصدِ اسلام کفر کو مٹانا نہیں بلکہ کفر کا زور توڑنا ہے اور اسلام کی بالادستی ظاہر کرنا ہے پس جہاں جہاں اسلام کی بالادستی ثابت ہو جائے۔ وہ دارالاسلام کہلائے گا۔ اگرچہ وہاں کا بادشاہ یا صدر وغیرہ کافر ہوں۔ ادائے شعائر اسلامیہ و عبادات شرعیہ کی آزادی بھی اسلام کی بالادستی ہے۔ شرعی تقسیم کے مطابق ملک چار قسم کے ہیں۔ ۱۔ دارالایمان۔ جہاں بادشاہ بھی مسلمان ہو اور کثرت رعیت بھی مسلمان ہو۔ اور مکمل اسلامی قانون یعنی نظام مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نافذ ہو۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے :۔ وَادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّۃً۔ (ترجمہ) :۔ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ ۲۔ دارالاسلام جہاں اسلام کے اصولی شعائر اور عبادات کے ادا کرنے میں روک ٹوک نہ ہو۔ اگرچہ وہاں کا بادشاہ وغیرہ حکام کافر ہوں اور رعایہ بھی کفر میں زیادہ ہو مسلمان اقلیت میں ہوں ۳۔ کفرستان جس کو عربی میں سلطنتِ کفر کہا جاتا ہے۔ جہاں کا بادشاہ بھی کافر اور رعایہ کفر کی اکثریت ہو۔ عام ہے اسبات کو کہ شرعی عبادت

میں ان کا ووٹ ہو یا نہ ہو۔ ع۳ دار الحرب وہ ملک ہے جہاں بادشاہ کافر ہو کفار کی اکثریت ہو اور مسلمان اقلیت میں ہوں۔ عبادات جمعہ و عیدین وغیرہ کی آزادی نہ ہو۔ گویا کہ کفرستان کی دو قسمیں ہیں ع۱ دار الحرب اور ع۲ دار الاسلام۔ سوال مذکورہ کے بیان کے مطابق برطانیہ وہ کفرستان ہے۔ جس کو شرعی قواعد کے لحاظ سے دار الاسلام کہا جاتا ہے بہر دار الایمان کا نام بھی دار الاسلام ہوتا ہے۔ کیونکہ دار الاسلام کا لقب عمومی ہے۔ دار الاسلام میں رہنے والے باشندوں کو اہلِ دار ع۲ یا ذمی ع۳ یا ستامن کہا جائے گا۔ اور دار الحرب میں رہنے والوں کو مسلمان یا حربی کہا جائے گا۔

بقاعدۂ اسلامیہ دار الحراب میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے دو خصوصی قانون ہیں پہلا یہ کہ وہاں سے جلد از جلد ہجرت کر کے کسی بھی دار الاسلام میں چلے جائیں۔ یہ شرعی ہجرت قیامت تک جاری و نافذ ہے۔ چنانچہ حاشیہ نسائی شریف جلد دوم ص۱۸۲ اور نووی شرح مسلم جلد دوم صفحہ نمبر ص۱۳۰ پر ہے:۔ قَالَ اَصْحَابُنَا وَغَیْرُھُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ اَلْھِجْرَۃُ مِنْ دَارِ الْحَرْبِ اِلٰی دَارِ الْاِسْلَامِ بَاقِیَۃٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ ۔ (ترجمہ) ہمارے اصحاب اور دیگر علماء اسلام نے فرمایا کہ دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنے کا حکم قیامت تک جاری ہے اور باقی ہے۔ اور بقاء جواز و وجوب کے درجے میں ہے۔ چنانچہ نووی ع۱۳۰ نے فرمایا۔ وَقِیْلَ اِنَّمَا کَانَتْ وَاجِبَۃً عَلٰی مَنْ لَمْ یُسْلِمْ کُلُّ اَھْلِ بَلَدِہٖ لِئَلَّا یَبْقٰی فِیْ طُلُوْعِ اَحْکَامِ الْکُفَّارِ ۔ (ترجمہ)۔! اور کہا گیا ہے کہ جس ملک کے اکثر باشندے مسلمان نہ ہوں بلکہ نقصان دِہ کافر ہوں تو مسلمان کو وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دار الحرب کی طرف مسلمانوں کو لوٹ کر جانا حرام ہے۔ چنانچہ شرح نووی نے اسی صفحہ پر فرمایا:۔ قَالَ قَاضِیْ عِیَاضُ اَجْمَعَتِ الْاُمَّۃُ عَلٰی تَحْرِیْمِ تَرْکِ الْمُھَاجِرِ ھِجْرَتَہٗ وَرُجُوْعَہٗ اِلٰی وَطَنِہٖ ۔ (ترجمہ)۔! قاضی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ مہاجر کو دار الحرب کی ہجرت چھوڑ کر پھر اپنے وطن کی طرف لوٹنا حرام ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو دار الحرب میں رہنا ہی جائز نہیں وہاں سے نکل کر دار الاسلام میں آکر بسنا واجب ہے۔ حربیوں سے سود لینے کا مسئلہ تو بعد کی چیز ہے۔ دوسرا قانون یہ ہے کہ دار الحرب میں رہنے والے مسلمان حربی کافروں سے سود لے سکتے ہیں۔ چنانچہ ھدایہ جلد سوم صفحہ نمبر ص۸۵ پر ہے۔

وَلَنَا قَوْلُہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ ۔ لَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ ۔ (ترجمہ) یعنی امام اعظم اور امام محمد علیہما الرحمۃ ان دو بزرگوں کا مذہب ہے کہ دار الحرب میں حربی کافر اور مسلمان کے درمیان زیادتی کی قرض میں یا ہم جنس کی خرید و فروخت میں سود نہیں بنتی یعنی حرام نہیں ہوتی وہ ہر دو بزرگ فرماتے ہیں کہ ہماری ایک دلیل تو نبی کریم علیہ السلام کا یہ فرمان ہے کہ دار الحرب میں مسلمان اگر حربی کافر سے سود لے لے تو وہ حرام نہ ہوگا۔ اس حدیث پاک کو کتب احادیث اور بیہقی شریف نے روایت کیا جیسا کہ الدرایہ للھدایہ نے ص۲۸۶

پر نقل فرمایا۔ اس روایت مبارکہ پہ بہت جرح ہے جس کا اختصاراً آگے ذکر کیا جائے گا۔ امام اعظم کی دوسری دلیل ھدایہ سوم صـ۸۰ پر اس طرح ہے۔ وَلِاَنَّ مَالَهُمْ مُبَاحٌ فِیْ دَارِهِمْ فَبِاَیِّ طَرِیْقٍ اَخَذَهُ الْمُسْلِمُ اَخَذَ مَالًا مُّبَاحًا۔ ترجمہ:۔ اور اس لیئے دارالحرب میں کفار سے سود لینا جائز ہے کہ ان کا مال دارالحرب میں مسلمانوں کے لیئے حلال ہے۔ تو جس طرح بھی مسلمان نے ان کا مال لیا حلال مال۔ دارالحرب میں مسلمانوں کے لیئے دو حکم ہیں۔ پہلا یہ کہ مسلمان کو دارالحرب کی سکونت جائز ہی نہیں اس قانون میں سب ائمہ مجتہدین و مشائخ اسلام کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ قاضی عیاض علیہ الرحمہ کا قول مذکور ہوا۔ مگر دوسرا قانون یعنی حربی کافر سے سود لینا مسلمانوں کو جائز ہے اس میں بہت جرح اور بہت اختلاف ہے۔ **پہلا اختلاف** یہ ہے کہ اس مسلک کو صرف امام اعظم نے اور ان کے شاگردِ دوم امام محمد رضی اللہ تعالیٰ عنھما نے نقل فرمایا۔ چنانچہ شرح عنایہ جلد پنجم صفحہ نمبر صـ۳۰۰ پہ ہے لَا رِبٰی بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ عِنْدَ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ (ترجمہ):۔ یعنی یہ مسئلہ کہ حربی کافر اور مسلمان کے آپس میں سود جائز ہے صرف امام اعظم اور امام محمد کا ہے۔ لیکن باقی ائمہ اس کے خلاف ہیں چنانچہ فتح القدیر جلد پنجم صفحہ نمبر صـ۳۰۰ پر ہے:۔ خِلَافًا لِاَبِیْ یُوْسُفَ وَالشَّافِعِیِّ وَمَالِكٍ وَاَحْمَدَ۔ ترجمہ۔ یہ قول امام یوسف، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل سب کے خلاف ہے۔ گویا کہ ان بزرگوں کے نزدیک دارالحرب میں بھی کسی مسلمان سے سود لینا حرام ہے۔ چہ جائیکہ دارالاسلام

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امام اعظم نے دارالحرب میں سود کے جواز پر دو دلیلیں قائم فرمائیں دوسری دلیل سے ثابت ہو رہا ہے کہ صرف مسلمان مرد۔ کافر حربی سے سود لے سکتا ہے مگر حربی مرد مسلمان سے سود نہیں لے سکتا گویا کہ مسلمان کو سود لینا جائز دینا منع جب کہ پیش کردہ پہلی دلیل والی حدیث سے ثابت ہو رہا ہے۔ کہ لینا بھی جائز دینا بھی کہ وہاں مطلقاً لاربٰو ہے۔ ہر دو دلیل میں تعارض پیدا ہو گیا۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ امام صاحب کی پیش کردہ حدیث پاک میں اس طرح جرح ہے کہ حاشیہ چلپی جلد پنجم نے صفحہ نمبر صـ۳۰ پر اس روایت کو مجہول کہا۔ چنانچہ لکھتا ہے:۔ هٰذَا خَبَرٌ مَّجْهُوْلٌ لَمْ یُرْوٰی فِیْ صَحِیْحٍ وَلَا مُسْنَدٍ وَلَا كِتَابٍ مُوْثَقٍ بِهٖ (ترجمہ) یہ روایت مجہول ہے۔ اس لیئے کہ اس کو نہ کسی صحیح نے روایت کیا نہ مسند نے نہ معتبر کتاب نے۔ فتح القدیر جلد پنجم نے صفحہ نمبر صـ۳۰۰ پر اس کو غریب کہا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ هٰذَا الْحَدِیْثُ غَرِیْبٌ۔ ترجمہ:۔ یہ روایت غریب ہے۔ مجہول ہونے کی وجہ تو صاحب کتاب نے خود بتا دی۔ مگر غریب وہ روایت ہوتی ہے جو عدالۃً تو صحیح ہو لیکن اس کے پاس کثرتِ رواۃ کی دولت نہ ہو صرف ایک ہی عادل ثقہ راوی نے روایت کی ہو اور یہ وحدت ہی اس کی کمزوری کی دلیل ہوتی ہے۔ **چوتھا اختلاف** یہ ہے کہ امام اعظم و امام محمد علیہما الرحمۃ

نے تو اس حدیث کے الفاظ لا ربوا کا یہ مطلب لیا ہے کہ سود حرام نہیں دار الکفر میں۔ یعنی حرف لا نے حرمت کی نفی کر دی مگر حاشیہ سعدی چلپی جلد پنجم نے صت۳ پر اس حرف لا کو لائے نہی کے درجے میں رکھا اور اس سے، دار الحرب میں بھی سود کی ممانعت کا احتمال نکالا۔ اور اپنے احتمال کی دلیل میں وہ آیت پیش کر دی جس میں ہے:۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔ چنانچہ تحریر ہوا:۔ وَیَحْتَمِلُ اَنَّ الْمُرَادَ بِقَوْلِہٖ لَا رِبٰو۔ اَلنَّہْیُ عَنِ الرِّبٰوا کَقَوْلِہٖ تَعَالٰی فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔ تَرْجَمَۃٌ:۔ وہی ہے جو اوپر ہوا۔ تو جس طرح لَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ کا یہ مطلب ہے کہ حج کے سفر میں گناہ فسق اور لڑائی جھگڑا مت کرو اسی طرح لَا رِبٰو فِیْ دَارِ الْحَرْبِ کا مطلب بھی یہ ہے کہ دار الحرب میں بھی سود کا لینا دینا نہ کرو۔ مگر یہ دلیل تو ہے **پانچواں اختلاف**:۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ صاحب ھدایہ نے دار الحرب میں سود کے جواز پر جس روایت پاک کو امام اعظم اور امام محمد کی دلیل بنا کر پیش کیا وہ روایت نہ مسند امام اعظم میں ہے نہ موطا امام محمد میں دار الحرب میں سود کے جواز پر تیسری دلیل فتح القدیر پنجم نے یہ دی کہ صدیق اکبر نے مکہ مکرمہ میں مشرکین سے شرط کا جوا کھیلا غلبۂ روم کے واقع پر اور چونکہ مکہ اس وقت دار الشرک اور دار الحرب تھا اس لیے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس جوئے کو جائز قرار دیا۔ یہ استدلال بھی کمزور ہے۔ اس لیے کہ جوئے کی شرط یہ ہے کہ دو طرفہ بے یقینی اور انجام سے لاعلمی ہو یہی اس کی وجہ حرمت ہے صدیق اکبر کو غلبۂ روم کا یقین کامل تھا کیونکہ قرآن کریم نے خبر دی تھی۔ اسی بنا پر نبی کریم نے اجازت دے دی نہ کہ دار الحرب ہونے کی وجہ سے کیونکہ اس وقت تک دار الحرب کے احکام نازل نہ ہوئے تھے ورنہ اسی وقت ہجرت بھی واجب ہو جاتی۔ ان مندرجہ بالا اختلافات کی بنا پر اگر میں اپنی اس تحقیق کی رو سے یہ کہہ دوں کہ دار الحرب میں بھی مسلمان حربی سے سود لینا دینا حرام ہے۔ تو باطل نہ ہوگا۔ اور یہ کہ جواز کی نسبت امام اعظم وغیرہ کی طرف غیر صحیح ہے۔ جب دار الحرب کے سود کا یہ حال ہے اور اس کے جواز میں اتنی کمزوریاں ہیں تو وہ علاقے جن کو شریعت دار السلام، فرماتی ہے وہاں سود کس طرح جائز ہو سکتا ہے لہٰذا میری علمی تحقیق کے مطابق برطانیہ اور اس جیسے دوسرے علاقے میں سود مطلقاً حرام ہے۔ خواہ مسلمان سے لینا ہو یا دینا اس کی وجہ یہ ہے کہ بقاعدۂ شرعیہ یہ ممالک دار الاسلام ہیں جیسا کہ آگے ثابت کیا جائے گا۔ بعض فاضل دیوبند محض سود خوری کی لالچ میں۔ ان جیسے علاقوں کو بے سوچے سمجھے دار الحرب کہہ جاتے ہیں اور پھر دھڑا دھڑ بینکوں اور لوگوں سے سود لیتے رہتے ہیں اور ھدایہ کی اسی عبارت کو دلیل میں لاتے ہیں جن کا ہم نے کافی وشافی جواب

دے دیا۔ یہ اللہ کے بندے یہ نہیں سوچتے کہ اگر یہ ملک دارالحرب ہے تو یہاں رہنا ہی جائز نہیں۔ اس مسئلے کو تو چھوتے نہیں اور جس دارالحرب سے ہجرت کرنا واجب تھی وہاں ڈٹ کر بیٹھے ہوئے ہیں یعنی مجتہدین کرام کا اجماعی مسئلہ تو مانتے نہیں لیکن جس میں اختلاف کثیرہ وافتراق شدیدہ واتحاد عدیدہ ہیں اس کو اپنی پیٹ پرستی کے لیے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں یہ فضلا تو اختراعی وافترائی فتوے خود ہی جواز سود کے لیے بنا لیتے ہیں کہ خود ہی کسی علاقے کو بلاوجہ دارالحرب بنا دیا اور پھر خود ہی وہاں کا سود حلال کر دیا۔ اور ہجرت کے حکم کو ذرا نہ دیکھا۔ ادھر عوام کا یہ حال ہے کہ پریشان و سرگرداں ہیں کہ کسی طرح سود حلال ہو جائے۔ پھر جس کو دارالحرب کہنے کہلانے پر مصر ہیں اسی کی طرف دوڑ لگانے وہیں سے لگانے ملازمت بنانے میں مشغول۔:

حالانکہ پہلے ثابت کر دیا کہ دارالحرب کی طرف جانا مسلمان کو حرام ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ برطانیہ وغیرہ مت جاؤ۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہاں جا کر سود۔ جوا۔ خنزیر وغیرہ کی حرام دولت سے بچو اس طرح کہ سود نہ لو نہ دو جوا نہ کھیلو نہ کھلاؤ خنزیر نہ بیچو نہ خریدو۔ کیونکہ برطانیہ وغیرہ دارالحرب نہیں بلکہ دارالاسلام ہیں جس کے بہت دلائل ہیں یہ پہلی دلیل تو ابھی تک کی گفتگو میں مکمل ہوئی۔ **دلیل دوم**۔ یہ ہے کہ فقہاء اسلام نے دارالاسلام کے لیے ایک کلیہ باندھا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دارالحرب یا دارالاسلام بادشاہت یا حکومت کا نام نہیں بلکہ قانونی آزادی کا نام دارالاسلام ہے۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد اوّل صفحہ نمبر [illegible] پر ہے:۔

اَلْبِلَادُ الَّتِیْ فِیْ اَیْدِی الْکُفَّارِ بِلَادُ الْاِسْلَامِ لَا بِلَادُ الْحَرْبِ لِاَنَّھُمْ لَمْ یُظْھِرُوْا فِیْھَا حُکْمَ الْکُفْرِ بَلِ الْقُضَاۃُ وَالْوُلَاۃُ مُسْلِمُوْنَ یُطِیْعُوْنَھُمْ عَنْ ضَرُوْرَۃٍ اَوْ بِدُوْنِھَا وَکُلُّ مِصْرٍ فِیْہِ وَالٍ مِنْ جِھَتِھِمْ یَجُوْزُ لَہٗ اِقَامَۃُ الْجُمَعِ وَالْاَعْیَادِ وَالْحَدِّ:۔

ترجمہ:۔ وہ شہر جو کافروں کے قبضے میں ہیں وہ دارالاسلام ہیں نہ کہ دارالحرب اس لیے کہ ان ملکوں میں اگرچہ بادشاہت کفر کی ہے مگر قانون کفر کا جاری نہیں بلکہ سیاسی قانون ہیں اور حکام و قاضی مفتی مسلمان ہی ہیں ضرورت بے ضرورت میں مسلمان ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور وہ شہر جن میں کافر حکام ہیں ان میں بھی مسلمانوں کو جمعہ۔ عیدین اور حدود قائم کرنے کی اجازت ہے اس دلیل سے واضح ہو گیا کہ دارالاسلام ہونے کے لیے کونسی شرطیں ہیں۔ **دلیل سوم**۔ کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے۔ کہ مسلمان وہاں اذان۔ جماعت۔ جمعہ عیدین با سہولت قائم کر سکیں۔ حدود شرعیہ کا قائم کرنا حتمی شرط نہیں۔ چنانچہ فتاوی بزازیہ جلد سوم ص[illegible] پر ہے:۔ قَالَ سَیِّدُ الْاِمَامِ۔ وَالْبِلَادُ الَّتِیْ فِیْ اَیْدِی الْکَفَرَۃِ اَلْیَوْمَ لَا شَکَّ اَنَّھَا بِلَادُ الْاِسْلَامِ بِعَدَمِ اِتِّصَالِھَا بِبِلَادِ الْحَرْبِ وَلَمْ یُظْھِرُوْا فِیْھَا اَحْکَامَ الْکُفْرِ۔ اور آگے کچھ فرماتے ہیں:۔

وَاَمَّا الْبِلَادُ الَّتِیْ عَلَیْھَا وُلَاۃُ کُفَّارٍ فَیَجُوْزُ فِیْھَا اَیْضًا اِقَامَۃُ الْجُمَعِ وَالْاَعْیَادِ۔ (الخ) وَبَعْدَ اِسْتِیْلَائِھِمْ اِعْلَانُ الْاَذَانِ اَوِ الْجُمَعِ وَالْجَمَاعَاتِ وَالْحُکْمُ بِمُقْتَضَی الشَّرْعِ وَالْفَتْوٰی وَالتَّدْرِیْسُ ذَائِعٌ بِلَا نَکِیْرٍ مِنْ مُلُوْکِھِمْ فَالْحُکْمُ بِاَنَّھَا مِنْ بِلَادِ الْحَرْبِ لَاجِھَۃَ لَہٗ۔ (الخ) وَاِعْلَانُ بَیْعِ الْخُمُوْرِ وَالْقَرَابِیْ وَالْمَکُوْسِ کَاِعْلَانِ بَنِیْ قُرَیْظَۃَ بِالتَّھَوُّدِ وَطَلَبِ الْحُکْمِ مِنَ الطَّاغُوْتِ فِیْ مُقَابِلَۃِ مُحَمَّدٍ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ فِیْ عَھْدِہٖ بِالْمَدِیْنَۃِ وَمَعَ ذٰلِکَ کَانَتْ بَلْدَۃَ الْاِسْلَامِ بِلَا رَیْبٍ۔ :- ان تمام عبارات کا (ترجمہ) :- یہ ہے:- اور وہ شہر جو کفار کے قبضے میں ہیں۔ آج کل۔ نہیں ہے شک اس بات میں کہ وہ بالکل اسلامی شہر ہیں کیونکہ وہ دارالحرب سے متصل نہیں ہیں اور نہ ان میں کفریہ احکام غالب ہیں اور لیکن وہ شہر جن پر کافر حکام مسلّط ہیں تو ان میں جمعہ اور عیدین کا قائم کرنا بھی مکمل اجازت سے جائز رکھا ہوا ہو اور ان کافروں کے غلبے کے بعد بھی اذان جمعہ اور جماعتوں کا علانیہ اذنِ عام جاری رہے اور شریعت کے حکموں پر مسلمان کاربند رہیں اور شرعی فتاوے اور دینی مدرسے بلا روک ٹوک شائع اور جاری رہیں ان کے بادشاہوں کی طرف سے اجازت ہو۔ اس کے باوجود ان علاقوں کو دارالحرب کہنا بلاوجہ ہے اس قول کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ عذر رکھنا کہ وہاں علانیہ شراب بکتی ہے اور ڈھول باجے بجائے جاتے ہیں۔ یہ عذر غلط ہے اگرچہ طبلہ سارنگی اور شراب کا علانیہ تجارت کفرستان اور کفار کی نشانیاں ہیں مگر ان سے وہ دارالحرب نہ بنے گا بلکہ یہ حرام اور غیر اسلامی کام اسی طرح ہیں جیسے کہ بنی قریظہ کافروں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقابلے میں یہودی رسمیں اختیار کیں اور بت پرستی۔ شروع کر دی اور یہ سب حرام کام مدینہ پاک میں کیے حالانکہ مدینہ پاک بلاشبہ دارالاسلام تھا۔ ثابت ہوا کہ کفار کی سلطنت اور شرکیہ کفریہ باتوں کے باوجود اگر وہاں اسلامی کاموں میں رکاوٹ نہ پڑے تو وہ علاقہ دارالاسلام ہے۔ **دلیل چہارم** کسی بھی علاقے کو دارالاسلام کہنے کے لیے صرف ایک شرط کافی ہے کہ وہاں ظاہر ظہور بلا جھجک اسلامی کام مسلمان کرتے ہوں مثلاً اذان وغیرہ۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صـ۲۳۲ پر ہے۔ اِعْلَمْ اَنَّ دَارَ الْحَرْبِ تَصِیْرُ دَارَ الْاِسْلَامِ بِشَرْطٍ وَاحِدٍ وَھُوَ اِظْھَارُ حُکْمِ الْاِسْلَامِ فِیْھَا۔ ترجمہ:- دارالحرب صرف ایک بات سے دارالاسلام بن جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی حکم وہاں ظاہر ظہور جاری ہوں۔ **دلیل پنجم**۔ جس طرح کہ ساری دنیا اور انسانی آبادی میں سلطنتیں صرف چار قسم کی ہیں۔ اسی طرح دنیا بھر کے قانون صرف تین قسم کے

ہیں ۱ اسلامی قانون ۲ سیاسی قانون ۳ کفریہ قانون۔ اسلامی قانون تو شریعت اسلامیہ کے قانون ہیں۔ سیاسی قانون وہ ہے۔ جس کو کوئی بھی بادشاہ اپنے ملک کو باامن باقی رکھنے اور چلانے کے لیے خودساختہ، منظم و متفق جاری کرے۔ جیسا کہ آج کل برطانیہ وغیرہ میں جاری ہے اگرچہ اس میں قوانین اسلامیہ کی ملاوٹ ہو کفریہ قانون یہ ہے کہ دیگر مذاہب والوں کے قانون اور عبادات برداشت نہ کی جائیں خصوصًا اسلامی باتیں۔ جب یہ ذہن نشین ہوگیا تو سمجھ لو کہ جس کفرستان میں اسلامی یا سیاسی قانون جاری ہوں وہ دارالاسلام ہے۔ اور جس کافر حکومت میں کفریہ قانون جاری ہوں وہ دارالحرب ہے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صـ۲۳۲ پر ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی الزِّیَادَاتِ اِنَّمَا تَصِیْرُ دَارُ الْاِسْلَامِ دَارَ الْحَرْبِ عِنْدَ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی بِشُرُوْطٍ ثَلَاثَۃٍ اَحَدُھَا اِجْرَاءُ اَحْکَامِ الْکُفَّارِ عَلٰی سَبِیْلِ الْاِشْتِھَارِ وَ اَنْ لَّا یُحْکَمَ فِیْھَا بِحُکْمِ الْاِسْلَامِ وَ الثَّانِیْ اَنْ تَکُوْنَ مُتَّصِلَۃً بِدَارِ الْحَرْبِ۔ وَالثَّالِثُ اَنْ لَّا یَبْقٰی فِیْھَا مُؤْمِنٌ وَّلَا ذِمِّیٌّ اٰمِنٌ بِاَمَانِ الْاَوَّلِ (الخ) وَقَالَ اَبُوْ یُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَھُمَا اللّٰہُ تَعَالٰی بِشَرْطٍ وَّاحِدٍ لَّا غَیْرُ وَھُوَ اِظْھَارُ اَحْکَامِ الْکُفْرِ۔ فتاوٰی شامی جلد سوم صـ۳۲۹ پر ہے۔ لَا تَصِیْرُ دَارُ الْاِسْلَامِ دَارَ الْحَرْبِ اِلَّا بِاُمُوْرٍ ثَلَاثَۃٍ۔ ترجمہ:۔ امام محمد نے زیادات کتاب میں فرمایا کہ دارالحرب تین چیزوں سے بنتا ہے ایک یہ کہ قانونِ کفر علانیہ مکمل طور پہ جاری ہوں یعنی قطعی طور پہ اسلام کا کوئی قانون جاری نہ ہونے دیں نماز اذان نہ جمعہ وغیرہ دوسری یہ کہ وہ ملک سب طرف دارالحرب میں گھرا ہو کسی دارالاسلام سے اتصال نہ ہو۔ تیسری یہ کہ مومنوں کو وہاں امن نہ ہو۔ امام یوسف نے فرمایا کہ اصل شرط ایک ہی ہے وہ یہ کہ قانون کفر جاری ہو۔

دلیل ششم۔ یہ ضروری نہیں کہ پورے اسلامی قانون جاری ہوں تب دارالاسلام بنے بلکہ بعض۔ اسلامی عبادات کو آزادی سے ادا کرنا یہ ہی اس کے دارالاسلام بنانے کے لیے کافی چنانچہ۔ طحطاوی شریف جلد دوم میں ہے:۔ وَ ظَاھِرُہٗ اَنَّہٗ لَوْ اُجْرِیَتْ اَحْکَامُ الْمُسْلِمِیْنَ وَ اَحْکَامُ اَھْلِ الشِّرْکِ لَا تَکُوْنُ دَارَ حَرْبٍ۔ (ترجمہ):۔ ظاہر کلام یہ ہے کہ اگر کسی علاقے کفر میں مسلمانوں کے قانون بھی جاری ہوں اور مشرکوں کو بھی اپنے قانون جاری کرنے کی اجازت عام ہو تو وہ دارالحرب نہیں ہوگا۔ بلکہ دارالاسلام کہلائے گا۔ اسی کا نام سیاسی قانون ہے۔ **دلیل ہفتم**:۔ دارالحرب میں جانا منع ہے اور مسلمان حکومتوں پر اُن سے جنگ کرنا واجب ہے۔ چنانچہ فتاوٰی بزازیہ جلد سوم صفحہ نمبر ۳۰۹ پر ہے وَالْقِتَالُ مَعَ اَھْلِ الْحَرْبِ لِیَرْجِعُوْا اِلٰی حُکْمِ اللّٰہِ وَاجِبٌ بِالنَّصِّ۔ (ترجمہ) نصِ قطعی سے ثابت ہے کہ دارالحرب سے جنگ کرنا واجب ہے تاکہ وہ اللہ کے قانون کی طرف مائل

ہوں۔ اسی لیے جنگ واجب ہوئی کہ وہاں اسلامی قانون میں رکاوٹ پیدا ہوئی آج کل سیاسی دور میں تقریباً تمام ہی دارالاسلام ہیں مندرجہ بالا شرائط کے مدِ نظر دارالحرب نظر نہیں آتے۔ لہٰذا کسی علاقے میں سود لینا کسی بھی مسلمان سے جائز نہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ دارالحرب میں بھی مسلمان سے سود لینا جائز نہیں۔ اگرچہ صاحب ہدایہ نے اس کا جواز امام صاحب کی طرف منسوب فرمایا ہے مگر وہ صرف کفار سے دو وجہ سے پہلی وجہ یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے امام اعظم کی طرف سے اُن سے منسوب جو دو دلیلیں پیش کی ہیں وہ بہت کمزور ہیں۔ اور آپس میں متعارض ہیں۔ جیسا کہ پہلے ثابت کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ کہ مشائخ محققین اور صاحب فتویٰ حضرات کے نزدیک عبادات میں امام اعظم کے قیاسی قول پر فتویٰ ہوتا ہے۔ اور میراث کے مسائل میں امام محمد کے قیاسی قول پر اور قضا و شہادت و معاملات کے مسائل پر امام یوسف کے قیاسی قول پر چنانچہ علامہ شامی نے جلد اوّل صفحہ نمبر ص ۶۶ پر فرمایا۔

قَدْ جَعَلَ الْعُلَمَاءُ الْفَتْوٰی عَلٰی قَوْلِ الْاِمَامِ الْاَعْظَمِ فِی الْعِبَادَاتِ مُطْلَقًا وَقَدْ صَرَّحُوْا بِاَنَّ الْفَتْوٰی عَلٰی قَوْلِ مُحَمَّدٍ فِیْ جَمِیْعِ مَسَائِلِ ذَوِی الْاَرْحَامِ وَالْفَتْوٰی عَلٰی قَوْلِ اَبِیْ یُوْسُفَ فِیْمَا یَتَعَلَّقُ بِالْقَضَاءِ کَمَا فِی الْقُنْیَۃِ وَالْبَزَّازِیَۃِ۔

(ترجمہ) بے شک علماء کرام نے قانون بنالیا ہے کہ عبادات میں فتویٰ امام اعظم کے قیاسی اقوال طیبہ پر اور علماء نے وضاحت فرمادی ہے کہ میراث کے مسائل میں امام محمد رضی اللہ تعالٰی عنہ کے قیاسی اقوال پر ہوگا۔ اور قضا و معاملات کے مسائل میں فتویٰ امام یوسف کے قیاسی اقوال مبارکہ پر ہوگا۔ سود کا مسئلہ چونکہ معاملات سے متعلق ہے اس لیئے صرف حربی مسلمانوں کے لیے اس میں امام یوسف کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ اور یہ پہلے ثابت کر دیا گیا ہے کہ امام یوسف رضی اللہ تعالٰی عنہ دارالحرب کی سود کو مسلمانوں سے مسلمانوں کے لیے لینا دینا بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا اسی پر فتویٰ جاری ہوگا کہ برطانیہ وغیرہ تمام دُنیا میں مسلمانوں کا مسلمانوں سے سود لینا قطعاً حرام ہوگا۔ رہا دوسرا سوال کہ برطانیہ میں مردار گوشت اور شراب کی تجارت مسلمانوں کے لیے کیسی ہے تو یاد رکھو کہ یہ تجارت بالاتفاق ہر علاقے میں ہر مسلمان پر حرام ہے۔ جو شخص مسلمان ہوکر شراب وغیرہ کی تجارت کرے وہ سخت فاسق فاجر اور بحکم اسلام ملعون ہے خاص کر مسلمانوں کے ہاتھ بیچنا اس کی یہ کمائی ہوئی دولت حرام ہے۔ مسلمانوں کو اس سے قطع تعلق کرنا چاہیئے۔ یہ مسئلہ صرف مسلمانوں کے لیے ہے لیکن کفار سے سود لینا دارالحرب میں بالکل جائز ہے کیونکہ وہ سود نہیں بلکہ مال غنیمت اور مال مباح کے درجہ میں ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتب

(باب الہبہ)

خاوند بیوی کو کوئی زیور وغیرہ ھبہ دے تو واپس نہیں لے سکتا

سوال نمبر ۴: ۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ مسماۃ کریم بیگم بیوہ محمد دین ولد اللہ داد قوم ارائیں تقریباً سات سال محمد دین مذکور کے نکاح میں رہی۔ جب محمد دین ولد اللہ داد کے نکاح میں گئی۔

اس وقت محمد دین کی پہلی بیوی ارشاد بیگم بنت فضل حسین قوم ارائیں اس کے گھر میں بطور بیوی آباد تھی۔ میں اس کی سوکن بن کر اسی گھر میں آباد ہوئی۔ میری سوکن ارشاد بیگم کے پاس وہ زیور تھا، جو اس کے خاوند محمد دین نے اس کو بنوا کر دیا تھا۔ جب میں زیور دیکھتی تھی تو میرا دل بھی چاہتا تھا کہ مجھے بھی زیور ملے اس بنا پر میں اپنے خاوند سے زیور کا پرزور مطالبہ کرتی تھی۔ میرا خاوند کسی نہ کسی طریقے سے مجھے ٹال دیتا تھا۔ میں اسی طرح ایک سال تک جھگڑا کرتی رہی۔ ایک سال کے بعد مجھ کو میرے خاوند محمد دین ولد اللہ داد نے سونے کی چار چوڑیاں اور کانوں کے معز عین کا وزن چھ تولے سونا ہے اور ہاتھ گھڑی ایک عدد زنانہ بازار سے بنوا کر مجھے دے دی اور بہت سے برادری والوں کے سامنے مجھے وہ زیور دیا اور کہا کہ تو روز کہتی تھی کہ مجھے زیور دو یہ تیرا زیور ہے۔ پہلا زیور ارشاد بیگم کا ہے اور یہ زیور تیری ملکیت ہے۔ یہ بات محمد دین نے کئی دفعہ کہی۔ میری سہیلیوں سے بھی کہا کہ میں نے اپنی دوسری بیوی کو بھی زیور دے دیا ہے۔ اس کے بہت گواہ حاضر خدمت ہیں جو حلفیہ میرے اس بیان پر گواہی دینے کو تیار ہیں آج سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے میرے خاوند محمد دین کا انتقال ہوگیا۔ فوت ہونے کے بعد میراث بطور طریقۂ شرعی تقسیم کی گئی۔ زمین اور مکان وغیرہ کی تقسیم ابھی باقی ہے۔ میرا زیور میرے پاس تھا اور میری سوکن ارشاد بیگم کا زیور اس کے پاس تھا۔ ہم دونوں میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔ ہم دونوں نے باہمی مشورہ چوری کے خطرہ کے وہ زیور اکٹھا ایک رومال میں باندھ کر امانتاً اپنے پڑوسی محمد علی ولد فضل دین قوم ارائیں ساکن ستارہ چک کے پاس رکھ دیا۔ اب میری سوکن یہ کہتی ہے کہ میرا زیور میری ملکیت میں ہے وہ تو سارا میرا ہے، لیکن کریم بیگم کا زیور میراث کے طریقے پر تقسیم ہوگا۔ اس لیئے آپ کے پاس میں بھی اور تمام گواہ حاضر خدمت ہیں حلفیہ بیان دیتے ہیں لہذا ہمیں شرعی فتوای عطا فرمایا جائے اور حکم جاری کیا جائے کہ کیا وہ زیور میراث کے طریقے پر تقسیم ہوگا، یا میری ملکیت ہے۔

نشان انگوٹھا سائلہ و چار گواہ

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

الجواب

سوال مذکورہ میں میں نے حتی المقدور کافی تحقیق و تفتیش اور واقعات مندرجہ بالا کی چھان بین کی ہے۔ میں نے اسی بستی کے غیر جانبدار گواہان کو طلب کیا اور حلفیہ بیان لیا تو انھوں نے ان باتوں کی تصدیق کی۔ اس تمام تحقیق کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کریم بیگم مدعیہ مذکورہ فی السوال زیور کی مالک ہے۔ محمد دین مذکور نے وہ زیور اپنی دوسری بیوی کریم بیگم کے لیئے ہی بنوایا تھا۔ لہذا شرعی فتوای جاری کیا جاتا ہے کہ یہ تمام زیور بشکل چار عدد سونے کی چوڑیاں ۲ عدد کانوں کے بندے بوزن چھ تولے سونا اور کلائی کی گھڑی مسمات کریم بیگم بیوہ

محمد دین کی ذاتی ملکیت ہے یہ فتوٰی فریق اوّل مدعیہ اور گواہان کے حلفیہ بیان کی بناء پر ہے۔ فریق مخالف کو نہ طلب کیا گیا اور نہ اطلاع دی گئی۔ کیونکہ فریق مخالف مسماۃ ارشاد بیگم شرعًا اور قانونًا کسی مخالفت کی مجاز نہیں۔ نہ قانونِ اسلامی کے مطابق ارشاد بیگم کا اس سے کوئی تعلق ہے جب تک کہ اپنے طور پر کریم بیگم کی عدم ملکیت ثابت نہ کرے۔ کسی قانون کو اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ ارشاد بیگم کا قول بغیر ثبوت قطعًا غلط ہے۔ وہ سب گھڑی اور زیور مذکور فورًا کریم بیگم کے حوالہ کیا جائے۔ فتوٰی اسلامی کی رو سے کریم بیگم کو مالک زیور و گھڑی قرار دیا جاتا ہے اسی طرح وہ تمام کپڑے وغیرہ جو محمد دین نے اس کے لیے ہی بنائے تھے۔ وہ بھی کریم بیگم کی ملکیت ہیں۔ جب کپڑے جوتے میں جھگڑا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تو مذکورہ زیور میں جھگڑا جائز نہیں۔ یہ زیور میراث نہیں اس لیے کہ اصطلاح لغت میں اور فقہاء عظام کے نزدیک میراث اس مال کو کہا جاتا ہے جس کا مالک مرجائے چنانچہ لغات کشوری ص۵۱۹ پر ہے۔ میراث۔ مال مردے کا جو اس کے وارثوں کے ہاتھ آوے۔ لغت منجد ص۹۹ عربی مصری میں ہے۔ وَرِثَ يَرِثُ۔ اِنْتَقَلَ اِلَيْهِ مَالُ فُلَانٍ بَعْدَ وَفَاتِهٖ اور صفحہ نمبر ۹۹ پر ہے۔ اَلْوِرَاثَةُ۔ مَا يُخَلِّفُهُ الْحَيَّةُ لِوَرَثَتِهٖ۔ قاموس میں ہے اَلْمِيْرَاثُ۔ تَرِكَةُ الْمَيِّتِ۔ مذکورہ مال کی مالک کریم بیگم موجود ہے۔ تو وہ میراث کس طرح بن سکتی ہے۔ محمد دین نے اپنی بیوی کریم بیگم کو یہ تمام چیزیں دے دی تھیں۔ محمد دین کا یہ کہنا کہ میں نے کریم بیگم کو بھی زیور دے دیا۔ یا یہ کہنا کہ "لے یہ تیرا زیور ہے یا یہ کہنا کہ "یہ زیور تیری ملکیت ہے۔ ان سب الفاظ سے شرعًا ہبہ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰی ہندیہ جلد چہارم صفحہ ۴۸۲ پر ہے۔ جَعَلْتُهٗ لَكِ وَهٰذَا لَكِ اَوْ اَعْطَيْتُكِ۔ فَهٰذَا كُلُّهٗ هِبَةٌ۔ اور قانونِ شریعت کے مطابق جو چیز خاوند اپنی بیوی کو دے دیگا۔ وہ خود خاوند بھی واپس نہیں لے سکتا۔ کیونکہ بیوی کو دینا شرعًا عظیم ہبہ ہے چنانچہ فتاوٰی شامی جلد ششم اور فتاوٰی قرۃ العیون جلد دوم صفحہ ۴۳۵ پر ہے۔ وَلَوْ وَهَبَ لِامْرَاَتِهٖ لَا يَرْجِعُ وَلَوْ فَارَقَهَا بَعْدَ ذَالِكَ۔ اسی طرح فتاوٰی قاضی خان جلد دوم اور فتح القدیر جلد ہفتم صفحہ ۱۳۴ پر ہے۔ وَاِنْ هِبَةٌ لِذِيْ رَحِمٍ مُحَرَّمٍ مِنْهُ فَلَا رُجُوْعَ فِيْهَا وَلِذَالِكَ مَا وَهَبَ اَحَدُ الزَّوْجَيْنِ لِلْاٰخَرِ۔ ثابت ہوا کہ خاوند جو چیز بھی اپنی زندگی میں بیوی کو دے دے وہ کامل طور پر بیوی کے قبضے اور ملکیت میں ہو جاتی ہے۔ خاوند کی موت سے وہ چیز میراث نہ بنے گی۔ لہٰذا یہ زیور وغیرہ بھی اس شرعی قانون کی بنا پر کریم بیگم کی ملکیت ہے۔ اور اس کی میراث تقسیم نہ ہوگی۔ ارشاد بیگم کا قول بالکل غلط ہے۔ مالک کی زندگی میں مال ہرگز ہرگز تقسیم نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ مالک آخری سانسوں میں ہو۔ چنانچہ علامہ شامی اپنی کتاب ردّ المحتار جلد پنجم صفحہ نمبر ۶۶۲ پر ایک سوال کا جواب دیتے

ہوئے فرماتے ہیں فَهَلْ اِمَاتَةُ الْحَيِّ مِنَ الْحَيِّ اَمْ مِنَ الْمَيِّتِ الْمُعْتَمَدُ الثَّانِي۔ یعنی یہ بات تحقیق شدہ اور معتبر ہے کہ میراث مرنے کے بعد بنتی ہے۔ پس ان تمام دلائل شرعیہ سے ثابت ہوا کہ کریم بیگم مذکورہ تمام زیور کی مالک ہے۔ امانت والے کو چاہیئے کہ فوراً یہ سوال میں درج کی ہوئی چیزیں کریم بیگم کو دے دے نہ یہ میراث ہے۔ اور نہ اس کی تقسیم جائز۔ قرآن وحدیث میں اللہ ورسول کا یہی حکم ہے۔ فقہاء کرام ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر خاوند یا بیوی کے مرنے کے بعد جائداد میں جھگڑا پڑ جائے تو شرعی فیصلہ یہ ہے کہ جو چیزیں عورتوں کے استعمال کی ہوں وہ بیوی کو دی جائیں گی اور وہ ہی اس کی مالک مانی جائے گی۔ اگر بیوی زندہ ہے تو وہ چیز میراث کے طریقے پر تقسیم نہ ہوگی۔ اسی طرح مرد کے استعمال کی چیزیں خاوند کی ملکیت ہوں گی۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد اوّل صفحہ ۳۲۹ پر ہے۔ وَاِذَا مَاتَ اَحَدُهُمْ ثُمَّ وَقَعَ الْاِخْتِلَافُ بَيْنَ الْبَاقِيْ وَوَرَثَةِ الْمَيِّتِ فَعَلٰى قَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ مَا يَصْلُحُ لِلرِّجَالِ فَهُوَ لِلرَّجُلِ اِنْ كَانَ حَيًّا وَلِوَرَثَتِهٖ اِنْ كَانَ مَيِّتًا۔ وَمَا يَصْلُحُ لِلنِّسَاءِ فَهُوَ عَلٰى هٰذَا۔ پس چونکہ سوال مذکورہ میں زیور کا اختلاف ہے اور زیور فطرتاً واصطلاحاً عورت کی ہی استعمال کی چیز ہے۔ لہٰذا میں مفتی اسلام ہونے کی حیثیت سے فتویٰ جاری کرتا ہوں کہ یہ زیور میراث نہیں اور چونکہ محمد دین کی پہلی بیوی ارشاد بیگم کا ملکیت زیور منجانب محمد دین ارشاد بیگم کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا عقلاً وشرعاً وحتماً یہ مذکورہ زیور کریم بیگم بیوہ محمد دین کا ہی ہے۔ فوراً اس کو دیا جائے۔ قطعاً تقسیم نہ ہوگی۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

بیٹے کو ھبہ کر کے بلا وجہ واپس لینے کا حکم

سوال نمبر ۱۴۱:۔ ایک باپ نے اپنے بیٹے کو کچھ زمین بطریقہ فروخت بعوض سو روپیہ ھبہ بذریعہ رجسٹری حکومت کر دی۔ اس وقت بیٹا نابالغ تھا۔ اب بالغ ہو چکا ہے۔ باپ کسی شخص کے ورغلانے پر حیلے بہانے سے زمین واپس لینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی والدہ تیار نہیں۔ اور بیٹا کچھ عذر نہیں رکھتا اس کے متعلق شرعی حکم سنایا جائے۔ کہ کیا یہ واپس لینا جائز ہے۔

سائل:۔ مقبول احمد صاحب لاڑکانہ سندھ۔ مورخہ: ۹ ۲/۵۹

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق ویسے تو کسی شخص کو کوئی چیز ھبہ یا تحفہ دے کر واپس لینی منع اور برا ہے

حدیث پاک میں اس کو تھوک کر چاٹنے کے مثل فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف جلد اول اور مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۲۶ پر ہے:۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَلْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهٖ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السُّوْءِ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ۔ (ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما سے روایت ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا۔ کہ فرمایا حضور اقدس آقائے دو عالم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم نے ہبہ کرکے واپس پھرنے والا ایسا ہی ہے۔ جیسے کتا قے کرکے چاٹ لیتا ہے۔ امام اعظم کے نزدیک ہبہ یا تحفہ دینے والا بغیر وجہ واپس مانگے تو یہ مکروہ تنزیہی ہے۔ اور اس حدیثِ پاک کے آخری الفاظ لَيْسَ لَنَا۔ صاحبِ مرقات کے نزدیک لَا يَنْبَغِيْ کے معنیٰ میں ہے۔ چنانچہ اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:۔ قَوْلُهٗ لَيْسَ لَنَا اَيْ لَا يَنْبَغِيْ لَنَا۔ اور لفظ لَا يَنْبَغِيْ علماء اصول کے نزدیک كَرَاهَةً تنزیہی کو ہی ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ بحر ہفتم صفحہ نمبر ص۲۹۰ پر ہے۔ يُكْرَهُ الرُّجُوْعُ فِيْهَا وَظَاهِرُ كَلَامِ الْمَبْسُوْطِ وَتَبِعَهٗ فِي النِّهَايَةِ اَنَّهَا كَرَاهَةُ تَنْزِيْهٍ۔ یہ حکم ان ہبوں کا ہے۔ جو عام لوگوں کو دیا جائے۔ لیکن بیوی اور ذی رحم یا بیٹے کو ہبہ کرکے کوئی چیز واپس لینی حرام ہے چنانچہ فتاویٰ بحر الرائق جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۲۹۱ پر ہے:۔ اِلَّا فِيْمَا يَهَبُ الْوَالِدُ لِوَلَدِهٖ اَنَّهَا كَرَاهَةُ تَحْرِيْمٍ۔ یعنی وہ ہبہ جو باپ اپنے بیٹے کو دیدے۔ اس سے رجوع مکروہ تحریمی ہے۔ اور مکروہ تحریمی حرام کے درجے میں ہے:۔ هٰكَذَا قَالَ الْفُقَهَاءُ۔ اسی طرح فتاویٰ بزازیہ جلد سوم ص۲۴۲ پر ہے۔ وَلَا يَرْجِعُ فِي الْوَلَدِ (ترجمہ):۔ بیٹے کو ہبہ کرکے باپ رجوع نہیں کرسکتا۔ عالمگیری جلد چہارم صفحہ نمبر ص۳۸۵ پر ہے:۔ لَيْسَ لَهٗ حَقُّ الرُّجُوْعِ بَعْدَ التَّسْلِيْمِ فِيْ ذِي الرَّحِمِ الْمَحْرَمِ۔ (ترجمہ) کسی شخص کو حق نہیں ہے۔ کہ اپنے کسی ذی رحم محرم رشتے دار کو۔ کچھ چیز ہبہ دے کر پھر واپس لے عالمگیری کی واضح عبارت سے دو مسئلے ثابت ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اولاد بالغ ہو یا نابالغ۔ اس کو ماں باپ کوئی چیز ہبہ کردیں۔ تو تاعمر وہ چیز باپ کی ملکیت شرعی میں واپس رجوع کے ذریعے نہیں آسکتی۔ باپ کے حقوقِ ملکیت ہبہ کرکے ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ شرعاً نابالغ کو ہبہ دینا جائز ہے۔ اس سے بیع منع ہے۔ (۲) یہ کہ ہبہ کی تکمیل بعد قبضہ ہوتی ہے۔ پس سوالِ مذکورہ میں والد مذکور ہرگز ہرگز اس زمین کو واپس نہیں لے سکتا ہے اگر اپنی چال بازی سے وہ کسی طرح قانوناً عدالت سے بیٹے کی ملکیت ختم کرانے میں کامیاب بھی ہو جائے تب بھی شریعت میں بیٹا ہی مالک متصور ہوگا۔ اور اس طرح سے اس کی تمام آمدنی باپ پر حرام ہوگی۔ اس لئے کہ مذکورہ صورت میں ہبہ مکمل ہو چکا۔ کیونکہ عدالتی رجسٹری قبضے کے حکم میں ہے۔ اور نابالغ کا قبضہ شرعاً معتبر ہے۔ اور یہ بیع بعوض ایک سو روپیہ شرعاً بیع نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ اپنے اسٹام میں درج

شدہ ایک سو روپیہ اور اخراجات رجسٹری واپس لینے کا بھی مجاز نہ ہوگا۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ شرعی خرید و فروخت نہیں ہے۔ بلکہ ھبہ کو مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ باپ کا رجوع کرنا اور بیٹے کا کچھ عذر یا اعتراض کرنا بھی رجوع کے لیے مفید نہیں۔ کہ جب تک کہ بیٹا پھر رجسٹری کے ذریعہ ہی باپ کو ھبہ مستقلاً نہ کر دے۔ یا کسی قیمت پر باپ کے ہاتھ فروخت کر دے فقط ان ہی دو صورتوں سے باپ مذکورہ دوبارہ اسی زمین کا مالک بن سکتا ہے۔ بجز اس کے ملکیتِ والد کی اب کوئی شرعی صورت نہیں۔ فی الحال بیٹا کامل طور پر مالک ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب ط

کتبہ

بَابُ الصَّدقات

گیارھویں شریف کا بکرا، کپڑا، پیسہ شیعہ اور ملنگوں کو دینے کا حکم

سوال نمبر ۲۲۴ :۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ گیارھویں شریف کا کھانا یا پیسہ شیعہ سادات اور ملنگوں کو دینا جائز ہے۔ یا نہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں۔ کہ یہ ہمارا ہی حق ہے۔ ہمارے بہت سے سنی حضرات اُن کو گیارھویں کا جمع شدہ چندہ بکرا اور کپڑے ان کے اِس کہنے کی وجہ سے دے دیتے ہیں۔
(۲) گیارھویں شریف کا پیسہ مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں۔ مثلاً تعمیر یا نلکہ یا حجرہ یا پھوڑ چٹائی وغیرہ میں استعمال ہو سکتا ہے یا کہ نہیں۔

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

گیارھویں شریف اور دیگر نیاز و فاتحہ کے کھانے صرف مسلمان ہی کھا سکتا ہے۔ ہر امیر غریب دینے والا اس کا تبرک فاتحہ شریف کے بعد ہر مسلمان کھا سکتا ہے۔ اصل گیارھویں شریف وغیرہ کے چندے اور پیسے صرف حضور غوثِ پاک کے ذکر اذکار میں خرچ کرنے چاہئیں۔ کہ یہ تقریبات صرف اسی مقصد کے لیے منعقد اور شروع کی گئیں۔ تاکہ مسلمانوں کے دل اولیاء کاملین کے ذکر اذکار سے منور ہوں۔ اور ہر شخص کو ولی اللہ بننے کی خواہش پیدا ہو۔ اس چندے سے علماء اہلسنت اور نعت خوان حضرات کو بلا کر اولیاء اللہ کے ذکر کی محفلیں قائم کی جائیں۔ اور فاتحہ خوانی و ایصال و ثواب کیا جائے۔ مرزائی، شیعہ، ملنگ مسلمان ہی نہیں ہیں تو سید کس طرح ہو

سکتے ہیں۔ اُن کو کسی قسم کی نیاز یا فاتحہ کی چیزیں نہ دی جائیں۔ یہ لوگ اسلام سے خارج ہیں۔ اور غیر مسلم کو نہ صدقہ نفلی جائز نہ نیاز جائز ہے۔ حیرت ہے کہ شیعہ لوگ حضور سرکار بغداد کو بُرا بھلا بھی کہتے ہیں۔ اور اُن کے نام کی گیارھویں شریف بھی کھا لیتے ہیں۔ اور افسوس ہے اُن سُنیوں کی بیوقوفی پر جو حضور غوث پاک کے نام کی چیزیں آپ کے دشمنوں کو دیتے ہیں (۲) اگر گیارھویں شریف کا پیسہ زیادہ جمع ہو گیا ہے۔ تو ہر مہینے کی گیارھویں کی فاتحہ کا پیسہ علیحدہ کر کے باقی رقم سے حضور غوث پاک کے نام پر نلکہ یا کنواں یا مسجد بنوائی جائز ہے اور پھر اس کو حضور غوث پاک کے ثواب پر وقف کر دو۔ اس مسجد یا نلکے کا نام مسجد غوثیہ یا نلکہ غوثیہ رکھا جائے۔ اور اُس کو اسی نام سے مشہور کیا جائے۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالٰی عنہ نے نبی کریم کے زمانے مبارک میں اپنی والدہ کے نام کا ایک کنواں کھدوایا۔ اور اُس کا نام اپنی والدہ کے نام پر بیر اُم سعد رکھا یہ حدیث شریف ان مسائل اور ناموں کی تا قیامت اصل ہے۔ مگر خیال رہے۔ کہ ان چیزوں میں مشغول ہو کر گیارھویں شریف کی نیاز فاتحہ ختم غوثیہ بند نہ کیا جائے۔ وہ اسی طرح جاری رکھی جائے۔ کیوں کہ اصل یہی ہے۔ ورنہ وہابی، دیوبندی اس طریقے سے گیارھویں شریف بند کرنا چاہیں گے۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتاب الحج

حج کے لیئے فوٹو کھینچوانے کا مسئلہ

سوال نمبر ۳۲: کیا فرماتے ہیں۔ علماء کرام اس مسئلہ میں۔ کہ بندہ آئندہ سال ۱۹۶۲ء میں حج کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہے۔ مگر سُنا ہے۔ کہ حکومت پاکستان بغیر فوٹو کسی شخص کو حج کے لیئے جانے کی اجازت نہیں دیتی فیصل آباد کے ایک عالم صاحب سے یہ مسئلہ پوچھا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ حج ملتوی کر دو۔ فوٹو کھینچوانے حرام ہیں۔ بہت کوشش کی کہ بغیر فوٹو ہی حج کی اجازت مل جائے۔ مگر فوٹو کے بغیر اجازت ناممکن ہے۔ بہت سے لوگ فوٹو کھینچوا کر چلے جاتے ہیں۔ ہم نے علماء کرام کے فوٹو بہت دفعہ اخباروں میں دیکھے ہیں۔ لہٰذا ہم کو شرعی فتویٰ عطا فرمایا جائے۔ کہ ہم کیا کریں اگر اس دفعہ حج

نہ کر سکے۔ تو نا معلوم آئندہ ہم کو حج کی سعادت نصیب ہو۔ یا نہ ہو۔ اور ہمارے پاس پھر پیسہ سفر خرچ صحت تندرستی باقی رہے یا نہ رہے۔ مدلّل طریقے سے فتویٰ صادر فرمایا جائے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ؕ

سائل:۔ محمد اقبال مقام سمندری ضلع فیصل آباد۔ مورخہ: ۱۶/۱/۱۹۹۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

قانون شریعت کے مطابق حکومتِ وقت کی سخت پابندی کی صورت میں حج مفروضہ کے لیے فوٹو کھنچوانا جائز ہے۔ ایسے ہی فوج کی نوکری یا پولیس کی ملازمت میں شناختی کارڈ کے لیے بھی حکومت کے جبر کی بنا پر فوٹو کھنچوانا جائز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فرضِ حج، ضروریاتِ دین سے ہے۔ اور فوج یا پولیس کی ملازمت ضروریاتِ زندگی سے۔ اور فقہِ اسلامی کا مشہور قانون ہے۔ کہ ضروریات کی بنا پر ممنوع چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مجدد صاحب بریلوی علیہ الرحمت عطایا قدیریہ صفحہ نمبر ص۳ پر ارشاد فرماتے ہیں۔ وَالضَّرُوْرَاتُ تُبِيْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ ط (ترجمہ) اور ضروریاتِ زندگی ممنوع چیزوں کو جائز اور حلال کر دیتی ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا یہ ارشاد سیاقِ عبارت کے مطابق ضروریاتِ زندگی و دنیوی پر ہی محمول ہے:۔ جب دنیوی ضروریات کے لیے شریعت کی ممنوع چیزیں شریعت نے حلال فرما دیں۔ تو ضرورتِ دینی کے لیے بدرجہ اولیٰ جائز ہوئیں۔ لہٰذا فوٹو کھنچوانا کسی بھی مسلمان مرد کے لیے بجز ان مندرجہ بالا اقسام کے اور کسی بھی صورت میں جائز نہ ہوگا۔ صرف ان ہی قسم کی مجبوریوں میں شرعًا جائز ہوگا۔ لیکن فوٹو کھنچوانا، کھینچنا اور فوٹوگرافی کا کام کرنا یا مصوری میں جاندار کی تصویریں بنانا خواہ کاغذ پر یا کپڑے پر نقش ڈالنے یا کسی جاندار کی تصویریں بنانا خواہ کاغذ پر یا کپڑے پر کندہ کرنا یا لکڑی وغیرہ پر یا جاندار کا بت بنانا۔ بہرصورت قطعًا حرام لائقِ عذابِ اُخروی ہے۔ فوٹوگرافر اور مصور وہ فوٹو اگرچہ حج مفروضہ کے لیے کھینچے یا شناختی کارڈ کے لیے۔ شریعت کی رخصت صرف فوٹو بنوانے والے مجبور شخص کے لیے ہے۔ نہ کہ کھینچنے والے کے لیے فوٹوگرافر اور مصور ہر صورت میں سخت ترین گناہ گار اور شرعی مجرم ہوگا۔ قانونِ اسلامی میں حکم چار قسم کے ہیں۔

۱۔ فتویٰ ۲۔ تقویٰ ۳۔ عزیمت ۴۔ رخصت:

فتویٰ:۔ یہ ہے۔ کہ نوکری کے لیے فوٹو کھنچوائے مگر **تقویٰ** یہ کہ نوکری چھوڑ دے۔ لیکن فوٹو نہ بنوائے۔ عزیمت یہ ہے۔ کہ فوٹو کھنچوانا بلکہ پاس رکھنا بھی منع ہے اور رخصت یہ ہے کہ مندرجہ بالا صورتوں میں صرف کھنچوانا اور پاس رکھنا جائز ہے جیسے کہ نوٹوں کا فوٹو یا جیسے کہ رشوت۔ کہ اس کا لینا ہر صورت میں حرام ہے۔ لیکن اس کا دینا۔ بعض صور مجبوریہ میں جائز ہے۔ چنانچہ فقہ اسلامی کی مشہور کتاب فتاویٰ شامی جلد چہارم صفحہ نمبر ص۳۲۱ پر ہے:۔

اَلرَّابِعُ مَا یُدْفَعُ لِدَفْعِ الْخَوْفِ مِنَ الْمَدْفُوْعِ اِلَیْہِ عَلٰی نَفْسِہٖ اَوْ مَالِہٖ حَلَالٌ لِلدَّافِعِ حَرَامٌ عَلَی الْاٰخِذِ لِاَنَّ دَفْعَ الضَّرَرِ عَنِ الْمُسْلِمِ وَاجِبٌ وَلَا یَجُوْزُ اَخْذُ الْمَالِ لِیَفْعَلَ الْوَاجِبَ ۰ھ

(ترجمہ):۔ رشوت کی چوتھی صورت یہ ہے۔ کہ دی جائے۔ کسی ظالم حاکم وغیرہ کو اپنی جان یا مال کے خوف سے۔ تو شرعًا دینے والے کے لیے جائز ہے۔ اور لینے والے کے لیے حرام ہے۔ اس لیے کہ مسلمان سے مصیبت کو دُور کرنا واجب ہے۔ اور واجب کام پر رشوت لینا ہرگز جائز نہیں۔ تو جس طرح یہاں رشوت لینے اور دینے میں فرق ہو گیا۔ کہ لینا ہمیشہ حرام، دینا کبھی کسی حالت میں جائز ہے۔ کسی میں حرام۔ اسی طرح فوٹو کا حکم ہے کہ فوٹو بنوانا اکثر منع مگر چند صورتوں میں جائز جو پہلے ذکر کی گئیں لیکن فوٹو کھینچنا یا جاندار کی مصوری ہر وقت ہر صورت میں حرام ہے۔ ایسے ہی مٹی کی گڑیں یا بت بنانا ہمیشہ حرام ہے۔ اگرچہ تعظیم یا پرستش ہو۔ یا نہ ہو۔ عوام کی تصویر ہو۔ یا خواص کی پیر کی ہو یا مرید کی، صاحبزادے کی ہو یا بزرگ زادے کی، عالم کی ہو۔ یا ولی غوث قطب کی۔ خاص کر بزرگوں کی فوٹو تو اور بھی زیادہ حرام ہے کہ اس میں نیتِ تعظیم ہوتی ہے۔ اور تصویر کی تعظیم اسلام میں شرکِ خفی ہے۔ بعض فقہاء کرام نے اس کو شرکِ جلی کہا ہے۔ اور تعظیم کرنے والے کو قطعی مشرک کہا ہے۔ تعظیم خواہ کسی طرح پر ہو۔ تعظیم کی چند صورتیں ہیں:۔
۱:۔ پیر یا بزرگ یا بادشاہ کی تصویر اونچی جگہ لٹکانی ۲:۔ تصویر کو بوسہ دینا ۳:۔ تصویر پر غلاف چڑھانا۔ ۴:۔ تصویر کو یا غلاف کو عطر خوشبو لگانا ۵:۔ تصویر سامنے آئے۔ تو کھڑے ہو کر تعظیم کا نقشہ بنانا۔ یہ سب صورتیں شرعًا حرام ہیں۔ اور ان طریقوں پر تعظیم کرنا۔ طریقۂ کفار ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کے صدر ایوب خان نے یہ قانون جاری کیا ہے۔ کہ جب سینما پر قائدِ اعظم محمد علی جناح کی فوٹو دکھائی جائے۔ تو سب لوگ ناظرین کھڑے ہو جائیں۔ یہ کفر یہ قانون بالکل بت پرستی کے مترادف ہے۔ صدر صاحب کو بذریعہ خط آگاہ کر دیا گیا ہے۔ کہ اس غلط حکم سے مسلمانوں کو بت پرستی کی عادت نہ ڈالو۔ یہ قانون محض اُن کی قانونِ اسلامیہ سے نادانی کے باعث ہے۔ اللہ ان کو ہدایت دے۔ اور خط کا اُن پر اثر ہو جائے۔ بہر حال فوٹو کھینچنا ہر حالت میں ہمیشہ حرام ہے اِس پر بہت سی احادیث وارد ہیں۔ جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ فی الحال یہ سمجھنا اشد ضروری ہے کہ تصویر کیا ہے۔ اور تصویر کون سی حرام ہے۔ کون سی حلال ہے۔ اور تصویر کب سے شروع ہوئی۔ اس کا موجد کون ہے۔ اور جاندار کی تصویر کیوں حرام ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ موجودہ دور میں بعض زمانہ ساز علماء ابن الوقت قسم کے رہبر اور رضاء عوام و امراء کے طالب مولوی اور رہبر پیر۔ فوٹو کے لیے طرح طرح کے جواز نکالنے کے لیے احادیثِ مبارکہ کے توڑ مروڑ کے پیچھے لگے ہوئے۔ اور دھڑا دھڑ فوٹو کھینچواتے چلے جاتے

ہیں۔ اس کی ابتداء شیعہ اور دیوبندی علماء کرام نے کی مگر کسی سے کیا کلام اب تو ہمارے بعض قریبی بھی اس بیماری میں مبتلا ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کاملہ عطا فرمائے۔ بعض علماء کو یہ بھی کہتے سنا گیا۔ کہ وہ۔ احادیث جن میں تصویر کو حرام قرار دیا گیا۔ وہاں بت مراد ہیں۔ نہ کہ فوٹو کھینچنا کھینچوانا۔ اس کی حرمت احادیث سے کہیں ثابت نہیں۔ اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ ؕ کتنی کم علمی اور ناسمجھی کی بات ہے۔ ایسی ہی لایعنی باتوں کی وجہ سے ضروری سمجھا۔ کہ اوّلاً تصویر کی حقیقت بیان کی جائے۔ کہ تصویر کیا ہے۔ لفظ تصویر باب تفعیل کا مصدر بمعنی مفعول ہے صُوْرَۃٌ سے مشتق ہے۔ صُوْرَۃٌ کا لغوی ترجمہ ہے کسی مخلوق کا اس طرح نقشہ کھینچنا۔ کہ اس شئی کی پہچان ہو جائے اگر باطن اور ذہن میں نقشہ کھینچا۔ تو اس کو تصور کہا جاتا ہے۔ جس کا نقشہ کھینچا جائے۔ اس کو صورت کہتے ہیں چنانچہ منطقی کہتے ہیں۔ اَلتَّصَوُّرُ حُصُوْلُ صُوْرَۃِ الشَّیْءِ فِی الْعَقْلِ ؕ (ترجمہ) ذہن میں صورت کا نقش ہونا تصور ہے۔ اور اگر نقشہ اس صورت کا خارج میں بنایا گیا تو اس کو عربی میں تصویر کہتے ہیں تصویر عام ہے۔ اس بات کو کہ کاغذ پر ہو۔ یا کپڑے پر۔ لکڑی پر ہو۔ یا لوہے تانبے پر کندہ ہو یا غیر کندہ۔ کسی مشین سے ہو۔ یا ہاتھ سے۔ مٹی یا پتھر کو سانچے میں ڈھال کر بنایا جائے یا تراش کر کسی دھات کو پگھلا کر بنائیں یا موم وغیرہ کو۔ غرضیکہ کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیز کا نقشہ خارج میں کہیں بھی کھینچا۔ تو وہ تصویر کہلاتی ہے۔ اب اگر کاغذ یا کپڑے پر یا دیوار پر نقشہ بنایا۔ یا لکڑی، دھات پر کندہ کیا۔ تو اس کو ہماری زبان میں فوٹو کہا جاتا ہے۔ عربی میں تمثال کہا جاتا ہے۔ اگر پتھر کا تراش کر یا مٹی یا کسی دھات کو سانچے میں ڈھال کر بنایا گیا۔ اور وہ نقشہ کسی جاندار کا ہے۔ تو اردو میں اس کو بت اور عربی میں صنم کہا جاتا ہے۔ اور اگر کسی تصویر کی پرستش اور پوجا شروع ہو جائے۔ تو اس کو عربی میں وَثَن کہا جاتا ہے۔ جس کی جمع ہے اوثان اور اردو زبان میں اس کو مورتی کہا جاتا ہے۔ اور اگر بے جان چیز کا نقشہ تراشہ ہے۔ یا ڈھالا ہے۔ تو اردو میں اس کو ڈھانچہ کہا جاتا ہے۔ اور عربی میں مجسمہ۔ لفظ تصویر ان سب پر بولا جاتا ہے۔ احادیث پاک میں جہاں بھی تصویر کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ وہاں ہر قسم کے جاندار کی تصویر مراد ہے۔ خواہ کاغذ کی ہو۔ یا کپڑے کی بت ہو۔ یا صورت مٹی کا ہو۔ یا پتھر لوہے تانبے وغیرہ کا بلکہ تصویر کی ممانعت والی حدیث پاک میں زیادہ تر کاغذ اور کپڑے والی ہی مراد ہیں جیسا کہ بہت جگہ صراحت بھی ہو گئی ہے بلکہ حدیث پاک کی عبارت النص تو فوٹو کے لیے ہی ہے صنم اور وثن یعنی مورتی وغیرہ کو تو اقتضاءً شامل کر لیا جاتا ہے کیونکہ صنم اور وثن، بت وغیرہ تو بوجہ کفر و شرک دیگر بے شمار آیات و احادیث سے ممنوع و حرام ہو گئے اور پھر یہ ممانعت مسلمان کو ہے۔ حالانکہ وثن تو کافروں کے گھروں میں ہوتے ہیں۔ نہ کہ مسلمانوں کے پاس ثابت ہوا۔ کہ ممانعتِ حدیثِ پاک، کاغذ اور کپڑے کی فوٹو کے بارے میں ہے۔ اب جو کہے۔ کہ صرف بت رکھنے منع اور بت بنانا منع ہیں۔ فوٹو کھینچنا منع نہیں۔ وہ شخص تمام احادیث کا منکر ہے۔ بلکہ اس کی

گمراہی کا اشد خطرہ ہے اگر ابتداء پر نظر کی جائے تو ماننا پڑتا ہے۔ کہ اصل تصویر کاغذ پر نقش شدہ فوٹو ہی ہے۔ اور اس کا موجد شیطان ابلیس ہے اور سب سے پہلے نقش و نگار کی تصویر نوح علیہ السلام کی وفات ہونے کے بعد قریبی دور میں شیطان ابلیس نے بناکر لوگوں کو گمراہ اور بے دین کیا۔ چنانچہ تمام تفاسیر روح المعانی وغیرہ نے یہی لکھا ہے۔ تفسیر عبد بن حمید کے الفاظ زیر آیت :۔ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا (الخ) اسی طرح ہیں۔ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرِ بْنِ مُهَلَّبٍ قَالَ كَانَ وُدٌّ رَجُلًا مُسْلِمًا كَانَ مُحَبَّبًا فِیْ قَوْمِهٖ فَلَمَّا مَاتَ عَسْكَرُوْا حَوْلَ قَبْرِهٖ فِیْ اَرْضِ بَابِلٍ۔ فَلَمَّا رَاٰى اِبْلِیْسُ جَزَعَهُمْ عَلَیْهِ تَشَبَّهَ فِیْ صُوْرَةِ اِنْسَانٍ ثُمَّ قَالَ اَرٰى جَزَعَكُمْ فَهَلْ لَكُمْ اَنْ اُصَوِّرَ لَكُمْ مِثْلَهٗ (الخ) قَالُوْا نَعَمْ فَصَوَّرَ لَهُمْ مِثْلَهٗ (الخ) قَالَ هَلْ لَكُمْ اَنْ اَجْعَلَ لَكُمْ فِیْ مَنْزِلِ رَجُلٍ مِنْكُمْ تِمْثَالًا فَیَكُوْنُ فِیْ بَیْتِهٖ قَالُوْا نَعَمْ فَصَوَّرَ لِكُلِّ اَهْلِ بَیْتٍ تِمْثَالًا مِثْلَهٗ الخ (ترجمہ) جعفر بن مہلب سے روایت ہے۔ کہ وُدّ ایک نیک مسلمان تھا۔ جب وہ مرگیا۔ تو لوگ غمگین ہوگئے۔ اس کی قبر پر کھڑے ہوگئے تھے۔ کہ ابلیس شکل انسانی میں آیا۔ اور تمہارے اس وُدّ کی تصویر نہ بنادوں تاکہ تم اپنا غم ہلکا کردو۔ سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ تو شیطان نے سب سے پہلے دنیا میں تصویر ایجاد کی۔ پھر ابلیس نے کہا۔ کہ کیا سب کے لیے ایک ایک تصویر نہ بنادوں۔ کہ ہر شخص اپنے گھر میں رکھے۔ لوگوں نے کہا۔ کہ ہاں۔ تو ابلیس نے بہت سی تصویریں بنائیں جس کو "تمثالاً" کہا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ تصویر بنانا شیطانی کام ہے۔ اب اس میں اختلاف ہے۔ کہ تصویر کس طرح بنائی۔ چنانچہ روح البیان اور صاوی نے فرمایا۔ کہ یہ مورتی کی شکل تھی۔ لیکن مواہب الرحمٰن جلد دہم صفحہ نمبر ۳۰۱ پر پیش کردہ بخاری شریف کی روایت سے ترجیح اس بات کی معلوم ہوتی ہے۔ کہ دیوار پر نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ بہر حال ہوسکتا ہے۔ کہ دونوں طرح تصویریں ابلیس نے بنائی ہوں نتیجہ یہ ہی نکلتا ہے۔ کہ کاغذ پر ہو یا دیوار پر بت ہو یا نقش کام ابلیس کا ہی ہے۔ اور سب سے پہلے اس نے ہی فوٹو گرافی اور مصوری کا کام کیا۔ قانونِ شریعت میں صرف جاندار کی تصویر اور مورتی حرام ہے۔ اگرچہ بعض نے اس کو مکروہ فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اصطلاحِ فقہاءِ عظام میں مکروہ مطلق سے کراہت تحریمی مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ فتاوٰی بزازیہ میں ہے۔ تصویر کے حرام یا مکروہ تحریمی ہونے کی وجہ یہ ہی ہے کہ کفار جاندار کی تصویر کی تعظیم کرتے ہیں۔ اللہ کریم کو یہ چیز پسند نہیں۔ کہ انسان کی نقلی بنی ہوئی شکل کی تعظیم یا عبادت کی جائے یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ پس جس تصویر کی عبادت کفر میں کی جاتی ہے۔ اس تصویر کا بنانا گناہ کبیرہ حرام ہے۔ چنانچہ فتاوٰی شامی جلد اول صفحہ نمبر ۶۰۶ پر ہے۔ مَكْرُوْهَاتُ صَلٰوة میں اَلْاِجْمَاعُ عَلٰى تَحْرِیْمِ :۔ تَصْوِیْرِ الْحَیَوَانِ وَقَالَ وَسَوَاءٌ صَنَعَهٗ لِمَا یُمْتَهَنُ اَوْ لِغَیْرِهٖ فَصَنْعَتُهٗ حَرَامٌ بِكُلِّ حَالٍ لِاَنَّ

فِیْهِ مُضَاهَاةٌ لِخَلْقِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَسَوَاءٌ کَانَ فِیْ ثَوْبٍ اَوْ بِسَاطٍ اَوْ دِرْهَمٍ وَّ اِنَاءٍ وَحَائِطٍ وَغَیْرِهَا فَیَنْبَغِیْ اَنْ یَّکُوْنَ حَرَامًا لَا مَکْرُوْهًا ط (الخ) (ترجمہ):۔ اجماع اور قطعی دلیل متواتر حدیث پاک سے ثابت ہے۔ کہ حیوان کی تصویر کپڑے بستر، درہم، برتن، دیوار وغیرہ پر بنانا حرام ہے یہ مکروہ نہیں۔ کیونکہ حرمت ہی ثابت ہے اس لیئے کہ یہ اللہ تعالٰے کی خلقت کا مقابلہ ہے۔ پس ثابت ہوا کہ فوٹو ہو۔ یا بت ہر تصویر کا بنانا شرعًا حرام ہے۔ اور وجہ حرمت اللہ کا مقابلہ ہے۔ اور پھر اس کی تعظیم کی بنا پر مترادف شرک کے ہے۔ چنانچہ فتاوٰی کی شرح عنایہ جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۹۵ پر ہے:۔ یُکْرَهُ لِمَا فِیْهِ مِنَ التَّعْظِیْمِ لَهٗ وَنَحْنُ اُمِرْنَا بِاِهَانَتِهَا ط (ترجمہ):۔ تصویر اس لیئے مکروہ تحریمی ہے۔ کہ اس میں تصویر کی عظمت کا مقصد ہوتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کو اس کی ذلت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ذلت کا معنٰی ہے نیچے ڈالنا یا پھینکنا یا چھپانا۔ نا کہ جوتے مارنا کہ عبث ہے جیسا کہ بعض نے غلط سمجھا۔ اسی وجہ سے ملائکہ بھی اس گھر میں نہیں جاتے جہاں فوٹو تعظیم سے رکھا ہو۔ جیسا کہ متعدد احادیث سے ثابت ہے فتح القدیر جلد اوّل صفحہ ۲۹۲ پر اور ردالمحتار جلد اوّل صفحہ ۶۰۷ پر اور مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۳۸۵ پر ہے:۔

بَابُ التَّصَاوِیْرِ۔ عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِکَةُ بَیْتًا فِیْهِ کَلْبٌ وَّلَا تَصَاوِیْرُ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ ط (ترجمہ):۔ ابی طلحہ نے فرمایا:۔ کہ سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا۔ اُس گھر میں اللہ کے فرشتے نہیں آتے جس گھر میں کُتّا ہو۔ یا تصویریں ہوں یہ حدیث مبارکہ مسلم شریف میں بھی ہے۔ اور بخاری میں بھی۔ نزہت المجالس جلد دوم صفحہ نمبر ۱۰۱ پر ہے۔ قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ۔ سَبَبُ اِمْتِنَاعِ الْمَلٰٓئِکَةِ مِنْ دُخُوْلِ الْبَیْتِ بِهٖ صُوْرَةٌ (اَیْ تَصْوِیْرٌ) اَوْ کَلْبٌ۔ لِاَنَّ الصُّوْرَةَ فِیْهَا مُشَابَهَةٌ لِخَلْقِ اللّٰهِ تَعَالٰی ط (ترجمہ):۔ فرشتوں کے تصویروں والے گھر میں نہ جانے کا سبب یہ ہے۔ کہ تصویر اللہ تعالٰے کی مخلوق کی نقل اُتارنا ہے۔ جو سخت گناہ ہے۔ اس لیئے اس کا موجد شیطان بنا۔ کوئی نیک آدمی یا فرشتہ نہ بنا۔ کیا یہاں بقول ہمارے بعض مقررین کے۔ صرف مٹی، پتھر کے بت مراد ہیں۔؟ اور کیا ملائکہ رحمت صرف اس گھر میں داخل نہیں ہوتے۔ جہاں مٹی کی مورتیاں ہی ہوں؟ اور کیا کاغذ کے فوٹو، کپڑے یا دیواروں پر تصویر ملائکہ کی ممانعت کا سبب نہیں بنتی؟ یا کہ ہر قسم کی تعظیم سے رکھی ہوئی تصویر سے فرشتے بوجہ نفرت، دخول سے رُک جاتے ہیں۔؟ اس کا فیصلہ بھی۔ حدیثِ پاک سے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ طحاوی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۳۶۳ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا رَوْحُ ابْنُ الْفَرَجِ (الخ) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِشْتَرَیْتُ نُمْرُقَةً فِیْهَا تَصَاوِیْرُ فَلَمَّا دَخَلَ عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ فَرَاٰهَا تَغَیَّرَ ثُمَّ قَالَ یَا عَائِشَةُ مَا هٰذِهٖ فَقُلْتُ نُمْرُقَةٌ اِشْتَرَیْتُهَا لَکَ تَقْعُدُ عَلَیْهَا۔ قَالَ اِنَّا لَا نَدْخُلُ بَیْتًا فِیْهِ تَصَاوِیْرُ ط (ترجمہ):۔ حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں

کہ میں نے ایک کپڑا چھینٹ خریدی۔ جس میں تصویریں تھیں۔ تو جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ اس کپڑے کو دیکھا۔ تو چہرۂ مبارک غصے سے متغیر ہوا۔ اور فرمایا۔ اے عائشہ یہ کیا ہے۔ تو میں نے عرض کیا۔ یہ چھینٹ کا کپڑا ہے میں نے آپ کے بیٹھنے کے لیے خریدا ہے۔ ارشاد فرمایا۔ ہم اس گھر میں نہیں جاتے۔ جہاں فوٹو ہوں۔ دوسری حدیث میں انہی ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:۔ وَاَنَا مُسْتَتِرٌ بِقِرَامٍ سِتْرٍ فِیْہِ صُوْرَۃٌ فَھَتَکَہٗ ط (ترجمہ):۔ میں ایسی چادر میں لپٹی بیٹھی تھی۔ جس میں فوٹو تھی۔ تو آپ نے اس کو اتار کر پھینک دیا۔ یا پھاڑ دیا۔ پھر فرمایا۔ کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان فوٹو گرافروں اور مصوروں کو ہوگا۔ جو اللہ کی جاندار مخلوق کے فوٹو بناتے ہیں۔ (طحاوی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۳۶۳) تیسری حدیث پاک:۔ طحاوی شریف جلد دوم باب الصور میں ہے:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ حِیْنَ دَخَلَ الْبَیْتَ وَجَدَ فِیْہِ صُوْرَۃَ اِبْرَاھِیْمَ وَصُوْرَۃَ مَرْیَمَ ط (الخ) (ترجمہ) جب آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ تو آپ نے سیدنا حضرت ابراہیم و سیدہ مریم علیہم السلام کی تصویریں دیکھیں۔ مجدد بریلوی علیہ الرحمت اپنے فتاویٰ رضویہ میں فرماتے ہیں۔ کہ وہ تصویریں فاروق اعظم نے پانی سے دھوئیں۔ کچھ نشان رہ گئے تو خود نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دھو ڈالیں۔ اس طرح کی متعدد احادیث کتب احادیث میں مکتوب ہیں۔ ان سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ بت نہ تھے۔ بلکہ فوٹو تھے۔ ایک اور حدیث پاک میں آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصویر بنانے والے کو بدترین انسان فرمایا۔ جس کے آخری الفاظ اس طرح ہیں:۔ ثُمَّ صَوَّرُوْا فِیْہِ تِلْکَ الصُّوَرَ اُولٰٓئِکَ شِرَارُ خَلْقِ اللّٰہِ ط (ترجمہ):۔ جب لوگوں نے حبشے کے ماریہ مندر کا ذکر نبی کریم کی بارگاہ میں کیا۔ اور بتایا کہ اس کی دیواروں پر رنگ و روغن سے تصویریں بنی ہیں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ بدبخت لوگ اللہ کے پیاروں کے فوت ہونے کے بعد ان کی فوٹو بنا لیتے تھے۔ وہ لوگ دنیا پر بدترین مخلوق تھے۔ اللہ اکبر کتنی سخت وعید ہے۔ اب بھی کوئی پیر مولوی یا لیڈر فوٹو کا شوق کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بچائے۔ ان تمام دلائل سے چند باتیں ثابت ہوئیں۔ ع۱ تصویر کا موجد کون ہے؟ ع۲ تصویر کب سے شروع ہے:۔ ع۳ تصویر کی حقیقت کیا ہے ع۴:۔ تصویر فوٹو وغیرہ کیوں حرام ہے۔ محض تعظیم کی بنا پر یا شرک سے مشابہت کی بنا پر۔ چنانچہ علامہ شامی اپنے فتاویٰ جلد اول صفحہ نمبر ۶۰۲ پر فرماتے ہیں:۔ وَقَدْ ظَھَرَ مِنْ ھٰذَا اَنَّ عِلَّۃَ الْکَرَاھَۃِ فِی الْمَسَائِلِ کُلِّھَا اِمَّا التَّعْظِیْمُ اَوِ التَّشَبُّہُ ط (ترجمہ):۔ ان تمام باتوں سے یہ چیز بخوبی ظاہر ہو گئی۔ کہ تصویر کی ممانعت تعظیم کا ارادہ نہ ہو۔ اب مزید اتنی وضاحت اشد ضروری ہے کہ جاندار کی تصویر کس صورت میں حرام ہے۔ کس صورت میں جائز۔ یہ تو پہلے بتا دیا گیا۔ کہ غیر جاندار درخت، پتھر،

آسمان، زمین کی صورت، تصویر۔ بنانا جائز ہے۔ اس کو گھر میں رکھنا۔ اس کی تعظیم کرنا نماز میں پاس رکھنا۔ سب جائز ہیں۔ عقلاً بھی اور نقلاً بھی۔ ہر طرح اجازت ہے:۔

نقلاً:۔ تو اس طرح کہ طحاوی شریف جلد دوم میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک کو مصور فرمایا کہ مصور کو سخت عذاب ہوگا۔ لیکن اگر تو مصوری چاہتا ہے۔ تو درخت اور غیر روح اشیاء کی تصویر بنا یا کر۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:۔ اِلَّا اَنْ تَصْنَعَ فَعَلَيْكَ بِالشَّجَرِ وَكُلِّ شَيْئٍ لَيْسَ فِيْهِ رُوْحٌ ۔ عقلاً:۔ اس طرح کہ ہر وہ چیز کفار جس کی پوجا کرتے ہیں اس کی تعظیم کرنا یا اس کو اونچے مقام پر رکھنا ہر مسلمان پر حرام ہے۔ تاریخ اور مذہبی کتب سے یہ بات یقین ثابت ہے۔ کہ ہندو، مجوسی اور دیگر بت پرست ہر قسم کے جاندار کی تصویر کی پرستش نہیں کرتے۔ خواہ وہ تصویر کاغذ کپڑے دیوار پر ہو یا مورتی اور بت کی شکل میں ہو۔ لیکن اصل جاندار کی پرستش نہیں کرتے۔ اسی طرح دیگر بہت سی بے جان چیزوں کی پرستش کرتے ہیں:۔ مگر وہاں اصل شئی کی پرستش ہوتی ہے۔ فوٹو کی نہیں۔ اور ہر قسم کے بے جان کی پرستش نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض مخصوص چیزوں کی جیسے ہندوستان کے ہندو پیپل کی مجوسی بھڑکتی آگ کی۔ پارسی ستاروں کی۔ بعض عیسائی قومیں صلیب کی پوجا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی فوٹو کی پوجا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جاندار کی فوٹو حرام اور اس کی عظمت مشابہ شرک۔ بے جان کی فوٹو حرام نہیں۔ بلکہ اصل پیپل۔ صلیب بھڑکتی آگ ستاروں چاند، سورج کی تعظیم حرام ہے:۔ کیونکہ کافر پیپل کے فوٹو کی تعظیم نہیں کرتے۔ نہ کسی ستارے کی تصویر کی پرستش ہوتی ہے۔ نہ آگ کی تصویر کی۔ بلکہ اصل آگ کی۔ اس لیے فقہاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ جس طرح تصویر ذی روح کے سامنے نماز منع ہے۔ اسی طرح بھڑکتی آگ سے چولہے یا تندور کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ آگ کی تصویر سامنے رکھی ہو۔ تو نماز منع نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اصلی جانور یا انسان نمازی کے سامنے آجائے۔ یا گزر جائے۔ تو نماز نہیں ٹوٹتی اس سے یہ بات بھی صاف ہوگئی۔ کہ جن چیزوں کی کفار پوجا نہیں کرتے۔ ان کی تعظیم شرعاً جائز ہے۔ لہٰذا مزاراتِ اولیاء اللہ کی شریعت کے حدود میں تعظیم اور اسی طرح علماء اولیاء کی زندگی و بعد وفات شریعت کی بتائی ہوئی تعظیم کرنا جائز۔ بلکہ عین ایمان ہے۔ اسی طرح تمام کتب فقہ میں مکتوب ہے۔ اس باریک فرق سے واضح ہوگیا۔ کہ جاندار کی تصویر کیوں حرام ہے۔ بے جان کی کیوں جائز ہے۔ اب یہ بات بھی سمجھنے کے لائق ہے۔ کہ جاندار میں صرف چہرے اور سر کی تصویر بنانا حرام ہے۔ اگر کسی جاندار کا چہرہ نہ بنایا جائے تو باقی جسم کی تصویر بنانا نہ حرام ہے۔ نہ دخولِ ملائکہ سے مانع اور نہ ناقضِ نماز۔ نہ اس کی تعظیم مکروہ چنانچہ طحاوی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۳۶۶ پر ہے:۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ اَلصُّوْرَةُ۔ اَلرَّاْسُ فَكُلُّ شَيْئٍ لَيْسَ لَهٗ رَاْسٌ فَلَيْسَ بِصُوْرَةٍ (ترجمہ) حضرت ابی ہریرہ نے فرمایا۔ کہ تصویر صرف چہرے کا نام ہے جس فوٹو وغیرہ کا چہرہ نہیں۔ وہ جاندار کی تصویر نہیں کہلاتی۔ دوسری حدیث میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی کریم رؤف الرحیم سے عرض کیا

کہ تصویر کا سر کاٹ دیا جائے۔ تو مثل درخت کے ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اَتَانِیْ جِبْرَائِیْلُ۔ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ جِئْتُکَ الْبَارِحَۃَ فَلَمْ اَسْتَطِعْ اَنْ اَدْخُلَ الْبَیْتَ لِاَنَّہٗ کَانَ فِی الْبَیْتِ تِمْثَالُ رَجُلٍ۔ فَمُرْ بِالتِّمْثَالِ فَلْیُقْطَعْ رَأْسُہٗ حَتّٰی یَکُوْنَ کَہَیْئَۃِ الشَّجَرَۃِ ؎ (ترجمہ):۔ روایت ہے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔ فرمایا۔ کہ ارشاد فرمایا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے۔ میرے پاس جبرائیل حاضر ہوا۔ پس عرض کی۔ اے کائنات کے تعریف کیئے ہوئے۔ میں کل شام حاضر بارگاہ ہوا تھا۔ لیکن اندر نہ آسکا۔ کیونکہ گھر میں انسانی تصویر تھی۔ پس اے آقا کسی صحابی کو حکم دیجئے۔ تاکہ وہ تصویر کا سر کاٹ دے۔ تاکہ وہ تصویر بقیہ مثل درخت کے ہو جائے۔ (اور حرمت سے خارج ہو جائے) فقہ کی معتبر کتاب ھدایہ جلد اول صفحہ نمبر ۶۰ پر ہے:۔

قَالَ اِذَا کَانَ التِّمْثَالُ مَقْطُوْعَ الرَّأْسِ فَلَیْسَ بِتِمْثَالٍ ؎ (ترجمہ):۔ فرمایا جب فوٹو کا سر کٹا ہوا ہو۔ تو وہ حیوان کی تصویر نہیں کہلاتی۔ ان دلائل سے ثابت ہوا۔ کہ تصویر صرف چہرے کا نام ہے۔ اور وجہ ظاہر ہے۔ کہ فوٹو اور تصویر کھنچوائی اور بنوائی جاتی ہی معرفت کے لیئے ہے۔ اور کسی کی عبادت، پوجا، اور تعظیم معرفت کی وجہ سے ہی کی جاتی ہے۔ اور معرفت و پہچان کا سرچشمہ چہرہ ہی ہے۔ چہرہ دیکھنے کے بغیر کسی کی پہچان ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ چہرہ دیکھے بغیر تو شرعاً گواہی بھی معتبر نہیں۔ چہرے ہی کی تصویر اصل مقصود ہوتی ہے۔ فقہ اسلامی کا مشہور قاعدہ ہے:۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِمَقَاصِدِہٖ ؎ (ترجمہ): چیزیں نیت و مقصد کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ تو چونکہ تصویر کا مقصد پہچان کرانا ہے۔ اور وہ صرف چہرے سے حاصل ہے۔ لہٰذا اصل فوٹو صرف چہرہ ہے۔ پس چہرے کے ساتھ پورے دھڑ کی تصویر بنانا بھی حرام۔ آدھے کی بھی حرام فقط چہرے کی بھی حرام زندہ کی بھی حرام۔ اور مردہ کی بھی حرام۔ کیونکہ یہی تعظیم کی اصل ہے۔ اسی کی تعظیم و معرفت مقصود ہے۔ اسی لیئے کسی نے کبھی صرف دھڑ کی اور چہرے کو چھوڑ کر تصویر نہ بنائی۔ حالانکہ فقط چہرے کی بے شمار تصویریں بنتی ہیں۔ دیکھو پاکستانی نوٹوں پر محمد علی جناح کی تصویر فقط چہرے کی ہے۔ پہلے زمانے میں سکوں پر بادشاہوں کے فقط چہرے بنائے جاتے تھے اور یہ سب کچھ معرفت و تعظیم ہی کی غرض سے ہوتا ہے۔ اور تصویر کی تعظیم تو حرام لہٰذا چہرہ کی تصویر حرام۔ یہ وضاحت اس لیئے کی گئی ہے۔ کہ بعض جہلاء یہ بھی کہہ دیتے ہیں۔ کہ اوپر والے آدھے دھڑ کی تصویر جائز ہے۔ ممانعت صرف قدِ آدم پورے جسم کی تصویر میں ہے۔ ثابت ہو گیا۔ کہ پورے دھڑ کی تصویر ہو یا آدھے کی۔ حیوان ہو۔ یا انسان کی بڑی ہو یا بالکل چھوٹی۔ سب کا بنانا حرام ہے۔ اور بنانے والے کو سب پر عذاب ہو گا۔ ہاں نماز کے لیئے یا دخولِ ملائکہ کے لیئے بہت چھوٹی تصویر منع نہیں۔ یعنی اگر کسی گھر کی دیواروں پر اور کپڑے یا کاغذ پر چھوٹی چھوٹی

جاندار تصویریں ہوں۔ تو اس کے سامنے نماز پڑھنا جائز ہے۔ کیوں کہ وہاں تصویر کی معرفت یا تعظیم مقصود نہیں۔ بلکہ وہ تو عام نظر میں نگاہوں سے مستور رہتی ہے۔ اسی طرح تصویروں والے نوٹ پیسے اگر نمازیں ظاہر ہیں تو نماز مکروہ تحریمی اعادہ واجب اگر جیب یا بٹوے میں اس طرح پوشیدہ ہوکر بلا تکلف نظر نہیں آتے۔ تو نماز جائز۔ کہ یہ بھی چھوٹی تصویر کی طرح۔ مستور کے حکم میں ہیں چنانچہ فتح القدیر میں جلد اول صفحہ نمبر ص ۲۹۵ پر ہے:۔ لَوْ كَانَتِ الصُّوْرَةُ صَغِيْرَةً بِحَيْثُ لَا تَبْدُوْ لِلنَّاظِرِ فَلَيْسَ لَهَا حُكْمُ الْوَثَنِ فَلَا تُكْرَهُ فِي الْبَيْتِ ؕ (ترجمہ):۔ اگر تصویر بہت چھوٹی ہوکر بادی النظر میں دیکھنے والے کو نظر نہ آئے۔ تو وہ بت پرستی کے حکم میں نہیں۔ لہٰذا گھر میں رکھنا مکروہ نہیں۔ یہ تو بنانے والے اور نماز پڑھنے والا کا حکم تھا۔ کہ بنانے والا جس طرح بھی جاندار کی تصویر بنائے گا۔ لائقِ عذاب ہوگا۔ ہاں بڑی تصویر یا بت خریدنے والا یا اپنی تصویر بنوانے کے لیے باعتبار نیات مختلف حکم ہیں۔ اگر مجبوریِ سخت کے تحت مبتلا ہے۔ جیسا کہ شروع میں بتایا گیا۔ تو جائز ہے۔ اور اگر تصویر خریدتا ہے لیکن خریدنے کا مقصد تصویر نہیں ہے۔ جیسے روزمرہ اخبار خریدنا۔ تب بھی جائز ہے۔ کیونکہ خریدار کی نیت تصویر نہیں بلکہ اخبار ہے۔ اگرچہ تصاویر ساتھ ہی ہیں۔ اس لیے کہ حدیث پاک میں ارشاد ہوا:۔ اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ؕ۔ (ترجمہ):۔ عمل کا مدار نیت پر ہے۔ لیکن تصویر کو تصویر کی نیت سے خریدا۔ یا بلا مجبوری، شوقیہ فوٹو کھنچوایا جیسا کہ اوباش لوگ دن رات بازاری کیلنڈر و قطعے و طغرے خریدتے ہیں۔ یا فلمی رسائل محض تصویروں کے لیے حاصل کرتے ہیں۔ یا زمانہ ساز مقررین حضرات اپنے جلسوں میں فوٹو کھنچواتے ہیں۔ یا عوام عید وغیرہ تیوہاروں کو بلاوجہ تصویریں کھنچواتے ہیں۔ یہ سب حرام بلکہ اشد حرام۔ دو وجہ سے۔ پہلی اس لیے کہ حرام اور شرعی مجرم یعنی تصویر سازی کی اعانت و امداد ہے۔ حالانکہ شریعت میں گناہ کی امداد بھی اسی طرح گناہ و جرم ہے۔ جس طرح ہر گناہ جرم ہے تصویر بنانا شرعی جرم ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے:۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ (ترجمہ):۔ اے ایمان والو! نیکی اور تقویٰ پہ مدد کرو۔ گناہ اور سرکشی پہ مدد نہ کرو۔ بلا وجہ فوٹو خریدنے یا بنوانے والا فوٹوگرافر کے شرعی جرم پہ مدد کرتا ہے جو شرعاً حرام ہے:۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اس میں اسراف یعنی فضول خرچی ہے۔ اور یہ بھی اسلام میں حرام ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ (ترجمہ):۔ اے مسلمانوں اللہ کی دی ہوئی دولت کو صرف اپنے کھانے پینے کی ضروریات میں خرچ کرو فضول خرچ نہ کرو۔ فضول ہر وہ کام ہے جس کا دینی دنیوی کوئی فائدہ نہ ہو۔

خلاصہ:۔ یہ کہ تصویر کا حکم صرف چند صورتوں میں جواز کی طرف ہے۔ باقی تمام شقیں حرمت کی طرف ہی راغب۔ اور یہ حکمی اختلاف بھی صرف محض استعمال یا شناخت کے لیے ہے۔ لیکن تصویر کی تعظیم کرنا ہر شخص کے لیے ہر صورت میں حرام لِعَيْنِهٖ ہے۔ اور تعظیم کی وہ چند صورتیں جو اوپر بیان ہوئیں

وہ سب صورتیں حرام۔ خواہ اپنی فوٹو کی تعظیم ہو یا کسی دوسرے کی۔ باپ کی ہو یا پیر کی یا اُستاد کی مثلاً ایک شخص نے بوجہ مجبوری تصویر بنوائی۔ لیکن دوسرے نے اُس کی زندگی میں یا بعد وفات اُس کے اسی فوٹو کی تعظیم کی تو اب یہ تعظیم کرنے والا شرعی مجرم ہے۔ اسی طرح اخباروں کے فوٹو کاٹ کر دیواروں یا چھتوں پر لگانا سجاوٹ کی نیت سے تو یہ بھی حرام ہے۔ کیونکہ اس سے بھی تصویر کی تعظیم ہے۔ ہاں البتہ پورے اخبار کو کسی سخت ضرورت کی بنا پر دیواروں سے چسپاں کرنا یا کپڑوں کی الماری میں لگانا۔ منع نہیں لیکن پھر بھی گندے فوٹوؤں سے بچنا بہتر ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط۔

کتبہ

احرام میں پیوند والی یا آنچل سلی چادر استعمال کرنے کا حکم

سوال نمبر ۴۴ :۔ کیا فرماتے ہیں۔ کہ علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ احرام کے لیے پیوند والی چادریں یا کپڑے کے دو پٹ جوڑ کر چادر کی طرح سی کر احرام میں استعمال کرنا جائز ہے یا منع ہمارے ایک مولوی صاحب اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے۔ کہ منع اور ناجائز ہے کہ احرام میں پیوند والی یا کناری سلی یا پٹ سلی چادر استعمال کی جائے۔ مرد کو ایسا احرام ناجائز ہے۔ فرمایا جائے۔ کہ کیا یہ مسئلہ صحیح ہے۔

السائل :۔ حافظ محمد یعقوب سکنہ جہلم مورخہ ۵-۱-۲

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

قانونِ شریعتِ مطہرہ کے مطابق احرام میں پیوند والی کھلی چادر باندھنا یا اوڑھنا بالکل جائز ہے اسی طرح چادر کی آنچل کو بوجہ خاص ضرورت سینا یا پہلے سے آنچل سلی چادر احرام میں استعمال کرنا بلا کراہت جائز ہے جس صاحب نے بھی اس کو ناجائز کہا ہے۔ انہوں نے بالکل غلط کہا ہے۔ عوام کو چاہیئے۔ کہ کسی مسئلہ پر قلم اٹھانے سے پہلے علماء سے مشورہ کر لیا کریں۔ اور اپنی تحقیق کو صرف اردو کتب تک محدود رکھ کر کسی شخص کے لیے روا نہیں۔ کہ تحریری اشاعت کرے۔ بلا تحقیق فتوٰے دینا قطعاً ناجائز بلکہ بعض مواقع قابلِ تعزیر ہے تحقیق فتوٰے یہی ہے۔ کہ سلائی والی چادر بحالتِ احرام باندھنا اوڑھنا بالکل جائز نہ مکروہ تحریمی نہ تنزیہی۔ چنانچہ فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۲۱۳ پر ہے۔ فَلَوْ اَحْرَمَ لَابِسًا لِلْمَخِیْطِ اَوْ مُجَامِعًا اِنْعَقَدَ فِی الْاَوَّلِ صَحِیْحًا۔ وَفِی الثَّانِیْ فَاسِدًا کَمَا فِی اللُّبَابِ ط ترجمہ :۔ اگر کسی شخص حج کرنے والے نے سلائی والی کھلی چادروں کا احرام باندھا۔ یا مجامع کی حالت میں بلا طہارت احرام باندھا۔ تو

پہلی حالت یعنی آنچل سلی چادر میں احرام صحیح منعقد ہو جائے گا دوسری صورت یعنی بحالتِ پلیدی احرام منع و فاسد ہوگا اسی فتاوی شامی کے صفحہ نمبر ۲۱۵ پر ہے:۔ فَيَجُوْزُ فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ وَاَكْثَرَ مِنْ ثَوْبَيْنِ وَفِيْ اَسْوَدَيْنِ اَوْ قِطَعِ خِرَقٍ مُخَيَّطَةٍ اَيِ الْتِئَامٍ مُرَقَّعَةٍ ۔ (ترجمہ):۔ پس ایک بڑی چادر میں بھی احرام باندھنا بالکل جائز ہے۔ دو چادروں سے زیادہ بھی یا بجائے سفید رنگ کے کالی چادریں بھی احرام میں جائز ہیں اسی طرح جائز ہے۔ اگر احرام کی چادریں ٹکڑا ٹکڑا جوڑ کر سی گئی ہیں۔ جن کو عربی میں مرقع کہا جاتا ہے۔ اردو میں گودڑی۔ جیسا کتب لغات سے ثابت ہے۔ لغات فارسی میں اس کو ژندہ کہتے ہیں۔ چنانچہ لغات منتخب النفائس صفحہ نمبر ص۱۳۳ پر ہے۔ گدڑی ژندہ، مرقع اور لغاتِ کشوری صفحہ نمبر ص۴۵۵ پر ہے، مرقع، مرقعہ ع۔ ا:۔ تصویروں کی کتاب ع۔ ۲:۔ گودڑی فقیروں کی۔ اس لیے کہ ان دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے اور پیوند، جمع کیے ہوئے اور سلے ہوتے ہیں۔ لغات مجمع البحار جلد دوم صفحہ نمبر ص۲۷ پر کرمانی اور قسطلانی کے حوالے سے مرقوم ہے:۔ اَلرِّقَاعُ جَمْعُ رُقْعَةٍ وَهِيَ الْخِرْقَةُ رُوِيَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَطَبَ وَفِيْ اِزَارِهٖ اِثْنَا عَشَرَ رُقْعَةً ۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایسی ٹکڑے سلی چادر کو بھی احرام میں جائز فرمایا اب کس کی جرأت ہے۔ جو اس کو ناجائز یا مکروہ تحریمی یا حرام و تنزیہی کہے۔ علامہ شامی کے علاوہ دیگر فقہاء کرام نے بھی اس کو جائز بلا کراہت تنزیہی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ فتاوی بحر الرائق ص۳۳۱ پر ہے:۔ فَيَجُوْزُ فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ وَاَكْثَرَ مِنْ ثَوْبَيْنِ وَفِيْ اَسْوَدَيْنِ اَوْ قِطَعِ خِرَقٍ مُخَيَّطَةٍ ۔ یعنی سلائی والی چادر احرام میں بالکل جائز ہے۔ اس کو ناجائز کہنا سراسر غلطی ہے۔ یہاں تک کہ سردی کی بنا پر اگر دو چادریں سلائی سے برابر جڑی ہوئی بھی احرام میں استعمال کریں۔ تب بھی بالکل بلا کراہت جائز ہیں۔ ہاں صرف افضل یہ ہے۔ کہ سفید رنگ کی بغیر پیوند والی اور بغیر آنچل سلی ہوئی چادر احرام میں لی جائے چنانچہ فتاوٰے بحر الرائق جلد دوم صفحہ نمبر ص۳۲۱ پر اور فتاوٰے ردالمحتار جلد دوم صفحہ نمبر ص۲۱۵ پر ہے:۔ كَرَوَا الْاَفْضَلُ اَنْ لَّا يَكُوْنَ فِيْهَا خِيَاطَةٌ (لُبَاب) بَلْ لَوْ لَمْ يَتَجَرَّدْ عَنِ الْمَخِيْطِ اَصْلًا يَنْعَقِدُ اِحْرَامُهٗ ۔ (ترجمہ):۔ اور بس افضل ہے۔ کہ اس چادر میں سلائی نہ ہو۔ بلکہ اگر خالی نہ ہو۔ وہ چادر سلائی سے بالکل تو بھی احرام منعقد ہو جائے گا۔ ثابت ہوا۔ کہ بے سلائی اور بے پیوند چادر افضل ہے۔ ورنہ اس کے بغیر بھی سلی چادر سے احرام بلا کراہت درست ہے۔ قانونِ شریعت میں افضل بمعنی اولیٰ و مستحب ہے۔ اور ترک اولیٰ جائز ہوتا ہے کراہت تحریمی تو در کنار کراہت تنزیہیہ بھی اس سے ثابت نہیں۔ خیال رہے۔ کہ شریعت کی زبان میں لفظِ افضل و مستحب و مندوب اور لفظ اولیٰ ہم معنی ہیں ان کے خلاف سے مکروہ تنزیہی بھی ثابت نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ مکروہ تحریمی یا ناجائز ہو۔ چنانچہ فتاوٰے شامی جلد اول ص۸۱ پر ہے:۔ وَاَمَّا الْمُسْتَحَبُّ اَوِ الْمَنْدُوْبُ

فَیَنْبَغِیْ اَنْ لَّا یُکْرَہَ اَصْلًا (الخ) فَلَمْ یَلْزَمْ مِنْ تَرْكِ الْمُسْتَحَبِّ ثُبُوْتُ الْکَرَاھَۃِ (الخ) وَلَا شَكَّ اَنَّ تَرْكَ الْمُسْتَحَبِّ خِلَافُ الْاَوْلٰی اھ (ترجمہ) اور لیکن مستحب یا مندوب کا ترک بالکل مکروہ نہیں۔ پس نہیں لازم آتا مستحب کو چھوڑنے سے کراہت کا ثبوت اور نہیں ہے شک اس میں کہ مستحب کا ترک خلافِ اولیٰ ہے۔ واضح ہو گیا۔ کہ سلی چادر کا استعمال افضلیت یعنی مستحب کے خلاف ہے۔ لہٰذا مکروہ تنزیہی بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ناجائز کہہ دیا جائے۔ ہمارے بعض بزرگ نے پیوند والے بے سلے کپڑے کو احرام کے لیے مکروہ فرما دیا۔ مگر اس میں تامل ہے۔ اگر ان کی مراد یہی مذکورہ چادر ہے۔ اور ظاہر بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ تو یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ مکروہ تحریمی تو بڑی چیز ہے۔ قانونِ شرعی میں تو مکروہ تنزیہی کے لیے بھی دلیل کی ضرورتِ شدید ہے۔ بغیر دلیل تو مکروہ تنزیہی بھی ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ فتاوٰی تنویر الابصار جلد اوّل صفحہ ۸۴ پر ہے:۔

لَا یَلْزَمُ مِنْ تَرْكِ الْمُسْتَحَبِّ ثُبُوْتُ الْکَرَاھَۃِ اِذْ لَا بُدَّ لَھَا مِنْ دَلِیْلٍ خَاصٍّ اھ (ترجمہ) مستحب اور افضل چیز کو چھوڑنے سے کراہت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ ثبوتِ کراہت کے لیے دلیل خاص کی ضرورت ہے۔ اور علامہ شامی نے فتاوے میں جلد اوّل کے صفحہ ۶۱ پر فرمایا:۔

یَظْھَرُ اَنَّ کَوْنَ تَرْكِ الْمُسْتَحَبِّ رَاجِعًا اِلٰی خِلَافِ الْاَوْلٰی لَا یَلْزَمُ مِنْہُ اَنْ یَّکُوْنَ مَکْرُوْھًا اِلَّا بِنَھْیٍ خَاصٍّ لِاَنَّ الْکَرَاھَۃَ حُکْمٌ شَرْعِیٌّ فَلَا بُدَّ لَہٗ مِنْ دَلِیْلٍ اھ ترجمہ بالکل ظاہر بات ہے۔ کہ ترکِ مستحب خلافِ اولیٰ ہے۔ اس سے کراہت تنزیہی ثابت نہیں۔ کیونکہ کراہت شرعی حکم ہے۔ اس کے لیے دلیل کی اشد ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا عباراتِ منقولہ سے چار باتیں، ظاہر ہوئی ہیں ۱: احرام میں بے سلی چادر افضل ہے۔ آنچل سلی اور پیوندوں والی چادر بھی بلا کراہت جائز ہے۔ ۲: افضل، مستحب، مندوب، اَولیٰ، الفاظِ مترادف ہیں، ایک معنٰی میں ہیں ۳: افضل وغیرہ اشیاء کا چھوڑنا بوقتِ ضرورت جائز ہے مکروہ بالکل نہیں ۴: کیونکہ مکروہ تنزیہی ثابت کرنے کے لیے بھی خاص شرعی دلیل اشد لازم ہے ۵: ان مندرجہ بالا عبارتوں میں تنزیہی مراد ہے کیونکہ ذکر تنزیہی کا شروع ہے۔ لہٰذا جن بزرگ صاحب نے پیوند والی چادر کو برائے احرام مکروہ کہا وہ بالکل صحیح نہیں اس لیے کہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ خیال رہے کہ جن فقہاء کرام نے سلے ہوئے کپڑے سے احرام میں منع کیا ہے۔ وہاں اصطلاحی لباس مراد ہے۔ جیسے کرتہ قمیص شلوار، پاجامہ وغیرہ نہ کہ کھلی آنچل سلی پیوند والی چادر۔ اس لیے کتب میں وضاحت کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے فتاوٰے عالمگیری جلد اوّل صفحہ ۲۲۴ پر ہے:۔ وَالْحَرَامُ مِنْ لُبْسِ الْمَخِیْطِ ھُوَ اللُّبْسُ الْمُعْتَادُ ھٰکَذَا فِیْ فَتَاوٰی قَاضِیْ خَانْ فِی الْجُزْءِ الْاَوَّلِ عَلٰی صَحِیْفَۃِ صفحہ ۲۸۵ اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے

یعنی احرام میں جو کپڑا پہننا حرام ہے۔ اس وجہ سے مروجہ لباس کو احرام چادر مکروہ وغیرہ کہا گیا۔ اس سے مراد وہی ابائی لباس ہے **لہذا**:۔ مضبوط دلائل سے ثابت ہو گیا۔ کہ احرام کی چادریں آنچل سلی اور پیوند والی جائز ہے۔ جو ناجائز کہے۔ وہ غلطی پر ہے: وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

حج کا احرام باندھ کر عورت حائضہ ہو جائے تو کیا حکم ہے

سوال ۴۵

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں۔ کہ ایک عورت نے تمام ارکان حج ادا کر لیے۔ لیکن احرام کھولنے کے وقت اس کو حیض جاری ہو گیا۔ اور پاک ہونے سے پہلے وہاں سے روانہ ہونا پڑ گیا طواف وداع نہ کر سکی۔ اب اس کا کیا حکم ہے

سوال نمبر ۴۵ کا جواب:۔ طواف وداع کے وقت اگر کسی عورت کو حیض یا نفاس شروع ہو جائے اور اس حاجیہ عورت کے پاس انتظار کا بالکل وقت نہ ہو۔ تو ایسی مجبوری میں اس کو طواف وداع معاف ہے چنانچہ فتاوی رد المحتار جلد دوم طوافِ صدر صفحہ نمبر ۲۵۵ پر ہے:۔ طَوَافُ الصَّدْرِ وَاجِبٌ الخ،، فَلَا يَجِبُ عَلَى الْمَكِّيِّ وَلَا عَلَى الْمُعْتَمِرِ مُطْلَقًا وَفَائِتِ الْحَجِّ وَالْمُحْصَرِ وَالْمَجْنُوْنِ وَالصَّبِيِّ وَالْحَائِضِ وَالنُّفَسَاءِ كَمَا فِي اللُّبَابِ وَغَيْرِهٖ (ترجمہ):۔ طوافِ صدر یعنی طوافِ وداع واجب ہے ہر حج کرنے والے مرد عورت پر۔ لیکن نہیں واجب مکی پر نہ ہر طرح کا عمرہ کرنے والے پر نہ حج کو فوت کرنے والے پر نہ محصر پر نہ بچے پر نہ حیض یا نفاس والی عورت پر۔ اسی طرح فتاوے لباب وغیرہ میں ہے۔ چنانچہ فتاوی ہندیہ جلد اول صفحہ نمبر ۲۳۴ پر ہے:۔ وَطَوَافُ الصَّدْرِ وَاجِبٌ عَلَى الْحَاجِّ (الخ) وَلَا يَجِبُ عَلَى الْحَائِضِ وَالنُّفَسَاءِ (ترجمہ):۔ طوافِ وداع ہر حاجی پر واجب ہے۔ اور حیض والی نفاس والی عورت پر واجب نہیں یعنی جس عورت کو ارکانِ حج ادا کرتے وقت طوافِ وداع سے کچھ پہلے حیض یا نفاس شروع ہو جائے تو طواف وداع اُس سے معاف ہو گیا۔ ہاں اگر ابھی واپس روانگی نہ ہوئی یا عورت حائضہ مکہ شریف سے بارادہ واپسی نکل گئی۔ ابھی میقات سے باہر نہ گئی تھی۔ کہ حیض یا نفاس بند ہو گیا۔ اور پھر خود واپس آ گئی۔ تو طواف کر لے۔ اب وہ معافی ختم ہو گئی:۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر ۲۳۵ پر ہے:۔ حَائِضٌ طَهُرَتْ قَبْلَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْ مَكَّةَ يَلْزِمُهَا طَوَافُ الصَّدْرِ (الخ) وَاِنْ خَرَجَتْ وَهِيَ حَائِضٌ ثُمَّ اغْتَسَلَتْ ثُمَّ رَجَعَتْ اِلَى مَكَّةَ قَبْلَ اَنْ تُجَاوِزَ الْمِيْقَاتَ فَعَلَيْهَا الطَّوَافُ (ترجمہ):۔ حائضہ عورت پاک ہو گئی۔ پہلے اس سے کہ نکلے مکے شریف سے۔ اس پر طوافِ وداع واجب ہے۔ اور اگر مکہ مکرمہ سے نکل گئی۔ پھر غسل کیا۔ پھر وہ لوٹی مکے شریف کی طرف میقات سے نکلنے سے پہلے پہلے تو اس پر پھر طوافِ وداع جس کو طواف صدر کہتے ہیں:۔

واجب ہے:۔

خلاصہ:۔ یہ کہ اگر حاجیہ عورت کو حیض یا نفاس روانگی تک جاری رہے۔ تو اکثر فقہاء کرام کے نزدیک طواف صدر معاف ہو جاتا ہے۔

خیال رہے:۔ کہ میقات کے اندر رہنے والے حضرات پر طوافِ وداع نہیں ہے:۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

کتاب النکاح

مرزائی لڑکے سے مسلمان عورت کا نکاح حرام اور باطل ہے

سوال ۴۵:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین و مفتیان شرع متین و مفتی اعظم پاکستان اس مسئلہ میں کہ میں مسماۃ فہیدہ بیگم بنت اللہ دتہ قوم کمہار سکنہ وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ کا نکاح میرے والد اللہ دتہ نے ایک لڑکے مسمّی محمد اشرف ولد غلام احمد قوم کمہار ساکن مقام پیرکا تحصیل حافظ آباد کے ساتھ میرے آبائی گاؤں بائیے تحصیل وزیر آباد میں آج سے تقریباً تین سال پیشتر کر دیا۔ نکاح برات کے ساتھ بڑی مجلس میں ہوا۔ لڑکی والوں میں سے کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ لڑکا اور اس کا باپ سخت ترین مرزائی اور مرزا غلام احمد کو نبی ماننے والے ہیں۔ نکاح اس لاعلمی اور دھوکے میں ہو گیا۔ اسی دن میں اپنے سسرال چلی گئی۔ دوسرے دن پھر اپنے میکے واپس آئی اور آٹھ دن رہ کر پھر اپنے سسرال گئی۔ اسی طرح دو تین پھیرے کیے مگر لڑکے کے مرزائی ہونے کا کوئی پتہ نہ لگ سکا۔ اور اپنے مذہب کو انھوں نے کافی چھپایا ڈیڑھ مہینے کے بعد پھر میں اپنے سسرال میں ہی تھی کہ مجھ سے کہا گیا ہے کہ ہم نے ایک جلسے میں جانا ہے۔ اور وہاں جانا ہمارا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ہم نے منت مانی ہے۔ اس وقت بھی مجھے نہ بتلایا گیا کہ جلسہ کہاں ہے اور کیسا ہے مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں پہنچ کر اور راستے میں لوگوں کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ ربوہ آگئے ہیں۔ اور مرزا غلام احمد اور مرزائیوں کا یہ جلسہ ہے۔ میرے خاوند نے مجھ پر یہ زور دیا کہ تو بھی مرزائی ہو جا اور مرزا کی بیعت کر لے مگر میں نے صاف انکار کر دیا

اُس وقت مجھ کو پتہ لگا کہ میرا یہ خاوند مسلمان نہیں ہے اور میرا نکاح ایک غیر مسلم مرزائی سے ہوا ہے۔ میں نے وہاں سے آکر فوراً اپنے گھر اطلاع دی کہ فوراً مجھے آکر لے جاؤ۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میری والدہ آئیں اور کافی لڑائی جھگڑے کے بعد مجھ کو میرے سسرال سے واپس لے گئیں۔ اب میں صرف اس لیے کہ وہ مرزائی ہے اور میں جانتی ہوں کہ مرزائی کافر ہوتے ہیں، اسی لیے میں اس کے ساتھ ہرگز نہیں رہنا چاہتی۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ محمد اشرف سخت مرزائی ہے۔ اس نے خود بھی اپنی تحریر سے انگوٹھا لگا کر اقرار کیا ہے اور اس کے چچا نظام علی نے بھی اس بات پر دستخط کیے کہ وہ اور اس کا بھتیجا محمد اشرف مرزائی احمدی ہیں۔ یہ تحریر اور بہت سے گواہوں کی تحریر حاضر خدمت ہے۔ وہاں کے مرزائی امام محبوب علی محمد نے بھی اس چیز کی گواہی دی ہے کہ محمد اشرف مرزائی ہے۔ اور سب لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ میں اور میرا والد اللہ دتہ صحیح العقیدہ سنی مسلمان ہیں، سب گواہی دے سکتے ہیں اور اس کے آبائی گاؤں میراں پور کے لوگ عبدالرشید مرزائی اور احمد وغیرہ نے بھی تحریری گواہی دی ہے کہ محمد اشرف واقعی مرزائی احمدی ہے۔ اور میرا والد اور چار گواہ حاضر خدمت ہیں جو باوضو کلمہ پڑھ کر حلفیہ گواہی دیتے ہیں کہ محمد اشرف مدعا علیہ مرزائی احمدی ہے۔ فرمایا جائے کہ کیا شریعتِ اسلامیہ میں میرا نکاح صحیح ہوا یا غلط۔ اور کیا محمد اشرف شرعاً میرا خاوند بن سکتا ہے؟ اور اگر نکاح غلط ہے تو کیا میں دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہوں؟ خدا کے لیے اس مرزائی سے میری جان چھڑائی جائے اور شرعی فتویٰ عطا فرمایا جائے۔

السائل

مؤرخہ ۸۴

بعونِ العلّامِ الوھّاب ﷻ

الجواب

قانون شریعت اسلامیہ اور قانون پاکستان کے تحت میں مفتی اسلام ہونے کی حیثیت سے حنفی مسلک کے مطابق فتوای جاری کرتے ہوئے سائلہ حنفیہ مسلمہ فہمیدہ بیگم بنت اللہ دتہ قوم کمہار کا نکاح باطل قرار دیتا ہوں۔ اور یہ نکاح جو دھوکہ اور فریب سے مسمیٰ محمد اشرف مرزائی احمدی قادیانی ولد غلام احمد نے فہمیدہ بیگم سے کیا ہے وہ شرعاً اور قانوناً ہوا ہی نہیں بالکل باطل محض ہے۔ میں نے بحیثیت مفتی ہونے کے محمد اشرف کے مرزائی ہونے کی کافی تحقیق کی ہے۔ مندرجہ بالا گواہوں کے حلفیہ بیان لیے ہیں۔ نیز محمد اشرف کے علاقے کے معتبر حضرات کے تحریری حلفیہ بیان لیے۔ خود محمد اشرف کی زیر دستخطی نشان انگوٹھے والی تحریر میرے پاس موجود ہے۔ جس میں اس نے اپنے احمدی مرزائی ہونے کا اقرار کیا ہے۔ میں نے مدعیہ اور اس کے لواحقین کے ذریعہ مدعا علیہ محمد اشرف کو بیان صفائی دینے کی اطلاع بھیجی۔

مگر خود حاضر نہ ہوا اس نے اپنی انگوٹھا شدہ تحریر میرے پاس بھیج دی۔ اس میں اپنے احمدی یعنی مرزائی ہونے
کا اقرار ہے۔ اس بستی کے مرزائی امام متعلقہ ربوہ کی تحریر بھی محمد اشرف کے احمدیت مرزائیت کے ثبوت میں
میں نے مہیا کیں۔ اس کے علاوہ بہت سے مرزائی و غیر مرزائی حضرات سے میں نے محمد اشرف کے مرزائی
ہونے کا ثبوت مانگا۔ سب کی حلفیہ تحریریں میرے پاس موجود ہیں۔ اتنی چھان بین اور تحقیق کے بعد
یہ شرعی فتوای صادر کیا جارہا ہے۔ چونکہ مدعیہ خود حنفی مسلمان ہے۔ اسی لیے حنفی مسلک کے مطابق فتوای
دیا جارہا ہے۔ قانون شریعت کے مطابق تمام امتِ مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرزائی احمدی
قادیانی ہرگز ہرگز مسلمان نہیں ہیں بلکہ مرتد خارج از اسلام ہیں۔ اس لیے کہ تمام مرزائی احمدی مرزا غلام
احمد کو نبی مانتے ہیں اور اسلامی عقیدہ کے مطابق جو شخص نبی کریم محمد مصطفی عربی تاجدار صلی اللہ علیہ وسلم
کے بعد کسی شخص کی نبوت کو تسلیم کرے وہ سب مسلمانوں کے نزدیک کافر ہے مجتہدین شریعت اور
علمائے امتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم کے بعد کسی کو کسی طرح کا نبی
ماننے والا کافر ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر جلد سوم ص۴۹۳ اور اسی طرح تفسیر روح البیان جلد ہفتم ص۱۸۸
پر ہے:۔ وَمَنْ قَالَ بَعْدَ نَبِیِّنَا نَبِیٌّ یَکْفُرُ لِاَنَّہٗ اَنْکَرَ النَّصَّ اور جو شخص نبوت کا دعوٰی
کرے۔ وہ بھی قرآن و حدیث اور تمام اہل اسلام و علمائے کرام کے نزدیک کافر گمراہ ہے۔ چنانچہ
تفسیر روح البیان اسی جگہ اور دیگر تفاسیر میں ہے:۔ وَمَنِ ادَّعَی النُّبُوَّۃَ بَعْدَ مَوْتِ مُحَمَّدٍ
لَا یَکُوْنُ دَعْوَاہُ اِلَّا بَاطِلًا۔ تفسیر ابن کثیر جلد سوم ص۴۹۳ پر ہے:۔ وَقَدْ اَخْبَرَ اللّٰہُ فِیْ کِتَابِہٖ
وَرَسُوْلِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی السُّنَّۃِ الْمُتَوَاتِرَۃِ عَنْہُ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ لِیَعْلَمُوْا اَنَّ
کُلَّ مَنِ ادَّعٰی ھٰذَا الْمَقَامَ بَعْدَہٗ فَھُوَ کَذَّابٌ اَفَّاکٌ دَجَّالٌ ضَالٌّ مُضِلٌّ۔ ان دلائل و
عقیدۂ اسلامی سے ثابت ہوا کہ مرزائی غلام احمدی مرتد و کافر ہیں۔ ان کو اہل کتاب بھی نہیں کہا جا
سکتا۔ اس لیے کہ شریعت میں اہل کتاب وہ شخص ہے کہ جو نبی کریم پر کامل ایمان نہ لائے اور ایسے
نبی کو مانے جس کو سب مسلمان بھی نبی تسلیم کرتے ہوں خواہ وہ نبی صاحب کتاب ہو یا نہ ہو جیسے یہودی
کہ حضرت عزیر علیہ السلام پر ایمان لاتے ہیں۔ حالانکہ آپ صاحب کتاب نہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو
کوئی مسلمان نہیں مانتا اس لیے اس کے متبعین کو اہلِ کتاب ہرگز نہیں کہا جاسکتا بلکہ ان کا شمار مرتدین
میں ہوگا۔ اور یہ بھی مسئلہ اسلامی عقیدہ ہے اور تمام امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے کہ مسلمان عورت
سے کافر مرد کا نکاح قطعاً نہیں ہوسکتا۔ خاوند کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ چنانچہ فتاوی فتح القدیر
جلد دوم ص۲۲۳ پر ہے:۔ لِاَنَّ مُطْلَقَ الدِّیْنِ ھُوَ الْاِسْلَامُ وَلَا کَلَامَ فِیْہِ لِاَنَّ اِسْلَامَ

الزَّوْجِ شَرْطُ جَوَازِ نِکَاحِ الْمُسْلِمَةِ: (ترجمہ) :- اس لیے کہ مطلق دین وہ اسلام ہے اور نہیں ہے کلام اس میں اس لیے کہ خاوند کا اسلام مسلمان عورت کے نکاح کے لیے شرط ہے"۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیر مسلم سے مسلمان عورت کا نکاح ہوتا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کافر مرد مسلمان عورت کا کفو نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ہم قوم یا ہم قبیلہ ہو اور قانون شرع کے مطابق غیر کفو میں نکاح باطل ہے جب تک کہ ولی اللہ اور شریعت اجازت نہ دے۔ چنانچہ فتاویٰ قاضی خان جلد اول صفحہ ۳۳۵ پر ہے :- وَاِنْ لَمْ یَکُنْ کُفُوًا لَا یَجُوْزُ النِّکَاحُ اَصْلًا۔ اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے صفحہ ۲۹۲ جلد اول عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَّ النِّکَاحَ لَا یَنْعَقِدُ اور جس طرح کافر سے مسلمہ کا نکاح ناجائز ہے اسی طرح مرتد سے بھی نکاح غلط ہے۔ چنانچہ فتاویٰ ہندیہ جلد اول صفحہ ۲۸۲ پر ہے :- لَا یَجُوْزُ لِلْمُرْتَدِّ اَنْ یَّتَزَوَّجَ مُرْتَدَّةً وَّلَا مُسْلِمَةً :- اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے جلد سوم صفحہ نمبر صفحہ ۵۸۱ وَمِنْهَا مَا هُوَ بَاطِلٌ بِالْاِتِّفَاقِ نَحْوَ النِّکَاحِ لَا یَجُوْزُ لَهٗ اَنْ یَّتَزَوَّجَ امْرَاَةً مُسْلِمَةً۔ یعنی مرتد اگر مسلمان عورت سے نکاح کرے تو وہ باطل ہے تمام فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر مرتد کا نکاح مسلمہ سے باطل ہے نہ کہ فاسد۔ کیونکہ فاسد نکاح وہ ہے جس میں علمائے کرام کا اختلاف ہو کہ جائز ہے یا ناجائز۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد دوم صفحہ ۳۳۵ پر ہے فِی الْبَحْرِ عَنِ الْمُجْتَبٰی کُلُّ نِکَاحٍ اِخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِیْ جَوَازِهٖ کَالنِّکَاحِ بِلَا شُهُوْدٍ فَهُوَ فَاسِدٌ۔ نکاح باطل وہ ہے جس کے ناجائز ہونے پر سب علمائے امت کا اتفاق ہو اور وہ نکاح سب کے نزدیک نہ ہونے کی طرح ہو۔ چنانچہ درمختار جلد دوم صفحہ ۴۸۲ پر ہے :- والظاهر ان المراد بالباطل ما وجوده کعدمه ولذا لا یثبت النسب به

صاحب ردالمحتار صفحہ ۴۸۲ پر فرماتے ہیں کہ کافر نے مسلمان عورت سے نکاح کیا تو وہ نکاح قطعاً باطل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے نَکَحَ کَافِرٌ مُسْلِمَةً فَوَلَدَتْ مِنْهُ لَا یَثْبُتُ النَّسَبُ وَلَا تَجِبُ الْعِدَّةُ لِاَنَّهٗ نِکَاحٌ بَاطِلٌ۔ ثابت ہوا کہ محمد اشرف مرزائی کا نکاح فہمیدہ کے ساتھ بالکل باطل ہے۔ اس لیے کہ سب مسلمانوں کے عقیدہ سے مرزا غلام احمد کو نبی ماننے کی وجہ سے سب مرزائی مرتد کافر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ جواہر البحار صفحہ ۴۶۲ پر ہے۔ فَقَدِ اتَّفَقَتِ الْاُمَّةُ عَلٰی ذٰلِكَ وَعَلٰی تَکْفِیْرِ مَنِ ادَّعَی النُّبُوَّةَ بَعْدَهٗ۔ اسی طرح شرح فقہ اکبر صفحہ ۲۰۲ پر ہے :- وَدَعْوَی النُّبُوَّةِ بَعْدَ نَبِیِّنَا کُفْرٌ بِالْاِجْمَاعِ۔ ان تمام دلائل شرعیہ سے ثابت ہوا کہ فہمیدہ بیگم کا نکاح باطل ہے ہوا ہی نہیں۔ نکاح فاسد اور باطل کے حکم میں بھی فرق ہے۔ نکاح فاسد کا حکم یہ ہے کہ قاضی اسلام یا عدالت کا جج نکاح فسخ کرے۔ چنانچہ شامی شریف جلد دوم صفحہ ۴۸۳ پر ہے :- بَلْ یَجِبُ عَلَی الْقَاضِی التَّفْرِیْقُ بَیْنَهُمَا لیکن نکاح باطل میں یہ بھی نہیں۔ لہٰذا فہمیدہ بیگم پر نہ عدت واجب نہ طلاق نہ تفریق۔ بلکہ وہ سابقہ باطل نکاح سے شرعاً بالکل آزاد

ہے اور پاکستانی عدالت کے قانون کے مطابق بھی یہ نکاح باطل ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں عدالتِ پاکستان کے ڈسٹرکٹ جج شیخ محمد اکبر نے مرزائی فرقے کو قانونی طور پر غیر مسلم قرار دیتے ہوئے مدعیہ امت الکریم اور لیفٹیننٹ نذیر الدین کے نکاح کو باطل کر دیا تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۳۵ء میں ٹرائل کورٹ کے ڈسٹرکٹ جج نے بھی ایسا ہی فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ بہاول نگر عدالت میں ہوا اور وہ دوسرا فیصلہ ۵۵-۶-۳ کو راولپنڈی میں ہوا تھا چند روز پیشتر اخبار امروز میں ۴ ستمبر ۱۹۷۱ء کو چنیوٹ کی ایک خبر اس طرح شائع ہوئی ہے۔ موضع خانکے چک ۲۰ نواب دین کے پورے خاندان نے احمدیت (مرزائیت) سے توبہ کر کے اسلام قبول کیا اور مشرف باسلام ہوگئے ان تمام باتوں اور فیصلوں اور دلائل سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے نزدیک مرزائی احمدی مسلمان نہیں۔ لہٰذا میں شرعی فتوٰے جاری کرتے ہوئے واضح کرتا ہوں کہ فہمیدہ بیگم چونکہ مسلمان ہے اس لیے اس کا نکاح محمد اشرف مرزائی سے قطعًا باطل ہے اور فہمیدہ بیگم سابقہ نکاح سے بالکل آزاد ہے۔ محمد اشرف کا اس پر کوئی حق یا اختیار نہیں ہے۔ فہمیدہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے شریعتِ اسلامیہ کے مطابق نکاح کر سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فتوٰے میری اسی تحقیق کے مطابق ہے جو مدعیہ اور اس کے لواحقین کے ذریعہ کی گئی۔ یہ فتوٰے تحقیق بالا کے درست ہونے کی صورت میں بالکل درست اور قابلِ عمل ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

حضرتِ حوّا کا مہرِ نکاح

سوال نمبر ۴۶ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں ع۱ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی جل مجدہ برائے حق مہر سیدتنا حضرت حوّا رضی اللہ عنہا" جو درود شریف پڑھا تھا۔ وہ کیا تھا۔ ع۲ درود شریف خضری کو خضری درود شریف کیوں کہتے ہیں؟ ع۳ متقدمین و متاخرین حضرات کے زمانہ کی ابتداء و انتہا نیز ان کی وجہ تسمیہ کی حکمت سے آگاہ فرمایئے۔

محمد یعقوب خطیب جامع مسجد فیضِ مدینہ کاموئنکے ضلع گوجرانوالہ

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

الجواب

(۱) مفسرین کرام اس بارے میں اختلاف فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا وہ مہر کیا تھا جو آپ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت حوّا کو عطا فرمایا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ مہر سونا چاندی تھا جو آپ جنت سے لے کر آئے اور حضرتِ حوّا کو عطا فرمایا۔ حضرت حوّا نے اس کو زمین میں دفن کر دیا۔ وہاں سے اللہ تعالٰی

نے اسی سونے چاندی کو اتنا بڑھایا کہ سونے چاندی کی کانیں بن گئیں۔ دنیا میں پہلے سونا نہیں تھا اسی سونے سے دنیا میں سونے چاندی کی ریل پیل ہوگئی۔ چنانچہ تفسیر درِ منثور جلد اول صہ ۵۶ پر علامہ جلال الدین سیوطی عبدالرحمٰن بن ابی بکر مطبوعہ مصر فرماتے ہیں:۔ وَاَخْرَجَ اِبْنُ عَسَاکِرٍ مِنْ طَرِیْقِ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَّا خَلَقَ الدُّنْیَا لَمْ یَخْلُقْ فِیْہَا ذَھَبًا وَّلَا فِضَّۃً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ مَنْفَعَۃً لِاَوْلَادِھِمَا مِنْ بَعْدِھِمَا وَجَعَلَ ذَالِکَ صِدَاقَ اٰدَمَ لِحَوَّآءَ فَلَا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ اَنْ یَّتَزَوَّجَ بِلَا صِدَاقٍ۔ اس روایت کی بنا پر بعض مفسرین حضرتِ حوا کا مہر جنت کا سونا چاندی بتاتے ہیں اور اسی بنا پر مندرجہ ذیل چند لطائف مستنبط ہیں۔

(۱) سب سے پہلے حضرت حوا نے خزانہ جمع کیا۔

(۲) سونا چاندی جنت کی دولت ہے اسی لیے قیمتی ہے اور اس کو فنا نہیں۔

(۳) دنیا میں صرف عورت کے لیے سونا چاندی آیا اس لیے دنیا میں مرد پر حرام ہے۔

(۴) جنت اصل مقام مرد کا ہے عورت صرف اس کے دل بہلاوے کے لیے ہے اس لیے جنت میں مرد پر جنتی دولت سونا چاندی حلال ہے، جیسے کہ سب فقہاءِ اسلام فرماتے ہیں

(۵) جنت سے بہت سی چیزیں حضرت آدم علیہ السلام اپنے ساتھ لے کر زمین پر تشریف لائے جس میں حجرِ اسود تمام غذاؤں کے بیج اور خوشبوؤں کے بیج بھی شامل تھے مگر سونا چاندی حضرتِ حوا دے کر آئیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اشارۃُ النص سے ثابت ہے۔ اسی لیے عورتوں کو سونے سے زیادہ پیار ہے۔

(۶) چونکہ حضرتِ حوا سرزمین عرب میں نازل ہوئیں۔ اس لیے سونے چاندی اسی اطراف میں زیادہ ہیں۔ اور حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین میں تشریف لائے اس لیے خوشبویات غذائی پیداوار وغیرہ انہی کشمیر وغیرہ کے علاقے میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔

یہ تمام علماء کرام و محققین و مدققین کے بیان کردہ لطائف تھے۔ اس مندرجہ روایت کی بنا پر مگر جمہور فقہاء و محققین فرماتے ہیں کہ حضرت حوا کا مہر درود شریف تھا۔ اسی مسلک کی بنا پر بعض علماء نے تفسیر درِ منثور کی بالا روایت کو ضعیف قرار دیا اور ضعف کی دلیل میں فرماتے ہیں کہ ابنِ عساکر اس روایت کی سند میں ہے۔ حالانکہ ابن عساکر ضابطہ اور حافظہ کے اعتبار سے تمام محدثین کے نزدیک کمزور ہیں اس لیے یہ مذکورہ روایت ضعیف ہے۔ درِ منثور کی یہ روایت مسلکِ جمہور کے مطابق نہیں اسی لیے کسی مفسر نے اس روایت کو اپنی کتب میں نہ لکھا۔ مگر مسلکِ جمہور بہت سی کتب میں مرقوم ہے۔ چنانچہ حضرت محقق عالم صوفی باصفا علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب سعادۃ الدارین صہ ۳۸ پر فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام

جب نیند سے بیدار ہوئے تو حضرتِ حوّا کو پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ قَالَ قَالَ یَا رَبِّ مَا ھِیَ قَالَ حَوَّآءُ قَالَ یَا رَبِّ زَوِّجْنِیْ مِنْھَا قَالَ ھَاتِ مَھْرَھَا قَالَ یَا رَبِّ مَا مَھْرُھَا قَالَ تُصَلِّیْ عَلٰی صَاحِبِ ھٰذَا الْاِسْمِ عَشْرَ مَرَّاتٍ قَالَ یَا رَبِّ اِنْ فَعَلْتُ اَتُزَوِّجُنِیْھَا قَالَ نَعَمْ فَصَلّٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ عَشْرَ مَرَّاتٍ فَکَانَ مَھْرُھَا۔ یعنی اللہ تعالٰی نے دس مرتبہ آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھوایا۔ تفسیر عزیزی جلد اوّل صـ۲۲۷ پر ہے: حکم رسید کہ دست باز مرساں تا وقتیکہ مہر اور را ادا نکنی حضرت آدم عرض کرد کہ مہرش چیست حکم شد (الخ) پس حضرت آدم دہ بار محمد وآلِ محمد درود فرستاد۔ اسی طرح نزہۃ المجالس جلد دوم صـ۱۸۶ پر ہے مگر وہاں تین مرتبہ درود شریف کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ فَقِیْلَ لَہٗ حَتّٰی اَنْ تُؤَدِّیَ مَھْرَھَا قَالَ وَمَا ھُوَ قَالَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ۔ مشہور کتاب طہارۃ القلوب جلد دوم صـ۱۳ فَقَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ مَہْ یَا اٰدَمُ فَقَالَ لِمَ وَقَدْ خَلَقَھَا اللہُ تَعَالٰی لِیْ فَقَالُوْا حَتّٰی تُؤَدِّیَ مَھْرَھَا قَالَ مَا مَھْرُھَا قَالُوْا تُصَلِّیْ عَلٰی مُحَمَّدٍ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ۔ کتاب مواہب لدنیہ جلد اوّل صـ۱۰ پر بھی اسی طرح تین مرتبہ درود شریف مہر حوّا کا ذکر ہے۔ لیکن ابنِ جوزی اپنی کتاب سلوۃ الاحزان میں دس مرتبہ درود شریف کا ذکر فرماتے ہیں۔ تفسیر صاوی پہلی جلد صـ۲۲ پر بھی تین مرتبہ آدم علیہ السلام کے درود شریف پڑھنے کا ذکر ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ جمہور یعنی کثیر فقہاء و محدثین مفسرین محققین کا مسلک یہی ہے کہ حضرتِ حوّا کا مہر درود شریف ہی بنا تھا۔ رہا یہ سوال کہ وہ کونسا درود شریف تھا۔ تو اس کے بارے میں کوئی حتمی تعین ثابت نہیں۔ تین قسم کے درود شریف حضرتِ آدم علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔ ایک درود وہ جو سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے زندہ ہوتے ہی پڑھا چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صـ۲۲۳ پر ہے:۔ اَیْضًا لَمَّا خَلَقَ اٰدَمُ رَاٰی اَنْوَارَ مُحَمَّدٍ عَلَیْہِ السَّلَامُ عَلٰی جَبِیْنِہٖ فَصَلُّوْا عَلَیْہِ۔ وَقَنْیَۃٍ اور کتب عملیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ یہ تھے وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ ن الدَّاعِیْ اِلَی اللہِ الْقَادِرِ الْقَوِیِّ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ ذَوِی الْفَلَاحِ وَالنَّجَاحِ۔ وقتِ نکاح بطورِ مہر بھی آپ نے یہی درود شریف پڑھا۔ اس لیے حکم ہے کہ نکاح کے خطبے میں یہ درود شریف ضرور پڑھا جائے۔ چنانچہ روح البیان جلد ہفتم صـ۲۳۲ پر اسی طرح درج ہے۔ بعض محققین نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام وہی درود شریف پڑھا کرتے تھے جو اللہ تعالٰی نے حضرت جبرائیل کو سکھایا۔ حضرت جبرائیل امین کے درود شریف کے یہ الفاظ ہیں:۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَوَّلُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اٰخِرُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا ظَاھِرُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا بَاطِنُ۔ یہ درود شریف خود جبرئیل امین نے نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کو سنایا۔ چنانچہ سعادۃ الدارین فی صلاۃ سید الکونین علامہ نبہانی جلد اوّل صـ۲۲۷ پر ہے:۔ قَالَ جِبْرَئِیْلُ اِنَّ اللہَ تَعَالٰی اَمَرَنِیْ اَنْ اُصَلِّیَ عَلَیْکَ ھٰکَذَا (الخ)

اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ حضرت جبرائیل کا درود شریف یہ ہے اور سابقہ قول سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم بھی یہی پڑھتے تھے۔ مگر بعض کا قول یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کا ایک ہی درود شریف ہے۔ از حضرتِ آدم تا حضرتِ مسیح اور خود پروردگار عالم تعلیم فرماتا رہا۔ سعادۃ دارین فی صلاۃِ سید الکونین کے صفحہ ۲۰ پر لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ میں کون سا درود شریف پڑھوں تب اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ تعلیم فرمائے:۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ الْاَنْبِیَآءِ وَمَعْدَنِ الْاَسْرَارِ وَمَنْبَعِ الْاَنْوَارِ وَجَمَالِ الْکَوْنَیْنِ۔۔۔ وَشَرَفِ الْحَرَمَیْنِ وَسَیِّدِ الثَّقَلَیْنِ الْمَخْصُوْصِ بِقَابَ قَوْسَیْنِ۔ یہ تین درود شریف بعض اقوال سے حضرت آدم کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ مگر پہلا درود شریف پھر والا درود شریف ہے۔ اور دوسرے دو کا نام حسب ترتیب صلوٰۃ جبریلی، صلوٰۃ موسوی ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

(۲) درود خضری حضرت خضر علیہ السّلام کی طرف منسوب۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے تمام انبیاء کا درود شریف ایک ہے مگر چاروں نبیوں کا صلوٰۃ علیحدہ ہے۔ ع۱ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا درود شریف چوتھے آسمان پر۔ ع۲ ادریس علیہ السلام کا جنت میں قیامت تک علیحدہ درود شریف ہے ع۳ الیاس علیہ السلام کا دنیا میں۔ ع۴ حضرت خضر علیہ السّلام کا۔ کیونکہ یہ چار حضرات قیامت تک اپنے اپنے مقامات پر زندہ ہیں۔ قریب قیامت وفات ہو گی، اس لیئے ان کے درود مختلف ہیں درود خضری علیہ السّلام کے الفاظ یہ ہیں۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔ (۳) چونکہ سائل نے اس سوال میں اپنے مسئول کا تعین نہیں کیا اس لیئے میں پورے مسئلے کی وضاحت کرتا ہوں۔ دینی مدارس میں جتنے علوم عام مروج ہیں، ان میں سے ہر علم کے علماء کی تقسیم اسی طرح ہے کہ بعض علماء کو متقدمین اور بعض کو متاخرین اور ایک عالم جس نے اس علم میں کوئی بہترین ایجاد یا چھانٹ کی ہو وہ اس تقسیم کا حدِ مرکزی بن جاتا ہے۔ تو جو علماء اس حدِ مرکزی سے پہلے ہوں وہ متقدمین کہلاتے ہیں اور جو بعد میں یا ہم زمانہ ہوں وہ متاخرین کہلاتے ہیں۔ یہی اس تقسیم کی وجہ اور وجہ تسمیہ اور ابتداء و انتہا ہے۔ مگر علوم کے مختلف ہونے کی وجہ سے۔ متقدمین و متاخرین و حدِ مرکزی بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ چنانچہ علم منطق میں امام رازی نے منطق کو اسلامی سانچے میں ڈھال کر علمائے منطق کے نزدیک مرکزی حیثیت قائم کی اس لئے امام رازی منطق کی حدِ مرکزی کی حیثیت سے ہیں، پس جو ان سے پہلے حکماء اور منطقی ہیں ان کو متقدمین کہتے ہیں جو ان کے بعد ہیں وہ متاخرین۔ اسی لیئے شرح تہذیب صفحہ پر ہے:۔ کَمَا زَعَمَہُ الْاِمَامُ الرَّازِیُّ وَاخْتَنَا مَامَذْھَبَ الْقُدَمَاءِ۔ علم نحو کے حدِ مرکزی امام ابنِ حاجب صاحب کافیہ ہیں ان سے پہلے علمائے نحو سیبویہ اخفش وغیرہ نحو کے متقدمین میں ہیں۔ اسی طرح فلسفہ کی چھانٹ امام غزالی نے اس طرح کی کہ فلسفہ جس کو اہلِ اسلام جہلِ مرکب اور زندیقی سے تصور کرتے تھے اور اس کے ورق کو گندگی لگانا جائز

سمجھتے تھے۔ اس کو امام غزالی نے اسلام کا آئینہ بنا دیا ۔ اس لیے امام شامی کو اس مسئلہ کی تردید کرنا پڑی اور کہنا پڑا کہ منطق اور فلسفہ لکھے ہوئے کاغذ سے استنجا کرنا جائز ہے۔ اس لیے امام غزالی فلسفی علماء کی نظر میں حدِ مرکزی ہیں۔ لہٰذا ان سے پہلے فلسفی ارسطو فارابی، بو علی سینا، جالینوس وغیرہ فلسفہ کے متقدمین ہیں اور ان کے بعد مولانا روم وغیرہ متاخرین ہیں۔ تصوف میں ابوالحسن علی بن ابراہیم خضری جنہوں نے تصوف کی دقیق گتھیوں کو سلجھایا اور متاخرین کے لیے تصوف کا سخت گیر راستہ آسان کیا اور فلسفے کو تصوف سے روشناس کرایا۔ اس وجہ سے صوفیائی نظر میں آپ کی ذات حدِ مرکزی ہے آپ سے پہلے ابوحفص نیشاپوری ابوالحسن نوری وغیرہما متقدمین کہلاتے ہیں اور آپ کے بعد داتا گنج بخش ابوالقاسم قیشری غوث پاک عبدالقادر جیلانی متاخرین کہلاتے ہیں ایسا ہی کشف المحجوب صـ۱۶۱ پر ہے۔ علم فقہ حنفی میں صاحب ہدایہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدِ مرکزی ہیں۔ واللہ و رسولہٗ اعلم

کتب

اگر کوئی بالغہ لڑکی اپنا نکاح نہیں کرتی، تو اس کے باپ پہ گناہ نہیں

سوال ۴۷: کیا فرماتے ہیں:۔ علمائے کرام اس مسئلے میں کہ میری لڑکی جس کی عمر تقریباً ۳۰ سال ہے۔ روزے، نماز کی سخت پابند ہے۔ نقشبندی سلسلے میں بیعت ہے۔ مرشد کے فرمان کی پوری پابندی کرتی ہے وظائف کے علاوہ نماز تہجد اور صلوٰۃ تسبیح، قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتی ہے۔ ہر وقت پردے میں رہتی ہے۔ محلے کی لڑکیوں کو قرآنِ کریم کا درس بھی دیتی ہے۔ بروز جمعہ ختم خواجگان کی عادی ہے۔ ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتی ہے۔ دربارِ مرشد میں بھی حاضری دیتی ہے۔ ہر نیک کام میں حاضری ہے۔ مرشد کے فرمان کے مطابق سالانہ عرس بھی کراتی ہے۔ یہ تمام باتیں اچھی ہیں۔ مگر اب جوان ہے۔ ہم نے کئی دفعہ کہا۔ کہ اب نکاح کرا لو مگر نکاح سے صاف انکار کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ نکاح کی حاجت نہیں نہ ہی کچھ خواہش ہے ہم نے بہت دھمکیاں بھی دیں۔ ڈرایا بھی جان سے مارنے تلوار سے قتل کرنے کی بھی دھمکی دی مرشد سے بھی کہلوایا۔ شریعت کا قانون بھی سنایا۔ مگر وہ یہی کہتی ہے۔ کہ مجھ کو نکاح کی بالکل ضرورت نہیں ہے اور شریعت کے قانون سے میں منحرف نہیں میں اپنی جان کی خود ذمہ دار ہوں۔ بندہ امام مسجد ہے۔ چند لوگوں نے اعتراض یہ کیا۔ کہ یہ تم پر بھار ہے۔ اور تمہارے پیچھے نماز بھی جائز نہیں۔ میں سخت پریشان ہوں۔ میں نے اپنی اسی لڑکی کے مرشد صاحب سے یہ لوگوں کی بات بیان کی۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ ہمارے ایک بہت بڑے عالم گجرات پنجاب میں رہتے ہیں۔ ہم سب انہیں کے معتقد ہیں۔ تو ان کو سب حالات لکھ کر شرعی فتوٰے منگا لو۔ جو وہ لکھیں۔ اسی پر عمل کرو۔ لہٰذا عرض ہے۔ کہ ہم کو اس بارے میں شرعی حکم بتایا جائے۔

السائل:۔ مولوی نبی بخش امام مسجد بہاولپور شہر۔ مورخہ ۔ ۲ ۱/۴

الجواب بعون العلام الوھاب

قانون شریعت کے مطابق نکاح کرنا بہت ہی اچھی عبادت ہے۔ بجز حضرت مسیح علیہ السلام کے تمام دینوں میں اس کا حکم دیا گیا۔ اور یہ نکاح تمام انبیاء کرام کی سنت ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد اوّل باب النکاح صفحہ نمبر ص۱۲۸ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ ابْنُ وَکِیْعٍ حَدَّثَنَا حَفْصُ ابْنُ غِیَاثٍ عَنِ الْحَجَّاجِ عَنْ مَکْحُوْلٍ عَنْ اَبِی الشِّمَالِ عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ اَلْحَیَاءُ وَالتَّعَطُّرُ وَالسِّوَاکُ وَالنِّکَاحُ ط (ترجمہ):۔ ابو ایوب روایت کرتے ہیں۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ چار چیزیں سنتِ انبیاء ہیں۔

۱: حیاداری ۲: عطر و خوشبو لگانا (۳) مسواک ۴: (۴) نکاح کرنا۔ اس مرفوع حدیثِ مبارکہ سے نکاح کی فضیلت واضح ثابت ہوئی۔ خود آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ظاہر الفاظ میں نکاح کی طرف رغبت دلائی۔ کتبِ احادیث میں متعدد روایتوں سے اس سنت پر عمل کی تاکید ہے۔ اور بلاوجہ نکاح سے ہٹنے والا عند اللہ معتوب و معیوب ہے۔ ایک موقعہ پر نبی کریم نے کنوارے مرد و عورت کو مسکین کا درجہ دیا ہے چنانچہ کتاب الاحادیث جمع الفوائد جلد اوّل لعلامہ محمد بن محمد بن سلیمان صفحہ نمبر ص۲۱۶ پر ہے:۔ لِمُسْلِمٍ وَالنَّسَائِیِّ اِبْنُ نُجَیْحٍ رَفَعَہٗ مِسْکِیْنٌ مِسْکِیْنٌ رَجُلٌ لَیْسَتْ لَہٗ اِمْرَاَۃٌ قَالُوْا وَاِنْ کَانَ کَثِیْرَ الْمَالِ قَالَ وَاِنْ کَانَ کَثِیْرَ الْمَالِ۔ مِسْکِیْنَۃٌ مِسْکِیْنَۃٌ اِمْرَاَۃٌ لَیْسَ لَھَا زَوْجٌ قَالُوْا وَاِنْ کَانَتْ کَثِیْرَۃَ الْمَالِ قَالَ وَاِنْ کَانَتْ کَثِیْرَۃَ الْمَالِ (ترجمہ) مسلم اور نسائی کی اس روایت شریفہ کو ابن نجیح نے مرفوع کہا۔ (مرفوع وہ صحیح حدیث ہے۔ کہ جس کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا جائے۔ خاص طور پر قول یا فعل یا تقریر سے۔ یہ کبھی متصل ہوتی ہے۔ کبھی منقطع۔ مگر یہ حدیث مسند متصل، مرفوع ہے) فرمایا آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مسکین ہے۔ مسکین وہ مرد جس کی بیوی کوئی نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا اگرچہ وہ بہت مالدار ہو فرمایا اگرچہ بہت مالدار ہو۔ فرمایا مسکینہ ہے مسکینہ ہے وہ عورت جس کا خاوند کوئی نہ ہو عرض کیا اگرچہ وہ عورت بہت مالدار ہو فرمایا۔ اگرچہ بہت مالدار ہو۔ اس حدیث پاک سے نکاح کے بغیر بدمزہ زندگی گزارنے کا ذکر ہے۔ اور مسکینیت و کس مپرسی کی زندگی ویسے تو مرد و عورت دونوں کیلئے بری ہے خاص کر عورت کے لئے سخت ترین عیب ہے۔ بعض صوفیاء فرماتے ہیں۔ کہ بے شادی شدہ مرد کے ساتھ دس شیطان اور عورت کے ساتھ چار شیطان ہوتے ہیں۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) اس لیے نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے۔ تَبَتُّل یعنی کنوارہ رہنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۲۸ پر ہے:۔ عَنْ سَمُرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنِ التَّبَتُّلِ ط

ترجمہ:۔ دراز سند کے بعد۔ حضرت سمرہ روایت کرتے ہیں۔ کہ بے شک نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے مرد وزن کو بے شادی شدہ رہنے سے منع فرمایا (یہ روایت بھی سنداً متصل مرفوع ہے)۔ بعض علماء کا مقولہ مشہور ہے۔ کہ اَلنِّکَاحُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ ط یعنی نکاح آدھا ایمان ہے۔ غرضیکہ عقلاً نقلاً اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ کسی وظیفے یا ذکر اللہ، وِرد، و درود، دم کے بہانے اِس کو چھوڑنا گناہ ہے۔ اِسی لیے جب چند نومسلم صحابہ نے آپس میں گفتگو کے دوران یہ کہا تھا۔ کہ ہم نکاح ہرگز نہ کریں گے۔ ایک بولے میں ہمیشہ روزے رکھوں گا۔ دوسرے صاحب نے فرمایا۔ کہ میں ہمیشہ نوافل میں مشغول رہوں گا۔ تیسرے صاحب نے کچھ کہا، چوتھے نے کچھ کہا۔ نبی کریم نے سب کا کلام سن کر باہر تشریف لاکر فرمایا۔ کہ تم لوگوں کی گفتگو ہم نے سن لی پھر ان کو ان ارادوں سے منع فرمایا۔ چنانچہ بخاری شریف جلد دوم صفحہ نمبر ص۷۵۸ پر اور مسلم شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ص۴۴۹ پر ہے:۔ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ۔ حَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ وَقَالَ لٰکِنِّیْ اُصَلِّیْ وَاَنَامُ وَاَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ ط (ترجمہ):۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ کہ نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اُس جماعت پر تشریف لائے، اَللہ جَلَّ شَانُہٗ کی حمد وثنا فرمائی۔ بعدہٗ فرمایا۔ دیکھو اے لوگو! میں نماز بھی پڑھتا ہوں۔ سوتا بھی ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں۔ اور افطار بھی کرتا ہوں۔ اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری اِن تمام سنتوں سے نفرت کرے گا۔ پس وہ میرے ساتھیوں میں سے نہیں ہے۔ اس حدیث پاک کی شرح میں شارحین نے بہت گفتگو فرمائی ہے مگر درست ترین یہ ہے۔ جو کہ حضرت حکیم الامت ملجائی وماوائی مفتی احمد یار خاں صاحب مدظلہ العالی نے اپنی تصنیف نعیم الباری شرح بخاری عربی میں غیر مطبوعہ صفحہ نمبر ص۵۸ پر ارشاد فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَیُحْتَمِلُ اَنَّ مَنْ کَرِہَ سُنَّتِیْ وَعَابَ ھَا فَلَیْسَ مِنْ اُمَّتِیْ ط وَھُوَ ظَاھِرٌ ط (ترجمہ):۔ یعنی اس حدیث پاک کے آخری الفاظ کا ظاہر مطلب یہ ہے۔ کہ جو شخص میری سنت سے کراہت (نفرت) کرے۔ اور اس کو عیب دار سمجھے۔ فَلَیْسَ مِنِّیْ وہ (بدبخت) میری اُمت سے نہیں یعنی کافر ہے۔ تحقیقی طور پر یہی مطلب درست ہے۔ کیونکہ یہاں الفاظ عَنْ سُنَّتِیْ ہیں اور اس سے پہلے رَغِبَ کا لفظ ہے۔ جس کا مادۂ اشتقاق رَغْبٌ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں۔ خواہش کرنا، پسند کرنا (لغات کشوری صفحہ نمبر ص۲۱۳)۔ بقاعدۂ نحوی جب اس کے بعد حرف فِیْ آئے۔ تو محبت کا ثبوت ہوتا ہے۔ جب اس کے بعد حرف عَنْ آئے۔ تو محبت کی نفی ہوتی ہے۔ چنانچہ المنجد عربی صفحہ نمبر ص۲۷ پر ہے:۔ وَرَغِبَتْ فِیْہِ اَرَادَہٗ وَاَحَبَّہٗ۔ عَنْہُ اَعْرَضَ عَنْہُ وَتَرَکَہٗ ط (ترجمہ):۔ اس میں

رغبت اس سے محبت۔ اِس سے رغبت اِس سے نفرت کے معنیٰ میں اور چھوڑنے کے معنیٰ میں ہیں۔ اور محبت کی ضد نفرت ہی ہوتی ہے۔ یہاں الفاظِ حدیث میں بھی حرف عَنْ ہے نحوی لحاظ سے لفظِ عَنْ ماقبل کی دوری چاہتا ہے۔ چنانچہ شرح جامی صفحہ نمبر ۲۶۲ پر ہے:۔ وَعَنْ لِلْمُجَاوَزَةِ (الخ) وَذَالِكَ اِمَّا بِزَوَالِہٖ عَنِ الشَّیْئِ الثَّانِیْ وَوُصُوْلِہٖ اِلَی الثَّالِثِ اَوْ بِالْوُصُوْلِ وَحْدَہٗ۔ اَوْ بِالزَّوَالِ وَحْدَہٗ نَحْوُ اَدَّیْتُ عَنْہُ الدَّیْنَ ہ (ترجمہ) ہے۔ حرفِ عَنْ ہمیشہ دور کرنے ختم کرنے کے لیے آتا ہے۔ جس کو زوال بھی کہا جاتا ہے۔ زوال کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) ایک سے زائل کرنا دوسرے کی طرف پہنچانا (۲) یا فقط دوسرے تک پہنچا دینا۔ (۳) یا فقط ایک سے زائل کرنا۔ یہاں الفاظِ حدیث میں لفظِ عَنْ اپنے تیسرے معنیٰ میں مستعمل ہے۔ یعنی فقط زوال اور زوالِ رغبت و محبت۔ نفرت ہے۔ گویا کہ ارشاد فرمایا جارہا ہے۔ کہ جو شخص میری ان تمام سنتوں سے نفرت کرے۔ وہ مسلمان نہیں۔ خیال رہے کہ کرنا نہ کرنا عمل ہے۔ اور محبت و نفرت عقیدہ ہے۔ عمل میں تو، سنت و فرض و واجب، نفل وغیرہ مختلف درجے رکھتے ہیں۔ لیکن عقیدے میں سب کا درجہ ایک ہے نبی کریم کے فرض، واجب سنتِ مؤکدہ، غیر مؤکدہ، نفل۔ جس سے بھی نفرت کی۔ فوراً کافر ہوگیا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِكَ ط لہٰذا نکاح نہ کرنا عمل ہے۔ اور نکاح سے نفرت عقیدۂ کفر۔ یہاں نفرت کا ذکر ہے نہ کہ ترک کا ترکِ نکاح پر اتنی سخت وعید نہیں ہوسکتی۔ ہاں نکاح کرنے پر بے حد فضیلتیں ہیں۔ جیسے کہ پہلے ثابت کیا گیا ہے ایک اور روایت میں ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نکاح کا حکم فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ مسند احمد بن حنبل صفحہ نمبر ص ۱۵۸ جلد سوم اور بلوغ المرام صفحہ نمبر ص ۲۰۱ پ اور فقہ السنن والآثار صفحہ نمبر ص ۲۰۷ پر ہے۔ وَصَحَّحَہٗ ابْنُ حِبَّانٍ عَنْہُ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْمُرُ بِالْبَآءَةِ وَیَنْہٰی عَنِ التَّبَتُّلِ نَہْیًا شَدِیْدًا (الخ) ترجمہ:۔ حضرت ابن حبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے اس حدیث پاک کو صحیح فرمایا۔ فرمایا راوی نے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم حکم دیا کرتے تھے۔ نکاح کرنے کا اور سخت ترین منع فرماتے تھے۔ کنوارہ رہنے سے۔ اِن تمام فضیلتوں اور اچھائیوں کے باوجود بھی یہ نکاح محض سنت کے درجے تک ہے۔ اسی لیے نبی کریم رؤف و رحیم علیہ التحیۃ والثناء نے اِس کو اور اِس کی ہم شکل چیزوں کو بے حد فوائد کے باوجود سنت ہی فرمایا۔ فرض و واجب نہ کہا۔ کیونکہ عام حالات میں نکاح کرنا فقط سنت ہے۔ اِس کا تارک گناہ گار نہ ہوگا۔ جن احادیث سے نکاح کرنے کا حکم ثابت ہے۔ وہاں بھی حکم استحبابی ہے نہ کہ وجوبی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ لوگوں کے خصوصی حالات کی بنا پر شریعتِ مطہرہ میں نکاح کے چار درجے ہیں۔ چنانچہ انشراحِ بخاری مسمّٰی بہ نعیم الباری غیر مطبوعہ تصنیف لطیف جناب

حضرت حکیم الامت قبلۂ العلماء مدظلہ العالی علٰی رَاقِبَتِہٖ وَرَأْسِ الْفُضَلَاءِ صفحہ نمبر ۵۵ پر ارشاد فرماتے ہیں۔ حاشیہ نمبر ۱ پر ہے:۔ اَلتَّرْغِیْبُ فِی النِّکَاحِ (الخ) اِعْلَمْ اَنَّ النِّکَاحَ فَرْضٌ عِنْدَ الْقُدْرَۃِ وَالتَّوَقَانِ۔ وَسُنَّۃٌ عِنْدَ السُّکُوْنِ، وَمَمْنُوْعٌ عِنْدَ عَدَمِ الْقُدْرَۃِ عَلَیْہِ۔ بَلْ یَجِبُ عَلَی الْعِنِّیْنِ وَالْمَجْبُوْبِ۔ اَلتَّطْلِیْقُ ط (ترجمہ):۔ باب ترغیبِ نکاح جان لے۔ کہ بے شک ۱ قدرت اور خواہشِ نفس کے وقت نکاح کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔ ۲ اور قدرت کے باوجود خواہشِ نفس نہ ہونے کی صورت میں نکاح کرنا سنت ہے۔ ۳:۔ اور وطی، نفقہ وغیرہ کی قدرت نہ ہونے کی صورت میں نکاح کرنا حرام ہے ۴:۔ اسی لیے واجب ہے۔ کہ نکاح شدہ نامرد یا مقطوع الذکر اپنی بیوی کو طلاق دیدے:۔ نیک اور عابد و زاہد حضرات میں عام طور پر دوسری صورت پائی جاتی ہے۔ کہ قدرت مردمی ہوتی ہے۔ مگر خواہشِ نفس نہیں ہوتی۔ بلکہ اولیاء اللہ اور روحانی اشخاص میں مردمی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ روحانی قوت سے مردمی قوت بھی ترقی کرتی جاتی ہے:۔ ھٰکَذَا قَالَ صَاحِبُ مَدَارِجِ النُّبُوَّتِ فِیْ تَصْنِیْفِہٖ وَھٰکَذَا قَالَ حَکِیْمُ الْاُمَّۃِ کَاشِفُ الْغُمَّۃِ فِیْ شَرْحِہِ الْبُخَارِیْ جلد ۱ صفحہ ۵۵ ط پس ان حضرات کے لیے خصوصی طور پر نکاح فقط سنت ہے۔ کریں۔ تو فبہا نہ کریں تو گناہ گار نہیں۔ بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ ان ہی حضرات کے لیے اپنا مسلک بیان فرماتے ہیں۔ کہ نکاح میں مشغول ہونے سے زیادہ بہتر ہے۔ کہ ذکر اللہ میں مشغول ہو۔ چنانچہ امام محی الدین ابو زکریا یحیٰی نووی علیہ الرحمۃ نے اپنی شرح نووی علی مسلم جلد اول صفحہ نمبر ۴۴۸ پر فرمایا:۔ فَقَالَ اَصْحَابُنَا اَلنَّاسُ فِیْہِ اَرْبَعَۃُ اَقْسَامٍ۔ قِسْمٌ تَتُوْقُ اِلَیْہِ نَفْسُہٗ وَیَجِدُ الْمُؤَنَ فَیُسْتَحَبُّ لَہُ النِّکَاحُ۔ وَقِسْمٌ لَا تَتُوْقُ وَلَا یَجِدُ الْمُؤَنَ فَیُکْرَہُ لَہٗ وَقِسْمٌ تَتُوْقُ وَلَا یَجِدُ الْمُؤَنَ فَیُکْرَہُ وَھٰذَا مَامُوْرٌ بِالصَّوْمِ لِدَفْعِ التَّوَقَانِ وَقِسْمٌ یَجِدُ الْمُؤَنَ وَلَا تَتُوْقُ۔ فَمَذْھَبُ الشَّافِعِیِّ وَجُمْھُوْرِ اَصْحَابِنَا اَنَّ تَرْکَ النِّکَاحِ لِھٰذَا وَالتَّخَلِّیَ لِلْعِبَادَۃِ اَفْضَلُ وَلَا یُقَالُ النِّکَاحُ مَکْرُوْہٌ بَلْ تَرْکُہٗ اَفْضَلُ (الخ) کچھ تغیر کے ساتھ وہی نکاح کی چار قسمیں کرکے جو حضرت حکیم الامت نے کیں۔ آخری میں فرماتے ہیں۔ کہ چوتھی قسم یہ ہے۔ کہ قدرت اور طاقتِ نکاح کے باوجود خواہشِ نفس نہ ہو۔ تو امام شافعی کا مذہب ان جیسے لوگوں کے بارے میں یہ ہے۔ کہ عبادت و ریاضت کے لیے گوشۂ خلوت زیادہ بہتر ہے۔ نکاح سے۔ نکاح مکروہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ترک افضل ہے (ان لوگوں میں قوتِ مردمی کی زیادتی خواہشِ نفسانی کو مستلزم نہیں) امام مالک فرماتے ہیں۔ کہ نکاح کبھی واجب ہوتا ہے کبھی حرام۔ چنانچہ بلغۃ السالک فقہ امام مالک جلد اول صفحہ نمبر ۳۷۲ پر ہے:۔ وَقَدْ یَجِبُ اِنْ خَشِیَ عَلٰی نَفْسِہِ الزِّنَا۔ وَقَدْ

یَحْرُمُ اِنْ لَمْ یَخْشَ الزِّنَا وَ اَدّٰی اِلٰی حَرَامٍ مِنْ نَفَقَةٍ اَوْ اِفْرَا یا اَوْ اِلٰی تَرْکِ وَاجِبٍ ۔ (ترجمہ):- اگر زنا کا خوف ہو۔ تو نکاح کرنا واجب ہے۔ اور اگر نماز روزے رہ جانے چھوٹ جانے یا خرچ کے لیے روزی حلال نہ ہونے کا خطرہ ہو۔ تو نکاح کرنا حرام ہے۔ بہر حال عام حالات میں نکاح سنت ہے۔ اور خصوصی حالات میں نکاح کرنے کی بہت شکلیں ہیں صورت مسئولہ میں جس لڑکی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وُہ شریعتِ اسلامیہ کی رو سے چوتھی قسم میں داخل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کے نزدیک تو اس صورت میں نکاح نہ کرنا افضل ہے۔ مگر ہمارے امام اعظم کے نزدیک فقط افضلیت نکاح کرنے میں ہے۔ اور افضلیت کا ترک جائز ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ فرماتے ہیں:- فَلَا یَلْزَمُ مِنْ تَرْکِ الْمُسْتَحَبِّ ثُبُوْتُ الْکَرَاهَةِ (شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۶۱) ترجمہ:- افضل و مستحب کے چھوڑنے سے کراہت ثابت نہیں ہوتی۔ پس مذکورہ فی السوال لڑکی اگر محض ذکر اللہ و ذکر الرسول عبادت و ریاضت کی بنا پر اور خواہشِ نفس نہ ہونے کی وجہ سے نکاح نہیں کرنا چاہتی۔ تو اس کو ہرگز مجبور نہ کیا جائے۔ اور مذکورہ دلائل کے بموجب گنہگار بھی نہیں۔ کیونکہ مندرجہ بالا جتنے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان سب میں مرد و عورت برابر ہیں۔ سب پر یکساں حکم جاری ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ سالکینِ راہِ طریقت پر ایک وقت ایسا آتا ہے۔ کہ اُن کو اپنا جسم بھی بوجھ معلوم ہوتا ہے وہ فنا فی اللہ کی وادی کو تہہ کرتے ہوئے مجذوبیت کی ایسی عمیق گھاٹی میں پہنچ جاتے ہیں۔ کہ اُن کو ماسوٰی کا ہوش نہیں رہتا۔ اور یہ سب کچھ فقط ایک تجلّی کا اثر ہوتا ہے۔ یہ انبیاء کرام ہی کی شان ہے کہ کروڑہا تجلیات سے بہرہ ور ہونے کے باوجود پھر بھی دنیا و کائنات کو اس طرح سنبھالا ہوا۔ کہ شادی بیاہ نکاح و اولاد بھی ہے۔ اور دنیا و مافیہا سے نباہ بھی۔ اسی لیئے فرمایا۔ پیارے آقا نے کہ یہ نکاح سنتِ انبیاء ہے۔ بھلا کسی ولی اللہ میں یہ ہمت کہاں۔ کہ فنا کے مقام پر پہنچ کر بھی بقاء کا درجہ حاصل رہے۔ صرف ایک ہی جھلک دیکھی۔ والیِ کلیر نے کہ تن من دھن کو گنوا بیٹھے۔ اسی لیئے فرمایا بعض اہلِ قلب حضرات نے۔ فَاتْرُکُوْا یَا اَهْلَ الظَّوَاهِرِ، اَهْلَ الْبَوَاطِنِ (ترجمہ):- اے ظاہر والو، باطن والوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ تو فقط نکاح ہے اِن لوگوں پر تو کبھی کبھی سارے شرعی احکام بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس فتوئے شرعی کے حکم کے مطابق اِس مذکورہ عابدہ زاہدہ لڑکی کو نکاح پر مجبور نہ کیا جائے۔ اس لیئے کہ وُہ بالغہ ہے۔ اور بالغہ لڑکی کو نکاح پر مجبور کرنا منع ہے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۸۷ پر ہے:- لَا یَجُوْزُ نِکَاحُ اَحَدٍ عَلٰی بَالِغَةٍ صَحِیْحَةِ الْعَقْلِ مِنْ اَبٍ وَ سُلْطَانٍ بِغَیْرِ اِذْنِهَا بِکْرًا کَانَتْ اَوْ ثَیِّبًا ۔ کوئی بالغہ، عاقلہ، صحیحہ عورت کنواری ہو۔ یا پہلے شادی شدہ مطلقہ ہو۔ یا بیوہ اس کا نکاح بغیر اُس کی رضا کے جائز نہیں لہٰذا اس حکم کے ماتحت مذکورہ لڑکی کو بھی نکاح پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ بھی

احتمال ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی کو بھی کوئی ایسا عارضہ یا بیماری ہو۔ کہ جس کی بنا پر یہ بھی نکاح کے ادائے حقوق پر قادر نہ ہو۔ اور بوجہ شرم و حجاب ظاہر نہ کرتی ہو۔ یہی حکمت ہے۔ شریعت کے اِس قانون میں کہ لڑکی بالغہ عاقلہ کو نکاح پر مجبور نہ کیا جائے۔ نابالغ اولاد تو اپنے اندرونی حالات سے ناواقف ہوتی ہے۔ لیکن بالغ ہو کر ہر مرد و عورت کو اپنی تمام کیفیات کا پتہ لگ جاتا۔ جو پردہ راز میں رہ کر بقائے عزت کا سبب ہیں۔ نکاح ہو جانے سے بدنامی و بے عزتی بلکہ خاندانی فساد کا باعث ہو جاتا ہے۔ کیا شان ہے۔ آقا نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے قانون کی کہ آپ نے پہلے ہی قانون بنا دیا۔ کہ خبردار بالغہ، عاقلہ کو، نکاح پر مجبور نہ کیا جائے چنانچہ بخاری شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۷۷۱ پر ہے:۔ لَا يُنْكِحُ الْاَبُ وَغَيْرُهُ الْبِكْرَ وَالثَّيِّبَ اِلَّا بِرِضَاهَا ؕ (ترجمہ) بالغہ، عاقلہ لڑکی کا بلا اس کی اجازت باپ یا اور کوئی ہرگز نکاح نہیں کر سکتا۔ یہ حدیث پاک مسلم ترمذی ابن ماجہ، نسائی، دارمی، موطا امام مالک، مسند احمد حنبل میں بھی ہے۔ مسند احمد ابن حنبل جلد اول صفحہ نمبر ۳۶۴ پر ہے:۔ مَنْ اَنْكَحَ اِبْنَتَهٗ وَهِيَ كَارِهَةٌ فَاَبْطَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِكَاحَهَا ؕ (ترجمہ):۔ جو شخص اپنی بیٹی کا نکاح کرے حالانکہ وہ بیٹی ناپسند کرتی ہو تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسے نکاح کو باطل قرار دیا ہے خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر بھی لڑکی نکاح سے انکار کرے۔ کوئی شخص اُس کو مجبور نہیں کر سکتا۔ نہ وہ لڑکی شرعاً گناہ گار ہے۔ اُس کے باپ پر کوئی بوجھ نہیں۔ نہ شرعاً۔ کیونکہ شریعت نے ہی مجبور نہ کرنے کا قانون مُرتب فرمایا ہے۔ نہ لڑکی کے گناہ کا۔ اس لیے کہ خواہش نفس نہ ہونے کی صورت میں لڑکی اِس انکار سے گناہ گار بھی نہیں۔ نہ کھانے پینے سے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ؕ (ترجمہ):۔ ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے وہی رب العالمین ہے۔ وہی سب کو پالتا ہے، نہ باپ پر بیٹی کے عزت و عصمت کی حفاظت کا بوجھ ہے اس لیے کہ جب وہ اللہ کی طرف مشغول ہو گی۔ اور خواہشِ نفسانی بھی نہ ہو گی۔ تو اغیار سے اللہ کریم خود اس کی حفاظت کے لیے کافی و وافی ہے۔ اُس کے باپ پر شرعی قانونی کوئی بوجھ نہیں اُس کے پیچھے نماز پڑھنا بالکل جائز ہے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ؕ

کتبہ

یہ فتوٰے میں نے اپنی عمر کے اٹھارویں سال میں لکھا تھا ۱۹۵۸ء اور ۱۳۷۸ھ میں یہ میرا پہلا فتوٰی تھا۔ جب میں نے یہ فتوٰی لکھ کر حضرت والد محترم قبلہ حکیم الامت مفتی احمد یار خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت اقدس میں پیش کیا۔ آپ نے پڑھا۔ اور اٹھ کر شفقت و خوشی میں معانقہ کیا۔ اور فرمایا۔ کہ مجھے تم سے امید ہے۔ کہ تم میرے بوجھ کو سنبھال لو گے۔ یہ فتوٰے اگرچہ تم نے کچھ دراز تو کر دیا ہے۔ مگر

بھی خوب محنت سے لکھا۔ اس فتوے پر تم کو ایسا عظیم انعام دوں گا۔ کہ جس کا مجھ کو تم سے پہلے کوئی لائق نظر نہیں آتا تھا۔ اب میں محسوس کر رہا ہوں۔ کہ تم اس انعام کے لائق ہو۔ اور تم ہی اس کے مستحق ہو۔ میں نہ سمجھا کہ وہ انعام کیا ہے۔ خیال گزرا۔ کہ شاید کچھ روپے ہوں گے یا حضرت کا تولیہ رومال یا قمیص وغیرہ ہو گی۔ کہ آپ اکثر مجھ کو اپنی اس طرح کی چیزیں عطا فرمایا کرتے تھے۔ مگر باعثِ جھجک و رعب میں کچھ استفسار نہ کر سکا۔ قبلہ عالم اگرچہ بہت خوش خلق۔ خوش طبع تھے۔ مسکراہٹ تو بعد وفات بھی آپ کے چہرے مبارک سے عیاں تھی۔ مگر رعب کا یہ عالم تھا۔ کہ بڑے بڑے جید علماء و استاذ العلماء بھی یہاں تک کہ وہابی سائلین علماء بھی نگاہیں نیچی کر کے بات کرتے تھے۔ میری خاموشی پر پھر آپ نے فرمایا۔ کہ میاں تم نے ایسا شاندار فتوی کیسے لکھ لیا۔ پہلی دفعہ تم نے قلم کو ہاتھ لگایا ہے۔ مجھ کو تو یقین ہی نہیں تھا۔ کہ تم کچھ ہی لکھو۔ بہت لوگوں نے ہم سے فتوی نویسی سیکھی۔ مگر بہت جھجک ماننی پڑتی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہاری غیب سے غوثِ پاک نے مدد کی ہے۔ میں نے عرض کی۔ حضور بات یہ ہے۔ کہ جس دن آپ نے میرے سپرد یہ سوال فرمایا تھا۔ میں نے تقریباً گیارہ مرتبہ اس سوال کو پڑھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ کہ جواب کیسے لکھوں۔ اور ابتداء کیسے ہو۔ بہت دو شش و پنج میں پڑا رہا۔ ایک دن آپ نے سلپچی میں کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے۔ مجھے ہی فرمایا۔ کہ جاؤ یہ پانی پھینک آؤ۔ میرا تو پہلے ہی کچھ ارادہ تھا۔ اسی لیے نئی سلپچی لایا تھا۔ اور قریب ہی کھڑا ہاتھ دھلا رہا تھا۔ آپ نے جب پھینکنے کا حکم دیا۔ تو وہ میں نے اٹھا کر تنہائی میں جا کر سب پی لیا۔ پھر اس کا دھوون بھی پی لیا۔ تو مجھ کو کامل یقین ہے۔ کہ آپ کے ہاتھوں کے دھوون کا فیض ہے۔ جب میں آپ کے پاس دوبارہ حاضر ہوا۔ تو آپ نے عجیب نظر سے مجھ کو دیکھا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ کہ شاید آپ نے مجھ کو دیکھ لیا۔ یا اندازہ لگا لیا۔ مگر پھر آپ کے کچھ استفسار کرنے پر میں مطمئن ہو گیا۔ جواباً ارشاد فرمایا۔ ہاں ہمیں اس دن کچھ شک گزرا تھا۔ کیونکہ جس قریبی گوشے میں تم نے چھپ کر پانی پیا تھا۔ وہاں تمہارا ایک آنچل نظر آ رہا تھا۔ پھر تم خالی سلپچی لے کر بڑے باورچی خانے میں آ گئے۔ اس سے ہمیں شک گزرا تھا۔ دوسرے دن مجھ کو بالکل تنہائی میں بلایا۔ اور فرمایا۔ کہ وضو کر کے آؤ۔ میں وضو کر کے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ دیکھو میں تم کو ایک عظیم تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ تم کو اب اس لائق سمجھتا ہوں۔ میں نے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھا۔ تو آپ کی آغوشِ مبارک میں ایک بہت ہی چمک دار باریک لپٹا ہوا کپڑا تھا۔ ارشاد فرمایا۔ کہ یہ وہ جبہ شریف ہے۔ جو چند گھڑیاں اعلیٰ حضرت مجدد ملت کے جسم اطہر کے ساتھ لگا۔ جو اس میں فیوض ہیں۔ تم کو بعد میں معلوم ہوں گے۔ اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالے عنہ نے جب صدر الافاضل شیخی و مرشدی و استاذی المکرم کو فیوضات و برکات سے نوازا، اور لائق پایا

تو یہ جبہ ان کی حفاظت میں دیا۔ جب انہوں نے مجھے اس جبہ شریف کے لائق پایا۔ تو مجھ کو نوازا۔ اب میں تم کو اس لائق سمجھتا ہوں۔ تو تم کو یہ انعام ہے۔ اس کو زیادہ پہننا مت۔ بلکہ یہ صاحبِ کرامت جبہ مبارکہ تم کو بہت سے موقعوں پر فائدہ پہنچائے گا۔ میں نے اس کی بہت برکتیں دیکھیں۔ جس گھر میں یہ جبہ رہے گا۔ وہاں کبھی غریبی نہ آئے گی۔ وہ اگر متوسط بھی ہو ہوگا۔ تو لوگ اس کو بہت رئیس سمجھیں گے۔ تم کو جب کبھی علمی، عملی دشواری پیش آئے۔ تو اس کا توسُّط کرنا۔ میں نے لیا۔ چوما اور پھر آنکھوں سے لگایا۔ پھر فرمایا کہ اس کو ایک دفعہ پہن کر اتار دو۔ میں نے کھول کر پہنا۔ تو اندازہ لگا لیا۔ کہ یہ بہت کمزور کپڑا ہے۔ وہ میرے پیروں تک آگیا۔ دراز بہت تھا۔ جس سے میں نے اندازہ لگا لیا۔ کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کا قد مبارک بہت دراز تھا۔ سوئے اتفاق سے جب میں اتارنے کے لیے کھڑا ہوا۔ تو نیچے کا آنچل میرے پیروں کے نیچے آکر درمیان کمر کے قریب کچھ شہید ہو گیا۔ جس کا حضرت کو پتہ نہ چلا۔ میں نے جلدی سے اتارا۔ اور تہہ کر کے عرض کیا۔ کہ یہ جبۂ شریف کا انعام میری خوش نصیبی ہے۔ لیکن ابھی آپ اپنے بکسے میں رکھیے۔ کیونکہ میرے پاس کوئی معقول حفاظت کا انتظام نہیں ہے۔ آپ نے منظور فرمایا۔ اور خود میں رکھ کر تالا لگا کر آیا۔ زیادہ تر میں ہی آپ کے صندوق کو کھولا کرتا تھا۔ رکھ کر واپس آیا۔ تو فرمایا۔ کہ جب تم کسی کو لائق پاؤ۔ تو آخری عمر میں یہ فیوضات اس کے حوالے کر دینا۔ تاکہ ہماری نسلوں میں اس کی برکت رہے۔ اس کے بعد سے مکمل فتوے نویسی میرے سپرد کر دی گئی۔ اور اب میری عمر چھتیس سال ہے۔

بحمدہٖ تعالیٰ ہزار سے زیادہ فتوے لکھ چکا ہوں مجھ سے پہلے میرے برادر معظم بزرگ مفتی مختار احمد صاحب کے سپرد فتوا نویسی کی گئی تھی۔ مگر باوجود بہت ذہین ہونے ان کا دل باہر تبلیغی جلسوں میں زیادہ رغبت رکھتا تھا۔ فتوے نویسی کی طرف میلان قلبی نہ تھا۔ ہم صرف دو بھائی ہیں۔ درس نظامی میں ہم دونوں بجز والد محترم کے کسی اور کے شاگرد نہیں۔ خاص کر میں نے تو کسی علم میں بھی کسی کی شاگردی نہیں کی۔ ہاں بوستان تک میں نے اپنے برادر بزرگ مفتی مختار احمد خان صاحب سے پڑھے۔ جب کہ وہ خود بھی حضرت صاحب سے پڑھا کرتے تھے۔ مگر میں ابتداء ہی سے سخت چلبلا قسم کا انسان تھا۔ ہر سبق میں بے شمار سوال کیا کرتا تھا۔ جس سے بھائی صاحب محترم تنگ پڑ جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی لڑائی تک نوبت آجاتی تھی۔ جس پر والد محترم شاگردوں کے سامنے تو مجھ کو ہی جھڑکا کرتے تھے۔ مگر میرے سوالات کی معقولیت کی بنا پر علیحدگی میں بھائی صاحب کو سمجھایا کرتے تھے

کر دیکھو میاں مطالعہ کر کے پڑھایا کرو۔ اُس وقت تو میں نادانی میں ایسی ویسی حرکتیں کر دیا کرتا تھا۔ مگر اب افسوس ہوتا ہے۔ کہ بہر حال سبق کے دوران ایسی تندی مسندِ شاگردی پر کسی طور پر صحیح نہیں آخر الامر حضرت صاحب نے نباہ نہ ہونے کی صورت میں پھر خود ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ اِس وقت سے آخر تک سب اسباق حضرت صاحب کے پاس ہی رہے۔ ہم دونوں بھائیوں کے دو دو نام ہیں۔ میرا نام اصلی محمد اقتدار خان۔ اور گھریلو نام مصطفٰے میاں کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اور ان کا نام محمد مختار خان، لیکن گھر میں محمد میاں کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ابھی تک تو ہم یہ سنتے آئے ہیں۔ کہ ہم دونوں اپنے والد محترم کے دادا مرشد صاحب علیہ الرحمۃ کچھوچھہ شریف والے قبلہ عالم اشرفی میاں کی دعا سے ہوئے۔ اور انھوں نے ہی ہمارے نام محمد میاں، مصطفٰے میاں رکھے۔ اور بعد میں ہمارے نسبی دادا جان نے محمد مختار، محمد اقتدار نام رکھا۔ مگر اب چند دن ہوئے۔ بدایوں سے ہمارے پھوپا میاں محمد حیات خان صاحب مدظلہ العالی نے ایک نیا انکشاف فرمایا۔ کہ حضرت حکیم الامت قبلہ اولاد نرینہ کے لیے برائے دعا دادا مرشد خانہ اور ہماری والدہ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا کے مرشد خانے کچھوچھہ شریف حاضر ہوئے۔ تو حضرت قبلہ عالم اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے والد محترم سے درخواستِ دعا سُن کر خلوت خانے لے جا کر فرمایا کہ مولانا تم کو بیٹے چاہئیں۔ تو آؤ بیٹھو۔ جب حضرت بیٹھے۔ تو حضرت قبلہ عالم نے آپ کی پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر کچھ دعا پڑھی۔ پھر کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا۔ کہ جاؤ مولانا ہم نے اپنے بیٹے دو تم کو دے دیئے۔ دو بیٹے ہوں گے۔ اُن کے نام میرے موجودہ بیٹوں کے نام رکھنا۔ بڑے کا نام محمد میاں اور چھوٹے کا نام مصطفٰے میاں ہے۔ اللہ کریم نے ہم دو بھائی ہی والد محترم کو عطا فرمائے وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔ شاید یہ ہی فیضان کہ اللہ کریم نے اپنے حبیب کی سچی غلامی میں قبول فرما لیا۔ اور وہابیوں گستاخوں کا جواب دینے کے لیے ایک کو تقریری اور ایک کو تحریری طرف مقرر فرما لیا۔ اور پھر اب تفسیر نعیمی کے باقی پارے تصنیف کرنے کی ڈیوٹی میرے سپرد فرمائی۔ فَلَہُ الْحَمْدُ عَلٰی نَائِلِہٖ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْہِ :۔ مورخہ: ۵/۱۱/۱۳۹۶ھ ۲۶ ذیقعد مبارکہ

کتبہ

حضرتِ زلیخا یوسف علیہ السلام کی بیوی ہیں

سوال ۲۸ :۔ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کیا حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح حضرت زلیخا سے ہوا تھا یا نہیں۔ کل ایک وہابی مولوی عبدالرحیم نامی نے ہمارے محلّے باغبانپورہ لاہور میں

اپنے روزمرہ درس کے دوران لاوڈ سپیکر پر درس دیتے ہوئے حضرت زلیخا کی بہت گستاخیاں کیں۔ حضرت زلیخا کا زوجۂ یوسف ہونے کا انکار کیا۔ میں نے جمعہ کے دن اس کی تردید میں تقریر کی حضرت حکیم الامت قبلہ استاد محترم کی جاء الحق اوّل سے ضمیمہ پڑھ کر سنایا۔ کہ حضرت صاحب قبلہ نے مسلم شریف اور بخاری شریف کی حدیث سے ثابت کیا ہے۔ اور بہت ایمان افروز طریقہ سے ثابت فرمایا ہے کہ حضرت زلیخا کا نکاح حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوا۔ اب اس لیے آپ کو استفسار ارسال کر رہا ہوں۔ کہ مزید حوالہ جات اور دلائل سے اس مسئلہ کو ثابت کیا جائے۔ تاکہ تحریری شکل میں وہابیوں کو منہ توڑ جواب دیا جائے۔ وہابی مولوی نے کہا ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی کا نام اسناتھ تھا۔ اور انجیل پڑھ کر درس میں سنائی تھی۔ میں خود تو وہاں موجود نہ تھا لوگ کہتے ہیں۔ اردو کی چھوٹی سی انجیل ہاتھ میں تھی۔ جس سے حوالہ پیش کیا تھا۔ فرمایا جائے۔ کہ کیا یہ بات صحیح ہے۔ ہم سے مولوی مذکور نے مطالبہ کیا ہے۔ کہ حدیث دکھاؤ۔

فقط والسلام بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا ط

آپ کا خادم:- غلام استاذ حکیم الامت حافظ فضل احمد لاہور مورخہ: ۱۱/۱۰

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ ط

الجواب

سوالِ مذکورہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح کے متعلق سوال ہے۔ کہ کس سے آپ کا نکاح ہوا۔ دیوبندی وہابی لوگ محض نبی اور ان کے اہل بیت کی گستاخی کرتے ہوئے ایسی خرافات کرتے ہیں۔ یہ لوگ ازلی گستاخ ہیں گستاخی کے لیے بہانے تراشتے ہیں۔ اپنی بات کے لیے اگر ان کو ہندو بھی بننا پڑے۔ تو گریز نہیں کرتے آج اگر عیسائیوں کے دامن میں پناہ لے کر انجیل کی آڑ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ کی گستاخی کر رہے ہیں تو کوئی تعجب ناک نہیں۔ کیونکہ چند سال پیشتر ڈاکٹر ذاکر حسین دیوبندی نے صدارتِ ہند کی لالچ میں ایک بت کے سامنے سجدہ بھی کر دیا تھا۔ اور نجد کے وہابیوں نے گاندھی نہرو کو رسول کا لقب دے دیا تھا یہ لوگ سب عیسائیوں ہندوؤں، یہودیوں، سکھوں کے دوست ہیں۔ اگر دشمن ہیں۔ تو اللہ اور رسول کے ولیوں اور مسلمانوں کے۔ ان کا اسمٰعیل دہلوی، سید احمد بریلوی، قاسم نانوتوی ساری عمر انگریزوں کی کاسہ لیسی کرتے رہے۔ اور نبی کریم کے ادب کو شرک وکفر کہتے رہے عیسائی انگریزوں کو ان ہی جھولی برداروں نے حضور اور سرکار کا لقب دیا۔ حالانکہ یہ القاب نبی کریم کے لیے استعمال کرنے کو کفر و گناہ کہتے ہیں۔ حضرت زلیخا کو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی ماننے کے لیے صرف اس لیے تیار نہیں۔ کہ گستاخی کا موقعہ ملتا رہے۔ حالانکہ تمام مفسرین، مؤرخین واضح الفاظ میں ثابت کر چکے ہیں۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی صرف ایک ہی بیوی حضرتِ زلیخا ہی تھیں۔ اور حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

اولاد دو بیٹے اور ایک بیٹی حضرت زلیخا کی ہی اولاد سے تھے۔ امام جمال الدین سیوطی اپنی تفسیر جلالین میں سورۃ یوسف کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ وَوَلّٰہُ مَکَانَ الْعَزِیْزِ وَعَزَلَہٗ وَمَاتَ بَعْدُ فَزَوَّجَہٗ اِمْرَأَتَہٗ فَوَجَدَ عَذْرَآءَ ؀ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کی جگہ حضرت یوسف کو مصر کا والی مدد گار بنا دیا اور عزیز کو معزول کر دیا۔ وہ عزیز کچھ دن بعد مر گیا۔ تو اس کی بیوی زلیخا سے حضرت یوسف کا اللہ تعالیٰ نے نکاح کر دیا۔ حضرت یوسف نے اُس زلیخا کو بالکل کنوارہ پایا۔ اس لیے کہ عزیز مصر اس کا خاوند بالکل نامرد تھا۔ تفسیر صاوی جلد دوم صـ۲۱ پر ہے:۔ فَوَلَدَتْ لَہٗ وَلَدَیْنِ ذَکَرَیْنِ۔ اَفْرَاثِیْمُ وَمِیْشَا وَبِنْتًا وَاِسْمُھَا رَحْمَۃُ زَوْجَۃُ اَیُّوْبَ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَمِیْشَا ھُوَ جَدُّ یُوْشَعَ بِنْ نُوْنٍ ؀ (ترجمہ):۔ بطن زلیخا سے حضرت یوسف کے دو بیٹے (۱) افراثیم ۲ اور میشا پیدا ہوئے۔ اور ایک بیٹی حضرت رحمت بی بی پیدا ہوئیں۔ حضرت رحمت بی بی تو ایوب علیہ السلام کی زوجہ محترمہ تھیں۔ اور حضرت میشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے حضرت یوشع علیہ السلام ہیں۔ اور تفسیر معالم التنزیل جلد سوم صـ۲۳ پر اور تفسیر مدارک جلد سوم صـ۲۲۵ پر ہے اور تفسیر روح المعانی جلد ہفتم صـ۳ پر اسی طرح تفسیر ابن کثیر جلد دوم پارہ نمبر ۱۳ پر لکھا ہے۔ تفسیر مدارک و ابن کثیر نے رحمت بی بی کو حضرت یوسف و زلیخا کی پوتی لکھا ہے۔ اور حضرت یوشع کو آپ کے بڑے بیٹے افراثیم کا پوتا لکھا ہے:۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ؀ تفسیر روح البیان جلد چہارم صـ۲۸۱ پر ہے۔ فَتَزَوَّجَ بِھَا ؀ (ترجمہ):۔ حضرت یوسف نے بحکم خدا تعالیٰ حضرت زلیخا سے نکاح فرمایا۔ غرضیکہ تمام مفسرین نے اس واقعہ کی حقانیت کا اعتراف کیا ہے۔ بلکہ وہابیت کے ڈیڑھ سو سالہ دور سے پہلے کے تمام مفسرین نے یہی لکھا ہے مفسرین کے علاوہ مسلمان مورخین بھی حضرت زلیخا کو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے دور کے مفسرین و محققین نے بھی صاف طور پر بالکل بالوضاحت یہی لکھا ہے۔ کہ حضرت زلیخا یوسف علیہ السلام کی بیوی پاک ہیں۔ بجز چند وہابی مفسرین کے کہ انہوں نے علم اور تحقیق سے ہٹ کر ایسی خرافات کی ہیں۔ اور شانِ زلیخا میں زبانِ طعن دراز کی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہابیوں میں تدبرِ قرآن و حدیث کا فقدان ہے۔ انہوں نے اپنی عمریں یا تو ایسی تصنیف میں صرف کی ہیں۔ جن سے مسلمانوں کو مشرک و کافر بنایا جائے۔ یا فلسفے منطق کے حواشی لکھتے ہیں۔ اگر کسی نے حدیث و قرآن کی طرف قلم اٹھایا بھی ہے۔ تو ایسا بیہودہ ہاتھ پڑا۔ کہ جس سے اصل مقصود کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے۔ یا کسی وہابی نے قرآن و حدیث کے صرف ترجمے پر اکتفا کی اور وہ بھی فقط اس نیت پر کہ اصل قرآن و حدیث کو مسخ کر کے نعت نبی کو ختم کیا جائے۔ گویا کہ جو کام یہود و نصاریٰ نے الفاظِ تورات و انجیل بدل کر کیے۔ بالکل وہی کام اِس دور کے وہابیوں نے قرآن حدیث میں کیا۔ چونکہ یہ لوگ الفاظِ قرآن و حدیث بدلنے پر تو قادر نہ ہوئے۔ لہٰذا انہوں نے اہل عجم کے سامنے غلط ترجمے کر کے نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعتِ پاک کو بدلنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان لوگوں میں

مفسرین بہت کم گزرے۔ اور جو چند ایک مفسر ہوئے۔ بھی ہیں۔ تو انہوں نے تحقیق کے میدان سے کنارہ کشی کرتے ہوئے تفسیر بالرائے پر زیادہ اعتماد کیا۔ جو اہل اللہ کے نزدیک خالص گمراہی ہے۔ ہمارے مودودی صاحب کے دیباچہ تفہیم القرآن سے اسی اعتراف کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہابی حضرات کا مقصد صرف اللہ کے بندوں کی توہین ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے۔ کہ حضرتِ زلیخا رضی اللہ تعالے عنہا کی شخصیت اور حالاتِ حقیقیہ پر۔ پردہ ڈالتے ہوئے اتنے مفسرین کرام کی عبارات و فرمودات کو چھوڑ کر مسخ شدہ انجیل کا ہی سہارا لیا جائے۔ اور اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اقوال محققین کے مقابل اقوالِ کفریہ کو ڈھال بنایا جائے۔ اور کیا ایک مسلمان وہابیوں کی اِن باتوں سے یہ سمجھنے پر مجبور نہ ہو گا۔ کہ وہابی در پردہ نصاریٰ کا ہی کردار ادا کر رہے ہیں۔ سوال مذکورہ میں جس مدرس نے موجودہ محرف بلکہ اردو کی خود ساختہ انجیل سے حوالہ پیش کیا ہے کیا وہ انجیل موجودہ کو صحیح سمجھتا ہے۔ حالانکہ اسی انجیل کے انہی صفحات پر لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر شراب پی یہیں پر لکھا ہے۔ کہ یہودا نے اپنے بیٹے کی بیوی کو رنڈی سمجھ کر زنا کیا۔ اِسی انجیل کے صفحہ نمبر ص۲۰ پر لکھا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی سوتیلی بہن سے نکاح کیا۔ اور صفحہ نمبر ص۲۴۴ پر لکھا ہے۔ کہ سب نبی جھوٹ بولتے ہیں اور ص۸۴ پر ہے۔ کہ بچھڑا حضرت ہارون نے بنایا اور صفحہ نمبر ص۳۴۰ پر ہے۔ کہ حضرت سلیمان نے عورتوں سے عشق کیا۔ اور اللہ سے پھر گئے۔ (اَلْعِیَاذُ بِاللہِ)، اسی انجیل میں لکھا ہے۔ کہ مسیح ابن اللہ ہیں۔ غرضیکہ یہ انجیل کفریات سے بھری پڑی ہے۔ کیا وہابی ان سب باتوں کو مانتے ہیں انجیل موجودہ میں سائل کی پیش کردہ عبارت سے تو بعد میں گفتگو کی جائے گی۔ پہلے یہ ثابت کیا جائے گا۔ کہ مفسرین کے علاوہ حدیثِ پاک اور قرآنِ کریم سے بھی اشارۃً یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ کہ حضرت زلیخا یوسف علیہ السلام کی کی زوجۂ محترمہ ہیں۔ وہابیوں کے ایک مشہور مولوی مودودی صاحب نے اپنی کتاب تفہیم القرآن جلد دوم کے صفحہ نمبر ص۳۹ پر کمال بے باکی سے بلا تحقیق اِس حقیقت صادقہ کا انکار کر دیا۔ پھر تعجب یہ ہے۔ کہ مصنفِ تفہیم جن کو متقدمین و متاخرین سے زیادہ اپنے علم کا دعوٰی ہے اِس حقیقت کی تردید میں کوئی دلیل پیش نہ کر سکے۔ صرف اتنا کہہ دیا۔ کہ اس کی کوئی اصل نہیں نہ قرآن میں اور نہ اسرائیلی تاریخ میں۔ تدبرِ قرآنی کی عدمیت پر دال ہے۔ تدبر فی القرآن کے بغیر تفسیر قرآنی ناممکن ہے یہی وجہ ہے۔ کہ مودودی صاحب نے اپنی تفہیم میں بہت مقام پر ٹھوکرے کھائے ہیں۔ بلکہ نحوی صرفی غلطیاں بھی کی ہیں۔ اسی مقام پر آگے چل کر حضرتِ زلیخا کو بد چلنی کی تہمت بھی دیتے ہیں نعوذ باللہ حالانکہ انصاف اور حقیقت ایمان و دیانت کی نگاہ سے اگر دیکھا جائے۔ تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ حضرتِ زلیخا کی پاک دامنی کی مثل آج ہمارے معاشرے میں مفقود ہے۔ کہ جس اللہ کی نیک بندی نے تمام عمر صبر و تحمل سے گزار دی۔ اور دامنِ عصمت کو داغدار نہ ہونے دیا۔ اور باوجود دولت مند و حسینہ جمیلہ ہونے کے جب کہ بوجہ زمانۂ جاہلیت آزادی و بے پردگی بھی میسر تھی۔ ایک نامرد کے ساتھ سب جوانی گزاری اور دولت بکارت

کو کمال حفاظت سے بچائے رکھنا ایک شادی شدہ عورت کو حصولِ نفسانیت و بد چلنی کی وہ تمام سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جو بے نکاحی گھریلو یا بند لڑکی کو میسر نہیں ہو سکتیں۔ اور جتنا بے نکاحی گھر کی مستورہ عورت کو بدنامی کا خطرہ ہوتا ہے۔ اتنا شادی شدہ کو نہیں ہوتا۔ ایسی آزاد فضا کی پرورش یافتہ عورت کا اپنی چادرِ عصمت کو تار تار نہ ہونے دینا۔ ولایتِ کاملہ اور فضل ربی نہیں تو اور کیا ہے۔ جوانی کی ان تمام دشوار گزار گھاٹیوں سے کون ناواقف ہے مگر آفرین ہے۔ اے نبی کی پاک دامن بیوی زلیخا تیری اس عظمت و ہمت پر کہ جب حجلۂ عروسی میں تقرب یوسفی کا حصول ہوتا ہے۔ تو زیورِ عصمت کے ساتھ ساتھ سرمایۂ عذارت و بکارت سے بھی مزین ہیں۔ جس کو خود۔ حضرت یوسف علیہ السلام فرعونِ مصر کے استفسار پہ بوجوہ خاص بیان فرماتے ہیں۔ اور وَجَدَهَا الْعَذْرَاءَ کے پیارے کلمات سے۔ زلیخا کی پاک دامنی کو آشکارا فرمایا۔ گستاخی کی پٹی باندھ کر اگر ان باتوں سے منہ موڑ لیا جائے۔ تو اور بات ہے ورنہ انصاف کی نگاہ اس سچائی کے انکار کی اجازت نہیں دیتی مفسرین کرام بھی فرماتے ہیں کہ حضرتِ زلیخا یوسف علیہ السلام کو کنواری ہی ملیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ ۱۴۲ پر ہے:۔ وَزَوَّجَهُ الْمَلِكُ اِمْرَأَتَهُ فَلَمَّا دَخَلَ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا خَيْرًا مِمَّا طَلَبْتِ فَوَجَدَهَا عَذْرَاءَ (ترجمہ) شاہِ مصر نے سابقہ عزیزِ مصر قطفیر کی بیوی زلیخا سے حضرت یوسف کا نکاح پڑھایا۔ جب قربت ہوئی۔ تو حضرت یوسف نے فرمایا۔ کہ اے زلیخا کیا اس طرح بطریقِ حلال وصل اچھا ہے۔ یا اس طرح جیسا کہ تو نے چاہا تھا۔ اور آپ نے زلیخا کو پاک دامن اور کنواری پایا۔ تفسیر روح المعانی جلد پنجم پ ۱۳ صفحہ ۵ پر ہے:۔ وَكَانَ صَاحِبِيْ لَا يَأْتِي النِّسَاءَ (ترجمہ):۔ میرا خاوند قطفیر عورتوں کے لائق نہ تھا۔ ان عبارات سے حضرت زلیخا کی پاک دامنی صاف طور پر عیاں ہے:۔ وہابیانِ زمانہ کے پاس ان براہینِ قاطعہ کو نہ ماننے کا کیا جواز ہے۔ اور ان کی تردید میں ان کے نزدیک کون سے دلائل ہیں۔ بجز زبانی انکار تو کسی طور مفید نہیں۔ انسان اپنی چرب زبانی سے جہلا کو تو مرعوب کر سکتا ہے۔ مگر حقیقت کو کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے۔ یہ آشکارا حقیقت ہے۔ کہ حضرت زلیخا، حضرت یوسف کی بیوی ہیں۔ صرف مؤرخین و مفسرین کے اقوال پہ ہی اکتفا نہیں بلکہ اگر ذرا تھوڑا سا بھی تدبر فی القرآن کر لیا جائے۔ تو اصلی تفہیم قرآن سے حضرت زلیخا کا احترام و عظمت ہی ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی طرز بیانی سے یہ بات بخوبی عیاں ہے۔ کہ زلیخا بد چلن یا فاحشہ نہ تھیں۔ سورت یوسف میں صرف ایک واقعہ ہی ان کی نفسانیت کا درج ہے ابتدائی زندگی کے متعلق ان پہ کسی نے عیب نہ لگایا۔ نہ ہی اس واقعہ کے بعد۔ اگر معاذاللہ بد چلنی میں ہوتیں۔ تو حضرتِ یوسف کی شرعی حکومت میں ان کو ضرور سزا دی جاتی۔ اسی طرح جب زنانِ مصر نے ان پہ ایک زر خرید کے عشق کا طعنہ دیا۔ تو وہ کسی اور واقعے کی طرف بھی اسی قسم کا اشارہ کر سکتی تھیں۔ اور کہہ سکتی تھیں۔ کہ زلیخا اس سے پہلے فلاں پہ عاشق ہوئی۔ عورتوں کی زبان کون بند کر

سکتا ہے۔ مگر آج تک کسی کو ایسا ظاہر نہ ہوا۔ بلکہ قرآن کریم کے اِس شاندار اسلوب سے تو زلیخا کے پاک دامن ہونے پر شاندار دلیل ہے اور یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضرتِ زلیخا نے آج تک کسی غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا نہ کسی مرد سے کبھی التفات یا محبت کیلیے پہلا موقعہ ہے۔ کہ ایک زر خرید سے آغازِ عشق ہے۔ اس لیئے قرآنِ پاک نے کہیں بھی زلیخا کا طعن یا برائی سے ذکر نہ فرمایا۔ یہاں تک کہ مصر کی عورتوں کے فعل کو تو قرآن کریم نے مکر کا لقب دیا مگر زلیخا کے دامن کو لفظِ مکر سے ملوّث نہ کیا۔ ابوالاعلےٰ مودودی صاحب کی اپنی تفہیم جلد دوم صفحہ نمبر ۳۹۱ پر ہے۔ اہل بیت نبی پر بلا دلیل و بلا خوف طعن کرتے ہوئے حضرت زلیخا کو بد چلنی اور خباثت میں ملوّث مانتے ہیں اور استدلال عدم تزوج پر اَلۡخَبِیۡثٰتُ لِلۡخَبِیۡثِیۡنَ (الخ) والی آیت پیش کرتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) کیسی کم فہمی ہے۔ بس گستاخیِ نبوت پر ایک بہانہ تلاش کرنا تھا۔ سو کر لیا۔ حالانکہ جمہور مفسرین اس آیت پاک کو بوجہ مطلق ہونے کے بعد قیامت پر محمول فرماتے ہیں۔ اس لیئے کہ عالمِ دنیا پر یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ بہت سے متقیوں کی بیویاں بری ہیں۔ اور اکثر بد چلن خاوند کی بیوی متقیہ ہوتی ہے۔ جس کا ایک مفتیِ اسلام کو اکثر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ نامعلوم وہابی حضرات نے ان حقائق سے نگاہیں کیوں بند کر لیں۔ اگر اس آیتِ مطلقہ کو عالمِ دنیا پر محمول کیا جائے۔ تو کلامِ الٰہی پر زد پڑتی ہے۔ یہ آیت کریمہ مطلق دوزخی جنتی لوگوں کی آئندہ ابدی زندگی کا نقشہ پیش کر رہی ہے اسی لیئے سیاقِ کلام میں پہلے کی روایات میں میدانِ محشر کا ہی ذکر ہے۔ مگر مودودی صاحب نے توہینِ زلیخا کے لیئے اِس آیت کو پیش کر کے اپنی ہی کم علمی کو اجاگر کیا۔ اگر یہ آیت بعض اقوال کے مطابق دنیا کے لیئے ہی ہو تب بھی اس آیت کا حضرتِ زلیخا کی پاک دامنی سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ وہابیوں کو چاہیئے۔ کہ پہلے قرآن و حدیث سے ان کی خباثت و بد چلنی تو ثابت کریں کبھی نہ کر سکیں گے۔ اس لیئے کہ قرآن کریم میں تو آپ کی پاک دامنی اقتضاءُ النص سے ثابت ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے مفسرین متکلمین علماء کے اقوال سے حضرت زلیخا کی پاک دامنی کے دلائل پیش کیئے گئے۔ اب قرآن کے دلائل ملاحظہ فرمایئے۔

پہلی دلیل۔ قرآن کریم نے حضرتِ زلیخا کے ارادۂ گناہ کا تو ذکر کیا مگر ارتکاب گناہ کا کوئی ذکر نہیں۔ قانون شریعت کے مطابق ارادۂ گناہ گناہ نہیں نہ اس پر دنیاوی یا اخروی سزا ہے۔ جب کہ بد چلنی اور خباثت ارتکابِ گناہ سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ ارادۂ محض سے وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ (الخ) ترجمہ: ۔ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کا ارادہ کر لیا۔ اور یوسف بھی ارادہ کر لیتے (الخ) اس آیت سے یہ فائدہ حاصل ہوا۔ کہ اُمتی اور نبی میں یہ فرق بھی ہے۔ کہ نبی معصوم ہوتا ہے (الخ) ارادۂ گناہ بھی نہیں کر سکتا۔ بخلاف دیگر بندوں کے کہ وہ اللہ کے کرم کی بنا پر مثل زلیخا تو ہوتے ہیں مگر معصوم نہیں اُن سے ارادۂ گناہ سرزد ہونا کوئی معیوب نہیں نہ اُن کو اس پر سزا۔ **دوسری دلیل**۔ ہر دور میں

بدچلنی، فحاشی اور گناہ بدترین عادت بدترین جرم تصور کیے جاتے رہے کسی شریعت میں بھی ان بدکاریوں کو اچھی نظر سے
نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ کبیرہ گناہ کا بھی اعلےٰ درجہ اس کو دیا جاتا رہا۔ اور یہ افعالِ قبیحہ ہمیشہ اکبرالکبائر میں شمار ہوئے۔ گناہ کو
عربی زبان میں اثم یا عصیان یا فحش کہا جاتا ہے۔ اگر معاذ اللہ حضرتِ زلیخا بدچلن یا فاحشہ تھیں۔ جیساکہ وہابی کہتے ہیں
تو قرآن کریم میں یہ آیت نہ ہوتی۔ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِيْنَ ﴿ (ترجمہ) :۔ بیشک تو ہی خطا کرنے
والوں سے ہے۔ بلکہ آثمین یا فاحشین وغیرہ کا لفظ ہوتا ہے۔ لفظ خاطئین آپ کی بدچلنی کی صاف طور پر تردید
کر رہا ہے۔ اس لیے کہ عربی لغت میں نادانی یا بھول چوک کی غلطی کو خطا کہا جاتا ہے۔ جس پر نہ شرعی قانونی سزا
ہے۔ نہ اخروی۔ چنانچہ المنجد عربی صفحہ نمبر ۱۸۱ پر ہے :۔ (وَالْخَطَاءُ) اَلذَّنْبُ قِيْلَ مَا لَمْ يَتَعَمَّدْ
مِنْهُ ضِدُّ الصَّوَابِ ﴿ (ترجمہ) :۔ کہا گیا ہے۔ کہ خطا وہ ذنب ہے جو جان کر نہ کیا جائے۔ درستی
کی الٹ۔ اور مجمع البحار جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۵۲ پر ایک دعا اس طرح منقول ہے :۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ خَطَايَايَ
وَعَمْدِيْ ﴿ (ترجمہ) :۔ یا الٰہی میری بھول اور دانستہ لغزشیں معاف فرما۔ گناہ وہ ہے۔ کہ کوئی شخص سمجھتے
بوجھتے باہوش حواس بالغ عاقل ہو کر شرعی جرم کرے۔ اس پر ہر دین میں سزائیں مقرر ہیں۔ خطا میں یہ بات نہیں۔
اللہ کریم نے حضرتِ زلیخا کو خطاواروں میں شمار کیا نہ کہ گنہگاروں میں۔ ظاہراً اگرچہ یہ کلام عزیزِ مصر کا ہے۔ مگر حکماً
عندالشرع بھی حضرتِ زلیخا کا درجہ بھول کر دارفتگیٔ عشقِ مجازی کے سبب خطاکاری کا ہے نہ کہ گناہ گاری کا
ہمارے یہ احباب جو جان کر ان پر گناہگاری اور بدچلنی کا اتہام دے رہے ہیں۔ درپردہ خدا تعالیٰ کا مقابلہ
کر رہے ہیں۔ کہ جس نیک پاک باز بندی کو رب تعالےٰ خطاکار شمار فرما رہا ہے۔ یہ خواہ مخواہ اس پر گناہ
ٹھونس کر خود کفر کے گھوارے میں جا رہے ہیں۔ عادتِ قرآن مجید یہ ہے۔ کہ جب کسی کے کلام کی تردید
نہ فرمائے۔ تو وہ منشاءِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی کا کلام منشاءِ الٰہی کے خلاف ہو۔ تو فوراً اس
کی تردید اسی قرآن میں کر دی جاتی ہے۔ دیکھو ایک موقعہ پر منافقین نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم
سے عرض کیا۔ نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ط (ترجمہ) :۔ ہم گواہی دیتے ہیں۔ کہ آپ اللہ کے
رسول ہیں۔ گواہی کا دوسرا نام ایمان ہے یہ کلام قرآن نے منافقین کا نقل فرمایا۔ مگر منشاءِ الٰہی کے اور حقیقت
کے خلاف تھا۔ اس لیے کہ ان کا نَشْهَدُ کہنا ایک جھوٹ تھا۔ لہٰذا فوراً اللہ کی طرف سے تردید ہو
گئی۔ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ (ترجمہ) :۔ یہ سب منافق جھوٹے ہیں۔ پس اگر زلیخا بھی فحش یا بدچلنی میں ہوتیں
تو عزیزِ مصر کا اس کو فقط خطاکار کہنا کبھی بلا تردید باقی نہ رکھا جاتا۔ بلکہ فوراً تردید کر دی جاتی۔ نہ ہی یہ تردید
کوئی اشارۃً یا کنایۃً ہی ثابت کر سکتا ہے۔ اس آیت سے ملحقہ پہلے یہ الفاظ ہیں۔ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْبِكِ ط
(ترجمہ) :۔ اے زلیخا اپنے ذنب سے بخشش مانگ (معافی مانگ) کس سے؟ یوسف سے یا اللہ سے

اہلِ لغت کے نزدیک لفظ ذنب مشترک المعانی ہے۔ چنانچہ اشرف علی تھانوی اور دیگر کئی مترجمین نے اِس کا ترجمہ قصور کیا ہے۔ اور لفظ قصور اردو زبان میں ہلکی نسیانی غلطی کے لیے مستعمل ہے۔ اہلِ لغت کے نزدیک ذنب کے معنیٰ ملاوٹ یا کھوٹ ہیں۔ چنانچہ مجمع البحار جلد اوّل صفحہ ۴۳۶ پر ہے۔ اِذَا تَصَافَحَ لَمْ يَبْقَ بَيْنَهُمَا ذَنْبٌ اَیْ غَلٌّ وَشَحْنَاءُ (ترجمہ):۔ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں۔ تو اُن کے درمیان ذنب یعنی کھوٹ ختم ہو جاتی ہے۔ جن بزرگوں نے اِس کا ترجمہ گناہ کیا ہے۔ وہ بھی یہاں ارادۂ نفسانی یا دروازے بند کرنا مراد نہیں لیتے۔ بلکہ بعد میں اِس کا حضرت یوسف پر اتہام لگانا مراد لیتے ہیں۔ اور کسی پر تہمت لگانا اگرچہ گناہ تو ہے مگر بدچلنی یا بدفعلی نہیں۔ اِس دلیل سے بھی حضرت زلیخا کی برائت ثابت ہو رہی ہے۔ قرآن کریم سے:۔

تیسری دلیل:۔ قانونِ شریعت کے مطابق کسی مجرم کا اپنے جرم کا حاکم کے سامنے یا بارگاہِ خداوندی یا عام لوگوں کے سامنے شرمندگی اور لجاجت کے طور پر اقرار کرنا کرانا توبہ کے مترادف ہے۔ اور اس سے شرعی توبہ ثابت ہو جاتی ہے۔ دیکھو کتبِ فقہ۔ پس قرآن کریم اِسی قسم کی توبہ حضرت زلیخا کے لیے ثابت فرما رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ (الخ) ترجمہ:۔ میں اقرار کرتی ہوں۔ کہ میں نے ہی اس کو اپنی محبت اور ناجائز فعل پر اُکسایا۔ یہ تو بچ نکلا۔ اور البتہ اگر آئندہ اس نے وہ کام نہ کیا۔ کہ جس کا حکم میں اس کو دُوں۔ یعنی میری محبت ٹھکرائے۔ تو حکومتِ وقت کی اُس قید میں رہنا پڑے گا۔ کہ جس کا مشورہ اور فیصلہ ہو چکا۔ گویا کہ میری محبت کے ساتھ ساتھ محبت کی قدر کرے۔ تو میری سفارش سے قید ختم ہو سکتی ہے۔ اس آیت میں اظہارِ محبت کے ساتھ ساتھ اپنے جرم کا اقرار اور حضرتِ یوسف کی برائت کا بھی ذکر ہے۔ اس توبہ میں دو پہلو ہیں۔ اپنی شرمندگی کے ساتھ جوشِ عشق کا جنون بھی جو ایسی تلخ آمیز گفتگو ہے۔ قرآن پاک نے اِس پر بھی کچھ سرزنش ہونے کا ذکر نہ فرمایا۔ کیونکہ وارفتگی میں بہت سی چیزیں معاف ہو جاتی ہیں یہ تھے وہ قرآنی دلائل کہ جس سے حضرتِ زلیخا کی عدمِ گناہگاری اشارۃً یا کنایۃً، دلالۃً، یا اقتضاءً ثابت ہوتی ہے۔ بخلاف مخالفین کہ ان کے پاس کسی قسم کی بھی ایک آدھ ایسی دلیل نہیں۔ کہ جس سے حضرتِ زلیخا کی بدچلنی ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کو مسلمان کہلا کر انجیل وغیرہ مصنوعی کتب کا سہارا پکڑنا پڑتا ہے۔ مفسرین و مؤرخین اور قرآن کریم سے تیرہ[۱۳] عدد دلائل کے بعد حدیث پاک سے اِس چیز کی دلیل ملاحظہ ہو۔ کہ حضرت زلیخا اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجہ محترمہ اور اہل بیت ہیں۔ لیکن جس طرح قرآن کریم میں غور کرنے والوں کو یہ دلائل میسّر ہوتے ہیں۔ اسی طرح علم اور تدبر سے ہی فہم حدیث حاصل ہوتی ہے۔ غور و فکر کے بعد حدیث پاک سے بھی ثابت ہو رہا ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی حضرت زلیخا ہی تھیں

چنانچہ بخاری شریف جلد اوّل باب حد المریض ان یشھد الجماعۃ صفحہ نمبر ۹۰ پر ہے

حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصِ بْنِ غِيَاثٍ قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي قَالَ حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ إِبْرَاهِيمَ قَالَ الْأَسْوَدُ كُنَّا عِنْدَ عَائِشَةَ فَذَكَرْنَا الْمُوَاظَبَةَ عَلَى الصَّلَاةِ وَالتَّعْظِيمَ لَهَا قَالَتْ لَمَّا مَرِضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مَرَضَهُ الَّذِي مَاتَ فِيهِ فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَأُذِّنَ قَالَ مُرُوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ وَأَعَادَ فَأَعَادُوا لَهُ ـ فَأَعَادَ الثَّالِثَةَ رَجُلٌ أَسِيفٌ إِذَا قَامَ مَقَامَكَ لَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يُصَلِّيَ بِالنَّاسِ ـ وَأَعَادَ الثَّالِثَةَ فَقَالَ إِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوسُفَ (الخ)

(ترجمہ):- عمر بن حفص بن غیاث سے روایت ہے۔ اُن سے روایت کی اُن کے والد نے فرمایا۔ کہ اُن سے حدیث بیان کی اعمش نے انہوں نے ابراہیم سے روایت لی۔ اسود نے کہا۔ ہم چند صحابی حضرت صدیقہ کے پاس تھے۔ تو ذکر کیا ہم نے نبی کریم صلے اللہ تعالےٰ علیہ واٰلہٖ وسلم کی تعظیم اور پابندیٔ نماز کا۔ اُمّ المومنین نے فرمایا۔ کہ جب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ واٰلہٖ وسلم مرضِ وفات شریف میں بیمار ہوگئے۔ تو ایک نماز کا وقت آیا۔ تو آپ نے اذان کے بعد فرمایا۔ ابوبکر سے کہو نماز پڑھا دے۔ عرض کیا گیا۔ کہ ابوبکر غمگین دل والے ہیں آپ کے مصلّی پر نماز نہ پڑھا سکیں گے۔ آپ نے تین دفعہ حکم فرمایا۔ تین دفعہ اسی طرح جواب عرض کیا گیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ تم تو یوسف کی صواحبہ کی طرح ہو۔ یہ حدیثِ پاک کچھ مجمل ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کہا کس نے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غمگین دل والے ہیں اس لیے کہ قیل کا لفظ صیغۂ مجہول ہے۔ چنانچہ اس کا جواب مسلم شریف جلد نمبر اوّل باب استخلاف الامام ص۱۷۷ پر دوسری اسناد کے ساتھ اسی طرح حدیث روایت ہے:-

عَنْ أَبِي مُوسٰى قَالَ مَرِضَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ فَاشْتَدَّ مَرَضُهُ فَقَالَ مُرُوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ فَقَالَتْ عَائِشَةُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ أَبَا بَكْرٍ رَجُلٌ رَقِيقٌ (الخ) فَإِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوسُفَ (الخ) ترجمہ:- ابوموسیٰ فرماتے ہیں۔ کہ فقط عائشہ صدیقہ نے کہا تھا۔ کہ یارسول اللہ حضرت ابوبکر غمگین دل والے شخص ہیں۔ تو نبی کریم نے صرف حضرت عائشہ کو ہی جواب دیا۔ کہ تم تو یوسف علیہ السلام کی صاحبہ کی طرح چال چل رہی ہو۔ ان دونوں احادیث سے جہاں یہ ثابت ہوا۔ کہ نبی کریم دِلوں کی باتیں جان لیتے ہیں۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ حضرت زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجہ ہیں۔ اس حدیث پاک کے پہلے جملے میں فقط حضرت عائشہ صدیقہ کا قول منقول ہے۔ کہ جس میں ظاہراً تو رقّتِ قلبی کا ذکر ہے۔ مگر باطناً صدیق اکبر کو لوگوں کی زبانِ طعن سے بچانا مقصود ہے۔ اور اس عرض و معروض کا منشاء یہی ہے۔ کہ کہیں لوگ حضرتِ صدیق کو منحوس یا شوم نہ سمجھیں کہ ایسا مصلّے پر قدم رکھا۔ جو پھر نبی کریم جان بر نہ ہو سکے۔ چنانچہ مسلم شریف کے اسی باب میں ص۱۷۸ پر

خود ام المؤمنین کا قول منقول ہے۔ جس میں آپ نے اپنے اِس قلبی ارادے کا ذکر کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علمِ غیب کی بنا پر اس قلبی ارادے کو سمجھا یا۔ عبارتِ حدیث سے بالکل صاف ظاہر ہے۔ کہ نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ تعالےٰ علیہ والہٖ وسلم سے صرف حضرتِ صدیقہؓ نے ہی یہ گفتگو کی تھی۔ لیکن نبی کریم نے جمع مؤنث کا صیغہ ارشاد فرمایا۔ اِنَّكُنَّ جس سے ثابت ہوا۔ کہ واحد کے لیے جمع کا صیغہ بولا جاسکتا ہے اسی طرح آگے ارشاد ہوا کہ صَوَاحِبُ یُوْسُفَ ط لفظ صواحب صاحبہ کی جمع ہے۔ جس طرح کہ اِنَّكُنَّ اگرچہ جمع ہے۔ مگر مراد فقط عائشہ صدیقہ اسی طرح صواحب اگرچہ جمع ہے۔ مگر مراد صاحبہ واحد ہے۔ اصطلاح احادیث اور اہل عرب کے نزدیک عام موقعوں پر واحد کو جمع بول دیا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں عربی ضرب الامثال عربی کتب، علم ادب، قصے کہانیوں میں بے شمار ملتی ہیں۔ اور وہاں جمع لفظی سے جمعیت مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ وحدت مراد ہوتی ہے۔ جمع لانا صرف فصاحت و بلاغت کے لیے ہوتا ہے چنانچہ عربی شاعر کہتا ہے۔ ؎

حَبِیْبِیْ مِثْلُ اَقْمَارِ السَّمَآءِ — قُلُوْبُ النَّاسِ مِنْهُ فِی الْقِیَامِ

وَدَعَهٗ بِاَنْوَارِ السَّمَآءِ — وَصِغَرٌ فِیْ نُظُوْرِ الْاَغْبِیَآءِ

(ترجمہ) :۔ میرا معشوق آسمان کے چاند کی مثل ہے۔ پیاروں کے دل اس چاند سے دمک رہے ہیں۔ ع ۲: اور غالب کر دیا اس چاند کو آسمان کے سورج پر لیکن بے وقوفوں، عقل کے اندھوں کی نظروں میں اب بھی یہ چاند حقیر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں پہلے شعر میں قمر کو اقمار لایا گیا۔ حالانکہ مراد واحد ہے۔ کیونکہ منسوب الیہ حبیب واحد۔ اقمار سے ستارے مراد نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ بعض جہلاء نے ترجمہ کیا۔ اِس لیے کہ کسی لغت میں نجم کو قمر نہ کہا گیا۔ نجم تو بہت ہیں مگر حبیب ایک ہے اور پھر محبوب کو چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے نہ کہ ستارے سے اور پھر دوسرے شعر میں لفظِ انوار سے مراد سورج ہے۔ چاند سورج کا تقابل تو بوجہ مشابہت مناسب ہے لیکن سورج ستارے کا متقابل سننے میں آج تک نہ آیا۔ دوسرے شعر میں بھی انوار جمع بولا مگر مراد واحد سورج ہے کیونکہ قرآن کریم نے بھی سورج کو ضیاء یعنی نور فرمایا۔ اور پھر یہاں خصوصی غلبے کا ذکر ہے۔ حالانکہ ستاروں پر تو چاند پہلے ہی غالب ہے۔ اِس اہمیت و خصوصیت کی کیا ضرورت تھی۔ پس ثابت ہوا۔ کہ لفظِ اقمار و انوار لفظاً جمع مگر معناً واحد ہیں۔ کیونکہ چاند سورج ایک ہی ہوتا ہے۔ نور الانوار کی شرح کا نام قمر الاقمار ہے۔ یعنی چاندوں کا چاند علمِ ہیئت کی کتاب تشریح الافلاک صفحہ نمبر ۳ پر ہے :۔ مَطْلَعُ شُمُوْسِ الْهِدَایَتِ یہاں شموس جمع لایا گیا حالانکہ شمس واحد ہے۔ عربی میں بہت دفعہ واحد کو جمع بولا جاتا ہے۔ اِسی طرح حدیث پاک میں لفظِ صواحب لفظاً جمع لیکن معناً واحد ہے۔ اور مراد اس سے فقط ایک عورت حضرت زلیخا ہیں نہ کہ مصر کی عورتیں کیونکہ فعل کی نوعیت اور مخاطبہ کی وحدت صواحب کی وحدت پر دال ہے۔ اور مقصود اس کلام سے یہ ہے کہ اے عائشہ

جس طرح تم میری بیوی ہو۔ اسی طرح زلیخا یوسف علیہ السلام کی بیوی تھی۔ اور جس طرح زلیخا نے جب زنانِ مصر کی دعوت کی۔ تو ظاہرًا کھانا کھلانے کا ذکر تھا۔ مگر زلیخا کے دل میں جمالِ یوسفی دکھا کر آپ سے غلامی کا دھبہ دھونا تھا۔ اور اپنے سے عورتوں کے طعن کو کہ اے عورتو! جس کو تم نے ادنیٰ غلام سمجھ کر میرے عشق پر طعنہ کیا۔ وہ اس شان کا مالک ہے۔ کہ تم ایک جھلک دیکھ کر اس کو بشریت کے ادنیٰ مقام سے نکال کر ملائکہ کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دو گی۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے زلیخا کے لیئے اِمْرَأَةٌ یا نِسَآءٌ کا لفظ ارشاد نہ فرمایا۔ کہ یہ الفاظ بہت دفعہ عمومیت کے لیئے مستعمل ہوتے ہیں۔ جیسے کہ:۔ نِسْوَةٌ الْمَدِیْنَۃِ، اِمْرَأَةُ الْبَلَدِ مگر صاحبہ کا لفظ عربی زبان میں صرف بیوی کے لیئے مستعمل ہے قرآن کریم میں چار جگہ لفظ صاحبہ ارشاد ہوا۔ اور سب جگہ اس سے مراد بیوی ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلی آیت سورت انعام پارہ ہفتم میں ارشاد ہے:۔ اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ کہاں سے ہوگی اس اللہ کی اولاد حالانکہ اس کی بیوی نہیں:۔

دوسری آیت:۔ سورت معارج پارہ نمبر ۲۹ میں ہے:۔ یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍۭ بِبَنِیْہِ وَصَاحِبَتِہٖ وَاَخِیْہِ (ترجمہ)۔ بروز قیامت مجرم پسند کرے گا کہ کاش فدیہ دیدے اس دن کے عذاب کا۔ اپنے بیٹے، بیوی اور بھائی کو۔ تیسری آیت سورت جن پارہ نمبر ۲۹ میں ہے:۔ وَاَنَّہٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا (ترجمہ):۔ بے شک بلند ہے ہمارے رب کی شان نہ اختیار کیا اپنے لیئے بیوی کو اور نہ اولاد کو۔ چوتھی آیت سورت عبس پارہ نمبر ۳۰ میں ہے:۔ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ (ترجمہ):۔ قیامت کا وہ ہولناک دن ہے۔ کہ بھاگ جائے گا مرد اپنے بھائی سے، اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹے کو چھوڑ کر۔ صرف ان چار جگہ پر ہی قرآن کریم میں لفظ صَاحِبَۃٌ آیا ہے۔ تمام مترجمین کے نزدیک اس کا ترجمہ بیوی ہی ہے۔ وہابی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی۔ اور خود مودودی صاحب نے بھی اس کا ترجمہ بیوی اور شریک زندگی ہی کیا ہے۔ صاحبہ کا ترجمہ بیوی کے علاوہ دوسرا ہو سکتا ہی نہیں۔ اس لیئے نبی کریم نے حضرت زلیخا کے لیئے صاحبہ کا لفظ ارشاد فرمایا۔ تاکہ بیوی ہونے کا ثبوت حدیثِ پاک سے بھی معلوم ہو جائے۔ گویا کہ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو وہی شخص پسند ہے۔ جو حضرت زلیخا کو زوجہ یوسف تسلیم کرے۔ پھر جب کہ لفظِ صاحبہ کا ترجمہ بیوی کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ لغت عرب اور قرآن کریم سے صرف یہ ہی مراد ثابت ہے اس کے سوا ترجمہ قرآن کے خلاف ہے۔ تو اب کوئی وہابی صَوَاحِبُ یُوْسُفَ کا کیا ترجمہ کریگا۔ صواحب کو جمع تسلیم کرنے کی صورت میں ترجمہ ہوگا۔ یوسف کی بیویاں۔ حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف اور گستاخی نبی ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ یہاں جمع سے وحدت مراد ہے۔ اور نسبت بھی حضرت زلیخا کی طرف اشارہ ہے۔ بحمدہٖ تعالٰی

حدیث وقرآن واقوالِ مفسرین سے چودہ دلائل مسلک اہل سنت والجماعت کے مطابق پیش کرکے ثابت کردیا گیا۔ کہ حضرت زلیخا رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ اللہ کے پیارے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک باز بیوی ہیں۔ بخلاف وہابیوں کے ان کے پاس اِس کے انکار میں ایک بھی ٹھوس دلیل نہیں۔ اگرچہ زمین وآسمان کے قلابے لگائیں۔ یا موجودہ انجیل وغیرہ میں جھک ماریں۔ اس لیے کہ انجیل سے بھی ان کی دلیل ثابت نہیں ہوتی۔ چنانچہ مصنوعی انجیل کے باب پیدائش میں جو حضرت یوسف علیہ السلام کا مفصل واقعہ درج ہے۔ اس میں بھی چند طرح متکلمانہ گفتگو کی جاسکتی ہے۔ انجیل پرانا عہد نامہ باب ۴۱ کتاب پیدائش آیت نمبر ۵۰ صفحہ نمبر ۴۲ پر ہے اور کال سے پہلے آون کے پجاری فوطیفرع کی بیٹی آسناتھ کے یوسف سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ اور یوسف علیہ السلام نے پہلوٹھے کا نام منسی رکھا۔ (الخ) اور دوسرے کا نام افرائیم۔ (الخ) یہ تھی انجیل کی عبارت جس کو وہابی صاحب قرآن وحدیث وفقہاء کے مقابل پیش کررہے ہیں (۱) اوّلاً تو یہ ثابت کیا جائے۔ کہ یہ کس نبی کی وحی یا کس صحابی کا کلام ہے (۲) اور کیا انجیل کا یہ پیش کردہ واقعہ قرآن کریم کے فرمودہ واقعے کے مطابق ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ بہت مختلف ہے۔ ان اختلافات میں وہابی صاحب کس کلام کو ترجیح دینا چاہتے ہیں؟۔ اگر مصنوعی انجیل کو ترجیح ہے۔ تو اس کا جواب لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ یعنی تمہارا دین تمہارے لئے اور ہمارا دین ہمارے لیے۔ والی آیت میں موجود ہے۔ پھر مزید گفتگو بے کار ہے۔ اور اگر ترجیح (بطورِ شرما حضوری) قرآن پاک کو دیں۔ تو انجیل کی باتوں کو غلط کہنا پڑے گا۔ اور جب دیگر باتیں غلط ہوئیں۔ تو یہ بھی غلط ہوسکتا ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے آسناتھ لڑکی کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ دوسری گفتگو اس طرح ہوسکتی ہے۔ کہ انجیل میں صرف یہ لکھا ہے کہ آسناتھ کے یوسف سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ نہ تو اس تحریر میں کہ زلیخا کے بیوی ہونے کا انکار ہے۔ اور نہ ہی آسناتھ کے بیوی ہونے کا ثبوت ہے۔ صرف آسناتھ کے بیٹے یوسف کے نطفے سے ہونے کا ذکر ہے۔ کیا معلوم انجیل کے مصنف کی مراد اس سے حلالی بیٹے ہیں۔ یا دوسرے اور جس طرح انجیل لکھنے والے نے حضرتِ داؤد، حضرت نوح، حضرت ابراہیم۔ دیگر انبیاء کرام۔ اور یہودا پر زنا اور بدفعلی کی تہمت لگائی۔ اسی طرح یہ بھی ایک تہمت ہی ہو۔ ایسی بکواسیات سے ایک وہابی تو دلیل پکڑ کر اپنے دین کو بچاسکتا ہے مگر مسلمان کی جرأت نہیں۔ کہ ایسی نجس کتاب کو ہاتھ بھی لگائے۔ سوم:۔ اِس طرح گفتگو ہے۔ کہ ہوسکتا ہے۔ کہ آسناتھ سے مراد زلیخا ہی ہو۔ اس لیے کہ انجیل میں بہت جگہ مشہور ناموں کو بدل کر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ سب مفسرین نے حضرت یوسف کے ایک بیٹے کا نام میشا بتایا مگر انجیل یہ کہتی ہے کہ اس کا نام منسی تھا اسی طرح یحیٰی علیہ السلام کو انجیل نے یوحنا کا نام دیا۔ اور اسی طرح انجیل نے قطفیر عزیز مصر کو فوطیفار کا نام دیا۔ چنانچہ کتاب پیدائش باب نمبر ۳۹ آیت نمبر ۱ صفحہ نمبر ۳۷ پر ہے۔ اور فوطیفار مصری نے جو فرعون کا ایک حاکم ہے اور جلوداروں کا سردار تھا۔ اس کو اسمٰعیلیوں کے ہاتھ سے خرید لیا۔ حالانکہ مفسرین عزیز مصر کا نام قطفیر بتاتے

ہیں۔ انجیل کہتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا سسر فوطیفرع تھا جو اُن کا پجاری اور کافر تھا۔ مگر تاریخ اسلام کہتی ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ کے والد یعنی حضرت یوسف کے سسر کا نام طیموس تھا چنانچہ تفسیر روح البیان جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۲۴ پہ ہے:۔ وَكَانَتْ بِنْتُ سُلْطَانِ الْمَغْرِبِ وَاِسْمُهٗ طَيْمُوْسُ (ترجمہ) زلیخا کے والد کا نام طیموس تھا۔ اور وہ علاقۂ عرب کا بادشاہ تھا۔ اسی طرح قرآن کریم نے حضرت ابراہیم کے فرزند پاک کا نام اسحاق فرمایا۔ لیکن بناوٹی انجیل ان کو اضحاق کہتی ہے۔ غرضیکہ بہت جگہ نام بدلے گئے۔ مقام غور ہے۔ کہ لفظ یوحنا اور یحییٰ وغیرہ میں کتنا تفاوت ہے۔ کیا کوئی وہابی کہہ سکتا ہے۔ کہ حضرت یحییٰ نبی نہیں۔ بلکہ یوحنا نبی ہیں جس طرح حضرت یحییٰ کی نبوت کا بوجہ انجیل انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ نام کی تبدیلی آگئی اسی طرح لفظ آسناتھ کی بنا پر زوجیت زلیخا کا انکار ایک کم علمی ہے۔ ممکن ہے کہ آسناتھ سے حضرتِ زلیخا ہی مراد ہوں۔ کیونکہ زلیخا آپ کا لقب ہے نا کہ نام ذاتی۔ آپ کا ذاتی نام تاریخ اسلامی کی بنا پر راعیل تھا۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد ہفتم صفحہ نمبر ۲۰۲ پر ہے:۔ وَاِنَّ الْمَلِكَ زَوَّجَ يُوْسُفَ۔ اِمْرَاءَتَهٗ رَاعِيْلَ فَقَالَ لَهَا (الخ) ترجمہ:۔ شاہ مصر نے حضرت یوسف کا نکاح عزیزِ مصر کی بیوی راعیل سے کر دیا ثابت ہوا۔ کہ زلیخا کا اصلی نام راعیل تھا۔ اور ایک شخص کا ذاتی نام بھی کئی دفعہ دو دو ہوتے ہیں۔ چنانچہ خود میرے نام دو ہیں۔ ایک نام:۔ اقتدار احمد خان اور دوسرا نام مصطفٰے میاں:۔ والدِ محترم کے بھی دو نام تھے۔ ۱:۔ حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خان ۲ دوسرا نام منظور خان۔ برادرِ محترم کے بھی دو نام ہیں خود آقا ئے دو عالم علیہ وسلم کے بھی دو نام ذاتی ہیں ۱ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم ۲ احمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم تو اگر زلیخا کے بھی ذاتی نام دو ہوں تو کیا تعجب ہے ۱ راعیل ۲ آسناتھ۔ لفظِ زلیخا آپ کا لقب اور یہی مشہور ہوگیا۔ جیسے کہ لفظ ابو ہریرہ لقب ہے۔ اور ایسا مشہور ہے کہ اصل نام شریف فراموش کر دیا گیا۔ زلیخا۔ ز ل خ سے مشتق ہے۔ جس کا ترجمہ ۱ موٹا ہونا ۲ پھسلنا یا پھسلنی جگہ ۳ دروازے کو چٹخنی سے بند کرنا تینوں ترجموں کے لحاظ سے اس کو زلیخا کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس لیئے کہ زلیخا بہت حسینہ جمیلہ تھیں اور موٹاپہ بھی حسن کی نشانی ہے۔ موٹا آدمی جلدی پھسلتا ہے۔ یا آپ کے حسن پر کسی کی نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ اس لحاظ سے بھی آپ کو زلیخا کہا جاتا ہے۔ بعض شارحین نے فرمایا۔ کہ واقعۂ یوسفی کے بعد آپ کا لقب زلیخا ہوا۔ جب کہ آپ نے دروازوں کی چٹخنیاں لگائیں۔ اور ارادہ یوسف کیا۔ اور یہ لقب آپ کے خاوند عزیزِ مصر نے دیا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بہر حال زلیخا آپ کا لقب اور راعیل آپ کا نام تھا۔ ہوسکتا ہے۔ کہ آسناتھ بھی آپ کا نام یا لقب ہو۔ اب حضرت زلیخا کے مختصر حالات بیان کیئے جاتے ہیں۔ حضرتِ زلیخا سلطانِ مغرب شاہ طیموس کی بیٹی تھیں۔ یہ بت پرست تھا۔ بعض نے کہا۔ کہ یہ کسی دین پر نہ تھا۔ مگر اللہ کو واحد مانتا تھا۔ بعض نے کہا۔ کہ یہ دینِ ابراھیمی پر تھا۔ زلیخا جب بارہ سال کی تھیں۔ تو انہوں نے خواب میں ایک بہت ہی حسین لڑکا دیکھا جس پر

پر خواب میں ہی عاشق ہوگئیں۔ انہوں نے اُس لڑکے سے پوچھا۔ کہ تم کون ہو۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ مَیں عزیزِ مصر ہوں پھر اُن کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن عشق ترقی کرتا گیا۔ جب چودہ برس کی ہوئیں۔ تو بہت بادشاہوں کے رشتے آئے مگر زلیخا نے سب نامنظور کر دئے۔ جب عزیزِ مصر کا رشتہ گیا۔ تو زلیخا نے فوراً قبول کر لیا۔ شادی و نکاح ہو کر جب رخصتی ہوئی تو خاوند کی شکل دیکھ کر بہت غم زدہ ہوئیں۔ اور اپنی سہیلیوں سے اپنا خواب بیان کر کے اپنے غمزدہ رہنے کی وجہ بیان کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں نکاح اور رخصتی ہوئی۔ بارہ سال اپنے خاوند کے ساتھ غم و اندوہ کی حالت میں گزارے خاوند بھی نامرد تھا۔ کبھی محبت و پیار نہ دیا۔ مگر اللہ کی بندی نے اپنے ایسے خاوند کے ساتھ ہی ساری زندگی بِتانے کا تہیہ کر لیا۔ بلکہ اکثر گوشۂ تنہائی کو اختیار کیا۔ مگر پاک دامنی پر آنچ نہ آنے دی۔ نہ کسی غیر مرد کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ چادرِ عصمت کو سنبھالے وقت گزرتا رہا۔ صرف ایک ہی تصور ایک ہی خیال۔ ؎

تیرا ہی تصور ہے محفل ہو کہ تنہائی! ؎ اور پھر غیر کی طرف نگاہ اُٹھ کس طرح سکتی تھی۔ کہ جس نگاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا جمالِ جہاں آرا دیکھ لیا۔ وہ بھلا کسی اور کو کیا دیکھتی۔ یہاں تک کہ مصر میں شور پڑا۔ کہ ایک غلام بازارِ مصر میں بکنے آیا ہے۔ سب نے دیکھا۔ اور قیمت لگائی۔ مگر عزیزِ مصر نے سب سے زیادہ قیمت لگا کر خرید لیا۔ جب یوسف علیہ السلام عزیزِ مصر کے گھر آئے۔ تو اس وقت آپ کی عمر بارہ سال تھی۔ اور زلیخا کی عمر تیس سال۔ جس وقت زلیخا نے آپ کو دیکھا۔ بس فوراً سمجھ گئی۔ کہ خواب والا عزیزِ مصر یہی ہے عشق تو تڑپاتا تھا۔ سو جان سے فریفتہ ہو گئی۔ یہاں تک کہ عزت و ناموس کا بھی ہوش نہ رہا۔ تین سال تک اسی طرح دیکھ دیکھ کر دل کو ٹھنڈا کیا۔ گھنٹوں دیکھتی رہتیں۔ اب وہ غلام، غلام نہ تھا۔ بلکہ قلب و جگر کا آقا تھا۔ جب دامنِ صبر ہاتھوں سے چھوٹتا نظر آیا۔ تو عصمت و حیا کی وہ چادر جس کو برسوں سے بچایا تھا۔ تار تار کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ مگر رب کریم کو یہ منظور نہ تھا۔ کہ جس موتی تابدار اور جوہرِ نایاب کو اپنے نبی کے لیے منتخب کیا ہو۔ وہ اب حالتِ وارفتگی و جنونِ عشق میں ضائع ہو جائے۔ بچایا اور خوب بچایا۔ پھر عورتوں کا واقعہ ہوا پھر آپ نے جیل جانا قبول کیا۔ اور دس سال کی جدائی ہو گئی۔ جس وقت حضرتِ یوسف جیل میں گئے۔ اُس وقت آپ کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ اور زلیخا کی عمر چھتیس سال تھی۔ عزیزِ مصر (یعنی مصر کا وزیرِ اعظم بادشاہِ فرعون کے ماتحت) قطفیر ابھی زندہ تھا۔ مگر زلیخا نے دنیا سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ اور دنیا سے غافل ہو کر محوِ خیالِ یوسف تھی۔ پھر یوسف علیہ السلام کو قید سے نکال کر عزیزِ مصر کا عہدہ دیا گیا۔ اور قطفیر کو معزول کر دیا گیا۔ جب قحط سالی شروع ہوئی۔ تو قطفیر نے زلیخا کے زیورات فروخت کر کے گندم خریدی۔ پھر اُسی سال قطفیر مر گیا اور زلیخا اپنے گھر سے بے نیاز ہو گئی۔ جو اُس کو ملنے آتا۔ تو اُس سے یوسف کا پتہ پوچھتی۔ کہ میرا یوسف کیسا ہے۔ کیا اُس کو بھوک تو نہیں لگتی۔ کیا وہ بیمار تو نہیں۔ کیا اس کی کوئی خبر گیری کرتا ہے۔ غرضیکہ وارفتگیِ عشق میں طرح طرح کے سوال کرتی۔ اور جب دوسرا شخص حضرتِ یوسف کے اچھے حالات سناتا۔ تو اُس کو بہت سونا، چاندی، کپڑے

وغیرہ کا انعام دیتی اسی طرح اُس نے اپنی ساری دولت ذکرِ یوسف پر لٹا دی۔ پھر ایک دفعہ کسی شخص نے خبر دی۔ کہ عزیزِ مصر حضرت یوسف علیہ السلام فلاں سڑک پر سے ہر آٹھویں دن گزرتے ہیں۔ تو اس کو اپنا مکان بخش دیا۔ اور خود اُس سڑک کے کنارے جھونپڑی ڈال کر رہائش اختیار کی۔ کہ شاید کبھی جمالِ یوسف نظر آجائے۔ کچھ دنوں بعد حضرتِ یوسف علیہ السلام کی سواری کا شور سن کر زلیخا سڑک پر آئی۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال اور تابانی دیکھی۔ اور ایسا اثر ہوا۔ کہ فوراً۔ اٰمَنْتُ بِرَبِّ یُوْسُفَ کہہ کر مسلمان ہوگئی۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کو پکارا۔ اے میرے یوسف مگر شور کی بنا پر ایک بوڑھی عورت کی آواز کان نہ پڑی۔ واپس آئی بت کو توڑا۔ اور اللہ کریم کے حضور سربسجود ہوگئی۔ مگر عشق میں اور اضافہ ہوگیا۔ لیکن نوعیتِ عشق کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتے ہی بدل گئی۔ کہ عشق مجازی کا حقیقی میں تبدیل ہوگیا اب سارا دن سربسجود اور ذکر اللہ میں گزرنے لگا تب دریاءِ رحمت جوش میں آیا۔ اور نا امیدی کے بادل چھٹنے کا وقت قریب آیا۔ اُس وقت حضرتِ زلیخا رضی اللہ تعالٰے عنہا کی عمر شریف چالیس ۴۰ سال تھی۔ اور قحط کا دوسرا سال تھا مگر عشقِ یوسفی کی بنا پر اسّی سال کی بوڑھی معلوم ہوتی تھیں۔ بینائی بھی کمزور تھی۔ بوجہ شدید رونے کے۔ کافی دنوں کے بعد ایک دفعہ پھر حضرت یوسف کے گزرنے کا شور بلند ہوا۔ تو حضرتِ زلیخا سڑک پر نکلیں بلند آواز سے کہا:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ الْمُلُوْکَ عَبِیْدًا بِالْمَعْصِیَۃِ وَجَعَلَ الْعَبِیْدَ مُلُوْکًا بِالطَّاعَۃِ ط (ترجمہ):۔ شکر ہے اُس اللہ تعالٰے کا۔ کہ جس نے بادشاہوں کو غلام بنا دیا گناہوں کی وجہ سے اور غلاموں کو بادشاہ بنا دیا نیکیوں کی وجہ سے، یہ آواز حضرتِ یوسف نے سُنی۔ تو بہت پسند کی۔ اور اس طرف دیکھ کر اپنے غلاموں سے فرمایا کہ اس بوڑھی کی حاجت پوری کرو۔ جب خدام حضرتِ زلیخا کے قریب آئے۔ اور حاجت پوچھی۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ میری حاجت سوائے یوسف علیہ السلام کے کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ خدام بوڑھی زلیخا کو لے کر شاہی محل میں آگئے۔ جب حضرت یوسف شام کو دربار برخاست کر کے محل میں پہنچے۔ تو آپ نے شاہی لباس اُتار کر سادہ لباس پہنا اور مصلّے پر آگئے۔ اس وقت آپ کو اُس بوڑھی کا خیال آیا۔ لیکن آپ ذکر اذکار اور پروردگارِ عالم کی حمد و ثنا میں مشغول ہوگئے جب فراغت پائی تو آپ نے خدام سے پوچھا۔ کہ اس بوڑھی کا کیا بنا۔ کیا اس کی حاجت پوری کر دی خادموں نے جواب دیا۔ کہ بوڑھی کو ہم محل میں لے آئے ہیں۔ کیونکہ وہ کہتی تھی۔ کہ میری حاجت صرف تمہارا حاکم آقا حضرتِ یوسف پوری کر سکتے ہیں۔ آپ نے اُسی بوڑھی عورت کو بلایا۔ اور کہا۔ کہ پھر وہی کلمات سناؤ جو وہاں سُنائے تھے۔ حضرتِ زلیخا نے پھر اِس طرح وہ کلمہ سنایا۔ سُبْحَانَ مَنْ جَعَلَ الْمُلُوْکَ عَبِیْدًا بِالْمَعْصِیَۃِ وَجَعَلَ عَبِیْدًا مُلُوْکًا بِالطَّاعَۃِ ط۔ آپ نے پوچھا۔ اے مائی تو کون ہے۔ اور کہاں سے آئی ہے۔ اور کیا حاجت ہے؟ یہ سوالات سن کر زلیخا زار و قطار رونے لگی۔ اور کہنے لگی۔ کہ اے یوسف میں وہ ہوں۔ کہ جس نے تیرے عشق میں زندگی گزار دی۔ تیری یاد میں رو رو کر آنکھیں کھو دیں۔ جس کی

نگاہِ شوق نے جمالِ یوسفی کے سوا کسی کو نہ دیکھا۔ میں ہوں وہ چادر۔ کہ جس کے آنچل کو یوسف کے سوا کسی نے نہ دیکھا۔ میں ہوں وہ۔ کشتۂ عشق جس نے تیری خاطر سب کچھ لٹا یا مگر خزانۂ عصمت کو تیرے لیے محفوظ رکھا۔ میں وہ ہوں۔ کہ جس نے اسی محل میں ہزاروں نعمتوں میں زندگی کا کچھ حصہ گزارا۔ مگر دل میں سوائے تیرے کسی کو جگہ نہ دی۔ اور اپنی جوانی کو تیرے فراق میں بڑھاپے سے تبدیل کیا۔ جب حضرت یوسف نے عشق کی یہ آپ بیتی سنی۔ تو آپ کو سابقہ زمانہ یاد آیا۔ اور حیران کن لہجے میں فرمایا۔ کیا تو زلیخا ہے۔ یعنی کنڈیاں بند کرنے والی۔ بعض نے فرمایا۔ کہ سب سے پہلے اس کو زلیخا حضرت یوسف نے ہی اس موقعہ پر فرمایا۔ اس کے ترجمہ کے لحاظ سے۔ اور پھر یہی لقب مشہور ہو گیا۔ زلیخا نے جواب دیا۔ ہاں میں زلیخا ہوں۔ آپ نے بلند آواز سے دعا کی۔ اے اللہ مجھ کو اس فتنے سے بچا۔ جیسے کہ پہلے بچایا۔ اور تو ہی اپنے بندوں کو بچانے والا ہے۔ پھر فرمایا۔ کہ اب تیری حاجت مجھ سے کیا ہے عرض کیا۔ کہ میری تین حاجتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ میری آنکھیں اور جوانی مجھ کو مل جائے۔ کیونکہ یہ سب کچھ آپ کے ہی عشق سے ختم کی ہیں۔ آپ نے دعا کی۔ تو فوراً زلیخا کو بالکل پہلے جیسا حسن و شباب و بینائی عطا ہوئی۔ عرض کیا دوسرا سوال یہ کہ میرے سابقہ گناہ اپنے رب سے معاف کرائیے۔ کیونکہ میں آپ کے رب پر سچے دل سے ایمان لا چکی ہوں۔ تیسرا سوال یہ کہ آپ میرے ساتھ نکاح کیجئے۔ اس پر آپ سر کو جھکا کر خاموش ہو گئے اور تفکر کے آثار چہرۂ انور پر ہویدا ہو گئے۔ تب جبرائیل امین حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا۔ کہ اے یوسف علیہ السلام اس کے اس سوال کو بھی پورا کر دیجئے۔ تب آپ نے اس کو تسلی دی دوسرے دن یعنی قطفیر کے فوت ہونے کے ایک ماہ بعد بادشاہ مصر نے آپ کا نکاح حضرت زلیخا سے کر دیا۔ کیونکہ فرعون اس وقت دین ابراہیمی پر تھا۔ اور دین ابراہیمی میں بیوہ پر عدت نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی پارہ ۱۳ صفحہ نمبر ۴ پر ہے۔ وَكَانَ ذَالِكَ عَلَى الْفَوْرِبِنَاءً عَلَى اَنَّهٗ لَمْ تَكُنِ الْعِدَّةُ فِيْ دِيْنِهِمْ (ترجمہ) وہ نکاح قطفیر کے مرنے کے کچھ دن بعد ہی ہو گیا۔ کیونکہ مصر والوں کے دین میں بیوہ پر عدت نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح دین ابراہیمی کا قانون تھا۔ کہ چور کو مال والے کا غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اور یہی ابراہیمی قانون بنیامین کے ساتھ اس کے بھائیوں نے بیان کیا۔ نکاح کے بعد پہلی ملاقات میں حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اے زلیخا۔ کیا یہ وصال اچھا ہے۔ یا وہ جس کی طرف تو بلاتی تھی۔ زلیخا نے تمام خواب وغیرہ کا واقعہ سنا کر عرض کیا۔ کہ اے میرے آقا مجھ کو ملامت نہ کر۔ کیونکہ میں تیرے عشق میں اندھی ہو چکی تھی۔ اور میں نعمتوں کی پروردہ تھی۔ حالت کنواری تھی۔ میرا خاوند عنین (نامرد) تھا۔ اس وقت حضرت زلیخا کی عمر چالیس سال تھی مگر جوانی میں بیس سال کی لگتی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر اس وقت بائیس سال تھی۔ آپ کے دو فرزند بطنِ زلیخا سے پیدا ہوئے۔ افرائیم اور میشا۔ اس میں سب کا اتفاق ہے۔ اور ایک بیٹی رحمت تولد ہوئی۔ جن کا

نکاح حضرت ایوب علیہ السلام سے ہوا تھا۔ مگر اس میں اختلاف ہے۔ اکثر مورخین نے فرمایا۔ کہ رحمت بی بی افرائیم کی بیٹی تھی۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پوتی تھیں ۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ۔

کتب

جبری نکاح کا حکم

سوال نمبر ۹ :۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص خالد کو لوگوں نے گھیر لیا بندوقیں اور چاقو چھریاں دکھا کر کہا۔ کہ تو اپنی لڑکی نابالغہ ہندہ کا نکاح ہمارے لڑکے زید سے کر دے۔ تو تجھ کو کچھ نہیں کہتے چھوڑ دیں گے۔ خالد نے انکار کیا۔ تو وہ قتل پر آمادہ ہو گئے خالد نے جبراً و کرہاً خوف زدہ ہو کر اپنی نابالغہ کا نکاح کر دیا۔ انہوں نے نکاح پڑھوا کے کلمے سن سنا کر پھر خالد کو چھوڑا۔ اب خالد یہ کہتا ہے۔ کہ یہ لوگ ہمارے پرانے دشمن ہیں۔ میں ہرگز ہرگز اپنی لڑکی اپنے دشمنوں کے گھر نہ جانے دوں گا۔ نہ میں نے رضا و رغبت سے یہ نکاح کیا۔ بلکہ جان کے خوف سے ایسا کیا۔ فرمایا جائے۔ کہ کیا یہ جبری نکاح درست ہے۔ اور اس کے ٹوٹنے کا کیا طریقہ ہے۔

بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ۔

سائل :۔ خالد حسین محلہ کشمیریاں سیالکوٹ شہر۔ ۲۰ ۔۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَہَّابِ ۔

الجواب

قانون شریعت کے مطابق صورت مسئولہ میں کوئی نکاح واقع نہ ہوا۔ اس لیے کہ یہ جبری نکاح ہے۔ اور جبری نکاح اپنے نفس اور اپنی ذات کے لیے تو منعقد ہو جاتا ہے۔ لیکن غیر کے لیے ہرگز ہرگز منعقد نہیں ہو سکتا یہی حکم ہے۔ ان تمام معاملات کا جو جبراً بھی منعقد ہو جاتے ہیں۔ وہ کل بیس چیزیں ہیں کچھ تو صراحتاً حدیث پاک میں مذکور ہوئیں۔ کچھ اشارۃً کچھ دلالۃً۔ اسی لیے فقہاء کرام میں سے کسی نے تین فرمائیں۔ کسی نے دس چیزیں کسی نے پانچ کسی نے کچھ کسی نے کچھ۔ سب جمع کردہ بیس ہوئیں :۔

پہلا نمبر :۔ طلاق ؛ ۲ نکاح ؛ ۳ :۔ رجوع ؛ ۴ :۔ ایلاء ؛ ۵ :۔ قسم کھانا ؛ ۶ :۔ رضاعت کا اقرار جبری ؛ ۷ :۔ منت ماننا ؛ ۸ :۔ امانت قبول کرنا ؛ ۹ :۔ کسی معاملہ پر صلح کرنا ۱۰ :۔ خریدنا ۱۱ :۔ بیچنا ؛ ۱۲ :۔ غلام مدبر بنانا ۱۳ :۔ غلام کو مکاتب بنانا ؛ ۱۴ :۔ لونڈی غلام کو آزاد کرنا۔ ۱۵ ہبہ کرنا بلا شرط لگا جبری ؛

ع۱۷ :- کسی چیز کا اقرار کرنا ۔ ع۱۸ :- معاف کرنا ۔ ع۱۹ :- ایجاب کرنا ۔ ع۲۰ :- قبول کرنا ۔
یہ بیس۲۰ چیزیں قانونِ اسلامی کی رُو سے جبراً بھی منعقد ہو جاتی ہیں ۔ اور مذاق سے بھی چنانچہ احادیث مشکوٰۃ شریف جلد آخر صفحہ نمبر ۲۸۴ پر ہے :- عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ (ترجمہ) :- روایت ہے ۔ عاشقِ رسول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہ فرمایا آقائے دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جنہیں اختیاری کلام بھی اختیاری ہے ۔ اور ھزل بھی اختیاری حکم رکھتا ہے ۔ یعنی جان کر کہے ۔ تب بھی وہ منعقد ہو جاتا ہے ۔ ھزل سے کہے تب بھی منعقد ہو جاتا ہے وہ نکاح ، طلاق اور رجوع ہے ھزل کی دو۲ قسمیں ہیں :-

پہلی قسم :- ایک یہ کہ مذاق کرتے ہوئے منہ سے لفظ نکالے ۔ ع۲ :- یہ کہ خوف سے مجبور ہو کر الفاظ منہ سے ادا کیجئے ۔ چنانچہ اصول فقہ کی کتاب نور الانوار حاشیہ قمر الاقمار صفحہ نمبر ۳۰ پر ہے :- لِاَنَّ الْهَزْلَ قَدْ يَكُوْنُ عَنْ اِخْتِيَارٍ وَقَدْ يَكُوْنُ عَنْ اِضْطِرَارٍ (ترجمہ) :- ھزل کبھی ہوتا ہے ۔ اپنی مرضی اور دل لگی مذاق سے ۔ اور کبھی ہوتا ہے مجبوری کی بنا پر ۔ مگر دونوں سے حکم جاری ہوتا ہے اس حدیث پاک میں تو صرف نکاح ، طلاق اور رجوع عن الطلاق کا ذکر ہے ۔ لیکن دوسری روایت میں عتاق اور یمین کا بھی ذکر ہے ۔ جیسا کہ ، نور الانوار صفحہ نمبر ۳۰۹ پر لکھا ہے ۔ دیگر فقہاء کرام نے احادیثِ متعددہ کی تفتیش کے بعد اس سے بھی زیادہ چیزیں بیان فرمائی ہیں ۔ چنانچہ فتاوٰے بحر الرائق جلد سوم صفحہ نمبر ۲۴۶ پر ہے :- وَفِی الْخِزَانَةِ لِاَبِی اللَّيْثِ وَجُمْلَةُ مَا يَصِحُّ مَعَهٗ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ شَيْئًا (ترجمہ) :- علامہ ابو اللیث رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خزانۃ الفتاوٰی میں ہے کہ وہ تمام معاملات جو مذاق اور جبر سے بھی صحیح ہو جاتے ہیں ۔ وہ اٹھارہ ہیں ۔ بعض نے دو اور شامل کر کے پورے بیس۲۰ بنا دیئے ۔ یہ تمام معاملات اپنے لیئے تو جبراً قہراً مذاقاً ہر طرح منعقد ہو جاتے ہیں مگر دوسرے کے لیئے مذاق اور جبر سے منعقد نہیں ہو سکتے ۔ جیسے کہ ایک شخص دوسرے آدمی کو کہتا ہے کہ تو اپنی بکری میرے ہاتھ فروخت کر دے ۔ ورنہ میں تجھ کو جان سے مار دوں گا ۔ وہ آدمی جان کے خوف سے کہتا ہے ۔ میں اتنے میں فروخت کرتا ہوں ۔ پہلا آدمی اسی وقت قبول کرے تو بیع شرعاً منعقد ہو جائے گی ۔ بعد میں بائع کا انکار قانوناً معتبر نہ ہوگا ۔ اگر خریدار کہے ۔ کہ قتل کر دوں گا ۔ ورنہ اپنے باپ کی بکری میرے ہاتھ بیچ دے ۔ اور وہ مجبور آدمی خوف زدہ ہو کر کہہ دے ۔ کہ میں نے اپنے والد کی بکری تیرے ہاتھ فروخت کر دی ۔ تو شرعاً بیع منعقد نہ ہوگی ۔ یہی حال نکاح کا ہے ۔ کہ اگر کہتا ہے ۔ کہ اپنا نکاح فلاں سے کر لے ۔ اور جبراً ایجاب و قبول ہو جاتا ہے ۔ تو نکاح منعقد ہو جائے گا ۔ لیکن اگر کوئی کہتا ہے ۔ کہ اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے

یا میرے لڑکے سے کر دے۔ اور وہ بوجہ خطرۂ جان نکاح کر دیتا ہے۔ تو شرعاً وہ نکاح منعقد نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان معاملات کا جبراً منعقدہ ہو جانا خلافِ قیاس ہے۔ کیوں کہ عقل اور قیاس نہیں چاہتا۔ کہ مرضی کے بغیر جبری زبردستی کوئی شخص کسی سے قبول کرالے۔ تو شرعاً بھی درست ہی ہو جائے۔ مگر چونکہ احادیثِ متعددہ مشہورہ میں یہ بات آگئی۔ اس لیے خلاف قیاس حکم جاری ہوگیا۔ چنانچہ فتاوٰے ردّ المحتار جلد دوم صفحہ نمبر ۵۰۹ پر ہے :- لِتَصْرِیْحِھِمْ بِاَنَّ الثَّلَاثَ تَصِحُّ مَعَ الْاِکْرَاہِ اِسْتِحْسَانًا اھ (ترجمہ) :- فقہاءِ کرام کے وضاحت فرمانے کی وجہ سے ثابت ہوا۔ کہ یہ تینوں چیزیں نکاح، طلاق وغیرہ زبردستی کرانے سے بھی صحیح ہو جاتی ہیں مگر خلافِ قیاس۔ اور احادیث مطہرہ کے یہ سب خلافِ قیاس حکم صرف اپنی ذات کے لیے ہیں۔ اسی لیے صاحب بحر الرائق طلاق میں مجبور شخص کی تشریح کرتے ہوئے جلد سوم صفحہ نمبر ۲۴۵ پر فرماتے ہیں :- وَلَوْ مُکْرَھًا ای وَلَوْ کَانَ الزَّوْجُ مُکْرَھًا عَلٰی اِنْشَاءِ الطَّلَاقِ (الخ) ترجمہ :- اگرچہ طلاق پر جبر کیا جائے۔ یعنی خاوند مجبور کیا جائے خود اپنی بیوی کے طلاق دینے پر نہ کہ کوئی دوسرا۔ ثابت ہوا کہ اپنے ذاتی معاملہ میں جبری حکم جاری ہوگا۔ اور فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۵۰۹ پر ہے۔ یَشْتَمِلُ مَا اِذَا اُکْرِہَ الزَّوْجُ اَوِ الزَّوْجَۃُ عَلٰی عَقْدِ النِّکَاحِ کَمَا ھُوَ مُقْتَضٰی اِطْلَاقِھِمْ اھ (ترجمہ) :- حدیث پاک کا یہ استحسانی حکم صرف اس صورت کو شامل ہوتا ہے جب کسی مرد یا عورت کو بذاتِ خود مجبور کیا جائے۔ کہ تم دونوں آپس میں نکاح کر لو۔ ورنہ قتل کر دیا جائے گا تب دونوں خوف زدہ ہو کر ایجاب و قبول کریں۔ ایسا نکاح شرعاً منعقد ہو جائے گا۔ یہی احادیث کا تقاضہ ہے۔ پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ مجبوری کا حکم صرف ذات کے لیے ہے نہ کہ غیر کے لیے۔ لہٰذا کسی اور کا نکاح منعقد نہیں ہو سکتا کیوں کہ علم اصول کا قاعدہ ہے۔ کہ خلافِ قیاس اپنے مَوْرَد پر ہی قائم رہتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے :- اَلْاِسْتِحْسَانُ یَقُوْمُ عَلَی الْمَوْرِدِ اھ (ترجمہ) :- خلافِ قیاس مسئلہ صرف وہیں جاری ہوتا ہے۔ جس کے لیے آئے یا جس کے لیے بنے۔ اس تمام گفتگو سے ثابت ہوگیا۔ کہ اگر باپ کو مجبور کیا گیا۔ کہ تو اپنی چھوٹی بیٹی کا فلاں سے نکاح کر دے اور اس نے مجبوراً نکاح کر دیا۔ تو نکاح منعقد نہ ہوگا۔ باوجود اس بات کے کہ باپ اپنی نابالغہ اولاد کا سب سے قریبی اور با اختیار والی اور ناظم ہے۔ مگر شریعت مطہرہ میں باپ کو یہ اختیار نہیں۔ کہ یہ وہ اپنی اس ذمے داری کو ناجائز استعمال کرے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اگر کوئی باپ جانتے بوجھتے اپنی ذاتی لالچ کی بنا پر اپنی نابالغہ کا نکاح کسی ظالم مرد سے کر دے۔ تو وہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۳۱۸ پر ہے :- حَتّٰی لَوْ عُرِفَ مِنَ الْاَبِ سُوْءُ الْاِخْتِیَارِ لِسَفَھِہٖ اَوْ لِطَمْعِہٖ لَا یَجُوْزُ عَقْدُہٗ اِجْمَاعًا اھ (ترجمہ) اس مسئلے پر اجماعِ امت ہے۔ کہ جب پہچان لیا جائے۔ کہ باپ نے کسی لالچ یا اپنی بیوقوفی کی وجہ سے اپنی نابالغہ بچی کا غلط اختیار سے کہیں نکاح کر دیا۔ تو وہ نکاح ہرگز منعقد نہ ہوگا۔ اسی طرح فتاوٰے بحر الرائق جلد سوم

فصل فی الکفو صفحہ نمبر ۳۵ پر ہے :- اَنَّ الْاَبَ اِذَا کَانَ مَعْرُوْفًا بِسُوْءِ الْاِخْتِیَارِ لَمْ یَصِحَّ عَقْدُہٗ (الخ) وَقَدْ وَقَعَ فِیْ اَکْثَرِ الْفَتَاوٰی فِیْ ھٰذِہِ الْمَسْئَلَۃِ اَنَّ النِّکَاحَ بَاطِلٌ فَظَاھِرُہٗ اَنَّہٗ لَمْ یَنْعَقِدْ (ترجمہ) :- بے شک باپ جب اپنی بُرے اور لالچی اختیار میں مشہور ہو چکا ہو۔ اور اکثر کتب فتاوٰی میں یہ مسئلہ اس طرح واقع ہوا۔ کہ نکاح باطل ہے۔ اِس سے بھی ظاہر ہوا۔ کہ نکاح منعقد ہی نہ ہوا جب صاحب اختیار باپ کا چھوٹی نابالغہ بچی کا پڑھایا ہوا نکاح برضا و منشا بھی شریعت پاک نے صرف بچی کو ظلم سے بچانے کے لیئے باطل اور غیر منعقد قرار دیا۔ تو وُہ نکاح جو باپ کی مرضی کے بغیر ہو گیا۔ اور جس میں باپ نے محض، اپنی جان بچانے کے لیئے ایجاب قبول کیا۔ بھلا وُہ کس طرح شریعت میں جائز ہو سکتا ہے۔ لہٰذا شرعی فتوٰی صادر کیا جاتا ہے۔ کہ خالد مذکور کا یہ کیا ہوا نکاح قطعاً باطل ہے۔ اور اُس کی بیٹی ہندہ سابقہ جبری نکاح سے باطل آزاد ہے۔ خالد کو اجازت ہے۔ جہاں چاہے اُس کا نکاح کر دے۔ شریعت کی طرف سے ممانعت نہیں۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

بغیر گواہی نکاح کا حکم۔ باطل، فاسد نکاح کا فرق

سوال نمبر ۵۰ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں۔ کہ ایک بیوہ عورت ہندہ بعد عدتِ وفات اپنے دیور زید سے اس طرح نکاح کرتی ہے کہ ایک خفیہ کمرے میں صرف ہندہ اور زید ہیں۔ ہندہ زید کو اور زید ہندہ کو کلمہ طیبہ صفتِ ایمان مجمل و مفصل پڑھاتے اور زید کہتا ہے کہ ہندہ سے ایک ہزار روپیہ مہر کے عوض نکاح کرتا ہوں۔ ہندہ کہتی ہے کہ مجھ کو قبول ہے میں خدا وند کریم اور رسول مقبول کو حاضر ناظر جان کر اقرار کرتی ہوں کہ میں بعوض ایک ہزار روپیہ مہر اپنی جان واسطے نکاح زید کے حوالے کرتی ہوں۔ زید نے تین دفعہ کہا میں نے قبول کیا۔ اس کے بعد ہندہ نے زید کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا، اور اپنا بھی دوسرا ہاتھ بلند کر کے کہا خداوندا تو گواہ ہے کہ میرا نکاح زید سے بعوض ایک ہزار روپیہ حق مہر ہو گیا ہے۔ یہ نکاح خفیہ اس لیئے کیا گیا کہ ہندہ اور زید میں انتہائی عشق و محبت ہے۔ لیکن دوسرے رشتے دار یہ نکاح نہیں ہونے دیتے۔ ابھی تک ہندہ اور زید نے ملاپ نہیں کیا۔ دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ گجرات پیر صاحب سے فتوٰی منگاؤ۔ جو آن کا حکم ہو گا۔ اُس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ لہٰذا آپ ہم کو شرعی فتوٰی عنایت فرماؤ کہ اس پر جلدی عمل کیا جائے۔ ہندہ اور زید چونکہ اکٹھے ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ غیر شرعی کام کر بیٹھیں۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا۔

دستخط سائل عنایت اللہ صیفی معرفت گوہر رحمان پوسٹ ماسٹر ڈاکخانہ کشیری بازار تحصیل کوہ مری ضلع راولپنڈی ۹ مئی ۱۹۸۰ء

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق صورتِ مسئولہ میں یہ نکاح بالکل فاسد ہوا۔ کیونکہ یہ نکاح حدیث و قرآن کی رو سے قطعًا غلط ہے۔ ہرگز ہرگز خاوند بیوی میں سے کوئی کسی کے نزدیک نہ جائے بالکل دور رہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے غیر ہیں۔ اگر فتوٰے ہذا پہنچنے سے پہلے صحبت کر لی ہے تو ہندہ پر عدت واجب ہے۔ اور جس دن سے یہ فتوٰے جاری ہوگا اسی دن سے تنسیخ نکاح کے طریقے پر عدت شروع ہوگی۔ اور اگر وطی صحبت نہیں کی ہے تو عدت واجب نہیں۔ قانونِ اسلامیہ کے مطابق جس طرح ہر نماز کے لیے چودہ فرض ہیں کچھ رکن اور کچھ شرطیں۔ اسی طرح نکاح کرنے کے لیے بھی چودہ فرض ہیں۔ جن میں دو رکن ہیں۔ اور بارہ شرطیں۔ دو رکن میں پہلا رکن ایجاب ہے اور دوسرا رکن قبول ہے۔ خاوند بیوی میں سے جس کی طرف سے نکاح کی خواہش پیش کش ہو وہ ایجاب ہے پیش کش کو مان لینا قبول ہے اس کا نام نکاح ہے۔ مگر اس کی تکمیل کے لیے بارہ شرطیں ہیں:۔ ع۱ عاقل بالغ ہو نا ولی کا جو نکاح کرے ع۲:۔ عورت و مرد آپس میں نکاح کے اہل ہوں ع۳:۔ خاوند بیوی یا ان کے وکیل ایک دوسرے کا کلام سمجھیں اور سنیں۔ ع۴:۔ ولی وارث کی اجازت بشرطیکہ سوء اختیار والا تجربہ شدہ ظالم نہ ہو ع۵۔ بیوی کی باکرہ بالغہ یا ثیبہ کی رضا:۔ ع۶:۔ دو مرد عاقل بالغ مسلمان یا ایک مرد دو عورتیں گواہ ع۷ دونوں گواہوں کا ایک دم ایجاب و قبول سننا ع۸:۔ ایجاب و قبول کا ایک مجلس میں ہونا ع۹:۔ قبولِ نکاح بالکل ہر لحاظ سے ایجاب کے مطابق ہو مہر وغیرہ سے قطعًا ممانعت نہ ہو ع۱۰:۔ نسبتِ نکاح بوقتِ ایجاب قبول کرنے والے کے سارے جسم کی طرف ہو یا ایسے عضو کی طرف جس سے سارا جسم مراد ہوتا ہے۔ مثلًا یا کہے کہ میں تجھ سے نکاح کرتا ہوں یا کہے تیرے سر سے نکاح کرتا ہوں۔ ع۱۱:۔ خاوند کو بیوی کا اور بیوی کو خاوند کا قبل نکاح پورا پورا پتہ اور پہچان ہو۔ ع۱۲:۔ خاوند بیوی کا قومیت اور کفو میں برابر ہونا۔ (عالمگیری) اُصول شریعت کے مطابق نکاح چار قسم کے ہیں۔ پہلی قسم۔ نکاح صحیح دوسری قسم نکاحِ ہزل یا جبر تیسری قسم۔ نکاح فاسد۔ چوتھی قسم۔ نکاح باطل۔ جس نکاح میں تمام رکن اور تمام شرطیں مکمل موجود ہوں وہ نکاح صحیح ہے۔ جہاں ایک شرط یعنی رضا و خوشی نہ پائی جائے۔ مذاق مذاق میں یا کسی کے جبر سے مجبور ہو کر ڈر کر نکاح کیا جائے۔ وہ نکاحِ ہزل ہے۔ یہ دونوں نکاح شرعًا جائز رکھے جائیں گے۔ جہاں نکاح کا کوئی رکن ختم ہو جائے۔ وہ نکاح باطل ہے۔ جہاں نکاح کی شرطوں میں سے کوئی شرط ختم ہو جائے۔

وہ نکاح فاسد ہے۔ رکنِ شی چونکہ بہت اہم ہوتے ہیں اس لیے اس کے ختم ہونے سے تمام علماءِ اسلام کے نزدیک متفقًا نکاح سرے سے ہوگا ہی نہیں اسی کو باطل کہتے ہیں ؛۔ پس گویا کہ جس کے عدم اور ناجائز ہونے میں سب کا اتفاق ہو وہ نکاح باطل ہے۔ اور شرط چونکہ بیرونی چیز ہے۔ اس لیے اس کے ختم ہونے سے بعض کے نزدیک نکاح ناجائز ہوگا۔ اور بعض کے نزدیک معلق۔ اور بعض کے نزدیک موقوف۔ اور بعض کے نزدیک جائز ہوگا۔ بارہ مذکورہ شرطوں سے ایک شرط بھی ختم ہو جائے تو اس میں علماءِ اسلام کا مندرجہ بالا اختلاف پایا گیا۔ اور جس میں اختلاف ہو وہ فاسد ہوتا ہے۔ لہٰذا معدومُ الشّرط نکاح فاسد ہوا۔ خلاصہ یہ کہ جس نکاح کے جائز ہونے میں سب کا اتفاق وہ نکاح صحیح ہوا اور جس کے ناجائز ہونے میں سب کا اتفاق وہ باطل ہوا۔ اور جس کے جواز میں اختلاف وہ نکاح فاسد ہوا۔ چنانچہ فتاویٰ شلبی علی دُرِّ مختار جلد دوم ص۸۳۵ پر ہے :۔ كُلُّ نِكَاحٍ اِخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي جَوَازِهٖ كَالنِّكَاحِ بِلَا شُهُوْدٍ فَالدُّخُوْلُ فِيْهِ مُوْجِبٌ لِلْعِدَّةِ فَعَلٰى هٰذَا يُفَرَّقُ بَيْنَ فَاسِدِهٖ وَبَاطِلِهٖ فِي الْعِدَّةِ ؛۔ (ترجمہ) ہر وہ نکاح جس کے جواز میں علماءِ امت کا اختلاف ہو جیسے بغیر گواہوں کے نکاح۔ پس اس میں صحبت کرنا عدت کو واجب کرتا ہے اسی کلیے سے نکاح فاسد اور باطل میں فرق کیا جاتا ہے۔ بحالتِ عدت۔ فتاویٰ شامی جلد دوم ص۳۸۸ پر ہے :۔ وَهُوَ الَّذِيْ فُقِدَ شَرْطًا مِنْ شَرَائِطِ الصِّحَّةِ كَشُهُوْدٍ (ترجمہ) نکاح فاسد وہ ہے جس میں صحتِ نکاح کی شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے جیسے گواہ ہونا جب آپ نے یہ ذہن نشین کر لیا تو یاد رکھو کہ صورت مسئولہ میں جس نکاح کا ذکر کیا گیا ہے وہ نکاح فاسد ہے۔ کیونکہ اس میں ارکانِ نکاح یعنی ایجاب و قبول تو ہیں مگر ایک اہم شرط یعنی گواہ موجود نہیں۔ اور گواہ نہ ہونا نکاح کو فاسد کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ابھی :۔ مندرجہ بالا دو حوالوں سے ثابت ہوا۔ شرعی طور پر دو گواہ کم از کم ہونے لازم ہیں جو عاقل بالغ مسلمان ہوں۔ اگر دو گواہ سے کم ہوں گے۔ تو نکاح غلط ہوگا۔ چنانچہ مؤطا امام مالک جلد دوم صفحہ نمبر ۸۳ پر ہے :۔ وَحَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ الْمَكِّيِّ أَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ أُتِيَ بِنِكَاحٍ لَمْ يُشْهَدْ عَلَيْهِ إِلَّا رَجُلٌ وَامْرَأَةٌ فَقَالَ هٰذَا نِكَاحُ السِّرِّ وَلَا أُجِيْزُهٗ وَلَوْ كُنْتُ تَقَدَّمْتُ فِيْهِ لَرَجَمْتُ (ترجمہ) :۔ امام مالکؒ سے روایت وہ راوی ہیں ابوزبیر مکیؒ سے کہ فاروق اعظم کی بارگاہ میں ایک ایسے نکاح کا مقدمہ آیا جس میں ایک مرد ایک عورت گواہ تھے آپ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ نکاح خفیہ ہے۔ میں ہرگز اس کو جائز نہیں رکھتا۔ اگر میں اس میں تعزیری شدت کرتا تو رجم کی حد لگاتا۔ ثابت ہوا کہ ایک مرد ایک عورت کی گواہی کے ہوتے ہوئے فیصلہ فاروقی کے لحاظ سے وہ نکاح ناجائز ہوا۔ صورتِ مذکورہ میں تو ایک گواہی بھی نہیں۔ شرعی اعتبار سے جب نکاح میں گواہ

بالکل نہ ہوں تو بحکم حدیث پاک وہ نکاح بالکل غلط ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صـ۲۷۰ پر ہے۔ اور ترمذی شریف صـ۱۳۰ پر ہے عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْبَغَایَا اللَّتِیْ یُنْکِحْنَ اَنْفُسَھُنَّ بِغَیْرِ بَیِّنَۃٍ (الخ) وَالصَّحِیْحُ مَارُوِیَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَوْلُہٗ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِبَیِّنَۃٍ۔ (ترجمہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ پیارے آقا حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ عورتیں جو اپنا نکاح بغیر گواہوں کے خود کرلیں وہ عورتیں سرکش باغی ہیں۔ (الخ) صحیح ہے وہ روایت جو حضرت ابن عباس سے آپ کا یہ فرمان کہ گواہوں کے بغیر نکاح ہوتا ہی نہیں۔ گواہوں کی موجودگی نکاح کے وقت اتنی سخت ضروری ہے کہ اگر ایک گواہ ذرا دیر سے آیا۔ اور اس نے محفل وغیرہ سب کچھ دیکھ لی چھوارے لٹتے ہوئے بھی دیکھے مگر ایجاب وقبول نہ سنا۔ ایجاب وقبول صرف ایک ہی گواہ نے سنا تب بھی نکاح فاسد ہوگا۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد اول صـ۱۳۱ پر ہے۔ لَا یَجُوْزُ النِّکَاحُ حَتّٰی یَشْھَدَ الشَّاھِدَانِ مَعًا عِنْدَ عُقْدَۃِ النِّکَاحِ۔ ترجمہ:۔ بوقت نکاح دونوں گواہ مرد یک دم ایک ساتھ جب تک موجود نہ ہوں اس وقت تک نکاح جائز نہ ہوگا۔ یہ اتنی سختی کیوں ہے۔ صرف اس لیے کہ گواہی نکاح کا اہم فرض ہے چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد اول صـ۲۶۷ پر ہے۔ وَمِنْھَا الشَّھَادَۃُ قَالَ عَامَّۃُ الْعُلَمَاءِ اِنَّھَا شَرْطُ جَوَازِ النِّکَاحِ ھٰکَذَا فِی الْبَدَائِعِ (الخ) وَیُشْتَرَطُ الْعَدَدُ فَلَا یَنْعَقِدُ النِّکَاحُ بِشَاھِدٍ وَّاحِدٍ۔ (ترجمہ):۔ اکثر علمائے کرام نے فرمایا کہ شرائط نکاح میں سے ایک شرط گواہی ہے وہ جواز نکاح کے لیے فرض لازمی ہے۔ ایسا ہی فتاوے بدائع میں ہے (الخ) اور گواہی میں عدد بھی فرض ہیں۔ لہٰذا ایک گواہ سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔ جب یہ اہمیت ثابت ہوگئی کہ ایک گواہ کی غیر حاضری سے بھی نکاح جائز نہیں ہوتا تو اب اگر کوئی بالکل ہی بغیر گواہوں کے نکاح کرے خفیہ طور پر جیسا کہ سوال مذکور میں ہوا تو وہ یقیناً فاسد ہوگا اور دونوں خاوند بیوی میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا خاوند بیوی نہ ہوگا۔ پس ان قوانین اسلامیہ کے تحت فتوے دیا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ فی السوال ہندہ وزید کا نکاح فاسد ہے۔ اور فاسد نکاح کے شرعًا چار حکم ہیں۔ پہلا حکم یہ کہ خاوند نے اپنی اس بیوی سے صحبت کرلی ہے۔ تو خاوند کو مقرر شدہ یا اس خاندان کا رواجی مہر ان میں سے جو کم ہوگا وہ پورا دینا پڑے گا۔ چنانچہ فتاوے درمختار علیٰ تنویر الابصار مجرد صـ۱۹۷ پر ہے۔ وَیَجِبُ مَھْرُ الْمِثْلِ فِیْ نِکَاحٍ فَاسِدٍ بِالْوَطْءِ فِی الْقُبُلِ لَا بِغَیْرِہٖ۔ (ترجمہ):۔ نکاح فاسد کرنے والے خاوند بیوی جب وطی کریں تو شرعًا خاوند پر مہر مثل یعنی اس خاندان کا رواجی مہر دینا واجب ہے۔ فتاوے شامی جلد دوم نے صـ۴۸۱ پر فرمایا وَیَجِبُ الْاَقَلُّ مِنَ الْمُسَمّٰی وَمِنْ مَھْرِ الْمِثْلِ۔ (ترجمہ):۔ اور نکاح فاسد کے

خاوند پر وطی کرنے کی صورت میں وہ مہر واجب ہے جو مہر معینہ اور مہر خاندانی سے کم ہو دوسرا حکم یہ ہے۔ کہ جب فاسد نکاح میں خاوند نے وطی کر لی تو بعد تنسیخ اور فیصلہ علیحدگی بیوی کا پر تین حیض عدت واجب ہو گی۔ چنانچہ در مختار مکمل مجرد صفحہ نمبر ص۱۹۷ پر ہے:۔ وَتَجِبُ الْعِدَّةُ بَعْدَ الْوَطْئِ لَا الْخَلْوَةِ لِلطَّلَاقِ لَا لِلْمَوْتِ مِنْ وَقْتِ التَّفْرِيْقِ۔ (ترجمہ):۔ ایسے نکاح میں صرف وطی کے بعد عدت طلاق واجب ہوتی ہے نہ کہ عدتِ وفات اور نہ فقط خلوت صحیح سے۔ نکاحِ صحیح اور نکاح فاسد میں ایک فرق یہ بھی ہے صحیح نکاح کے ختم ہونے میں خلوت سے بھی عدت واجب ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں نہیں اور تین حیض عدت ہے نہ کہ چار ماہ دس دن۔ ان دونوں حکموں میں وطی شرط ہے یعنی اگر خاوند نے وطی کی ہوگی تو ہی مہر واجب ہوگا۔ اور تو ہی عدت واجب۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ جب کسی مرد عورت نے نکاح فاسد کر لیا تو اولاً جب خاوند کو شریعت کے قانون سے معلوم ہو جائے کہ یہ نکاح فاسد ہوا ہے تو فوراً دو عاقل بالغ متقی مسلمانوں کو بطورِ گواہ بلا کر کہہ دے بلکہ تحریر کر دے کہ میں نے فلاں نکاح غلط کیا تھا اس کو چھوڑتا ہوں ثانیاً اگر وہ ایسا کرے تو مفتی اسلام یا قاضی وقت یا موجودہ دور کے عدالتی جج صاحب بذریعہ قانونِ شرعی تنسیخ نکاح کا فیصلہ کرا کے فوری خاوند بیوی کو علیحدہ کر دیا جائے۔ چنانچہ فتاوٰے جلد دوم ص۴۸۲ پر ہے:۔ بَلْ یَجِبُ عَلَی الْقَاضِیْ التَّفْرِیْقُ بَیْنَهُمَا۔ اَیْ اِنْ لَّمْ یَتَفَرَّقَا اَوْ مُتَارَکَةُ الزَّوْجِ۔ (ترجمہ):۔ اگر وہ دونوں میاں بیوی خود جدا نہ ہوں تو اسلامی جج پر واجب ہے کہ دونوں میں علیحدگی کر دے۔ یا خاوند خود بیوی کو گھر سے نکال دے یا خود نکل جائے۔ اس چوتھے حکم پر ہر صورت عمل کرنا واجب ہے۔ وطی ہوئی ہو یا نہ کیونکہ یہ تنسیخ و تفریق وطی سے روکنے کے لیے ہی تو کی جائے گی۔ بوجہ غلط نکاح۔ فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ص۴۸۴ پر ہے:۔ وَقَبْلَ الدُّخُوْلِ اَیْضًا لَا یَتَحَقَّقُ اِلَّا بِالْقَوْلِ۔ (ترجمہ):۔ نکاح فاسد میں متارکہ قولی یا تنسیخ ضروری ہے دخول یعنی وطی اگرچہ نہ ہوئی ہو۔ یا متارکہ یا قاضی کا فیصلہ اور مفتی اسلام کا فتوای شرعی و حتمی۔ قانوناً تنسیخ نکاح ہوگا اور اس کے بعد عدتِ مدخولہ شروع ہوگی جب تک کسی طرف سے تنسیخ نکاح نہ ہوگی۔ اور بحکم فیصلہ و فتوائے جدائی مابین عورت و مرد نہ ہوگی۔ اس وقت تک نہ وہ خاوند خود اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے نہ کوئی دوسرا شخص اس عورت سے نکاح کر سکے۔ لیکن تفریق کے بعد یہ خاوند تو اسی وقت اس سے صحیح نکاح کر سکتا ہے۔ خواہ یہ بیوی مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ عدت نہ ہوگی اور خاوند اس صحیح نکاح سے پوری تین طلاق کا مالک ہوگا۔ نکاح فاسد و صحیح میں یہ بھی فرق ہے کہ نکاح صحیح میں ایک طلاق دے کر خاوند جب پھر اسی بیوی سے نکاح یا رجوع کرے تو اب تین سے کم طلاق کا مالک ہوگا مگر نکاح فاسد سے تنسیخ یا متارکہ میں اگرچہ بیوی عدتِ طلاق گزارے گی مگر آئندہ اسی خاوند کے اسی بیوی سے صحیح

نکاح میں تعدادِ طلاق میں فرق نہ پڑے گا۔ اس لیے نکاح فاسد دراصل نکاح ہوتا ہی نہیں عدت تو فقط احتیاطاً واجب ہوتی ہے۔ بہرحال خاوند کے بسانے یں عدت واجب نہیں۔ لیکن اگر دوسرا شخص اس عورت سے نکاح کرنا چاہیے تو مدخولہ ہونے کی صورت میں بعد عدت کر سکتا ہے پہلے نہیں۔ فقہاء کرام کے اقوال مبارکہ کے مطابق۔ اگر نکاح فاسد کرنے والا خاوند قبل متارکہ فیصلہ شرعیہ سے پہلے مر گیا تب بھی صحیح یہ ہے کہ بیوی مدخولہ عدت طلاق گزارے گی۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ نکاح فاسد ہوا ہے۔ لہٰذا فتوئے شرعیہ کے بعد فوراً خاوند رو برو گواہان متارکہ کرے۔ اور بعدہ فوراً نیا مہر مقرر کر کے شریعت کے مطابق صحیح نکاح کرے۔ پہلا مہر اس لیے واجب نہیں کہ بیوی غیر مدخولہ ہے۔ جیسا کہ عبارت سوال سے واضح ہے۔ اگر خاوند بیوی خود ایسا نہ کریں تو وہاں کے سرکردہ لوگ فوراً دونوں کو علیحدہ کر کے صحیح نکاح کر دیں۔ لیکن اگر یہ خاوند اب خود آباد نہیں کرنا چاہتا تو متارکہ کر کے چھوڑ دے۔ بیوی اگر واقعی مدخولہ نہیں ہے تو جہاں چاہے آج ہی نکاح کرے۔ اور اگر مدخولہ ہے تو بعد عدت جہاں چاہے نکاح کرے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہٗ

ٹیلیفون پر نکاح کرنے کا بیان

سوال نمبر ۱۰۵: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ آج کل پاکستان کے بہت نوجوان لڑکے باہر علاقے میں یعنی بیرونی ممالک میں بسلسلہ ملازمت و مزدوری گئے ہوئے ہیں اُن کے باقی سب رشتہ دار پاکستان میں رہتے ہیں۔ وہ وہاں رہتے ہوئے بذریعے ٹیلیفون پاکستانی لڑکی سے نکاح کرتے ہیں باقاعدہ گھر پر مجلس بیٹھی ہے۔ لڑکے کو انگلینڈ۔ جرمن۔ یا جاپان۔ ٹیلیفون سے رابطہ قائم کر کے مطلع کر دیا جاتا ہے۔ وہ لڑکا ٹیلیفون کے پاس دو گواہ لے آتا ہے۔ ادھر بھی دو گواہ ہوتے ہیں اس طرح بہت سے لوگ نکاح کر رہے ہیں۔ پھر بیوی کا پاسپورٹ بنوا کر ویزا منگوا لیتے ہیں اور بیوی کو سوار کر کے بھیج دیتے ہیں۔ خاوند وہاں آباد کر لیتا ہے۔ فرمایا جائے کہ کیا قانونِ شریعت کے مطابق یہ نکاح درست ہے یا نہیں۔ اگر درست نہیں ہے تو کیوں اور کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے سابقہ اور آئندہ درست نکاح کیئے جائیں اتنی دور کے فاصلے میں لڑکا یہاں آ بھی نہیں سکتا۔ ایک نکاح صرف آپ کے فتوے کے انتظار میں رکا ہوا ہے۔ لہٰذا براہِ کرم جلدی فتوٰے بھیجا جائے۔

دستخط سائل

بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق عقدِ نکاح میں اتنی شرطیں اور اتنے رکن ہیں جن سے نکاح کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ تفکر و غور سے پتہ چلتا ہے کہ جتنی باریکیاں اور احتیاطیں نماز میں ہیں تقریباً اتنی ہی عقدِ نکاح میں ہیں اگر حدیثِ پاک نے نماز کے لیے فرمایا۔ اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ۔ (ترجمہ) نماز دین کا ستون ہے تو نکاح کے لیے بھی ارشادِ نبوی ہے :۔ اَلنِّکَاحُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ۔ (ترجمہ) نکاح آدھا ایمان ہے۔ فقہاءِ کرام نے جہاں بیانِ نماز کے لیے دراز باب باندھے ہیں وہاں ہی قریب قریب نکاح کے لیے بھی وسیع باب بناکر بڑے اہتمام سے نکاح کے احکام بیان کیے ہیں آخر کیوں؟ وجہ ظاہر ہے کہ اگر نماز خالصتاً حقوق اللہ ہے تو نکاح خالص حقوق العباد ہے۔ نماز کا تعلق روحِ انسانی سے ہے۔ تو نکاح کا تعلق نسلِ انسانی۔ نماز بگڑے تو روح بگڑے نکاح بگڑے تو ساری نسلِ انسانی بگڑنے یہی وجہ ہے کہ زنا کی حد رجم انسانی ہے۔ اس بنا پر قانون سازِ اسلام جلّ مجدہٗ نے کمال قدرت و احتیاط سے نکاح کے کار ہوسے اور قواعد و ضوابط مرحمت فرمائے اسی کے کلام پاک کے اشاروں کن یوں اقتضاؤں سے فقہاءِ ملت نے نکاح کے ارکان و شرائط سمجھائے ان شرائط و ضوابط کو دیکھتے ہوئے یہ شرعی قانونی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ کہ موجودہ وقت میں جو طریقہ اور کیفیت ٹیلیفون کے استعمال کی عموماً رائج ہے اس طریقہ سے ٹیلیفون پر نکاح کرنا اوّلاً تو باطل ہی قرار دیا جائے۔ ورنہ کم از کم فاسد تو یقیناً وحتماً ہے اس لیے فتوائے شرعی جاری کیا جاتا ہے کہ ہرگز ہرگز ٹیلیفون پر کسی لڑکے لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے۔ کیونکہ قانونِ شرعی کے لحاظ سے۔ نکاح میں سب سے زیادہ ضروری فرض ایجاب و قبول ہے۔ اور نکاح کی بارہ شرطوں میں تین اہم شرطیں ہیں۔ پہلی شرطیں ایجاب و قبول دو طرفہ سمجھنا یعنی خاوند یا اس کا وکیل بیوی یا اس کے وکیل کی پوری بات سمجھے اور پہچانے کہ واقعی یہ کون کہہ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اسی طرح دوسری طرف کے فریق بھی سمجھیں اور سنیں۔ چنانچہ فتاوے عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۶۷ پر ہے :۔ وَمِنْهَا سِمَاعُ كُلٍّ مِنَ الْعَاقِدَيْنِ كَلَامَ صَاحِبِهٖ (ترجمہ) :۔ اور نکاح کی شرط یہ ہے کہ خاوند بیوی یا ان کے وکیل دو طرفہ ایک دوسرے کا ایجاب و قبول صاف صاف سنیں۔ دوسری شرط۔ دو عاقل بالغ مسلمان مردوں کا بطور گواہ مجلس نکاح میں ایک ساتھ موجود ہونا۔ چنانچہ ترمذی شریف صفحہ نمبر ۱۳۱ پر ہے :۔ لَا يَجُوْزُ النِّكَاحُ حَتّٰى يَشْهَدَ الشَّاهِدَانِ مَعًا عِنْدَ عَقْدَةِ النِّكَاحِ :۔ (ترجمہ) :۔ جب تک دو گواہ ایک ساتھ مجلس نکاح میں موجود نہ ہوں اس وقت تک نکاح جائز ہی نہ ہوگا۔ تیسری شرط دونوں گواہ ایک ساتھ خاوند کا بھی کلام سنیں اور بیوی کا بھی کلام سنیں۔ یعنی دو طرفہ ایک ساتھ ایجاب و قبول سنیں چنانچہ فتاوے قاضی خان جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۳۲ پر ہے :۔ وَلَا يَصِحُّ النِّكَاحُ مَا لَمْ يَسْمَعْ كُلٌّ

وَاحِدٍ مِّنَ الْعَاقِدَيْنِ كَلَامَ صَاحِبِهٖ وَيَسْمَعُ الشَّاهِدُ اِنْ كَلَامَهُمَا مَعًا فَاِنْ سَمِعَ اَحَدُ الشَّاهِدَيْنِ كَلَامَهُمَا وَلَمْ يَسْمَعِ الشَّاهِدُ الْاٰخَرُ لَا يَجُوْزُ۔ (ترجمہ) نکاح قطعاً صحیح نہیں ہوتا جب تک کہ دونوں خاوند بیوی یا ان کے وکیل ایک دوسرے کا ایجاب وقبول خود نہ سنیں۔ اور دونوں گواہ بھی ایک ساتھ ایجاب وقبول خود سنیں۔ پس اگر ایک گواہ نے ایجاب وقبول سن لیا اور دوسرے نے نہ سنا تو بھی نکاح جائز نہ ہوگا۔ فتاویٰ بحر الرائق جلد ہفتم صفحہ نمبر ۵۶ پر ہے:۔ وفی الملتقط اِذَا سَمِعَ صَوْتَ الْمَرْأَةِ وَلَمْ يَرَىٰ شَخْصَهَا فَشَهِدَ اثْنَانِ عِنْدَهٗ اَنَّهَا فُلَانَةٌ لَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْهَا (ترجمہ) ترجمہ وہی ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔ وہ انتہائی ضروری شرطیں جنہوں نے عقد نکاح کو نازک تر بنا دیا۔ ٹیلیفون میں یہ شرائط نہیں پائے جا سکتے۔ اوّلاً تو مروجہ ٹیلیفون میں اتنے فاصلے سے فضائی کثافتوں سے برقی لہروں میں اتنا تغیر پیدا ہوتا ہے کہ خود اپنے قریبی لواحقین کی آواز نہ صاف سمجھ آتی ہے نہ شناخت مکمل ہو سکتی ہے۔ بلکہ کئی بار پوچھنا پڑتا ہے کہ ہیلو تم کون بول رہے ہو۔ اگر صاف سمجھ آ بھی جائے۔ تو پس پردہ کئی لوگوں کی آواز ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ ان وجوہ سے ایجاب وقبول ہی مشکوک ہو گیا اور مشکوک چیز کالعدم ہے ثانیاً یہ معلوم نہیں ہو سکتا ہے کہ خاوند کے قریب کون گواہ کتنے گواہ ہیں۔ لہٰذا دو طرفہ شکوک شبہات سے بڑے فریب اور دھوکے کا حتمی اندیشہ ہے۔ ثالثاً گواہوں کو نہیں معلوم کے ایجاب کیا ہوا اور کس طرح ہوا۔ خاوند نے اتنی دور سے کیا کہا خاوند کون ہے۔ شکل وحلیہ کیا ہے۔ رابعاً اگر والی وارث کے سننے کے بعد گواہوں نے بھی ٹیلیفون کا رسیور کان سے لگایا اور یکے بعد دیگرے دونوں گواہوں نے خاوند کا بیان سن بھی لیا۔ تب بھی دو خرابیاں لازم ہیں ۔ع۱ گواہ کو کیا معلوم کہ خاوند نے یہی بیان پہلے نکاح خواں کو دیا ہے یا کچھ تبدیل کر دیا۔ ع۲ گواہ بوجہ اجنبی ہونے کے آواز پہچاننے میں زیادہ مشکوک ہے۔ ع۳ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ایک دم دونوں گواہ بیان سنیں۔ مگر ٹیلیفون پر ایک دم نہیں سن سکتے۔ لہٰذا ان سخت ترین خرابیوں کی بنا پر گواہی مکمل نہ ہو سکے گی۔ اور جب گواہی کی شرط نہ ہوئی تو نکاح فاسد ہوا۔ اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ خبردار ٹیلیفون پر نکاح کر کے شرعی اور اخلاقی اور معیوب غلطی نہ کی جائے۔ کیونکہ معاشرہ اور آئندہ نسلیں خراب ہونے کا عظیم خطرہ ہے۔ البتہ اگر برقی مشین لگائی جائے جس سے خاوند کی آواز یک وقت سب سن سکیں علیحدہ علیحدہ رسیور نہ پکڑنا پڑے تب نکاح شرعاً صحیح ہوگا۔ کیونکہ گواہوں کا صرف ایجاب وقبول سننا شرط ہے۔ دیکھنا شرط نہیں یہی وجہ ہے کہ اندھا آدمی بھی گواہِ نکاح بن سکتا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۶۷) سنا گیا ہے کہ بعض بڑے ممالک میں ایسے ٹیلیفون بھی ایجاد ہو چکے ہیں۔ جن میں بولنے والے کی تصویر مثل ٹیلیویژن سننے والے کے سامنے فوراً نمودار ہو جاتی ہے۔ اگر اس طرح دونوں سہولتیں حاصل ہو جائیں تب ٹیلیفون پر نکاح میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ لیکن اگر یہ ہر دو آواز بلندی اور تصویر کی سہولتیں حاصل نہ ہو سکیں۔ اور مروجہ ٹیلیفون ہی میسر ہو تو

نکاح ہرگز جائز نہیں بلکہ اس دوری میں بہتر یہ ہے کہ خاوند بذریعہ خط اپنے کسی بہت جان پہچان والے شخص کو اپنا وکیل مقرر کرے وہ وکیل اس کی تحریر اس کے دستخط بخوبی پہچانتا ہو۔ اس خط کی اجازت پر وہ وکیل بیوی اور اس کے لواحقین اور دو معتبر گواہوں کی موجودگی میں کہے کہ یہ تحریر فلاں بن فلاں کی ہے میں اس کو اس کی تحریر اس کے دستخط کو بخوبی پہچانتا ہوں۔ اس نے مجھ کو فلاں بنت فلاں بنت سے نکاح کے لیے اپنا وکیل اختیار کیا ہے۔ پھر بیوی اس کو قبول کرے گواہ دونوں کی بات بخوبی سنیں اور سمجھیں تب یہ نکاح شرعًا درست ہوگا۔ یہ اہتمام اس لیے ہے کہ شریعت پاک نے ہر چیز کو بہت اصول و ضوابط سے مرتب فرمایا ہے۔ یہ اسلامی نکاح ہے۔ اس پر معاشرے کی بنیاد ہے۔ اور پھر یہ دین اسلام ہے۔ کوئی یہودیت یا عیسائیت نہیں کہ جہاں ہر چیز بے اصولی ہو۔ اور انسان جس طرح چاہے من مانی کرتا پھرے۔ اسلام میں کسی بھی شخص کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تو شریعت کی لائن پر چلنا ہی پڑے گا۔ اور قرآن و حدیث و فقہ کا دامن پکڑنا ہی پڑے گا۔

وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کتاب الطلاق

خاوند اپنے سسر سے کہے کہ اپنی لڑکی یعنی میری بیوی کو سنبھالو یہ میری بیوی نہیں ماں بہن ہے اس کا حکم

سوال ۵۲ :- (نقل مطابق اصل نمبر ۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ میں مسمات حمیدہ بیگم دختر قائم علی قوم کشمیری ساکن پھیرا تحصیل کھاریاں ضلع گجرات کی ہوں۔ میرا نکاح آج سے تقریبًا چھ سال پیشتر مسمی بہاول حسین ولد احمد علی قوم کشمیری ساکن پھیرا ضلع گجرات سے میرے والد نے کیا تھا۔ اس چھ سال کے عرصے میں کسی دن بھی محبت سے گزارا نہیں ہوا۔ اکثر لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ آج سے تقریبًا پانچ مہینے پہلے میں اپنے خاوند کے گھر گئی تو حسب سابق جھگڑا شروع ہو گیا۔ اور جھگڑے نے اتنا طول اختیار کیا کہ وہ میرا خاوند مجھ کو لے کر میرے میکے میں آ گیا اور میرے گھر کے قریب گاؤں کے ایک دائرے میں جہاں پر گاؤں کے اکثر لوگ بیٹھے ہوئے تھے، مجھ کو بھی وہاں بٹھا دیا۔ اس محفل میں والد بھی تھے اور میری بڑی ہمشیرہ آمنہ بی بی

تھی۔ اور ان کے علاوہ تقریباً گاؤں کے پچیس لوگ جمع تھے۔ اُن سب کے سامنے بآوازِ بلند میرے خاوند بہاول حسین نے میرے والد کی طرف دیکھ کر کہا کہ لو اپنی لڑکی سنبھالو۔ یہ میری بیوی نہیں آج سے یہ مجھ پر حرام ہے۔ یہ میری ماں بہن ہے اس آواز کو سن کر ہم سب لوگ حیران ہوگئے اور گاؤں کے بزرگ لوگوں نے ان کو سمجھانا شروع کیا مگر وہ یہی کہتا رہا میں اس کو ہرگز نہیں رکھوں گا۔ جس کو مرضی ہے اپنی لڑکی حمیدہ بیگم دے دو۔ اس کے بعد لوگوں میں بہت شور پڑ گیا۔ میں نے اور میری بہن اور دیگر موجود عورتوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ سب لوگ اس واقعہ کے عینی گواہ ہیں۔

چار گواہ حاضرِ خدمت ہیں جو باوضو کلمہ پڑھ کر اس بیان کی سچائی پر حلفیہ گواہی دیتے ہیں۔ فرمایا جائے کہ شریعت کے لحاظ سے مجھ پر طلاق ہوئی یا نہیں۔ اور میں دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہوں یا نہیں۔ میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ ہاں البتہ اس خاوند کے پاس میں چھ سال آباد رہی۔ مجھے شریعت کا فتویٰ عطا فرمایا جائے۔

نشان انگوٹھا سائلہ حمیدہ بیگم ۱۴ ۹/۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق سوال مذکورہ میں مدعا علیہ مسمٰی بہاول حسین ولد احمد علی کی طرف سے اس کی بیوی مدعیہ سائلہ حمیدہ بیگم بنت قائم علی کو ایک طلاق بائنہ پڑ چکی ہے کیونکہ خاوند کا اپنی مذکورہ فی السوال بیوی کو یہ کہنا کہ یہ میری بیوی نہیں اور یہ مجھ پر حرام ہے۔ ان دونوں لفظوں سے شریعت کے لحاظ سے ایک طلاق بائنہ واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد دوم صـ۶۱ پر ہے کہ کسی خاوند کا اپنی بیوی کے لئے مندرجہ بالا الفاظ بولنا طلاق بائنہ واقع کر دیتے ہیں۔ اور ان الفاظ سے طلاق بائنہ پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ثُمَّ ذَكَرَ اِخْتِيَارَ الْمَشَايِخِ الْمُتَاَخِّرِيْنَ اَنَّهٗ تَبِيْنُ اِمْرَاَتُهٗ بِلَا نِيَّةٍ وَالْفَتْوٰى عَلٰى قَوْلِ مُتَاَخِّرِيْنَ بِانْصِرَافِهٖ اِلَى الطَّلَاقِ الْبَائِنِ عَامًّا كَانَ اَوْ خَاصًّا ... اس عبارتِ فقہ سے ثابت ہوا کہ خاوند کے ان الفاظ سے طلاق بائن ہوئی۔ اس طرح فتاویٰ درمختار جلد دوم میں ہے۔ قَالَ لِامْرَاَتِهٖ اَنْتِ عَلَيَّ حَرَامٌ۔ تَطْلِيْقَةٌ بَائِنَةٌ۔ اِنْ نَوَى الطَّلَاقَ وَثَلَاثٌ اِنْ نَوَاهَا وَيُفْتٰى بِاَنَّهٗ طَلَاقٌ بَائِنٌ وَاِنْ لَّمْ يَنْوِهٖ۔ لِغَلَبَةِ الْعُرْفِ اور اسی طرح فتح القدیر جلد دوم میں ہے۔ بَلِ الصَّوَابُ حَمْلُهٗ عَلَى الطَّلَاقِ لِاَنَّهُ الْعُرْفُ الْحَادِثُ الْمُفْتٰى بِهٖ وَهٰذَا هُوَ الصَّوَابُ عَلٰى مَا عَلَيْهِ الْعَمَلُ وَالْفَتْوٰى یعنی چونکہ ہر خاوند جب یہ الفاظ بولتا ہے تو اس سے مراد طلاق ہی لیتا ہے۔ عرفِ عام کی وجہ سے طلاق واقع ہو گئی ہے۔ لہٰذا فتویٰ شرعی کی رو سے سائلہ حمیدہ بیگم کو طلاقِ بائنہ واقع ہو گئی۔ کیونکہ الفاظ غیر صریح سے طلاقِ بائنہ واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خاوند کے دوسرے الفاظ کہ یہ میری بیوی نہیں۔ اس سے بھی طلاق بائنہ واقع ہو جاتی ہے۔
چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد اوّل صـ۳۷۵ پر ہے:

وَلَوْ قَالَ لِامْرَأَتِهٖ لَسْتِ لِيْ بِامْرَأَةٍ وَقَالَ نَوَيْتُ الطَّلَاقَ يَصِحُّ الطَّلَاقُ فِيْ قَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ ۔

پس شرعی فتویٰ جاری کیا جاتا ہے کہ حمیدہ بیگم سابقہ نکاح سے بالکل آزاد ہے۔ اور مدت طلاق سے یہ بات بھی واضح ہے کہ عدت گزر گئی۔ لہٰذا آج ہی جہاں چاہے نکاح شرعی کرسکتی ہے

کتب

ایک طلاق کی خبر دینے کا بیان

سوال ۵۳ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ میں نے اپنی بیوی کو لڑائی کے دوران سخت غصہ کے ساتھ چند عورتوں کی موجودگی میں یہ کہا کہ میں نے تجھے طلاق دے دی ہے۔ اور قانونی طلاق کل بذریعہ ڈاک بھیج دوں گا۔ اس کے بعد میرے منہ سے نکل گیا کہ اگر میں تجھ کو اب رکھوں تو ماں بہن کی طرح رکھوں گا اس کے علاوہ میں نے کچھ نہیں کہا۔ اس سے پہلے میں نے کئی مرتبہ کہا کہ میں تجھ کو طلاق دے دوں گا۔

فرمایا جائے کہ اب میں اپنی بیوی بطور بیوی آباد رکھ سکتا ہوں یا نہیں؛ کیا کچھ کفارہ تو واجب نہیں؛ شریعت مطہرہ کا فتویٰ جاری فرمایا جائے اور فرمایا جائے کہ کونسی طلاق پڑی ہے۔

فقط والسلام سائل، محمد اعظم، ضلع سیالکوٹ

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

سوال مذکورہ میں۔ میں نے بحیثیت مفتی ءِ اسلام ہونے کے بقدر ضرورت و استطاعت مذکورہ واقعات کی تفتیش و تحقیق کی موقع کے تین گواہ بھی حاضر ہوئے اور حلفیہ بیان سے اس واقع کی تائید کی۔ میں نے پوری پوری تحقیق کے بعد یہ فتویٰ جاری کیا ہے۔ چونکہ ثابت ہوگیا ہے کہ سوال بعینہٖ بالکل درست ہے۔ لہٰذا اسلامی قانون کے مطابق محمد اعظم کی طرف سے اس کی بیوی کو ایک طلاق رجعی واقع ہوچکی ہے کیونکہ مذکورہ فی السوال الفاظ ایک صریح طلاق کو ثابت کرتے ہیں اور ایک صریح طلاق بلاشدت و بلاقید عند الفقہاء طلاق رجعی ہی واقعہ ہوتی ہے چنانچہ عالمگیری جلد اول صفحہ ۳۵۴ پر ہے اِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِامْرَأَتِهٖ طَلَّقْتُكِ تَقَعُ وَاحِدَةٌ رَجْعِيَّةٌ۔ هٰكَذَا فِي الْهِدَايَةِ صفحہ ۵۵ اَلْمُجَلَّدُ الثَّانِيَةُ۔ اور طلاق رجعی میں خاوند کو شریعت مطہرہ کی طرف سے حق ملتا ہے کہ وہ عدت کے اندر اندر اس طلاق سے رجوع کرے۔ کیونکہ سائل کے بیان اور گواہوں کی گواہی سے ثابت ہوچکا ہے کہ یہ واقعہ آج سے آٹھ دن قبل کا ہے۔ لہٰذا ابھی عدت باقی ہے۔ اور شرعاً رجوع ہوسکتا ہے۔ رجوع کے بعد مذکورہ مطلقہ حسب سابق محمد اسلم کی بیوی ہوگی۔ محمد اعظم کے وہ الفاظ جو اس طرح اس نے ادا کیے "میں تجھے طلاق دے دوں

گا" یہ لغو و بیکار ہیں۔ طلاق رجعی کے بعد محمد اعظم کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ "اگر میں تجھ کو اب رکھوں گا تو ماں بہن کی طرح رکھوں گا" اِن الفاظ سے قانونِ شریعت کے مطابق ظہار ثابت ہوگیا اگرچہ قبل ازیں طلاقِ رجعی بھی واقع ہو چکی ہے۔ کیونکہ شریعت کے قانون کے مطابق۔ رجعی طلاق دینے کے بعد بھی عدت کے اندر اندر ظہار واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ سراجیہ جلد دوم اور فتاویٰ ہندیہ جلد اول ص۵۰۸ پر ہے۔ لَوْ طَلَّقَ الرَّجُلُ اِمْرَأَتَهٗ طَلَاقًا رَجْعِيًّا ثُمَّ ظَاهَرَ مِنْهَا فِيْ عِدَّتِهَا صَحَّ ظِهَارُهٗ۔ چونکہ ظہار عدت کے اندر ہے اس لئے صحیح ہے۔

اگرچہ محمد اعظم نے اپنے اس ظہار میں زمانہ مستقبل کا ذکر کیا ہے۔ اس کو شریعت میں ظہار تعلیقی کہتے ہیں۔ اور اس کا حکم بھی جاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ بحرالرائق اور فتاویٰ بدائع و ہندیہ ص۵۰۹ میں ہے۔ وَيَصِحُّ ظِهَارُ ذَوْجَتِهٖ تَعْلِيْقًا

پس ثابت ہوا کہ محمد اعظم کی طرف سے اس کی مذکورہ بیوی پر طلاق رجعی بھی واقع ہوئی اور ظہار بھی۔ مگر ظہار کا حکم ابھی جاری نہ ہوگا بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے محمد اعظم دو گواہوں کی موجودگی میں اپنی طلاق سے رجوع کرے۔ اور یہ الفاظ کہے کہ میں اپنی طلاق رجعی سے جو فلاں تاریخ کو دی تھی اور ابھی عدت باقی ہے۔ رجوع کرتا ہوں اور اپنی بیوی فلاں بنت فلاں کو پھر بطور بیوی آباد کرتا ہوں۔ اِن الفاظ کے کہتے ہی ظہار کا حکم جاری ہو جائے گا۔ پھر وطی کرنے سے پہلے پہلے محمد اعظم کفارۂ شرعی ظہار کا ادا کرے۔ جب تک ظہار کا کفارہ پورا ادا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک محمد اعظم اپنی اس بیوی کے نزدیک نہیں جا سکتا۔ ظہار کا کفارہ موجودہ زمانے میں دو طریقے سے ادا ہو سکتا ہے۔ اولاً یا تو ساٹھ روزے رکھے۔ لیکن جب روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ارشاد ہے۔ اِذَا لَمْ يَسْتَطِعِ الْمُظَاهِرُ الصِّيَامَ اَطْعَمَ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۔۔۔۔ اور ہر مسکین کو سوا دو سیر خوراک دے چنانچہ فقہاءِ اسلام فرماتے ہیں وَيُطْعِمُ كُلَّ مِسْكِيْنٍ نِصْفَ صَاعٍ مِّنْ بُرٍّ هٰكَذَا فِى الْعَالَمْكِيْرِى عَلٰى صَحِيْفَةٍ ۵۱۳ یہ روٹی صرف مسکینوں کو کھلائی جائے۔ کوئی امیر یا برادری کا آدمی نہ ہو۔ ان تمام کاموں کے بعد محمد اعظم اپنی اس مطلقہ بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم رکھ سکتا ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

نابالغ خاوند سے طلاق لینے کا بیان

سوال ۱۸۵ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ میں کہ شیر محمد ولد حق نواز کا نکاح اس کے والد نے کسی لڑکی سے پڑھایا۔ جب کہ دونوں نابالغ تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد شیر محمد کا والد فوت ہو گیا۔ اب لڑکی بالغہ ہے۔ اور لڑکا ابھی تک نابالغ ہے۔ اب لڑکے کا دادا چاہتا ہے۔ کہ لڑکا شیر محمد اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ یا دادا خود اپنے پوتے کی طرف سے

اس کی بالغہ بیوی کو طلاق دے دے فرمایا جائے۔ کہ کیا نابالغ خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے یا نہیں؟ کیا دادا کی طلاق پوتے کی بیوی پر واقع ہو گی یا نہیں؟ السائل :۔ مولوی نصیر الدین!

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؎

الجواب

قانونِ شریعت کی رو سے نابالغ لڑکا اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ کیونکہ شریعت مطہرہ نے طلاق دینے والے کے لئے چند شرطیں مقرر فرمائی ہیں۔ اُن میں سے ایک خاوند کا بالغ ہونا بھی ہے۔ چنانچہ عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۵۳ پر ہے:۔

يَقَعُ طَلَاقُ كُلِّ زَوْجٍ اِذَا كَانَ بَالِغًا عَاقِلًا سَوَاءٌ كَانَ حُرًّا اَوْعَبْدًا طَائِعًا اَوْ مُكْرَهًا:۔

ترجمہ:۔ ہر اس خاوند کی طلاق بیوی پر واقع ہوتی ہے: (۱) جو بالغ ہو۔ (۲) سمجھ دار ہو۔ (۳) آزاد ہو یا غلام، چاہے خوشی سے دے یا ناخوشی سے اور طلاق میں یہ شرط ہے۔ کہ خود خاوند ہی اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے دوسرا کوئی شخص بھی خاوند کی مرضی کے بغیر طلاق نہیں دے سکتا۔ لہٰذا صورت مذکورہ کے تحت دادا اپنے پوتے کی بالغہ بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ اور اگر یہ نابالغ خاوند اپنے دادا کو طلاق کی اجازت بھی دے دے اور دادا اس کی اجازت نامہ پر اس کی بیوی کو طلاق دے دے تو بھی طلاق نہ ہو گی۔ کیونکہ جب خاوند خود طلاق نہیں دے سکتا۔ تو تفویض طلاق کا بھی مستحق نہیں۔ اور البتہ اس مندرجہ بالا صورت میں اس بالغہ بیوی کو فسخ نکاح کا اختیار مل سکتا ہے۔ جب کہ یہ نکاح لڑکی کے دادا اور والد کی غیر موجودگی میں پڑھایا گیا ہو۔ بشرطیکہ لڑکی نے بالغہ ہوتے ہی اس نکاح سے نفرت کا اظہار کیا ہو۔ اگر بالغہ اپنے نکاح کا سن کر باخوشی خاموش رہی۔ پھر بعد میں نکاح مذکورہ سے متنفر اور منکرہ ہوئی ہو۔ تو معتبر نہیں؟ سوال مذکورہ ناقص ہے۔ کیونکہ پتہ نہیں۔ کہ بوقتِ نکاح والدِ صغیرہ کہاں تھا؟ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

اپنی بیوی کو پہلے طلاقاً کہہ کر پھر طلاق سے انکار کرنے کا بیان

سوال ۵۵ کیا فرماتے ہیں۔ علماے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو کہا۔ او طلاقاً بچے کو سنبھال پھر تھوڑے دنوں کے بعد اس نے انکار کر دیا۔ کہ میں نے کوئی طلاق نہیں دی۔ اور اپنی بیوی کے ساتھ آباد ہو گیا۔ مگر بعد میں لوگوں نے شور مچایا۔ اس کے بھائی نے بھی کہا۔ کہ طلاق ہو گئی ہے۔ مگر اس نے پھر انکار کیا۔ جب بھائی نے زیادہ زور دیا۔ تو اس نے غصے میں آکر کہا۔ کہ طلاق ہو گئی ہے تو ہونے دو طلاق طلاق۔ ہم نے اس کے متعلق پہلے ایک جگہ سے فتویٰ منگایا اس کا جواب آیا۔ کہ طلاق ایک ہی ہوئی ہے پھر کسی شخص نے کہیں اور سے فتویٰ منگایا۔ تو جواب آیا کہ تین طلاقیں ہو گئی ہیں

پہلی طلاق میں اضافت لفظی ہے۔ اور دوسری دو طلاقوں میں اضافت لفظی نہیں۔ بلکہ اضافت معنوی ہے۔ اور شرعی طور پر طلاق جس طرح اضافت لفظی سے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اضافت معنوی سے بھی ان دو فتوی کی وجہ سے ہماری بستی میں بہت انتشار پڑا ہے۔ دو پارٹیاں بن چکی ہیں۔ دونوں پارٹیوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے۔ کہ پاکستان گجرات سے حضرت حکیم الامت جو فتویٰ ارشاد فرمائیں۔ وہ ہمیں تسلیم ہے۔ لہذا براہ کرم شرعی فتویٰ صادر فرمایا جائے۔

سائیل۔ عبدالغفور نئی دہلی ہندوستان ۶/۱۰

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ ؕ

الجواب

گرامی نامہ تشریف لایا۔ حضرت حکیم الامت آج کل پارۂ چہارم کی تصنیف میں مشغول ہیں۔ اور فتویٰ کا کام حضرت نے میرے سپرد کیا ہے۔ اس لیئے یہ فتویٰ میرے قلم سے لکھا ہے۔ انشاء اللہ اس میں کوئی شرعی غلطی نہیں ہو گی۔ فتویٰ اپنے مقام پر بالکل درست ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ؕ

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ ؕ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق اس وقت مذکورہ فی السوال بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہے۔ اور خاوند مذکور کا اپنی بیوی کو آباد رکھنا شرعًا بالکل درست ہے۔ دونوں فتووں میں پہلا فتویٰ درست ہے۔ طلاق صرف ایک واقع ہوئی تھی۔ جس کا درجہ شریعت میں طلاق رجعی تھا۔ اس طلاق کے بعد خاوند کا اپنی بیوی کو آباد کرنا عملی طور پر طلاق سے رجوع ہے جو عدت کے اندر شرعی طور پر درست ہوا۔ اور طلاق ختم ہو گئی۔ دوسرے موقع پر اُس کا طلاق طلاق کہنا اظہار غضب اور انکار کے لیئے ہے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی گزشتہ طلاق کا انکار کر رہا ہے۔ جب سامنے والا طلاق ہونے پر زور دے رہا ہے۔ تو یہ اُس کی تردید میں کہہ رہا ہے۔ عرف عام میں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم کیا طلاق طلاق کہے جا رہے ہو جیسے کوئی شخص کسی سے کہے۔ کہ کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ وہ کہے نہیں۔ اور نہیں کے لفظ کے بعد کہے طلاق طلاق تو یہ تردید کلام کے لیئے ہے نہ کہ ایقاع طلاق کے لیئے اور جیسے کوئی غصے میں کہہ دے۔ کہ کیا طلاق طلاق بکے جا رہے ہو۔ لہٰذا سوال مذکورہ میں صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوئی۔ جس سے اُس نے رجوع بھی کر لیا۔ دوسرا فتویٰ غلط ہے کیونکہ طلاق یا واقع ہوتی ہے اضافت لفظی سے یا اضافت معنوی سے خاوند مذکور کے دوسری دفعہ طلاق طلاق کے الفاظ میں نہ اضافت لفظی ہے نہ معنوی کیونکہ اضافتِ معنوی کا تعلق خاوند کی نیت سے ہے۔ جس کا وہ دوسرے سے ہی منکر ہے پس بستی کے جھگڑے کو ختم کیا جائے اور خاوند اور بیوی کو آباد رہنے دیا جائے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

گمشدہ خاوند کی بیوی کے تنسیخ نکاح کا بیان

سوال ۵۶: کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میری چھوٹی بہن کریم بی بی کا نکاح اس کے والد نے اس کے نابالغی کے زمانے میں جب کہ وہ آٹھ سال کی تھی۔ ایک لڑکے شیر محمد بعمر گیارہ سال سے کر دیا۔ اور برادری کے رواج کے مطابق اسی وقت رخصت بھی کر دیا۔ صرف ایک رات کے لئے۔ اس وقت لڑکا اور لڑکی دونوں نابالغ تھے۔ پھر وہ کریم بی بی اپنے خاوند مذکور کے سامنے بھی نہ آئی۔ لڑکا جب کہ اٹھارہ سال کا ہوا۔ تو گھر سے لڑ جھگڑ کر بھاگ گیا۔ اب میری بہن پچیس [۲۵] سال کی جوان ہے۔ ہم نے اس کے خاوند کو بہت تلاش کیا۔ ریڈیو پر بھی اعلان کیا۔ اخباروں میں بھی شائع کرایا۔ جہاں جہاں شبہ ہوتا رہا۔ خود وہاں جا کر تلاش کرتے رہے۔ شیر محمد خاوند کو گم ہوئے تقریباً دس سال گزر گئے ہیں۔ اور ہم کو تلاش کرتے ہوئے پورے چھ سال ہو گئے۔ ریڈیو اعلان کی رسیدیں اور وہ اخبارات جن میں بار بار ہم نے اعلان و اشتہارات گمشدگی شائع کرائے۔ ان اخباروں میں خاوند مذکور شیر محمد کا فوٹو بھی شائع کرایا گیا۔ اب ہم نے عدالت میں مقدمہ کر کے فسخ نکاح کا ارادہ کیا ہے۔ وکیلوں نے ہم کو مشورہ دیا ہے۔ کہ پہلے گجرات کے مفتی صاحب سے شرعی فتویٰ حاصل کر لو۔ تاکہ جلد فیصلہ ہو جائے۔ اور عدالت کی زیادہ تاریخیں نہ پڑیں۔ تم کو سہولت رہے گی۔ لہٰذا ہم وہ رسیدیں اور اخبارات اور پانچ گواہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ یہ گواہ حلفیہ بیان دیتے ہیں۔ کہ ہمارا بیان بالکل درست اور سچا ہے شیر محمد کریم بی بی کا نابالغی سے خاوند ہے۔ اور عرصہ سات سال سے لاپتہ ہے۔ اس کے والدین بھی اس کے لئے اب تک غم زدہ ہیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ شیر محمد کہاں ہے۔ ہم کو شرعی فتویٰ عطا فرمایا جائے۔ اور نکاح فسخ کر کے ہمیں اجازت دی جائے۔ تاکہ ہم کریم بی بی کا کہیں اور نکاح کر دیں۔ اس لئے کہ کریم بی بی اب جوان ہے۔ اور والدین بہت ہی غریب ہیں۔ خرچے کی تنگی کے علاوہ عزت و ناموس اور لوگوں کی باتوں کا زیادہ فکر لگا رہتا ہے۔ اپنے پڑوسیوں میں دشمنی بہت زیادہ ہے۔ زمانہ بہت خطرناک ہے لہٰذا قرآن و حدیث شریف کے مطابق ہماری جان چھڑائی جائے۔ واللہ ورسولہٗ اعلم۔

السائل: محمد نذیر کنجاہ روڈ وارڈ بلاشاہ۔ ضلع گجرات مورخہ ۱۲/۱/۱۹۷۲

بعون العلام الوھاب

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق صورتِ مسئولہ میں بحیثیت مفتیٔ اسلام ہونے کے میں نے بہت تحقیق و تفتیش کی ہے۔ وہ تمام رسیدات و اخبارات بھی نظر سے گزرے۔ جن میں اشتہارات گمشدہ کا ثبوت تھا۔ فوٹو بھی بمطابق حلفیہ بیان گواہان درست ثابت ہوئے۔ فریقِ ثانی یعنی لڑکے شیر محمد کے والدین کو بھی بلایا۔ انہوں نے بھی اپنے گمشدہ بیٹے اور اس کی مجبور

زندگی پر تاسف کا اظہار کیا۔ اور مدعی کے بیان کی تائید کی۔ استفسار اور تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ گم شدہ کی ذاتی جائیداد بھی نہیں جس کی بنیاد پر بیوی اپنے نان نفقے کی کفالت کر سکے۔ ان وجوہ کی بنا پر قانونِ شرعی کے مطابق فیصلہ تنسیخ نکاح صادر کیا جاتا ہے۔ مَیں مسلکِ حنفی کے مفتی ہونے کی حیثیت سے مذہب حنبلی اور مالکی کے مطابق یہ فیصلہ کر رہا ہوں اس لیے کہ جس طرح امام مالک و امام شافعی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہم اجمعین اپنے مقلدین کو بوقتِ ضرورت اجازت فرماتے ہیں کہ بوقتِ حاجتِ شدیدہ مسلکِ غیر پر فتوٰی جاری کر سکتے ہیں۔ چنانچہ فتاوٰی شامی علٰی مذہب حنفیہ جلد اوّل صفحہ نمبر ۴۶ پر ہے وَاِنَّہٗ یَجُوْزُ لَہُ الْعَمَلُ بِمَا یُخَالِفُ کَمَا عَمِلَہٗ عَلٰی مَذْھَبِہٖ مُقَلِّدًا فِیْہٖ غَیْرَ اِمَامِہٖ مُسْتَجْمِعًا شُرُوْطَہٗ (ترجمہ)۔ اور بے شک جائز ہے حنفی مفتی کے لیے بوقتِ ضرورت اپنے امام کے علاوہ قانون پر جیسے کہ مقلد اپنے امام کے مسلک پر عمل کرتا ہے۔ بشرطیکہ دوسرے امام کی بیان کردہ تمام شرائط کے ماتحت فیصلہ یا فتوٰی ہو۔ اور درِّ منتقٰی میں علامہ قہستانی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ فرماتے ہیں: لَوْ اَفْتٰی بِہٖ فِیْ مَوْضِعِ الضَّرُوْرَاتِ الشَّدِیْدَۃِ لَا بَأْسَ بِہٖ عَلٰی مَا اَظُنُّ ۔ (الخ) ترجمہ:۔ اگر مفتی حنفی نے سخت ضرورت کے موقع پر غائب کی بیوی کے لیے تنسیخ نکاح کا فیصلہ مسلکِ مالکی کے مطابق کر دیا۔ تو میرے گمان کامل کے مطابق کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح فتاوٰی ردّالمحتار جلد دوّم صفحہ نمبر ۶۲۹ پر ہے:۔ وَقَدْ کَانَ بَعْضُ اَصْحَابِنَا یُفْتُوْنَ بِقَوْلِ مَالِکٍ فِیْ ھٰذِہِ الْمَسْئَلَۃِ لِلضَّرُوْرَۃِ (ترجمہ):۔ اور بے شک ہمارے بعض اصحاب اس مسئلہ پر بوجہ ضرورت و حاجت امام مالک کے قول پر فتوٰی دیتے ہیں۔ فتاوٰی درِّ مختار جلد دوّم صفحہ نمبر ۶۲۸ پر ہے:۔ نَعَمْ لَوْ قَضٰی مَالِکِیٌّ بِذٰلِکَ نَفَذَ :۔ ترجمہ:۔ اگر کوئی مالکی مسلک مفتیٔ اسلام۔ گم شدہ لاپتہ خاوند کی بیوی کی تنسیخ نکاح کا فیصلہ کر دے۔ تو احناف مقلدین پر بھی جاری ہوگا اسی طرح فتاوٰی حنفیہ زاہدی جلد دوّم اور ردّالمحتار جلد سوم صفحہ نمبر ۲۷۶ پر ہے:۔ وَاِنْ لَمْ یَکُنْ مَذْھَبُنَا فَاِنَّ الْاِنْسَانَ یَحْتَاجُ فِی الْعَمَلِ بِہٖ عِنْدَ الضَّرُوْرَۃِ :۔ ترجمہ۔ یعنی اگرچہ ہمارا مذہب اس تنسیخ کے حق میں نہیں ہے مگر بوقتِ حاجت انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ مذہب غیر پر عمل کرے۔ یہ تھیں وہ عبارات جن سے ایک حنفی مسلک والے مفتیٔ اسلام کو امام اعظم کی طرف سے اجازت حاصل ہو رہی ہے۔ کہ وہ قدرتی مجبوری کی صورت میں عورت کو قیدِ ناگہانی سے چھڑانے کے لیے آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مسلک پر ان کے قواعد و شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے فتوٰی جاری کر کے تنسیخ کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ زوجۂ مفقود کے لیے امام احمد بن حنبل اور امام مالک رحمۃ اللہ تعالٰی علیہما ہر دو بزرگان کے نزدیک کچھ مندرجہ ذیل شرائط کے تحت تنسیخ نکاح کا فیصلہ جائز ہے۔ چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ امام احمد کا مذہب بیان فرماتے ہوئے ردّالمحتار جلد دوّم باب النفقہ صفحہ نمبر ۹۰۳ پر محرر ہیں:۔ نَعَمْ یَصِحُّ عِنْدَ اَحْمَدَ کَمَا ذُکِرَ فِیْ کُتُبِ مَذْھَبِہٖ وَعَلَیْہِ یُحْمَلُ مَا فِیْ فَتَاوٰی قَارِی الْھِدَایَۃِ۔ سُئِلَ عَمَّنْ غَابَ زَوْجُھَا وَلَمْ یَتْرُکْ لَھَا نَفَقَۃً: فَاَجَابَ

اِذَا قَامَتْ بَیِّنَۃٌ عَلٰی ذٰلِکَ وَطَلَبَتْ فَسْخَ النِّکَاحِ مِنْ قَاضٍ یَرَاہُ فَفَسَخَ نَفَذَ۔ (ترجمہ)۔ امام احمد رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کے نزدیک دوسری صورت تنسیخ کی صحیح ہے۔ جیسے کہ ذکر کیا گیا اُن کی ہم مذہب کتب میں اور اسی پر محمول کیا گیا ہے وہ قول جو فتاوٰی قاری الہدایہ میں ہے۔ کہ امام احمد سے پوچھا گیا۔ اُس بیوی کے بارے میں جس کا خاوند گم ہو گیا (اور ایسا گم ہوا کہ باوجود تلاش بسیار کے نہ ملا)۔ اور اپنی بیوی کے لیے خرچہ تک نہ چھوڑا۔ تو آپ نے جواب دیا۔ کہ جب سچی گواہی اس بات پر قائم ہو جائے۔ اور بیوی بھی تنسیخ نکاح کا مطالبہ کرے مفتی یا قاضی یا جج سے۔ وہ اچھی طرح چھان بین اور مفقود کی تلاش کرنے کے بعد نکاح کا فیصلہ کردے تو وہ فیصلہ قابل قبول اور جاری ہوگا اس میں امام احمد نے تین شرطیں کہیں۔

ا۔ پہلی شرط یہ کہ زوجیت اور خاوند کے عرصۂ دراز سے لاپتہ ہونے اور تلاش بسیار کے باوجود نہ ملنے پر گواہی قائم ہو۔ دوسری شرط یہ ہے۔ کہ خاوند مفقود نے کوئی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ بھی نہ چھوڑی ہو کہ جس سے بیوی نفقہ و سکونت حاصل کرسکے تیسری شرط یہ ہے۔ کہ بیوی تنسیخ نکاح کا مطالبہ کرے۔ ان شرائط کے ماتحت مفتیٔ اسلام یا قاضی و عدالت اچھی طرح تحقیق و تفتیش کرکے نکاح فسخ کرسکتا ہے۔ یہ تھا امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالٰی عنہ کا مذہب۔ اسی طرح حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ بھی چند شرائط سے تنسیخ نکاح کا فیصلہ فرماتے ہیں:

چنانچہ مسلک مالکی کی قانونی کتاب فتاوٰی مالکیہ منتقی للباجی جلد پنجم صفحہ نمبر ۲۰۳ پر ہے:۔ اِذَا انْتَشَرَ خَبَرُہٗ فِی الْجِیْرَانِ - اَنَّ فُلَانًا تَزَوَّجَ فُلَانَۃَ فَلَہٗ اَنْ یَّشْھَدَ اَنَّ فُلَانَۃَ زَوْجَۃُ فُلَانٍ (ترجمہ) مفتیٔ اسلام پر لازم ہے۔ کہ سب سے پہلے اس چیز کا بین ثبوت لے۔ کہ یہ عورت واقعی اس کی بیوی ہے۔ اور فلاں گم شدہ مرد اس کا خاوند ہے۔ اس ثبوت کے بعد پھر حاکم یا مفتیٔ اسلام نکاح فسخ کرسکتا ہے۔ اور فسخ کے فیصلہ کے بعد عورت مدعیہ چار سال اور چار ماہ دس دن عدت گزارے۔ کہ چار سال عدت مفقود ہے۔ اور چار ماہ دس دن عدت وفات متخیلہ ہے۔ چنانچہ مفتیٔ مالکی علامہ سعید بن صدیق مالکی اپنے فتاوٰی میں فرماتے ہیں:۔ اَمَّا مَدَّتُ اِمْرَأَۃِ الْمَفْقُوْدِ تَحْتَدُّ الْاَرْبَعَ سِنِیْنَ فِیْ مَذْھَبِ مَالِکٍ بِغَیْرِ اَمْرِ السُّلْطَانِ فَقَالَ:۔ ثُمَّ مَالِکٌ - لَا وَاِنْ قَامَتْ عِشْرِیْنَ سَنَۃً (ترجمہ) یعنی حاکم کے فیصلہ کے بغیر خواہ کتنے ہی سال زوجہ بے آباد بیٹھی رہے۔ علامہ سعید نے فرمایا۔ کہ امام کے فرمودہ کے مطابق وہ سال عدت میں شمار نہ ہوں گے۔ عدت کا اعتبار فیصلہ کے بعد شمار ہوگا:۔ فتاوٰی بلغۃ السالک مالکی جلد دوم صفحہ نمبر ۵۰۵ پر ہے:۔ اِمْرَأَۃُ الْمَفْقُوْدِ تَعْتَدُّ اَرْبَعَ سِنِیْنَ ثُمَّ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّ عَشْرًا فَتَنْکِحُ غَیْرَہٗ عِنْدَ مَالِکٍ:۔ (ترجمہ) حاکم کے فیصلہ کے بعد بحکم حاکم زوجۂ مفقود چار سال چار ماہ دس دن عدت گزارے۔ اگرچہ خاوند کی گم شدگی بیس سال سے ہو۔ مدت انتظار چار سال بعد حکم حاکم شروع ہوگی۔ یہ تھا عام حکم۔ جب کہ بیوی میں مزید انتظار کی ہمت رہو۔ لیکن حالات زمانہ کے پیش نظر اگرچہ حکم حاکم سے پہلے چار سال کا عرصہ زمانۂ گم شدگی میں گزر چکا ہو۔ تو فقہ مالکی میں مزید گنجائش ہے کہ اب

صرف ایک سال اور گزار کر چار ماہ دس دن گزارے اسی طرح شرح دردیر میں ہے۔ چنانچہ مفتی مدینہ منورہ علامہ ہاشم بن احمد مالکی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ جن کا انتقال اعلٰی حضرت کے زمانے میں ہوا ہے۔ اپنے فتاوٰی میں شرح دردیر مالکیہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں۔ وَاِنْ کَانَ لِخَوْفِہَا الزِّنَا وَتَضَرُّرِہَا بِعَدَمِ الْوَطْیِ وَالْغِنَا مَعَ وُجُوْدِ النَّفَقَۃِ وَالْغِنَا فَیَعُدُّ صَبْرُہَا سَنَۃً۔ (ترجمہ):۔ اگر عورت کو عصمت و عزت و آبرو کا خوف ہو۔ تو صرف ایک سال تک صبر کا حکم دیا جائے گا۔ اور چار ماہ دس دن مزید عدت گزار کر زوجۂ مفقودہ اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ اس لیئے کہ یہ فسخ نکاح۔ شرعاً طلاق نہ ہوگی۔ بلکہ خاوند کو مُردہ تصور کیا جائے گا۔ اس لیئے فقہائے کرام مالکیہ عدتِ وفات کا شدت سے ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ بلغۃ السالک فقہ امام مالک جلد دوئم صفحہ نمبر ۵۰۵ پر ہے:۔ وَتَعْتَدُّ زَوْجَۃُ الْمَفْقُوْدِ عِدَّۃَ الْوَفَاتِ اِنْ رَفَعَتْ اَمْرَہَا لِلْحَاکِمِ۔ اَوِالْجَمَاعَۃِ الْمُسْلِمِیْنَ عِنْدَ عَدَمِہٖ وَکَفٰی الْوَاحِدُ مِنْ جَمَاعَۃِ الْمُسْلِمِیْنَ اِنْ کَانَ عَدْلًا عَادِ فَاًط (ترجمہ):۔ یعنی اگر زوجہ مفقودہ کا فیصلہ حاکم وقت نے کیا ہو۔ یا مفتی اسلام نے۔ تو وہ عورت وفات کی عدت گزارے گی۔ کیونکہ ایسا گم شدہ خاوند قانونِ مالکی میں شرعی طور پر مُردہ مانا جاتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰی زیلعی میں ہے۔ فَاِنْ رَأَی الْمَصْلِحَۃَ حَکَمَ بِمَوْتِہٖ۔ (ترجمہ) جب حاکم اسلام پوری تحقیق کے بعد تنسیخ نکاح کی مصلحت دیکھے۔ تو مفقود کی موت کا حکم لگا کر نکاح فسخ کرے۔ یہ تھا زوجہ لاپتہ شخص کے تنسیخ نکاح کا قانون مالکی و حنبلی۔ ان اماعین کرامین کے نزدیک یہ فیصلہ فاروق اعظم کے فیصلوں کے مطابق ہے۔ چنانچہ مؤطا امام مالک جلد دوئم صفحہ نمبر ۲۸ پر ہے:۔ حَدَّثَنِیْ یَحْیٰی عَنْ مَالِکٍ عَنْ یَحْیٰی بِنِ سَعِیْدٍ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیِّبِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ۔ قَالَ اَیُّمَا امْرَأَۃٍ فَقَدَتْ زَوْجَہَا فَلَمْ تَدْرِ اَیْنَ ہُوَ فَاِنَّہَا تَنْتَظِرُ اَرْبَعَ سِنِیْنَ۔ ثُمَّ تَعْتَدُّ اَرْبَعَۃَ اَشْہُرٍ وَعَشْرًا ثُمَّ تَحِلُّ۔ (ترجمہ):۔ یہ روایت ہے یحیٰی اور مالک اور یحیٰی بن سعید بن مسیب سے کہ فاروق اعظم نے یہ فیصلہ فرمایا۔ کہ جو عورت مفقود الزوج ہو۔ اور تلاش بسیار کے بعد بھی پتہ نہ چلے۔ کہ گم شدہ کہاں ہے۔ (اور حاکم کے فیصلے سے پہلے چار سال نہ گزرے ہوں) تو وہ عورت بعد فیصلہ چار سال انتظار کرے۔ اور پھر چار مہینہ دس دن عدت گزارے۔ اور پھر نکاح ثانی کرے یہ تھا فاروق اعظم کا اولین فیصلہ۔ اگرچہ عند الاحناف فاروق اعظم کا رجوع ثابت ہے۔ مگر امام مالک اور امام احمد اب بھی اس کو سند بناتے ہیں۔ اور اس کے استدلال سے تنسیخ کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اور فی زمانہ مجبوری حالت کی بنا پر ہم احناف بھی مفتی مالکی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ شامی شریف جلد دوئم صفحہ نمبر ۸۲۹ پر ہے:۔ قُلْتُ لٰکِنْ ہٰذَا ظَاہِرٌ اِذَا اَمْکَنَ قَضَاءُ مَالِکِیٍّ بِہٖ اَوْ تَحْکِیْمُہٗ اَمَّا فِیْ بِلَادٍ لَا یُوْجَدُ مَالِکِیٌّ یَحْکُمُ بِہٖ فَالضَّرُوْرَۃُ مُتَحَقِّقَۃٌ (ترجمہ):۔ اگرچہ بہتر یہی ہے۔ کہ خود مفتی مالکی ایسا فیصلہ کرے۔ لیکن چونکہ ہمارے علاقوں میں ودرود

وراپنک مالکی مفتی نظر آتا نہیں۔ اس لیے حنفی مفتی کے ذریعے ہی تفسیخ کا فیصلہ کرایا جاسکتا ہے۔ (الخ) اور اس کا طریقہ یہ ہے۔
کہ پہلے بیوی یا اس کے لواحقین عدالتِ اسلامی یا مفتیٔ وقت کے پاس مقدمہ لے جائے اور مفتیٔ وقت یا حاکمِ عدالت
اچھی طرح گواہی لے کر تفتیش کرے۔ اور خود تلاش کرائے۔ پھر بھی نہ ملے۔ تو فیصلہ تفسیخ کر دے۔ مگر چار سال کا وقفہ دے۔ کہ
شاید مفقود آجائے۔ اگر پہلے ہی چار سال تک تلاش کرتے رہے۔ پھر عدالت کی طرف رجوع کیا۔ اب حاکمِ اسلام صرف
ایک سال کا وقفہ انتظار مقرر کرے۔ اور اگر بیوی مدخولہ یا خلوتِ صحیحہ والی ہو۔ تو بعدہٗ عدتِ وفات گزار کر جہاں چاہے
نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن غیر مدخولہ مطلقہ پر عدت نہیں ہوتی۔ اس کیلئے صرف ایک سال کی مدتِ انتظار ہوگی قرآنِ کریم
ارشاد فرماتا ہے۔ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ
عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (ترجمہ)۔ بعد نکاح اے خاوندو۔ تم نے بغیر خلوتِ صحیحہ غیر مدخولہ بیویوں کو طلاق دی۔
تو تمہارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں۔ ثابت ہوا۔ کہ زوجہ مفقود کی تفسیخ نکاح طلاق نہ ہوگی۔ ورنہ اس پر عدتِ وفات
نہ ہوتی۔ اور غیر مدخولہ کی عدت کا ذکر عباراتِ فقہاء میں نہ ہوتا۔ بلکہ شرعاً یہ تفسیخ بیوگی متصور ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی عدت
ضرور گزارے گی۔ اگرچہ غیر مدخولہ ہو۔ ان تمام دلائل کے ماتحت میں مفتی اسلام ہونے کی حیثیت سے مسلک مالکی وحنبلی
کے مطابق کریمہ بی بی اور شیر محمد کا نکاح قانونِ شرعی کے مطابق فسخ کرتا ہوں۔ آج سے کریمہ بی بی اور شیر محمد کے تعلقات زوجیت
سے بالکل آزاد ہیں۔ اور چونکہ سات سال سے لاپتہ ہے۔ اور یقین کی حد تک ثابت ہو چکا ہے۔ کہ بسیار باوجود تلاش
کے اب تک لاپتہ ہے۔ لہٰذا اب مزید ایک سال مدتِ انتظار مقرر کی جاتی ہے۔ ایک سال گزرنے کے بعد پھر
چار ماہ دس دن گزار کر جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ کریمہ بی بی کا غیر مدخولہ ہونا اس کی عدت کو مانع نہیں۔ کیونکہ یہ
گم شدگی اس کے خاوند شیر محمد کی موت کے درجے میں ہے۔ اور بیوہ پر بہر صورت عدت واجب ہوتی ہے۔ مدخولہ
ہو یا غیر مدخولہ۔ صرف مطلقہ غیر مدخولہ پر عدت نہیں ہوتی۔ کریمہ بی بی کا خاوند اگر دوسری جگہ نکاح سے پہلے پہلے آگیا
تو کریمہ بی بی اسی کی بیوی ہوگی۔ اور تفسیخ ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے اصطلاحِ فقہاء میں اس فسخ کو فسخ موقوفہ کہا جاتا ہے۔ اگر ایک
سال چار ماہ دس دن بعد کریمہ بی بی نے شریعتِ مطہرہ کے مطابق نکاح کر لیا۔ تو پھر اس کا گم شدہ خاوند آیا۔ تو اس سے
کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور کریمہ بی بی اپنے دوسرے خاوند کی ہی بیوی ہوگی۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۹۰۲ پر ہے
:- وَاِذَا حَضَرَ الزَّوْجُ الْاَوَّلُ وَبَرْهَنَ عَلٰى خِلَافِ مَا ادَّعَتْ مِنْ تَرْكِهَا بِلَا نَفَقَةٍ لَا تُقْبَلُ
بَيِّنَتُهٗ لِاَنَّ الْبَيِّنَةَ الْاُوْلٰى تَرَجَّحَتْ بِالْقَضَاءِ فَلَا تَبْطُلُ بِالثَّانِيَةِ ؕ :- (ترجمہ)
اور جب بعد مدت پہلا خاوند حاضر آگیا۔ اور دعوی کیا۔ کہ میں بیوی کا خرچہ چھوڑ کر گیا۔ اور گواہی بھی قائم کر دی۔ عدالت اس
کی بات، اور گواہی تسلیم نہ کرے گی۔ اس لیے کہ پہلا فیصلہ بہت تحقیق و تفتیش و گواہی کے بعد ہوا تھا۔ وہ فیصلہ سابقہ اس
گواہی سے باطل نہ ہوگا۔ موطا امام مالک کی شرح تنویر الحوالک جلد دوم صفحہ نمبر ۳۹ پر ہے۔ قَالَ مَالِكٌ اِنْ

تَزَوَّجَتْ بَعْدَ انْقِضَاءِ عِدَّتِهَا فَدَخَلَ بِهَا اَوْلَمْ يَدْخُلْ بِهَا زَوْجُهَا - فَلَا سَبِيْلَ لِزَوْجِهَا الْاَوَّلِ اِلَيْهَا ؕ - (ترجمہ) - اگر زوجہ مفقود نے فسخ نکاح کے شرعی فیصلے کے مطابق بعد عدت و میعاد انتظار نکاح ثانی کرلیا - دوسرے خاوند نے دخول کیا ہو یا نہ پہلے خاوند کے آجانے سے کچھ فرق نہ پڑے گا - اور گمشدہ خاوند کا اس عورت پر کوئی حق نہ ہوگا - بشرطیکہ اس عورت نے پوری شرعی مدت ایک سال چار ماہ دس دن بعد نکاح ثانی کیا ہو - اگر اس نے اس مدت سے ایک دن بھی پہلے نکاح کیا ہوگا - تو وہ نکاح معتبر نہ ہوگا - اور جب بھی خاوند اگر یہ ثابت کردے - کہ یہ نکاح مدتِ شرعیہ سے پہلے ہے - تو مفتیٔ اسلام اس نکاح ثانی کو باطل قرار دے کر نکاح اوّل کو برقرار رکھے گا - لہٰذا کہ بیبی اور اس کے لواحقین اس مدت کا خاص طور پر خیال رکھے - نکاح کی پکی تاریخ کسی اسٹام پر یا عدالتی فارم پر درج کرلینی چاہیئے ؕ

کتبہ ـــــــــــــــ

نو مسلم اپنی کافرہ بیوی کو بعد تفریق تین طلاق دے پھر بیوی مسلمان ہوکر بغیر حلالہ اسی کے نکاح میں آسکتی ہے

سوال ۷۵ - اِنْ اَسْلَمَ الزَّوْجُ وَاَبَتْ زَوْجَتُهٗ ثُمَّ فَرَّقَ بَيْنَهُمَا مُفْتِي الْوَهَابِيَّةِ ثُمَّ طَلَّقَ زَوْجَتَهٗ بِثَلٰثِ تَطْلِيْقَاتٍ - ثُمَّ اٰمَنَتْ بَعْدَ سَنَتٍ - هَلْ يَجُوْزُ نِكَاحُ الزَّوْجِ بِهٰذِهِ الزَّوْجَةِ بِغَيْرِ تَحْلِيْلٍ اَمْ لَا - بَيِّنُوْا بِالْكِتَابِ تُؤْجَرُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ؕ

السائل :- محمد عثمان خطیب جامع مسجد منگھو پیر روڈ - راشن شاپ نمبر ۲۳ کراچی مورخہ ۳/۱۱/۱۹۶۷

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب ـــــــــــــــ

يَجُوْزُ بِاِعْتِبَارِ قَانُوْنِ الشَّرْعِ اَنْ يَّنْكِحَ زَوْجٌ مُّسْلِمٌ مِّنْ زَوْجَتِهٖ سَابِقَتِهٖ اِيْتِهٖ اِذَا كَانَتْ مُسْلِمَةً - وَلَوْ كَانَتْ بَعْدَ تَفْرِيْقِ الْقَاضِيْ - وَبَعْدَ تَطْلِيْقَتِهٖ الثَّلٰثَةِ بِغَيْرِ تَحْلِيْلٍ مِّنْ زَوْجٍ اٰخَرَ لِاَنَّ تَطْلِيْقَ الزَّوْجِ الْمُسْلِمِ الْجَدِيْدِ بَعْدَ تَفْرِيْقِ الْقَاضِيْ مِنْ اِبَائَةِ الزَّوْجَةِ الْكَافِرَةِ غَيْرِ الْكِتَابِيَّةِ - عَنِ الْاِسْلَامِ - لَغْوٌ فَاِنَّهٗ اِذَا اَسْلَمَ الزَّوْجُ - وَاَبَتْ زَوْجَتُهٗ عَنِ التَّسْلِيْمِ - وَمَضَتْ مُدَّةٌ فَتَفَرَّقَ الْقَاضِيْ اَمْ مُفْتِيْ نَفَذَ التَّفْرِيْقُ

فَسَدَ النِّکَاحُ قَطْعاً - وَلَا یَکُوْنُ هٰذَا التَّفْرِیْقُ طَلَاقاً - لِاَنَّ سَبَبَ التَّفْرِیْقِ اِمْرَاءَةٌ وَلَا یَقَعُ مِنَ النِّسَاءِ فِیْ شَرِیْعَةِ الْاِسْلَامِیَّةِ طَلَاقٌ قَطُّ - فَلَا یَکُوْنُ التَّفْرِیْقُ طَلَاقاً بَلْ فَسْخاً - هٰکَذَا مَرْقُوْمٌ فِی الْعَالَمْگِیْرِیَّةِ جِلْدِ اَوَّلْ عَلٰی صَفْحَةِ نمبر ۳۳۸ - وَاِنْ اَسْلَمَ الزَّوْجُ وَاَبَتْ زَوْجَتُهٗ لَمْ تَکُنِ الْفُرْقَةُ طَلَاقاً - وَفِیْ عَکْسِهٖ طَلَاقٌ (الخ) لِاَنَّ سَبَبَهُ الزَّوْجُ وَ فِی الشَّرِیْعَةِ یَقَعُ الطَّلَاقُ مِنَ الرِّجَالِ فَقَطْ وَ اِسْلَامُ الزَّوْجِ یُفْسِدُ النِّکَاحَ بَعْدَ التَّفْرِیْقِ وَمِنَ الْفَسَادِ لَا یَبْقَی النِّکَاحُ بِالْکُلِّ وَ الطَّلَاقُ بِغَیْرِ النِّکَاحِ کَیْفَ یَقَعُ - هٰکَذَا فِیْ رَدِّ الْمُحْتَارِ جِلْدِ ثَانِیْ عَلٰی صَفْحَةِ نمبر ۵۴۳ - قَالَ وَبَعْدَ فَسَادِ النِّکَاحِ طَلَاقُ الزَّوْجِ لَغْوٌ - وَاِنْ کَانَتْ وَاحِدَةً اَوْ اِثْنَیْنِ اَوْ ثَلَاثاً - وَلَا ضَرُوْرَةَ لِنِکَاحِ هٰذِهِ الزَّوْجِ تَحْلِیْلُ زَوْجٍ اٰخَرَ - فَفِیْ صُوْرَةِ الْمَسْئُوْلَةِ جَازَ النِّکَاحُ لِزَوْجٍ سَابِقٍ بِغَیْرِ حَلَالَةٍ - عَنْ هٰذِهِ الْمَرْءَةِ وَتَطْلِیْقُهُ الثَّلَاثَةُ لَغْوٌ ۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمْ ۔

کتبہ

مفتی دار العلوم مدرسہ غوثیہ نعیمیہ گجرات پاکستان

بے آباد زوجۂ متعنت کا نکاح فسخ ہو سکتا ہے

سوال ۵۸ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں، کہ میں مسمات زبیدہ بیگم کا نکاح خالد حسین سے آج سے پانچ۵ سال پیشتر ہوا۔ سات۷ ماہ میں اپنے خاوند کے گھر آباد رہی۔ پھر اس نے دوسری شادی کر لی ہے اور مجھ کو مار کر گھر سے نکال دیا۔ اب میں تقریباً چار۴ سال سے بے آباد بیٹھی ہوں۔ میرا کوئی والی وارث نہیں بنتا۔ نہ میرے ماں باپ زندہ ہیں بھاوجوں کی ٹھوکروں پر پڑی ہوں۔ سخت قلبی اور جسمانی اذیت ہے۔ نہ وہ خاوند طلاق دیتا ہے۔ اور نہ خرچہ دیتا ہے۔ نہ ہم میں جبری طلاق کی ہمت ہے۔ نہ خلع کرتا ہے۔ نہ آباد کرنے پر تیار ہے بتائیے حضرت جی میں کیا کروں۔ میرے رشتہ دار کئی مرتبہ خالد حسین مذکور سے میرے متعلق ملاقات کر چکے ہیں مگر وہ ظالم کسی راستے پر نہیں آتا۔ لہذا مجھ کو شریعت کا فتویٰ دیا جائے۔ اور اس ظلم سے بچایا جائے۔

سائلہ:- زبیدہ بیگم پشاور صدر۔ مورخہ ۶/۱۱/۱۹۷۰

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

قانون شریعت کے مطابق ایسے ظالم خاوند کو متعنت کہا جاتا ہے۔ اور ایسی مظلومہ عورت کو زوجۂ متعنت

فی النفقہ کہا جاتا ہے۔ جب خاوند اپنی بیوی پر باسہولت زندگی گزارنے کے چاروں دروازے بند کر دے۔ کہ نہ آباد کرے گا۔ نہ خرچہ دے گا۔ نہ طلاق دے گا۔ نہ خلع کرے گا۔ اور نہ ہی بیوی کی طرف سے جبری طلاق لینے کی ہمت ہو تو ایسی صورت میں بجز فسخِ نکاح کے چارہ نہیں۔ مگر فقہ حنفی میں تنسیخ نکاح کا قانون امام اعظم کی طرف سے ثابت نہیں۔ چنانچہ فتاوٰی درمختار جلد اول صفحہ نمبر ۹۰۳ پر ہے:۔ وَلَا یُفَرَّقُ بَیْنَهُمَا بِعَجْزِهٖ عَنْهَا بِاَنْوَاعِهَا الثَّلٰثَةِ وَلَا بِعَدَمِ اِیْفَائِهٖ ترجمہ اور نہ نکاح فسخ کیا جائے۔ اُن خاوند بیوی کے درمیان۔ خاوند کے عاجز ہونے کی صورت میں تینوں قسموں کے خرچے سے اور نہ تفریق ہو۔ جان بوجھ کر خرچہ نہ دینے کی بنا پر۔ لیکن امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک تنسیخ نکاح جائز ہے۔ اور ایسی نازک ترین حالت میں زوجہ متعنت کا نکاح فسخ کر کے دوسری جگہ اس کو نکاح کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ چنانچہ فتاوٰی مالکیہ لعلامہ سعید بن صدیق الفلاق صفحہ نمبر ۳۵ پر ہے:۔ وَاَمَّا الْمُتَعَنِّتُ الْمُمْتَنِعُ عَنِ الْاِنْفَاقِ فَاِنْ لَّمْ یَثْبُتْ عُسْرُهٗ۔ اَنْفَقَ اَوْ طَلَّقَ وَاِلَّا طَلَّقَ عَلَیْهِ۔ اَیْ طَلَّقَ عَلَیْهِ الْحَاکِمُ ترجمہ اور لیکن وہ خاوند جو بیوی کو خرچہ وغیرہ نہ دیتا ہو۔ تو لوگ پتہ لگائیں۔ کہ کیوں خرچہ نہیں دیتا۔ اگر غربت ثابت نہ ہو تو اُس پر واجب ہے۔ کہ خرچہ دے یا طلاق۔ اگر کسی چیز پر راضی نہ ہو۔ تو حاکمِ وقت طلاق دے۔ بذریعہ فسخ کیونکہ ہر وہ فسخ جو خاوند کی وجہ سے ہو گی۔ وہ شرعاً طلاق بائنہ ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا عبارت سے ثابت ہوا۔ کہ امام مالک کے نزدیک متعنت فی النفقہ کی بیوی اپنا نکاح فسخ کرا سکتی ہے۔ اور امام مالک حدیث پاک سے استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ مؤطا امام مالک جلد دوم صفحہ نمبر ۳۵ پر ہے:۔ وَحَدَّثَنِیْ عَنْ مَالِکٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ سَعِیْدَ بْنَ الْمُسَیَّبِ کَانَ یَقُوْلُ۔ اِذَا لَمْ یَجِدِ الرَّجُلُ مَا یُنْفِقُ عَلَی امْرَاَتِهٖ فُرِّقَ بَیْنَهُمَا۔ قَالَ مَالِکٌ وَعَلٰی ذٰلِکَ اَدْرَکْتُ اَهْلَ الْعِلْمِ بِبَلَدِنَا ترجمہ اور حدیث بیان فرمائی میرے سامنے جو روائت ہے۔ امام مالک سے کہ تحقیق روائت پہنچی۔ اُن کو بے شک صحابئ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم سعید بن مسیّب فرمایا کرتے تھے۔ جب خاوند وہ چیز نہ پائے۔ جو خرچہ دے اپنی بیوی کو تو شرعاً فسخ نکاح سے دونوں خاوند بیوی کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ امام مالک علیہ الرحمت نے فرمایا۔ کہ اپنے شہر کے اہلِ علم حضرات کو میں نے اسی مسلک پر پایا۔ اس حدیث پاک میں لفظ لَمْ یَجِدْ عام ہے۔ اس بات کو کہ بوجہ غربت قدرتِ خرچہ نہ پائے۔ یا بوجہ ظلم ارادۂ خرچہ نہ پائے۔ یہ تھا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اور استدلال۔ اس بنا پر فقہاء مالکیہ کا یہ قانون مشہور و مسلم ہے اور ہر مفتی مالکیہ مکمل تحقیق کے بعد۔ ایسی مظلومہ عورت کو ظالم متعنت خاوند کی قید سے چھڑانے کے لئے تنسیخ نکاح کا فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔ اُس کا یہ طریقہ ہے۔ کہ اَوّلاً بیوی یا اُس کے لواحقین خاوند کو آباد کرنے پر مجبور کریں۔ اُس پر راضی نہ ہو۔ تو خرچہ لباس خوراک رہائش کا مطالبہ کریں۔ اس پر راضی نہ ہو تو طلاق اُ جائے۔ اگر طلاق بھی نہ دے۔ تو خلع کا لالچ دیا جائے۔ جس کو طلاق بالمال بھی کہا جاتا ہے۔ جب اس

سے بھی کام نہ چلے۔ تو دھوکے فریب سے جبری طلاق کی کوشش کی جائے۔ مگر ایسا ہونا عام طور پر مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے چار طریقے کم از کم ایک سال تک مختلف موقعوں پر مختلف لوگوں کے ذریعے چند بار دُہرائے جائیں۔ اور ہر طرح خاوند کو سمجھایا بجھایا جائے۔ باوجود اس کوشش بسیار کے اگر ظالم کو خوفِ خدا نہ آئے۔ تو بیوی۔ حاکم اسلام یا فقۂ شافعی یا مالکی کے مفتی کے پاس مقدمہ دائر کرے۔ اور گزشتہ تمام حالات بھی بتا دے۔ کہ ہم نے یہ کوشش کر دیکھی۔ مگر خاوند کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا پھر مفتیٔ اسلام اور حاکم عدالت خود بھی اپنے وسائل کے مطابق واقعات کی تفتیش کرے جب تعنّت ثابت ہو جائے۔ تو تفسیخ نکاح کا فیصلہ کر دے۔ چنانچہ درمختار جلد دوم صفحہ نمبر ص۳۰۹ پر ہے۔ نَعَمْ لَوْ اَمَرَ شَافِعِيًّا فَقَضٰی بِهٖ نَفَذَ (ترجمہ) اگر شافعی مذہب والا فسخ نکاح کا فیصلہ کر دے۔ تو جاری ہوگا۔ اسی طرح فتاوٰی صالح تونسوی میں ہے۔ ظَاهِرُ عِبَارَاتِ بَعْضِ الشُّرَّاحِ فِیْ اَنَّ الْفَسْخَ اَوِ التَّطْلِيْقَ الْمَذْكُوْرَ يَكُوْنُ لِلْحَاكِمِ اَوْ لِجَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ عِنْدَ عَدَمِهٖ الخ (ترجمہ) بعض شارحین کی عبارت سے ظاہر ہے۔ کہ فسخ یا طلاق کی مذکورہ صورت میں اختیار ہے۔ حاکم یا مسلمانوں کی جماعت کو اس فیصلے کے بعد مدعیہ بیوی طلاقِ بائنہ کی عدت گزار سکتی ہے۔ اور اب خاوند مذکور کو کوئی اختیار نہ رہے گا۔ یہ ہے وُہ طریقہ جو زوجۂ متعنّت کے فسخ کے لیے فقہ مالکی و شافعی سے ثابت ہُوا لیکن چونکہ فی زمانہ حکام عدالت نہ تو قانونِ اسلامی کو جاری کرتے ہیں۔ پاکستان میں عیسائیوں کا وہی باطل قانون جاری ہے۔ جس میں بجز ظلم کے کچھ نہیں۔ نہ قیودِ شرعی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن کی تفسیخ شرعاً ہرگز ہرگز معتبر نہیں۔ پس زوجۂ متعنّت کا فیصلہ انگریزی قانون کے ماتحت قابلِ نفاذ نہیں اور دُوسری طرف فقہ مالکی یا شافعی کے مفتی حضرات ہمارے قریبی علاقوں میں کہیں دُور دُور نظر نہیں آتے بلکہ افغانستان، ہندوستان، پاکستان ہر سہ ممالک میں تو بجز احناف کوئی عام شخص بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ خود میں نے آج تک کسی شافعی یا مالکی یا حنبلی مقلد کو اپنے ان علاقوں میں نہ دیکھا۔ بحمداللہ تعالیٰ ان تینوں ملکوں کے عوام و خواص سب کے سب حنفی المسلک ہیں۔ پس ان علاقوں میں متعنّت فی النفقہ کے ظلم کو توڑنے کے لیے خود مفتی حنفی کو ہی نیابتِ امام مالکؒ سپرد کی جائے گی۔ اور وہ اپنے امام اعظم کی اجازت سے امام مالک کے مذہب پر فیصلہ کرتے ہُوئے فسخ نکاح کرے گا۔ اور حنفی مفتی کا کیا ہُوا یہ فیصلہ شرعاً جاری متصور ہوگا۔ کیونکہ مفتیٔ احناف کو اِس چیز کی امام اعظم کی طرف سے اجازت ہے۔ کہ وُہ بوقتِ مجبوری مسلکِ غیر پر فتویٰ جاری کرے چنانچہ فتاوٰی شامی جلد دوم صفحہ نمبر ص۹۰۳ پر ہے۔ ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ مَشَائِخَنَا اِسْتَحْسَنُوْا اَنْ يَّنْصِبَ الْقَاضِیْ الْحَنَفِیْ نَائِبًا مِمَّنْ مَذْهَبُهُ التَّفْرِيْقُ بَيْنَهُمَا اِذَا كَانَ الزَّوْجُ حَاضِرًا وَاَبٰی عَنِ الطَّلَاقِ۔ الخ۔ فَالتَّفْرِيْقُ ضَرُوْرِیٌّ اِذَا طَلَبَتْهُ ترجمہ۔ پھر جان لو کہ ہمارے مشائخ نے اس بات کو اچھا سمجھا۔ کہ حنفی قاضی کو اُس امام کا نائب مقرر کیا جائے۔ جو امام اس مسلک پر ہیں۔ کہ خاوند بیوی کے درمیان تفریق کی جائے۔ یعنی امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما۔ اور حنفی مفتی بھی تفسیخ نکاح کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس

ظلم کو ختم کرنے کے لئے تفریق ضروری ہے۔ جب کہ عورت مطالبہ کرے۔ یہ وہی صورت ہے۔ کہ خاوند موجود ہو۔ اور طلاق دینے سے انکار کرے۔ خود امام ابن عابدین اپنے فتاوی ردّ المحتار علی درّ مختار جلد دوم صفحہ نمبر ۶۴۹ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔ اَمَّا فِیْ بِلَادٍ لَا یُوْجَدُ فِیْهَا مَالِکِیٌّ یَحْکُمُ بِهٖ فَالضَّرُوْرَةُ مُتَحَقِّقَةٌ (الخ) وَلِهٰذَا قَالَ الزَّاهِدِیُّ وَقَدْ کَانَ بَعْضُ اَصْحَابِنَا یُفْتُوْنَ بِقَوْلِ مَالِکٍ فِیْ هٰذَا الْمَسْئَلَةِ لِلضَّرُوْرَةِ (ترجمہ) لیکن شہروں میں مالکی مذہب کا عالم نہیں پایا جاتا جو یہ حکم لگائے۔ مگر ضرورت فی زمانہ موجود ہے۔ اس لئے علامہ زاھدی نے فرمایا۔ اور بے شک ہمارے بعض امام فتویٰ دے دیتے تھے۔ امام مالک کے فرمان پر۔ اس مسئلہ میں سخت ضرورت کی بنا پر۔ پس ضروری ہے۔ کہ اس ظلم پر بھی مفتی حنفی زوجۂ متعنّت کا نکاح فسخ کر دے۔

لھٰذا میں مفتی اسلام ہونے کی حیثیت سے اپنے امام کی مندرجہ بالا اجازت کے ماتحت صورت مذکورہ فی السوال میں کافی تحقیق و تفتیش کے بعد ہر دو فریق کی موجودگی میں مذہب امام مالک کے مطابق تنسیخ نکاح کا فیصلہ صادر کرتا ہوں اس فیصلہ سے قبل میں نے غیر جانب دار گواہوں سے حلفیہ بیان لیا۔ کہ واقعی خاوند مذکور نہ اپنی اس بیوی کو آباد کرتا ہے۔ اور نہ خرچہ دیتا ہے۔ اور نہ طلاق دیتا ہے۔ اور نہ خلع پر راضی۔ نہ جبری طلاق کی ہمت ہے۔ بیوی کے لواحقین نے بہت مرتبہ خاوند کو سمجھایا۔ میں نے بھی دوسرے فریق کو بلا کر چاروں باتوں پر آمادہ کرنا چاہا۔ جب کسی طرح صلح کی صورت نظر نہ آئی۔ تب یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ آج سے سائلہ مذکورہ سابقہ نکاح سے بالکل آزاد ہے۔ یہ فیصلہ تنسیخ شرعی طور پر طلاق بائنہ ہے جس میں خاوند مذکور کو رجوع کا بالکل حق نہیں ہے۔ لہٰذا تین حیض عدت گزار کر جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔

نوٹ ضروری:۔ یہ فیصلہ سخت مصیبت کے موقعہ پر کافی تحقیق و تفتیش کر کے کیا گیا ہے۔ آئندہ کسی موقعہ پر۔ عدالت کے جج صاحبان یا کوئی متبحر مفتی جو محقق و مدقق ہو۔ اپنے طور پر دو طرفہ تفتیش حالات کر کے شریعت مطہرہ کے چاروں اصول مدنظر رکھ کر تب اس میرے فتوے کی روشنی میں فیصلہ نافذ کر سکتا ہے۔ خبردار۔ یہ حرام و حلال کا بہت نازک مرحلہ ہے۔ ہرگز یک طرفہ کارروائی نہ کی جائے۔ نہ بلا تحقیق فتویٰ دیا جائے۔ کہ باب مفاسد عدیدہ کا کھولنا ہے۔ دنیا و آخرت میں عزت کو کھونا ہے۔ بربادی ایمان و قہر رحمان کا لوٹنا ہے۔ استغفار:۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ وَاَسْئَلُهُ التَّوْبَةَ۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ عَلَیَّ بِحُرْمَةِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا الرَّحِیْمًا۔

کتبہ ــــــــــــــــــــــــ

✧ — ✧ — ✧

طلاق اور عدّت اور حلال حرام عورتوں کا حکم اور ان کی قسمیں

سوال ۵۹ :۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اِس مسئلہ میں کہ طلاق کی کتنی قسمیں ہیں۔ اور ہر ایک کی کیا تعریف ہے۔ اور اُن سب کا حکم کیا ہے؟ ۲ :۔ عدّت کی کتنی قسمیں ہیں۔ اور ہر ایک کی تعریف و حکم کیا ہے؟ ۳ :۔ شریعت میں کون کون سی عورتیں حلال ہیں۔ کون کون سی حرام؟

سائل :۔ اویس علی مقام بھکر۔ ضلع میانوالی۔ مورخہ : ۷۰ – ۱۲ – ۱۳

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق طلاق کی کُل پندرہ ۱۵ قسمیں ہیں۔ **پہلی طلاق** : سنّتِ وقتی۔ اُس کی تعریف یہ ہے کہ خاوند اپنی غیر مدخولہ بیوی کو اُس طہر میں ایک طلاق دے۔ جس میں وطی نہ کی ہو۔ چنانچہ عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۴۸ پر ہے مِنْهُ الطُّهْرُ الَّذِي لَمْ يُجَامِعْ هَا فِيهِ إِنَّ مَا يَكُونُ وَقْتًا لِلطَّلَاقِ السُّنِّيِ إِذَا لَمْ يُجَامِعْهَا (ترجمہ) :۔ پھر وہ طہر جس میں صحبت نہ کی ہو۔ اُس میں طلاق دینا سنّتِ وقتی کہلاتا ہے ؛ **دوسری طلاق** : سنّتِ عددی :۔ اِس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی مدخولہ یا غیر مدخولہ بیوی کو ایک یا دو ۲۔ یا تین طہروں میں طلاق دے۔ وہ طہر جس میں جماع نہ کیا ہو ؛ **تیسری طلاق** : طلاق سنّتِ عددی اَحْسَن :۔ اِس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی بیوی مدخولہ یا غیر مدخولہ کو صرف ایک طلاق رجعی دے پھر نہ دے۔ یہاں تک کہ عورت کی عدّت گزر جائے۔ اور رجوع بھی نہ کرے ؛ **چوتھی طلاق** : سنّتِ عددی حَسَن :۔ اِس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی بیوی مدخولہ یا غیر مدخولہ کو ہر اُس طہر میں ایک طلاق دے۔ جس طہر میں اُس نے جماع نہ کیا ہو۔ یعنی تین طہر میں تین طلاق دے۔ اِسی طرح فتاوٰی بحر الرائق جلد دوم میں ہے ؛ **پانچویں طلاق** : سنّتِ وقتی اَحْسَن :۔ اِس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی بیوی غیر مدخولہ کو ایک ایسے طہر میں جس میں جماع نہ کیا ہو۔ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دے۔ نہ رجوع کرے۔ اور نہ دوسری طلاق دے۔ یہاں تک کہ عدّت گزر جائے ؛ **چھٹی طلاق** : سنّتِ وقتی حسن :۔ اِس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی غیر مدخولہ بیوی کو تین طہروں میں تین طلاق دے۔ اُن طہروں میں سے کسی میں جماع نہ کرے۔ ہر طہر میں ایک طلاق دے۔ اِن چھ طلاقوں کا حکم یہ ہے۔ کہ دو طلاق تک رجعی ہوگی۔ تیسرے طہر کی طلاق سے طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔ بغیر حلالہ دوبارہ اُس خاوند سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ عدّت گزرنے کے بعد یہ دو رجعی طلاقیں بائنہ بن جائیں گی۔ چنانچہ فتاوٰی ھندیہ جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۴۸ پر ہے :۔ وَأَمَّا حُكْمُهُ فَوُقُوعُ الْفُرْقَةِ بِانْقِضَاءِ الْعِدَّةِ فِي الرَّجْعِيَّةِ وَبِدُونِهِ فِي الْبَائِنِ وَزَوَالُ حِلِّ الْمُنَاكَحَةِ مَتَى تَمَّ ثَلَاثًا (ترجمہ) :۔ لیکن اِس طلاق کا حکم یہ ہے۔ کہ رجعی طلاق کی عدّت

گزرنے کے بعد طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔ اور بائن طلاق دیتے ہی واقع ہو جاتی ہے۔ اور جب تیسری طلاق دے دی گئی۔ تو طلاق مکمل ہو کر مغلظہ ہو گئی۔ اور دوبارہ نکاح ہونا ناجائز ہو گیا:

خیال رہے کہ مدخولہ بیوی وُہ ہے۔ جس سے اُس کے خاوند نے بعد نکاح صحبتِ وطی یا خلوتِ صحیحہ کی ہو خلوتِ صحیحہ کی شرعی تعریف یہ ہے کہ خاوند بیوی میں ایسی تنہائی میسر آجائے۔ جو وطی میں رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ اِسی طرح ھدایہ جلد دوم ۳۱ میں ہے:: **ساتویں طلاق**:- طلاقِ بدعت وقتی اِس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی حیضوں والی بیوی کو حالتِ حیض میں یا ایسے طہر میں جس میں صحبت جماع کیا ہو۔ ایک یا دو طلاقیں رجعی دے۔ اسی طرح شرح وقایہ میں ہے۔ اِس کا حکم یہ ہے۔ کہ طلاق رجعی ہوتی ہے۔ اور رجوع کرنا واجب ہے چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۴۹ پر ہے:- وَالْاَصَحُّ اَنَّ الرَّجْعَةَ وَاجِبَةٌ (ترجمہ) اور صحیح یہ ہے۔ کہ رجوع کر لینا واجب ہے۔ اس طلاق سے خاوند گناہگار نہ ہوگا:: **آٹھویں طلاق**:- طلاقِ بدعت عددی ہے۔ اِس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی بیوی کو ایک طہر میں ایک دم تین طلاق یا دو طلاق دے دے۔ ایک لفظ سے۔ جیسے کہ تجھ کو تین طلاق یا متفرق کرکے۔ جیسے کہ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ اور جیسے کہ تجھ کو طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ یا مثلاً تجھ کو دو طلاقیں یا تجھ کو طلاق ہے۔ طلاق ہے۔ اِس کا حکم یہ ہے۔ طلاقیں جتنی دے گا۔ واقع ہو جائیں گی۔ اور خاوند گناہگار ہوگا۔ عالمگیری میں ہے:- فَاِنْ فَعَلَ ذٰلِكَ وَقَعَ الطَّلَاقُ وَكَانَ عَاصِيًا (ترجمہ) اگر خاوند نے اِس طرح طلاقِ بدعت عددی دی۔ تو طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اور دینے والا خاوند گناہگار ہوگا:: **نویں طلاق**:- صریح رجعی طلاق ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی مدخولہ بیوی کو صاف صاف ایسے الفاظ سے ایک یا دو طلاق دے۔ جو لفظ صرف طلاق کے لیے ہی اِستعمال ہوتے ہیں۔ نہ اِس میں شدت ہو۔ نہ زیادتی ہو۔ نہ تعلیق ہو۔ نہ اضافت ہو نہ کسی صفت سے موصوف ہو۔ نہ خلع ہو۔ نہ بائنہ اور نہ جدائی کے الفاظ ساتھ میں شامل ہوں۔ اِسی طرح فتاوٰی شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۵۹۲ پر ہے:- اور ھدایہ جلد دوم ۳۳۳ پر ہے:- فَالصَّرِيْحُ قَوْلُهٗ اَنْتِ طَالِقٌ وَمُطَلَّقَةٌ وَطَلَّقْتُكِ فَهٰذَا يَقَعُ بِهِ الطَّلَاقُ الرَّجْعِيُّ لِاَنَّ هٰذِهِ الْاَلْفَاظَ تُسْتَعْمَلُ فِي الطَّلَاقِ وَلَا تُسْتَعْمَلُ فِيْ غَيْرِهٖ اھ:- (ترجمہ):- پس صریح طلاق کے الفاظ یہ ہیں۔ کہ تُو طلاق والی ہے۔ تو مطلقہ ہے۔ تجھ کو مَیں نے طلاق دی۔ اُن لفظوں سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ الفاظ طلاق ہی میں اِستعمال کئے جاتے ہیں۔ طلاق کے غیر میں مُستعمل نہیں ہوتے اور فتاوٰی کاملیہ حنفیہ صفحہ نمبر ۲۸ پر ہے:- وَالطَّلَاقُ الرَّجْعِيُّ هُوَ مَا كَانَ دُوْنَ الثَّلَاثِ بِصَرِيْحِ الطَّلَاقِ وَلَمْ يَصِفْهُ بِضَرْبٍ مِّنَ الشِّدَّةِ وَلَمْ يَكُنْ بِمُقَابَلَةِ مَالٍ اھ (ترجمہ):- طلاقِ رجعی وُہ ہے۔ جو تین طلاق سے کم ہو۔ اور الفاظ طلاق کے ہوں۔ شدت نہ پائی جائے (جیسے کہ پہاڑ بھر کے طلاق) نہ مال کے بدلے میں طلاق ہو۔ اِس طلاق کا حکم یہ ہے۔ کہ ایک طلاق ہو۔ یا دو۔ رجعی ہی واقع ہوتی ہے۔

اگرچہ بائنہ کی نیت کرے۔ عدت کے اندر اندر خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ اگرچہ بیوی مطلقہ رجعیہ کو پتہ لگے یا نہ۔ رجوع صحیح ہوگا۔ اور یہی رجعی بعد عدت بائنہ بن جاتی ہے۔ **دسویں طلاق**: صریح بائنہ ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی غیر مدخولہ بیوی کو لفظِ طلاق سے طلاق دے۔ ایک یا دو۔ مگر شدت یا صفت یا اضافت یا تعلیق یا خلع شامل کر دے۔ ایسے ہی فتاوٰی ردّ المحتار جلد دوم صفحہ نمبر ۵۹۲ پر ہے۔ اس کا حکم یہ ہے۔ کہ عدت کے اندر رجوع نہیں کر سکتا۔ اور اس نکاح سے خاوند صرف ایک ہی کا مالک بن سکتا ہے بعد عدت یا عدت میں دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ اور اس نکاح سے خاوند تین طلاق کا مالک ہرگز نہیں بن سکتا۔ اب پھر جب کبھی طلاق دینا چاہے گا تو ایک طلاق ہی مغلظہ ہوگی۔ **گیارہویں طلاق**: مغلظہ۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی مدخولہ یا غیر مدخولہ بیوی کو صریح یا غیر صریح الفاظ سے یک دم یا تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین طلاق دیدے۔ اس کا حکم یہ ہے۔ کہ تمام فقہاء کرام کے نزدیک اور بحکم قرآن وحدیث بہر صورت تینوں طلاق واقع ہو جاتی ہیں۔ اور بعد عدت بغیر حلالہ اس خاوند کے نکاح میں دوبارہ نہیں آسکتی۔ **بارہویں طلاق**: طلاقِ کنایہ ہے اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی بیوی غیر مدخولہ یا مدخولہ کو ایک یا دو طلاق ایسے لفظوں سے دے۔ جو الفاظ صرف طلاق کے لئے استعمال نہیں ہوتے بلکہ دیگر معانی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ مگر جدائی کے معنی بھی اس میں پائے جاتے ہوں۔ اس کا حکم یہ ہے۔ کہ اگر خاوند کی نیت ہو طلاق دینے کی یا حالات اور موقعہ طلاق کا ہو۔ تو طلاق ہوگی۔ لیکن اگر نہ تو طلاق کا ذکر ہو۔ اور نہ بقولِ خاوند اس کی طلاق دینے پر نیت ہو۔ تب طلاق واقع نہ ہوگی۔ اور شریعتِ مطہرہ کے نزدیک اس خاوند کے بولے ہوئے الفاظ کے دوسرے معنی لئے جائیں گے۔ **تیرہویں طلاق**: طلاق بالخلع۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی مدخولہ یا غیر مدخولہ بیوی کو یہ کہے۔ کہ اتنے پیسے دے۔ تو میں تجھ کو طلاق دے دوں۔ اور بیوی قبول کرلے۔ اس کا حکم یہ ہے۔ کہ جب خاوند طلاق دیدے۔ اور بیوی مالِ خلع ادا کر دے۔ تو طلاقِ بائنہ واقع ہو جاتی ہے۔ خواہ ایک دفعہ طلاق دے یا دو دفعہ۔ خاوند رجوع نہیں کر سکتا۔ خاوند کے لئے اتنا روپیہ لینا جائز ہے۔ جتنا اس نے مہر دیا تھا۔ **چودھویں طلاق**: طلاق باللعان۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند اپنی بیوی پر ایسے زنا کی تہمت لگائے کہ جس پر حدِ شرعی لگائی جاتی ہو۔ وہ بیوی عدالت میں لعان کا دعوٰی کرے۔ حاکمِ وقت لعان دونوں طرف سے کر خاوند بیوی کو جدا کر دے۔ اس طلاق کا یہ حکم ہے۔ کہ اس سے طلاقِ بائنہ واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ فتاوٰے تنویر الابصار شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۸۰۶ پر ہے: وَيَسْقُطُ اللِّعَانُ بَعْدَ وُجُوْبِهٖ بِالطَّلَاقِ الْبَائِنِ (ترجمہ): اور لعان ساقط ہوتا ہے۔ بعد وجوب طلاق بائنہ پر۔ **پندرھویں طلاق**: طلاق بالفسخ ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ خاوند کی طرف سے خانہ بربادی اور بے آبادی کی صورت پیدا ہو۔ حاکمِ وقت یا مفتیِ اسلام بعد تحقیق شرعی

قواعد کے تحت نکاح کر دے۔ مذہب اسلام میں چاروں مسلکوں کے مطابق فسخ نکاح چار صورتوں میں ہو سکتا ہے ایک یہ کہ خاوند متعنت ہو یعنی نہ بیوی کو بساتا ہو نہ خرچہ دیتا ہو نہ طلاق دیتا ہو نہ خلع چاہتا ہو نہ بیوی کے لواحقین میں جبری طلاق کی ہمت ہو۔ جیسا کہ پہلے متعنت کے فتوے میں پوری تفصیل کر دی گئی دوم یہ کہ خاوند مرتد ہو جائے۔ فسخ حاکم ضروری ہے یا بیوی مسلمان ہو جائے۔ یا خاوند مسلمان ہو جائے۔

سوم:۔ یہ کہ خاوند لاپتہ یا دیوانہ دائمی ہو جائے

چہارم:۔ یہ کہ خاوند نامرد ہو ان سب حالتوں میں حاکم وقت یا مفتی اسلام کا فیصلہ ضروری ہے ان قسموں میں اہم متعنت کا مسئلہ ہے اس کا حکم یہ کہ یہ فسخ طلاق بائنہ ہو گی نہ رجعی ہو گی نہ مغلظہ کیونکہ فسخ جس کا موجب خاوند ہو۔ طلاق بائنہ بنتا ہے۔ چنانچہ درمختار جلد دوم صفحہ نمبر ۲۱۲ پر ہے:۔ ثُمَّ الْفُرْقَةُ اِنْ مِنْ قِبَلِهَا فَفَسْخٌ (الخ) وَاِنْ مِنْ قِبَلِهٖ فَطَلَاقٌ (ترجمہ) ہر وہ جدائی جو بیوی کی وجہ سے پیدا ہو۔ وہ فسخ نکاح ہے۔ اور وہ جدائی جو خاوند کی وجہ سے ہو۔ وہ طلاق ہے۔ اس کی شرح میں علامہ شامی علیہ الرحمۃ اللہ نے فرمایا:۔ وَفِيْهِ نَظَرٌ فَاِنَّهٗ يَقْتَضِيْ اَنْ يَكُوْنَ التَّبَايُنُ (ترجمہ):۔ اس میں کچھ غور ہے۔ تقاضا یہ ہے۔ کہ یہ طلاق بائن ہو گی۔ شریعت میں فقط یہی اقسام ہیں۔ جن سے طلاق واقع ہوتی ہے دوسرے سوال کا جواب قانون شریعت کے مطابق نکاح شرعی کے بعد بیوی دو قسم کی ہو سکتی ہے:۔ ع۱:۔ مطلقہ ۔ ع۲:۔ متوفی عنہا زوجہا یعنی بیوہ، ۔ مطلقہ وہ ہے۔ کہ جس کے خاوند نے طلاق کی پندرہ قسموں میں سے کوئی طلاق دی ہو۔ اور بیوہ وہ کہلاتی ہے۔ جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو۔ بیوہ اور مطلقہ دونوں عورتوں کی چار حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ع۱:۔ صغیرہ ہونا۔ یعنی نابالغی کی وجہ سے حیض نہ بستا ہو ۔ دوسری حائضہ۔ یعنی جوانی کی بنا پر ماہواری خون آتا ہو۔

تیسری حالت حاملہ ہونا یعنی بوجہ حمل حیض نہ آئے ۔ **چوتھی حالت** آئسہ یعنی بیوی کے بہت بوڑھا ہونے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو۔ ان حالتوں کی بنا پر عدت آٹھ قسم کی ہوتی ہے۔ ع۱:۔ مطلقہ صغیرہ کی حالت کبریٰ کی عدت تین مہینے ۔ ع۲ مطلقہ حائضہ کی عدت تین حیض ۔ ع۳:۔ مطلقہ حاملہ کی عدت حمل کا پیدا ہو جانا ۔ ع۴:۔ مطلقہ حائضہ آئسہ کی عدت تین مہینے جب یہ مدتیں پوری ہوں گی۔ عدت ختم ہو جائے گی ۔ ع۵:۔ بیوہ صغیرہ کی عدت چار ماہ دس دن ۔ ع۶:۔ بیوہ حائضہ کی عدت چار ماہ دس دن ع۷ بیوہ آئسہ کی عدت چار ماہ دس دن۔ قانون اسلامیہ کی رو سے یہ تین قسم کی بیوہ عورتیں ایک ہی طرح عدت گزاریں گی۔ چنانچہ تنویر الابصار جلد دوم علامہ شامی صفحہ نمبر ۸۳۰ پر ہے:۔ وَالْعِدَّةُ لِلْمَوْتِ اَرْبَعَةُ اَشْهُرٍ وَعَشْرُ اَيَّامٍ مُطْلَقًا (ترجمہ):۔ مطلقاً موت کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اس کی شرح میں ہے

وَلَوْ صَغِيْرَةً اَوْ كَبِيْرَةً (ترجمہ) :- اگرچہ بیوہ چھوٹی ہو یا بڑی (یعنی حائضہ و آئسہ) خیال رہے۔ کہ تین قسم کی مطلقہ میں تو شرط ہے۔ کہ اگر صحبت شدہ ہو گی۔ تب عدت واجب نہیں ہوتی۔ غیر مدخولہ یا غیر خلوتِ صحیحہ والی عورت کو اگر طلاق ہو۔ تو عدت واجب ہو گی۔ ع۸ :- بیوہ حاملہ کی عدت۔ وضع حمل ہے خلاصہ یہ کہ چونکہ عورتوں کی حالتیں آٹھ قسم کی ہیں۔ چار مطلقہ عورت کی اور چار بیوہ کی۔ اس لیے عدت آٹھ قسم کی ہو گی سائل کے تیسرے سوال کا جواب قانونِ شریعت کے مطابق حرمت بالنکاح اصلیت کے لحاظ سے دو قسم کی ہے۔ نمبر ۱ :- حرمتِ ابدی ؛ نمبر ۲ حرمتِ عارضی ؛ حرمتِ اصلیہ وہ ہے۔ جو بغیر کسب کے پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ حرمتِ ابدی جو مرنے تک باقی رہے۔ حرمتِ عارضی جو نکاح سے ختم ہو جائے۔ حرمت بالنکاح اصلی ابدی کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی حرمت نسبی، دوسری حرمتِ رضاعی، حرمتِ عارضی ان دونوں کے علاوہ ہے فرعیت کے لحاظ سے بھی حرمت کی دو قسمیں ہیں :-

پہلی قسم ع۱ :- حرمتِ فرعی ابدی ؛ ع۲ حرمتِ فرعی عارضی ؛ حرمتِ فرعی ابدی، صرف حرمت مصاہرت ہے۔ مصاہرت خواہ حرام طریقے سے ہو یا حلال طریقے سے۔ حرمتِ فرعی عارضی کی چار قسمیں ہیں :-

پہلی قسم ع۱ :- ایک حرمت بالجمع ؛ نمبر ۲ :- حرمتِ بالشرک ؛ نمبر ع۳ :- حرمت بحقِ غیر ؛ (ع۴) :- حرمت بالطلاق ؛ فقہاء کرام کے نزدیک وہ حرمت جو نکاح کے ہونے نہ ہونے سے متعلق ہے۔ وہ بس یہی دس اقسام ہیں۔ ان قسموں کے ذریعے ہر مسلمان پر شریعت میں کل ایک سو بارہ عورتیں حرام ہیں۔ جن کی فہرست علیٰ حسب ترتیب مندرجہ ذیل ہے۔ اوّل حرمتِ نسبی کے ذریعہ تئیس ۲۳ عورتیں حرام ہوتی ہیں :- نمبر ع۱ :- والدہ سگی ؛ ؛ نمبر ع۲ :- سگی دادی ؛ نمبر ع۳ :- پڑدادی اور اوپر تک تمام دادیاں۔ نمبر ع۴ :- نانی سگی ۵ سگی پڑنانی، اور اوپر تک تمام نانیاں ؛ ع۶ :- سگی بیٹی ؛ ع۷ سگی بہن ؛ ع۸ باپ شریکی (علاتی) بہن ؛ نمبر ع۹ :- ماں شریکی اخیافی بہن ؛ ع۱۰ :- سگی پھوپھی۔ نمبر ع۱۱ :- اپنی والدہ کی طرف سے سگی پھوپھی ؛ نمبر ع۱۲ :- اپنے باپ کی طرف سے سگی پھوپھی۔ نمبر ع۱۳ :- ماں باپ کی طرف سے پھوپھی کی پھوپھی ؛ نمبر ع۱۴ :- باپ کی طرف سے سگی پھوپھی کی پھوپھی ؛ نمبر ع۱۵ :- سگی خالہ ؛ نمبر ع۱۶ :- صرف ماں کی طرف سگی خالہ ؛ نمبر ع۱۷ :- صرف اپنے والد کی طرف سے سگی خالہ ؛ ع۱۸ :- پوتی ؛ نمبر ع۱۹ :- پڑپوتی اور نیچے تک تمام پوتیاں ؛ ع۲۰ نواسی ؛ نمبر ع۲۱ :- پڑنواسی اور نیچے تک تمام نواسیاں ؛ ع۲۲ :- بھتیجی اور اس کی اولاد نمبر ع۲۳ :- بھانجی اور اس کی اولاد۔ **دوم** :- حرمت رضاعی اس کے تین فریق ہیں۔ پہلا فریق وہ لوگ جو دودھ پینے والے بچے اور بچی پر حرام ہیں۔ دوسرا فریق وہ لوگ جو دائی اور اس کے خاوند پر حرام۔ فریق سوم جو بچے اور بچی پر آپس میں حرام ہیں۔ اس طریقے سے حرمت رضاعی کے ذریعے کل ع۴۲ مرد و عورتیں حرام ہیں :-

نمبر ۱ :۔ دودھ پلانے والی ، نمبر ۲ :۔ دودھ والی کا خاوند :۔ نمبر ۳ دائی مرضعہ کی سگی بیٹی :۔ نمبر ۴ دائی مرضعہ کی یعنی دودھ پلانے والی کی پوتی پڑپوتی اور تمام پوتیاں ، نمبر ۵ دودھ پلانے والی کی نواسی اور تمام نواسیاں نمبر ۶ :۔ دودھ پلانے والی کا سگا بیٹا ، نمبر ۷ :۔ دودھ پلانے والی کا رضاعی بیٹا ، نمبر ۸ مرضعہ کا رضاعی یعنی دودھ پوتا ، پڑپوتا ، اور نیچے تک سب پوتے ، ع ۹ :۔ مرضعہ کی رضاعی پوتی اور نیچے تک سب پوتیاں ، نمبر ۱۰ مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی کی رضاعی نواسی اور نیچے تک سب نواسیاں ۔ یہ سب ابدی حرام ہیں۔ دودھ پینے والے لڑکے اور لڑکی پر :۔ نمبر ۱۱ دائی کا دوسرا خاوند ، نمبر ۱۲ :۔ دودھ پلانے والی کے خاوند کی دوسری بیوی نمبر ۱۳ :۔ دودھ پینے والی کی سگی والدہ :۔ نمبر ۱۴ :۔ دودھ پلانے والی کا سگا والد ، نمبر ۱۵ :۔ دودھ پلانے والی کے خاوند کا سگا والد ، نمبر ۱۶ :۔ خاوند کی سگی والدہ ، نمبر ۱۷ :۔ خاوند کا سگا بھائی نمبر ۱۸ :۔ مرضعہ کی سگی بہن ، نمبر ۱۹ سگا بھائی رضیع کی سگی بیٹی ، نمبر ۲۰ سگی بہن ، نمبر ۲۱ :۔ خاوند کا نانا پڑنانا ، اور اوپر تک سب نانے ، نمبر ۲۲ :۔ دودھ پینے والا جس کو عربی لغت میں رضیع کہا جاتا ہے اس کی مونث رضیعہ ہے۔ نمبر ۲۳ دودھ پینے والی لڑکی ، نمبر ۲۴ :۔ سگی بہن ، نمبر ۲۵ :۔ رضیع کی سگی پوتی ، ، ، پڑپوتی اور نیچے تک ، ع ۲۶ دودھ پلانے والی کی سگی بیٹی ، نمبر ۲۷ :۔ بچی کی پوتی پڑپوتی وغیرہ ، ع ۲۸ :۔ بچی کا پوتا وغیرہ ، نمبر ۲۹ :۔ بچی کی نواسی وغیرہ ، نمبر ۳۰ : بچی کا نواسا وغیرہ ، ع ۳۱ :۔ بچے کا سگا بھائی ، بچی کا سگا بھائی ، ع ۳۲ :۔ بچے کی سگی بہن ، ع ۳۳ بچے کی بیوی ، نمبر ۳۴ بچی کا خاوند ۔ یہ سب دائی اور اس کے خاوند پر حرام ہیں ، نمبر ۳۵ :۔ دودھ پینے والا رضاعی بھائی ، ع ۳۶ :۔ رضاعی بہن ، ع ۳۷ :۔ رضاعی بہن کی سگی والدہ ، ع ۳۸ :۔ رضاعی بھائی کا سگا والد ، نمبر ۳۹ :۔ رضاعی بھائی کا بیٹا ، پوتا ، پوتی وغیرہ نیچے تک ، نمبر ۴۰ :۔ رضاعی بھائی کی بیٹی ، نواسی ، نواسہ وغیرہ نیچے تک ، نمبر ۴۱ :۔ رضاعی بہن کی بیٹی نواسی ، نواسہ وغیرہ نیچے تک ، نمبر ۴۲ :۔ رضاعی بہن کا بیٹا ، پوتا ، پوتی وغیرہ نیچے تک یہ سب آپس میں رضاعی بہن بھائی پر حرام ہیں حرمت رضاعت کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ دودھ پلانے والی کے تمام قرابت دار اسی طرح دودھ پینے والے بچے اور بچی پر حرام ہیں جیسے کہ اپنے ماں باپ کے قرابت دار حرام ہوتے ہیں۔ اور دودھ پینے والے کی صرف بیوی اور اولاد دودھ پینے والی بچی کا صرف خاوند اور اولاد ۔ اپنی مرضعہ اور اس کے خاوند پر حرام ہیں چنانچہ شرح وقایہ جلد دوم صفحہ نمبر ۶۷ پر اس پورے ضابطے کو ایک شعر میں جمع فرمایا ہے۔ ؎

شعر

از جانب شیر دہ ہمہ خویش شوند
وز جانب شیر خوار زوجان و فروع

ترجمہ :۔ یہ ہے۔ کہ دودھ دینے والی دائی کے تمام وہ رشتے دار جو دائی اور اس کے خاوند پر

ابدی حرام ہیں۔ وہ دودھ پینے والے بچے اور بچی پر ابدی حرام ہیں۔ لیکن دودھ پینے والے کی طرف سے وہ خود اور ان کا خاوند یا بیوی اور اولاد نیچے تک دائی اور اس کے خاوند پر حرام ہو گی:۔

تیسری حرمت:۔ جو عدمِ نکاح سے ثابت ہوتی ہے۔ اگر نکاح قائم ہو جائے۔ تو حرمت بھی ختم۔ اس لحاظ سے تمام عورتیں حرام ہیں۔ کیونکہ بلا نکاح کسی عورت سے فی زمانہ صحبت جائز نہیں کیونکہ لونڈی غلام اب نہیں ہیں۔ **چوتھی حرمت** مصاہرت۔ اس کے ذریعہ کل چودہ عورتیں حرام ہیں نمبر ۱:۔ بیوی کی والدہ:۔ نمبر ۲:۔ بیوی کی دادی: نمبر ۳:۔ بیوی کی نانی: نمبر ۴:۔ بیوی کی بیٹی جو پہلے خاوند سے ہو: نمبر ۵:۔ بیوی کی پوتی: نمبر ۶:۔ بیوی کی نواسی: نمبر ۷:۔ بیٹے کی بیوی: نمبر ۸:۔ پوتے کی بیوی: نمبر ۹:۔ نواسے کی بیوی: نمبر ۱۰:۔ والد کی دوسری بیوی: نمبر ۱۱:۔ دادا کی بیوی: نمبر ۱۲:۔ پڑدادا وغیرہ کی بیوی: نمبر ۱۳ نانا کی بیوی: نمبر ۱۴:۔ پڑنانا وغیرہ کی بیوی۔ یہ چودہ عورتیں مصاہرۃ حلال سے حرام ہوئیں۔ ان میں شرط ہے۔ کہ اپنی زوجہ سے خلوتِ صحیحہ یا دخول کیا ہو۔ حرام مصاہرت سے دس عورتیں حرام ہوئیں:۔

نمبر ۱:۔ مزنیہ کی والدہ: نمبر ۲:۔ مزنیہ کی دادی: نمبر ۳ نانی: نمبر ۴ مزنیہ کی بیٹی: نمبر ۵:۔ مزنیہ کی پوتی: نمبر ۶:۔ مزنیہ کی نواسی: نمبر ۷: جس اجنبیہ کو شہوت سے چھوا ہو۔ یا کاٹا ہو۔ اس کی ماں، دادی نانی، بیٹی، پوتی، نواسی: نمبر ۸:۔ باپ کی مزنیہ: ۹:۔ جس اجنبیہ کی فرج داخلی شہوت سے دیکھی ہو۔ اس کی ماں، دادی وغیرہ: ۱۰:۔ جس نے اجنبیہ کو شہوت سے چھوا ہو اس کی ماں، دادی، بیٹی، پوتی، نواسی وغیرہ:۔

پانچویں حرمت:۔ بالجمع کے ذریعے کل پانچ عورتیں حرام ہوئیں۔ نمبر ۱:۔ اپنی بیوی سے بحالتِ آبادی اپنی سالی: نمبر ۲:۔ بیوی کے ہوتے ہوئے پھوپھی ۳:۔ بیوی کے ہوتے ہوئے اس کی بھتیجی ۴:۔ بیوی کی خالہ ۵:۔ بیوی کی بھانجی اسی طرح تمام وہ عورتیں جن کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ ایسی عورتیں وہ ہیں۔ کہ اگر ان میں ایک مرد ہوتا۔ تو ان کا آپس میں نکاح حرام ہوتا۔ ان دونوں عورتوں کا ایک خاوند نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ حرمت عارضی ہے۔ کہ بیوی کی موت یا طلاق کے بعد یہ حرام عورتیں حلال ہو جاتی ہیں۔

چھٹی حرمت:۔ بالشرک۔ اس کے ذریعے نو عورتیں حرام ہیں۔ ۱:۔ ہندو عورت: ۲:۔ سکھ عورت: ۳:۔ بدھ مت: ۴:۔ مجوسی عورت: ۵:۔ آریہ: ۶:۔ مرزائی عورت: ۷:۔ مرتدہ عورت: ۸:۔ لادین (دہریہ): ۹:۔ اسی طرح تمام کافرہ عورتیں۔ بجز مذہبی عیسائی اور مذہبی یہودی کے حرمت عارضی سے حرام ہیں۔ کیونکہ اگر ان میں کوئی عورت مسلمان ہو جائے تو مسلمان پر نکاح حلال ہو گا:۔

ساتویں حرمت بحقِ غیر۔ اس کے ذریعے کل دو عورتیں حرام ہیں:۔ ۱:۔ دوسرے کی بیوی ۲:۔ دوسرے کی طلاق شدہ عدت والی بیوی: یا بیوہ۔ **آٹھویں حرمت** بالطلاق کے

ذریعے کل سات عورتیں حرام ہیں:- نمبر۱ اپنی مطلقہ رجعیہ بعد عدت نمبر۲:- مطلقہ بائنہ نمبر۳:- مطلقہ مغلظہ (ثلاثہ) نمبر۴:- فسخ نکاح والی نمبر۵:- ظہار والی بیوی نمبر۶:- لعان والی بیوی نمبر۷:- ایلاء والی بیوی

یہ تھیں وہ حرمتیں جن کے ذریعے مندرجہ بالا بلحاظ قانون شرعی کل ایک سو بارہ عورت ہر مسلمان مرد پر حرام ہیں۔ یادداشت کے لیے نقشہ ملاحظہ ہو

نسب ابدی حرام ۲۲	رضاعی ابدی ۴۲	مصاہرت شرعی ابدی ۱۴
مصاہرت ناجائز ۱۰	حرمت بالجمع ۵	بالشرک ۹
بحق غیر ۲	بالطلاق ۷	کُل تعداد ۱۱۲

موقت کتنی

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ:- ط

کتبہ

بیوی کو ماں، بہن کہنے کا حکم

سوال نمبر۶۰:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آج سے دس دن پیشتر میں نے اپنی بیوی مسمات زینت کو دوران گھریلو جھگڑے کے قرآن مجید پر ہاتھ لگا کر صرف دو مرتبہ یہ کہا کہ تو میری ماں، بہن ہے۔ اب یہاں سے چلی جا۔ اس پر میری بیوی زینت نے کہا کہ میں تو نہیں جاؤں گی۔ یہیں بسوں گی۔ میں اتنی بات کہہ کر گھر سے نکل گیا۔ اس وقت گھر میں میری بیوی کے علاوہ محلے کی دو لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک لڑکی بہت چھوٹی بچی تھی لہٰذا موقعہ کے گواہ یا میری بیوی یا ایک بڑی لڑکی یہ دونوں گواہ میرے اس بیان پر حلفیہ تصدیق کرتے ہیں۔ اب میں لڑائی جھگڑا ختم کرکے اپنی بیوی کو آباد کرنا چاہتا ہوں۔ بستی کے چند معزز حضرات سے بھی میری بیوی نے کہا تھا کہ میرے خاوند نے مجھ کو ماں، بہن کہہ کر علیحدہ کر دیا ہے۔ وہ حضرات بھی شنید گواہ کے طور پر پیش کر سکتا ہوں لہٰذا میری درخواست کو قبول فرماتے ہوئے مجھ کو شرعی فتویٰ دیا جائے کہ کیا ہم کسی طرح اب دونوں خاوند بیوی آباد ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہو سکتے تو شرعی طریقہ کیا ہے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا

دستخط سائل بکر بن علی قوم گوجر ساکن چیلیانوالہ ۱۲ ۸/ ۷۸

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

اَلْجَوَاب

قانون شریعت کے مطابق صورت مسئولہ میں سائل مذکور بکر بن علی کی طرف سے اس کی بیوی زینت مذکورہ پر دو طلاق واقع ہو گئیں ہیں۔ اس لیے کہ بیوی کو ماں، بہن کہنا الفاظ کنایہ میں سے ہے فقہ اسلامی کی رو سے کنایہ وہ الفاظ ہیں۔ جس میں طلاق بھی مراد ہو سکتی ہو۔ اور غیر طلاق بھی۔ طلاق کیلئے مقرر نہ ہو۔ چنانچہ فتاویٰ در مختار صفحہ نمبر ۶۲۵ جلد دوم

پر ہے:۔ كِنَايَةٌ عِنْدَ الْفُقَهَاءِ مَا لَمْ يُوْضَعْ لَهُ اَيِ الطَّلَاقِ وَاحْتَمَلَهُ وَغَيْرَهُ (ترجمہ)
فقہاء کرام کے نزدیک طلاق کے کنایہ الفاظ وہ ہیں جو طلاق کے لیے مقرر نہ ہوں طلاق کا بھی احتمال رکھیں اور غیر کا بھی۔ اسی لیے
فقہاء اسلام مجتہدین کرام نے ان الفاظ کی مراد کے لیے تین صورتیں معیّن فرمائیں۔ پہلی صورت رضا دوسری صورت غضب
لڑائی جھگڑا۔ تیسری صورت مذاکرہ رضا کا مطلب ہے کہ وہ الفاظ محبت کے لیے بولے گئے۔ غضب سے مراد ہے۔ ان
لفظوں کو صرف ڈانٹنے کے لیے بولا۔ مذاکرہ کا مطلب ہے کہ جس وقت یہ لفظ بولے گئے اس وقت کسی کی طلاق کا ذکر ہو رہا
تھا۔ یہ تو الفاظ کنایہ کی مراد اور مطلب کی تین قسمیں تھیں۔ علماء ملت نے الفاظ کنایہ کی بھی تین قسمیں کی ہیں۔ ۱۔ وہ الفاظ جس
میں صرف تردید پائی جاتی ہے ۲۔ وہ الفاظ جو اکثر گالی کے لیے استعمال ہوتے ہیں ۳۔ وہ الفاظ جو اکثر جواب دینے
کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی کسی بات کا جواب بن سکیں اور طلاق بھی مراد ہو سکے۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ کنایہ الفاظ
کی حد بندی کوئی نہیں بلکہ زمانے اور اصطلاحات اور علاقے کے اعتبار سے الفاظ خود بخود معیّن ہو جاتے ہیں۔ اور
شریعت اسلامیہ کی عالمگیریت کی ایک شان یہ بھی ہے کہ شریعت پاک میں عرف عام کا بہت اعتبار ہے۔ شریعت
کے ہزاروں قوانین صرف عرف پر مرتّب ہو جاتے ہیں خصوصًا باب طلاق میں۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد دوم صفحہ نمبر
۵۱۴ پر ہے:۔ وَالْفَتْوٰى عَلَى الْعُرْفِ الْحَادِثِ۔ (ترجمہ):۔ اور فتویٰ نئے پیدا ہونے والے
عرف پر قائم ہوتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں:۔ بَلِ الصَّوَابُ حَمْلُهُ عَلَى الطَّلَاقِ لِاَنَّهُ الْعُرْفُ الْحَادِثُ
الْمُفْتٰى بِهٖ:۔ (ترجمہ):۔ بلکہ درست یہی ہے کہ ایسے الفاظ کو طلاق کے لیے بنایا جائے۔ اس لیے کہ اب
نیا رواج یہی ہو گیا ہے اور عرف پر ہی فتوے ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ عرف نیا ہو۔ ان دلائل کے اعتبار سے میں
مفتی اسلام ہونے کی حیثیت سے فتوے جاری کرتا ہوں کہ مسئولہ صورت میں طلاق پڑ گئی کیونکہ اب ہمارے معاشرے
خاص کر پنجاب میں ماں بہن کہنا لڑائی جھگڑے میں طلاق کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں کوئی خاوند بھی اس سے طلاق
کے علاوہ مراد نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی خاوند نے اپنی بیوی کو کہا کہ تو میری ماں بہن ہے تو بستی میں اس
کو طلاق سمجھ لیا جاتا ہے اور برادری میں شور مچ جاتا ہے اور فورًا اسلامی شرعی عدالت کے علماء اور مفتی حضرات
کے پاس مقدمے جاتے ہیں اور فتوے پوچھنے کے لیے بارعب ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود خاوند بھی اپنی اس
بات کو طلاق سمجھتے ہوئے کہہ دیتا ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو ماں بہن کہہ دیا یعنی لفظًا کہہ دیا۔ صاف طلاق ظاہر کرتا ہے اور بستی کا یہ رویہ بھی اسی کو ثابت کرتا ہے کہ اب
ہماری اصطلاح میں بیوی کو ماں بہن کہنا طلاق کنایہ بنا ہے جیسا کہ مجھ کو بحیثیت مفتی ہونے کے تجربہ ہے۔ لہٰذا ان حالات کے پیش نظر فی زمانہ اس طرح
الفاظ بولنے سے طلاق ہو جانے کا ہی فتویٰ دیا جائے گا۔ ہمارے بعض اکابرین۔ ماں بہن کہنے کو صرف جھوٹ میں داخل مان کر مکروہ کہا ہے
اور طلاق کنایہ میں شامل نہیں مانا۔ ان بزرگوں کا یہ فتوے اُن کے اپنے زمانے میں درست ہو سکتا تھا۔ مگر اب ہماری
اصطلاح میں وہ قدیم فتوے نافذ نہ ہوگا۔ اور ہم اُن سے اسی طرح اختلاف کریں گے جس طرح امام محمد و امام ابو یوسف

رحمۃ اللہ تعالٰی علیہما نے اپنے زمانوں میں اپنی اصطلاحات کے مدِ نظر تغیر احوال کے تحت امام اعظم کے فروعی مسائل سے اختلاف کیا جیسے کہ وہ اختلاف امام اعظم کی مخالفت یا اُن سے تصادم نہ تھا بلکہ صرف مرورِ زمانہ کی وجہ تغیر اصطلاحات کی بنا پر تھا۔ اسی طرح میرا جو فتوٰے بھی آپ ظاہراً اکابر متحدین سے متصادم سمجھیں وہ حقیقتاً متصادم نہیں بلکہ دلائل کثیرہ کی روشنی میں اصطلاحات کی وجہ سے صرف مختلف ہوگا۔ اور جس طرح امام یوسف رحمۃ اللہ تعالٰی علیہما وغیرہ کی یہ مشہور اختلافی مسائل اکابر کی گستاخی نہیں بلکہ اُن کی فروعی تحقیق ہے۔ اسی طرح میری یہ اختلافی جرأت بھی کسی بزرگ کی گستاخی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ شرعی تحقیق ہے۔ اور اشد ضروری کیونکہ عالم متغیر ہے اور یہاں کی ہر چیز حادث ہے۔ اس لیے نئی تحقیق بھی ضروریات میں سے ہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ اصول کے مطابقت ہوں۔ اور ماں بہن کا یہ مسئلہ بھی بالکل اصول و قواعد کے عین مطابق ہے۔ بدیں وجہ حضرت اعلٰی پیر سید مہر علی شاہ قدس سرّہٗ نے اپنے فتاوٰی مہریہ میں ان الفاظ یعنی بیوی کو ماں بہن کہنے کو طلاق کنایہ قرار دیا۔ اور چونکہ کنایہ الفاظ میں متعدد احتمال ہوتے ہیں۔ جن کا دار و مدار خاوند کی نیت پر ہوتا ہے۔ اس لیے ماں بہن کہنے میں بھی چند احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کو بول کر طلاق مراد لی جائے دوسرا یہ کہ اس کو بول کر ظہار مراد لیا جائے۔ تیسرا یہ کہ اس کو بول کر پیار و محبت مراد لیا جائے اور بلا ارادۂ طلاق و ظہار محض پیار میں بیوی کو یا امی جان اور اسے بہن کہہ کر پکارے۔ پہلی صورت میں طلاق بائنہ واقع ہوگی دوسری صورت میں ظہار مگر ظہار میں اکثر لفظ مثل بھی بول دیا جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ۱۲۵ پر ہے:۔ وَلَوْ قَالَ اَنْتِ عَلَیَّ مِثْلُ اُمِّیْ فَاِنْ نَوَی الْکَرَامَۃَ صُدِّقَ اَوِ الظِّھَارَ فَظِھَارٌ اَوِ الطَّلَاقَ فَبَائِنٌ وَاِنْ لَّمْ یَنْوِ شَیْئًا فَلَیْسَ شَیْءٌ۔ اور شرح الیاس جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۱ پر ہے۔ وَفِیْ قَوْلِہٖ اَنْتِ عَلَیَّ کَاُمِّیْ صَحَّ نِیَّۃُ الظِّھَارِ۔ (الخ) لٰکِنَّہٗ لَیْسَ بِصَرِیْحٍ فِیْہِ فَاشْتُرِطَ النِّیَّۃُ وَصَحَّ نِیَّۃُ الطَّلَاقِ:۔ (ترجمہ):۔ تو مجھ پر میری ماں کی مثل ہے۔ اگر کسی خاوند نے اپنی بیوی سے ایسا کہا تو اگر عزت مراد لی تو درست مانی جائے گی۔ اگر ظہار کی نیت کی تو ظہار ہی ہوگا اگر طلاق کی نیت کی تو ایک طلاق بائنہ ہوگی۔ اگر کچھ نیت نہ کی تو یہ قول بیکار ہوگا۔ ظہار وغیرہ کی نیت اس لیے درست تسلیم ہوگی۔ کہ ماں بہن کہنا صریحی الفاظ نہیں ہیں بلکہ کنایہ ہیں۔ اس لیے خاوند کی نیت شرط ہے۔ اور طلاق کی نیت کی تب بھی ٹھیک ہے۔ تیسری صورت میں جب کہ پیار یا محبت میں ماں یا بہن کہہ کر پکار دیا تو کراہت لازم آئے گی چنانچہ فتاوٰے ردالمحتار جلد دوم صفحہ نمبر ۹۰۳ پر ہے:۔ وَفِیْ اَنْتِ اُمِّیْ لَا یَکُوْنُ مُظَاھِرًا وَیَنْبَغِیْ اَنْ یَّکُوْنَ مَکْرُوْھًا فَقَدْ صَرَّحُوْا بِاَنَّ قَوْلَہٗ لِزَوْجَتِہٖ یَا اُخَیَّۃُ مَکْرُوْہٌ (ترجمہ):۔ خاوند نے بیوی کو کہا تو میری ماں ہے تو ظہار نہیں ہوگا۔ اور مناسب یہ ہے کہ یہ کلام مکروہ ہو۔ اور یہ مناسبت اس لیے ہے کہ فقہاء کرام نے وضاحت کر دی حدیث پاک سے ارشاد کے حکم کی وجہ

سے اس طرح کہ خاوند نے اپنی بیوی کو کہا اے بہن۔ یہ کہنا مکروہ ہے۔ درِ مختار شامی کے پاس کراہت کی دلیل صرف وہ حدیث شریف ہے جو صحیح روایت ابوداؤد صفحہ نمبر ۳۰۲ پر درج ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ عَنْ اَبِیْ تَمِیْمَةَ الْھُجَیْمِیِّ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِامْرَاَتِهٖ یَا اُخَیَّةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ اُخْتُكَ هِیَ؟ فَكَرِهَ ذٰلِكَ وَنَهٰی عَنْهُ (ترجمہ):۔ ابی تمیمہ ہجیمی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو کہا اے بھنو (یعنی چھوٹی پیاری بہن) تو نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا یہ تیری بہن ہے؟ پس اس کہنے کو آپ نے ناپسند مکروہ فرمایا۔ اور اس طرح کہنے سے منع فرما دیا فقط اسی حدیث سے شامی نے استدلال کرتے ہوئے۔ بیوی کو ماں بہن بلانے کو مکروہ فرمایا۔ جیسا کہ فَقَدْ صَرَّحُوْا کے لفظ سے خود انہوں نے اعتراف کیا۔ حالانکہ یہ استدلال بہت کمزور ہے کیونکہ حدیث پاک میں۔ اے بہن کہنے کی ممانعت ہے اور شامی نے تو بہن ہے کو قیاس کیا۔ یہ قیاس مَعَ الْفَارِقِ ہے جس پر کراہت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یا اختی اور انت اختی میں بہت فرق ہے ۱۔ وہ ندا ہے یہ خبر ہے ۲۔ یا اختی میں صرف پکارنا ہے جو بلا قصد محض پیار میں بھی ہوتا ہے:۔ اور۔ اَنْتِ اُخْتِیْ۔ تو میری بہن ہے یہ جملہ خبریہ ہے اور طلاق میں جملہ خبریہ انشا بن جاتا ہے۔ جیسا کہ شائع ہے۔ تو گویا حدیثِ پاک نے پیار میں اے بہن کہنے کو منع فرمایا اور شامی نے اَنْتِ اُمِّیْ کو بھی اسی حکم میں شامل مانا۔ یہ قیاس اور یہ شمولیت ان کے زمانے میں تو شاید درست ہو گی۔ مگر فی زمانہ درست نہیں ہمارے زمانے کے بعض اصاغر مفکرین۔ شامی کو سند بناتے ہوئے۔ ابوداؤد شریف کی اسی حدیث پاک سے یہی استدلال کرتے ہوئے اب بھی کہہ دیتے ہیں کہ بیوی کو ماں بہن کہہ دینے سے طلاق نہیں ہوتی۔ اگرچہ خاوند طلاق کی نیت کرے یہ بات ان کی فحش غلطی ہے۔ حدیث پاک اپنی جگہ بالکل صحیح اور قابل قبول ہے مگر اس کا مطلب وہ نہیں جو ہمارے ہم عصر بورگوں نے دیا۔ روایتِ صحیحہ میں تو پیار محبت اور محض ندا مراد ہے۔ اس کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ پکارنا نہ طلاق ہے کیونکہ ندا ہے اور کنایۃً ندا طلاق نہیں ہو سکتی:۔ جب کہ پیار میں ہو۔ نہ ظہار کیونکہ ظہار میں تشبیہ ہوتی ہے۔ نہ ہی اس کو جھوٹ میں شامل مانا جا سکتا ہے کیونکہ جھوٹ میں کفارۂ کذب لازم آتا ہے۔ جیسا کہ شرح الیاس جلد چہارم صفحہ ۱۰۰ پر لکھا ہے۔ اگر ابی تمیمہ کی روایت میں خاوند کا قول یا اُخَیَّةُ جھوٹ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کفارۂ کذب تعزیراً جاری فرماتے۔ مگر صرف کراہت اور ممانعت فرمائی۔ جس سے ثابت ہوا کہ اس خاوند نے فقط پیار میں بیوی کو یا اُخَیَّةُ کہا۔ اور افصح الفصحاء پیارے آقا صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے اس لیے اس کو کلام محبت میں داخل مانا کہ وہ خاوند اپنی بیوی کو یا اُخْتِیْ نہیں کہتا بلکہ یا اُخَیَّةُ کہہ رہا ہے۔ لفظِ اُخَیَّةُ اُخْتٌ کا مصغر ہے جیسے اردو میں بہن اور بھنو۔ بہن عام لفظ ہے بھنو اس کی تصغیر یہ فقط پیار میں شفقت کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہم علامہ شامی علیہ الرحمۃ کے قیاس کو کس طرح درست مان سکتے ہیں۔ جب کہ وہ اَنْتِ اُمِّیْ اَنْتِ اُخْتِیْ کو یا اُخَیَّةُ پر قیاس کر رہے ہیں حالانکہ یہاں انتِ ہے وہاں یا حرف ندا ہے۔ یہاں اُخْتِیْ ہے وہاں اُخَیَّةُ یہاں یائے متکلم کی اضافت ہے وہاں کوئی اضافت نہیں۔ جب کہ طلاق میں اضافت شرط۔ لہٰذا حدیث پاک

میں تو طلاق یا ظہار یا کذب بالکل مراد نہیں لیا جاسکتا۔ مگر انتِ اختی انتِ امّی میں طلاق کی ساری شرطیں موجود۔ نور الانوار مطبوعہ مجتبائی کے صفحہ ۱۱۸ والی عبارت بھی ہم کو مضر نہیں کیونکہ ان کا اس مسئلہ کو حقیقت مجاز کی ترازو میں تول اپنے حکم لگانے کی صورت میں ہے۔ یعنی اگر خاوند اپنی بیوی کو بیٹی کہہ دے۔ اور خاوند کی اپنی طلاق کی نیت نہ ہو نہ ہی مذاکرۂ طلاق ہو تو مفتی اسلام خود حرمت کا حکم نہیں لگا سکتا نہ حقیقت کے لحاظ سے نہ مجاز کے اعتبار سے اور ہم جس موقف میں ہیں وہ کنایہ کی صورت میں ہے۔ اس لیے اگر کوئی خاوند بالارادہ طلاق کی نیت سے کہے تو طلاق پڑ جائے گی۔ چنانچہ اسی حدیث پاک کی شرح میں تفسیر ابن کثیر جلد چہارم ص ۳۲۱ پر ہے:۔ هٰكَذَا اَيْضًا عَمَّا خَرَجَ مِنْ سَبْقِ اللِّسَانِ وَلَمْ يَقْصُدْ اِلَيْهِ الْمُتَكَلِّمُ كَمَا رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ۔ پھر آگے فرماتے ہیں فَهٰذَا اِنْكَارٌ وَلٰكِنْ لَمْ تُحَرَّمْ عَلَيْهِ بِمُجَرَّدِ ذَالِكَ لِاَنَّهٗ لَمْ يَقْصُدْهُ وَلَوْ قَصَدَهٗ لَحُرِّمَتْ عَلَيْهِ۔: (ترجمہ):۔ ابوداؤد شریف کی حدیث مبارکہ کا مطلب یہ ہے۔ کہ خاوند بلا قصد زبان کی جلد بازی میں پیار کے طریقے پر اے بہن وغیرہ کہہ دے متکلم کا ارادہ طلاق نہ ہو تو یہ کہنا مکروہ ہے لیکن فقط اس صورت میں خاوند پر بیوی حرام نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے طلاق کا ارادہ نہیں کیا نہ طلاق کی حالت ہے کہ پیار محبت کی گفتگو ہو رہی ہے ہاں اگر انتِ اختی وغیرہ کہہ کر طلاق کا ارادہ کرے تو طلاق واقع ہو جائے گی:۔ طلاق کے باب میں حرمت سے مراد طلاق ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شرح الیاس جلد رابع صفحہ نمبر ص ۱۱۰ پر ہے۔ وَصَحَّ نِيَّةُ الطَّلَاقِ لِاَنَّهٗ تَشْبِيْهٌ بِالْاُمِّ فِي الْحُرْمَةِ:۔ اور خاوند طلاق کی نیت کرے تو صحیح ہے کیونکہ اس نے حرمت میں تشبیہ دی۔ ابن کثیر نے حدیثِ ابی داؤد کی شاندار وضاحت فرما دی۔ جس سے سب مسئلہ حل ہوگیا کہ اگر لڑائی جھگڑے میں ماں بہن کہا تو یہ کہنا طلاق بن سکتا ہے۔ اور اگر پیار میں سبقت زبان سے کہا تو مکروہ ہوگا۔ طلاق نہ بنے گی صورت مسئولہ میں چونکہ لڑائی جھگڑے میں ہی خاوند نے ماں، بہن کہا اور ہماری اصطلاح بھی یہی بن گئی ہے۔ لہٰذا فتویٰ یہی ہے کہ طلاق واقع ہو گئی۔ پھر جس طرح ماں کہنا حرمت پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح دادی کہنا پھوپھی کہنا خالہ کہنا بلکہ کسی بھی ذی رحم محرم کا لقب دینا حرمت یعنی طلاق واقع کر دیتا ہے۔ چنانچہ احکام القرآن للجصاص جلد سوم صفحہ نمبر ۴۲۲ پر ہے۔ اور ایسے ہی تفسیر ابن کثیر جلد چہارم صفحہ نمبر ص ۳۲۱ پر ہے:۔ لِاَنَّهٗ لَا فَرْقَ عَلَى الصَّحِيْحِ بَيْنَ الْاُمِّ وَبَيْنَ غَيْرِهَا مِنْ سَائِرِ الْمَحَارِمِ مِنَ الْاُخْتِ وَعَمَّتِهٖ وَخَالَتِهٖ وَمَا اَشْبَهَ ذَالِكَ:۔ (ترجمہ):۔ وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ ان دلائل مستندہ سے ثابت ہوا کہ بیوی کو ماں بہن کہنا طلاق کنایہ ہے۔ اور طلاق کنایہ بائنہ ہوتی ہے۔ چنانچہ شامی جلد دوم باب الکنایات صفحہ نمبر ص ۴۶۷ پر ہے:۔ وَنَوَى الطَّلَاقَ تَقَعُ وَاحِدَةٌ بَائِنَةٌ:۔ (ترجمہ):۔ یعنی اگر ایک دفعہ خاوند نے کنایہ طلاق کے الفاظ بولے۔ اور اس سے طلاق کی نیت کرلی تو ایک طلاق بائنہ واقع ہوگی۔ اسی طرح۔ اگر دو دفعہ کہے تو دو طلاق۔ تین دفعہ کہے تو تین طلاق مغلظہ واقع ہو جائیں گی۔ ہاں البتہ صریح اور کنایہ میں یہ مزید فرق ہے۔ کہ صریح طلاق تو بیکدم عدد بولنے سے بھی بمطابق عدد طلاق واقع ہو جاتی ہیں مثلاً خاوند

نے بیوی کو کہا تجھے تین طلاق تو تینوں واقع ہوں گی۔ بخلاف کنایہ کے کہ وہاں علیحدہ علیحدہ کہے گا تب ایک سے زیادہ واقع ہوں گی اگر خاوند یہ کہے کہ تو دو دفعہ میری ماں بہن ہے یا تین دفعہ ماں بہن ہے تو ایک ہی طلاق واقع ہو گی اگرچہ دو یا تین کی نیت کرے جیسے کہ ظہار ایک ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ خاوند کہے کہ تو تین دفعہ میری ماں کی طرح ہے یا جیسے کہ تو مجھ پر تین مرتبہ حرام ان سب صورتوں میں ایک ہی طلاق ہو گی۔ اسی طرح فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ص۷۹۱ پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلاق کنایہ کا دارو مدار حالت اور نیت پر ہے ایک دفعہ کے قول میں جنس نیت اور حالت ایک ہے جو فقط طلاق پر صادق آسکتی ہے۔ نہ کہ عدد پر۔ لہٰذا ایک حالت سے ایک طلاق ثابت ہو گی۔ ہاں اگر علیحدہ علیحدہ کہے تو نیت بھی علیحدہ ہو گی اور حالت بھی۔ لہٰذا ایک سے زائد طلاق واقع ہوں گی صورتِ مسئولہ میں چونکہ خاوند نے اپنی مذکورہ فی السوال بیوی کو دو دفعہ علیحدہ علیحدہ۔ ماں بہن کہا ہے۔ اس لیے دو طلاقیں واقع ہو گئیں۔ ہماری اس تقریر سے طلاق صریح اور بائن کا ایک عظیم فرق ثابت ہو گیا۔ اور اب یہ خاوند صرف ایک طلاق کا مالک رہ گیا۔ اور بیوی مدخولہ مطلقہ چونکہ ابھی عدت میں ہے۔ جیسا کہ عبارتِ سوال سے ظاہر ہے۔ لہٰذا سائل آج بھی نکاح کر سکتا ہے۔ اور بعد عدت بھی۔ کیونکہ طلاق دینے والے خاوند کو یہ ہر طرح جائز ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

سسرالی گھر جانے پر بیوی کی طلاق کو مُعلّق کرنے کا بیان

سوال نمبر ۱۶۱ :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ زید نے خانگی فسادات کی بنا پر کہا کہ آج کے بعد قسم کھاتا ہوں کہ اگر میں اپنے سسرال کے گھر پھر گیا تو میری بیوی کو طلاق طلاق طلاق طلاق تقریباً آٹھ دس مرتبہ کہا اور آخر میں کہا کہ ہزار بار طلاق۔ بالکل ختم۔ یہ طلاق کے حلفی بیانات ہیں۔ اور عرصہ گزر جانے کے بعد وہ کسی موقعہ پر کسی رشتے دار کے ساتھ اُن کے یعنی اپنے اسی سسرالی گھر میں چلا جاتا ہے۔ تو جن لوگوں کو پتہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ زید نے اُس گھر جانے کی قسم کھائی تھی اور کہا تھا کہ اگر اُس گھر جاؤں تو بیوی کو ہزار طلاق تو اس نے اقرار کیا ہے کہ ہاں میں نے کہا تھا۔ جس کے اب کئی گواہ بن گئے ہیں۔ لہٰذا از روئے شریعتِ اسلامیہ فتوٰی صادر فرمایا جائے کہ یہ طلاق بائن ہے۔ یا مُغلّظہ ہے۔ یا کوئی حیلہ و بچت ہے کہ نہیں ہے۔ ہمارے علاقے کے ایک مولوی صاحب نے کہا ہے۔ فتاوٰے عبدالحی جلد اول صف۳۵ اور جلد دوم صف۵۳ اور درِ مختار شامی میں لکھا ہے کہ اس طرح تین طلاق نہیں پڑتی۔ ایک ہی پڑتی ہے۔ مگر ہمارے بہاپور کے باقی لوگ کہتے ہیں کہ ہم۔ فتاوٰے عبدالحی کو نہیں مانتے۔ ہم کو گجرات کا فتوٰی منگا کر دکھاؤ۔ تب تسلیم کریں گے۔ لہٰذا آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ ضرور کوئی بچت کی صورت نکالیے۔ کیونکہ اس سے آٹھ خاندانوں کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ براہِ کرم جلدی فتوٰی

دیا جائے:۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا

سائل:۔ حکیم ایم اشرف علی ہاشمی محلہ شاہ گنج اندرون فرید گیٹ نزد شاہی بازار بہاولپور شہر۔ ۱۰؍۱۱؍۷۷

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

اَلْجَوَاب

صورتِ مسئولہ میں قانون شریعت کے مطابق زید کی طرف سے اس کی بیوی کو تین طلاق مغلظہ پڑ گئی ہیں۔ اور زید کی مجازی قسم ٹوٹ چکی ہے۔ جب زید نے کہا کہ میری بیوی کو طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ تو اگرچہ قضاءً و ظاہراً انہیں الفاظ سے تین طلاق پڑ گئیں مگر دیانتاً ابھی خاوند کی نیت کے مطابق اس کو تاکیدِ طلاق بنا کر ایک طلاق بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن جب زید نے کہا کہ ہزار بار طلاق تو یک دم طلاقِ مغلظہ کی شرط معین ہو گئی۔ اس لیے کہ اردو اصطلاح میں لفظِ بار عدد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا کہ زید نے کہا کہ ہزار عدد ترتیب وار طلاق لہٰذا اب کوئی گنجائش تاکید کی نہ رہی اور ان الفاظ کو کثرتِ طلاق پر ہی محمول کیا جائے گا۔ جس کی بنا پر تین طلاق جو کثرتِ طلاق کی انتہاء ہے وارد ہو جائیں گی۔ عربی اصطلاح میں لفظ ہزار کثرت پر بولا جاتا ہے۔ نہ کہ معین عدد پر جیسا کہ پنجابی میں کو گر تسو اور میں ہزار ہا۔ کروڑ ہا۔ لکھو کھہا۔ فارسی میں صدہا۔ اسی طرح قانون شریعتِ مطہرہ میں۔ ہزار یا اَلْف۔ کثرت کے لیے مستعمل ہے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۲۳ پر ہے:۔ قَالَ لِاِمْرَأَتِهٖ اَنْتِ طَالِقٌ اِنْ لَّمْ اُجَامِعْكِ فُلَانَةً اَلْفَ مَرَّةٍ فَالْيَمِيْنُ عَلٰى كَثْرَةِ الْعَدَدِ لَا عَلٰى كَمَالِ الْاَلْفِ:۔ (ترجمہ):۔ کسی نے اپنی بیوی کو کہا کہ اگر میں فلاں بیوی سے ہزار مرتبہ صحبت نہ کروں تو تجھ کو طلاق۔ تو یہ قسم کثرتِ تعداد پر موقوف ہوگی نہ کہ پورے ہزار پر۔ ثابت ہوا کہ شرعی طور پر ہزار بار کا لفظ بولنا کثرت کو ثابت کرتا ہے۔ اس لیے زید کا یہ کہنا کہ ہزار بار طلاق۔ بیکار نہ گیا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ طلاق مراد ہو گئیں اور وہ تین ہیں اور یہ امر متفقہ مسلّم ہے کہ ایک دم تین طلاق دینے سے تین طلاق پڑ جاتی ہیں اور بغیر حلالہ بچت کی کوئی صورت نہیں ہوتی:۔ قرآن کریم۔ حدیث پاک۔ امام اعظم رضی اللہ عنہ۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ۔ امام مالک رضی اللہ عنہ۔ امام احمد رضی اللہ عنہ۔ غرضیکہ تمام مجتہدینِ عظام کے نزدیک ایک دم تین طلاق دینے سے تینوں طلاق پڑ جاتی ہیں۔ ہاں البتہ غیر مقلد لوگ اپنی کم علمی اور آرام طلبی کی بنا پر یہ بدعتی مسئلہ بنائے پھرتے ہیں۔ کہ یکدم تین طلاق ایک طلاق ہوتی ہے۔ اور اپنے اس خود ساختہ مسئلہ کے لیے کبھی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیتے ہیں اور کبھی شافعی علیہ الرحمۃ کا۔ حالانکہ یہ مسئلہ ابن تیمیہ وہابی گمراہ نے ایجاد کیا تھا۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد اوّل صفحہ نمبر ۹۶ پر ہے:۔ فَاِنْ ثَبَتَ طَلَاقُهَا ثَلَاثًا فِيْ مَرَّةٍ اَوْ مَرَّاتٍ فَلَا تَحِلُّ كَمَا اِذَا قَالَ لَهَا اَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا اَوِ الْبَتَّةَ وَهٰذَا هُوَ الْمُجْمَعُ عَلَيْهِ وَاَمَّا الْقَوْلُ بِاَنَّ الطَّلَاقَ الثَّلَاثَ فِيْ مَرَّةٍ وَاحِدَةٍ لَا يَقَعُ اِلَّا طَلْقَةً۔ فَلَمْ يُعْرَفْ اِلَّا لِابْنِ تَيْمِيَّةَ مِنَ الْحَنَابِلَةِ وَقَدْ رَدَّ عَلَيْهِ اَئِمَّةُ مَذْهَبِهٖ حَتّٰى قَالَ الْعُلَمَاءُ اِنَّهُ الضَّالُّ الْمُضِلُّ وَنِسْبَتُهَا لِلْاِمَامِ

اَشْہَبَ مِنْ اَئِمَّۃِ الْمَالِکِیَّۃِ بَاطِلَۃٌ ۔ (ترجمہ) پس اگر ثابت ہو اس کی طلاق تین عدد ایک مرتبہ کی یا چند مرتبہ میں
میں تو یہ بیوی مطلقہ اس خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔ جیسے کہ جب خاوند نے اپنی بیوی کو کہا تو طلاق والی ہے تین یا تجھ کو
بَتّہ طلاق ہے۔ اور یہ مسئلہ ایک دم تین طلاقوں کا واقع ہونا تمام مجتہدین کا متفقہ ہے۔ اور لیکن یہ قول کہ تین طلاقیں ایک
مرتبہ میں ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ ابن تیمیہ کے سوا کسی نے نہ کہا۔ ابن تیمیہ اپنے آپ کو حنبلیوں میں شمار کرتا ہے۔ حالانکہ
حنبلی مذہب کے ائمہ عظام نے اس کو مردود قرار دیا ہے۔ اس طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں۔ یہاں تک کہ تمام علماء کرام نے فرمایا
کہ وہ ابن تیمیہ بیشک گمراہ اور گمراہ گر ہے اور اس طلاق ثلاثہ کے مسئلے کی نسبت امام اشہب مالکی کی طرف باطل ہے۔
پتہ لگا کہ طلاق بیک دم دینے سے تین ہی پڑتی ہیں۔ علامہ شیخ احمد صاوی رحمہ خود مالکی مذہب کے ہیں۔ جن کا اپنا مذہب
یہی اور حنبلی ائمہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ تین طلاق دے کر ایک طلاق پڑنے کا باطل نظریہ صرف ابن تیمیہ وہابی کا ایجاد
کردہ ہے۔ جس کو بعد والے وہابیوں نے اپنا لیا۔ اس مسئلہ حقہ کے پورے دلائل تو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ
کی کتاب جاء الحق اوّل میں دیکھئے۔ یہاں صرف اتنا بتانا ہے کہ امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بھی تین طلاقیں
ایک دم دینے سے تین ہی پڑتی ہیں۔ اور فتاوی عبدالحی کے مصنف عبدالحی صاحب نے جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۵ پر اس غلط
مسئلے کی نسبت امام شافعی رحمہ کی طرف کر کے وہابیانہ خیانت کی ہے۔ حالانکہ فقہ شافعی میں ایسا کوئی مسئلہ یا عقیدہ درج نہیں
بلکہ واضح طور پر ثابت ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاق دینے سے تین طلاق ہی پڑتی ہیں۔ چنانچہ فقہ شافعی حاشیہ بیجوری
جلد دوم صفحہ نمبر ۱۶۲ پر ہے:۔ وَلَوْ قَالَ لَهَا اَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا اِلَّا اَوَّلُ الطَّلَاقِ وَقَعَ الثَّلَاثُ :۔ (ترجمہ)
اور اگر خاوند نے اپنی بیوی کو کہا تو تین طلاق والی ہے۔ مگر پہلی طلاق۔ تو تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ اسی کتاب کے صفحہ نمبر
۱۶۸ اور ۱۷۸ پر ہے:۔ وَلَا يَحْرُمُ جَمْعُ الطَّلَقَاتِ الثَّلَاثِ :۔ (ترجمہ) اور تین طلاق کو جمع کر کے دینا حرام نہیں
۱۸۰ پر ہے۔ وَيَقَعُ الثَّلَاثُ سَوَاءٌ كَانَ عَلٰى تَفْرِيْقِهِ اَوْ جَمْعٍ ۔ (ترجمہ) تین طلاق دینے سے تین طلاق ہی پڑتی ہیں چاہے
متفرق اور الگ الگ کر دے یا جمع کر کے ایک دم۔ ان تمام عباراتِ شافعیہ سے ثابت اور واضح ہوا کہ امام شافعی رحمہ کے نزدیک
بھی تین طلاقیں ایک لفظ سے ادا کرنے سے ایک دم واقع ہو جاتی ہیں۔ فتاوے عبدالحی کی عبارت قطعاً غلط ہے۔ لہٰذا
سوال مذکورہ میں چونکہ طلاقِ ثلاثہ بالشرط ہے اور شرط گھر میں جانا پایا گیا۔ اس لیے جس وقت زید جس دن جس گھڑی
اپنے مذکورہ سسرالی گھر میں داخل ہوا تھا۔ اسی وقت زید کی بیوی کو تین طلاق مغلظہ پڑ گئیں۔ اب شرعاً بچت کی کوئی
صورت نہیں ہاں البتہ اگر قسم کھانے کے بعد گھر میں داخل ہونے سے پہلے زید مجھ سے پوچھ لیتا تو اس کا یہ حیلہ شرعی
ہو سکتا تھا۔ کہ پہلے زید بذاتِ خود ایک صریح طلاق دے دیتا۔ جب اس کی عدت گزر جاتی تو وہ زید اپنے
سسرالی گھر میں چلا جاتا۔ اس طرح۔ اس کی قسم ختم ہو جاتی۔ اور یہ کثرتِ طلاق بھی نہ پڑتی کیونکہ وہ کثرت کا مالک
ہی نہ رہتا جب وہ تین طلاق کا مالک ہی نہ رہتا ایک طلاق تو پہلے دے چکا تھا۔ باقی دو طلاق کا مالک تھا۔ پس اس صورت میں قسم بیکار ہو جاتی۔ چنانچہ

فتاویٰ درمختار صفحہ نمبر ۲۳۳ اور فتاویٰ شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۶۹۱ پڑھے :- فَحِيْلَةُ مَنْ عَلَّقَ الثَّلَاثَ بِدُخُوْلِ الدَّارِ اَنْ يُطَلِّقَهَا وَاحِدَةً ثُمَّ بَعْدَ الْعِدَّةِ تَدْخُلُهَا فَتَنْحَلُّ الْيَمِيْنُ فَيَنْكِحُهَا!
(ترجمہ) وہی ہے جو اوپر گذرا۔ مگر اب یہ حیلہ بیکار ہے۔ کہ اس کا وقت گذر گیا۔ فتاوے عبدالحی جلد دوم صفحہ نمبر ۵۳ کا جو حوالہ سائل نے پیش کیا ہے کہ بوقتِ ضرورت مسلکِ غیر پر فتوے جاری کرنا جائز ہے۔ یہ بات اگرچہ ٹھیک ہے مگر مسلکِ غیر بھی وہی ہے جو مسلکِ حنفی ہے۔ جیسا کہ اوپر فقہ شافعی اور تفسیر صاوی سے ثابت کیا گیا پس سائل کو مفید نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس سے آٹھ خاندان متاثر ہوتے ہیں تو یاد رکھو کہ شریعت اور قانونِ اسلامی ایک بااصول اور باضابطہ ٹھوس قانون ہے نہ اس میں لچک پیدا ہو سکتی ہے نہ اس کو توڑا مروڑا جا سکتا ہے۔
یہ تو زید کو اور اس جیسے تمام جلد باز خاوندوں کو پہلے سوچنا چاہیئے کہ ہمارے بیہودہ کردار اور جلد بازی غصہ سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ طلاق دیتے وقت یا خود قانون ہاتھ میں لے لیتے ہیں یا جاہل عرضی نویسوں کے پاس بھاگتے ہیں۔ علما اور عاملِ شریعت کے پاس آنا نہیں چاہتے۔ جب کام بگاڑ بیٹھتے ہیں۔ تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کے لیے شریعت کو توڑا جائے۔ اور گمراہی کی طرف دوڑنا چاہتے ہیں۔ پس کس کو مصیبت پڑی ہے کہ غلط راہ پڑ کر اپنی عاقبت خراب کرے۔ بیوی چھوڑنا خاندانوں سے منہ موڑنا آسان ہے۔ مگر اللہ رسول سے رشتہ توڑنا ناممکن ہے

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد ۔۔۔ فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

طلاق۔ طلاق۔ طلاق

بیوی کو پرچہ میں لکھ کر اس طرح طلاق دینے کا حکم

سوال نمبر ۶۲:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ آج سے تیرہ دن پہلے زید نے گھریلو ناراضگی کی بنا پر اپنی بیوی ہندہ کو ایک چھوٹے سے کاغذ پر طلاق لکھ کر دی اس طلاق نامے پر لکھی ہوئی عبارت بالکل اس طرح ہے۔ کہ مسمی زید جو کہ اپنی بیوی ہندہ کو بوجہ نافرمانی مورخہ ۸۱،۸،۹ سے طلاق دے رہا ہوں۔ آج کے بعد میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ پھر اس پرچے پر سطر توڑ کر علیحدہ پانچویں سطر میں لکھا ہے۔
طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔
اس کے بعد نیچے والی سطر میں اپنے قلم سے دستخط کرتا ہے۔ اب وہ یہ طلاق دے کر پچھتا رہا ہے :-

اور بیوی کو آباد کرنا چاہتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تین طلاق ہو گئی ہے لہٰذا ہم آپ کی طرف استدعا کرتے ہیں ہمیں فتوٰے عطا فرمایا جائے۔ کہ کیا یہ دونوں خاوند بیوی اس طلاق کے بعد آباد ہو سکتے ہیں یا نہیں اگر ہو سکتے ہیں تو ہمیں شریعت کی طرف سے اجازت دی جائے۔

دستخط سائل صلاح محمد ولد حسن قوم جٹ ساکن امرہ کلاں براستہ ڈنگہ تحصیل کھاریاں ۸ ، ۷ ، ۹ ۲۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

اَلْجَوَاب

قانون شریعت کے مطابق صورتِ مسئولہ میں زید کی بیوی ہندہ کو صرف ایک طلاق واقع ہوئی ہے۔ اس لیے کہ طلاق میں نسبت کرنا شرط ہے۔ قانونِ شریعت اسلامیہ کی رو سے جس طلاق میں بیوی کی طرف نسبت نہ ہوگی وہ طلاق واقع نہ ہوگی۔ بلکہ بیکار ہوگی۔ چنانچہ فتاوٰے شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۵۹ پر ہے:۔ لَوْقَالَ (الخ) اِنِّیْ حَلَفْتُ بِالطَّلَاقِ فَخَرَجَتْ لَمْ یَقَعْ لِتَرْکِہِ الْاِضَافَۃَ اِلَیْھَا (الخ) فَاِنَّھَا الشَّرْطُ۔ (ترجمہ) خاوند نے کہا کہ میں نے طلاق کی قسم کھائی ہے بیوی نے یہ سنا اور پھر بھی گھر سے نکل گئی تو طلاق نہ پڑے گی۔ کیونکہ خاوند نے اپنی تسمیہ طلاق میں اضافت چھوڑ دی۔ یعنی خاوند نے گھر سے نکلنے پر طلاق کی قسم تو کھائی مگر بیوی کا تذکرہ اور نسبت نہ کی۔ لہٰذا یہ طلاق اور قسم وغیرہ بیکار اس لیے کہ طلاق کو کسی بیوی کی طرف منسوب کرنا شرط ہے۔ اضافتِ طلاق یہ ہے کہ طلاق دینے والا شخص طلاق دیتے وقت بیوی کا تذکرہ ضرور کرے خواہ اس کا نام لے جیسے کہ یہ کہنا کہ زینب کو طلاق ہے۔ یا اس کی زوجیت کا اظہار کرے مثلاً کہے کہ میری بیوی کو طلاق۔ حاضر کے صیغ سے طلاق دے مثلاً کہے کہ تجھ کو طلاق یا غائب کے صیغے سے موجودہ بیوی کو طلاق دے خواہ زبانی طلاق دے یا تحریری یہ اضافت ہر لحاظ میں شرط ہے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۴۸ پر ہے:۔ وَاَمَّا رُکْنُہٗ فَقَوْلُہٗ، اَنْتِ طَالِقٌ وَّنَحْوُہٗ کَذَا فِی الْکَافِی۔ (ترجمہ) اور تکمیل طلاق کا رکن فرض خاوند کا اپنی بیوی کو یہ کہنا ہے تو طلاق والی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح فتاوٰے کافی میں ہے۔ ان قوانین کے تحت سوال بالا میں زید کی بیوی ہندہ کو صرف ایک طلاق پڑی کیونکہ زید نے ایک دفعہ لکھا کہ میں ہندہ کو طلاق دے رہا ہوں۔ اس کے بعد یہ لکھنا کہ طلاق طلاق۔ طلاق۔ یہ عبارت بالکل بیکار ہے کیونکہ یہ تحریر نہ طلاق بنتی ہے نہ تکرارِ طلاق نہ تاکیدِ طلاق۔ طلاق تو اس لیے نہیں کہ یہاں اضافت نہیں تکرار اس لیے نہیں کہ تکرار میں سابقہ کلام کی مشابہت لازم ہے۔ یہاں نہ مشابہت نہ مطابقت۔ تاکید اس لیے نہیں کہ تاکید میں کلام سابق کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے۔ اور اسی سابقہ کلام کے ساتھ تاکیدی الفاظ لگا دیئے جاتے ہیں۔ جو ہر زبان کی علیحدہ اصطلاح میں ہیں۔ مثلاً ہماری وطنی زبان میں چند الفاظ تاکیدی اس طرح ہیں ۱ پھر سن ۲ میں بار بار کہتا ہوں ۳ سمجھ لیا؟ ۴ سنتی ہو کہ نہیں ۵ تکرار بھی تاکید کے لیے بہت دفعہ مستعمل ہے۔ اگر زید بار بار طلاق اور بیوی کا نام لکھتا مثلاً کہتا کہ ہندہ کو طلاق ہندہ کو طلاق یا بیوی کے ساتھ ہی تکرار کرتا مثلاً لکھتا کہ ہندہ کو طلاق

طلاق۔ طلاق یا ہندہ کو طلاق کی تعداد ظاہر کرتا۔ مثلاً لکھتا کہ ہندہ کو تین طلاق تو ان صورتوں تین طلاق واقع ہوتیں۔ اس لیے کہ اضافت ظاہر ہوتی۔ مگر صورتِ مسئولہ میں چونکہ بجز پہلی طلاق کے اضافت بالکل نہیں۔ اس لیے ایک ہی طلاق پڑے گی۔ اضافتِ طلاق چار قسم کی ہے۔ ع۱ اضافتِ معنوی مثلاً کوئی خاوند کہے کہ میری بیوی طلاق والی ہے۔ یہ عبارت اگرچہ ظاہراً ماضی کی خبر کا صیغہ ہے مگر خاوند کا بیوی کو اس طرح کہنا لکھنا بطریقِ اصطلاح جملہ انشائیہ بنتا ہے نہ کہ خبریہ۔ لہٰذا اس کلام سے اُس وقت طلاق واقعہ ہوگی۔ جس وقت یہ لفظ بولے جائیں گے۔ اس لیے کہ یہاں اضافتِ معنوی ہے جو طلاق کو فی الحال واقع کر رہی ہے۔ ع۲ اضافتِ لفظی۔ مثلاً خاوند حاضر موجودہ بیوی کو زبانی کہے یا غائبہ کو تحریری کہے کہ میں نے تجھ کو طلاق دے دی۔ یا تو طلاق والی ہے۔ سوالِ مذکورہ کی پہلی طلاق میں یہی اضافت ہے ع۳ اضافتِ واضح مثلاً خاوند کہے کہ میں آج اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہوں۔ اس کلام میں چونکہ خاوند نے زمانے اور فعل حال سے طلاق کی انشائیت کو مکمل ظاہر اور واضح کر دیا اس لیے یہ عبارت اضافتِ واضح کہلائی ع۴ اضافت بالاشارہ مثلاً خاوند اپنی حاضر موجود بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ۔ اس کو طلاق ہے۔ مذکورہ سوال کی دوسری طلاقوں میں ان میں سے کوئی اضافت نہیں لہٰذا وہ الفاظ بیکار ہیں۔ بدیں وجہ زید کی بیوی ہندہ کو فقط ایک صریحی طلاق پڑی جو بحکم شریعت طلاقِ رجعی ہے۔ اس لیے زید شرعی قانون کے مطابق عدت کے اندر اندر رجوع کر سکتا ہے اور عدت گزر جانے کے بعد نکاح پڑھنا لازم ہوگا۔ عدت کے اندر نکاح پڑھنا ضروری نہیں صرف اس طرح رجوع کر لینا کافی ہوتا ہے کہ دو عاقل بالغ مسلمان متقی کی گواہی سے تحریری یا زبانی یہ کہہ دے کہ میں اپنی بیوی کی ایک طلاق رجعی سے جو فلاں تاریخ کو دی ہے جس کی ابھی عدت باقی ہے۔ رجوع کرتا ہوں۔ اگر تحریری ہو تو گواہوں کے دستخط مع پورا پتہ اور ولدیت اور خاوند اپنے بھی مکمل دستخط مع پتہ تحریر کرکے رجوع کی تاریخ لکھے۔ تاکہ ہر دو تاریخ سے عدت کا موازنہ کیا جا سکے۔ خیال رہے کہ طلاق بائنہ ہو یا رجعیہ عدت کے اندر اندر طلاق کو ختم کر کے خاوند طلاق وہندہ دوبارہ خانہ آبادی کر سکتا ہے۔ اس طرح کہ طلاقِ بائنہ میں باقاعدہ نکاح شرعی پڑھا کر اور طلاقِ رجعیہ میں شرعی طریقے پر رجوع کر کے عدت گزرنے کی ان ہر دو طلاق میں کوئی شرط نہیں۔ عدت تو دوسرے خاوند کے لیے ہوتی ہے۔ پہلا خاوند اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کو عدت گزرنے کے انتظار کی زحمت لازم نہیں۔ چنانچہ فتاوے تنویر الابصار جلد دوم صفحہ ۲۹ پر ہے اور اسی طرح اس کی شرح شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۲۸ پر ہے:۔ اَلرَّجْعَۃُ فِی الْعِدَّۃِ بِنَحْوِ رَاجَعْتُکِ وَیَتَزَوَّجُھَا فِی الْعِدَّۃِ اِنْ لَّمْ یُطَلِّقْ بَائِنًا وَنُدِبَ اِعْلَامُھَا بِھَا وَنُدِبَ الْاِشْہَادُ بِعَدْلَیْنِ، ترجمہ رجوع کرنا صرف طلاق رجعی میں جائز ہے عدت کے اندر اندر مثلاً یہ کہے کہ میں نے تجھ سے رجوع کر لیا یا طلاق رجعی دے کر عدت کے اندر نکاح کرے رجوع کی نیت سے تو جائز ہے۔ یہ دونوں طریقوں سے رجوع صرف طلاق رجعی

میں جائز ہے بائنہ میں نہیں ۔ اور مستحب ہے کہ رجوع کے بارے بیوی کو بتا دے اور مستحب ہے ۔ دو عادل گواہ بنانے اِسی عبارت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نکاح پڑھانا رجوع کی جگہ کام دے سکتا ہے دوسرے لفظی رجوع سے نکاح زیادہ مفید ہے ۔ کہ اس میں خود بخود بیوی کو رجوع کا پتہ لگ جائے علیحدہ اطلاع کی ضرورت نہیں یہ تب مفید ہے ۔ جب کہ عورت قریب ہو راضی ہو دور یا ناراضگی کی صورت میں تحریری یا زبانی رجوع مفید ہے ۔ ھدایہ شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۳۷۷ پر ہے :۔ اور دُرِّ مختار جلد دوم صفحہ نمبر ۲۳۸ پر ہے :۔ اِذَا کَانَ الطَّلَاقُ بَائِنًا دُوْنَ الثَّلَاثِ فَلَهٗ اَنْ یَّتَزَوَّجَهَا فِی الْعِدَّةِ وَبَعْدَ انْقِضَائِهَا لِاَنَّ حِلَّ الْمَحَلِّيَّةِ بَاقٍ ۔: (ترجمہ) : جب طلاق بائن ہو تین نہ ہو تو خاوند کو جائز ہے کہ اپنی اس مطلقہ سے عدت میں ہی نکاح کرے یا بعد عدت اس لیئے کہ نکاح کی محلیت باقی ہے یہ حکم صرف خاوند کے لیئے ہے ۔ دوسرا کوئی شخص اگر مطلقہ سے نکاح کرنا چاہے تو عدت گزرنا فرض ہے ۔ چنانچہ باری تعالیٰ ربّ العزت قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے :۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۔ (ترجمہ) مطلقہ یا بیوہ کی جب تک عدت نہ گزر جائے ۔ اس وقت تک کوئی اجنبی شخص اس سے نکاح نہیں کر سکتا ۔ لہٰذا اِس کا اِرادہ بھی نہ کرو ۔ ثابت ہوا کہ خاوند مرد اپنی مطلقہ رجعیہ سے عدت کے اندر اندر رجوع بھی کر سکتا ہے اور نکاح بھی اور یہ نکاح رجوع ہی کے قائم مقام ہوگا :۔ اور بائنہ سے عدت کے اندر نکاح کر سکتا ہے رجوع نہیں خواہ کچھ بھی نیت ہو ۔ کیونکہ نکاح تو رجوع کے قائم مقام ہو سکتا ہے مگر رجوع نکاح کے قائم مقام نہیں ہو سکتا ۔ ان کے درمیان نسبتِ عام خاص مطلق ہے سوال مذکورہ میں زید نے چونکہ صرف ایک طلاق رجعی صریحی اپنی زوجہ ہندہ کو دی ہے ۔ جیسا کہ دلائلِ شرعیہ سے ثابت ہوگیا لہٰذا زید آج ہی رجوع کرے عدت کے اندر اپنی اس بیوی کو بطورِ بیوی آباد رکھ سکتا ہے ۔ اس لیئے کہ فقہاء کرام کی بیان کردہ رجوع کی وہ پانچ شرطیں جو شامی جلد دوم نے صا ۵۳۱ پر درج کیں صورتِ مسئولہ میں موجود ہیں بدیں وجہ زید کا رجوع صحیح ہوگا کیونکہ تواریخِ مبیّنہ کے توازن سے ابھی عدت کا وجود معلوم ہوتا ہے ۔ ہاں البتہ اس رجوع فِی الْعِدَّتْ یا نکاح بعد عدت سے خاوند مذکور صرف دو طلاق کا مالک رہ جائے گا ۔ اور اب کبھی کسی لڑائی میں اس خاوند نے اپنی اس بیوی کو دو طلاقیں بھی دیں تو طلاق مغلظہ واقع ہو جائے گی :۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ۔

کتبہ

طلاقِ معلّق کا بیان اور طلاق کی قسمیں

سوال ۶۳

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بکر سے چار گواہوں کے روبرو کہا میں اپنی

بیٹی قمر زیدی کا نکاح تیرے بیٹے خالد سے کروں گا۔ اگر چار مہینے کے اندر اندر میں نکاح نہ کروں تو میری بیوی ہندہ کو تین طلاق ہوں گی۔ یہ وعدہ تحریر بھی کر دیا اور گواہوں کے اس پر دستخط بھی کرائے تحریری کاغذ پر زید نے خود لکھا۔ حلف نامہ، یہ حلف نامہ بھی حاضر خدمت ہے اور وہ چار گواہ بھی جن کے سامنے یہ حلفیہ وعدہ زید نے لکھ کر مجھ کو دیا۔ اس حلفیہ اور قسمیہ وعدے کے دو ماہ بعد میں نے رسم کے مطابق اپنا نائی زید کے پاس بھیجا تاکہ لڑکی کا ناپ لے آئے اور ہم کپڑے وغیرہ تیار کریں۔ جب نائی زید کے گھر گیا تو زید نے نائی کو جھڑک کر واپس بھیج دیا۔ میں اور چند آدمی زید سے ملے۔ کہ تو نے نائی کو بغیر ناپ دیئے واپس کیوں بھیجا تو زید نے کہا ابھی میرا کوئی ارادہ نکاح کرنے کا نہیں۔ ہم خاموش ہو گئے۔ تین ماہ گزرنے کے بعد ہم پھر گئے تو زید نے صاف صاف انکار کر دیا کہ میں تمہارے لڑکے خالد سے نکاح نہیں کروں گا۔ ہم نے اس کا حلفیہ وعدہ اس کو یاد کرایا مگر وہ انکاری ہی رہا۔ اب اس بات کو چھ ماہ ہو گئے ہیں فرمایا جائے کہ اس کی بیوی ہندہ کو طلاق ہوئی یا نہیں۔ خالد کہتا ہے کہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی۔ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ نہ ہی ثابت ہے مگر دیگر لوگ کہتے ہیں کہ طلاق ہو گئی آپ فتویٰ دیں کہ طلاق ہوئی یا نہیں۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا!

سائل:- افضل حسین فیصل آباد کارخانہ بازار ۷۹-۳-۳

اَلْجَوَاب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

قانون شریعت کے مطابق صورت مسئولہ میں زید کی بیوی ہندہ کو تین طلاق معلقہ واقع ہو گئی۔ خالد مذکور کی بات درست نہیں۔ قرآن کریم حدیث مطہرہ اقوال فقہ۔ فرمودات ائمہ اربعہ کے دلائل کثیرہ سے یہ بات لازم و ثابت ہے کہ طلاق معلقہ بالشرط شرط پائے جانے کے بعد اسی طرح واقع ہوتی ہے۔ جس طرح بوقت شرط ذکر کیا تھا۔ اس کے دلائل عدیدہ سے چند دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلی دلیل:- یہ عقیدہ ذہن نشین و دل گزین کر لینا چاہیئے کہ اسلام کے تمام قوانین صرف قرآن مجید و احادیث مطہرات سے ہی لیئے جاتے ہیں۔ اور تمام فقہ اسلامیہ سلاسل اربعہ قرآن و حدیث کی ہی تفسیر و شرح ہے۔ ہاں البتہ مفتیان اسلام و قضات شریعت کے لیئے فتوے قانونیہ و فیصلہ شرعیہ کے نفاذ کی خاطر پانچ طریقوں سے نافذ اور جاری کرنے کی اجازت ہے۔ یہ اجازت بھی علماء اسلام کو پیارے آقا رسول کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عطیہ خسروانہ ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۳۲۴ پر حضرت معاذ ابن جبل کی روایت پاک سے اور نسائی جلد دوم کتاب القضاء میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت سے یہی کچھ ثابت ہو رہا ہے۔ قرآن و حدیث سے مسائل جاری کرنے کے اہم طرق میں سے پہلا طریقہ ماخذ قرآن والحدیث۔ یعنی وہ مسئلہ جو بالوضاحت صاف صاف

قرآنِ پاک یا حدیث پاک میں لکھا ہو وہ اسی طرح مفتی اسلام بیان کرے۔ دوسرا طریقہ۔ استنباط قرآن والحدیث۔ یعنی جو مسئلہ وضاحت سے صاف صاف قرآن پاک یا حدیث پاک کا لکھا ہو مگر اشارۃً یا اقتضاءً یا دلالۃً وہ مسئلہ قرآن پاک سے ہی ثابت ہو رہا ہو مجتہدِ اسلام قرآن و حدیث سے وہ مسئلہ مستنبط کر دے۔ تیسرا طریقہ۔ قیاسِ مجتہد یعنی وہ مسائل جن میں قرآن مجید یا حدیث مطہرہ سے صریحی دلائل نہ ملے اور مجتہد امام اپنے زمانے کے مسائل کو احکام قرآنیہ یا احکامِ حدیث کے صریحی مسائل پر علت کی مطابقت سے قیاساً چسپاں کر دے اسی کو قیاس شرعی کہتے ہیں چوتھا طریقہ۔ قیاس علے القرآن والحدیث۔ یعنی وہ مسائل جن میں ماخذِ قرآن و حدیث بھی نہ ملیں استنباطِ قرآن و حدیث بھی نہ ملیں۔ قیاس مجتہد بھی نہ ملیں تو مفتی اسلام خود احکام قرآن و حدیث یا استنباطِ فقہا پر قیاس کر کے فتوے جاری کر دے۔ جیسے کہ روزمرہ کے نئے حوادثات مسائل۔ پانچواں طریقہ۔ استحلالِ ضروریات بالقرآن والحدیث۔ یعنی وہ مسائل جو مندرجہ بالا چاروں طریقوں سے ظاہر نہ ہو سکیں۔ بلکہ ضروریاتِ زندگی کے طور پر اس کو جاری کیا جائے۔ چنانچہ قانونِ اسلامی ہے کہ اَلضَّرُوْرِیَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ۔ (ترجمہ): ضروریاتِ زندگی ممنوعہ چیزوں کو بھی ہنگامًا حلال کر دیتی ہیں۔ قانونی تشریعات کے باجازتِ محمدی یہی وہ پانچ طریقے ہیں۔ جنہوں نے اسلام کو نہایت آسان فرمایا۔ اور اسی اسلوبِ بیانیہ کی بنا پر انسان کی ہر شعبۂ زندگی پر ہر دور میں اسلام مکمل جاری و ساری ہے اور کسی طبقہ کے افراد کو اسلام پر عمل کرنے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جنھوں نے بھی اس راہِ راست کو چھوڑا وحیات کی وادی میں سر پھوڑا۔ اپنے دھن ذھن سے خواہ قرآن والے بنتے پھریں یا حدیث والے۔ بہر حال مفتی اسلام کو قرآن پاک و حدیث پاک سے مندرجہ بالا پانچ طریقوں سے مسئلہ نکالنے کی اجازت ہے بدیں وجہ بحیثیتِ مفتی اسلام ہونے کے حتمًا یہ فتوے جاری کر رہا ہوں۔ کہ زید کی بیوی کو تین طلاق واقع ہو چکی ہیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ استنباطی ہے۔ اور طریقۂ دوم کی رو سے۔ قرآن مجید و حدیث پاک سے ہی استنباط کر کے لیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ قرآن پاک میں بہت جگہ مذکور ہوا کہ جہاں کہیں شرط پائی جائے وہاں جزا کا پایا جانا لازم قرار دیا گیا۔ اور قرآن پاک کا جو حکم کسی شرط سے معلق ہوا۔ وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کی جزا نہ ہو۔ اور ایسے ہی جزا بھی اس وقت لازمًا پائی جائے گی جب کہ شرط مذکورہ ثابت ہو جائے۔ خواہ شرط و جزا کا جملہ منفیہ ہو یا ثبوتیہ۔ قضیہ موجبہ ہو یا سالبہ۔ چنانچہ نفی کی مثال قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے:۔ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ:۔ (ترجمہ):۔ پس اگر تم صدقہ کرنے والی چیز نہ پاؤ تو اللہ یقینًا غفور الرحیم ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں پہلا جملہ شرطیہ ہے:۔ دوسرا جزا۔ اس آیت پاک میں رب کریم نے اپنی غفوریت و رحیمیت کو اِنْ لَّمْ تَجِدُوْا سے معلق کر دیا۔ یعنی اگر اشیاءِ صدقہ بحالتِ مجبوری مسلمان نہ پائیں تو بغیر صدقہ ہی اللہ کا رحم و بخشش ہو

جائے گا اور موجود ہوتے صدقہ نہ کرو گے تو ضرورت نہ ہوگی۔ اسی کو معلق بالشرط کہتے ہیں۔ یہی شرط و جزا جب طلاق میں ہو جائے تو شرط پائے جانے کے بعد طلاق بھی ہو جائے گی۔ دوسری آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ۔ (ترجمہ) :۔ اگر تم بیمار ہو یا مسافر ہو یا بیت الخلاء سے آؤ یا بیوی سے وطی کرو۔ اور وضو یا غسل کے لیے پانی نہ پاؤ۔ تو پاک مٹی سے تیمم کر لو۔ یہاں حرفِ اِنْ شرط کا ہے اور لفظِ مَآءً تک جملہ شرط ہے مطلب یہ کہ اگر کسی نمازی مسلمان کی یہ حالتیں ہوں اور پانی نہ ہو تب فَتَيَمَّمُوْا کا حکم نافذ ہوگا فَتَيَمَّمُوْا کا پورا جملہ جزا ہے۔ یعنی اگر پانی نہ ملے تب تیمم فرض ہوگا ورنہ نہیں۔ اِن ہر دو آیات سے واضح ہوا کہ اسلام میں تعلیقی طور پر بھی حکم نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اور جس طرح غیر تعلیقی حکم فوراً قانوناً نافذ العمل ہے اسی طرح تعلیقی حکم بعد شرط نافذ اور واجب العمل ہے اس کی اور بھی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآنِ پاک نے قانونِ معلق کا تذکرہ فرما کر قاعدہ کلیہ بنا دیا۔ پس اس کلیے سے عملاً اجازت مل گئی کہ علماءِ اسلام و فقہاءِ عظام۔ اس کلیے کے تحت ہزاروں جزئیات اسی تعلیق علت کی مناسبت سے نافذ کرتے چلے جائیں۔ اس لیے کہ کلیات سے جزئیات پر حکم لگتا ہے۔ ورنہ یہ ناممکن ہے کہ موجودہ دور کا حادثہ بعینہٖ قرآن و حدیث میں مذکور ہو جب یہ سمجھ لیا تو یاد رکھو کہ مذکورہ فی السوال طلاق بھی بالکل اسی نوعیت کی ہے کیونکہ زید اپنی بیوی ہندہ کی طلاقِ مغلظہ ثلاثہ کو اپنی بیٹی کے نکاح کرنے پر معلق کر رہا ہے۔ اس صورت میں شرط ہے نکاح نہ کرنا اور جزا ہے۔ بیوی ہندہ کو تین طلاق ہونا۔ اور مندرجہ بالا قرآنی قاعدے کے مطابق شرط کے پائے جانے سے جزا کا ثابت ہونا اشد لازم ہے۔ پس چونکہ شرط یعنی نکاح نہ کرنا پایا گیا لہٰذا جزا بھی لازم ہو گئی۔ اور ہندہ کو یک دم تین طلاق پڑ گئیں۔ جس طرح کہ اگر پانی نہ ملے تو تیمم فرض ہو جائے۔ مزید بیٹی کا وہاں نکاح نہ کرے تو اس کی بیوی ہندہ کو طلاقِ مذکورہ واقع۔ کہ یہاں بھی تعلیق وہاں بھی تعلیق۔ لہٰذا سوالِ مذکورہ میں استنباطی طور پر و قیاسی طریقہ پر قرآنِ پاک سے ثابت ہوا کہ زید کی بیوی ہندہ کو طلاقِ ثلاثہ وارد ہو چکی ہیں۔

دلیل ۲ دوم :۔ جس طرح یہ مسئلہ قرآن پاک سے ثابت ہے۔ اسی طرح یہ مسئلہ حدیث مطہرات سے کچھ زیادہ وضاحت سے ثابت ہے۔ چنانچہ :۔ کتاب الحدیث الدرایہ صفحہ نمبر ۲۲۶ پر ہے :۔ الحدیث كُلُّ طَلَاقٍ وَاقِعٌ اِلَّا طَلَاقُ الصَّبِيِّ وَالْمَجْنُوْنِ ۔ حدیث دوم ۔ جامع الصغیر للسیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ جلد دوم صفحہ نمبر ۹۳ حدیث سوم درایہ صفحہ نمبر ۲۲۶ پر ہے :۔ وَاَخْرَجَ عَنْ عَلِيٍّ بِاِسْنَادٍ صَحِيْحٍ كُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ اِلَّا طَلَاقُ الْمَعْتُوْهِ :۔ حدیث چہارم :۔ انہی الفاظ کی روایت ترمذی شریف جلد اول صفحہ نمبر ۱۴۲ پر صرف سند کے ضعف سے روایت کی۔ مگر دارقطنی انہی الفاظ کے متنِ حدیث کو صحیح سند سے روایت فرمایا۔ چاروں حدیثوں کا ترجمہ اس طرح ہے۔ روایت ہے

علی شیرِ خدا سے کہ فرمایا آقائے کائنات صلی اللہ تعالٰی علیہ والہ وسلم نے کہ جس طرح بھی جو خاوند بھی طلاق دے وہ واقع ہو جائے گی۔ سوائے تین خاوندوں کی طلاق کے۔ ع۱ بچے کی طلاق ع۲ مجنون یعنی دائمی پاگل خاوند کی طلاق ع۳ معتوہ یعنی جس کی عقل نشے یا غصے یا عارضی حالات سے ماری گئی ہو۔ ان تین قسم کے خاوندوں کی طلاق واقع نہ ہو گی ان کے علاوہ جو خاوند بھی جس طرح بھی طلاق دے گا۔ واقع ہو جائے گی۔ اس لیے کہ الفاظِ حدیث میں لفظِ کُل کی اضافت طلاق کی طرف ہے اور اصطلاحِ منطق میں کُل موجبہ کلیہ کا سور ہے۔ جس سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ طلاق بہت قسم کی ہے۔ دوسری یہ کہ سب قسمیں ہی وارد ہو جاتی ہیں۔ صرف خاوند کی اہلیت ہونی چاہیے اور محل طلاق ہونا چاہیے۔ خاوند کی اہلیت تو تین مندرجہ بالا شخصوں میں معدوم ہوتی ہے اور محل طلاق عورت ہے کائنات میں جو عورت جس خاوند کی شرعی بیوی بن سکتی ہے وہ اس کی طلاق کا محل بھی بن سکتی ہے شریعت پاک میں طلاق کی کل سولہ قسمیں ہیں:۔

پہلی قسم ع۱ :۔ طلاقِ سنت جو منشاءِ اسلام کے مطابق سخت ضرورت میں ضرورتاً دے۔ زائد نہ دے۔ جس سے رجوع بھی ہو سکے ع۲ :۔ طلاقِ احسن۔ جو غیر صحبت والے طہر میں صرف ایک رجعی ہو۔ ع۳ :۔ طلاقِ حسن۔ غیر صحبت والے طہر میں ایک رجعی ہو دوسرے طہر میں دوسری تیسرے طہر میں تیسری ہو۔ ع۴ طلاقِ بدعت۔ جو ایک پاکیزگی میں تین یکدم ہوں یا بحالت حیض۔ مدخولہ بیوی کو تین طلاق یا ایک طلاق دے۔ طلاق تو پڑ جائے گی مگر خاوند گناہ گار ہو گا۔ ع۵ طلاقِ بائنہ جس میں شدت یا زیادتی یا کوئی قید پائی جائے۔ اس میں رجوع جائز نہیں ہوتا ع۶ طلاق رجعی۔ وہ ایک یا دو طلاق جس میں صریح صاف لفظ ہوں کوئی شدت یا قید کے الفاظ نہ ہوں اس میں خاوند عدت کے اندر اندر رجوع کر سکتا ہے ع۷ طلاقِ مغلظہ۔ وہ طلاق جو صاف ظاہر لفظوں میں یکدم تین طلاق یا وقفے سے دے تیسری طلاق کے وقت مغلظہ ہو گی۔ اس میں رجوع یا نکاح جائز نہیں جب تک کہ حلالہ نہ کرائے۔ ع۸ طلاقِ صریحی۔ وہ طلاق جس میں صاف صاف طلاق کا لفظ بولا جائے ایک دفعہ یا دو دفعہ یا تین دفعہ ع۹ طلاقِ کنایہ۔ بیوی کو ایسے لفظ سے پکارے یا کہے۔ جس میں دو مطلب نکلتے ہوں مگر خاوند کی نیت یا حالات بتائیں کہ مراد طلاق ہے ع۱۰ طلاقِ فسخ۔ حاکم عدالت یا مفتیٔ اسلام قانونِ اسلامی اور ضابطہ شرعیہ کے مطابق خاوند بیوی کو علیحدہ کر دے ع۱۱ طلاقِ متارکہ۔ جب شریعت خاوند بیوی کو ایک دوسرے کے لیے ناجائز کر دے تو خاوند خود بیوی کو چھوڑ دے ع۱۲ طلاقِ تنجیزی۔ وہ طلاق جو فوراً واقع ہو جائے۔ کسی شے کا انتظار نہ رہے۔ ع۱۳ طلاق تعلیقی۔ وہ طلاق جس کو خاوند کسی شرط سے لٹکا دے اور جس کے واقع ہونے میں کسی چیز کا انتظار کرنا پڑے۔ ع۱۴ طلاقِ خلع۔ خاوند پیسے

دے کر طلاق دے۔ ۱۵ طلاقِ لعان۔ خاوند بیوی کو زنا کی تہمت لگائے تو قسمیں کھلا کر عدالت کا جج یا قاضی ان دونوں کا چھٹکارا کر دے۔ ۱۶ طلاقِ ایلا۔ خاوند قسم کھالے کہ میں بیوی کے نزدیک نہ جاؤں گا۔ یہ تفصیل شریعتِ پاک میں طلاق کی سولہ قسمیں جن کا نقشہ اس طرح ہے :۔

طلاقِ سنت	طلاقِ احسن	طلاقِ حسن	طلاقِ بدعت
طلاقِ بائنہ	طلاقِ رجعی	طلاقِ معلقہ	طلاقِ صریحی
طلاقِ کنایہ	طلاقِ فسخ	طلاقِ متارکہ	طلاقِ تنجیزی
طلاقِ تعلیق	طلاقِ خلع	طلاقِ لعان	طلاقِ ایلاء

اسی لیے مندرجہ بالا احادیثِ مطہرات نے فرمایا کُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ یعنی طلاق کی جتنی بھی قسمیں ہیں ان میں سے کوئی خاوند اپنی بیوی کو دے تو اپنے وقت کے حساب سے پڑ جائے گی جب ان ہی حدیثوں کے حکم سے پندرہ طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں تو سولہویں طلاق معلق بالشرط کیوں نہ پڑے گی۔ صورتِ مذکورہ میں زید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں معلقہ کر کے دی ہیں اور جس شرط پر معلق کی ہیں وہ پائی گئی لہٰذا حدیث پاک کے قانون سے زید کی بیوی کو طلاق پڑ گئیں **دلیل سوم** :۔ درایہ لاحادیث ہدایہ صفحہ ۲۲۸ پر ہے عَنْ اِبْنِ عُمَرَ۔ رَفَعَہٗ۔ مَنْ حَلَفَ بِطَلَاقٍ۔ وَعَلٰی یَمِیْنٍ فَقَالَ اِنْشَاءَ اللّٰہُ فَلَا حِنْثَ عَلَیْہِ قَالَ التِّرْمِذِیْ حَدِیْثٌ حَسَنٌ :۔ (ترجمہ) جس خاوند نے طلاق کو کسی شرط پر معلق کیا یا کسی یمین پر قسم کھائی۔ اور اگر ساتھ ہی انشاء اللہ کہہ دیا تب قسم ختم ہو گئی۔ یعنی انشاء اللہ کہنے سے شرط اور قسم ختم ہوتی ہے۔ اگر انشاء اللہ نہ کہے تو شرط قائم رہتی ہے اور بعد شرط وہ طلاق پڑ جاتی ہے۔ اس حدیث سے بھی مسئلہ واضح ہو گیا کہ کسی شرط پر طلاق کو معلق کرنے سے شرط پائے جانے کے وقت طلاق پڑ جائے گی۔ سوالِ مذکورہ میں زید نے اپنی بیوی ہندہ کی طلاق ثلاثہ کو اپنی بیٹی کے نکاح کر دینے پر معلق کیا تو جب زید نے بکر کے بیٹے سے اُس بیٹی کا نکاح کر دیا پس فوراً طلاقِ معلقہ پڑ گئی۔ کیونکہ زید نے انشاء اللہ نہ کہا تھا۔ جیسا کہ عبارۃِ سوال اور میری ذاتی تفتیشِ واقعات سے ظاہر ہوا پس اس حدیث کے مبینہ قانون سے بھی طلاق پڑ گئی :۔ **دلیلِ چہارم** :۔ احادیثِ کثیرہ وروایات عدیدہ میں یہ بات بہت واضح ہے کہ اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو طلاق کا اختیار دیدے تو بیوی اپنی مرضی سے جس وقت اس اختیار کو استعمال کرے گی۔ اس وقت طلاق پڑے گی اور جتنی طلاقیں بیوی خود کو دے گی اتنی ہی پڑیں گی۔ یہ سوچ کر کوئی طلاق نہ پہلے پڑے گی۔ اور نہ ضائع جائے گی۔ اختیار خواہ ظاہری لفظوں سے

دے یا کنایۃً۔ اشارۃً۔ مثلاً یا یہ کہے کہ تو اپنے آپ کو طلاقیں دے دے یا کہے کہ تو اپنی مرضی سے مجھے چھوڑ کر جہاں چاہے چلی جا۔ بہرحال طلاق شرعاً وارد ہوگی۔ مگر اس وقت جب کہ بیوی چاہے گی۔ شریعت نے اس طلاق کو جائز رکھا ہے۔ اس اختیار دینے کا مطلب بھی یہ ہوا کہ خاوند نے اپنی بیوی کی طلاق کو اسی کی رضا سے معلق کر دیا۔ اور بیوی کی رضا شرط بن گئی۔ تو جب بیوی کی رضا پائی جائے گی طلاق واقع ہو جائے گی۔ چنانچہ موطا امام مالک علیہ الرحمۃ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۷ پر ہے:۔ حَدَّثَنِیْ یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلٰی عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَقَالَ یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اِنِّیْ جَعَلْتُ اَمْرَ امْرَاَتِیْ فِیْ یَدِهَا فَطَلَّقَتْ نَفْسَهَا فَمَاذَا تَرٰی:۔ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اَرَاهُ كَمَا قَالَتْ:۔ (ترجمہ):۔ ایک مرد حضرت عبداللہ ابن عمر کی خدمت میں آیا اور عرض کی میں نے اپنی بیوی کو طلاق کا اختیار دیا تھا۔ اس نے خود کو طلاق دے لی پس آپ کا کیا فتویٰ ہے آپ نے فرمایا کہ طلاق ہو گئی۔ مسئلہ اس حدیث پاک نے صاف کر دیا۔ کہ جب خاوند طلاق کو بیوی کی رضا سے لٹکا دے تو جب رضاء زوجہ پائی جائے گی طلاق واقع ہو گی۔ اسی طرح اگر خاوند اپنے کسی کام پر طلاق کو معلق کر دے گا تب بھی جب وہ کام پایا جائے گا۔ طلاق قیاساً واستنباطاً۔ لازماً۔ وحتماً۔ پائی جائے گی۔ یہ مسئلہ ان ہی احادیث سے لیا گیا ہے۔ گویا کہ شریعت میں طلاق معلق بالشرط اور طلاق معلق بالتملیک و اختیار حکماً ایک زمرہ میں ہیں۔ بدیں وجہ اسی حدیث کے تحت فتویٰ دیا جا رہا ہے کہ زید کی بیوی کو طلاق ہو گئی:۔

دلیلِ پنجم:۔ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۱۴۱ پر ہے۔ عَنْ عَلِیٍّ اَنَّهٗ قَالَ اِنِ اخْتَارَتْ نَفْسَهَا فَوَاحِدَةٌ بَائِنَةٌ:۔ (ترجمہ) اگر کسی خاوند نے اپنی بیوی کو کنایہ طریقے سے اختیار دیا کہ اگر تو چاہے تو مجھ کو پسند کرے اور اگر تو چاہے تو خود کو علیحدہ کرے۔ وہ عورت خود کو علیحدہ کرے تو ایک طلاق بائنہ پڑے گی۔ یعنی یہ کلام بھی بیکار نہ جائے گا اور معلق طلاق بن کر جب بیوی اس اختیار کو استعمال کرے گی تب طلاق واقع ہو جائے گی۔ پس اسی طرح کلام زید مذکورہ فی السوال ضائع نہ جائے گا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حدیث میں خاوند نے طلاق کو رضاءِ زوجہ سے لٹکایا اور زید نے طلاقِ زوجہ کو نکاحِ دختر سے لٹکایا۔ وہ موجبہ ہے یہ سالبہ۔ وہاں ہے اگر تو اختیار کرے۔ اور یہاں ہے اگر میں نکاح نہ کروں جب وہ بھی جملہ شرطیہ۔ یہ بھی جملہ شرطیہ۔ تو جب بقول و فرمانِ علیٔ مرتضیٰ شیرِ خدا مشکل کشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں طلاق پڑ گئی تو یہاں بھی لازماً معینہ طلاقیں پڑ جائیں گی:۔

دلیلِ ششم:۔ ابوداؤد شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۳۰۰ پر ہے:۔ عَنْ قَتَادَةَ عَنِ الْحَسَنِ۔ فِیْ اَمْرُكِ بِیَدِكِ قَالَ ثَلَاثٌ۔ (ترجمہ): حضرت قتادہ تابعی حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ ایک خاوند نے اپنی بیوی سے کہا کہ تیرا کلی معاملہ تیرے

ہاتھ میں ہے۔ بیوی کہے کہ میں خود کو طلاقیں دیتی ہوں تو تین طلاق واقع ہو جائیں گی ثابت ہوا کہ حدیث و قرآن کی رو سے کسی بھی شرط پر منفی یا مثبت طلاق کو معلق کیا جائے تو طلاق پڑ جاتی ہے ان ہی آیات سے قیاس و استنباط کرکے تمام فقہاء عظام۔ حنفی۔ شافعی، مالکی۔ حنبلی۔ کا یہی مذہب ہے کہ طلاق معلق بالشرطہ۔ اس وقت واقع ہو جاتی ہے جب طلاق کی شرط پائی جائے۔ بلکہ اس فتوے کے لکھنے کے دوران میں نے بطور اتمام حجت غیر مقلد بڑے بڑے اکابر سے پوچھا کہ کیا طلاق معلق بعد وجود شرط۔ واقع ہے تو انہوں نے ان ہی احادیث و آیات پر قیاس کرکے۔ واقع مانا۔ حالانکہ یہ لوگ قیاس کے سخت دشمن ہیں جو اگرچہ ان کی حماقت ہے۔ مگر یہاں ماننا ہی پڑا امام مالک کا مسلک تو ان کی موطا سے ظاہر ہو چکا۔ امام اعظم کا مذہب مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے:۔

دلیل ہفتم:۔ فتاوٰے فتح القدیر جلد سوم صفحہ نمبر ۱۲۸ پر ہے۔ وَاِذَا اَضَافَہٗ اِلَی شَرْطٍ وَقَعَ عَقِیْبَ الشَّرْطِ مِثْلُ اَنْ یَّقُوْلَ لِاِمْرَاَتِہٖ اِنْ دَخَلْتِ الدَّارَ فَاَنْتِ طَالِقٌ وَھٰذَا بِالْاِتِّفَاقِ لِاَنَّ الْمِلْکَ قَائِمٌ فِی الْحَالِ وَالظَّاھِرُ بَقَائُہٗ اِلٰی وَقْتِ وُجُوْدِ الشَّرْطِ:۔ (ترجمہ):۔ اور جب کوئی خاوند طلاق کو کسی شرط کی طرف منسوب کر دے تو وہ طلاق شرط کے پائے جانے کے بعد واقع ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی خاوند اپنی بیوی کو کہے کہ اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق ہے۔ یہ حکم و قانون سب مجتہدین ائمہ اربعہ کے نزدیک ہے وجہ یہ کہ نکاح کی ملک قائم ہے فی الحال۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ملک نکاح شرط کے پائے جانے تک باقی ہے۔ یعنی امام اعظمؒ۔ مالکؒ۔ شافعیؒ حنبلؒ سب کے نزدیک اس اصولی مسئلے میں اتفاق ہے طلاق بالشرط بعد پائے جانے شرط کے واقع ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصول شریعت میں طلاق کا محل ملک زوجیت ہے جب تک یہ ملکیت قائم ہے۔ اس وقت تک جس طرح بھی طلاق دی جائے واقع ہو جائے گی۔ خواہ تنجیزاً خواہ تعلیقاً۔

دلیل ہشتم:۔ قرآن مجید حدیث پاک مذہب مالکی۔ مذہب حنفی سے ثابت ہو گیا بلکہ فتح القدیر کی مندرجہ بالا عبارت سے ائمہ اربعہ کا مذہب ثابت ہوا کہ طلاق معلقہ علی الشرط بعد شرط واقع ہو جاتی ہے۔ مگر یہ مسئلہ تو علم معقولات یعنی علم نحو سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ نحو کی مشہور کتاب ہدایۃ النحو صفحہ پر ہے:۔ وَاَمَّا کَلِمُ الْمُجَازَاتِ حَرْفًا کَانَتْ اَوْ اِسْمًا فَھِیَ تَدْخُلُ عَلَی الْجُمْلَتَیْنِ لِتَدُلَّ عَلٰی اَنَّ الْاُوْلٰی سَبَبٌ لِلثَّانِیَۃِ وَتُسَمَّی الْاُوْلٰی شَرْطًا وَالثَّانِیَۃُ جَزَاءً (ترجمہ) جزا بنانے والے کلمات حرف ہوں یا اسم وہ دو جملوں پر داخل ہوتے ہیں تاکہ دلالت کریں اس بات پر کہ بے شک پہلا سبب ہے دوسرے کا اور پہلے کا نام رکھا جاتا ہے شرط اور دوسرے کا جزا درس نظامی کی مشہور کتاب شرح مائۃ عامل کے صفحہ ۲۳ پر ہے۔ وَاِنْ لِلشَّرْطِ وَالْجَزَاءِ

ترجمہ:- حرفِ اگر ہمیشہ شرط اور جزاء کے لیئے آتا ہے۔ یعنی جس بات میں بھی اگر بولا جائے وہ بات معلق ہو جاتی پچھلی بات پر۔ سوال مذکورہ میں زید نے اپنے حلف ہذا حلف نامے میں یہی کہا ہے کہ اگر میں اپنی بیٹی کا نکاح نہ کروں تو میری بیوی کو طلاق اسی کو شرط و جزا کہتے ہیں یہی وہ دو جملے ہیں جن میں پہلا شرط ہے دوسرا جزا۔ اور بقانونِ نحو پہلا سبب ہے دوسرے کے وجود کا۔ لہٰذا جب سبب پایا گیا تو مسبب فوراً پایا جائے گا۔ اسی طرح شرح مائۃ عامل صفحہ ۲۶ پر ہے:- تَدْخُلُ عَلَى الْفِعْلَيْنِ وَيَكُوْنُ الْفِعْلُ الْاَوَّلُ سَبَبًا لِلْفِعْلِ الثَّانِي وَيُسَمَّى الْاَوَّلُ شَرْطًا وَالثَّانِي جَزَاءً۔ (ترجمہ):- لفظِ اگر دو فعلوں پر یعنی دو کاموں پر داخل ہوتا ہے۔ اور پہلا فعل سبب ہو جاتا ہے دوسرے کا۔ پہلے کا شرط دوسرے کا جزا نام رکھا جاتا ہے۔ یعنی جب پہلا کام کرنا یا نہ کرنا پایا گیا تو دوسرا خود بخود پایا جائے گا۔ لہٰذا ان قوانینِ معقولیہ کے تحت بھی زید کی بیوی ہندہ کو تین طلاق پڑ گئیں۔ اس لیئے کہ زید نے اپنے حلفیہ کلام میں اگر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس سے یہ جملہ شرطیہ بن گیا:- دلیل نہم فقہ حنفی کی صریحی عبارت تو پہلے پیش کر دی گئی اسی طرح موطا امام کی بھی۔ اب مذہب شافعی ملاحظہ ہو۔ چنانچہ۔ مغنی المحتاج لشیخ محمد خطیب شربینی شافعی جلد سوم صفحہ ۳۱۹ پر ہے:- اِذَا عَلَّقَ الطَّلَاقَ بِحَمْلٍ۔ فَاِنْ كَانَ بِهَا حَمْلٌ ظَاهِرٌ وَقَعَ الطَّلَاقُ فِي الْحَالِ لِوُجُوْدِ الشَّرْطِ۔ (ترجمہ):- اگر کسی خاوند نے طلاقِ بیوی۔ اس کے حمل پر معلق کی مثلاً کہا کہ اگر تجھ کو حمل ہو۔ تو تجھے طلاق کل وقت اس کو حمل ظاہر تھا۔ تو طلاق اسی وقت پڑ جائے گی کیونکہ شرط موجود ہے۔ ثابت ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی شرط جب پائی جائے گی اسی وقت وہ جزا ہو جائے گی۔ یہی چیز سوالِ مذکورہ میں ہے۔ فقہ شافعی حاشیہ بیجوری الامام ابی شجاع جلد دوم صفحہ نمبر ۱۷۱ پر ہے:- وَيَصِحُّ تَعْلِيْقُهُ اَيِ الطَّلَاقِ بِالصِّفَةِ وَالشَّرْطِ۔ (ترجمہ):- وہ طلاق بھی صحیح واقع ہو جاتی ہے جو کسی صفت یا کسی شرط سے معلق ہو۔ اسی کے صفحہ نمبر ۱۷۱ پر ہے:- وَاَدَوَاتُ التَّعْلِيْقِ تَقْتَضِي الْفَوْرَ فِي النَّفْيِ اِلَّا اِنْ فَاِنَّهَا لِلتَّرَاخِي۔ (ترجمہ) طلاق وغیرہ کو معلق کرنے والے الفاظ تقاضہ کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ اگر شرط نفی کی لگائی ہے تو فوراً طلاق واقع ہو جائے گی۔ سوائے لفظ اگر کے۔ وہ چاہتا ہے کہ دیر سے۔ یعنی شرط کے پائے جانے سے طلاق واقع ہو۔ صورت مذکورہ میں زید نے اپنی بیوی ہندہ کی طلاق کو نفی پر ہی معلق کیا ہے اور لفظ اگر لکھا ہے۔ یعنی کہاں ہے کہ اگر میں نکاح دختر نہ کروں تو طلاق ہے۔ پس ان قواعد کے تحت چونکہ اب شرط پائی گئی اور زید نے اپنی بیٹی کا نکاح نہ کیا لہٰذا طلاق پڑ جائے گی۔ قانونِ شریعت میں یہ بات ثابت ہے کہ جب کسی چیز کو کسی شرط پر معلق کرنا ہو تو دونوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ الحاوی للفتاوٰی جلد اوّل صفحہ ۲۰۰ پر ہے:-

وَلَابُدَّ فِی التَّعْلِیْقَاتِ مِنْ ذِکْرِ الْمُعَلَّقِ وَھُوَ الطَّلَاقُ وَالْمُعَلَّقُ عَلَیْہِ وَھُوَ الْفِعْلُ۔ (ترجمہ) معلق کرنے کی صورتوں میں ضروری ہے کہ جس کو معلق کیا جا رہا ہو اس کا بھی ذکر ہو اور جس پر معلق کیا جا رہا ہے اس کا بھی ذکر ہو۔ جب دونوں کا ذکر ہو تو تعلیق صحیح ہے اور جب معلق علیہ یعنی شرط پائی جائے گی تو وہ معلق فوری واقع ہوگا بصورت مذکورہ میں۔ زید نے معلق و معلق علیہ دونوں کا ذکر کیا۔ زید کے حلفیہ اقرار نامے میں یہ کہنا کہ اگر میں اپنی بیٹی کا نکاح بکر کے بیٹے سے نہ کروں تو میری بیوی ہندہ کو طلاق ثلاثہ اس میں پہلا جملہ معلق علیہ ہے اور ہندہ کی طلاق معلق ہے۔ اور معلق علیہ کے وجود سے معلق کا وجود لازم ہے **دلیل دھم**۔ جس طرح کہ کتبِ شافعی سے اس امر کی صراحتاً تجویز ثابت ہو رہی ہے۔ امام احمد بن حنبل کا مسلک بھی حنابلہ کی کتب سے یہی ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ۔ المغنی لابنِ قدامہ جلد ہفتم ص۴۵۵ پر ہے۔ فَاِنْ قَالَ اِنْ لَمْ تَکُوْنِیْ حَامِلًا فَاَنْتِ طَالِقٌ۔ وَلَمْ تَکُنْ حَامِلًا طُلِّقَتْ۔ (ترجمہ) اگر کسی خاوند نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو حاملہ نہ ہو تو۔ تو طلاق والی ہے۔ وہ حاملہ نہ تھی۔ تو طلاق پڑ جائے گی۔ بالکل یہی صورتِ نفی سوال مذکورہ میں ہے۔ بدیں وجہ یہاں طلاق پائی گئی خلاصہ یہ کہ طلاق کسی طرح بھی معلق کی جائے قرآن پاک حدیثِ مبارکہ اور ائمہ اربعہ و تمام فقہاءِ عظام کے فرمودات کے مطابق واقع ہو جائے گی۔ بشرطیکہ معلق بہ پایا جائے۔ ہاں اگر وہ شے نہ پائی جائے جس پر طلاق کو معلق کیا ہے تو طلاق بھی نہ پائی جائے گی۔ یہ مسئلہ تو اتنا واضح ہے کہ موجودہ زمانے کے غیر مقلد وہابی جو قیاس کا سخت انکار کرتے ہیں۔ یہاں وہ بھی قیاس کے پابند ہو کر طلاقِ معلقہ کو مان لیتے ہیں گویا کہ اپنے کمزور مذہب سے منحرف ہو جاتے ہیں ہاں البتہ شیعہ روافض جو قرآن و حدیث کے شروع سے ہی منکر ہیں وہ طلاقِ معلقہ کو بالکل باطل مانتے ہیں۔ جیسا کہ اُن کی کتاب جامع رضوی فارسی سے مترجم اردو جامع جعفری جلد دوم صفحہ نمبر ص۱۲ پر ہے۔ صورت مسئولہ مذکورہ میں مسمٰی زید بحمدہٖ تعالیٰ اہلسنت حنفی ہے اس لیے اس کے مذہب کے مطابق فتویٰ جاری کیا جا رہا ہے زید مذکورہ نے اپنی بیوی کا ہندہ کی طلاق ثلاثہ کو اپنی بیٹی کے نکاح نہ کرنے پر معلق کیا پھر تمہ مدتِ معینہ تک نکاح نہیں کیا لہٰذا معلق بہ پایا گیا اور ضابطہ اسلامیہ شرعیہ سے تین طلاق واقع ہو گئیں۔ حتمًا و یقینًا۔ ہاں اگر زید اپنی بیٹی کا نکاح کر دیتا اور وہیں کرتا جہاں کی حلف دی تھی تو اس کی بیوی ہندہ کو طلاق ثلاثہ واقع نہ ہوتی۔ خالد کا یہ کہنا کہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی غلط ہے اور قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خالد رافضی المذہب ہو۔ رہا یہ شبہ کہ تین طلاق ایک دم واقع ہوتی ہیں یا نہیں یہ ایک علیحدہ مسئلہ ائمہ اربعہ کے نزدیک واقع ہو جاتی ہیں:۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کتاب الرضاع

کوئی عورت کسی دوسرے بچے کے کان میں اپنا دودھ ڈال دے تو اس سے رضاعت نہیں ہوتی

سوال نمبر ۶۵۵ :- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ایک عورت نے اپنے بچے کے سوا کسی دوسرے ایک سالہ چھوٹے بچے کے کان میں بطورِ دوائی اپنا دودھ ڈال دیا۔ تو جس طرح منہ میں یا ناک میں دودھ ڈالنے سے حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ کیا کان میں دودھ ڈالنے سے بھی رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا :- السائل: محمد رمضان مظفر گڑھ ۔ مورخہ ۱۲-۱۲-۱۹۹۸

اَلْجَوَاب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ

قانون شریعت مطہرہ کے مطابق کسی شیر خوار بچے کے کان میں کسی عورت کا دودھ بذریعہ پستان یا بذریعہ چمچ وغیرہ ڈالنے سے حرمتِ رضاعت بالکل ثابت نہیں ہوتی کیونکہ حرمتِ رضاعت براستہ حلق پیٹ میں دودھ ڈالنے سے ہوتی ہے۔ کان کے ذریعے پیٹ میں دودھ نہیں جاتا۔ کیونکہ کان سے کوئی راستہ پیٹ کی طرف نہیں نکلتا۔ ہاں اگر کسی روزے دار کے کان میں گائے یا بھینس کا دودھ ڈالا گیا۔ تو صحیح یہ ہے۔ کہ روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ دودھ بوجہ چکناہٹ تیل کے درجے میں ہے اور مٹھا مکھن نکلا ہوا پانی کے درجے میں ہے۔ اور روزہ ٹوٹنا صرف پیٹ سے ہی متعلق نہیں بلکہ دماغ میں بھی کسی شئی کے جانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بخلاف رضاعت کے کہ وہ صرف عورت کے دودھ کو بطور خوراک شیر خوار کو بذریعہ حلق پلانے سے حاصل ہوتی۔ مگر کان میں یہ دونوں باتیں نہیں نہ پلانا مقصود ہے نہ حلق کا راستہ مقصود اس لیے اس سے حرمت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ چنانچہ فتاوٰی درمختار و شامی جلد دوم صفحہ نمبر ۵۶۳ پر ہے :- وَلَا الْاِحْتِقَانُ وَالْاِقْطَارُ فِیْ اُذُنٍ وَاِحْلِیْلٍ وَجَائِفَۃٍ وَاٰمَّۃٍ ط (ترجمہ) اور حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ حقنے میں دودھ ڈالنے سے۔ اور نہ کان میں قطرے ٹپکانے سے نہ ذکر کے سوراخ میں دودھ ڈالنے سے۔ نہ پیٹ کے زخم میں۔ نہ دماغی زخم میں دودھ ڈالنے سے۔ اسی طرح فتاوٰے عالمگیری جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۴۴ پر ہے :- وَلَمْ یَثْبُتْ بِالْاِقْطَارِ فِی الْاُذُنِ ط (ترجمہ) رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ کان میں عورت کے دودھ کے قطرے ٹپکانے سے۔ فتاوٰی قاضی خان میں بھی اسی طرح ہے۔ ہاں ناک اور منہ میں ڈالنے سے رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ کیونکہ یہاں پلانا بھی مراد ہے اور حلق بھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حقنہ کرانے سے روزہ تو ٹوٹ جاتا ہے مگر رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ روزہ ٹوٹنے میں صرف پیٹ میں جانا شرط ہے خواہ کسی طرح ہو۔ لیکن رضاعت کے لیے قاعدہ کلیہ ہے۔ کہ براستہ حلق ہی جائے۔ اگرچہ ایک ہی چسکی ملے دیکھو پیٹ کے زخم میں دودھ جانے سے بھی حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ اور نہ وہ عورت اس شیر خوار بچے کی رضاعی ماں بنی :- خیال رہے کہ امام اعظم کے نزدیک رضاعت یعنی دودھ

پینے کی مدت ڈھائی سال ہے اور صاحبین یعنی امام یوسف و امام محمد کے نزدیک دو سال ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر بچے کے لیے امام اعظم کا قول معتبر ہے لہٰذا احتیاطاً واجب ہے کہ اگر ڈھائی سال بچے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا تو حرمت ثابت ہوگی۔ اور اجرت پر پلانے والی کے لیے صاحبین کا قول معتبر ہے۔ کہ باپ پر دو سال بعد اجرت دینی واجب نہیں۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ بچے کا اتنے عرصہ تک دودھ پینا فرض نہیں لہٰذا اگر کسی بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا مدت سے پہلے ہی اور وہ خوب روٹی کھانا کھاتا ہے اور کسی عورت نے مذاقاً یا جبراً اس کو اپنا دودھ پلا دیا تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔ ہاں ڈھائی سال گزرنے کے بعد جتنا بھی پلائے حرمت ثابت نہ ہوگی۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری جلد اول ص۳۴۲ پہ ہے
اذا مضت مدۃ الرضاع لم یتعلق بالرضاع تحریم۔ ترجمہ جب دودھ پینے کی مدت گزر گئی پھر بچے نے دودھ پیا تو حرمت نہ ہوگی واللّٰہ ورسولہ اعلم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ شیر خوارگی

سوال نمبر ۷۶: کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ آقائے نامدار سرورِ عالم نورِ مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ایامِ رضاعت میں کن کن دائیوں نے دودھ پلایا۔ امام زرقانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب زرقانی شریف جلد اول صفحہ نمبر ص۱۴۷ پر جہاں سات دودھ پلانے والی دائیوں کا ذکر کرتے ہیں ان میں تین کنواری عورتوں کا ذکر ہے جن کا دودھ پیا۔ اور اس کی تصدیق میں ایک حدیث اَنَا ابْنُ الْعَوَاتِكِ مِنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ، استیعاب ابن عبد اللہ سے نقل کرتے ہیں جس کے علاوہ کا انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ فرمایا جائے۔ کہ یہ حدیث کہاں تک صحیح ہے اور اس کا راوی بھی ہے یا نہیں۔ اور اس حدیث کو کیا درجہ دیا جاسکتا ہے اس واقعہ سے یہاں پر بہت شور مچا ہے۔ وہابی اور دیوبندی اس کے خلاف بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس سے توہینِ رسالت ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ کنواریوں کو دودھ نہیں آسکتا۔ یہ بالکل خلافِ عقل ہے مہربانی فرماکر اس مسئلہ کی تحقیق فرماکر جواب سے نوازیں عیون المعارف میں امام قضاعی نے بھی یہی مسئلہ لکھا ہے۔ کہ تین کنواریوں نے حضور علیہ السلام کو دودھ پلایا۔ فقط والسلام۔

سائل:۔ سید محمد فاضل بخاری خطیب صابری مسجد، جڑانوالہ۔ ضلع فیصل آباد

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی دودھ پلانے والی دائیوں کے بارے میں مؤرخین و محدثین کے کچھ اختلاف ہیں صحیح یہ ہے۔ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی دائیاں کل سات ہیں۔ جن میں سب سے پہلی دایہ حضرت ثویبہ ابوجہل کی آزاد شدہ لونڈی ہیں۔ اور انہی سات میں تین دائیاں وہ ہیں۔ جن میں مشہور ہے۔ کہ وہ کنواری لڑکیاں تھیں جب انہوں نے حضور کو گود میں لیا۔ تو قدرتی ان کے دودھ اتر آیا۔ جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پلایا۔ مشہور یہ ہے۔

کہ ان بیٹیوں کا نام عاتکہ ہے۔ اکثر علماء مؤرخین نے اِس کا ذکر اپنی کتب میں فرمایا۔ جن میں مذکورہ فی السّوال ہر دو حضرات بھی داخل ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا کنواری لڑکیوں کا دُودھ پینا جیسا کہ مشہور ہے یہ کوئی تعجب خیز نہیں۔ اس لیئے کہ ان کنواری لڑکیوں کا دُودھ اُترنا حضور کا معجزہ تھا۔ اسی لیئے حضور اکرم کے اُس دُودھ کو نوش فرمانے کے بعد دُودھ بند ہوگیا۔ باری تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کو ایک ایسی طاقت دی ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے اِن سے عجیب عجیب باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو انسانی عقل اور طاقت سے باہر ہوتی ہیں۔ اِن کا نام اصلاح میں اِرہاص اور معجزہ ہے۔ اگر عجیب باتیں نبی کی پیدائش سے پہلے یا بعد میں اعلان نبوت سے پہلے ظاہر ہوں۔ تو اُن کو اِرہاص کہتے ہیں۔ اور اگر بعد اعلانِ نبوت ظاہر ہوں۔ تو اُن کا نام معجزہ ہے۔ حضور کا یہ دُودھ پینا اِرہاص ہی میں داخل ہے اور مخالفین کا یہ قول کہ یہ چیز خلافِ عقل ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ کیونکہ اِرہاص اور معجزہ کہتے ہی اُس کو ہیں۔ جو اُن کی عقل کو عاجز کر دے۔ جو عقل اور سمجھ میں آ جائے۔ وہ معجزہ نہیں رہتا۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا بچپن میں بولنا اِرہاص ہے۔ اور عقل کے خلاف ہے: ۔ کہ حضور نبی کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا چاند چیرنا سورج لوٹانا انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری فرمانا، یہ سب خلافِ عقل ہیں اسی طریقے سے حضور کا کنواری لڑکیوں کا دُودھ پینا بھی بالکل خلاف ہے۔ مگر جس طرح معجزات برحق ہیں۔ اسی طرح یہ مذکورہ فی السّوال اِرہاص بھی بالکل برحق ہے۔ اور تمام انبیاء اپنے اس خدا داد طاقت میں مختارِ کل ہوتے ہیں۔ مجبور یا بے خبر نہیں کہ خود بخود معجزہ صادر ہوتا رہے بلکہ اِرہاص اور معجزہ اُن کی مرضی سے صادر ہوتا ہے۔ جب چاہیں۔ دکھائیں اور جب چاہیں نہ دکھائیں یہی تمام علمائے اہلسنّت کا عقیدہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس میں توہینِ رسالت ہے تو یہ محض لغو اعتراض ہے۔ اس میں رسالت کی کسی طریقہ سے توہین کا شائبہ بھی نہیں۔ اگر حضور نبی پاک کا کنواری لڑکیوں کا دُودھ پینا توہین ہے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا کنواری (اپنی والدہ) کا دُودھ پینا کیوں کر توہین نہ ہوگا۔ اور بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا حضرت مریم کے بطن سے دنیا میں تشریف لانا عجیب نہیں؟ بلکہ عظیم الشان قدرتِ الٰہی کا کرشمہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا معجزہ ہے۔ جن کو اصطلاحِ عرب میں اِرہاص کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِسی طریقہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک معجزہ بھی مشہور ہے۔ جو مشکوٰۃ شریف باب المعجزات کی آخری حدیث صفحہ نمبر ۵۴۴ پر مرقوم ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُمّ معبد کی غیر حاملہ کنواری بکری کے پستانوں سے اتنا دودھ نکالا۔ جس کو کئی لوگوں نے اور خود نبی پاک نے نوش فرمایا۔ بتایئے۔ کہ یہ بھی توہینِ رسالت ہے ہرگز نہیں بلکہ عظیم الشّان معجزۂ رسول ہے۔ یہ بھی انسانی عقل کے خلاف ہے۔ اِسی طریقہ سے حضور کا کنواری لڑکیوں کا دودھ نوش فرمانا بھی توہین نہیں بلکہ رسالت کی دلیل ہے۔ مشہور یہ ہے۔ کہ اُن بیویوں کا نام عاتکہ ہے۔ چنانچہ نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے بعض غزووں میں صحابہ کے سامنے چند مرتبہ اِس طرح فرمایا:۔ اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ وَاَنَا ابْنُ الْعَوَاتِكِ مِنْ بَنِیْ سُلَیْمٍ ۔ یہ حدیث بالکل درست اور صحیح ہے اِس کو سیابہ بن عاصم سے امام طبرانی نے کبیر میں نقل فرمایا اور

سعید ابن منصور امام اپنی سنن میں روایت کرتے ہیں۔ حضرت سابر بن عاصم صحابی رسول اور بڑے معتبر راوی ہیں۔ اس حدیث اور مختصر واقعہ کو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب شمول الاسلام صفحہ نمبر ۱۱ پر بھی نقل فرمایا ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ امام زرقانی اور امام قضاعی کا بیان کیا ہوا واقعہ درست ہے۔ اس میں توہین رسول کا شائبہ بھی نہیں۔ لہٰذا اس میں جھگڑا کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ہاں یہ سوال ہو سکتا ہے۔ کہ یہ معجزہ کیوں صادر ہوا۔ ہر معجزہ کسی فائدے اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں کیا حکمت تھی تو اولاً جواب یہ ہے۔ کہ یہ اعتراض تو خلقت مسیح پر بھی ہو سکتا ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے اس طرح خلقت کیوں فرمائی۔ اور ایسا دودھ کیوں پلوایا۔ قانونِ الٰہیہ کے مطابق پیدائش حمل سے پہلے دودھ پیدا ہوتا ہے۔ تو جس وقت حضرت مریم کا دودھ پیدا ہوا۔ تو اس وقت آپ کنواری تھیں۔ اور عرفِ شریعت میں ہر وہ عورت بھی باکرہ ہوتی ہے۔ جس کی بکارت بغیر صحبت زائل ہو۔ پس معترض کے پاس اس کا کیا جواب ہے **جواب دوم**۔ یہ درست ہے۔ کہ ہر معجزہ کسی حکمت اور فائدے پر ہی مبنی ہوتا ہے مگر اس کا علم ہر انسان کے لیے ضروری ضروری نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ہوتے ہیں۔ ہاں بعض معجزات و قدرت خداوندی کی حکمتیں عقل کامل سے معلوم ہو جاتی ہے مگر وہ منحصر نہیں تو ہیں

جواب سوم۔ یہ ہے۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے بعض احکام کی عملاً تبلیغ فرمائی بعض کی عملاً بھی اور قولاً۔ جس طرح کہ اور بہت سے قانونوں کی عملاً تبلیغ اور وضاحت فرمائی۔ اسی طرح بے شادی شدہ کنواری عورت کے دودھ کے حلال ہونے کے مسئلہ کی عملی تبلیغ بچپن کی عمر کے سوا ممکن نہ تھی۔ اس لیے مذکورہ بالا معجزہ ازحامں ظاہر ہوا اور کنوارے جانور مؤنث کے دودھ کی حلت ام معبد کی بکری والے واقعات سے ثابت ہوتی۔ اگر یہ دو معجزانہ واقعات نہ ہوتے تو آج اس مسئلہ کے حل میں بہت دشواری پیش آتی۔ پس ایک حکمتِ عظیمہ اس معجزے کے صدور سے یہ بھی معلوم ہوئی۔ دوسری حکمت اس میں یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ ہر نبی کو ان کے زمانے کے مطابق معجزہ دیا جاتا ہے۔ تو چونکہ نبی پاک کا زمانہ تاقیام قیامت ہے۔ جس میں آج کل کا سائنسی دور بھی شامل ہے۔ اس معجزے کا اظہار کر کے سائنس دان کے ترقی یافتہ ذہن کو مبہوت کر دیا۔ کہ سائنس والوں کی اختراع زمینی چشموں تک ہے مگر یہ معجزہ کئی درجہ محیر العقول ہے۔ ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سب انبیاء کرام کے معجزے فرداً فرداً نبی کریم کو عطا ہوئے اور زیادہ شان سے عطا ہوئے جس کی طرف اعلیٰحضرت نے اشارہ فرمایا۔ شعر۔ حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ وہ بطنِ مادر میں آئے جس سے دودھ پیدا ہوا اور آپ نے کنواری مریم کا شیر پیا اسی طرح حضرت صالح نے کنواری اونٹنی اور اس کا دودھ نکالا اور پیا۔ ان معجزات نے دنیا کو حیران کر دیا۔ لیکن ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے کنواری عورت کے گود میں آنے سے ہی دودھ پیدا فرما دیا۔ یہ معجزہ ان معجزوں سے زیادہ حیران کن ہے۔ اور اس طیب دودھ کو پینا صرف اظہارِ معجزہ ہے اگر نہ پیتے تو معجزہ ظاہر نہ ہوتا۔

وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کھڑے ہو کر کھانا اور پینا مسلمان کیلئے سخت ناجائز ہے یہاں تک کہ شیرخوار بچے کو بھی بٹھا کر دودھ پلایا جائے، کھڑا کر کے پلانا منع ہے

سوال نمبر ۶۷: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ:۔ آج جو شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں پنجاب کے شہروں میں مسلمان لوگ صرف میزیں بچھا کر کھانا چن کر کھڑے کھڑے بلکہ بہت جگہ بھاگ دوڑ کر کھاتے ہیں۔ کیا اس طرح روٹی کھانی جائز ہے یا نہیں۔ ہمارے ایک دوست نے ایک وہابی مولوی سے فتویٰ لیا ہے۔ وہابی مولوی اسلام آباد راولپنڈی کی مرکزی مسجد کا بہت بڑا عالم خطیب ہے اور اپنے فتوے میں دو دلیلیں دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ کھڑے ہو کر کھانا پینا بالکل جائز ہے۔ پہلی دلیل مشکوٰۃ شریف کی یہ حدیث پیش کرتا ہے۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نَأْكُلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَمْشِيْ وَنَشْرَبُ وَنَحْنُ قِيَامٌ (رواہ الترمذی)۔ (ترجمہ):۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا ہم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چلتے پھرتے کھالیا کرتے تھے اور کھڑے کھڑے پی لیا کرتے تھے۔ صحاح ستہ کی دو کتابوں ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کرتے ہوئے اس روایت کو حسن صحیح فرمایا۔ دوسری دلیل مشکوٰۃ شریف ص ۳۷۱ پر ہے عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشْرَبُ قَائِمًا وَقَاعِدًا (رواہ الترمذی)۔ (ترجمہ) عمرو ابن شعیب اپنے والد سے وہ والد ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کو دیکھا کہ آپ کھڑے ہو کر بھی پی لیا کرتے تھے اور بیٹھ کر بھی۔ لہٰذا جائز ہے کہ کھڑے ہو کر بھی کھائیں پئیں اور بیٹھ کر بھی۔ ہم اہالیانِ علاقہ نے کھڑے کھانے کے خلاف بھرپور مہم شروع کر رکھی تھی مگر اس فتوے نے ہماری اس تحریک کو خاصا کمزور کر دیا ہے۔ جو لوگ پہلے اس شیطانی دعوتوں سے بچنے اور بچانے کا وعدہ کر چکے تھے۔ اب وہ بھی پھسلتے نظر آ رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں مکمل مدلل فتویٰ دیا جائے جس میں ثابت ہو کر کھڑا کھانا مسلمان عوام امراء وزراء کے لیے ناجائز ہے۔ اور مندرجہ بالا دلیلوں کا صحیح مطلب بیان فرمایا جائے:۔ بَيِّنُوْا تُوْجَرُوْا

دستخط سائل:۔ غلام رسول و عبدالکریم۔ اور مختلف دستخط اہالیانِ علاقہ اسلام آباد راولپنڈی:۔ ۲۶۔۶۔۸۰

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

قانونِ شریعت کے مطابق احادیث و فقہ کی روشنی میں کھڑے ہو کر کھانا ہر مسلمان کے لیے مکروہ تحریمی ہے

اور کھڑے ہو کر پانی وغیرہ پینا مکروہ تنزیہی ہے۔ یہ فرق بھی صرف اس لیے ہے کہ فقہاء ملت نے کھڑے ہو کر پینے کے مکروہ تنزیہی ہونے پر اتفاق کر لیا ہے۔ ورنہ صرف احادیثِ مطہرات کے مطالعے سے تو دونوں کام بدعت سیئہ اور مکروہ تحریمی ہی نظر آتے ہیں۔ فقہاء کرام کا یہ اتفاق علی کراہتِ تنزیہی بھی ایک خبرِ واحد کے اشارے کی بنا پر ہے۔ جس کا ذکر آئندہ ہوگا اس لیے احتراماً قبول ہے۔ لیکن کھڑا کھانا بہر صورت مکروہ تحریمی ہے۔ اور کھانے والا سخت شرعی مجرم ہے۔ یہ حکم تو قرآن پاک احادیثِ معتبرہ اور فقہاء اسلام کے فرمودات سے ثابت ہو رہا ہے مگر تعجب تو ان سفہاء دیوبند پر ہے جنہوں نے ہر بدعتِ سیئہ کو رواج دینے کی مذموم ذمے داری اٹھا رکھی ہے۔ بدعتی ہونے کی تہمت تو اہل سنت پر رکھتے مگر ان کے عمل اور ہمارے تجربے سے ثابت ہے کہ اسلام میں بدعات سیئہ کو یہی اہل دیابنہ رواج دیتے چلے جا رہے ہیں مثلاً لاؤڈ سپیکر[۱] پر نماز کی بدعت خانہ گاؤں میں جمعہ[۲] و عیدین[۳] [۴] غائبانہ نمازِ جنازہ۔ [۵] فوٹوکشی [۶] جوتیوں میں نماز۔ [۷] ننگے سر نماز۔ [۸] مسجد کے اندر نمازِ جنازہ اور میت کا دخول یہاں تک کہ حرمین شریفین کے ادب کا خیال بھی نہ رکھا [۹]۔ کوئی دیوبندی وہابی اٹھتا ہے تو داڑھی چار انگل کی حد شرعی سے کم رواج ڈالنے کی کوشش کرتا ہے مثلاً مولوی مودودی[۱۰] اور کسی دیوبندی کو جوش چڑھتا ہے تو داڑھی کو اتنا بڑھاتا ہے کہ زیرِ ناف تک پہنچا کر خوش ہوتا ہے جیسے مولوی احمد علی لاہوری وغیرہ۔ حالانکہ یہ بھی بدعت سیئہ اور وہ بھی۔ دونوں داڑھیاں خلافِ سنت غرضیکہ ہر طرف ان لوگوں میں بدعت ہی بدعت ہے۔ اور سب سے بڑے بدعتی دیوبندی وہابی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ہمارے بعض جاہل پیروں اور ان کی اتباع میں ان کے مریدوں نے لمبی داڑھی رکھنا شروع کر دی۔ حالانکہ چھوٹی داڑھی ہو یا چار انگل سے لمبی سب ہی گناہ ہے۔ جس طرح داڑھی منڈانے یا کترنے والے امام کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے اسی طرح لمبی داڑھی والے کے پیچھے بھی نماز مکروہ تحریمی ہے۔ بعض لوگ صرف زبانی توبہ کر کے امامت شروع کر دیتے ہیں یہ بھی ناجائز ہے۔ اس توبہ سے گناہ معاف ہو سکتا ہے مگر امامت اس وقت تک جائز نہ ہوگی۔ جب تک چار انگل داڑھی پوری نہ ہوگی۔ داڑھی کے پورے مسائل و دلائل ہمارے فتاویٰ العطایا جلد دوم میں دیکھیے [۱۱] علامہ شامی نے ثابت فرمایا ہے کہ مونچھیں استرے سے منڈانا بدعتِ سیئہ ہے۔ وہابی لوگ یہ بدعت کرتے ہیں [۱۲] مسجد کے داخلی حصے میں اذان دینا۔ حالانکہ یہ سب کام سنتِ نبوی کے خلاف اور سراسر بدعتِ سیئہ ہیں ان وہابیانِ زمانہ کے پاس آج تک اس کا کوئی ثبوت نہیں نکل سکا۔ اسی پر بس نہیں ان لوگوں نے اپنے مصنوعی مذہب کو بچانے اور حق سے دشمنی کرتے ہوئے قرآنِ مجید کے ترجمے بدلنے شروع کر دیے کہ یہاں تک ہی ان کا بس چل سکتا ہے۔ ورنہ ان کا دل تو یہی چاہتا ہے کہ اپنی مطلب برآری کے لیے الفاظِ قرآن بھی بدل دیں۔ میں تو تاریخِ وہابیت دیکھ کر اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی دیوبندی نے اسلام پر ظلم کرنے میں کسر چھوڑی ہے؟ اشرف علی تھانوی اٹھتے ہیں تو دینی دشمنی میں۔ بہت سی آیتوں کا ترجمہ بگاڑتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کا

ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں پر مہربانی کرنے کیلئے (الخ)
عام آدمی بھی جانتا ہے عالمین کا ترجمہ تمام جہان ہیں نہ کہ فقط دنیا جہان اور جہانوں میں فقط لوگ ہی نہیں رہتے۔ بلکہ نباتات
جمادات حیوانات ملائکہ۔ جنات سب ہی جہانوں میں ہیں اور پیارے آقا سب کے لیے رحمت ہیں اور صرف مہربانی نہیں
بلکہ ہر طرح رحمت۔ جیسے اللہ تعالےٰ سب جہانوں کا رب ہے۔ نہ کہ فقط دنیا جہان کا اور فقط لوگوں کا۔ اسی طرح یہاں
ہے۔ یہی اشرف علی تھانوی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں عالمین کا ترجمہ کرتے ہیں اللہ۔ مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔ مگر اس جگہ عالمین کا
ترجمہ یہ حرکیا صرف نعتِ مصطفےٰ کو گھٹانے کے لیے یہ خباثتِ متعصبانہ۔ اسی طرح دوسرا دیوبندی کا ٹھتا ہے عبدالقادر دہلوی کے
روپ میں تو آیتِ کریمہ کے اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ کا ترجمہ کرتا ہے کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے۔ حالانکہ لفظ الٰہ کا ترجمہ کسی لغت میں
حاکم نہیں یہ ترجمہ لغت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کریم کی دیگر آیات کے بھی مگر وہابیوں نے یہ ترجمہ صرف اس لیئے گھڑ لیا
تا کہ کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حاکم نہ مان لے دنیا کے یہود و نصاریٰ اور امریکن کو بلا تکلف حاکم مان لیا جائے کوئی دکھ نہیں
دکھ تو ان کو ذاتِ مصطفےٰ سے ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اتنی بدعتیں کیا کم تھیں۔ جو اب مزید کھڑے ہو کر کھانا بھی شروع
کرایا جا رہا ہے۔ بہر حال کھڑے ہو کر کھانا روٹی سالن یا کوئی دعوت گھر ہو یا ہوٹل یا شادی بیاہ ہر قسم کا کھانا مکروہ تحریمی
ہے۔ اس کے بہت دلائل ہیں۔

دلیل اوّل:۔ اللہ جل شانہٗ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے:۔ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا
یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔ پارہ ۲۶ آیت نمبر ۱۲ سورت محمد
ترجمہ۔ اور وہ لوگ جو کافر ہوئے نفع لے لیتے ہیں اور کھاتے اس طرح ہیں۔ جس طرح جانور کھاتے ہیں اور آگ یعنی جہنم ان کا ٹھکانا
ہے۔ اس آیتِ پاک میں رب تعالےٰ نے کافروں کے کھانے اور دعوتوں کا طریقہ بیان فرمایا۔ کہ کافر لوگ جانوروں کی طرح کھاتے
ہیں۔ یہاں تشبیہ ذہنی بھی ہے اور فعلی بھی۔ ذہنی تشبیہ کا مطلب ہے کہ کافر جانوروں کی طرح ہیں ہو کر بلا سوچے سمجھے صرف
موٹے تازے ہونے کے لیے پیٹ بھرتے چلے جاتے ہیں اور زندگی کا مقصد صرف عیش پرستی کو سمجھتے ہیں۔ اور
تشبیہ فعلی کا مطلب ہے کہ جس طرح جانور کھڑے ہو کر اور بھاگ دوڑ کر۔ چل پھر کر بد تہذیبی بد تمیزی سے کھاتے ہیں۔
کر آدھا کھایا آدھا برباد کیا رزق کی قدر نہ کی۔ بالکل اسی طرح کافر لوگ کھاتے ہیں۔ یہاں اس آیت میں اصل مقصد تشبیہ
فعلی کا ہے اور کافروں کے کھانے اور بد تہذیبیوں کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے۔ اور مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ جانوروں
کی طرح کھڑے ہو کر چل پھر کر کھانا کافروں کا کام ہے اور اس طرح کھڑے کھانے کی سزا کیا ہے کہ اَلنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ
کھڑے ہو کر کھانے والوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اگر اس آیت میں صرف تشبیہ ذہنی مقصود ہوتی تو کھانے کا تذکرہ نہ ہوتا
بلکہ زندگی کا نقشہ کھینچ کر جانوروں کی طرح زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا جاتا۔ اور الفاظ اس طرح ہوتے:۔
وَیَعِیْشُوْنَ كَمَا تَعِیْشُ الْبَهَائِمُ (ترجمہ) اور کافر لوگ زندگی گزارتے ہیں جس طرح جانور زندگی گزارتے ہیں۔

یہ ساری سورت مدنی ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ مدینہ منورہ میں بسے ہوئے کافروں کے کھانے کا طریقہ بتایا جارہا ہے۔ اور یہ بات تاریخ سے ظاہر و ثابت ہے کہ مدینہ پاک میں صرف یہود و نصاریٰ آباد تھے۔ کوئی بت پرست نہ تھا اشارۃً سمجھایا جارہا ہے۔ کہ عیسائی اور یہودی کھڑے ہوکر جانوروں کی طرح کھاتے ہیں اب آج کل اُن کی دیکھا دیکھی بیوقوف نادان کم عقل مسلمان بھی کھڑے ہوکر کھانے لگے ہیں۔ اور چونکہ کھڑے کھانے کی سزا جہنم ہے لہٰذا جو بھی جانوروں کتوں، بلوں گدھوں گھوڑوں بیلوں کی طرح کھڑے ہوکر یا چل پھر کر کھائے گا۔ اُس کو نارِ جہنم کی سزا ہوگی۔ **دلیل دوم**:۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰی لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْھُمْ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَلْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی۔ قَالَ فَمَنْ؟ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ:۔ باب تَغَیُّرِ النَّاسِ فصل اول پہلی حدیث صفحہ نمبر ۴۵۸ مشکوٰۃ شریف:۔ (ترجمہ):۔ روایت ہے حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انھوں نے فرمایا۔ کہ ارشاد پاک فرمایا۔ آقا صلے اللہ علیہ وسلم نے اے مسلمانو تم پچھلے لوگوں کی اِس طرح پوری پوری اتباع کروگے کہ بالشت کے برابر بالشت گز کے برابر گز نقش قدم چلوگے۔ عرض کیا گیا کیا مسلمان یہودیوں اور عیسائیوں کی پیروی کریں گے۔ پیارے آقا صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا۔ پس کون ہے اِن کے سوا۔ یعنی مسلمان ان یہودیوں عیسائیوں کی ہی پیروی کریں گے اور حدیث پاک میں نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے غیبی خبر دیتے ہوئے بتایا کہ آخر زمانے میں مسلمان اسلامی طریقے چھوڑ کر عیسائیوں اور یہودی کافروں کے طریقوں کی پیروی کریں گے۔ قرآن مجید کی مندرجہ آیت سے ثابت ہوچکا کہ یہودی عیسائی ہی جانوروں کی طرح کھڑے ہوکر اور چل پھر کر کھاتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا اس طرح مثل حیوانوں کے کھانا عیسائیوں کی نقل ہے اور بحکم قرآنی انتہائی بد تہذیبی اسی لیے رب تعالیٰ نے اس طرح کھڑے کھانے کو جانوروں سے تشبیہ دی اور رسول کریم نے غیبی خبر دیتے ہوئے اس نقل کی برائی فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شریف اور مہذب آدمی۔ علماء اولیاء اللہ کھڑے ہوکر نہ کھاتے ہیں نہ اس بیہودہ طریقے سے کھانے کو پسند فرماتے ہیں۔ بلکہ دیکھا یہی جارہا ہے کہ دنیا پرست اور آزاد خیال دین سے غافل فیشن زدہ نوجوان طبقے نے ہی کھانے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ یہ طریقہ حیوانات انسانوں کو سخت نقصان اور تکلیف دہ ہے مگر دھڑا دھڑ جوق درجوق فیشنی طبقہ اِس کھڑے کھانے کا طریقہ اپناتے چلے جارہے ہیں اور بہت سرور ہوتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ یہ شیطانی راہ ہے۔ اگر یہ طریقہ اسلامی ہوتا تو اولیاء اللہ علماء دین اور نیک بندوں سے شروع ہوتا اور اوباش لوگ اختیار نہ کرتے۔ عقلاً یہ بات ظاہر ہے اور تجربہ شدہ ہے کہ اللہ رسول کی پسندیدہ باتیں نیک لوگ اختیار کرتے ہیں اور شیطان کی پسندیدہ باتیں فاسق گناہگار دنیادار اور کفار اختیار کرتے ہیں۔ محققین علمائے کرام فرماتے ہیں کہ جس فعل کی اچھائی برائی کا پتہ لگانا ہو تو اُس کے کرنے والے کو دیکھو اگر کرنے والے نیک متقی نمازی عابد زاہد اور تھوڑے سے

ہوں تو سمجھ لو کہ یہ اچھا کام ہے اور اگر کرنے والے اوباش آوارہ۔ فساق و دنیا دار بے نمازی۔ فیشن پرست اور کثرتِ ہجوم ہو تو سمجھ لو کہ اسلامی کام نہیں بُرا کام یا دنیوی کام ہے۔ اب وہابی اور دیوبندی مولوی خود سوچ سمجھ لیں کہ یہ کھڑا کھانا شیطانی کام ہے یا رحمانی اور ایسے بیہودہ طریقے کی تائید میں فتوے دینا ناقص علمی سے احادیث کو دلیل بنانا، وہابیوں کو کس گروہ میں شامل کر رہا ہے۔ **دلیل سوم**:۔ مندرجہ بالا دونوں دلیلوں سے ثابت ہوا کہ کھڑے ہو کر کھانا کفار یہودیوں۔ عیسائیوں اور غیر مہذب بے عقل لوگوں کا کام ہے۔ مہذب لوگ اور اسلام کے غیر بیہودہ طریقوں کو پسند کرنے والے مسلمان ہرگز کھڑے ہو کر نہیں کھاتے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مہذب لوگوں کی دعوتوں اور کھانے پینے کا نقشہ اس طرح ظاہر فرمایا گیا ہے:۔ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً سورۂ یوسف آیت نمبر ۳۱ (ترجمہ) اور حضرتِ زلیخا نے زنانِ مصر کی دعوت کی تو ان کے بیٹھنے کا انتظام کیا۔ ثابت ہوا کہ شرع سے ہی مہذب انسان بیٹھ کر کھانا کھاتے رہے۔ اور جانور کھڑے کھڑے کھاتے ہیں۔ تو اب جو انسان کھڑے ہو کر کھائے گا وہ جانوروں گدھوں گھوڑوں کی نقل کرتا ہے نہ کہ مہذب انسانوں کی۔ بیٹھ کر کھانا شرافت تہذیب اور انسانیت کی نشانی ہے یہی حکم اسلام نے دیا۔ **دلیل چہارم**:۔ اللہ تعالیٰ نے جنتی لوگوں کی جنت میں دعوت اور کھانے پینے کا ذکر اِس طرح فرمایا:۔ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ۔ سورۂ ص آیت نمبر ۵۱ (ترجمہ):۔ جنتی لوگ جنت میں تکیے لگا کر بیٹھا کریں گے اور اِسی طرح بیٹھ کر اپنے غلمانوں اور خدام فرشتوں سے فروٹ اور پانی منگا کر کھایا پیا کریں گے۔ باری تعالیٰ جَلَّ مَجْدُہٗ نے بڑے اہتمام اور پسندیدگی سے جنتی لوگوں کے بیٹھ کر کھانے پینے کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ یہی بیٹھ کر کھانے پینے کا طریقہ شرافت اور وقار کی علامت ہے۔ پیاروں محبوبوں کو بٹھایا جاتا ہے مجرموں کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس حدیث نے ثابت کیا کہ جنتی لوگ جنت میں بیٹھ کر کھانا پینا کریں گے۔ اور یہی رب تعالیٰ کو پسند ہے۔ کیونکہ جنت میں یہ انتظام اور دعوت سب کچھ رب تعالیٰ کا تیار کردہ ہے اور اِسی غفور رحیم کی طرف سے ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ۔ ترجمہ:۔ یہ مہمان خانہ اور دعوت اللہ کی طرف سے ہے۔ پس سمجھ لو کہ جب جنت میں اللہ تعالیٰ کو بیٹھ کر کھانا پینا پسند ہے اور اُس کی تعریف فرمائی جارہی ہے تو دنیا میں بھی رب کریم کو مسلمانوں کا بیٹھ کر ہی کھانا پسند ہے۔ اور پسندیدگی کے خلاف کام ناراضگی کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا اب جو شخص مسلمان ہو کر دعوتوں تقریبوں میں کھڑے ہو کر کھانا کھائے یا کھلائے تو اللہ تعالیٰ اُس سے سخت ناراض ہے۔ اور رب تعالیٰ کی ناراضی عذاب کا باعث ہے:۔

دلیل پنجم:۔ سابقہ دلائل سے اشارۃً و اقتضاءً ثابت ہوا کہ کھڑے ہو کر کھانے کی بدخصلت یہود و نصاریٰ کی طبعی رواجی عادت ہے۔ اور حدیث پاک میں یہودیوں عیسائیوں کی پیروی کاسے بہت سخت منع فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۹۳ پر اور مشکوٰۃ شریف صفحہ ۳۹۹ پر ہے

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّہَ بِغَیْرِنَا لَا تَشَبَّھُوْا بِالْیَھُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارٰی (الخ) :۔ روایت ہے عمرو شعیب سے وہ اپنے والد وہ اپنے دادا سے راوی کہ فرمایا نبی کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ وہ مسلمان ہم میں سے نہیں ہے گا جو ہمارے غیروں کی پیروی کرے یعنی غیر کی مشابہت کرو تم یہودیوں عیسائیوں کی۔ یہ حدیث پاک ترمذی کی سند سے اگرچہ ضعیف ہے مگر دیگر سندوں سے بالکل صحیح ہے۔ مرقات نے بہت وضاحت اور ثبوت سے اس کو درست فرمایا۔ یہ حدیث پاک ظاہراً عیسائیوں اور یہودیوں کے سلام کے لیے ہے مگر اقتضاءً سب کاموں کو شامل ہے کیونکہ اعمال تین قسم کے ہوتے ہیں ۱ اعمال مذہبی ۲ اعمالِ قومی ۳ اعمال رواجی و طبعی۔ قانونِ شریعت کے مطابق۔ کفار کے اعمالِ مذہبی کی نقل کرنا کفر ہے اعمال قومی کی پیروی اور نقل کرنا حرام ہے۔ لیکن اعمال رواجی کی نقل کرنا گناہ کبیرہ و مکروہ تحریمی ہے۔ اس حدیث پاک میں یہودی اور عیسائیوں کے سلام کرنے کے طریقہ و رائجہ کی نقل کرنے سے مسلمانوں کو روکا جا رہا ہے۔ اور یہ طریقہ جو یہودیوں وغیرہ کفار نے سلام کرنے کا نکالا ہے۔ کہ انگلی کے اشارے اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتے ہیں منہ سے سلام نہیں کہتے۔ یہ عمل نہ اُن کا مذہبی شعار ہے نہ قومی بلکہ رواجی اور عادت کا طریقہ ہے اس سے بھی منع کر دیا گیا۔ تو کھڑے ہو کر کھانا بھی اِن کفار کا طبعی اور رواجی طریقہ ہے۔ اس کا حکم بھی وہی ہے لہٰذا اس روایت کی عبارت النص اگرچہ صرف سلام کے لیے ہے مگر اقتضاء النص کھڑے ہو کر کھانے پینے اور یہود و نصاریٰ کے ہر برے کام کی مشابہت سے باز رکھنے کی ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ کھڑے ہو کر کھانا یہودیوں کی مشابہت ہے اور وہ مسلمان نیک مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونے کا حق دار نہیں کیونکہ آقا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَیْسَ مِنَّا۔ وہ ہم میں سے نہیں۔ ابن ماجہ کی ایک روایت کے آخری الفاظ اس طرح ہیں۔ خَالِفُوْھُمْ۔ ترجمہ :۔ اے مسلمانو تم یہودیوں عیسائیوں کی پوری مخالفت کرو یعنی کسی کام میں بھی اُن کے رواج اور عادتوں کی پیروی و نقل نہ کرو **دلیل ششم** :۔ حدیث پاک میں ہے :۔ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ۔ جامع صغیر جلد دوم صفحہ نمبر ۱۶۲ مشکوٰۃ ص ۳۷۵ (ترجمہ) :۔ جو کسی قوم سے عملی مشابہت کرے یعنی ان کے سے کام کرے تو کل قیامت میں وہ مسلمان ان لوگوں کے ساتھ حشر کرے گا۔ اب وہ مسلمان جو انگریزوں عیسائیوں کی نقل کرتے ہوئے کھڑے ہو کر کھائے پیئے وہ اپنا حشر سوچ لے۔ **دلیل ہفتم** :۔ مندرجہ بالا عبارتوں سے یہ واضح ہوا کہ کھڑا کھانا جانوروں اور یہودیوں عیسائیوں کا طریقہ ہے۔ مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہیئے۔ اب دلائل ذیلیہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے۔ کہ مسلمانوں کو ہر کام ہر طریقے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم اور اتباع پر چلنا چاہیئے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ : پارہ ۲۱ سورہ احزاب آیت نمبر ۲۱ (ترجمہ) :۔ البتہ بے شک اے مسلمانو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے

رسولِ معظم میں بہت اچھا نمونہ زندگی ہے لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ کھانے سے متعلق نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا عملی و قولی نمونہ پاک کیا ہے۔ **دلیل ہشتم**:۔ احادیث و تاریخ سے ظاہر ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفاءِ راشدین نے کسی محفل کسی مجلس کسی دعوت میں کھڑے ہو کر نہ کھایا نہ پیا بلکہ اکیلے بھی کھڑے ہو کر نہ کھایا بیٹھ کر ہی تناول فرمایا چنانچہ ابوداؤد جلد اول باب النواقض وضو اور ابن ماجہ اور مشکوٰۃ شریف صفحہ ۴۱ پر ہے:۔ وَعَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتِفًا ثُمَّ مَسَحَ يَدَهٗ بِمِسْحٍ كَانَ تَحْتَهٗ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى۔ (ترجمہ) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے بکری کی دستی کا گوشت کھایا اور اپنے نیچے بچھے ہوئے تولیے سے ہاتھ مبارک پونچھے پھر آپ کھڑے ہوئے تو نماز پڑھی۔ یہ روایت دلالۃً بتا رہی ہے کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر کھاتے تھے اگرچہ اکیلے ہوتے یا مجلس میں۔ لفظِ قَامَ نے صاف طور پر عمل شریف ظاہر کر دیا۔ اسی طرح عمل صحابہ سے بھی بیٹھ کر کھانا ثابت ہے۔ چنانچہ مسند احمد اور مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۳۶۱ پر ہے:۔ وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنْتُ اَنَا وَاُبَيٌّ وَاَبُوْ طَلْحَةَ جُلُوْسًا فَاَكَلْنَا لَحْمًا وَخُبْزًا (الخ) روایت ہے انسؓ بن مالک سے انہوں نے فرمایا کہ میں اور حضرت اُبیؓ اور طلحہ بیٹھے تھے تو ہم نے گوشت روٹی کھائی۔ اس حدیث سے صحابہ کرام کا عمل ثابت ہوا کہ آپ حضرات بیٹھ کر ہی کھانا کھاتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے بیٹھ کر ہی کھانا کھائیں کیونکہ نبی کریم علیہ التحیۃ والثناء نے ارشاد فرمایا۔ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ۔ (ترجمہ):۔ اے مسلمانو تم سب ہر وقت ہر کام میں میرے اور خلفاءِ راشدین کے طریقوں پر عمل کرو۔ **دلیل نہم**:۔ یہ تو کھڑے کھانے کی مخالفت اور بیٹھ کر کھانے کا واجب ہونا نبی کریم اور صحابہ عظام کے عمل شریف سے ثابت ہوا۔ اس طرح بیٹھ کر کھانے کی اور بھی بہت احادیث موجود ہیں۔ مگر کھڑے کھانے کی ایک بھی روایت نہ ملے گی۔ لیکن قولی اور قانونی حکم بھی یہ ہی ہے کہ کھڑے ہو کر کھانا گناہ ہے بیٹھ کر کھانا ہی اسلامی طریقہ اور انسانیت کے لائق ہے اس میں انسانیت کی شرافت اور عزت ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۱۰ پر ہے:۔ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى اَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا فَقِيْلَ الْاَكْلُ قَالَ ذَاكَ اَشَدُّ هٰذَا الْحَدِيْثُ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔ (ترجمہ):۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی اکرم نے کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا۔ عرض کیا گیا کہ کھانے کا کیا حکم ہے۔ فرمایا وہ کھڑے ہو کر کھانا تو اور بھی زیادہ سخت ہے۔ یعنی بدتر گناہ ہے۔ اس حدیث پاک میں کھانے اور پینے دونوں کا ذکر ہے کہ دونوں کام کھڑے ہو کر گناہ ہے مگر چند روایات کی بنا پر فقہاء کرام نے کھڑے ہو کر پینے کو مکروہ تنزیہی فرمایا ہے۔ جب

بقولِ فقہاءِ اسلام کھڑا ہو کر پینا مکروہ تنزیہی ہے تو اس حدیث پاک کی بنا پر کھڑا کھانا مکروہ تحریمی ہونا لازم ہے کیونکہ نبی کریم نے کھڑے ہو کر کھانے کو کھڑے پینے کے مقابل زیادہ سخت گناہ فرمایا۔ پس ثابت ہوا کہ کھڑے ہو کر کھانا مکروہ تحریمی ہے۔ اور کھڑے ہو کر پینا مکروہ تنزیہی ہے۔ **دلیل دہم:۔** عَنِ الْجَارُوْدِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَجَرَ عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا ۔ (ترجمہ) ۔ حضرت جارود سے روایت ہے کہ نبی پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پینے سے سخت جھڑکا۔ اس حدیث پاک کو سات دیگر محدثین نے بھی روایت کیا اسی لیے اہل علم حضرات نے کھڑے ہو کر پینے کو مکروہ فرمایا ہے۔ چنانچہ طحاوی شریف جلد دوم صـــ۳۵۷ پر اسی حدیث شریف کے ماتحت لکھا ہے:۔ قَالَ اَبُوْجَعْفَرٍ فَذَھَبَ قَوْمٌ اِلٰی کَرَاھَۃِ الشُّرْبِ قَائِمًا وَاحْتَجُّوْا فِیْ ذَالِکَ بِھٰذِہِ الْاٰثَارِ ۔ (ترجمہ):۔ امام ابو جعفر نے فرمایا کہ سب مسلمان قوم کا مذہب ہے کہ کھڑے ہو کر پینا مکروہ فرمایا ہے۔ اور ان لوگوں نے اسی مندرجہ بالا طحاوی کی حدیث کو دلیل بنایا ہے۔ فقہاءِ کرام نے کھڑے پینے کے مکروہ تنزیہی ہونے پر اتفاق کر لیا ہے ورنہ اس حدیث پاک میں جھڑک فرمانے سے تو سخت برائی اور گناہ اور شدید کراہت ثابت ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ جھڑک فرمانا معمولی کام کے لیے نہیں ہوتا دیکھو مسلمان کے گھر میں فوٹو تصویر سجانا حرام ہے۔ اور حرمت کی دلیل میں حضرت ابو الزبیر کی حدیث پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ حَدَّثَنَا اَبُو الزُّبَیْرِ قَالَ سَاَلْتُ جَابِرًا عَنِ الصُّوَرِ فِی الْبَیْتِ وَعَنِ الرَّجُلِ یَفْعَلُ ذَالِکَ فَقَالَ زَجَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَالِکَ ۔ (ترجمہ) حضرت ابو زبیر تابعی نے حدیث پاک بیان کی کہ میں نے حضرت جابر سے پوچھا گھر میں تصویریں ٹانگنے کے بارے اور جو شخص یہ کام کرے اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ تو جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کام سے جھڑکا ہے۔ لفظ جھڑک سختی کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جس طرح گھر میں تصویریں سجانا سخت گناہ ہے اسی طرح کھڑے ہو کر پینا بھی سخت گناہ ہے۔ کیونکہ نبی کریم کی جھڑک اس پر بھی ہے اور اس پر بھی ہے:۔

گیارھویں دلیل: مسلم شریف جلد دوم صـــ۱۷۳ پر ہے:۔ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ نَھٰی اَنْ یَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا قَالَ قَتَادَۃُ فَقُلْنَا فَالْاَکْلُ ۔ فَقَالَ ذَالِکَ اَشَرُّ اَوْ اَخْبَثُ :۔ (ترجمہ):۔ حضرت قتادہ "تابعی روایت کرتے ہیں حضرت انس سے کہ بے شک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ کوئی مسلمان مرد کھڑے ہو کر پانی وغیرہ پیئے قتادہ نے فرمایا کہ ہم نے حضرت انس سے عرض کیا کہ کھڑا کھانا کیسا ہے تو حضرت انس نے فرمایا کہ یہ کام تو اور بھی زیادہ شر والا ہے یا فرمایا کہ یہ کام تو اور بھی زیادہ خبیث ہے:۔ طحاوی صـــ۳۴۳ پر اس حدیث کو اس طرح لکھا ہے:۔

فَالْاَکْلُ قَالَ ذَاكَ اَشَرُّ وَاَخْبَثُ۔ یہاں حرف اَوْ نہیں واؤ ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ کھڑے کھانے والا دونوں برائیوں والا ہے شریر بھی خبیث بھی اس روایتِ مطہرہ سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کے نزدیک کھڑے ہو کر کھانا شریر اور خبیث ہے۔ تو اب خود اندازہ لگا لو کہ اس طرح کھانے والا کون ہوگا۔ **بارھویں دلیل:۔** قانونِ شریعت کے مطابق صرف دو پانی کھڑے ہو کر پینے جائز بلکہ بہتر ہیں ۱؎ آب زم زم ۲؎ وضو کا بچا ہوا پانی۔ تمام احادیث میں جہاں کہیں نبی کریم رؤف الرحیم صلے اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابی کے کسی وقت کھڑے پینے کا ذکر ہے تو وہ یہی دو پانی مراد ہیں۔ نہ کہ عام۔ یا کسی تابعی کو غلطی لگی کہ اس نے آب زم زم کے جواز سے کسی اور کو بھی کھڑے ہو کر پینے میں شامل ان لیا۔ شرعاً صرف یہی دو پانی کھڑے ہو کر پیئے جا سکتے ہیں لیکن دورِ صحابہ و تابعین میں بیٹھ کر کھانے پینے کا حکم اتنا مشہور ہو چکا تھا۔ اور کھڑے کھانے پینے کو اتنا برا سمجھا جاتا تھا کہ اگر کوئی صحابی مسئلہ سمجھانے کی نیت سے وضو کا پانی بھی کھڑے ہو کر پیتے یا آب زم زم تو بھی دیگر مسلمان حیرانی اور تعجب سے اس کھڑے پینے سے اظہار کرتے چنانچہ طحاوی شریف جلد دوم صفحہ ۲۷۵ پر ہے:۔ عَنْ اِبْنِ سَبْرَۃَ قَالَ رَاَیْتُ عَلِیًّا شَرِبَ فَضْلَ وَضُوْءِہٖ قَائِمًا ثُمَّ قَالَ اِنَّ نَاسًا یَکْرَھُوْنَ اَنْ یَّشْرَبُوْا قِیَامًا۔ وَقَدْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَعَلَ کَمَا فَعَلْتُ:۔ (ترجمہ) حضرت ابن سبرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا انہوں نے میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پیا۔ پھر فرمایا کہ لوگ بے شک مکروہ سمجھتے ہیں اس بات کو کہ کھڑے ہو کر پئیں حالانکہ میں نے دیکھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ نے ایسا ہی کیا جیسا میں نے کیا۔ (یعنی نبی پاک نے وضو کا بچا پانی کھڑے ہو کر پیا):۔ اس حدیث پاک میں حضرت علی لوگ کس کو فرما رہے ہیں؟ اس وقت کون لوگ مسلمان تھے؟ یہی صحابہ کرام و تابعین حضرات۔ اور یہ سب حضرات کھڑے پینے کو مکروہ جانتے ہیں کس کے فرمان کس کے حکم سے کس کی تعلیم سے۔؟ صاف ظاہر ہے کہ نبی کریم نے ہی ان کو فرمایا تھا کہ خبردار کھڑے ہو کر کھانا پینا شرعاً سخت ناجائز اور حیوانوں کا کام ہے اور مکروہ ہے وضو کا بچا اور آب زم زم خصوصی طور پر صرف ادب و احترام کے لیے کھڑے ہو کر پیا جاتا ہے۔ وہ بھی صرف عبادت سمجھ کر دو چار گھونٹ نہ کہ پیاس بجھانے کی غرض سے اگر کھانا کھاتے وقت پیاس بجھانے کی غرض سے وضو کا بچا پانی پیا یا آب زم زم۔ تو وہ بھی بیٹھ کر ہی پیا جائے گا۔ جیسا کہ اہل عرب علماء کو دیکھا گیا ہے۔ اب تک قرآن پاک اور حدیثِ مطہرات کثیرہ کے دلائل سے ثابت ہو گیا کہ مسلمان کو کھڑے ہو کر کھانا پینا قطعاً ناجائز ہے **تیرھویں دلیل:۔** متعدد احادیث سے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر کھانے پینے سے منع فرمایا جس سے قانونی طور پر کھڑا کھانا پینا ممنوعات اور منہیاتِ شرعیہ میں شامل ہو گیا اور حضرتِ علیؓ کی اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ صحابہ کرام کھڑے پینے کو مکروہ جانتے تھے۔ فقہاء کرام کے نزدیک منہیات چیزیں بھی مکروہ تحریمی ہوتی ہیں اور مطلق مکروہ بھی

مکروہ تحریمی ہوتا ہے۔ چنانچہ فتاوے بحرالرائق جلد اوّل صفحہ نمبر ص۲۹ پر ہے :۔ اِذَا اِطْلَاقُ الْکَرَاھَۃِ مَصْرُوْفٌ اِلَی التَّحْرِیْمِ۔ (ترجمہ) :۔ کیونکہ کراہت کا مطلق ذکر لوٹایا ہوا ہے تحریم کی طرف اور آگے فرماتے ہیں :۔ وَفِی الْمُنْتَقٰی اَنَّہٗ فِی الْمَنْھِیَّاتِ فَتَکُوْنُ تَحْرِیْمِیَّۃً۔ (ترجمہ) :۔ فتاوے منتقی میں ہے کہ جو چیز شریعت کی منہیات میں سے ہو یعنی نبی کریم نے اس سے منع کیا ہو تو وہ چیز مکروہ تحریمی ہو جاتی ہے۔ کھڑے پینے کے متعلق عبارتاً اور کھڑے کھانے کے متعلق اقتضاءً نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ منع فرمایا جیسا کہ سابقہ دلائل میں احادیثِ کثیرہ سے ثابت ہوا کہ کہیں زجر رسول اللہ لکھا ہے اور کہیں نھٰی رسول اللہ۔ بہر حال مسلمانوں کو کھڑے ہو کر کھانا سخت برا ہے :۔

چودھویں دلیل :۔ فتاوٰی مراقی الفلاح شرح نورالایضاح صفحہ نمبر ص۴۳ پر ہے۔ لِاَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَرِبَ قَائِمًا مِنْ وَضُوْءِہٖ وَمَاءِ زَمْزَمَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَشْرَبَنَّ اَحَدُکُمْ قَائِمًا فَمَنْ نَسِیَ فَلْیَسْتَقِیْ وَاَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰی کَرَاھَتِہٖ تَنْزِیْھًا لِاَمْرٍ طِبِّیٍّ لَا دِیْنِیٍّ :۔ (ترجمہ) :۔ نمازی وضو کرکے وضو کا پانی کھڑے ہو کر پیئے۔ اس لیئے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وضو کا بچا پانی اور آب زمزم کھڑے ہو کر پیا۔ اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز نہ پیئے تم میں سے کوئی کھڑے ہو کر پس جو شخص بھول کر پانی کھڑے ہو کر تو اسے چاہیئے کہ فوراً قے کردے۔ اور تمام علما نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا مکروہ تنزیہی ہے۔ کیونکہ کھانا پینا طبعی چیز ہے نہ کہ دینی۔ اس لیئے یہ ممانعت تحریمی نہیں ہو سکتی۔ اس عبارت سے تین باتیں ثابت ہوئیں پہلی یہ کہ صرف دو پانی بطورِ تبرک کھڑے ہو کر پینا جائز ہے۔ اس کے علاوہ نبی کریم سے یا خلفاءِ راشدین سے کوئی چیز کھڑے ہو کر پینا ثابت نہیں۔ جن علما فقہا نے مطلقاً کھڑے پینے کو جائز مانا ہے وہ ان ہی پر قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ قیاس قطعاً غلط ہے۔ ایسی باتیں نا کبھی کی دلیل ہیں کیونکہ خصوصیت پر قیاس کرنا منع ہے۔ دوسری بات یہ کہ لَا یَشْرَبَنَّ نہی تاکیدی ہے جس سے سختی ثابت ہوتی ہے :۔ چنانچہ طحاوی شریف ص۴۳ پر ہے :۔ لَا یَشْرَبَنَّ اَحَدُکُمْ قَائِمًا۔ فَمَحْمُوْلٌ عَلٰی غَیْرِ الْحَالَتَیْنِ السَّابِقَتَیْنِ وَالْمُرَادُ الْمُبَالَغَۃُ فِی النَّھْیِ عَنْ ھٰذَا الْفِعْلِ۔ (ترجمہ) :۔ لَا یَشْرَبَنَّ والی حدیث محمول ہے آب زمزم اور وضو کے بچے پانی پینے کے علاوہ دوسرے پانیوں پر اور یہ تاکیدی نہی اس فعلِ بد سے روکنے کی سختی اور مبالغے کو ظاہر کرتی ہے :۔ یعنی یہ ممانعت معمولی نہیں سخت حکم ہے سختی سے اسی سے روکا جاتا ہے جو سخت برا ہو معلوم ہوا کہ کھڑا پینا سخت برا ہے۔ اور کھڑا کھانا اس سے بھی سخت برا ہے۔ تیسری یہ کہ۔ اس سے زیادہ سختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ پیارے آقا کریم و حکیم و علیم و خبیر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بھول کر کھڑے کھڑے پی لے وہ قے کردے جس سے پتہ لگا کہ یہ پانی اندر جا کر یقیناً فساد اور مصیبت ڈالتا ہے جس سے جسمانی خرابی کے علاوہ روحانی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کھڑے ہو کر کھانا پینا کتنا برا ہے۔ مگر حیرانی اس بات کی ہے کہ بعض علماءِ متقدمین نے اتنی سختی کے باوجود اس طرح پینے کو مکروہ تنزیہی فرمایا۔ اور پھر اس کی وجہ امرِ طبعی قرار دیا اور نبی کریم کے

ایسے سخت اور ضروری حکم کو دینی چیزوں سے خارج کر دیا۔ حالانکہ اہلِ اسلام کے نزدیک نبی کریم کا ہر حکم دینی بھلائیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسی زندگی گزارنے کو ہی اسلامی زندگی کہا جاتا ہے اسلام نے مسلمان کے ہر کام کو دینی بنا دیا۔ یہی مطلب ہے اسلام میں پورے داخل ہونے کا عقل مراقی الفلاح کی اس عبارت اور اجماعِ علما کو تسلیم نہیں کرتی۔ نہ اس کو امرِ طبعی مان کر دینی امور سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ان علما نے یہ نہ سوچا کہ کھڑے ہو کر پینے میں اللہ رسول کی کتنی ناپسندیدگی ہے کہ کہیں جھڑک ہے کہیں ممانعت ہے۔ کہیں لَا یَشْرَبَنَّ کی تاکید ہے۔ کہیں قے کر دینے کا حکم ہے۔ کہیں صحابہ کا مکروہ تحریمی یعنی مطلق مکروہ جانتا ہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے جواز پیدا کرنا یا مکروہ تنزیہی جیسی کمزور کراہت بیان کرنا حیران کن ہے اگر ان علماءِ کرام کا پاس ادب نہ ہوتا تو میں اس کو اشدِ حرام کا فتویٰ لگاتا۔ اور طحاوی نے تو اس اجماع کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کر دیا ہے۔ اگر صرف احادیث کو دیکھا جائے تب تو کھڑا کھانا کھڑا پینا دونوں سخت مکروہ ہیں ورنہ کم از کم بقولِ فقہاء کھڑا پینا مکروہ تنزیہی ضرور ہے اور کھڑا کھانا اس کو تنزیہی کسی نے نہ کہا حدیث پاک سے تحریمی کراہت ثابت کر دی گئی۔ لیکن مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مکروہ تنزیہی بھی گناہ ہے اگرچہ صغیرہ ہے اور گناہ پر بھی قبر و حشر میں عذاب ہوتا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۴۲ پر ہے:۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَیْنِ۔ فَقَالَ اِنَّھُمَا یُعَذَّبَانِ وَمَا یُعَذَّبَانِ فِیْ کَبِیْرٍ (ترجمہ) روایت ہے حضرت ابنِ عباسؓ سے فرمایا کہ ایک مرتبہ گزرے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دو قبروں سے تو آپ نے فرمایا کہ یہ دونوں قبر والے عذاب دیے جا رہے ہیں اور کسی گناہِ کبیرہ میں عذاب نہیں دیے جا رہے۔ اس حدیثِ پاک سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ گناہِ صغیرہ پر بھی عذاب ہوتا ہے۔ لہٰذا کھڑا کھانے والے تو عذاب کے مستحق ہیں ہی جو کھڑے ہو کر پیتے ہیں وہ بھی عذاب پائیں گے۔ **پندرھویں دلیل**:۔ جامع صغیر جلال الدین سیوطی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۹۰ پر ہے:۔ نَھٰی عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا وَالْاَکْلِ قَائِمًا۔ ترجمہ:۔ حضرتِ انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم نے منع فرمایا کھڑے پینے اور کھڑے کھانے سے۔ علامہ طحاوی اور مراقی الفلاح نے جس طرح کھڑے کھانے پینے پر بحث کی ہے اسی طرح فتاوٰی شامی جلد اول ص ۱۲۰ پر مفصل ذکر بیان فرمایا ہے۔ یہ تھیں پندرہ دلیلیں جن سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان کو ہر وقت کھڑے ہو کر کھانا پینا سخت جرم ہے۔ اور عادت بنا لینے پر عذابِ اخروی کا اندیشہ ہے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ نبی کریم اور صحابہ عظام کی پیروی کرتے ہوئے ہمیشہ کھڑے ہو کر کھانے پینے سے بچے اور بیٹھ کر کھانے پینے کی عادت بنائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہی ہدایت عطا فرمائے۔ مخالفین فیشن زدہ لوگ اور ان کو گمراہ کرنے والے وہ دیوبندی جنہوں نے ان کی تائیدیں کر کے غلط راہ پر ڈالا وہ اپنے استدلال میں صرف تین روایتیں پیش کر سکتے ہیں دو روایتیں تو وہی ہیں جو سائل نے سوال میں درج کی ہیں۔ ان کا جواب مندرجہ ذیل سطور میں دیا جائے گا۔ تیسری روایت جو مخالف پیش کر سکتا ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ایک مشکیزے سے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ چنانچہ۔ ترمذی شریف نے ایک روایت کو دو سندوں سے اس طرح رقم کیا:۔

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَنْ عِیْسٰی بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اُنَیْسٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَامَ اِلٰی قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ فَخَنَثَهَا ثُمَّ شَرِبَ مِنْ فِیْهَا۔ ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمر تابعی روایت کرتے ہیں عیسٰی بن عبداللہ بن اُنیس سے وہ اپنے والد صحابی سے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کھڑے ہوئے ایک لٹکے ہوئے مشکیزے کی طرف تو اُس کو اٹھایا اور اُس سے پانی پیا اس روایت کے متعلق خود صاحب ترمذی لکھتے ہیں:۔ هٰذَا حَدِیْثٌ لَیْسَ اِسْنَادُهٗ بِصَحِیْحٍ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ یُضَعَّفُ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهٖ وَلَا اَدْرِیْ سَمِعَ مِنْ عِیْسٰی اَمْ لَا۔ (ترجمہ):۔ یہ حدیث اس کی اسناد صحیح نہیں اور عبداللہ راوی حافظے کے اعتبار سے ضعیف راوی ہیں امام ترمذی فرماتے ہیں میری عقل میں نہیں آتا کہ عبداللہ نے عیسٰی بن عبداللہ سے سنا بھی ہے یا نہیں۔ اس پتہ لگا کہ یہ ضعیف روایت ہے اور ہو سکتا ہے کہ بناوٹی اور موضوع ہو۔ دوسری روایت اس طرح ہے:۔ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِیْ عُمَرَ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ عَنْ یَزِیْدَ بْنِ یَزِیْدَ بْنِ جَابِرٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَبِیْ عَمْرَةَ عَنْ جَدَّتِهٖ كَبْشَةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَشَرِبَ مِنْ قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قَائِمًا فَقُمْتُ اِلٰی فِیْهَا فَقَطَعْتُهٗ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ:۔ ترجمہ:۔ حضرت کبشہؓ نے فرمایا تشریف لائے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ نے لٹکے ہوئے مشکیزے سے کھڑے کھڑے پانی پیا۔ میں نے اُس مشکیزے کا وہ حصہ کاٹ لیا جس پر آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹ مبارک لگے تھے۔ یہ حدیث حسن صحیح اور غریب ہے۔ حدیث کا غریب ہونا حدیث میں ضعف پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ حدیث غریب وہ حدیث ہے۔ جو سنداً صرف ایک راوی سے مروی ہو:۔ (از خطبہ مشکوٰۃ شریف و تدریب الرّاوی صفحہ نمبر ۲۷۵) اسی طرح یہی حدیث طحاوی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۳۵۵ پر تین سندوں سے مروی ہے۔ پہلی سند۔ حَدَّثَنَا ابْنُ مَرْزُوْقٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَاصِمٍ عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَبْدُ الْكَرِیْمِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ اَخْبَرَنِی الْبَرَاءُ بْنُ زَیْدٍ اَنَّ اُمَّ سُلَیْمٍ حَدَّثَتْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ مِنْ قِرْبَةٍ:۔ (ترجمہ:۔ اُمِّ سُلیمؓ نے حدیث بیان کی کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کھڑے کھڑے پانی پیا مشکیزے سے دوسری سند اس طرح ہے حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ غَسَّانٍ قَالَ حَدَّثَنَا زُهَیْرُ بْنُ مُعَاوِیَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْكَرِیْمِ الْجَزَرِیْ قَالَ حَدَّثَنِی الْبَرَاءُ بْنُ بِنْتِ اَنَسٍ وَهُوَ ابْنُ زَیْدٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ حَدَّثَتْنِیْ اُمِّیْ (یعنی اُمّ سُلَیْمٍ) تیسری سند:۔ اس طرح ہے:۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ اُمَیَّةَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ غَسَّانٍ قَالَ حَدَّثَنَا شَرِیْكٌ عَنْ حُمَیْدٍ عَنْ اَنَسٍ۔ محدثین اسلام کے نزدیک یہ تینوں حدیثیں باعتبار ان تینوں سندوں کے ضعیف ہیں:۔ پہلی سند میں ابو عاصم راوی ضعیف ہیں چنانچہ تقریب التہذیب لابن حجر عسقلانی صفحہ نمبر ۲۹۱ پر ہے مُحَمَّدُ بْنُ اَبِیْ اَیُّوْبَ اَبُوْ عَاصِمٍ الثَّقَفِیْ الْكُوْفِیْ كَانَ یَضَعُهُمْ یَقُوْلُ فِیْهِ مُحَمَّدُ بْنُ

اَیُّوْبَ فَیُخْطِئُ وَھُوَ صَدُوْقٌ مِّنَ السَّابِعَۃِ ۔ (ترجمہ) ابو عاصم جن کا نام محمد بن ایوب ثقفی کوفی ہے ان کے بارے میں بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ اور وہ ساتویں درجہ کے صدوق ہیں۔ صدوق سابع کا تعارف اس طرح ہے تقریب التھذیب صفحہ ۱ ۔ اَلسَّابِعَۃُ مَنْ رَوٰی عَنْہُ اَکْثَرُ مِنْ وَاحِدٍ وَلَمْ یُوَثَّقْ وَاِلَیْہِ الْاِشَارَۃُ بِلَفْظِ مَسْتُوْرٍ اَوْ مَجْھُوْلِ الْحَالِ ۔ (ترجمہ) :۔ ساتویں درجے کا صدوق وہ ہے جس سے اکثر لوگ روایت لیتے تو ہوں مگر ان پر بھروسہ نہ کریں۔ اور حالتِ تقویٰ طہارت وغیرہ میں یا خاندانی لحاظ سے پوشیدہ اور مجہول ہو۔ اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ ابو عاصم ضعیف راوی ہیں اور راوی کے ضعف سے سب روایت ضعیف ہو گئی۔ ضعیف روایت بقولِ فقہاءِ کرام فضائل میں تو معتبر مان لی جاتی ہے مگر مسائل میں معتبر نہیں مانی جاتی۔ دوسری اور تیسری سندیں اس لیئے ضعیف ہیں کہ ایک راوی ان میں ابو غسان ہے تمام محدثین کے نزدیک یہ ضعیف ہے چنانچہ تقریب ابن حجر صفحہ ۲۷۶ پر ہے :۔ یَحْیٰی بْنُ کَثِیْرٍ اَبُو النَّضْرِ صَاحِبُ الْبَصْرِیِّ ضَعِیْفٌ مِّنْ کِبَارِ التَّاسِعَۃِ ۔ ابو غسان کا نام یحییٰ بن کثیر ہے اس کو عنبری بھی لقب دیتے ہیں۔ جیسا کہ صفحہ ۴۲۱ پر ہے :۔ ابو النضر صاحب البصری یہ بھی ان کے لقب ہیں یہ راوی ضعیف ہے۔ نویں درجہ کے کبار سے ہے۔ ایسے راوی پر محدثین کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی راوی کو مجہول کہا جاتا ہے (از صفحہ تقریب) اس جرح و تحقیق تفتیش سے طحاوی کی یہ تینوں سندیں اور روائتیں ضعیف ہو گئیں۔ اور ضعیف روایت سے کوئی مسئلہ اور قانون ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ تو محدثانہ جرح تھی جس سے مخالف کا استدلال کمزور ہو گیا۔ اس مشکیزے والی روایت کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ اس مشکیزے میں آبِ زمزم تھا۔ اس لیئے کھڑے ہو کر پیا۔ بعض لوگوں نے جواب یہ دیا کہ جب قول و فعل میں تعارض ہو جائے تو قول کو ترجیح ہوتی ہے۔ کھانے پینے میں قول اور فرمانِ رسولِ کریم تو بہت جگہ بیٹھنے میں ہے یہاں تک کہ کھڑے پینے کھانے میں جھڑک اور ممانعت اور قے کرنے کا حکم اور خبیث و شر کا لقب ہے جیسا کہ کثیر احادیث سے پہلے ثابت کیا گیا۔ صرف ان روایاتِ ضعیف میں فقط کھڑے پینے کا عملی ذکر ہے ہو سکتا ہے۔ یہ نبی کریم کی خصوصیت ہو۔ کھڑے کھانے کا عمل اور فعلِ رسول کہیں بھی مذکور نہیں۔ ان تمام کمزوریوں کی وجہ سے مخالف کو لائق نہیں کہ ایسی روایات سے کھڑے کھانے پینے پر دلیل پکڑے۔ اور خود گمراہ ہو کر لوگوں کو بھی گمراہ کرے۔ پھر یہاں تو مشکیزے سے کھڑے پینے کا عملی ثبوت ہے جن پر ضعیف ہونے کا بھی گمان غالب ہے لیکن مشکیزے سے کھڑے پینے کی ممانعتِ قولی صحیح روایت سے ثابت ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ صفحہ ۲۴۳ و جامع صغیر جلد دوم صفحہ ۱۹۰ پر ہے :۔ نَھٰی عَنِ الشُّرْبِ مِنْ فِیِّ السِّقَاءِ (الخ) (حم ہک عَنْہُ (صح) ۔ ترجمہ :۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم نے مشکیزے کے منہ سے پینے سے منع فرمایا۔ یہ حدیث صحیح ہے اس کو مسند احمد اور مستدرک حاکم اور ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی نے روایت کیا۔ انتی

معتبر حدیث جس کو سب محدثین صحیح فرمائیں اور پانچ کتابیں روایت کریں۔ وہ حدیث مشکیزے سے پینے کو منع کرے اور ایک ضعیف روایت مشکیزے سے پینے کو ثابت کرے تو ترجیح ممانعت کی حدیث کو ہوگی۔ دو وجہ سے نمبر ۱ صحت و ضعف کے تقابل میں صحیح کو مانا جائے گا نہ کہ ضعیف کو۔ ۲ قول و عمل کے تعارض میں قول کو قبول کیا جائے گا نہ کہ عمل شریف کو۔ جیسا کہ اوپر ثابت ہوا۔ سائل نے سوال میں مخالف کی دو روایتوں کا ذکر کیا ان کے جواب ملاحظہ ہوں۔ مخالف کہتا ہے کہ عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نَاكُلُ۔ الخ۔ یعنی صحابہ چلتے پھرتے کھاتے تھے ترمذی شریف جلد دوم ص۱۰ پر یہ روایت اس طرح درج ہے:۔ حَدَّثَنَا اَبُو السَّائِبِ سَلْمُ بْنُ جُنَادَةَ بْنِ سَلْمٍ الْكُوفِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نَاكُلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَمْشِيْ وَنَشْرَبُ وَنَحْنُ قِيَامٌ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔ اور ابن ماجہ شریف ص۲۴۲ پر یہی روایت سنداً اس طرح ہے:۔ حَدَّثَنَا اَبُو السَّائِبِ سَلْمُ بْنُ جُنَادَةَ قَالَ حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاكُلُ وَنَحْنُ وَنَشْرَبُ وَنَحْنُ قِيَامٌ۔ ترجمہ:۔ اوپر گزرا دونوں روایتوں کی سند میں حفص بن غیاث راوی ہیں جن کو محدثین مجہول کہتے ہیں اور مجہول راوی کی سند معتبر نہیں ہوتی کتاب اسماء الرجال تقریب التہذیب ص۹۰ پر بھی اس کو مجہول کہا گیا ہے۔ ابن ماجہ نے اس روایت کو حسن صحیح نہیں کہا۔ البتہ ترمذی نے حسن صحیح کہا مگر ساتھ ہی غریب بھی کہا۔ مقام غور ہے کہ جو روایت غریب بھی ہو اور اس کے راوی مجہول بھی ہوں تو اس روایت سے دلیل پکڑنا کب جائز ہوگا جب کہ اس کے مقابل کثیر روایاتِ صحیحہ وارد ہوں یہ تو محدثانہ جرح ہے اس کی حالت ثابت ہوئی اس سے قطع نظر اگر صحیح مطلق بھی مان لیا جائے تو بھی اس کو موجودہ کھڑے کھانے پینے پر دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ دو وجہ سے۔ پہلی وجہ یہ کہ ممانعت کی احادیث ہوتے ہوئے پھر کسی صحابی کا اس کے خلاف ممکن نہیں۔ غالباً یہ طریقہ پہلے کا ہے اسی کو دیکھ کر نبی کریم نے منع فرمایا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہو کہ یہ کام بحالتِ سفر نہایت مجبوری یا بحالتِ جنگ ایسا ہوتا ہو۔ دوسری وجہ یہ کہ طرزِ کلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کھانا بحالتِ دعوت نہ تھا۔ بلکہ منفرد طور پر مختصر کھانا تھا جیسے کوئی مزدور یا مسافر کھجور یا ایک گاجر یا مولی خریداری کی نیت سے چکھتا ہے۔ لہٰذا ان روایتوں کو عام دعوتوں پر دلیل نہیں بنایا جاسکتا یہ وہ جواب تھے جو پہلے علماء نے دیئے مگر میں صحابہ کرام کو اس طرح کھانے میں بھی نبی کریم کے ممنوع طریقے کو اپنانے کو تسلیم نہیں کرتا بھلا کیسے ہوسکتا ہے آقا منع فرمائیں اور کھڑے کھانے کو خبیث فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اس طرح کھڑے کھانے کو جانوروں حیوانوں کافروں کا طریقہ فرمائے اور سب سے زیادہ متبع سنت صحابہ کرام اس کی مخالفت کرتے ہوئے صرف کھڑے ہی نہیں بلکہ چل پھر کر کھائیں ماننا پڑے گا یہ روایتیں ضعیف ہیں یا نو مسلم لوگ یا نبی کریم کی غیر

موجودگی میں ایسا کرتے ہوں گے۔ اور یا ابتدائی زمانے کی بات ہو بعد میں نبی کریم کے منع فرمانے کے بعد پھر کسی ہمت تھی کہ کھڑے ہو کر یا چل کر کھاتے۔ تیسری حدیث جو مخالف کی طرف سے پیش کی گئی کہ عمرو بن شعیب اپنے دادا سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا رسول کریم کو کھڑے اور بیٹھے پیتے ہوئے۔ تو اس کا مطلب بالکل صاف ہے کہ کھڑے ہو کر پیتے تھے پانچ وقت وضو کا بچا ہوا اور کبھی کبھی آب زم زم۔ اور بیٹھ کر پیتے تھے عام پانی ہمیشہ لہٰذا صحابی کا یہ فرمان منقسم ہے پانیوں کی تقسیم سے۔ اور ہم بھی مانتے ہیں کہ تبرکاً کھڑے ہو کر یہ دو پانی پینے جائز بلکہ مستحب ہیں۔ اور پیاس بجھانے کے لیئے پانی بیٹھ کر ہی پینا لازم ہے۔ یہ تھے ہمارے دلائل اور مخالف کی تین دلیلوں کا جواب۔ اب یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ پیارے آقا صلے اللہ علیہ وسلم نے کھڑے کھانے پینے سے اتنی شدت سے منع کیوں فرمایا تو خیال رہے کہ کھڑے کھانے پینے میں جسمانی روحانی بیماری ہے۔ چنانچہ طحاوی جلد دوم صفحہ ۲۵۸ پر ہے

عَنِ الشَّعْبِیِّ قَالَ اِنَّمَا اُکْرِہَ الشُّرْبُ قَائِمًا لِاَنَّہٗ دَآءٌ (الخ)۔ (ترجمہ) امام شعبی سے روایت ہے کہ کھڑے کھانے سے اس لیئے کراہت اور ممانعت ہے۔ کہ یہ بیماری پیدا کرتا ہے۔ مقام حیرانی ہے ہر کھڑا پانی جسم میں بیماری پیدا کرے مگر وضو کا بچا پانی کھڑے پینے سے شفا پیدا کرے۔ ماننا پڑے گا۔ کہ شفا اور بیماری کا فی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرمان سے ہے۔ اتباع کرو گے تو شفا ہو گی مخالفت کرو گے۔ تو بیماری ہی بیماری ہے۔ اس تمام گفتگو سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان کو کھڑا کھانا پینا جائز نہیں۔ یہاں تک کہ نابالغ اور شیر خوار بچوں کو دودھ اور غذا بھی بٹھا کر کھلائی جائے شیر خوار بچے کی والدہ اپنے بچے کو کھڑا کر کے دودھ نہ پلائے کہ اس میں بھی بیماری کا خطرہ ہے۔ تعجب ہے کہ ایسی بدعت سیئہ کو وہابیوں نے رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنی نادانی سے احادیث کو نہ سمجھا نہ تحقیق و تفتیش کی۔ کیا یہ لوگ اسی لیئے علم پڑھتے ہیں کہ گمراہی کے لیئے راہ ہموار کرتے پھریں۔ ان ہی غلط فتووں کی بنا پر جس طرح موجودہ نسل کے لوگ اسلام کے تمام روشن اصول و ضوابط بھولتے اور چھوڑتے چلے جا رہے ہیں اسی طرح نئی نسل والے کھانے پینے کے اسلامی طریقے چھوڑ رہے ہیں اور ناسمجھ مفتی اپنے غلط فتووں سے اُن کی ڈھارس بندھا رہے ہیں۔ اسی لیئے میں نے ضروری جانا کہ آقائے کائنات مدنی تاجدار معلمِ اخلاقِ حمیدہ شرفِ انسانیت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرمودات کی روشنی میں مختصر الفاظ میں کھانے پینے کے وہ آداب سکھاتے ہوئے مسلمانوں کو بتاؤں کہ دعوتوں محفلوں تقریبوں میں مسلمان کس طرح مہذبانہ طریقے سے کھائیں پئیں تاکہ جانوروں حیوانوں اور کافروں سے جداگانہ حیثیت ظاہر کر سکیں:۔

٭ ٭ ٭

مسلمانوں کیلئے کھانے پینے کے اسلامی آداب کا بیان

مندرجہ ذیل سطور میں جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ اور اُس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام و اولیاء اللہ فقہاء اسلام کے عملی و قولی آداب طعام سے اخذ و حاصل شدہ ہے کیونکہ یہی مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ نمبر ۱ سب سے مقدم یہ ہے کہ مسلمان مرد و عورت اپنے اور اپنے بچوں کے پیٹ کو حرام غذاؤں سے بچائے کیونکہ حرام غذا ہی وہ زہر ہلاہل ہے جس سے معاشرے اور جسمانی اور روحانی ہزارہا بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جب حرام غذا کھا کر پلا ہوا بیٹا جوان ہوتا ہے تو ماں کو نوکرانی اور باپ کو گھٹیا ذلیل نوکر سمجھتا ہے۔ مذہب کا دشمن شیطانوں کا دوست ہوتا ہے، قلب کا بزدل اور دماغ کا مغرور ہوتا ہے۔ والدہ کو چاہیئے کہ حرام غذا سے بچے کیونکہ حرام غذا سے حرام دودھ حرام خون پیدا ہوگا۔ جو اُس کا شیرخوار بچہ پئے گا اور سرکش فسادی بنے گا۔ حرام غذا بہت قسم کی ہے ۱ سود لینا۔ نمبر ۲ سود دینا جس قرضے پر سود دی ہوگی وہ قرضہ سب حرام غذا ہے اُس سے کاروبار نفع وغیرہ سب حرام غذا ہے۔ ۳ رشوت لینا نمبر ۴ ظلماً رشوت دینا کہ اس ظلم سے جو بھی کمائے گا وہ حرام غذا ہی ہوگی۔ نمبر ۵ کم تول گھٹیا مال۔ نمبر ۶ بلیک کرکے ضروریاتِ زندگی کی چیزیں بیچنا۔ اذان و نماز کے وقت خرید و فروخت سے کمائی دولت حرام ہے۔ نمبر ۷ لاوارث شدہ اشیا بیچنا۔ جو لاوارث کرے اُس کے لیے حرام غذا ہے۔ نمبر ۸ راہ چلتے کسی دوست کی دکان سے بلا اُس کی اجازت۔ گاجر مولی یا مونگ پھلی چنے وغیرہ کھانے یہ حرام غذا ہے اِس بُرے کام سے مسلمان دنیا و آخرت میں ذلیل ہوگا۔ نمبر ۹ عیب دار چیز بغیر عیب دکھائے بتائے بیچنا۔ نمبر ۱۰ چوری ڈکیتی راہ پڑی کی چیز اُٹھانا غصب و چھینا جھپٹی اور اِس کو اپنے استعمال میں لانا حرام ہے۔ نمبر ۱۱ دھوکہ دہی سے اور سیاستِ دنیوی سے کسی کا مال مارنا۔ نمبر ۱۲ بغیر اجازت یا بغیر رضامندی کسی کے مکان یا دکان پر قبضہ کرنا۔ جیسا کہ ضرورت مند مالک کے ساتھ کرائے دار کرتے ہیں۔ اسی طرح کی سب کمائیاں حرام غذا ہیں۔ نمبر ۱۳ غلط فیصلے یا جھوٹے فتوے لکھ کر تنخواہ یا فیس اُجرت لینی حرام غذا ہے۔ ۱۴ پیری مریدی دنیا کمانے نذرانے لینے کے لیے کرنی۔ اور مریدوں کو گناہوں سے نہ بچانا۔ ایسے نذرانے سب حرام غذا ہے۔ اگر حرام غذا کھاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی حلال چیزوں اور غذاؤں سے محروم ہوتے چلے جاؤ گے۔ ایسی بیماریاں لگ جائیں گی کہ ڈاکٹر طبیب ہر چیز سے پرہیز کراتے چلے جائیں گے۔ بظاہر ڈاکٹر کا پرہیز ہوگا مگر حقیقت میں رب کا غضب حلال غذا کمانے کھانے والے کو نہ خطرناک بیماری لگتی ہے۔ نہ پرہیز کرایا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک حرام سے پرہیز کرلو ہزاروں پرہیزوں سے بچ جاؤ۔ جس مال کی زکوٰۃ نہ نکالی جائے وہ بھی حرام ہے۔ خیانت کا مال بھی حرام ہے۔ کفار کے مذہبی تہوار کا کھانا حرام ہے۔ مسلمان اُن کے تحفے نہ کھائیں۔ وغیرہ وغیرہ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ ہر دن

ہر وقت کوشش اور خیال سے ان حرام غذاؤں لباسوں اور کمائیوں سے بچے۔ اس گناہ کو معمولی نہ سمجھو یہ ہی چنگاری اور شعلہ ہے۔ حلال غذا کھاؤ اور کھلاؤ اور کماؤ۔ باپ حلال غذا کمائے۔ ماں حلال غذا کھائے اس سے حلال دودھ پیدا ہو تو بیٹا بیٹی اس کو پی کر باادب باحیا۔ دلیر اور باعصمت باغیرت جوانی گزاریں گے۔ نمبر ۲۔ جب اپنی یا اپنے والد سرپرست مربی کی خون پسینے سے کمائی ہوئی غذا کھانے لگو تو دل میں خیال باندھو کر ہم اپنے پروردگارِ عالم کی عطا کردہ روزی کھانے لگے ہیں۔ نمبر ۳ شکرِ الٰہی کے تصور سے سب سے پہلے ہاتھ دھو لو کلی کرو۔ خود بھی ایسا کرو اور اپنے سب چھوٹے بڑے بچوں اہلِ خانہ کو اس کی عادت ڈالو۔ ہر کھانے کے لیے ہاتھ دھونا واجب ہیں اگرچہ نہا کر آئے ہو۔ ۴ پھر کرسی میز لگا کر یا فرشی دسترخوان پر بیٹھو۔ بیٹھنا تین طرح جائز ہے۔ ۱ اُکڑوں ۲ دوزانو بشکل تشہد ۳ چہار زانو۔ کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی سنت سے ثابت ہے۔ ۵ کھاتے وقت نہ لیٹو نہ ٹیک لگاؤ کہ یہ نقصان دِہ اور متکبرین کی علامت ہے۔ ۶ جب بیٹھ جاؤ تو پھر کھانا لایا جائے ہاں البتہ ڈھکا کھانا بیٹھنے سے پہلے بھی لگایا جا سکتا ہے ۷ شروع کرنے لگو تو باآوازِ بلند پوری بسم اللہ شریف پڑھو۔ تاکہ بھولوں کو یاد آجائے۔ جس کو جس وقت یاد آئے اسی وقت بسم اللہ پڑھ لے شرم نہ کرے۔ حدیث پاک میں ہے کہ کھانے والا جب پہلے لقمے پر بسم اللہ بھول گیا تو جب یاد آئے۔ اس طرح پڑھے بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۸ جو لوگ متقی پرہیزگار پانچ وقت مسواک سے اپنا منہ صاف رکھنے والے ہیں اُن کے ساتھ ایک برتن میں کھانا بہتر بلکہ فائدہ مند اور باعثِ ثواب ہے۔ اور اُسْوۂ حسنہ سے بے خبر فاسق فاجر گندہ بے نمازی ایسے انسان کی پلیٹ میں ساتھ کھانا بُرا اور نقصان دِہ دنیاداروں کی محافل میں علیحدہ پلیٹ میں کھانا ہی بہتر ہے زاہدین عابدین کی محفل میں ایک پلیٹ میں ایک ساتھ کھانا بہتر۔ ۹ علیحدہ ہو یا سب کے ساتھ اپنی طرف سے نوالہ اٹھائے۔ ۱۰ سالن اتنا ڈالا جائے جتنا کھا لیا جائے۔ پلیٹ یا پیالے کو اچھی طرح پونچھ کر صاف کرے۔ جھوٹا سالن نہ چھوڑا جائے تاکہ وہ بچا ہوا رزق گندی جگہ پھینکنا نہ پڑے۔ جس گھر یا ہوٹل میں روٹی کے ٹکڑے اور سالن نالیوں میں پھینکا جاتا ہے وہاں بے برکتی تنگی غریبی آجاتی ہے۔ بلکہ قہرِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی) مہنگائی اور قحط بھی رزق کی بے ادبیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ نمبر ۱۱ روٹی سے ہاتھ یا انگلیاں پونچھنا حرام ہے ہاں البتہ انگلی پر لگا ہوا سالن لقمہ کو لگانا اور خود ہی کھا لینا جائز ہے۔ ۱۲ روٹی کو چھری سے کاٹنا منع ہے تنگیٔ رزق لاتی ہے۔ ۱۳ بیچ کی روٹی کھا لینا اور کنارے کی چھوڑ دینا گناہ ہے اگر کچی ہو تو درست کرا لے یا اس کو چھوڑ کر دوسری لے لے۔ ۱۴ بلاوجہ روٹی کے ٹکڑے نہ کرے۔ اگر صاف ٹکڑے ڈلیہ میں موجود ہوں تو پہلے اُن کو کھائے۔ ۱۵ کھاتے وقت اگر کوئی لقمہ یا کھانے کی کوئی چیز زمین پر

گرجائے اور صاف کر لینا ممکن ہو تو اٹھا کر صاف کر کے کھالے ورنہ اٹھا کر کسی جانور کو ڈال دے۔ اسی طرح چاول گرے دسترخوان یا زمین سے اٹھا کر جانوروں کو کھلا دے پڑے نہ رہنے دے تاکہ رب تعالیٰ کا رزق پیروں میں نہ آئے۔ ع۱۶ کھاتے وقت خوش طبعی جائز ہے۔ مگر جاہلانہ مذاق دِلآزاری کی گفتگو غیبت چغلی شکایت۔ جس سے ساتھیوں کو تنگی ناراضگی ہو نا جائز ہے۔ بہتر ہے کہ کھاتے وقت اللہ رسول کا تصور کرے اور خیال کرے کہ نعمت رب کی صدقہ آں کا دیتا وہ ہے دلاتے یہ ہیں ۔ اور سمجھے کہ یہ رزق ہم کو اس لیئے کھلایا جا رہا ہے کہ ہم یہ کھا کر دین دنیا میں اس کی عبادت کریں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کی غلامی میں آئیں۔ نمبر ع۱۷ مرتد فرقوں اور کفار کے ہاتھوں سے ذبح شدہ گوشت کھانا منع ہے۔ نمبر ع۱۸ کفار کے ساتھ بیٹھ کر ایک پلیٹ میں سالن کھانا ناجائز ہے۔ ع۱۹ پھلوں میں اپنی طرف سے اٹھانے کی شرط نہیں اسی طرح ملی جلی مٹھائی بھی ہر طرف سے اٹھا کر کھا سکتا ہے۔ نمبر ع۲۰ سالن روٹی دودھ چائے بہت زیادہ گرم نہ پیو۔ نمبر ع۲۱ کھانے میں پھونک مارنی منع ہے۔ نمبر ع۲۲ کفار کا جھوٹا کھانا منع ہے۔ نمبر ع۲۳ بُھسا ہوا بدبودار کھانا گناہ ہے۔ ع۲۴ مٹی والی گرد آلود چیز کھانی گناہ ہے۔ نمبر ع۲۵ بہت زیادہ کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ ابھی کچھ بھوک رہ جائے تو چھوڑ دو۔ نمبر ع۲۶ جب کھانا کھا چکو تو پہلے کھانا اٹھایا جائے پھر کھانے والے اٹھیں مگر یہ اُس صورت میں ہے جب کھانے والے گھر کے افراد ہوں یا تھوڑے چند مہمان۔ لیکن بڑی دعوتوں میں پہلے مہمانوں کا اٹھ جانا جائز ہے تاکہ برتن اٹھانے والوں کو آسانی رہے۔ نمبر ع۲۷ جب کھا چکو تو یہ دعا پڑھو۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاُمَّتِ نَبِیِّ الْکَرِیْمِ۔ وَنَبِیِّ الرَّحِیْمِ ۔

پھر اُٹھ کر اچھی طرح پانی صابن وغیرہ سے ہاتھ دھوئے کلی کرے اور تولیئے رومال سے پونچھے۔ اگر صرف کلی کرے پانی سے اور ہاتھ رومال یا تولیئے وغیرہ سے پونچھے تب بھی جائز ہے۔ لیکن کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا واجب ہے اور پہلے دھونے کے بعد پھر تولیئے وغیرہ سے نہ پونچھے بلکہ اسی طرح خشک ہونے دے۔ یہ تھے وہ آداب جو ہر مسلمان عورت و مرد چھوٹے بڑے امیر غریب بیمار تندرست کو یاد رکھنے لازم ہیں۔ یہاں تک کہ والدہ شیر خوار بچے کو بیٹھ کر دودھ پلائے نہ خود کھڑے کھڑے یا چلتے پھرتے پلائے نہ بچے کو کھڑا کرے کہ اس میں زچہ بچہ کے بیمار ہونے کا خطرہ ہے۔ اور بچے کا بھی ہاتھ منہ دھلا کر دودھ پلائے۔ بغیر ہاتھ منہ دھلے کھانا۔ اور کھلانا مکروہ ہے۔ کھانا پینا شروع کرتے وقت بڑا اور سمجھدار آدمی خود بسم اللہ شریف پڑھے۔ بچے اور ناسمجھ کی طرف سے اس کو کھلانے پلانے والا بسم اللہ پڑھے۔ نمبر ع۲۸ پانی پیو تو تین سانس میں خواہ

تھوڑا پانی پیو یا زیادہ ع ۲۹ کھانا پینا داہنے یعنی سیدھے ہاتھ سے کرے۔ بائیں یا الٹے ہاتھ سے روٹی سالن پکڑنے کا کام لے سکتا ہے۔ الٹے ہاتھ سے کھانا حرام ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتاب البیوع

اسلام میں خرید و فروخت کی قسمیں کہ کونسی تجارت جائز اور کونسی حرام ہے

سوال نمبر ۶۸ :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ۔ ہمارے علاقہ بنارس میں بہت سے تاجر لوگ ہیں ان کی تجارتیں کلکتے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ تاجر لوگ بعض دفعہ تجارت کا نام لے کر دھوکہ فریب اور ظلم کی خرید و فروخت بھی کر لیتے ہیں۔ اور اس کو کامیاب کاروبار سمجھتے ہیں۔ ہم لوگ بھی تاجر ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ صحیح اور سچی تجارت کریں۔ لہٰذا ہمیں ایک بہت بڑے پیر صاحب نے مشورہ دیا کہ تم لوگ گجرات پنجاب پاکستان سے تفصیلی فتوے منگاؤ۔ اس لیے عرض ہے کہ ہم کو بتایا جائے کہ اسلامی شریعت میں خرید و فروخت کی کل کتنی قسمیں ہیں اور اُن کا حکم کیا ہے۔ کتنی جائز و حلال ہیں۔ اور کتنی ناجائز و حرام ہیں۔ تاکہ ہم۔ جائز طریقے اختیار کریں اور ناجائز سے بچیں :۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا :۔

سائل :۔ محمد انور علی :۔ بنارس بھارت ہندوستان ۔ ۸۰ ۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

اَلْجَوَابْ

قانون شریعت کے مطابق قرآن کریم اور احادیث مطہرات و فقہ ائمہ اربعہ کی روشنی میں اسلام جیسے بہترین جہاں دیں میں خرید و فروخت جس کو عربی میں بیع شرعی کہا جاتا ہے۔ اس کی کل اکیاون ۵۱ قسمیں ہیں جن میں اصولی اقسام تین ہیں :۔ نمبر ۱ :۔ بیع صحیح۔ نمبر ۲ :۔ بیع باطل۔ نمبر ۳ :۔ بیع فاسد۔ باقی اڑتالیس قسمیں ان کی شاخیں ہیں :۔ ان اڑتالیس قسموں میں جتنی قسمیں جائز ہیں وہ۔ بیع صحیح کی فرع ہیں۔ اور جو ناجائز ہیں وہ علی الترتیب باطل اور فاسد کی شقیں ہیں۔ میں نہایت آسانی کے لیے مندرجہ نقشے میں تمام اقسام اور ان کی مختصر تعریف اور ان کا حکم کہ کون جائز کون حرام اور ناجائز ہیں لکھ رہا ہوں۔ ان ناجائز میں بعض حرام بعض مکروہ تحریمی اور بعض مکروہ تنزیہی ہیں مگر چونکہ خرید و فروخت کا تعلق حقوق العباد سے انتہائی شدت سے ہے۔ اور ذرا سی غفلت سے خریدار یا بیچ

کی طرف سے ایک دوسرے پر ظلم کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ خرید و فروخت میں ناجائز تجارت کسی قسم کی بھی نہ کرے۔ نہ خرید میں ظلم ہو نہ فروخت میں۔ یہ دنیا امتحان گاہِ مومن ہے۔ رزق بے ایمانی دھوکہ بازی یا ظلم سے نہیں ملتا۔ حلال و طیب رزق ایمان داری سے وسیع ہوتا ہے۔ نبی کریم نے فرمایا:۔ عَنْ وَاثِلَۃَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ بَاعَ عَیْبًا لَمْ یُنَبِّہْ. لَمْ یَزَلْ فِیْ مَقْتِ اللّٰہِ اَوْ لَمْ تَزَلِ الْمَلٰٓئِکَۃُ تَلْعَنُہٗ رَوَاہُ ابن ماجہ:۔ (ترجمہ):۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عیب دار چیز بغیر عیب بتائے بیچ دے۔ وہ اللہ کے غضب اور فرشتوں کی لعنت میں رہے گا۔

بیع کی قسمیں

نمبر شمار	نام	تعریف	حکم
۱	بیع صحیح	جس میں شریعت کی کوئی ممنوعہ چیز نہ ہو اور بیع کی تمام شرائط موجود ہوں	جائز
۲	بیع باطل	جس میں خریدار کبھی مالک نہ بن سکے نہ قبلِ قبضہ نہ بعدِ قبضہ	ناجائز
۳	بیع فاسد	جس میں شریعت کی ممنوعہ چیزوں میں سے کوئی چیز ہو اور قبضے سے خریدار مالک بن جائے مگر فسخ لازم ہو	ناجائز
۴	بیع موقوف	جو بغیر اجازت مالک یا والی کی جائے پھر مالک یا والی وارث اجازت دیدے	جائز
۵	بیع فضولی	خریدار اپنی مرضی سے کسی کے لیے خریدے اور اپنی مرضی سے کچھ اور کاروبار کرے جس میں سب کا فائدہ ہو	جائز
۶	بیع اقالہ	بیع ہو جانے کے بعد پھر کسی کا واپسی کا ارادہ ہو بغیر عیب کے اور دوسرا راضی ہو جائے	جائز
۷	بیع مرابحہ	بازاری قیمت سے کچھ نفع پر بیچنا۔ مثلاً بازاری قیمت ہے دس روپے کی خرید لی اور گیارہ کو بیچ دی	جائز
۸	بیع تولیہ	جتنے کی صحیح قیمت پر خرید لی اتنے کی ہی بیچ دی	جائز
۹	بیع سلم	خریدنے والے پیشگی قیمت دیدے گا اور کچھ مدت بعد چیز لینے کا معاہدہ ہو۔ جنس حالت بھاؤ اور مقام ادا معین ہو گیا	جائز
۱۰	بیع تلجئہ	کسی ظالم کے ڈر سے ظاہراً بیچ دے حقیقتاً نہ بیچے۔ اور تاجر و خریدار کا خفیہ معاملہ ہو گیا ہو	جائز
۱۱	بیع وفا	رہن کی طرح امانت رکھا مگر خرید و فروخت کا نام لیا اور وعدہ واپسی کیا نفع جائز پابندی ضروری نہیں	جائز
۱۲	بیع وکالہ	کسی کو کوئی چیز اپنے لیے خریدنے کے لیے بھیجنا	جائز
۱۳	بیع کفالہ	اپنے لیے یا کسی نااہل کے لیے خریداری میں کسی سمجھدار کو ذمہ دار بنانا	جائز
۱۴	بیع حوالہ	کوئی شخص ادھار خریدے اور دوسرا وقت آدمی اسکی ضمانت دے کہ پیسے میرے ذمے ہیں	جائز
۱۵	بیع من یزید	ایک چیز کے بہت خریدار ہوں سب زیادہ زیادہ قیمت لگائیں جس کو نیلامی کہا جاتا ہے	جائز
۱۶	بیع استثنائیہ	بیچنے والا بیچنے کے وقت کہے کہ باغ کے پھل خریدے صرف چوتھائی حصہ میرا یا اس کھیتی کا چوتھائی میرا	جائز
۱۷	بیع تصرف غیر منقولہ	خریدار قبضے یا لینے سے پہلے آگے کسی تیسرے کو نہ بیچ دے	جائز

نمبر شمار	نام	تعریف	حکم
۱۸	بیع صرف تعادلاً	قیمت کو قیمت سے بیچنا مثلاً سونے کو سونے سے چاندی کو چاندی سے	جائز
۱۹	بیع استحقاق	بیچنے والے نے بیچی خریدار نے لی مگر تیسرا شخص کہتا ہے یہ میرا ہے بائع مالک نہ تو خریدار واپس دے کر اپنی قیمت لے لے	جائز
۲۰	بیع حق	صرف حق بیچنا صحیح ہے کہ جائز ہے مثلاً حق تصنیف یا طلاق بیچنا بیوی کے ہاتھ جس کو خلع کہتے ہیں	جائز
۲۱	بیع استصناع رواجی	کسی کاریگر سے کوئی چیز بنوانا جس کا عام رواج ہو ہر شخص بنواتا ہو۔ مثلاً ٹوپی جوتا وغیرہ	جائز
۲۲	بیع شرط باطل	کوئی چیز قیمت کے بدلے بیچی لیکن کوئی شرط لگائی۔ تو بیع جائز ہوگی اور شرط غلط شرط کی پابندی خریدار پر لازم نہیں	جائز
۲۳	بیع مضاربت	دو آدمیوں کی شرکت کاروبار ایک کا مال ایک کی محنت نفع آدھا آدھا یا جو معین ہو جائے۔	جائز
۲۴	بیع مزارعہ	زمین کرایہ پر دی کھیتی باڑی کے لیے اس طرح کہ بیج بھی مالک کا صرف کام کرائے کاشتکار کسان کا پیداوار یا نفع آدھا	جائز
۲۵	بیع عرایا	باغ کے مالک نے کسی غریب کو ایک درخت دیا کہ اس کے پھل توڑ لے لینا پھر اس کے آنے سے تنگی ہوئی تو اس سے اندازے سے کچھ پھل دیکر درخت واپس لے لیا	جائز
۲۶	بیع مکرہ	کوئی شخص دوسرے کو کہے کہ یہ چیز مجھ کو اتنے میں دیدے ورنہ قتل کر دوں گا وغیرہ وغیرہ	ناجائز ہے
۲۷	بیع تعاطی	دل میں بیع سے راضی ہو زبان سے ناراض ہو کر بیچے	ناجائز
۲۸	بیع مکروہ	جس میں کوئی شرعی ممانعت شامل ہو جائے	ناجائز
۲۹	بیع عینہ	کوئی غریب قرض مانگنے گیا امیر نے کہا یہ چیز بازار میں دس کی بکتی ہے تو مجھ سے بارہ کا خرید لے بازار میں دس کا بیچ کر فلاں مہینے میں بارہ دے دینا	ناجائز
۳۰	بیع احتکار	غلہ نہ بیچے ضرورت قحط سالی کی کے باوجود۔ اپنے پاس جمع رکھے	ناجائز
۳۱	بیع ہزل	مذاق کے طریقے پر خرید و فروخت کرنا	ناجائز
۳۲	بیع استثنائے غیر معین	بیچنے والا کہے خریدار سے یہ کھیت یا یہ باغ خرید لے اس میں دس من میرا باقی تیرے	ناجائز
۳۳	بیع مزابنہ	تر پھل کو خشک پھل کے بدلے ناپ کر بیچنا وغیرہ	ناجائز
۳۴	بیع ملامسہ	بغیر کھولے صرف ہاتھ لگا کر کپڑا خریدنا اور بغیر الٹ پلٹ کئے گندم کا ڈھیر خریدنا	ناجائز
۳۵	بیع غرر	دھوکہ دے کر بیچنا جیسے گائے بھینس بکری کا دودھ روک لینا۔ تاکہ خریدار سمجھے کہ بہت دودھ والی ہے	ناجائز
۳۶	بیع معدوم	پھل یا کھیتی اگنے سے پہلے بیچنا یا صرف بالاخانے کا مالک بالاخانہ گر جانے کے بعد بیچے	ناجائز
۳۷	بیع نجش	خریدنے کا ارادہ نہ ہو مگر شی کی قیمت بڑھا دے تاکہ خریداروں کو نقصان ہو	ناجائز
۳۸	بیع قبل قبض منقول	کوئی منقول چیز خریدی مگر قبضے سے پہلے ہی کسی تیسرے کے ہاتھ بیچ دی	ناجائز
۳۹	بیع صرف ادھار کی بیع	قیمت کو قیمت سے بیچنا۔ مثلاً چاندی یا سونا یا نوٹ پیسے وغیرہ کو چاندی سونے نوٹ سے بیچنا	ناجائز
۴۰	بیع استصناع غیر رواجی	کوئی شخص کسی مستری معمار سے کوئی خصوصی چیز بنوائے اور قیمت پہلے مقرر نہ کرے۔	ناجائز

نمبر شمار	نام	تعریف	حکم
۴۱	بیع لعب	محض کھیل کود کے لیے چیزیں خریدنا۔ مثلاً پتنگ ڈور گلی ڈنڈا یا مورتی کھلونا	ناجائز
۴۲	بیع مزابنہ	غلہ گندم وغیرہ کو گندم یا کسی دوسرے مال کے بدلے بیچنا اور کوئی فضول شرط لگانا	ناجائز
۴۳	بیع مضطر	خریدنے پر مجبور انسان کے ہاتھ مہنگی کر کے بیچنا	ناجائز
۴۴	بیع محاقلہ	گندم وغیرہ معین کے بدلے لگی کھیتی بیچنا۔ مثلاً بائع کہے کہ دو من گندم لے لو اور اپنا یہ کھیت گندم کا دیدے	ناجائز
۴۵	بیع مخابرہ	زمیندار صرف زمین کرائے پر دے محنت اور بیج کرایہ دار کا۔ اور مالک آدھا یا چوتھائی مانگے	ناجائز
۴۶	بیع معاومہ	کسی باغ کا آئندہ چند سال کا پھل خریدنا	ناجائز
۴۷	بیع حصات	خریدار بائع سے کہے کہ میں پتھر کنکر پھینکتا ہوں جس چیز کو لگ جائے وہ مجھے دو روپیہ سیر دے دینا	ناجائز
۴۸	بیع مجہول	ادھار بیچنا اور کہنا کہ جب فلاں شخص آئے گا قیمت دے دوں گا تاریخ معین نہ ہو	ناجائز
۴۹	بیع عربان	کسی خرید کردہ شی کا بیعانہ دینا پوری رقم بوقت قبضہ اور معاہدہ کرنا اگر نہ خریدوں تو بیعانہ ضبط	ناجائز
۵۰	بیعتان فی البیع	نقد خرید و فروخت سستی اور بازاری قیمت سے کرنا۔ ادھار خرید و فروخت مہنگی کرنا	ناجائز
۵۱	بیع سلف	بیچنے والا کہے کہ میں تیرے ہاتھ فلاں چیز تب بیچوں گا جب تو مجھ کو اتنا قرضہ بھی دے	ناجائز

یہ تھیں بیع کی تمام قسمیں۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو ایمان کے سچے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور کاروباری حضرات اسلامی طریقے سے آپس میں تعاون کریں آمین: ۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

اسلامی قانون میں سخت مہنگائی یعنی بلیک کرنا ناجائز ہے

سوال نمبر ۶۹: ۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ میں مسمّٰی محمد حیات ولد خضر حیات نے ایک سال سے اپنا ایک کتب خانہ بنایا ہے۔ اور اپنی مطبوعات میں سے ایک کتاب چھپوائی ہے۔ جس کا سائز ۱۸ × ۲۲ ہے اور اس کے صفحات ۹۸۵ ہیں۔ وہ مجھ کو فی کتاب ۱۵ روپیہ میں پڑی ہے۔ آج کل تاجرانہ کمیشن بھی دینی پڑتی ہے کچھ میں خود فروخت کروں گا۔ اور کچھ تاجروں کو کمیشن سے دوں گا۔ میں نے اس کی ونڈیک آفسٹ کی کتابت کرائی ہے جس پر میرے تین ہزار روپیہ صرف ہوئے۔ اور کتابت تصحیح کرائی۔

اور کاپی جڑائی پر مزید دو ہزار روپیہ خرچ ہوئے۔ کاغذ اور چھپائی پلیٹ لگوائی جلد بندی فولڈنگ پر پندرہ ہزار روپیہ خرچ ہوئے۔ اس طرح کل بیس ہزار روپیہ خرچ ہوئے اور اس سارے خرچ کے اعتبار سے فی کتاب بیس روپیہ کی مجھ کو گھر پڑی۔ اور اگر کتابت و تصحیح کو الگ شمار کیا جائے تو پندرہ روپیہ کی پڑی۔ کیونکہ ایک ہزار کتاب چھپی ہے۔ میں نے اس کی قیمت مکمل مجلد کی پچاسی روپیہ رکھی ہے۔ ایک صاحب نے مجھ کو شک ڈالا ہے۔ کہ اتنی قیمت پر فروخت کرنا ظلم ہے۔ اور ایک اور صاحب نے کہا ہے۔ کہ اپنی چیز جتنی قیمت پر دل چاہے فروخت کر سکتا ہے۔ شریعت میں کوئی گناہ اور ظلم نہیں۔ کتاب دینی مذہبی مسائل پر ہے۔ اس کے مصنف آپ کے پاکستان میں ہیں۔ اُن کی اجازت کے بغیر چھاپی ہے۔ اُن معترض صاحب نے مجھے یہ بھی کہا کہ اجازت کے بغیر چھاپنا بھی گناہ اور کمائی حرام ہے۔ میں دونوں بزرگوں کی باتیں سن کر سخت پریشان ہوا اور مذبذب ہوا تو مجھ کو اُن معترض صاحب نے کہا کہ پاکستان سے فتوے منگاؤ۔ انہوں نے ہی مجھ کو آپ کا پتہ دیا دوسرے صاحب جو ذرا آزاد خیال ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مولویوں کو کیا پتہ کہ تجارت اور اس کے اصول کیا ہوتے ہیں۔ یہ مولوی لوگ صرف نماز روزے کے مسئلے بتا سکتے ہیں کاروباری الجھنوں سے یہ واقف نہیں ہوتے لہٰذا اُن کا فتوای مت منگاؤ۔ مگر میں نے اُنکی اِس بات کو تسلیم نہ کرتے ہوئے آپ کو سوال لکھ دیا ہے۔ لہٰذا براہِ کرم جلدی فتوے دیا جائے۔ جب تک آپ کا فتوے نہ آئے گا۔ میں فروخت بند رکھوں گا۔ آپ ہی اُس کی قیمت مقرر فرما دینا فقط والسلام۔ بیّنوا توجروا:۔

سائل۔ مولوی محمد حیات رضوی محلہ سوداگران بریلی شریف یوپی بھارت ہندوستان ۲ اپریل ۱۹۷۲ء۔

اَلْجَواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّاب

قانونِ شریعت کے مطابق ضروریاتِ دین اور ضروریاتِ زندگی میں بازاری قیمت سے زیادہ قیمت لگانا سخت گناہ ہے۔ سوالِ مذکورہ بالا میں جن معترض صاحب نے ہمارے تاجر و ناشر بھائی کو اُن کی مطبوعہ کتاب کی قیمت زیادہ لگانے پر روکا اور ٹوکا ہے۔ وہ بالکل درست ہے۔ اور شرعًا اتنی زیادہ قیمت لگانا ظلم ہے۔ اور جن دوسرے صاحب نے اُس کو جائز قرار دیا وہ غلطی پر ہیں۔ اس لیئے کہ دنیاء کائنات میں استعمالی اشیا تین قسم کی ہیں ایک یہ کہ بقاءِ زندگی کے لیئے اُس کا خریدنا اور حاصل کرنا اشد ضروری ہو اُس کے بغیر زندگی گزارنا محال ہو ان چیزوں کو ضروریاتِ زندگی کہا جاتا ہے۔ جیسے کھانا پینا گندم چاول۔ اور پانی وغیرہ ۲:۔ ضروریاتِ دین یعنی وہ چیزیں کہ حصولِ دین کے لیئے اشد لازم ہوں جن کے بغیر شریعت و طریقت کے علوم کا حصول ممکن نہ ہو۔ جیسے دینی کتب قرآن مجید احادیثِ مبارکہ کتبِ تفسیر۔ کتبِ فقہ وغیرہ۔

غ۳ :۔ اشیاءِ فضولیات ۔ جن چیزوں کا حاصل کرنا نہ بقاءِ زندگی کے لیے ضروری ہو نہ بقاءِ دین کے لیے مثلاً فیشن پرستی اور عیاشی کی چیزیں ۔ پہلی دو چیزیں بازاری قیمت سے مہنگی بیچنی گناہ کبیرہ اور شرعی جرم ہے ۔ چنانچہ فتاوٰی درمختار جلد چہارم صفحہ نمبر ص۱۴۶ پر ہے :۔ وَفِي الْكُتُبِ بَيْعُ الْمُضْطَرِّ وَشِرَاؤُهٗ فَاسِدٌ :۔ (ترجمہ)۔ بحوالہ فتاوٰے تتف ہے کہ مجبور کا بیچنا بھی فاسد ہے ۔ اور کسی چیز کے خریدنے پر مجبور ہو کر خریدنا بھی فاسد ہے ۔ اس کی شرح میں علامہ شامی ص۱۴۶ پر فرماتے ہیں :۔ هُوَ اَنْ يَضْطَرَّ الرَّجُلُ اِلٰى طَعَامٍ اَوْ شَرَابٍ اَوْ لِبَاسٍ اَوْ غَيْرِهَا وَلَا يَبِيْعُهَا الْبَائِعُ اِلَّا بِاَكْثَرَ مِنْ ثَمَنِهَا بِكَثِيْرٍ وَكَذٰلِكَ فِي الشِّرَاءِ مِنْهُ ۔ (ترجمہ) :۔ مجبوری کا خریدنا اور بیچنا یہ ہے کہ لوگ اس کے خریدنے پر مجبور ہوں جیسے کھانا ۔ پانی یا لباس یا اس کے علاوہ دینی ۔ دنیوی اشد ضروری چیزیں ۔ اور بیچنے والا ان چیزوں کو بازاری قیمت سے زیادہ مہنگی کر کے بیچے ۔ اسی طرح خریدار بھی کسی موقع پر بیچنے والے کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سستی چیز لینے کی کوشش میں ہو ۔ یہ دونوں کام بیع فاسد اور ناجائز ظلم ہیں ۔ اس سے ثابت ہوا کہ دینی ضرورت کی چیز ہو یا دنیوی ۔ بازاری قیمت سے مہنگی بیچنی منع ہے ۔ شریعت میں ایسی خرید و فروخت بیع فاسد ہوگی اور جس طرح ضروریاتِ زندگی کی اشیاء میں یہ مہنگا کیا جاتا ہے اسی طرح دین کی چیزوں میں بھی یہ مہنگائی جس کو آج کل بلیک کہا جاتا ہے سخت ناجائز ہے آج کے دور میں تو مسلمان بھی دین و مذہب اور گناہ و برائی حرام و حلال کی پرواہ نہیں کرتے ۔ نہ کسی کا ادب احترام نہ کسی کی شرم و حیا ۔ بس پیسے کی دوڑ ہے ۔ یہ بلیک یہ مہنگائی ۔ چور بازاری ذخیرہ اندوزی ۔ غریب ماری ۔ ظلم چوری ڈکیتی سب اسی ہوس زر کی وجہ سے ہیں ۔ پہلے زمانوں میں دنیوی چیزوں میں مہنگائی تو سب ہی کر لیتے تھے مگر دینی چیزوں میں مہنگائی کرنا مسلمان سے متصور بھی نہ تھا اور دینی کتابوں وغیرہ میں صرف کفار ہی مہنگائی کرتے تھے ۔ اسی لیے فقہاءِ اسلام نے جب دنیوی چیزوں کی مہنگائی کا ذکر کیا تو عام تاجروں اور بیچنے والوں کا ذکر کیا اور جب دینی اشیاء کی خرید و فروخت میں مہنگائی کا ذکر کیا تو صرف کفار کا تذکرہ کیا چنانچہ فتاوٰے ردّ المحتار جلد چہارم ص۱۴۶ پر ہے :۔ اَوْ اَلْزَمَ الذِّمِّيُّ بِبَيْعِ مُصْحَفٍ اَوْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ وَنَحْوِ ذٰلِكَ (ترجمہ) :۔ یا ذمی کافر قرآن مجید یا مسلمان غلام کو مسلمانوں کے ہاتھ بہت مہنگا کر کے بیچے تو وہ بھی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اس لیے وہ بھی بیع فاسد ہے ۔ ذمی کافر جانتا ہے کہ مسلمان آدمی قرآن مجید خریدنے پر دینی طور پر مجبور ہے ۔ اسی طرح اپنے غلام مسلمان بھائی کو کافر کے چنگل سے چھڑانے پر مجبور ہے ۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ دینی مسائل کی کتب بھی بہت زیادہ مہنگی بیچنے پر بیچنے والا گناہ گار ہے ۔ اس لیے کہ بیع فاسد شرعاً مکروہ تحریمی ہوتی ہے ۔ چنانچہ فتاوٰے دُرِّ مختار جلد چہارم صفحہ ع۱۲۸ پر ہے اَلْمُرَادُ بِالْفَاسِدِ الْمَمْنُوْعُ مَجَازًا عُرْفِيًّا فَيَعُمُّ الْبَاطِلَ وَالْمَكْرُوْهَ ۔ (ترجمہ) بیع فاسد سے

مراد مجازی اور مشہور معنی ہیں یعنی ممنوع و ناجائز۔ لہٰذا عام ہے باطل کو بھی اور مکروہ کو بھی۔ ثابت ہوا کہ بلیک کرنا بیع فاسد اور بیع فاسد مکروہ ہوتی ہے۔ اور فقہاءِ اسلام کے نزدیک مطلق مکروہ سے مکروہ تحریمی مراد ہوتی ہے:۔ مکروہ تحریمی قابلِ توبہ گناہ ہے۔ چنانچہ فتاوے بحر الرائق جلد ششم صفحہ نمبر ۹۱ پر ہے:۔ (فَصْلٌ فِي الْبَيْعِ الْفَاسِدِ) أَيْ فِي بَيَانِ أَحْكَامِ الْفَاسِدِ قَدَّمْنَا أَنَّ فِعْلَهُ مَعْصِيَةٌ فَعَلَيْهِ التَّوْبَةُ مِنْهَا بِفَسْخِهَا۔ (ترجمہ):۔ بیع فاسد کی فصل میں فرماتے ہیں اس کا حکم یہ ہے کہ یہ سخت گناہ ہے اور اس سے توبہ واجب ہے اس طرح کہ جو چیزیں مہنگی کرکے بیچی ہیں وہ سب بیع فسخ کرے اور ان کی زیادتی قیمت واپس کرے۔ اور آئندہ بچے۔ ثابت ہوا کہ ضروریاتِ دینی اور ضروریاتِ زندگی کی اشیاء کو مہنگا بیچنا مکروہ تحریمی اور گناہ کبیرہ ہے۔ اور قانونی طور پر جس فعل کا تعلق حقوق العباد سے ہو اس میں زیادتی ظلم ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی ضروری شئی کو مہنگا کرکے بیچنا ظلم ہے۔ پھر ضروریاتِ زندگی عام ہے اس بات کو کہ وہ کھانا۔ پانی لباس ہو یا زمانے کے اعتبار سے کوئی بھی اشد ضروری چیز۔ کیونکہ ضروریاتِ زندگی بھی دو قسم کی ہیں:۔ نمبر ۱ دائمی ضروری۔ ۲ عارضی ضروری۔ دائمی ضروری جیسے گندم۔ چاول۔ پانی لکڑی ایندھن۔ عارضی وقتی ضروری جیسے کفار سے جنگ کے وقت ہتھیار اسلحہ مروجہ۔ بیمار کے لیے دوائی وغیرہ پس اپنے اپنے موقعوں سے جو ضروری چیز کسی مسلمان نے بھی بازاری قیمت سے مہنگی بیچی تو وہ تجارت ظلم اور گناہ ہوگی۔ ایسے ہی جو مسلمان دینی مسائل کی کتاب بہت زیادہ مہنگی بیچے تو وہ بھی ظلم اور گناہ ہے۔ کیونکہ دینی کتاب خریدنا اور حاصل کرنا مسلمان کے لیے ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ ہر مسلمان شرعی طور پر دینی کتاب خریدنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ حدیث پاک میں ہے کہ علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ چنانچہ جامع صغیر جلد دوم صفحہ نمبر ۵۴ اور مشکوٰۃ شریف صفحہ ۳۴ پر ہے:۔ عَنْ أَنَسٍ قَالَ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (الخ):۔ ترجمہ:۔ وہی ہے جو اوپر ہوا۔ اور فرض کی ادائیگی پر مسلمان مجبور ہوتا ہے۔ لہٰذا اتنی دراز گفتگو سے یہ ثابت ہوا کہ دنیا کی تین قسم کی چیزوں کو حد سے زیادہ مہنگا کرکے قیمت دگنی چگنی بڑھا چڑھا کر بیچنی ظلم اور گناہ۔ ۱ یعنی ضروریاتِ دین کی چیزیں ۲:۔ ضروریاتِ زندگی کی دائمی ضرورت والی چیزیں اور ۳ زندگی کی عارضی ضرورت والی چیزیں۔ کفار سے جنگ کے موقعہ پر اگر کوئی مسلمان تاجر اسلحہ۔ بندوق۔ کارتوس وغیرہ بلیک کرے تو سخت گناہ گار ہے۔ اسی طرح کوئی ڈاکٹر حکیم اپنی دوائیوں کی بلیک کرے یعنی بازاری قیمت سے مہنگی بیچے تو شرعًا مجرم ہے۔ ہاں البتہ تیسری قسم کی چیزیں جن کو صرف فیشن پرستی عیاشی اور لذتِ نفسانی کے لیے خریدا جاتا ہے۔ مثلاً سنگھار کا سامان۔ فیشنی ریشمی اور خوبصورت کپڑے۔ جوتے۔ یا پھل فروٹ میوہ۔ یا

مشروباتِ لذیذہ یا امن کے حالات میں اسلحہ کی خرید و فروخت وغیرہ یہ اشیاء نہ ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہیں نہ ضروریاتِ دین سے لہٰذا ان میں بیچنے والا اپنی مرضی کی قیمت لگا سکتا ہے۔ شریعت میں کوئی گناہ نہ ہوگا۔ خواہ چارگنا زیادہ پر بیچے۔ خریدار اگر غریب ہے تو نہ خریدے کونسی مصیبت پڑی ہے۔ اسی طرح دنیا کی کتابیں رسالے اخبارات۔ جریدے۔ بلیک کرکے بیچنے سے شرعی مجرم نہ ہوگا۔ خریدار اگر نہیں خرید سکتا تو نہ خریدے بلکہ بعض دفعہ بعض لوگوں کے لیے دنیا کی بری کتابیں خریدنا حرام یا ناجائز ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے لیے فحش ناول گندی تصویریں۔ طالب علم کے لیے قصے کہانیاں۔ موجودہ دور میں۔ فلمی گیت کی کتابوں کی خرید و فروخت اور مٹی پتھر کی مورتیں جن کو کھلونوں کا نام دیا جاتا ہے یہ تمام چیزیں مسلمان کو بیچنا یا خریدنا گناہ ہیں ان ہی سے بچوں کی زندگیاں اور بڑوں کا معاشرہ تباہ ہو رہا ہے۔ سائل نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ واقعتاً اتنے کی ہی پڑتی ہے۔ جتنی اس نے حساب لگا کر بتائی ہے۔ مگر اس کتاب کے وہ اخراجات جو اسکی طباعت اور کاغذ اور جلد بندی (فولڈنگ) اور طباعت کے سلسلے میں بھاگ دوڑ۔ مزدوری کرایہ جات وغیرہ پر جو خرچ ہوئے بس وہ ہی مالیت کتاب کے مصارف میں شامل کی جائیں گی۔ رہے وہ اخراجات جو کتابت اور تصحیح اور کاپی جڑائی یا کتابت وغیرہ کے سلسلے میں آمد و رفت کے کرائے خرچے میں صرف ہوئے وہ کتاب کی قیمت میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔ اگر کوئی تاجر پبلشر (چھاپنے والا) آفسٹ و بلاک کتابت اور تصحیح جڑائی وغیرہ خرچوں کو اپنی مطبوعہ کتاب میں شامل کرکے کتاب کی قیمت معین کرے تو بیع فاسد ہوگی اور تاجر چھاپنے بیچنے والا شرعی مجرم گناہ گار ہے۔ اور یہ بیع یا اسلامی قانون کے مطابق مندرجہ بالا دلائل اور حوالوں کے تحت ظلم ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں ونڈیک کتابت کتاب کی طباعت کے بعد بھی بعینہٖ مالک کے پاس محفوظ رہتی ہے۔ نہ وہ پرانی لیتھو کتابت کی طرح فنا ہوتی ہے۔ نہ کتاب کے ساتھ فروخت ہوتی ہے۔ وہ مالک کی چیز مالک کے پاس تادیر سلامت رہتی ہے۔ جب چاہے مالک کسی بھی شخص کے ہاتھ وہ کتابت اسی یا دوگنی تگنی قیمت سے فروخت کر سکتا ہے پس کتنے ظلم کی بات ہے کہ مالکِ کتاب۔ کتابت کی قیمت جو اس کے گھر بحفاظت موجود ہے۔ کتاب میں شامل کرکے اپنے خریداروں سے وصول کرتا ہے۔ اور پھر جب چاہے اسی کتابت کو بڑھا چڑھا کر علیحدہ بھی فروخت کر دے۔ یہ حرکت تجارت کے ان اصول کے خلاف ہے۔ جو پیارے آقا رہبرِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سکھائے۔ خریدار نے آپ سے کیا خریدا؟ صرف کاغذ۔ جلد۔ اور چھاپ شدہ مضمون۔ تو چاہیے کہ اس سے قیمت بھی انہی کی وصول کی جائے اگر آج کتابت شامل کرو گے۔ تو کل کو شیطان اور لالچ کرائے گا اور مشورہ دے گا کہ جس گھر میں بیٹھ کر یہ کتابت ہوئی۔ اس گھر اس گدیلے اس چٹائی کی قیمت بھی شامل کر دو جس پہ بیٹھ کر کتابت

کی گئی۔ اور رات بھر میں امیر بن جاؤ۔ مسلمان تاجروں کو ان ہی ظلموں سے بچانے کے لیے نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد پاک فرمایا۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّھَدَاءِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَالدَّارَقُطْنِیُّ وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ۔ (بحوالہ مشکوٰۃ شریف ص۲۴۳ باب المساہلۃ فی المعاملۃ فصل ثانی) ترجمہ:۔ ترمذی۔ دارمی۔ دارقطنی ابن ماجہ جیسی چار معتبر کتابوں نے حدیث روایت کی کہ روایت ہے ابوسعید سے فرمایا۔ انہوں نے کہ فرمایا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ سچا تاجر اور امین تاجر قیامت کے دن انبیاء کرام اور صدیقوں شہیدوں کے ساتھ رہے گا۔ اسی طرح کنوزِ حقائق لامام عبدالرؤف مناوی جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۱۰ پر ہے اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ تَحْتَ ظِلِّ الْعَرْشِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (بحوالہ دیلمی)۔ ترجمہ:۔ سچے ایماندار تاجر قیامت کے دن عرشِ اعظم کے سائے کے نیچے ہوں گے۔ ایمانداری اور سچائی کی تجارت یہی ہے کہ جائز منافع اور اسی چیز کی قیمت وصول کی جائے۔ جو فروخت کی جا رہی ہے۔ اگر کسی چھاپنے والے نے اپنی لیتھو یا آفسٹ کتابت کی پلیٹیں رکھ لی ہیں تو صرف پلیٹ لگوائی کی اجرت کتاب میں پہلی بار شامل کر سکتا ہے۔ پلیٹ کی قیمت اور دوسری بار لگوائی کی قیمت شامل نہیں کر سکتا کہ یہ بھی زیادتی اور ظلم میں شمار ہوگا۔ پس اِن اصولِ تجارت کے لحاظ سے مذکورہ فی السوال کتاب کی قیمت جائز طریقے پر مناسب منافع سے پینتالیس ۴۵ روپیہ مقرر کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ موجودہ دور میں چھاپنے والے کو اپنی کتاب زیادہ تر تاجروں کو کمیشن سے دینی پڑتی ہے اور کمیشن تین قسم پر رائج ہے ع۱:۔ تینتیس ۳۳ فی صد ع۲ چالیس فی صد ع۳ پینتالیس ۴۵ فی صد۔ اور لائبریریوں کو بیس ۲۰ سے پچیس ۲۵ تک کمیشن دینی پڑتی ہے تب تین گنا قیمت رکھ کر اتنی محنت کے باوجود دس گیارہ روپیہ منافع ملتا ہے اور فی کتاب گیارہ روپیہ منافع بہت مناسب ہے بلکہ اب بھی کچھ زیادہ ہی ہے مگر جائز حد تک ہے۔ اس لیے پندرہ کے حساب سے تین گنا زیادتی شرعاً جائز ہے۔ تمام مسلم تاجروں کو اس شرعی قانون پر عمل کرنا لازم ہے۔ کہ یہی تعلیم نبی کریم ہے۔ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ رہی یہ بات کہ مصنف کی اجازت کے بغیر کتاب چھاپنا جائز ہے یا نہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مصنف نے تصنیف کے جملہ حقوق اپنے یا اپنی اولاد یا کسی ادارے یا حکومت کے نام محفوظ کر دیئے ہوں۔ یا کسی شخص نے وہ کتاب مصنف سے خود اپنے خرچ پر لکھوائی ہو اور اس شخص نے جملہ حقوق مندرجہ بالا کسی کے نام محفوظ کر دیئے ہوں تب تو شرعاً کسی غیر کو بلا تحریری اجازت وہ کتاب چھاپنا ہرگز جائز نہیں۔ چھاپنے سے پہلے مصنف یا حقوق کے مالک کی اجازت شرط ہے اگرچہ وہ اجازت مفت دے یا قیمت سے۔ شریعت کے قانون کے مطابق حق والا اپنا حق بیچ سکتا

ہے۔ دیکھو طلاق خاوند کا حق ہے قانونِ اسلامی کی کتابوں میں لکھا ہے۔ اَلطَّلَاقُ حَقُّ الزَّوْجِ وَالْمَهْرُ حَقُّ الزَّوْجَۃِ۔ (ترجمہ) ہر قسم کی طلاق صرف خاوند کا حق ہے اور مہر کا مال بیوی کا حق ہے۔ خاوند اپنا یہ حق ہر طرح استعمال کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ بیچ بھی سکتا ہے۔ خواہ بیوی کے ہاتھ یا بیوی کے لواحقین کے ہاتھ بشرطیکہ بیوی کی رضامندی سے ہو۔ اسی کو طلاق خلع کہتے ہیں۔ اور یہ فروخت گناہ نہیں۔ بالکل جائز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔ (ترجمہ): - اور نہیں ہے گناہ طلاق بیچنے والے خریدنے والے دونوں خاوند بیوی پر اس میں جو بیوی طلاق کی قیمت دے۔ اس خاوند کو۔ ثابت ہوا کہ خاوند خلع کر کے اپنا حق یعنی طلاق بیچ سکتا ہے۔ اور یہ کہ طلاق خاوند ہی کا حق ہے اور یہ کہ خاوند کی اجازت کے بغیر کوئی اس کا یہ حق استعمال نہیں کرسکتا۔ یہ حق خاوند کو اس لیے ملا کہ خاوند نے محنت مشقت سے بیوی کی پرورش وغیرہ کی ذمے داری اٹھائی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جس میں بھی کسی شخص نے محنت کی ہو وہ اسی کا حق ہے خواہ دماغی ہو یا قلمی سخنی۔ تصنیف میں اچھی خاصی محنت ہوتی ہے پس وہ بھی مصنف کا حق ہے۔ اگر اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس کی کتاب چھاپے تو شرعاً گناہ گار ہوگا اس کا منافع حرام روزی ہوگا۔ بعض غلط قسم کے تاجر کہتے ہیں کہ تصنیف کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ مگر یہ بات ایمانداری کے خلاف ہے۔ ہاں دیگر صورت یہ ہے کہ مصنف نے اس کو عام کردیا ہو اور اعلان کردیا ہو کہ ہر شخص میری کتاب چھاپ سکتا ہے۔ تب ایمانداری اور صحیح روش یہ ہے اسی طرح صحیح ترین چھاپے جس طرح مصنف نے لکھی ہے کوئی خیانت یا گڑبڑ کرے بہتر ہے کہ اپنی ہم مسلک کتاب چھاپے۔ اگر کتاب کی اجازت عام ہو تو چھاپو یا اجازت مفت یا قیمت دے کر خرید کر چھاپی جائے یہ خرید و فروخت خواہ عارضی ہو یا دائمی۔ خلاصہ یہ کہ شریعت اسلامیہ نے جس طرح زندگی کے ہر شعبے کو نہایت احتیاط سے با اصول بنایا ہے۔ اسی طرح خرید و فروخت میں بھی بیع کی اکیاون قسمیں فرما کر نہایت ضروری اہم شرائط و ارکان کی پابندیاں سے تجارت کو آسان و با اصول بنادیا۔ تاکہ کوئی شخص کسی پر کبھی بھی ظلم نہ کرسکے۔ دوسرے صاحب کا یہ کہنا کہ فتوے دینے والے منگا کر مولوی لوگ کاروبار اور تجارتوں کو نہیں جانتے۔ ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے اور ان کی اپنی نادانی ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا کا کوئی مذہب کوئی دین کوئی لیڈر کوئی راہنما کوئی فلاسفر یا ذی عقل و ہوش ایسا نہیں ہے۔ جو ہر اسٹیج پر بول سکے۔ ہر شخص صرف ایک ہی اسٹیج پر بول سکتا ہے۔ ڈاکٹر صرف ڈاکٹری کے میدان میں کلام کرسکتا ہے انجینئر کے سامنے گنگ ہے۔ انجینئر فلسفی کے سامنے فلسفی منطقی کے سامنے۔ منطقی معمار کے سامنے۔ معمار طبیب کے

کے سامنے۔ طبیب ایک لکڑہارے کے فن سے ناواقف ہے۔ غرضیکہ ہر فن کار۔ صنعت کار۔ کاریگر اپنے اپنے فن کے اسٹیج پر بول سکتا ہے۔ مگر دینِ اسلام اور تعلیم مصطفےٰ کی ہی یہ شان ہے کہ اس مدرسۂ الٰہیہ کا پڑھا ہوا طالب علم عالم دین فقیہ اسلام ہر اسٹیج پر بول سکتا ہے۔ یہ تو خرید و فروخت کا معمولی مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عوام ہر کام میں علماء کرام کے شرعی مشوروں کے محتاج ہیں۔ شادی بیاہ ہو یا غمی مصیبت۔ کھانا پینا ہو یا بھوک ہڑتال۔ انجینئری ہو یا جغرافیائی سڑکیں ہر جگہ شریعت کے قانون نافذ ہوتے ہیں۔ معلّم اشرف المخلوقات نے کیسی پیاری تعلیم دی کہ مسلمانوں کو راستے بنانا اور راستوں پر چلنے کے آداب سکھا دیئے۔ گھر کی نقشہ نویسی اور گھر بنانے کا اسلامی طریقہ سکھا دیا۔ ایک مسلمان امیر سے غریب تک جب گھر بنانے کا ارادہ کرے تو وہ بھی عالم دین کے مشورے کے بغیر اسلامی گھر نہیں بنا سکتا۔ علماء اسلام ہی بتائیں گے کہ اپنے گھر کا بیت الخلاء اس طرح بناؤ کہ بول و براز کرتے وقت نہ کعبے کو پیٹھ ہو نہ کعبہ کی طرف منہ خواہ گھر کی چار دیواری میں ہو۔ یا صحرا میدان میں یہی حکم اسلام ہے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ صرف استنجا کرتے وقت بھی کعبے کو منہ یا پشت کرنی ناجائز ہے۔ (بحوالہ شامی صفحہ نمبر ۲۶۱ جلد اول) خود میں نے کئی کو ٹھیوں کے بنے ہوئے فلش تڑوا کر درست کروائے۔ کہاں تک بیان کیا جائے مختصر یہ کہ زندگی کے ہر شعبے پر شریعت اسلامیہ مکمل رہنمائی فرماتی ہے اور آج اگر شریعت کی بات پوچھنی ہو تو بجز علماء اہل سنّت کے کون سچی بات بتا سکتا ہے دنیا دار لوگ سمجھتے ہیں کہ علماء اسلام بے خبر ہوتے ہیں یہ ان کی بھول ہے یہ سادے سیدھے نیچی نظروں والے علماء کرام عرش و فرش سے خبردار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ دنیا و آخرت حشر و قبر میں ان ہی سادی زندگی والے علما فقہا کے دامنِ عافیت میں پناہ عطا فرمائے۔ جن کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید ہے اور ایک میں حدیث پاک ہے سینے میں عشقِ مصطفےٰ کی شمع فروزاں ہے۔ ان علماء کرام کے حق میں کسی کہنے والے نے خوب کہا ہے۔

نگاہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

قافلۂ غلامانِ احمدِ مجتبیٰ کے سالارِ اعظم اور منزلِ عشق و مستی کے امیرِ کارواں یہی علماء ہی ہیں۔ علماء متبحرین ہی وارثین انبیاء کرام ہیں چنانچہ ارشاد حبیب کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ (ترجمہ):۔ انبیاء کرام کے وارث صرف علماء عظام ہیں۔ قرآنِ کریم سورۂ ہود میں انبیاء سابقین کی تبلیغوں کا ذکر فرمایا ہے کہ ان انبیا علیہم السّلام نے کس شاندار دلنواز طریقوں سے اپنی امتوں کو زندگی کے اصول و ضوابط سمجھائے مگر جس طرح ان امتوں نے اپنے انبیاء کی حکمتوں بھری نصیحتیں سن کر یہی کہا کہ تم کیا جانتے ہو کہ کاروبار اور زندگی گزارنے کا طریقہ کیا ہے۔ اسی طرح آج یہ لوگ

علماء پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو سمجھ ہدایت عطا فرمائے۔ واللہ ورسولہ اعلم

کتاب البیوع

بہتے خون، مٹی اور ٹوٹے برتن وغیرہ اور مُردار بیچنے کا حکم

سوال نمبر: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ شریعت میں مذبوحہ جانور کا خون اور مردار جانور اور مٹی زمین کی بیچنا جائز ہے یا نہیں۔ شرح وقایہ کتاب البیوع میں لکھا ہے کہ خون اور مُردار کی بیع اور مٹی کو بیچنا منع ہے اور ان کی خرید وفروخت باطل ہے۔ اسیطرح فرمایا جائے کہ جانوروں کی لید اور گوبر کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ براہ کرم دلائل شرعیہ سے صحیح مسئلہ ثابت فرمایا جائے بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا۔ دستخط سائل (حضرت علامہ) احمد حسن نوری خطیب جامع مسجد فاروقی ڈاک خانہ مغلپورہ لاہور۔ پاکستان۔ مورخہ ۸/۷۹ ۲۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق فی زمانہ مذکورہ فی السوال پہلی دونوں چیزوں کی بیع یعنی خرید وفروخت کی اجازت ہے اور خون بہتا ہوا جانور مذبوحہ کا بیچنا خریدنا اسیطرح ہر طرح پر مٹی، لید گوبر حیوانی انسانی حلال حرام ٹوٹے برتن کا بیچنا وخریدنا بھی بالکل جائز ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جس طرح اشیاءِ عالم کا استعمال اسلامی زندگی میں مومن مسلمان کیلئے دو طرح پر ہے۔ یعنی حلت وحرمت اور حلت وحرمت کا دار ومدار پاکی۔ پلیدی پر ہے۔ اسی طرح خرید وفروخت کے لئے بھی ضابطۂ اسلامیہ مقرر ہے۔ وہ یہ کہ اگر عاقدین یا مبیع وثمن وجنس وقدر میں مجہولیت نہ ہو اور یہاں کوئی خرابی واقع نہ ہو تو خرید وفروخت کے جواز اور عدمِ جواز میں صرف یہی کُلیہ ہے کہ کائنات کی ملکیتی چیزوں میں جو چیز شرعاً نفع دیتی ہو اُسکا بیچنا جائز ہے اور جو چیز نفع نہ دے اسکا بیچنا خریدنا ناجائز۔ اشیاء کی تقسیم میں تمام فقہاءِ اسلام نے یہی ضابطہ مدِ نظر رکھتے ہوئے نفع بخش چیزوں کی خرید وفروخت جائز رکھی۔ اور بے نفع اشیاء کی خرید وفروخت کو باطل قرار دیا۔ اس قاعدے کے تحت یہ بھی ماننا لازم ہے کہ جو چیز جس وقت نفع دینا شروع کردے اور شریعت اس نفع کو تسلیم کرے وہ بیچنا جائز ہو جائے گی۔ اگرچہ زمانۂ گذشتہ میں وہ نفع نہ دیتی ہو اور سابقین فقہاء نے اسکا نفع نہ ظاہر ہونے کی بناء پر اپنے وقتوں میں اسکی بیع کو ناجائز ہی کیوں نہ قرار دیا ہو۔ یہ بات بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ خرید وفروخت کے جائز ناجائز ہونے میں

پاک پلید۔ حلال۔ حرام کا کوئی دخل نہیں۔ یہاں صرف نفع دینے نہ دینے کی شرط ہے۔ ان باتوں کو سمجھ لینے کے بعد مندرجہ ذیل دلائل سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ فی زمانہ ہمارے علاقوں میں خون، بلغم ومٹی بیچنا شرعاً جائز ہے۔ **دلیل اوّل**۔ قانونِ شریعت کے مطابق مال کو بیچنا اور خریدنا جائز ہے۔ اور مال کی شرعی تعریف کرتے ہوئے علامہ شامی صاحب ردّالمحتار نے فرمایا فَاِنَّ الْمُتَقَوِّمَ هُوَ الْمَالُ الْمُبَاحُ يَجُوْزُ الْاِنْتِفَاعُ بِهٖ شَرْعًا۔ ترجمہ۔ شریعت میں مال اس کو کہا جاتا ہے کہ جس سے نفع حاصل کرنا شریعت میں جائز ہو۔ یہی اُس کو قیمتی بناتا ہے۔ (فتاویٰ شامی جلد چہارم ص۱۳۹) دُرِّ مختار کامل نے ص۴۴۲ پر مال کی لغوی تعریف اس طرح فرمائی۔ وَالْمَالُ مَا يَمِيْلُ اِلَيْهِ الطَّبْعُ وَيَجْرِيْ فِيْهِ الْبَذْلُ وَالْمَنْعُ۔ ترجمہ۔ مال وہ ہے کہ جس کی طرف طبیعت مائل اور اس کو برتنا اور روک رکھنا ممکن ہو۔ یعنی اس کو برتا جا سکتا ہو۔ اور اُس پر ملکیت بھی ثابت ہوسکے۔ اس دلیل سے ثابت ہُوا۔ کہ شریعت میں مال کے لئے حدِ فاصل یہی ہے کہ اس سے نفع ملتا ہو۔ اس نفع پر نہ شریعت رکاوٹ ڈالے نہ طبیعت۔ **دلیل دوم**۔ پھر یہ ضروری نہیں کہ وہ شیئ ہمیشہ ہی سے نفع دیتی ہو۔ بلکہ جو چیز جس وقت بھی جائز نفع دینا شروع کردے اس وقت ہی وہ مال کہلائے گی اور جس وقت وہ نفع ختم کر بیٹھے۔ اس وقت اس کی مالیت ختم ہوجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے کسی شئی کے مال ہونے پر کوئی پابندی نہ لگائی۔ اور فرمایا کہ حالاتِ زمانہ اور کیفیتِ اشیاء کے مناسب خرید و فروخت کا حکم بدلتا رہے گا۔ گویا کہ آج ایک چیز کا نفع لوگوں کو نظر نہیں آتا تو آج وہ چیز بے نفع ہونے کی بنا پر مال نہ بنے گی۔ اور اُس کی بیع باطل ہوگی۔ لیکن کل وُہی چیز کسی مقام پر کسی قوم کو جائز نفع دے رہی ہے تو وہ ان لوگوں کیلئے اس زمانے میں شرعی مال بھی ہے اور بیچنا جائز بھی ہے۔ چنانچہ فتاویٰ دُرِّ مختار کامل ص۴۴۲ پر اور فتاویٰ شامی جلد چہارم ص۱۴۰ پر ہے۔ وَسَيَاْتِيْ اَنَّ جَوَازَ الْبَيْعِ يَدُوْرُ مَعَ حِلِّ الْاِنْتِفَاعِ وَاَنَّهٗ يَجُوْزُ بَيْعُ الْعَلَقِ لِلْحَاجَةِ مَعَ اَنَّهٗ مِنَ الْهَوَامِّ وَبَيْعُهَا بَاطِلٌ۔ ترجمہ۔ اور آگے عنقریب وضاحت سے آئے گا یہ مسئلہ کہ خرید و فروخت کا جائز و ناجائز ہونا پھرتا رہتا ہے۔ نفع کی حلّت کے بدلنے کے ساتھ۔ اور بیشک شان یہ ہے کہ اب جونک (پانی والا کیڑا) کو بیچنا و خریدنا شرعاً جائز ہے۔ ضرورت کی بنا پر۔ باوجود اس بات کے یہ کیڑوں مکوڑوں میں شامل ہے اور کیڑوں کی بیع کو فقہاء نے باطل کہا ہے۔ اِس دلیل سے ثابت ہُوا کہ حالات زمانہ کے بدلنے سے وہ چیزیں بھی بیچنا جائز ہیں جن کو پہلے فقہاء کرام نے ناجائز و باطل قرار دیا۔ کیوں اور کب جائز ہُوا؟ فقط اُس وقت جبکہ لوگوں نے جائز نفع حاصل کرنے کا طریقہ جان لیا۔ **دلیل سوم**۔ فقہاءِ عظام نے خرید و فروخت کے قانون میں جائز

نفع کو ہی قانونِ جواز بنالیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاءِ متقدمین و متاخرین نے اپنے اپنے دور میں بہت سی ایسی چیزوں کو بیچنا جائز قرار دیا جنکو پہلوں نے ناجائز کیا تھا اور بہت سی جائز بیع والی چیزوں کو ناجائز کر دیا فقط اسی بناء پر کہ بعض اشیاء کا پہلوں نے نفع ضروری سمجھا تو ان کی بیع جائز کرنا پڑی۔ بعد کے لوگ اس کے نفع سے ناواقف ہو گئے تو بیع ناجائز و باطل ہو گئی۔ چنانچہ فتاوی فتح القدیر جلد پنجم صفحہ ۳۵۷ پر ہے فی مسائلِ منثورہ۔ فَاِنَّهٗ مَبْنِيٌّ عَلٰى اَنَّ كُلَّ مَا يُمْكِنُ الْاِنْتِفَاعُ بِجِلْدِهٖ اَوْ عَظْمِهٖ يَجُوْزُ بَيْعُهٗ۔ ترجمہ۔ بیع کا قانون بس بیشک مبنی ہے اس قاعدہ کلیہ پر کہ ہر وہ چیز جس سے نفع لینا ممکن ہو خواہ مردار کی جلد یا ہڈی ہی ہو تو اس کی بیع جائز ہے۔ **دلیل چہارم**۔ آئمہ متقدمین نے تمام کیڑوں کی بیع کو باطل کہا کیونکہ انہوں نے ان میں نفع نہ پایا۔ چنانچہ فتح القدیر نے صفحہ ۳۵۷ پر جلد ۵ میں فرمایا۔ وَلَا يَجُوْزُ بَيْعُ هَوَامِّ الْاَرْضِ۔ ترجمہ۔ زمین کے تمام کیڑوں کی خرید و فروخت ناجائز ہے۔ مگر بعد کے فقہاء نے فرمایا کہ جونک کی بیع جائز ہے جیسا کہ فتاوی شامی کی عبارت سے ابھی اوپر ثابت کیا۔ اور کچھ فقہاءِ عظام نے سانپ کی بیع کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ فتح القدیر میں ہے۔ وَذَكَرَ اَبُو اللَّيْثِ اَنَّهٗ يَجُوْزُ بَيْعُ الْحَيَّاتِ اِذَا كَانَ يُنْتَفَعُ بِهَا فِي الْاَدْوِيَةِ وَاِنْ لَمْ يُنْتَفَعْ فَلَا يَجُوْزُ۔ ترجمہ۔ امام فقیہہ ابو اللیث رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے ذکر فرمایا کہ سانپوں کی بیع جائز ہے جبکہ ان سے دواؤں میں نفع لیا جائے۔ اور اگر نفع نہ ملے تو سانپ کو خریدنا بیچنا ناجائز ہے۔ **دلیل پنجم**۔ پہلے علمائے اسلام نے فرمایا کہ کتے کو بیچنا خریدنا غلط ہے۔ کیونکہ ان کو اس میں نفع نظر نہ آیا۔ مگر بعد والے ائمہ نے کہا جائز ہے۔ چنانچہ فتاوی ہدایہ باب مسائل منثورہ۔ ھدایہ آخرین صفحہ ۱۰۳ پر ہے۔ وَعَنْ اَبِيْ يُوْسُفَ اَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ بَيْعُ الْكَلْبِ الْعَقُوْرِ لِاَنَّهٗ غَيْرُ مُنْتَفِعٍ بِهٖ وَقَالَ الشَّافِعِيُّ لَا يَجُوْزُ بَيْعُ الْكَلْبِ ترجمہ:۔ امام یوسف کا مسلک ہے کہ کند ذہن یا کٹکھنا کتا بیچنا ناجائز ہے اس لئے کہ اس سے کوئی نفع نہیں لیا جا سکتا اور امام شافعی نے فرمایا کہ مطلقاً ہر کتے کی بیع منع ہے۔ لیکن صاحب ہدایہ اور ان کے ہمعصر فقہاء نے جب کتے میں نفع سمجھا تو فرمایا کہ بیع جائز ہے چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہوا۔ وَيَجُوْزُ بَيْعُ الْكَلْبِ وَالْفَهْدِ وَالسِّبَاعِ۔ اَلْمُعَلَّمِ وَغَيْرِ الْمُعَلَّمِ فِيْ ذٰلِكَ سَوَاءٌ (الخ) لِاَنَّهٗ مُنْتَفَعٌ بِهٖ حِرَاسَةً وَاصْطِيَادًا فَكَانَ مَالًا فَيَجُوْزُ بَيْعُهٗ۔ ترجمہ۔ کتے، چیتے اور درندے کی خرید و فروخت جائز ہے خواہ سیکھے ہوئے ہوں یا بغیر سیکھے۔ کیونکہ ان سے چوکیداری اور شکار کا نفع حاصل ہوتا ہے لہٰذا یہ مال ہیں اور مال کو خریدنا بیچنا جائز ہے۔ بات واضح ہوئی کہ خرید و فروخت میں پاک پلید حلال حرام کا اعتبار نہیں یہاں تو صرف نفع غیر نفع کا دار و مدار ہے۔

دلیل پنجم۔ ایک وہ زمانہ تھا جب فقہاءِ کرام کو مٹی میں کوئی نفع نظر نہیں آیا۔ تو انھوں نے مٹی کی بیع کو بھی ناجائز قرار دیا۔ چنانچہ شرحِ وقایہ کتابُ البیع جلد اوّل صفحہ ۲۰۲ پر ہے فَیَخْرُجُ مِنْهُ التُّرَابُ وَنَحْوُهُ ترجمہ: یعنی ہر اُس چیز کا بیچنا باطل ہے جو مال نہیں۔ پس اسی قانون کے ذریعے مٹی وغیرہ بھی اس جواز سے نکل جاتی ہے۔ پھر بعد کے فقہاء نے اس میں نفع پایا تو فرمایا کہ مٹی کا بیچنا جائز ہے۔ خواہ تھوڑی سی ہو یا زیادہ۔ چنانچہ شامی جلد چہارم صفحہ ۱۳۹ پر ہے۔ وَإِلَّا فَقَدْ يُعْرَضُ لَهُ بِالنَّقْلِ مَا يُصَيِّرُهُ مَالًا مُعْتَبَرًا۔ ترجمہ۔ ورنہ وہ مٹی جو منقول کی جانے کے لئے اکھیڑ لی گئی ہے۔ وہ معتبر مال ہے۔ یعنی اس کا بیچنا جائز ہے۔ دلیل ششم۔ پھر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا جب لید گوبر کی خرید و فروخت کو ناجائز رکھا گیا۔ اسی طرح انسانی گندگی کو بھی بیچنا ناجائز کہا گیا۔ مگر پھر بعد کے زمانے نے اس سے نفع حاصل کرنے کے طریقے معلوم کر لیے۔ لہٰذا فقہاءِ کرام نے اس کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیدیا۔ چنانچہ فتاویٰ ردّ المحتار جلد رابع صفحہ ۱۴ پر ہے فَيَنْبَغِي جَوَازُ بَيْعِهَا كَبَيْعِ السِّرْقِينِ وَالْعَذِرَةِ الْمُخْتَلَطَةِ بِالتُّرَابِ۔ ترجمہ۔ لائق ہے یعنی جائز ہے کپڑے کا بیچنا جیسے جائز ہے گوبر اور انسانی گندگی کو مٹی میں سے ملا کر بیچنا۔ فتاویٰ بحر الرائق جلد ۶ صفحہ ۷ پر ہے۔ وَيَجُوزُ بَيْعُ السِّرْقِينِ وَالْبَعْرِ وَالِانْتِفَاعُ بِهِ وَالْوُقُودُ بِهِ۔ ترجمہ۔ گوبر اور مینگنی کی خرید و فروخت اور اس کا نفع اور اس کو ایندھن بنانا بالکل جائز ہے۔ فتاویٰ کاملیہ صفحہ ۴۲ پر ہے۔ قَالَ فِي الْخَانِيَةِ وَبَيْعُ رَجِيعِ الْآدَمِيِّ بَاطِلٌ إِلَّا إِذَا غَلَبَ عَلَيْهِ التُّرَابُ وَعَنْ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى أَنَّهُ جَائِزٌ وَبَيْعُ السِّرْقِينِ وَالْبَعْرِ جَائِزٌ۔ فرمایا خانیہ میں کہ انسانی گندگی کو بیچنا باطل ہے مگر جب اس میں مٹی ملی ہو اور مٹی غالب ہو زیادہ ہو لیکن امام محمدؒ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے۔ مٹی ہو یا نہ۔ اور گوبر۔ لید و مینگنی کا بیچنا جائز ہے۔ مقامِ غور ہے کہ یہ اختلاف کیوں ہیں؟ فقط اس لئے کہ جب اشیاء میں نفع نظر آیا تو خرید و فروخت جائز ہو گئی۔ اور جب نفع نظر نہ آیا تو شئی کی خرید و فروخت ناجائز ہو گئی۔ گوبر۔ لید کا نفع تو آج ہمکو نظر آ رہا ہے مگر انسانی فضلات کا نفع اُن بزرگوں کے دَور میں نہ معلوم کیا تھا۔ آج ہم کو وہ نظر نہیں آتا۔ نہ مٹی ملے فضلے کا نفع ہے نہ خالص کا۔ لہٰذا اگر آج مجھ سے کوئی فتویٰ مانگے کہ انسانی گندگی کا بیچنا جائز ہے یا باطل۔ تو میں پچھلے فتاویٰ نہیں دیکھوں گا۔ بلکہ ان بزرگوں کے بنائے ہوئے قواعد و کلیہ کو دیکھتے ہوئے فتویٰ دونگا کہ انسانی گندگی کی بیع فی زمانہ باطل ہے کیونکہ جس نفع کی بناء پر سابقہ بزرگوں نے اس کی بیع

جائز رکھی تھی وہ نفع ہم کو نظر نہیں آیا۔ بس اسی طرح اس زمانے میں اُن بزرگوں کو بہتے خون کا کوئی نفع نظر نہیں آیا تو انہوں نے خون کی بیع کو ناجائز قرار دیا۔ مگر آج ہم کو اپنے دور میں خونِ مسفوح کے کے بہت سے فائدے نظر آتے ہیں اس لئے آج کے دور کا فقیہہ اور مفتی عالم یہی حکم جاری کریگا۔ کہ بہتے خون کو بیچنا جائز ہے۔ کیونکہ اس سے مرغی کی خوراک اور بہت دوائیاں حیوانات کی بنتی ہیں بلکہ حیوانی ٹیکے تیار ہوتے ہیں لہٰذا بقر عید کے دنوں میں مدارس کے لوگ بہتا ہوا خون بیچکر اس کی رقم وصول کر سکتے ہیں۔ وہ بیع فاسد یا باطل کی آمدنی کی شکل سود نہ ہوگی۔ اسیطرح ہر روز مذبح خانہ میں جانوروں کا خون بیچنا بھی جائز ہے۔ صرف اس لئے خون کی خرید و فروخت کو ناجائز کہنا کہ یہ پلید ہے گندا نجس ہے سراسر نادانی ہے۔ کیا گوبر لید اور انسانی غلاظت پلید نہیں۔ کتا بلا پلید نہیں؟ یقیناً ہیں مگر چونکہ ان سے نفع ہے۔ لہٰذا ان بزرگوں نے بیچنا جائز رکھا۔ آج بھی جائز ہے۔ اس طرح خون کا نفع آج ظاہر ہے۔ لہٰذا آج یہی فتویٰ ہے کہ خون بیچنا جائز ہے کیونکہ خرید و فروخت میں قانون یہی ہے کہ جو نفع دے وہ مال ہے اور جو مال ہے اسکی خرید و فروخت جائز ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد سوم صفحہ ۱۱۴ پر ہے۔ وَالصَّحِیْحُ اَنَّہٗ یَجُوْزُ بَیْعُ کُلِّ شَیْئٍ یُنْتَفَعُ بِہٖ۔ ترجمہ۔ صحیح یہ ہے کہ ہر اُس چیز کا بیچنا جائز ہے جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہو۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ بعینہ وہی چیز اسی حالت میں نفع دے بلکہ اس کو کسی صورت میں ڈھال کر اُس سے نفع لیا جا سکتا ہو۔ دیکھو فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر سانپ کو دوائی میں استعمال کیا جاتا ہو تو اس کو بیچنا جائز ہے جیسا کہ پہلے ثابت کیا۔ لہٰذا بہتے خون سے مرغی کی خوراک یا کسی حیوانی دوائی میں استعمال کرنا اس کو مال بنا دیتا ہے۔ اور مال کا بیچنا جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر نفع بخش شی مال ہے اور ہر مال کا بیچنا جائز۔ اگرچہ اس کا کھانا حلال نہ ہو۔ علامہ شامی فرماتے ہیں۔ ریشم اور دیگر نفع دینے والے کیڑے بیچنے جائز ہیں۔ وَاِنْ لَّمْ یَجُزْ اَکْلُھَا۔ ترجمہ۔ اگرچہ اُن کا کھانا جائز نہیں۔ پس اس قانونِ اسلامی کے تحت فتویٰ دیا جاتا ہے کہ خون کا بیچنا خریدنا بالکل جائز ہے۔ اسی طرح مٹی کا بیچنا بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ اکھڑی ہوئی ہو۔ بشکل زمین نہ ہو۔ جیسا کہ پہلے شامی کی عبارت سے ثابت کیا گیا۔ اگرچہ تھوڑی ہو۔ دیکھو کھریا مٹی۔ چونا۔ گچ۔ پلاسٹر۔ چینی مٹی یہ سب مٹی ہی ہے اور تھوڑی بھی نفع بخش ہے۔ لہٰذا خریدنا بیچنا جائز۔ اسیطرح جو چیز جب تک نفع دیتی رہے وہ مال ہے اس کا بیچنا جائز ہے۔ فقہاء متقدمین نے فرمایا۔ یعنی ٹھیکری کا بیچنا خریدنا منع ہے۔ مگر ہم نے آج اپنے زمانے میں دیکھا کہ بہت سی چیزیں ٹوٹ پھوٹ کر بھی نفع دیتی ہیں۔ شیشے کے برتن ٹوٹ کر نفع دیتے ہیں کہ برتن ساز کارخانے شیشہ پیس کر روغن تیار کرتے ہیں۔ آج

کے دور میں ٹوٹا پھوٹا شیشہ تقریباً پچیس روپیہ فی من فروخت ہوتا ہے۔ ہم اس تجارت کو صرف اس لئے جائز کہتے ہیں کہ یہ ٹوٹ پھوٹ کر بھی نفع بخش ہے۔ لہٰذا مال ہے اسی قانون کے تحت اگر کسی کا حفاظتِ شرعی میں رکھا ہوا تقریباً ۲ من ٹوٹا پھوٹا شیشہ کوئی چوری کرے تو اس کے ہاتھ کٹیں گے۔ اسی طرح فی زمانہ نائلون کی جوتیاں ٹوٹنے کے بعد بھی ضائع نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کو گلا کر پھر بہت سی اشیاء تیار ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا نائلون کی ٹوٹی پھوٹی جوتی بھی مال ہے اور اس کو بیچنا بھی جائز ہے۔ ہاں البتہ وہ چیز جو ٹوٹ کر نفع بخش نہ رہے اسکو بیچنا ناجائز ہے۔ مثلاً سرخ مٹی کا پیالہ یا سفید مٹی کا پیالہ خواہ کتنا حسین ہو ٹوٹ کر اس کی ٹھیکری بیکار ہے کوئی نفع نہیں۔ لہٰذا ان کا بیچنا باطل۔ بخلاف مٹی کی پختہ اینٹ کا بیچنا کہ وہ ٹوٹ کر بھی نفع بخش ہے بلکہ اس کو خود توڑ کر روڑی بنائی جاتی ہے۔ بدیں وجہ ٹوٹی اینٹ۔ ٹوٹی شیشی۔ ٹوٹی نائلون کی جوتی بیچنا جائز۔ اور ٹوٹا برتن۔ ٹوٹی چمڑے کی جوتی بیچنا ناجائز ہے۔ یہ سب اسی قانون کے تحت ہیں کہ جو نفع دے اور جس وقت دے وہ مال ہے جو نفع نہ دے وہ مال نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ فی زمانہ خون مٹی۔ مال ہے لہٰذا بیچنا خریدنا بالکل جائز ہے۔ ہاں البتہ مردار جو عام طور پر گائے۔ بھینس۔ بکری۔ مرغی بطخ مرجاتی ہیں۔ ان کا بیچنا خریدنا بالکل ناجائز ہے۔ جو کوئی اپنا مردہ جانور بیچے گا اس کی رقم سود ہو گی اور سود حرام ہے۔ چنانچہ فتاویٰ کاملیہ صلے پر ہے اَلْبَیْعُ الْفَاسِدَۃُ مَعْصِیَۃٌ یَجِبُ رَفْعُھَا وَسَیَاْتِیْ فِیْ بَابِ الرِّبٰوا اِنَّ کُلَّ عَقْدٍ فَاسِدٍ فَھُوَ رِبًا۔ ترجمہ: بیع فاسدہ گناہ ہے۔ واجب ہے اس کا ختم کرنا۔ ربا کے باب میں ہے جو بیع فاسد ہو وہ سود ہے۔ مردار کی بیع اگرچہ بیع باطل ہے اور فتاویٰ کاملیہ میں بیع فاسد کو سود کہا گیا ہے مگر یہاں فاسد سے مراد ممنوع ہے جو باطل کو بھی شامل۔ کیونکہ کتاب البیوع میں فاسد بھی ممنوع ہوتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ دُرِّ مختار صـ۴۳۴ پر ہے۔ اَلْمُرَادُ بِالْفَاسِدِ الْمَمْنُوْعُ مَجَازًا فَیَعُمُّ الْبَاطِلَ وَالْمَکْرُوْہَ۔ ترجمہ۔ مجازی اور عرفی طور پر لفظ فاسد کا معنیٰ ہے ممنوع۔ پس باطل اور مکروہ بیع کو بھی شامل ہے۔ مختصر یہ کہ فی زمانہ خون اور مٹی کی خرید و فروخت شرعاً بالکل جائز ہے اور عام مردار کی تجارت حرام ہے کہ بیع باطل ہے۔ ابھی تک اس کا کوئی نفع ظاہر نہیں کھانا تو حرام ہے ہی۔ ہاں اگر مستقبل میں بعینہٖ مردار سے کوئی حلال نفع نظر آیا تو حکماً بھی تغیر واقع ہوگا قرآنِ مجید میں جو مردار خون وغیرہ کی حرمت آئی ہے وہاں کھانا مراد ہے جیسا کہ سیاقِ کلام سے ظاہر ہے۔ خون سے مراد جانوروں کا بہتا ہوا خون ہے جس کو شریعت میں دمِ مسفوح کہتے ہیں۔ ہاں انسانی خون کا بیچنا خریدنا اب بھی حرام ہے کیونکہ احترامِ انسانی ہے۔ یہ فتویٰ ان قواعد کے

تحت ہے جو فقہاءِ عظام نے مرتب فرمائے۔ اگرچہ فی زمانہ جلد باز لوگ اس کو میرا تجدیدی شاہکار سمجھیں گے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں۔ یہ مضبوط اور اصولی فتویٰ ہے۔ قرآن کریم کی اقتضاء النص سے یہی ثابت ہو رہا ہے۔ کہ جب چیز میں نفع حلال ہو تو اس کی تجارت جائز ہے۔ چنانچہ پارہ ۵ آیت ۲۹ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ ترجمہ۔ لیکن آپ کی رضامندی والی تجارت جائز ہے۔ یعنی وہ رضامندی جو شریعت کی حدود میں ہو۔ اور بیع میں شرعی حد حلال نفع ہے آیتِ پاک میں لفظ تَرَاضٍ تقاضا کر رہا ہے نفع کا بلغیر نفع رضا باطل۔ وہ رضا نہیں بلکہ حماقت ہے اور نفع ظاہر تو بیع جائز۔ کون عالم کہہ سکتا ہے کہ مرغی کی خوراک بنانا شرعاً منع ہے؟ جب یہ خوراک جائز ہو تو ثابت ہوا کہ یہ نفع شرعی ہے نہ کہ غیر شرعی۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔

کتاب

علماء کو تقریر کا معاوضہ لینے کا بیان

سوال ۱۸۲:۔ علماء کی تقریر کی اُجرت و فیس لینے کا حکم:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ کسی عالمِ دین کا کسی جگہ وعظ کرنے کے لئے پیشگی اُجرت مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر اس کو اُس کی مقرر شدہ رقم دے دی جائے۔ تو وہ وعظ یا تقریر کرنے کیلئے جائے۔ اور اگر نہ ملے تو جانے سے معذرت کرے اور انکار کرے۔ اس صورت میں چند امور قابلِ فہم ہیں:۔

(۱) کیا اُس کی روزی حلال ہے؟ (۲) کیا ایسے شخص سے عقیدت رکھنی جائز ہے؟ (۳) کیا کرایہ وغیرہ وصول کرنے کے بعد بھی پھر ان واعظین کو کچھ لینے کا حق ہے؟ براہِ کرم اس کا جواب جلدی عطا کیا جائے:۔

السائل:۔ مسٹر عبداللہ خاں لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور ط ۲۴ $\frac{1}{68}$

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

سوال مذکورہ میں جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ معاشرے کی خرابیوں سے ایک خرابی ہے۔ اور اس خرابی کے ذمے دار صرف اور صرف علماء اور مقررین یا خطباء حضرات ہی نہیں بلکہ پورا معاشرہ اس خرابی کا ذمہ دار ہے۔ جس میں موجودہ حکومت مسلمان امراء اور عوام الناس کی گندی ذہنیت خاص طور پر ملوث ہیں۔ قاعدۂ فطرت ہے کہ ہر شخص کو اس کی حیثیت کا مقام ملنا چاہیئے۔ یہی ایک اصولِ ازلی ہے۔ جس سے کبھی معاشرہ بگڑ نہیں سکتا۔ اسی

اصولِ کلیہ سے روگردانی۔ تمام قومی اور معاشرتی ابتری کا باعث ہے۔ اسلام کی معاشرانہ کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے ہر شخص بلکہ نباتات، جمادات وحیوانات کو بھی ان کا صحیح مقام عطا فرمایا۔ عورت۔ مرد، بچہ، جوان، تندرست وضعیف، آقا، غلام، امیر، غریب، حاکم ومحکوم، عالم، جاہل، پیر، مُرید عاقل وبیوقوف، جانور وحیوانات، اُستاد وشاگرد۔ غرضیکہ ہر ایک کا مقام ودرجہ علیحدہ علیحدہ بیان کر دیا۔ اور ہر ایک سے ہر ایک کے حقوق دلوائے۔ آج کی مسلم قوم نے سب سے پہلے یہی عظیم سبق بھلایا۔ بلکہ اشرارِ قوم نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت یہ سبق بھلوایا۔ اسی خرابی کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا۔

شعر ؎ تو چہ دانی عہدِ ما با ما چہ کرد ۔ اَز جمالِ مصطفٰی بیگانہ کرد

جب کسی قوم میں مقامات کی ترتیب بدل جاتی ہے تو نت نئی خرابیاں، ذہنی فسادات، معاشرہ کی بدتہذیبیاں اور اسی طرح کی رُوحانی ونفسیاتی بیماریاں اُجاگر ہوتی ہیں۔ اقوامِ عالم میں رہنمایانِ دین جن کو مُسلم زبان میں عُلمائے کرام کہا جاتا ہے اور اغیار اُن کو پنڈت، پادری، گُرو، راہب وغیرہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا بھی معاشرے میں بہت بڑا مقام ہے۔ اسلام نے اُن کا بہت بڑا مقام بنایا۔ جیسا کہ قرآن کریم واحادیث مبارکہ میں متعدد مقامات پہ صراحت ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ۔ سے سب سے زیادہ عُلماء ہی ڈرتے ہیں۔ اور خشیتِ ایزدی عظیم ترین سرمایۂ مومن ہے۔ اس لحاظ سے عُلمائے کرام ایمانی سرمایہ دار ہیں۔ اور حدیث پاک میں بے شمار جگہ درجاتِ عُلماء کی تعیین کی گئی۔ تاریخ عالم بتاتی ہے کہ ادوارِ اسلامیہ میں عدالت کے تمام شعبے عُلمائے اسلام کے ہی ماتحت تھے۔ اور دار الافتاء سے لے کر دار القضاء بلکہ قاضی القضاء کی کرسیاں فقہاء وعلماء کے پاس ہی تھیں۔ اور تمام منصوبوں کے حقدار علماء ہی متصوّر ہوتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اسلام جیسے عالمگیر نظام کی عدالتوں کو، شریعت اسلامیہ کے علمائے متبحرین ہی نافذ کر سکتے ہیں۔ اور وہی ان حقوق کے اصل حقدار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ ترتیبی دور چلتا رہا مسلمانوں کا عروج ہوتا رہا اور ربانی علمائے کرام وآئمہ عظام کی مخلصانہ جدوجہد اور جان سوز وجگر دوز سعیاتِ جمیلہ وکوششہائے حمیدہ کی بدولت، مومن کا کردار اغیار کے سامنے آفتابِ کائنات کی طرح دمکا۔ حقیقت پسندوں کو مومن کو ناطق قرآن کا لقب دینا پڑا۔ اور مولانا رومی کی رُوحانی صحبت کا پروردہ اقبال پکار اٹھا۔ شعر ؎

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن ۔ قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہ سب علمائے کرام کے ہی مرہونِ منت ہیں۔ مگر آج جب کہ سب قومیں ہندو اپنے پنڈت کو، عیسائی

اپنے پادری کو، سکھ لوگ اپنے گُرو کو، بدھ مت اپنے راہب کو اعلیٰ ترین مقام سے نوازنے کے عملی خواہش مند ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ (ع) قوم مذہب سے ہے۔ مذہب جو نہیں تم بھی نہیں۔ اور اب جب کہ ان راہ نمایانِ دین کی آواز سلطان و حکام کی قانونی آواز پر بھی مسلّط ہے۔ اور جس دَور میں ایک لاٹ پادری کی آواز ایوانِ بالا میں گونج کر حاکم و محکوم بادشاہ و رعایا کو یکساں لرزہ براندام کر رہی ہے۔ اس وقت بدنصیب مسلم قوم نے اپنے راہ نما علمار کو اُن کے جائز مقام و درجے سے بھی محروم کر رکھا ہے۔ ایکطرف تو انگریزی غلامیت کے دلدادہ فیشنی مسلمان امراء و رؤسار نے علمار ملّت کو عدالتی منصب سے ہٹا کر، عیسائیت پرست لوگوں کو اس کرسی پر بٹھا کر عدالت کی باگ ڈور اُن کے سپرد کر دی۔ تو دوسری طرف جاہل مسلمان نے جھوٹے گمراہ گر پیروں کو شریعت و طریقت دونوں کا ٹھیکیدار بنا دیا۔ پڑھا لکھا طبقہ تو اس لئے علمار کو ٹھکرا چکا۔ کہ وہ عیسائیت مجوسیت۔ دھریت کے جال میں بُری طرح جکڑ چکا ہے۔ لیکن پیر پرست فرقہ صرف اس لئے علمار کی بات کو اہمیت نہیں دیتے اور نہ ہی ان کی نصیحت ماننے کیلئے تیار ہیں۔ کہ اُن کے نزدیک پیر کی بات قرآن و حدیث کے حکم سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے حالانکہ علمار کے پاس سوائے قرآن و حدیث کے اور کیا ہے اُن کی بات قرآن کی بات ہے۔ اُن کا کلام رسول اللہ کا کلام ہی تھا۔ اُن کی نصیحت پر عمل قرآن و حدیث پر عمل ہے۔ اور اُن کی ممانعت سے رُک جانا۔ ممنوعاتِ شریعت سے بچنا ہے۔ اِسی میں ربِ کریم کی خوشنودی ہے فی زمانہ دیکھا جا رہا ہے۔ کہ عدالتی جج جو بھی خلاف شرع فیصلہ کر دے۔ وہ ہر مسلمان کیلئے قابلِ عمل ہے۔ اور بے دین پیر پیری مریدی کا چکر چلا کر جو راستہ بھی دکھا دے اس پر چلنا ہر مرید کے لئے فرض ہو جاتا ہے۔ علمار کرام ہزار مرتبہ سمجھاتے رہیں۔ مگر مرید کی نظر میں پیر ہی شریعت کا امام ہے۔ چاہے اس کے پیر کو شریعت کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ کیسی سچی تھی۔ وہ تقسیم جو آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ کیسی پیاری تھی وہ تفریق جو نبی کریم نے کی۔ کیسی انوکھی تھی وہ تعلیم جو رسول اللہ نے دی۔ کیسا حسین تھا وہ انتخاب جو حبیب خدا نے مرحمت فرمایا۔ کیسی مشفقانہ تھی۔ وُہ ترتیب جو بانیٔ اسلام علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے مرتب کی کہ شریعت کے لئے علما اور طریقت کے لئے صوفیار مقرر فرمائے۔ علمار کو حکم دیا کہ تم ظاہر ہو جاؤ اور صوفیار کو فرمایا۔ کہ تم پوشیدہ ہو جاؤ۔ علمار کو فرمایا۔ کہ تم ہر شخص سے ملتے رہو۔ صوفیار سے کہا۔ عوام سے دُور بھاگو۔ علمائے کرام کو تبلیغ کا حکم دیا۔ صوفیار کو تصوّف کی پوشیدگی کا حکم دیا۔ فقہار کو علم چھپانے سے منع کیا۔ کہ وُہ احکامِ الٰہیہ ہیں۔ صوفیار فقرار کو تصوف کے ظہور سے منع کیا۔ کہ وہ اسرارِ الٰہیہ ہیں۔ عوام کو حکم ملا کہ علمار کے پاس رہا کرو۔ خواص کو لازم ہُوا کہ صوفیار کی صحبتیں اختیار کرو۔ یہ تھی وہ پیاری ترتیب کہ جس نے دامنِ اسلام کو زرنگار بنا

دیا تھا۔ مگر نفرین ہے زمانے کی چالوں پر کہ اگر ملکی قانون پوچھنا ہو تو دامنِ عیسائیت اور مجوسیت کی پناہ لی جاتی ہے اور مسائل اور عبادت کا علم لینا ہو تو صوفیاء اور پیروں کی بارگاہ کی طرف دوڑ لگتی ہے۔ حالانکہ ان دونوں مقام پر شریعت و قانون میں سے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ مرکزِ شریعت اور قانونِ شریعتِ اسلامی تو مجالسِ علماء ہی ہیں۔ مگر عوام حکومت امراء غرباء کی علماء سے روگردانی اور بے توجہی کا نتیجہ جہالت و بدعاتِ سیئہ کی بھرمار ہے:
اب علماء کا مصرف عوام کی نظر میں صرف یہ ہی رہ گیا ہے۔ کہ ان کو جلسوں پر بلا کر وعظ کرالو۔ یا مسجدوں کی امامت سے آگے نہ بڑھنے دو۔ حالانکہ فقہاء اسلام سلاطین اسلام نہ سہی۔ مگر عدالاتِ اسلامیہ کے فی الواقع جائز حقدار یہی ہیں۔ اب جب کہ معاشرہٴ مسلم نے یہ خطرناک کروٹ بدلی۔ تو یورپ نواز حکومتی کرسیوں کے دلدادہ محراب و مسجد، مدارس و خانقاہ کو چھوڑ کر سکول و کالج کی طرف دوڑے۔ اور مریدوں سے لقمہٴ تر کا مزہ پا جانے والے اپنے وِرد و وظائف کے ناروں سے نکل کر پیری مریدی کی تجارت میں مشغول ہوئے اور تجارت بڑھانے کی خاطر قرآن و حدیث سے روگردانی کرتے ہوئے شرعی حدود کو پامال کرنے لگے۔
علماءِ امت نے قوم کی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو بہت کچھ سہارا دینے کی کوشش کی۔ مگر جب ملاح و مسافر ہی آمادہ غرقاب ہوں تو پھر بحرِ عمیق کے تھپیڑوں سے کون بچا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست۔ بھیڑیئے کو چوکیدار اور چوکیدار کو بھیڑیئے سمجھا جانے لگا۔ علماء کو طرح طرح مطعون نشتر لگائے جانے لگے۔ اپنے پرائے اپنی جہالت اور ناوکِ خباثت کا ہدف، فقہاءِ ملت کو بنانے میں ہمہ تن مشغول ہوئے۔ کوئی درپردہ کوئی در ظہور علماء کی مخالفت پر کمر بستہ ہو کر اپنے ہی دین و ایمان کے پائے ثبات پر تیشہ زن ہوئے اور مسلمان نے اس کو ہی قابلِ فخر کارنامہ اور جہادِ عظیم سمجھا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ کہ علماء متبحرین و فقہاء ربانیین نے گوشہٴ تنہائی اختیار کی۔ اور بعض نے سینہ سپر ہو کر جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔ پھر کیا تھا۔ باز رکھنے اور روکنے ٹوکنے والوں کو مفلوج کیا۔ تو میدان صاف تھا۔ آشیانہٴ شاہین پر قبضہٴ بوم کچھ اچنبھا خیز نہ تھا۔ دنیا پرستوں نے عمامہ و دستار پر قبضہ کیا۔ اور ابن الوقتوں نے اسٹیج پر براجمان ہونے کے ساتھ ساتھ مسجد و محراب پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ اب کون تھا۔ جو ان کو روکتا اور کون اپنی جان کا دشمن اس ظالم گرگ کے مقابل ہوتا۔ جو کچھ غیرتِ ایمانی والے تھے۔ اگر انہوں نے مخالفت میں آواز بلند کی تو فرقہ پرست اور دین ملا فی سبیل اللہ فساد اور مسجد کے لیٹرے وغیرہ الفاظی نشتروں کے تنکلوں سے چھیدے جانے لگے۔ ان حالات نے اور بھی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ آئندہ نسلوں نے حق و باطل میں فرق نہ کیا۔ چور اور پولیس کے نازک رشتے کو نہ سمجھا۔ راہزن و شاہد کی معمولی گتھی کو بھی نہ سلجھایا۔ صُمًّا وَّعُمْیَانًا ہو کر مدرسوں سے دُور مسجدوں سے متنفر، قرآن و حدیث سے علیٰحدہ ہو کر

مجالس صالحین کو چھوڑ کر گوشۂ سینما میں آرام ڈھونڈا، تلاوت کو ہٹایا، ناول کو پکڑا۔ حدیث پاک سے نظریں ہٹا کر ٹیلیویژن پر جمائیں۔ ادھر عیش پرست پیروں نے اپنے عیاش مریدین کے لئے چشتیت کا نعرہ مار کر طبلہ و سارنگی اور قوالیوں سے دل بہلایا۔ اور اگر ایک طرف قوم کا سرمایہ عدالتوں اور کچہریوں کی نذر ہو رہا ہے تو دوسری طرف ان پیروں کی عیاشی اور بھانڈوں، قوالوں پہ دھڑا دھڑ خرچ ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلم قوم کو رب العالمین کی طرف سے دولت و سرمایہ اس لئے ملتا ہے کہ اس کو دینی، ملی اسلامی، مذہبی، قومی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے نہ کہ فردِ واحد کا پیٹ بھرا جائے۔ دینی اسلامی کام مدارسِ اسلامیہ کے بوا ممکن نہیں۔ جب تک قوم کا روپیہ علمائے کرام کو ملتا رہا۔ مدرسے پنپتے رہے اور مدارسِ اسلامیہ سے غزالی و رومی پیدا ہوتے رہے۔ لیکن مسلمانوں نے علماء کو ٹھکرا کر اپنے سرمایہ سے بھانڈوں، قوالوں اور وکیلوں اور سینماؤں اور دنیا بھر کے دنیا پرست پیروں کی جھولیاں بھرنی شروع کر دیں۔ تو علماءِ سوء اور ان پڑھ مقررین اور بغرض مسند واعظ کب چپ بیٹھنے والے تھے انھوں نے بھی تبلیغِ دین۔ وعظ و نصیحت جیسی عظیم سنتِ انبیاء و اولیاء کو تجارت کے معیار پر اپنایا۔ اُدھر عوام سامعین نے وعظ و نصیحت کو ڈرامائی رنگ میں چاہا۔ آج اسی مقرر کو پسند کیا جاتا ہے۔ جو اپنی تقریر کو بجائے قرآن و حدیث کے مسائل کے حکایات و لطائف و شعر و شاعری و خندہ آمیز گفتگو سے مزین کرے۔ آج وہی اسٹیج کامیاب و کامران ہے جس پر سینمائی رنگ ہو۔ اس واعظ کو خشک مُلّا کا لقب دے کر دُرکار دیا جاتا ہے۔ جو سلجھی سیدھی سادھی قرآن و حدیث کی باتیں کرے۔ جب سننے والے کو تبلیغِ دین اور عملی و علمی تقریر ناگوار ہے تو سنانے والے کس کو سنائیں گے جب محققین و مفسرین کو فضول چیز سمجھا جانے لگا تو کون آئندہ عالم محدث، مفسر بننے بنانے پر راغب ہوگا۔ اور اللہ اور رسول کے دین پر کون مخلص ہوگا۔ کون فی سبیل اللہ اس نعمتِ عظمٰی کے بار کو برداشت کرے گا۔ رائے ونڈ کا تبلیغی گروہ بھی اپنی تبلیغ میں مخلص نہیں۔ بلکہ یہ جہلاءِ زمانہ دین کے مسائل سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ تر مصنوعی دستِ غیب کی لالچ میں شامل ہوتے ہیں۔ غرضیکہ نہ سنانے والے مخلص ہوتے ہیں اور نہ سننے والے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ وہ مدرسے رہے۔ نہ جس میں رازی و عطّار پیدا ہوتے تھے۔ نہ پڑھنے والے۔ اب وہ چٹائیاں مفقود ہو چکی ہیں کہ جن پر سعدی و شیرازی کا مقام حاصل کیا جاتا تھا۔ وہ سجادے اُٹھ چکے جن پر بیٹھ کر جیلانی و ہجویری کا مقام حاصل تھا۔ ظاہراً مدرسے بھی خال خال نظر آجاتے ہیں۔ چٹائیاں بھی موجود ہیں پڑھنے والے بھی موجود ہیں شان و شوکت ظاہر۔ مگر عجز و انکسار مفقود رسمیں نمایاں خلوص و حقیقت ناپید۔ شعر ؂

؎ شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں ۔ بُت بھی اب دَیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

جہاں کبھی جامی و بُوعلی کا وردُود تھا۔ اب وہاں ہزل گو۔ اور ظریف بن کر نکل رہے ہیں۔ جو علماءِ دین سمجھے جاتے ہیں وُہ حجروں کی چٹائیاں سنبھال لپیٹ انکسار و تواضع چھوڑ مسجدوں کی صفیں لپیٹ، پنڈال اور پلیٹ فارم کی زینت بن گئے۔ جو صوفی و مشائخ کہے جاتے تھے۔ خانقاہوں سے نکل کر انھوں نے خود اپنے نقارے پر چوب لگانی شروع کر دی۔ دینی مدرسوں کے طلبہ استادوں کی جُوتیاں سیدھی کرنے کے بجائے سگے مطالبات کا بگل پھونکنے۔ یہاں تک زمانہ بدلا کہ بیویوں نے خاوندوں کی اولاد نے والدین کی خدمت چھوڑ تھیٹر و کلب، کا رُخ کیا اور مائیں بھی بچوں کو دایا اور آیا کے سپرد دفتروں میں جا پہنچیں اب وُہ خلوص و وفا کہاں ؟ مصرع :۔

اب وُہ پہلی سی صداقت میرے محبوب نہ مانگ

اب تو مُلّا و صوفی کے لباس میں تاجر ہی تاجر ہے۔ کیونکہ اُن کے طلب گار بھی خریدار بن گئے۔ نہ اِدھر خلوص نہ اُدھر وفا۔ نہ اِدھر للّٰہیت نہ اُدھر سچا پیار۔ شعر :۔

یا وفا از جہان شود معدُوم ۔ یا کسے در جہاں وفا نہ کرد !

جب یہ سب کچھ اپنا ہی بویا ہُوا ہے تو گلہ کس سے شکایت کس کی۔ آج جبکہ سب کچھ عزت آبرو وقار و سرداری، بزرگی و عقلمندی و دولت و سرمایہ ہی ہے۔ غریب آدمی نہ عالم، نہ عقل مند تو کون شخص ہے جو مدرسے کے ٹکڑوں پر ہی ساری عمر پڑھے۔ اور پڑھ کر بھی قوم کا مطعون بنے اور اپنی آنکھوں دیکھے کہ قوم کا سرمایہ و دولت عزت ان کو مل رہی ہے۔ جو بھانڈ، مراثی، قوال بنے۔ یا جو پیری کی گدی پر بلا استحقاق بیٹھے ہیں۔ یا وکلا، و ڈاکٹروں کو مل رہی ہے تو وہ خلوص و وفا کو اپنے سینے سے چمٹائے بھوکے پیاسے قریہ قریہ بستی بستی جاتے پھریں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے، کہ پیر بغیر وجہ کے ہر ماہ نذرانے لیتا ہے۔ اور چڑھاوے کھاتا ہے۔ ڈاکٹر و وکیل منہ مانگی قیمت وصول کریں تو کسی کو دکھ نہ ہو۔ بلکہ قوم میں زیادہ اُونچا مقام حاصل کرتا ہے۔ مگر زمانے بھر کا مقرر جس نے تبلیغ دین سے زیادہ آپ کو ہی راضی کرنا ہے۔ اور اللہ کی خوشنودی کی بجائے اہلِ جلسہ کو خوش کرنا ہے وُہ اگر اپنی مرضی سے قیمت طلب کرے تو فتویٰ طلب کیا جاتا ہے۔ اور حرام و حلال کا خیال آجاتا ہے اگر پہلے ہی انصاف کیا جاتا اور دولتِ امراء کو شریعت کے مطابق خرچ کیا جاتا تو آج ایسے ناسُور پیدا نہ ہوتے۔ نہ اللہ رسول کی باتیں بند ہوتیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :۔ ؎

علماء را زر بدہ تا دیگراں را علم بخوانند ۔ و زاہداں را چیزے مدہ تا از زہد باز نمانند

نہ زاہد را درم باید نہ دینار چوں بستند زاہدے دیگر بدست آر

پھر مزید افسوس اس بات کا ہے کہ معاشرے کی یہ ساری خرابیاں اہلِ سنّت والجماعت میں ہی دن بدن اُجاگر ہوتی جارہی ہیں۔ دوسرے اسلامی فرقے اس قدر منظم ہیں کہ اُن میں یہ خرابیاں سر نہیں اٹھاتیں سائل نے استفسار فرمایا ہے۔ کہ کیا اس کی روزی حلال ہے۔ تو اس کے جواب میں اتنی دراز وضاحت کے بعد کوئی شرعی فتویٰ تو حرمت کا جاری نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اخلاقی طور پہ اگر دورِ موجودہ میں پیروں کا چڑھاوا، ڈاکٹروں کی کمر توڑ اجرت، قوالوں کی فیس، حلال اور جائز ہے تو یہ مطالبانہ قیمت بھی جائز ہی متصور ہے۔ ہاں یہ ضرور کہنا پڑے گا۔ کہ عوام کے اس رویّے سے دو خرابیاں بہت بُری طرح ظہور میں آئیں۔ ایک یہ کہ مقررین و سامعین کے اخلاق پر گندا اثر پڑا۔ دوسری یہ کہ اہلِ سنّت کے سرمایہ سے اپنوں سے زیادہ غیروں نے فائدہ حاصل کیا۔ طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے چندوں کی بھیک مانگی گئی خاص طور پہ دیوبندی حضرات نے قوم سے سب حیلے استعمال کرکے سرمایہ کو لوٹا۔ کبھی سیاست کے لباس میں آگئے۔ تو کبھی یتیم خانہ کا بورڈ لگالیا۔ ان کی دیکھا دیکھی دیگر علماء کو بھی مانگنے اور مطالبے کی عادت پڑگئی۔ اس کے باوجود اب بھی بہت سے حق پرست علماء اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دُنیا کی ہر چیز سے کنارہ کش ہوکر درسی تصنیفی تبلیغی طور پہ خدمتِ دین میں ہمہ تن مشغول ہیں۔ زمانہ جانتا ہے۔ کہ ایک وقت اشرف علی تھانوی جیسے متعصب فی المسلک قوم اور فرقہ پرور بزرگ زمانے کے چکر سے مغلوب ہوکر آخیر زمانے میں دین کے کاموں سے علیحدہ ہوکر سیاست میں ملوث ہوگئے مگر اعلیٰ حضرت اور اُن کے مایۂ ناز معتقدین کے پایۂ استغناء میں تزلزل نہ ہُوا۔ جس دَور میں اغیار لوگوں نے علمی لبادہ اوڑھ کر چندہ گیری اور کاسہ لیسی کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس دَور میں اعلیٰ حضرت کا ایک شعر ہی اُن کی پوری زندگی کا خاکہ پیش کرتا ہے فرماتے ہیں کہ ؎

کروں مدح اہلِ دُوَل رضا پڑے اس بلا میں میری بلا ۔ میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں

ان خرابیوں کا علاج صرف یہی ہے کہ قوم باضمیر علماء پیدا کرے اور اپنی رقومات اور سرمایہ بجائے غلط مقام و فحاشی یا عیاشی پہ صرف کرنے کے مدارس و علماء پہ خود خرچ کرے۔ ہوسکتا ہے کہ رب تعالیٰ ہماری اخلاقی پستی کو دور فرمادے۔ آمین ثم آمین۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ؕ

نوٹ: یہ جو کچھ گفتگو ہوئی۔ معاشرے کی ان خرابیوں کے اسباب و علل بیان ہوئے۔ لیکن اس کا مؤثر علاج یہی ہے کہ معزز خاندان اور امراء کو دین کا علم پڑھاؤ۔ نہ دورانِ تعلیم بھیک منگواؤ۔ نہ بعد فراغت انکو ٹھکراؤ۔ بلکہ معزز عہدے اور مقام سے نوازو۔ انشاء اللہ تعالیٰ خود بخود یہ سب بیماریاں دور ہوجائینگی۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

پگڑی اور رشوت کی قسمیں اور ان کے لینے دینے کا بیان

سوال ۲۰۰: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ پاکستان کے بہت مہاجرین کے نام صرف مکان یا دوکان الاٹ ہیں۔ نہ وہ مالک ہیں نہ مرتہن۔ حکومت نے اُن کو تین سال کیلئے الاٹ کردیا ہے۔ پکا پیٹو نہیں دیا گیا۔ یہ مہاجرین دو دو ہزار روپیہ پگڑی لے کر دوسرے لوگوں کو دیدیتے ہیں۔ وُہ مہاجر بھی نہیں ہوتے۔ بعض پگڑی دینے والے مہاجرین بھی ہوتے ہیں۔ جب حکومت ان مکانات وغیرہ کو نیلام کرے گی۔ تو ان پگڑی دینے والے قابضین کو حکومت کی معیّن شدہ قیمت بھی مکمل دینی پڑے گی۔ اور اگر پہلے الاٹ کردہ قابضین اپنا قبضہ بھی رکھیں۔ پگڑی پر نہ دیں تو تین سال بعد یہ مکان متروکہ جائیداد کے ضمن میں حکومت نیلام کردے گی اور جو بھی حکومت کو روپیہ ادا کرے گا۔ وُہی مالک ہوگا۔ پھر بھی قبضہ لینے کے لئے پگڑی مانگتے ہیں۔ فرمایا جائے کہ قانونِ شرعی میں یہ پگڑی لینا دینا جائز ہے یا گناہ۔ اور اگر گناہ ہے تو کون سا گناہ ہے صغیرہ یا کبیرہ۔ میں جب ایک دفعہ گجرات میں آپ سے ملا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ رشوت لینا دینا سخت گناہ ہے مگر جب ظلم روکنے کیلئے ہو۔ تو دینے والا گنا ہگار نہ ہوگا۔ کیا پگڑی بھی رشوت میں شامل ہے۔ براہِ کرم جلد از جلد جواب ارسال فرمائیں بہت سے لوگ آپ کے فتوے کے منتظر ہیں۔

السائل: آپ کا خادم نیاز مند بشیر احمد ماھی ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ مورخہ ۱۰ $\frac{11}{60}$

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

دورِ حاضرہ کے مروجہ طریقہ کی تین صورتیں ہیں۔ جن میں سے ایک صورت ہر دو کے لئے جائز ہے۔ کسی طرف سے رشوت نہیں بنتی۔ اور دوسری دو صورتیں قطعاً رشوت ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ مالکِ مکان یا دکان خود قابض ہے۔ باسہولت بہت سکون سے رہائش یا کاروبار اس اپنی جگہ کر رہا ہے۔ کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ براہِ مہربانی اپنا یہ رہائش کا مکان مجھ کو کرایہ پر دے دو۔ یا اپنی دکان مجھ کو کرایہ پر دے دو۔ وُہ زمانے کے مطابق کرایہ بھی وصُول کرتا ہے۔ اور اس کے چھوڑنے کے لئے پگڑی طلب کرتا ہے اور ہر دو کی رضامندی کے مطابق لیتا ہے تو شرعی طور پر لینا دینا دونوں جائز ہیں۔ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے اس صورت کی دوسری شق اس طرح بھی ہوسکتی ہے ایک شخص بطور کرایہ دار کسی دُکان یا مکان پہ قابض ہے اور مالک کی رضا و رغبت کے ساتھ اس میں

رہائش یا کاروبار کر رہا ہے۔ کوئی تیسرا شخص اس کو کہتا ہے کہ یہ دکان مجھ کو دیدے۔ یا مکان میری رہائش کے لئے خالی کر دے۔ وہ کہتا ہے کہ میں مالک سے پوچھ لوں۔ مالک عاقل بالغ ہے۔ وہ اس کو اختیار یا اجازت دے دیتا ہے کہ تو اس شخص کو اس کاروبار کے لئے میری دکان دیدے۔ اور اس کو کرایہ دار بنا دے۔ اب وہ آ کر کہتا ہے کہ مالک نے مجھ کو اجازت دے دی لہٰذا اتنا روپیہ لاؤ تو میں دکان یا مکان خالی کر دیتا ہوں۔ وہ شخص مقررہ برضامندی پگڑی دے دیتا ہے۔ شرعاً یہ صورت بھی جائز ہوگی۔ رشوت نہ بنے گی۔ کہ دراصل یہ بھی مالک نے ہی دلوائی۔ قانونِ اسلامیہ میں مالک کیلئے ایسی پگڑی لینی یا دلوانی جائز ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی کرایہ دار مالک کی اجازت کے بغیر کسی تیسرے شخص کو پگڑی لے کر دکان یا مکان اس کے حوالے کر دے۔ یہ صورت قطعاً حرام ہے اور پگڑی لینے اور دینے والے دونوں شرعی اور قانونی مجرم ہیں۔ یہ دنیا کے دوسرے ظلموں کی طرح ایک ظلم۔ یہ پگڑی رشوت ہوگی۔ اور رشوت جب ظلم کیلئے لی دی جائے تو دونوں کیلئے حرام چنانچہ ترمذی شریف جلد اوّل صہ ۱۵۹ پر ہے۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اَلرَّاشِیَ وَالْمُرْتَشِیَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ ۔ ترجمہ:۔ عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے۔ فرمایا انھوں نے کہ آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت فرمائی۔ یعنی حکم میں دونوں برابر ہیں۔ لیکن وہ رشوت جو اپنا حق لینے اور ظلم سے بچنے کے لئے ہو۔ وہ دینے والا تو گنہگار نہ ہوگا۔ مگر لینے والا بدترین گنہگار ہوگا۔ اور یہ روزی اس کے لئے حرام ہوگی۔ دینے والا ملعون نہ ہوگا بلکہ مجبور کے درجے میں ہوگا۔ چنانچہ ترمذی شریف اسی حدیث کا حاشیہ ۶ صفحہ نمبر ۱۵۹ پر ہے:۔ فَاَمَّا اِذَا اَعْطٰی لِیَتَوَصَّلَ بِہٖ اِلٰی حَقٍّ اَوْ لِیَدْفَعَ بِہٖ عَنْ نَفْسِہٖ مَضَرَّۃً فَاِنَّہٗ غَیْرُ دَاخِلٍ فِیْ ھٰذَا الْوَعِیْدِ ۔ ترجمہ:۔ پس لیکن جب رشوت دی۔ تاکہ اس کے ذریعے اپنے حق کو حاصل کرے یا اپنے آپ کو ظالم سے بچائے۔ تو وہ لعنت والی وعید میں داخل نہیں۔ اور فتاوٰی درمختار جلد چہارم صفحہ ۴۲۱ پر ہے:۔ اَلرَّابِعُ مَا یُدْفَعُ لِدَفْعِ الْخَوْفِ مِنَ الْمَدْفُوْعِ اِلَیْہِ عَلٰی نَفْسِہٖ اَوْ مَالِہٖ حَلَالٌ لِلدَّافِعِ حَرَامٌ عَلَی الْاٰخِذِ ۔ (ترجمہ) یعنی رشوت کی چار قسموں میں سے چوتھی قسم یہ ہے کہ ظلم کو روکنے یا اپنے مال کو لینے کے لئے دی جائے تو دینے والے کے لئے حلال ہے لینے والے پر حرام۔ پس ثابت ہوا کہ رشوت لینا ہر طرح حرام ہے۔ پگڑی لینے کی تیسری صورت وہی ہے جو سائل کے سوال میں ہے۔ اس کی دو شقیں ہیں۔

ل :۔ یہ کہ پگڑی لینے والا اور مکان یا دُکان کا قبضہ دوسرے شخص کو دینے والا اس وقت دے رہا ہے جب ابھی الاٹ کی مدت میں تین سال باقی ہیں۔ اور وُہ اپنا حق چھوڑ رہا ہے تب پگڑی جائز ہے رشوت نہ بنے گی۔ کیونکہ وہ اپنا حق بیچ رہا ہے اور حق کی بیع جائز ہے۔ حق خواہ کسی شکل میں ہو۔ لیکن مُدت تین سال پُوری کرنے کے بعد پھر خالی کرنے کے لئے پگڑی لیتا ہے تو یہ رشوت ہے۔ کیونکہ ظلم ہے۔ لینے والے کے لئے وہ روزی حرام ہوگی۔ اگر دینے والا مجبُور ہے تو اس کا پگڑی دینا فقط اُس کے لئے جُرم نہ ہوگا۔ اگر دینے پر مجبور نہیں۔ صرف حرص دُنیا ہے تو یہ دینے والا بھی مُجرم وملعون ہے کہ بلا وجہ رشوت دے رہا ہے۔ ۲ :۔ اسی طرح کوئی شخص ناجائز قابض ہے۔ بغیر الاٹ کے۔ تو اُس کا پگڑی لینا بھی بہر حال حرام ہے۔ اور یہ حرمت گناہ صغیرہ نہیں۔ بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ؕ

کتاب

قبرستان کے درختوں کی قیمت سکول میں دینے کا حکم

سوال ۳۲؎ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں۔ کہ ایک میدان سفیدہ زمین کا کچھ زمانہ قبل علاقے کی قبروں کے لئے وقف کیا گیا۔ اب گاؤں والوں نے اس میں لگے ہوئے درخت ایک ہزار روپیہ میں فروخت کر دیئے۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ یہ رقم اسکول میں صرف کی جائے۔ کچھ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم آپ سے شریعت کا فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ ہم کو فرمایا جائے کہ قانون شریعت میں کیا حکم ہے۔ کیا اسکول میں یہ رقم لگانی جائز ہے یا نہیں؟ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ؕ

سائل :۔ محمد ولایت ولد لال خاں ساکن نلائیں۔ ڈاک خانہ موناغربی۔ تھانہ دینہ ضلع جہلم ۹/۴۸ ۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ ؕ

اَلجواب

قانونِ شریعت کے مطابق قبرستان کے درختوں کی چار صُورتیں ہیں :۔ پہلی دو صورتوں میں وُہ درخت بھی زمین کی طرح وقف ہوں گے۔ اور وُہ درخت یا اُن کی قیمت صرف قبرستان کی ضروریات میں ہی خرچ ہو سکتے ہیں۔ کسی ادارے میں خاص طور پر انگریزی سکول وکالج جہاں بجز شیطانیت کے کچھ نہیں سکھایا جاتا۔ یہ رقم خرچ کرنا حرام ہے کیونکہ تبدیلیٔ وقف ہے فقہاءِ اسلامی فرماتے ہیں۔ کہ ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد میں خرچ کرنا یا لے جانا بغیر معاوضہ بھی جائز نہیں :۔

پہلی صُورت :۔ یہ ہے کہ جنگل کا کچھ حصہ مسلمانوں نے قبرستان کے لئے مقرر کرلیا۔ اور

میدان کسی فردِ واحد کی ملکیت نہ تھا۔ پُرانا قبرستان ہے۔ مالک کا پتہ ہی نہیں۔ کہ کون تھا۔ اُس کے سب درخت شرعی وقف ہوں گے اور قبرستان کے حدود کی زمین بھی وقف ہوگی۔ **دُوسری صُورت**:۔ یہ ہے کہ کسی شخص نے زمین وقف کردی اُس وقت اُس میں کوئی درخت نہ تھا۔ بعد میں خود رَو درخت بغیر کسی کی محنت کئے اُگے۔ وُہ درخت بھی وقف للّٰہ ہوں گے۔ سوائے قبرستان جنازہ گاہ وغیرہ کے صرف نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کی قیمت بوجہ وقف قبرستان کی ضروریات میں خرچ ہو سکتی ہیں تمام فقہاء کرام اسی طرح فرماتے ہیں۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر ۴۷۲ یہ ہے۔ اِذْ كَانَتْ مَوَاتًا لَا مَالِكَ لَهَا وَاتَّخَذَهَا اَهْلُ الْقَرْيَةِ مَقْبَرَةً (الخ) وَفِي الْقِسْمِ الثَّانِي الْاَشْجَارُ بِاَصْلِهَا عَلٰى حَالِهَا الْقَدِيْمِ ؕ (ترجمہ) یا زمین بے آباد پڑی ہو۔ اُس کا کوئی مالک معلوم نہ ہو سکے بستی والے اُس کو قبرستان بنالیں۔ تو اس دوسری قسم میں اس زمین کے تمام خود رَو درخت اپنی جڑوں کے ساتھ زمین کے حال پر باعتبار پرانا ہونے کے وقف ہوں گے۔ یہ تو تھی پہلی صُورت۔ دُوسری اس طرح مذکور ہے:۔ وَفِي وَجْهِ الثَّانِي اَلْمَسْأَلَةُ عَلٰى قِسْمَيْنِ اِمَّا اِنْ عُلِمَ لَهَا غَارِسٌ اَوْ لَمْ يُعْلَمْ فَفِي الْقِسْمِ الْاَوَّلِ كَانَتْ لِلْغَارِسِ وَفِي الْقِسْمِ الثَّانِي اَلْحُكْمُ فِي ذٰلِكَ اِلَى الْقَاضِي اِنْ رَاٰى بَيْعَهَا وَصَرْفَ ثَمَنِهَا اِلٰى عِمَارَةِ الْمَقْبَرَةِ فَلَهُ ذٰلِكَ ؕ (ترجمہ) دوسری صورت یہ ہے۔ کہ جب قبرستان کے لئے وقف زمین ہُوا تو اس وقت کوئی درخت اُس میں نہ تھا۔ بعد میں اُگے اس صورت کی دو قسمیں ہیں:۔ ۱: ایک یہ کہ درخت اگانے والا موجود ہو۔ تب بھی وہ سب درخت اُس کے ہوں گے۔ ۲:۔ دُوسری قسم یہ کہ درخت لگانے والا مجہول لاپتہ ہو یعنی درخت خود اُگے ہوں تو اس صورت میں قبرستان کے درختوں کے بارے میں حاکم وقت، قاضی اسلام یا مفتیٔ دین کے فتوے پر عمل جاری ہوگا۔ اگر اس کی رائے یا حکم اور فتویٰ یہ ہو کہ درختوں کو بیچ کر اس کی رقم قبرستان کی تعمیر پر ہی خرچ کی جائے تو جائز ہے۔ بہر حال ان دو صورتوں میں درختوں کی قیمت قبرستان پر ہی خرچ ہو سکتی ہے۔ **تیسری صورت**:۔ یہ کہ مالک زمین صرف زمین قبرستان کے لئے وقف کرتا ہے اُس میں درخت اُگے ہُوئے ہیں۔ وہ شخص بوقت توقیف درختوں کا نام نہیں لیتا۔ تو قانونِ شریعت کے مطابق صرف زمین وقف۔ درخت وقف نہ ہوں گے۔ وُہ مالک کی ملکیت میں رہیں گے۔ کوئی دوسرا شخص نہ اُس کو بیچ سکتا ہے نہ کٹوا سکتا ہے۔ نہ اُس کی قیمت کسی اور جگہ خرچ کرسکتا ہے۔ مالک کو پورا پورا اختیار ہے کہ ان درختوں کو جو چاہے کرے

اُس کی قیمت خود برتے یا اسکول وغیرہ کو دے۔ کہ یہ اُس کی ملکیت تام ہے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر ۴۷۳ پر ہے:۔ فَفِی الْقِسْمِ الْاَوَّلِ اَلْاَشْجَارُ بِاَصْلِهَا عَلٰی مِلْكِ رَبِّ الْاَرْضِ يَصْنَعُ بِالْاَشْجَارِ وَاَصْلِهَا مَا شَاءَ ۔ ترجمہ:۔ ترتیب ہندیہ کے اعتبار سے پہلی قسم میں قبرستان کے تمام درخت اپنی جڑوں کے ساتھ واقف کی ملکیت پر ہوں گے۔ جو چاہے اِن درختوں یا اُن کی قیمت کا کرے۔ **چوتھی قسم**:۔ یہ ہے کہ زمین کسی اور کی تھی۔ اُس نے وقف کی۔ بعد میں کسی نے خود اُس میں درخت لگائے۔ تو شرعاً وہ درخت اُس لگانے والے کے ہوں گے۔ جیسے کہ ابھی فتاوٰی عالمگیری سے ثابت کر دیا۔ **خلاصہ** یہ کہ بقاعدۂ قانونِ اسلامی کسی صورت میں بستی والوں کو جائز نہیں کہ قبرستان کے درخت، یا اُن کی قیمت سکول وغیرہ پر صرف کریں۔ پہلی دو صورتوں میں تو وہ وقف شرعی ہیں۔ اِس لئے وہیں قبرستان میں خرچ کئے جا سکتے ہیں۔ دُوسری دو صورتوں میں وہ سب درخت فردِ واحد کی ملکیت ہیں۔ وُہ ہی قانوناً کہیں خرچ کر سکتا ہے۔ بستی والوں کو پھر بھی کچھ اختیارِ تصرّف نہیں۔ سوالِ مذکورہ میں یہ چار صُورتیں اس لئے بیان کی گئیں کہ مُستفتی کا اِستفتاء بذریعہ ڈاک وصول ہُوا۔ بریں بنا تحقیق وتفتیش نہ کی جا سکی۔ اور نہ ہی حتمی فیصلہ کیا جا سکا۔ لہٰذا اب مُستفتی و لواحقین کا خود اپنا کام ہے کہ تحقیق کریں۔ اور ہر چہار میں سے جو صورت ثابت ہو اُس پر عمل کریں۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ۔

کتبہٗ

کِتَابُ الْاِجَارَہ

مسجد کی دُکان بینک کو کرایہ پر دینے کا بیان

سوال ۲۷ے کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے محلہ کی مسجد کیلئے چند دکانیں بنائی گئیں۔ تاکہ اُن کے کرائے کی آمدنی سے مسجد کے اخراجات چل سکیں۔ اِس جگہ دیگر دکاندار کرائے پر لینے کیلئے تیار نہیں۔ اِس لئے کہ وہ اکثر خالی رہتی ہیں۔ نیشنل بینک آف پاکستان مسجد کی دکانوں کو کرائے پر لینا چاہتا ہے لہٰذا ہم منتظمین مسجد شریعت کے مطابق اجازت طلب کر رہے ہیں کہ کیا ہم مسجد کی دکانیں پاکستان کے کسی بینک یا اسی بینک کو دے سکتے ہیں؟ جبکہ بینکوں میں سُودی کاروبار بھی ہوتے ہیں۔ اور کیا شرعاً ان کا کرایہ لینا جائز ہے یا نہیں۔ اور کیا یہ کرایہ مسجد کی ضرورت پر خرچ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ براہِ مہربانی

ہمیں جلدی شرعی فتویٰ ارسال فرمائیے۔

السائل :- ابوالضیاء فقیر محمد حنیف خطیب عیدگاہ ڈنگہ ضلع گجرات۔

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق موجودہ بنکوں کو مسلمانوں کی دکان یا مسجد کی دکان کرایہ پر دینی اسلیئے جائز ہے کہ پاکستانی بنکوں میں سود کے علاوہ اور جائز بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان صرف سودی کاروبار یا شراب، خنزیر وغیرہ حرام کاروبار کے لئے ہی دکان کرائے پر لیتا ہے۔ یا فحش حرام کے لئے ہی جیسے رنڈی عورتیں زنا کاری کے لئے کرایہ پر دکان لیں۔ تو کسی مسلمان کو جائز نہیں ہے کہ ایسے کاروبار والے کو دکان کرایہ پر دے اور نہ ایسا کرایہ کھانا جائز ہے۔ کیونکہ قانون اسلامیہ میں ہر وہ کاروبار جو صرف اسلام میں حرام ہے۔ وہ کسی مسلمان کے لیئے جائز نہیں۔ اور ہر وہ کاروبار جو تمام دینوں میں حرام ہے۔ وہ کاروبار کسی کے لئے بھی جائز نہیں۔ مثلاً فحاشی زنا وغیرہ، سودی کاروبار اور شراب اور خنزیر کا کاروبار سامان مسلمان کے لئے تو حرام ہے کافر کے لئے نہیں۔ لہٰذا صرف سودی یا صرف شراب وغیرہ حرام کاروبار کے لئے مسلمان کو دکان دینی جائز نہیں۔ اور کافر کو دینی جائز ہے۔ کیونکہ وہ کافر کے نزدیک کاروبار حرام ہی نہیں۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد چہارم صفحہ نمبر ۴۴۹ پر ہے: اِذَا اسْتَأْجَرَ الذِّمِّيُّ مِنَ الْمُسْلِمِ بَيْتًا لِيَبِيعَ فِيهِ الْخَمْرَ جَازَ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ ؓ یعنی اگر کوئی ذمی کافر مسلمان سے صرف اس لئے دکان کرائے پر لیتا ہے کہ اُس میں شراب بیچے۔ تو جائز ہے کہ مسلمان اُسے کرائے پر دے دے۔ اور یہ کرایہ اُسکے لئے حرام نہ ہوگا۔ بلکہ جائز ہوگا۔ اور شراب و خنزیر اسلامی فقہ اور حدیث رسول کریم کے مطابق کافر کیلئے ایسا ہی ہے۔ جیسے سرکہ اور بکری مگر یہی کاروبار مسلمان کے لئے بالکل حرام ہیں۔ اور جب مالک دکان کو معلوم ہو کہ کرایہ پر لینے والا محض صرف سودی کاروبار یا شراب کے لئے لے رہا ہے۔ تو ہرگز ہرگز اس کو دکان کرائے پر نہ دے لیکن اگر وہ شخص کرائے پر لیتے وقت یہ نہیں بتاتا کہ میں کس لئے لے رہا ہوں تو دکان کرایہ پر دینی جائز ہے۔ اور مالک کے لئے جائز اور حرام کاروبار کی چھان بین کرنا واجب اور ضروری نہیں۔ اسی طرح اگر کرائے پر لیتے وقت کسی جائز کاروبار کا نام لیا اور بعد میں حرام کام شروع کر دیا۔ تب بھی مالک کے لئے اس کا کرایہ حلال رہے گا۔ اور اُس کے لئے خالی کرانا ضروری نہیں ہے۔ عذاب کا مستحق خود کرایہ دار اور کاروباری شخص ہے۔ نہ کہ مالکِ دکان۔

اسی طرح قانونِ شرعی کے مطابق اگر کوئی کرائے پر لینے والا حرام اور حلال دونوں کاروبار کرتا ہے۔ اور مالکِ دکان کو معلوم ہے۔ تب بھی کرایہ پر دینا جائز ہے۔ اور نیت حلال پر جاری ہوگی جس طرح کہ انگریزی دوائیوں کی دکان اس میں دیگر حلال دوائیوں کے علاوہ شراب، برانڈی وغیرہ حرام چیزیں بھی فروخت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بینکوں کو بھی کرائے پر دینا جائز ہے۔ کیونکہ ان میں بھی حلال اور حرام دونوں کام ہوتے ہیں۔ اُن کا کرایہ حلال ہے۔ اسی طرح فقہاء کرام نے ہر کرائے دار کے لئے یہ شرط نہیں لگائی کہ وہ کرائے پر لیتے وقت یہ بتائے کہ میں نے کیا کام کرنا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد پنجم صفحہ نمبر ۳۴ پر ہے۔ تَصِحُّ اِجَارَةُ حَانُوْتٍ وَدَارٍ بِلَا بَيَانِ مَا يَعْمَلُ فِيْهَا ؕ ہاں فحش کام جیسے زنا وغیرہ کے لئے مسلمان یا کافر کسی شخص کو دکان کرائے پر دینا جائز نہیں اور اس کام کا کرایہ حرام ہوگا جب کہ کرائے پر دینے والے کو پہلے پتہ لگ جائے۔ بعد میں پتہ لگنا کرایہ کو حرام نہیں کرے گا۔ **خلاصہ** یہ کہ ہر مسلمان بینکوں کو اپنی یا مسجد کی دکان کرائے پر دے سکتا ہے۔ اور اس کا کرایہ ہر جائز کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بینک کا سودی کاروبار خود بینک کے مالک اور عملے کو گنہ بگار اور جہنمی بنائے گا۔ نہ کہ مالکِ دکان کو۔ ہاں اگر کسی جگہ مسلمان کے معاشرے کے خراب ہونے کا خطرہ ہے تو مخلوط کاروبار اور کافر کو بھی شرعی حرام کاروبار کے لئے نہ دی جائے۔ کیونکہ مسلمانوں کو بھی حرام کام سے بچانا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ؕ

کتبہ

کتابُ الشّہادت

خاوند نے طلاق کا دعویٰ کیا اور فاسق گواہ پیش کیے اسکا حکم

سوال ۵: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے طلاق کا دعویٰ کیا جس کے گواہ بھی ۲ عدد پیش ہوئے۔ مگر گواہ فاسق و فاجر تھے۔ اس لئے عدالت نے حکم فرمایا۔ کہ مفتی اسلام سے فتویٰ شرعی لیکر عدالت میں پیش کرو۔ اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ چنانچہ مدعا علیہ احمد علی اور اس کی دختر ہندہ بی بی نے ایک اہلِ سنت مفتی اور عالم صاحب سے شرعی فتویٰ حاصل کیا۔ مفتی صاحب نے حق العبد سمجھتے ہوئے پوری تحقیق سے چھان بین کرکے۔ شریعت کے مطابق فتویٰ جاری فرمایا۔ جس میں ثابت کیا کہ یہ گواہی معتبر نہیں اور اس گواہی کی بنا پر دعویٰ طلاق ثابت نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مذکورہ میں طلاق واقع نہ ہوئی۔ اس کی نقل مدعی نے ایک مولوی دیوبندی دہابی کو دکھائی تو

اُس نے اُس کے خلاف فتویٰ دے دیا۔ گواہوں کی حالت یہ ہے کہ تمام عمر کبھی نماز نہ پڑھی۔ روزہ نہ رکھا۔ جھوٹ، چوری، خیانت، جیسے گناہ کبیرہ ہر انسان حیوان کو گالی گلوچ۔ رات دن فاسق لوگوں کی مجلس میں رہتے ہیں۔ پوری طرح کلمہ طیبہ بھی نہیں آتا۔ تاریخ پر عدالت میں دو طرفہ سے فتویٰ پیش ہو گئے۔ جج صاحب نے دونوں فتوے رد کر دیئے۔ اور دونوں کو حکم دیا کہ دونوں صاحب مدعی اور مدعا علیہ گجرات سے فتویٰ منگواؤ۔ تب فیصلہ ہوگا۔ لہٰذا باتفاق ہر دو فریق حاضر خدمت ہیں۔ جو بھی فتویٰ جاری کیا جائے۔ عین مہربانی ہوگی۔ یہ مقدمہ گوجرانوالہ ضلع کچہری میں شروع ہے جلد از جلد فتویٰ عطا فرمایا جائے۔ بہت کرم نوازی۔ آپ کا یہ فتویٰ عدالت میں پیش کرنا ہے۔

السائل:۔ مدعی اکرم لغاری ریل بازار گوجرانوالہ شہر۔ دستخط۔ دستخط مدعا علیہ:۔ احمد علی گوجرانوالہ شہر

بعون العلام الوھاب مرحبا ۲

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق صورتِ مسئولہ میں طلاق ثابت نہیں ہوتی۔ اور شرعی طور پر طلاق کا دعوٰے کرنے والا خاوند بدستور شرعی خاوند ہے اور مدعا علیہا عورت اُس کی جائز بیوی اور اپنے حقوقِ زوجیت کی حقدار ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اقرارِ طلاق اور دعوٰیِ طلاق میں کئی طرح فرق ہیں۔ اگر طلاق نہ دی ہو اور کوئی شخص خاوند سے کہے کہ تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ خاوند کہہ دے کر دی ہے۔ تو فوراً طلاق واقع ہو جاتی ہے اور اُس اقرار کے الفاظ ادا ہوتے ہی بیوی مطلقہ ہو کر معتدہ شمار ہوتی ہے۔ مگر دعوٰے طلاق میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دعوٰی طلاق میں خاوند مدعی ہوتا ہے اور اقرار طلاق میں بسا اوقات مدعیٰ علیہ ہوتا ہے۔ مدعی کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہاں اقرار کا حکم جاری نہیں کیا جا سکتا۔ اقرار طلاق میں گواہی کی حاجت نہیں۔ بغیر شہادت ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ مگر دعوٰیِ طلاق دیگر دعووں کی طرح ہے کہ وہاں شرعی معیار کے مطابق گواہی شرط ہے۔ اگر گواہوں میں شرعی نقائص ہوں گے تو طلاق ثابت نہیں ہوگی۔ اقرارِ طلاق میں طلاق فوری واقع ہوتی ہے۔ مگر دعوٰی طلاق میں سابقہ طلاق ثابت ہوتی ہے۔ دیوبندی مفتی صاحب نے جو اس وقت اپنے مسلک کے کسی مدرسے میں منصب افتاء پر فائز ہیں۔ یہ فرق ملحوظ نہ رکھے۔ اور دعوٰی طلاق کو اقرارِ طلاق کا درجہ دے کر وقوع طلاق کا حکم جاری کر دیا۔ یہ محض اُن کی جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ بہر صورت سوالِ مذکورہ میں ہرگز ہرگز طلاق ثابت نہیں ہوتی۔ خیال رہے کہ جس طرح اقرار اور دعوٰی میں مندرجہ بالا چند طرح فرق ہیں۔ اسی طرح وقوعِ طلاق اور ثبوتِ طلاق میں بھی فرق ہے۔ کیونکہ ثبوت زمانۂ ماضی سے متعلق ہے اور وقوع

زمانۂ حال سے۔ چونکہ سوال مذکورہ میں دعویٰ طلاق کا ذکر ہے۔ اس لئے بغیر شرعی نوعیت کی گواہی کے ثبوتِ طلاق نہیں ہو سکتا۔ شریعتِ مطہرہ میں آٹھ شخصوں کی گواہی عدالت میں معتبر نہیں ہو سکتی۔ ۱ گونگا بہرہ۔ ۲ جو موقع واردات پر نابینا تھا۔ ۳ نابالغ بچہ ۴ جو موقع پر دیوانہ تھا اگرچہ اب دیوانہ نہ ہو ۵ دو مردوں کی بجائے صرف ایک عورت گواہی دے۔ ہرگز معتبر نہیں۔ ۶ وہ شخص جو ادائے شہادت کے وقت قیدی ہو۔ ۷ مدعی کا نوکر، باپ، بیٹا یا قریبی رشتہ دار جب کہ حق میں گواہی دے تو معتبر نہیں۔ اسی طرح جو شخص غلام یا لونڈی ہو۔ وہ مطلق گواہی نہیں دے سکتے لیکن اب اُن کا زمانہ ہی نہیں۔ اس لیئے اس کو علیحدہ نمبر دینا کچھ ضروری نہیں ۸ فاسق فاجر (از عالمگیری جلد سوم ص۴۶۶) فاسق فاجر جس کو فاسق معلن کہا جاتا ہے۔ وہ شخص ہے جو ظاہر ظہور گناہ کرتا ہو۔ اور لوگوں میں گنہگار مشہور ہو۔ تمام علماءِ اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ فاجر کی گواہی معتبر نہیں۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد سوم ص۴۶۶ پر ہے۔ اِتَّفَقُوْا عَلٰی اَنَّ الْاِعْلَانَ بِکَبِیْرَۃٍ تَمْنَعُ الشَّھَادَۃَ وَفِی الصَّغَائِرِ اِنْ کَانَ مُعْلِنًا بِنَوْعٍ فِسْقٍ مُسْتَشْنَعٍ یُسَمِّیْہِ النَّاسُ بِذٰلِکَ فَاسِقًا مُطْلَقًا لَا تُقْبَلُ شَھَادَتُہٗ۔ ترجمہ:۔ تمام فقہاءِ کرام وعلمائے عظام کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ وہ گناہ جن کو کبیرہ کہا جاتا ہے وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ قبولیتِ گواہی کو روک دیتے ہیں۔ اور صغیرہ گناہ اگر ظاہر ہوں اور لوگ ایسے شخص کو فاسق کہتے ہوں تو اس کی گواہی بھی قبول نہیں ہوگی۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ فاسق کی گواہی شریعت میں قبول نہیں۔ اس لیئے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر سے نہیں ڈرتا۔ اور ہر وقت علی الاعلان گناہ کرتا رہتا ہے کہ تو وہ کسی مفتی یا قاضی یا جج سے کیا ڈرے گا۔ اور جھوٹی گواہی پر اس کو کیا عار ہوگا۔ لہٰذا فتویٰ شرعی جاری کیا جاتا ہے کہ صورتِ مذکورہ میں ہرگز طلاق ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ گواہوں کی جو علامات سوال میں درج ہیں وہ واضح طور پہ ان کے گناہ اور فسق کو ثابت وظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ شریعتِ پاک میں گناہ کبیرہ بہت قسم کا ہے۔ جن میں سے ۱۔ آوارگی ۲ بے نمازی ہونا ۳ بازاری بن جانا ۴ عام گالی گلوچ کرنا وغیرہ بھی سخت ترین فسق اور گناہ ہیں۔ اور یہ سب گناہ مذکورہ گواہوں میں موجود ہیں۔ لہٰذا ان کی گواہی شرعاً معتبر نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری جلد سوم کتاب الشہادت ص۴۶۶ پر ہے۔ کہ کُلُّ فَرْضٍ لَہٗ وَقْتٌ مُعَیَّنٌ کَالصَّلٰوۃِ وَالصَّوْمِ اِذَا اَخَّرَ مِنْ غَیْرِ عُذْرٍ سَقَطَتْ عَدَالَتُہٗ۔ ترجمہ:۔ جو شخص فرض نماز یا روزہ بغیر عذر کے جان کر دیر سے قضا کرکے پڑھے۔ تو بھی اس کا عادل ہونا ختم ہو گیا۔ یعنی ایسے نمازی کی بھی گواہی معتبر نہیں۔ اس عبارت کی شدت سے گواہی کی

نزاکت کا بخوبی پتہ لگ جاتا ہے۔ اور اسلامی قوانین کسی خاص قوم یا وقت کے لئے نہیں۔ کہ ان کو کوئی زمانہ قابل اعتنا نہ سمجھا جائے۔ بلکہ یہ عالمگیر قانون تاقیامت جاری اور غالب رہنے کے لئے آیا ہے۔ اس لئے آج گئے گزرے دور میں بھی ایک مفتیٔ اسلام یہی فتویٰ جاری کرے گا۔ کہ ہرگز ہرگز ایسے فاسقوں کی گواہی معتبر نہیں۔ اور ایسی گواہی کی صورت میں مدعی کا دعوی غلط ہے۔ طلاق ثابت نہیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ؕ

غلط گواہی سے وصیت نامے کا اجرا نہ ہوسکنے کا بیان

سوال ۸۷: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کے مرنے کے دو دن بعد اس کے وارثین نے اس کی طرف سے چھ ماہ پیشتر کا ایک وصیت نامہ ظاہر کیا ہے۔ وصیت نامہ کے الفاظ یہ ہیں:۔ کہ میں مسمّی فرید ولد خالد بقائمی ہوش وحواس مندرجہ ذیل وصیتیں کرتا ہوں:۔ **پہلی** یہ کہ بیس سال پہلے میں نے اپنی بیوی زینب کو طلاق دے دی تھی۔ لہٰذا اس کو میری میراث نہ دی جائے۔ **دوسری** وصیت یہ کہ میری دوسری بیوی ھنا کا کو حق مہر کے بدلے میں ایک سو کنال زمین دی جائے جو حصۂ میراث میں شامل نہ ہوگی۔ **تیسری** وصیت یہ ہے کہ میرے پوتے بکر کو کل مال کا تیسرا حصہ دیا جائے۔ **چوتھی** وصیت یہ ہے کہ میرا بڑا لڑکا میرا جانشین ہوگا۔ اور تمام خاندانی امور کا ناظم ہوگا۔ **پانچویں** وصیت یہ ہے کہ میری بقیہ جائیداد شریعت کے مطابق تمام وارثوں میں تقسیم کردی جائے۔ اس وصیت نامہ کو عام سادے کاغذ پر تحریر کیا گیا ہے۔ نیچے دو ایسے گواہوں کے دستخط ہیں۔ جو ساری عمر داڑھی منڈاتے رہتے ہیں۔ نہ نماز اور نہ روزہ۔ اس وصیت نامہ کو اس کی زندگی میں ظاہر نہ کیا گیا۔ نہ زینب کو طلاق کے متعلق کبھی خود خاوند نے آگاہ کیا۔ نہ کسی اور نے۔ اس وصیت نامے پر اس کے مرنے کے دن سے چھ ماہ پہلے کی تاریخ لکھی ہے۔ ہم لوگوں کو آخر تک بالکل اشارۃً کنایۃً بھی علم نہ ہوسکا۔ فرمایا جائے کہ کیا شریعت مطہرہ کے مطابق یہ وصیت نامہ درست ہے۔ اور بیوی زینب کو میراث نہ ملے گی۔ ہمیں شرعی فتویٰ دیا جائے۔ کیونکہ اس سے بہت وارثوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا ؕ

السائل:۔ نوردین بھاگڑ یانوالہ ضلع جہلم۔ پاکستان مورخہ ۱۹۷۱/۱/

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ ؕ

سوالِ مذکورہ میں جہاں تک الفاظ و عبارت کا تعلق ہے۔ وصیت نامہ بالکل درست ہے صرف دوسری بیوی کے مہر کے لئے جو فوت شدہ نے سو کنال زمین مقرر کی ہے۔ وہ قابلِ غور ہے۔ اگر مہر اتنا ہی ہے جس سے اب موجودہ وقت میں سو کنال زمین خریدی جاسکتی ہے یا سو کنال ہی مہر مقرر کیا تھا۔ تب تو ٹھیک ہے لیکن اگر مہر اتنا نہیں بنتا۔ تو یہ وصیت غلط ہے۔ لہٰذا اولاً ثابت کیا جائے کہ مہر کتنا تھا۔ اور زندگی میں ادا ہوا یا نہیں۔ باقی وصیتیں اپنے اپنے مقام پہ درست اور قابلِ اجراء ہیں۔ مگر وصیت نامہ کو ثابت کرنے کے لئے کم از کم دو عدد متقی، پرہیزگار، غیر وارث گواہ اشد ضروری ہیں۔ جن دو گواہوں کی گواہی کا ذکر سوال نامے میں کیا گیا ہے وہ از روئے عبارتِ سوال فاسق و فاجر ہیں۔ اور شریعت میں فاسق و فاجر کی گواہی معتبر نہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم فرماتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ (سورۃ مائدہ آیت نمبر ۱۰۶) (ترجمہ) اے ایمان والو! جب تم میں سے کوئی کسی کو موت آنے لگے۔ تو وصیت کرتے وقت دو گواہوں اپنے قریبیوں سے متقی پرہیزگار کی گواہی معین کرلے۔ وہ گواہی لازم ہے تمہارے درمیان۔ اس آیتِ کریمہ سے ثابت ہوا۔ کہ دونوں گواہ متقی ہوں۔ فاسق گناہگار نہ ہوں۔ حدیث میں بھی ایسی ہی گواہی سے روکا گیا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۳۲۸ پر ہے۔ عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا۔ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ لَا یَجُوْزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَّلَا خَائِنَةٍ وَّلَا مَجْلُوْدٍ حَدًّا (الخ، رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ) (ترجمہ) اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ کہ فرمایا آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے نہیں جائز ہے خیانت کرنے والے مرد اور خائنہ عورت کی گواہی اور نہ کسی حدِ شرعی میں کوڑے کھانے والے کی گواہی۔ اور خائن اور خائنہ سے مراد فاسق فاجر گناہگار ہے چنانچہ اشعۃ اللمعات جلد سوم ص۲۴۷ پر۔ اور مرقات شرح مشکوٰۃ جلد چہارم ص۱۶۳ پر ہے۔ وَالْمُرَادُ بِالْخَائِنِ هُوَ الْفَاسِقُ وَهُوَ مَنْ فَعَلَ كَبِیْرَةً اَوْ اَصَرَّ عَلَی الصَّغَائِرِ (ترجمہ) اور خائن سے مراد فاسق ہے اور فاسق وہ ہوتا ہے جو یا تو گناہ کبیرہ کرتا ہو۔ جیسے کہ جان بوجھ کر نماز روزہ کا تارک اور یا گناہ صغیرہ کرنے کی عادت بنالے۔ جیسے فی زمانہ داڑھی منڈانا۔ کہ ہے تو گناہِ صغیرہ۔ مگر ہمیشہ منڈانے سے گناہِ کبیرہ بن جاتا ہے۔ سوالِ مذکورہ میں وصیت نامہ کے دونوں گواہ ہر طرح کے فاسق ہیں۔ لہٰذا ان کی گواہی سے از روئے فتویٰ شرعی وصیت نامہ درست نہیں ہوتا۔ خیال رہے کہ قانونِ شریعت میں گواہ بننا کچھ اور ہے اور گواہی دینا

کچھ اور ہے۔ گواہ بنتے وقت فاسق گواہوں سے بھی وہ چیز منعقد ہو جائے گی جیسے کہ نکاح میں گواہ شرط ہیں۔ اگرچہ فاسق ہوں۔ فتاویٰ عالمگیر جلد اول صفحہ ۲۶۷ پر ہے:۔ یَصِحُّ بِشَھَادَۃِ الْفَاسِقَیْنِ وَ الْاَعْمَیَیْنِ کَذَا فِیْ فَتَاوٰی قَاضِیْ خَانْ وَکَذَا بِشَھَادَۃِ الْمَجْلُوْدَیْنِ فِی الْقَذْفِ وَاِنْ لَّمْ یَتُوْبَا وَکَذَا یَصِحُّ بِشَھَادَۃِ الْمَحْدُوْدِ فِی الزِّنَاءِ۔ (ترجمہ) اور نکاح صحیح ہو جاتا ہے دو فاسق یا دو اندھوں کی گواہی سے۔ اسی طرح فتاویٰ قاضی خان میں ہے اور ایسے ہی تہمت کے سزا یافتہ دو گواہوں کے موجود ہونے سے۔ اگرچہ توبہ نہ کی ہو۔ اور ایسے ہی زنا کے کوڑے کھائے ہوئے گواہوں کے گواہ بننے سے بھی نکاح صحیح ہو جاتا ہے۔ فتاویٰ بزازیہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ ثابت ہوا کہ گواہ بننے کیلئے متقی پرہیزگار ہونا ضروری اور شرط نہیں۔ ہاں اگر گواہی دینے کا موقعہ ہو تو متقی ہونا شرط ہے اور عدالت اسلامیہ فاسق کی گواہی قبول نہیں کرتی۔ مثلاً فساق کی گواہی سے نکاح پڑھا گیا۔ تو شرعاً منعقد ہو گیا لیکن اگر کسی وقت اسی نکاح کا جھگڑا پڑ گیا کہ خاوند بیوی سے ایک نکاح کا منکر ہو تو اب ثبوت نکاح کے لئے عدالت میں یہ فاسق گواہ منظور نہ ہوں گے۔ عربی میں گواہ بننے کو تحمل شہادت کہتے ہیں اور گواہی دینے کو ادائے شہادت، ادائے شہادت کیلئے ستّرہ شرطیں ہیں۔ جن میں ایک یہ ہے کہ گواہ متقی پرہیزگار ہوں۔ چنانچہ فتاویٰ تنویر الابصار جلد چہارم صفحہ ۵۱۶ پر ہے:۔ وَلَزِمَ فِی الْکُلِّ لَفْظُ اَشْھَدُ لِقَبُوْلِھَا وَالْعَدَالَۃُ لِوُجُوْبِہٖ۔ (ترجمہ) اور لازم ہے۔ ہر قسم کی گواہی دینے میں اَشْھَدُ کا لفظ قبولیت کے لئے اور گواہوں کا عادل ہونا ادا کے لئے اور شریعت میں عادل اس کو کہتے ہیں جو فاسق، فاجر نہ ہو بلکہ متقی، پرہیزگار ہو۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد چہارم صفحہ ۵۱۶ پر ہے:۔ وَاَحْسَنُ مَا قِیْلَ فِیْ تَفْسِیْرِ الْعَدَالَۃِ اَنْ یَّکُوْنَ مُجْتَنِبًا لِلْکَبَائِرِ وَلَا یَکُوْنَ مُصِرًّا عَلَی الصَّغَائِرِ۔ (ترجمہ) اور عادل ہونے کی سب سے اچھی تفسیر یہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے بچتا ہو۔ اور گناہ صغیرہ کی عادت نہ بنائے۔ سورۃ مائدہ کی آیت ۱۰۶ میں بھی گواہ بننے کا ذکر نہیں ہے بلکہ گواہی دینا مراد ہے اسی لئے عدل کی قید ہے۔ چنانچہ تفسیر انوار التنزیل علی اربع تفاسیر جلد دوم اسی آیت کے تحت صفحہ ۳۶۲ پر ہے:۔ اَیْ فِیْمَا اُمِرْتُمْ شَھَادَۃَ بَیْنِکُمْ۔ وَالْمُرَادُ بِالشَّھَادَۃِ اَلْاِشْھَادُ۔ (ترجمہ) یعنی اس آیت کریمہ میں جو تم پر نازل ہوئی ہے کہ آپس میں دو گواہ بنا لو۔ وہاں لفظ شہادت سے گواہی دینا مراد ہے نہ کہ گواہ بننا۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ وصیت نامہ پر جن گواہوں کے نام درج ہیں۔ وہ بقول مستفتی فاسق شرعی ہیں۔ لہٰذا فقط ان گواہوں کی گواہی پر وصیت نامہ کو شرعاً جاری نہیں کیا جا سکتا اور اس فتوئے شرعی کے ماتحت

چاروں وصیتیں ہی بناوٹی اور ناقابلِ تسلیم ہیں نہ پہلی بیوی زینب کی طلاق ثابت ہوتی ہے نہ پوتے کو میراث کا تیسرا حصہ مل سکتا ہے بلکہ پوتا بقانونِ شرعی محروم رہیگا اور کل مالِ میراث کے طور پر تقسیم کر دیا جائے جس میں پہلی بیوی مذکورہ بحیثیت وارثہ صحیحہ شامل کی جائیگی۔ ہاں اگر ان دو گواہوں کے علاوہ کوئی اور متقی لوگ اس وصیت نامہ کے حق میں گواہی دیدیں تو مفتی یا حاکم کی تحقیق کے مطابق علیحدہ شرعی فیصلہ نافذ کیا جا سکتا ہے جو اس وصیت نامہ کے نفاذ کے حق میں ہوگا۔ فی الحال یہ وصیتیں محض گواہی کی بنیاد پر فتوئے شرعی کے دلائل سے ناقابلِ قبول ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتابُ الدّعویٰ

خاوند بیوی کا گھریلو سامان میں جھگڑا ہو تو طلاق کی صورت میں فیصلہ کسطرح کیا جائے؟

سوال ۱۷۷۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ پاکستان اس جھگڑے کے شرعی حل میں کہ ہم میاں بیوی مسمی عنایت حسین ولد الٰہی نواب دین قوم کشمیری ساکن راولپنڈی اور مسماۃ ہندہ بیگم قوم بٹ سکنہ شہر جہلم کا عرصہ دو سال سے نکاح ہوا۔ کچھ دن ہم دونوں کی خانہ آبادی رہی۔ مگر اس کے بعد گھریلو جھگڑوں اور فساد کی بناء پر کسی موقع پر ہم دونوں کی بن نہ آئی جھگڑے ٹالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر لڑائی جھگڑے طول پکڑتے گئے۔ بیوی کا خاوند پر یہ الزام ہے کہ میرا خاوند عنایت حسین بہت سخت ظالمانہ رویّے سے میرے ساتھ پیش آتا ہے۔ کئی دفعہ برسرِ عام اپنے اور غیروں کے سامنے سخت ترین میری ذلّت کی جس کے مفصل واقعات دوسرے کاغذ پر تحریر کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔ بیوی کا کہنا ہے کہ اس ظالم خاوند کے ساتھ میرا آباد ہونا اب کسی صورت میں بھی ممکن نہیں۔ آپ بحیثیت مفتیٔ اسلام ہونے کے ہمارا شرعی فیصلہ فرمائیں۔ قرآن وحدیث کے مطابق آپ جو بھی فیصلہ فرمائیں گے ہمیں بغیر کسی عذر کے قابلِ قبول ہوگا۔ خاوند مذکور عنایت حسین کا کہنا یہ ہے کہ میں اپنی بیوی مسماۃ ہندہ بیگم مذکور کو آباد رکھنا چاہتا ہوں۔ اور اگر وہ کسی صورت میں آباد نہیں رہنا چاہتی تو میں خلع پر طلاق دینے کیلئے تیار ہوں۔ آپ ہم دونوں میاں بیوی کے نزدیک شریعت کے جج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ جو بھی شرعی فیصلہ فرمائیں گے ہمیں بالکل منظور ہوگا۔ اس فیصلے پر عمل کرنے کی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ فوری طور پر آپ کے اس فیصلے پر عمل کیا جائیگا۔ ہم دونوں کے علیحدہ علیحدہ بیان حاضرِ خدمت ہیں۔ آپ ہمارا فیصلہ فرمائیں۔ اس فیصلے میں ہندہ بیگم مدعیہ کی حیثیت رکھتی ہے اور عنایت حسین مدعا علیہ۔ دستخط مدعیہ ومدعا علیہ۔ مورخہ ۲-۹-۷

نقل مطابق اصل نہیں ہے۔ **فیصلہ بمطابق شریعت اسلامیہ حنفی مسلک!**

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ الرَّءُوْفِ الرَّحِیْمِ

بعد حمد وصلوٰۃ کے قانونِ فقہ کی کتابیں اور قرآن وحدیث کے دلائل مدِّنظر رکھتے ہوئے مفتی اسلام ہونیکی حیثیت سے

کافی تحقیق کے بعد بندہ عرض پرواز ہے کہ چونکہ ہر دو فریقین نے مجھ کو اپنے تصفیہ کے لئے شریعت کا قاضی تسلیم کرلیا ہے اور اپنی دستخط شدہ تحریر مع دستخط گواہان حاضر کر دیئے ہیں۔ ہر دو فریقین نے اپنے مطالبات کی تحریر بھی پیش کر دی ہے۔ نکاح نامہ کا فارم بھی میرے پاس لایا گیا۔ یہ سب کاغذات میرے پاس ریکارڈ ہیں۔ میں نے ذاتی بھی ان معاملات میں بقدر استطاعت تحقیق کر لی ہے۔ خود رُوبرو ہر دو فریقین کے بیان بھی لئے ہیں۔ اور حتی الامکان مدعیہ ہندہ بیگم کو آبادی پر آمادہ کیا تاکہ ہر دو خاندان ذلت و رسوائی سے بچیں۔ سب تحقیق و تفتیش کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مذکورہ خاوند و بیوی حُدودِ شرعی کے مطابق خانہ آبادی نہیں کر سکتے۔ اور مدعیہ حالات سے مجبور ہو کر طلاق پر بضد ہے۔ ان تمام حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں قانونِ شریعت کے مطابق یہ فیصلہ جاری کرتا ہوں کہ لڑکا مسمّٰی عنایت حسین اپنی بیوی مسمات ہندہ بیگم کو طلاق بالخلع دے دے۔ جیسا کہ ہر دو فریقین نے زبانی گفتگو میں اس بات پر رضا کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ اسی فیصلے کے مدِنظر میں نے لڑکی کے خاوند عنایت حسین کو بلا کر بتاریخ $\frac{9}{2}$ ۱۶ کو مدرسہ غوثیہ میں ہی ایک طلاق خلع تحریری و زبانی قانونی کاغذ پر حاصل کر لی ہے جس پر تین گواہوں اور طلاق دینے والے خاوند عنایت حسین کے دستخط موجود ہیں۔ اصل طلاق نامہ فیصلہ کے ساتھ منسلک ہے۔ اس طلاق کے ساتھ میں شریعتِ اسلامیہ کے فیصلہ کے مطابق مبلغ بائیس ۲۲ سَو روپیہ خلع کی رقم عنایت حسین کی بیوی مسماۃ ہندہ بیگم کے ذمے کرتا ہوں کہ وُہ فوراً یہ رقم دو ہزار دو سَو روپیہ اپنے خاوند کو ادا کر دے تاکہ طلاق مؤثر ہو۔ یہ فیصلہ شریعت کے اس قانون کے مطابق کیا گیا ہے جو حدیث پاک میں خود آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بی بی صاحبہ کے طلاق کے مطالبہ پر کیا۔ نبی کریم نے خود اس کا خلع مقرر فرمایا اور بی بی صاحبہ کو حکم دیا کہ تم اپنا باغ جس کی قیمت شارحین کے نزدیک اُن کے مہر کے برابر تھی اُن کے خاوند کو دلوایا۔ اور خاوند کو حکم دیا کہ اسے طلاق دے دو۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف جلد دوم صـــ ۲۸۳ پر ہے:۔ **بَابُ الْخُلْعِ**۔ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ اِمْرَأَۃَ ثَابِتِ ابْنِ قَیْسٍ اَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (الخ) بعض نے فرمایا کہ یہ باغ مہر ہی تھا۔ بہرحال حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ جب عورت اپنے خاوند کے ساتھ آباد نہ ہونا چاہے تو وہ طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اور خاوند خلع کا مطالبہ کر سکتا ہے اور قاضی یا مفتی اپنے فیصلہ میں اپنی مرضی سے قانونِ شرعی کی حد میں خلع کی رقم بیوی پر لازم کر سکتا ہے۔

اور فیصلے کے ماتحت ہندہ بیگم کے خاوند مسمّٰی عنایت حسین مذکور کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ

تمام جہیز جو لڑکی کے والدین نے اس کی شادی کے موقع پر دیا ہے وہ فوراً واپس کرے۔ کیونکہ قانونِ شریعت کے مطابق جو سامان والدین اپنی بیٹی کو شادی نکاح کے موقعہ پر دیتے ہیں وہ سب اسی بیوی کی ملک ہوتا ہے۔ چنانچہ فتاوی ردّ المحتار جلد دوم صفحہ ۸۹۹ پر ہے۔ فَاِنَّ کُلَّ اَحَدٍ یَّعْلَمُ اَنَّ الْجِهَازَ مِلْكُ الْمَرْاَةِ وَاَنَّهٗ اِذَا طَلَّقَ تَاْخُذُهٗ کُلَّهٗ۔ یہاں تک کہ وہ تمام زیور بھی جو جہیز کے ساتھ آیا ہے کہ وہ بھی لڑکی کے ملک ہے۔ اگرچہ مردانہ انگوٹھی بھی ہو۔ کیونکہ یہ انگوٹھی بھی شرعاً اس کی بیوی ہندہ بیگم کے ملک ہے۔ ہاں وہ تمام اشیاء جو صرف مرد کے استعمال کے لئے ہندہ بیگم کے جہیز کے ساتھ آئی ہیں وہ جہیز میں شامل نہیں۔ لہٰذا وہ اشیاء عنایت حسین پر واپس کرنا واجب نہیں۔ کیونکہ جہیز صرف وہ سامان ہوتا ہے جو لڑکی کے استعمال یا گھر کی زینت کے لئے باپ اپنی بیٹی کو دیتا ہے۔ چنانچہ فتاوی شامی صفحہ ۸۹۸ پر ہے۔ لَتَاتِیَ بِجِهَازٍ کَثِیْرٍ لِیُزَیَّنَ بِهٖ بَیْتُهٗ الخ دیگر سامان انہی کی ملک ہوتا ہے جنکو دیا جاتا ہے یا جو لڑکے کے استعمال کا ہوتا ہے۔ اسی لئے فقہاءِ کرام فرماتے ہیں کہ گھر کا استعمالی سامان خاوند بیوی کے جھگڑے کے بعد اس طرح تقسیم کر دیا جائے گا کہ زنانہ سامان بیوی کو اور مردانہ خاوند کو۔

جہیز بیوی کو اور زر خرید اسی کو جس نے ہر دو خاوند بیوی میں سے خریدا ہو بشرطیکہ وہ خریدا گواہی پیش کرے۔ چنانچہ فتاوی ہندیہ حنفیہ جلد دوم صفحہ ۳۲۹ پر ہے۔ وَقَالَ اَبُوْحَنِیْفَةَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰی اِذَا اخْتَلَفَ الزَّوْجَانِ فِیْ مَتَاعٍ مَوْضُوْعٍ فِی الْبَیْتِ الَّذِیْ کَانَا یَسْکُنَانِ فِیْهِ حَالَ قِیَامِ النِّکَاحِ اَوْبَعْدَ مَا وَقَعَتِ الْفُرْقَةُ بِفِعْلٍ مِّنَ الزَّوْجِ اَوْمِنَ الْمَرْءَةِ۔ فَمَا یَکُوْنُ لِلنِّسَآءِ (فَهُوَ لِلْمَرْاَةِ) اِلَّا اَنْ یُّقِیْمَ الرَّجُلُ الْبَیِّنَةَ وَمَا یَکُوْنُ لِلرِّجَالِ (فَهُوَ لِلرَّجُلِ) اِلَّا اَنْ تُقِیْمَ الْمَرْاَةُ (الخ) یعنی جو چیز ان دونوں میں سے خود کسی نے اپنے پیسے سے خریدی ہو تو وہ خواہ کسی کے استعمال کی چیز ہو، خریدنے والے کو ہی ملے گی لیکن جہیز کے علاوہ باقی چیزوں کی تقسیم اسی طرح ہو گی جس طرح اوپر کی گئی۔ اس عبارت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مردانہ انگوٹھی بھی واپس کرنا پڑے گی۔ کیونکہ مرد کو سونا پہننا حرام ہے اسلئے سونے کی انگوٹھی مرد کے استعمال کی چیز نہ ہوئی۔

اس قانون کے تحت میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندہ کے والدین کی طرف سے جو سامان صرف خاوند کے استعمال کے لائق ہے وہ مدعا علیہ عنایت حسین اور اُس کے لواحقین کا ہے۔ باقی سب جہیز ہندہ بیگم کو واپس کیا جائے۔ اسی لئے میں نے لڑکی والوں سے اس

تمام سامان کی فہرست منگا کر سُرخ نشان لگا دیئے ہیں جس فہرست میں جہیز اور دیگر اشیاء کے نام درج ہیں۔ پس جن ناموں پر سُرخ نشان لگا ہے وہ جہیز میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے ہندہ بیگم کو واپس نہ ملے گا۔ فہرست کا کاغذ بھی مع نشان شدہ فیصلے کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ تھا خلع کی رقم اور جہیز سے متعلق شرعی اسلامی فیصلہ۔ آگے مہر سے متعلق شریعت اسلامیہ کے قانون کے مطابق فیصلہ درج کیا جاتا ہے۔

قانونِ شریعت کے مطابق ہر وہ بیوی جس سے اس کے خاوند نے وطی یا خلوت صحیحہ کرلی ہو اُس کو زوجہ مدخولہ کہا جاتا ہے۔ خواہ مدخولہ حقیقتاً یعنی جس سے جماع کیا ہو یا حکماً۔ مدخولہ بیوی کو مقررشدہ مہر پُورا پُورا ملے گا اور خاوند پر دینا واجب ہے۔ خواہ بیوی آباد رہے یا طلاق لے یا خاوند خود طلاق دے یا نکاح فسخ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْهِمْ فِیْٓ اَزْوَاجِهِمْ۔ مہر حق شرع ہے۔ اس کی حقدار صرف بیوی ہے۔ چنانچہ فتاوٰی فتح القدیر جلد دوم صفحہ ۴۳ پر ہے۔ اَنَّ الْمَهْرَ خَالِصُ حَقِّهَا۔ اور مہر کا مال صرف پہلی دفعہ صحبت کرنے کا بدلہ ہے۔ جب پہلی مرتبہ صحبت کرلی تو خاوند پر پُورا مکمل شدہ مہر دینا واجب ہوگیا۔ بلکہ کسی خطرہ کے ماتحت بیوی صحبت سے پہلے بھی پُورا مہر لے سکتی ہے اور یہ کہہ سکتی ہے جب تک مہر نہ ملے گا میں صحبت نہیں کروں گی۔ کیونکہ مالِ مہر شریعت میں بضع کا بدلہ ہے۔ چنانچہ فتاوٰی شامی جلد دوم میں ہے۔ لِاَنَّ الْمَهْرَ یُجْعَلُ بَدَلًا عَنِ الْبُضْعِ دُخُوْلُهٗ۔ پس جب عورت نے دخول کرالیا تو پُورا مہر خاوند پر واجب ہوگیا۔ یہی قانون فتاوٰی بحرالرائق میں اس طرح مرقوم ہے۔ وَجَبَ کَمَالُ الْمَهْرِ (اِنْ دَخَلَ بِهَا)۔ فتاوٰی درمختار کی شرح شامی میں لکھا ہے کہ مدخولہ بیوی خواہ خود طلاق لے یا اُسی کی جانب سے جدائی ہو تو بھی خاوند پر پُورا مہر واجب ہے۔ چنانچہ جلد دوم صفحہ ۴۵۲ پر ارشاد ہے۔ وَاِذَا تَاَکَّدَ الْمَهْرُ بِمَا ذُکِرَ لَا یَسْقُطُ بَعْدَ ذٰلِکَ وَاِنْ کَانَتِ الْفُرْقَةُ مِنْ قِبَلِهَا۔ تین چیزوں سے مہر واجب ہوتا ہے ۱۔ بیوی سے جماع صحبت کرنا۔ ۲۔ خلوت صحیحہ کرنا ۳۔ ہر دو سے کوئی مرجائے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اول صفحہ ۳۰۲ پر ہے۔ وَالْمَهْرُ یَتَاَکَّدُ بِاَحَدِ مَعَانٍ ثَلَاثَةٍ۔ اَلدُّخُوْلُ وَالْخَلْوَةُ الصَّحِیْحَةُ وَمَوْتُ اَحَدِ الزَّوْجَیْنِ۔ علامہ شامی اور صاحب بحر نے چار چیزیں لکھی ہیں۔ پس میں اس قانون کے تحت یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ عنایت حسین فوراً وہ زیور جو بطورِ مہر ہندہ بیگم کو دیا تھا اور اسی جھگڑے اور فساد کے دنوں میں پھر

واپس اپنی زوجہ مطلقہ بالخلع کو واپس کرے۔ اگرچہ نکاحنامے
عنایت حسین کے پاس پہنچ چکا ہے، کے کاغذ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ مبلغ پندرہ ۱۵ سو روپے کا زیور بطریق مہر معجل ادا کیا جا چکا ہے
مگر میری تحقیق اور تفتیش سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ مہر کا زیور بجز چار عدد طلائی چوڑیوں کے باقی
سب کچھ عنایت اور اس کے لواحقین کے پاس ہے۔ لہٰذا فیصلے کے ماتحت اس کو وہ سب زیور
بھی ہندہ کو دینا واجب ہے۔ اس کا تمام ثبوت بھی میرے پاس ریکارڈ ہے۔

فیصلے کا خلاصہ

میرا یہ فیصلہ قرآن کریم حدیث پاک اور فقہائے عظام حنفیہ کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق ہے میں نے اپنے پاس سے کوئی حکم صادر نہ کیا۔ ہاں
خلع کی رقم میں نے اپنے حکم سے بیوی پر لازم کی ہے مگر وہ بھی شریعت اسلامیہ کی حدود میں
رہ کر۔ کیونکہ خلع کی رقم مبلغ بائیس صد ۲۲۰۰ روپے اس لئے مقرر کی ہے کہ مہر بشکل زیور ہے۔ جیسا
کہ نکاح نامے کے کاغذ سے ثابت ہے اور وہ زیور اس وقت مبلغ ایک ہزار پانچ سو کا
تھا جیسا کہ نکاح نامے پر درج شدہ قیمت سے ثابت ہے امروز زمانہ کے اعتبار سے
اب اسی زیور کی قیمت مبلغ بائیس ۲۲ سو روپیہ تقریباً بنتی ہے۔ لہٰذا فیصلہ کے مطابق اس پر بھی
عمل کرنا واجب ہے۔ اگرچہ خلع کی رقم مہر سے زائد لینی بھی حرام نہیں لیکن چونکہ مکروہ تنزیہی
ضرور ہے اس لئے میں نے صرف ۲۲۰۰ روپیہ ہی مقرر کیا ہے۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری
میں صفحہ ۴۸۸ پر ہے۔ وَاِنْ كَانَ النُّشُوْزُ مِنْ قِبَلِهَا كَرِهْنَا لَهٗ اَنْ يَّاْخُذَ اَكْثَرَ مِمَّا
اَعْطَاهَا مِنَ الْمَهْرِ وَلٰكِنْ مَعَ هٰذَا يَجُوْزُ اَخْذُ الزِّيَادَةِ فِي الْقَضَاءِ۔

خلاصہ یہ کہ عنایت حسین مدعا علیہ تمام جہیز تمام زیور جس میں خود لڑکی کے والد کا دیا اور
عنایت حسین کا دیا ہوا سب شامل ہے۔ لڑکی ہندہ بیگم مدعیہ کو واپس کرے اور ہندہ بیگم
مبلغ بائیس ۲۲ سو روپیہ اپنے سابقہ خاوند عنایت حسین مدعا علیہ کو بطور خلع بالمال ادا کر دے ہندہ
بیگم پر ایک طلاق بائنہ واقع ہو چکی ہے۔ کیونکہ خلع سے طلاق بائنہ ہی واقع ہوتی ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
اَعْلَمُ۔

کتبہ

مُفتی دار العلوم مدرسہ غوثیہ۔ گجرات

کتاب الوکالت

تقلید کا بیان، اللہ رسول کی تقلید حرام ہے، تقلید کی تعریف

سوال ۵۸: محترم المقام جناب صاحبزادہ اقتدار احمد خاں صاحب مدظلہٗ۔ السلام علیکم۔

گزارش ہے کہ کل ایک غیر مقلد عالم سے میری گفتگو ہوئی۔ دوران گفتگو اُس نے کہا کہ اہلسنت لوگ جس کو تقلید کہتے ہیں وہ گناہ ہے، شرک و بدعت ہے۔ اس کا ثبوت بالکل قرآن و حدیث سے نہیں۔ اصل تقلید اللہ رسول کی ہے۔ ہم سب وہابی اللہ کی تقلید کرتے ہیں۔ اللہ اور اُس کے رسول کی تقلید کرتے ہوئے کسی عالم فقیہہ مجتہد کی تقلید ہرگز جائز نہیں۔ کیا اُس کا یہ کہنا درست ہے؟ فوراً جواب دیا جائے۔ پہلی فرصت میں فوراً جواب دے دو۔ دو دن بعد پھر گفتگو ہونی ہے۔ مولوی محمد الیاس، ڈیرہ غازیخاں۔

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

مورخہ ۱۰/۱/۷۲

الجواب

محترم حضرت العلام ذی جاہ والا شان مولانا محتشم عزیز گرامی وعلیکم السلام۔

ثم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ تشریف لایا۔ حسب الارشاد اسی وقت جواب حاضر کیا جا رہا ہے۔ گزارش ہے کہ آئندہ سوال الگ بڑے کاغذ پر بھیجا کیجئے اور سوال کاغذ کے ایک طرف ہو تاکہ اسی کاغذ پر جواب دیا جا سکے۔ سوال کی تحریر عام خطوط کی طرح نہ ہو۔ بوجہ مصروفیات مختصر جواب حاضر کر رہا ہوں۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی برسی ہے۔ یوم وصال ۳ رمضان ۱۹۷۱ء کو پچھلے سال ہوا۔ مزار شریف بھی زیر تعمیر ہے۔ پہلا روزہ گزر چکا ہے، پرسوں تیسرے روز سے عرس شریف ہے۔ ان مصروفیات کی بنا پر مختصر جواب حاضر کیا جا رہا ہے۔ سوال مذکورہ میں جس غیر مقلد مولوی کا ذکر کیا گیا ہے وہ علم سے بہت دور نظر آتا ہے۔ علم والے لوگ ایسی جاہلانہ بات نہیں کر سکتے۔ ویسے تو تمام وہابی غیر مقلد بیچارے علم سے کورے ہوتے ہیں۔ صرف جُبّہ و دستار سے ہی علمیت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کی بے علمی اور بے عقلی ہی ان کو غیر مقلدیت کی طرف لے جاتی ہے۔ ورنہ ذی عقل اور ذی علم حضرات حقائق کی بنا پر کبھی بھی تقلید سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ تقلید ائمہ واجب ہے۔ چنانچہ اصولِ فقہ کی مشہور کتاب نورُ الانوار ص ۲۱۶ پر ہے۔ نَعَالَ تَقْلِيْدُ الصَّحَابَةِ وَاجِبَةٌ يُتْرَكُ الْقِيَاسُ۔ اور علامہ شامی کی کتاب عقود رسم المفتی ص ۵ پر ہے کہ ائمہ مجتہدین کے علاوہ

کسی اور مقلد یا کم علم عالم کی تقلید کرنا حرام ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اَلسَّابِعَةُ طَبَقَةُ الْمُقَلِّدِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی مَا ذُکِرَ الخ فَالْوَیْلُ لِمَنْ قَلَّدَهُمْ کُلَّ الْوَیْلِ۔ دنیا میں کوئی شخص تقلید سے بری نہیں ہو سکتا۔ ہاں کوئی علمائے اسلام وصحابہ کبار کا مقلد ہے کوئی نفس وشیطان کا۔ یہ وہابی نہ معلوم لفظِ تقلید سے کیوں دکھ کرتے ہیں۔ حالانکہ بغیر تقلید چارہ نہیں ہر علم میں تقلید شرط ہے۔ یہی وہابی علم صرف علم نحو منطق فلسفہ تمام علوم میں علماء اجتہاد کی تقلید بلا چون وچرا کر لیتے ہیں علم فقہ وحدیث میں تقلیدِ مجتہد سے کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ بس وجہ ان کی نادانی کم عقلی ہے۔ تقلید کی لغوی تعریف: کسی اور دوسرے شخص کی بات یا فعل کو اپنے دل کا ہار بنا لینا اور اطاعت کا پٹہ اپنے گلے میں ڈالنا۔ چنانچہ قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار صفحہ ۲۱۶ پر ہے اور مختصر المنار میں ہے وَکَانَ الْمُقَلِّدُ جَعَلَ قَوْلَ الْغَیْرِ اَوْ فِعْلَهٗ قِلَادَةً فِیْ عُنُقِهٖ۔ اور تقلید اصطلاحی کی اصولی تعریف یہ کہ اَلتَّقْلِیْدُ اِتِّبَاعُ الرَّجُلِ غَیْرَهٗ فِیْمَا سَمِعَهٗ یَقُوْلُ اَوْ فِیْ فِعْلِهٖ بِلَا تَظَنُّرٍ فِی الدَّلِیْلِ۔ جب دنیا کی ہر چیز میں تقلید کی جاتی ہے تو دین کے فقہ میں تو بدرجہ اولیٰ تقلید واجب ہے۔ ائمہ کرام ہمارے سامنے حدیث وقرآن ہی پیش کرتے ہیں، مگر موتی نکال کر۔ تمام مقلدین فقط فقہ کے مسائل میں مجتہدین کی تقلید کرتے ہیں نہ کہ اسلام کی بنیادی باتوں میں۔ اور فقہ وہ ہے جو مستنبط ہو۔ کتاب وسنت سے گویا کہ فقہائے کرام کی باتیں کتاب وسنت کے موتی ہیں۔ چنانچہ حاشیہ صغیری شرح منیہ صفحہ ۹۱ پر ہے قَوْلُهٗ هٰذَا اَشْبَهُ بِالْفِقْهِ اَیْ بِالْمَعْنَی الْمُسْتَنْبَطِ مِنَ الْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ تقلید اپنی تمام تعریفوں کے مدِ نظر قابلِ ستائش ہے۔ فقہائے مجتہدین نے قرآن وحدیث کے جو موتی ہمارے سامنے پیش کئے اس کا نام فقہ اسلامی ہے۔ فقہ کی تعریف معنوی علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں فرمائی۔ اَلْفِقْهُ مَعْقُوْلٌ مِّنَ الْمَنْقُوْلِ یعنی اللہ اور رسول کا قانون قواعد عقلیہ کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلام ہم جیسوں کے سامنے اتنا آسان ہو گیا ہے۔ ورنہ ہماری عقول ان گہرائیوں تک کس طرح پہنچ سکتی تھیں؟ یہ غیر مقلد لوگ بھی بغیر تقلید کے ایک منٹ اپنا مذہب ثابت نہیں رکھ سکتے منہ سے کہتے پھرتے ہیں کہ ائمہ کی تقلید ہم نہیں کرتے۔ آپ ان سے پوچھیں کہ حدیث پاک سے دکھاؤ کہ نماز کے فرض واجب اتنے ہیں۔ اور واضح حدیث یا آیت سے دکھاؤ کہ باپ کی مزنیہ بیٹے پر حرام ہے۔ ہرگز نہ دکھا سکیں گے۔ مذکورہ فی السوال غیر مقلد مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ ہم اللہ کی تقلید کرتے ہیں یا رسول اللہ کی۔ یہ عین گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کریم کے کلام پر ایمان اور یقین ہوتا ہے۔ اس کی عبادت واتباع ہوتی ہے نہ کہ تقلید جس طرح عبادت صرف

اللہ کریم کی اور اتّباع صرف نبی کریم کی۔ اسی طرح تقلید صرف مجتہدین کی۔ جو یہ کہے کہ میں فقہاء کی عبادت کرتا ہوں بے دین ہے۔ اسی طرح جو کہے کہ میں اللہ کی تقلید کرتا ہوں بے دین ہے۔ نبی کریم کی بھی تقلید نہیں ہوتی۔ ورنہ سارے صحابہ مقلّد ہوتے۔ امتی نہ ہوتے۔ حالانکہ کوئی صحابی مقلد نہیں کہ نہ نبی کریم کی تقلید ہوسکتی ہے نہ صحابہ کو کسی اور کی تقلید کی حاجت تھی۔ اللہ رسول کی تقلید اس لئے نہیں ہوسکتی ہے کہ کسی شخص کی بات ماننے کو علمِ منطق میں ادراک کہتے ہیں۔ اور ادراک دو قسم کا ہے ۱ ادراک اعتقادی۔ ۲ ادراک غیر اعتقادی۔ ادراکِ اعتقادی کی چھ اقسام ہیں۔ ۱ جزم ۲ ظن ۳ جہل مرکب ۴ وہم ۵ یقین ۶ تقلید۔ جزم وہ اعتقاد ہے جس کی نقیض یعنی خلاف ہونے کا احتمال نہ ہو۔ ظن جس میں نقیض کا احتمال ہو۔ جہل مرکب وہ بات ہے جو واقع کے خلاف ہو۔ وہم وہ بات جس کے واقع کے خلاف ہونے کا احتمال ہو۔ یقین وہ اعتقاد ہے جو واقع کے مطابق بھی ہو۔ اور حقیقت میں ثابت بھی ہو۔ اور کسی شک ڈالنے والے کے شک سے بھی اعتقاد ختم نہ ہو۔ تقلید وہ اعتقاد ہے جو واقع کے مطابق ہو ثابت بھی ہو۔ مگر شک ڈالنے سے شک پڑجائے۔ اب بتائیے کہ کیا اللہ اور رسول کی تقلید جائز ہے۔ کیا کسی مسلمان کو اللہ و رسول کے کلام میں شک پڑسکتا ہے۔ تقلید کی یہ تعریف اصولی تعریف کہلاتی ہے۔ پہلی دو تعریفیں لغوی اور اصطلاحی کہلاتی ہیں تقلید کی تین تعریفیں یاد رکھنا۔ مزید تحقیق کیلئے کتب منطق دفعتہ دیکھئے

وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتــــــــــــــــــــــبہ

کتابُ الوقف

مسجد کے متولّی اور بانی کے اختیارات کا بیان

سوال ۹۶ؔ۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص عرصہ پچیس ۲۵ سال سے ہمارے گاؤں کی مسجد کا متولّی بھی ہے۔ اور امام و خطیب اور مسجد کی انتظامیہ کمیٹی کا صدر بھی۔ تمام مسلمانوں نے اور خود بانی مسجد نے اس شخص کو مسجد مذکورہ کے تمام انتظامات پر پورا اختیار دیا تھا۔ اس شخص سے ایک دوسرے شخص نے درخواست کی کہ مجھ کو ایک سال تک اس مسجد میں صرف تقریر کی اجازت دے دو۔ متولّی مذکور نے از راہِ ہمدردی اجازت دے دی۔ ایک سال گزرنے کے بعد وہی سابقہ خطیب اور متولّی و صدر انجمن نے سابقہ اجازت منسوخ کر کے اس کو اطلاع دی کہ آئندہ میں خود تقریر کیا کرونگا مگر یہ عارضی خطیب خطابت چھوڑنے سے انکاری ہے اور چند لوگوں کو ساتھ ملا کر فتنہ و فساد پر آمادہ

ہے۔ کافی بحث اور جھگڑے کے بعد ہر دو فریق نے آپ کے فتوے پر اتفاق کیا ہے۔ لہٰذا ہم کو فتویٰ دیا جائے کہ اس امامت وخطابت کا صحیح حق دار کون ہے۔ خطیب سابق اس یک سالہ خطیب کی خطابت منسوخ کرنے کا حقدار ہے یا نہیں۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ۝

سائل محمد یوسف۔ مدرس مدرسہ علوم شرقیہ میونسپل اسلامیہ ہائی سکول جہلم شہر ۱۰/۱/۱۹۷۰

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ۝

الجواب

صورت مسئولہ میں چونکہ دوسرے فریق کا بھی تعلق حقوق ہے اس لئے بطور مدعا علیہ اس کا بیان بھی شرعاً ضروری ہے۔ خیال رہے کہ ہر وہ مسئلہ جس کا تعلق دو فریق سے ہو۔ اس کو قانونی زبان میں مسئلہ قضاء کہا جاتا ہے۔ ان مسائل میں بقول حضرت حکیم الامت مدظلہٗ رحمۃ اللہ علیہ فی زمانہ مفتی اسلام پر لازم ہے کہ شرعی فیصلہ یا فتویٰ سے قبل ہر دو فریق و گواہان کثیرہ حسب استطاعت کے حلفیہ بیانات سے تحقیق و تفتیش کر کے پھر فتویٰ جاری کرے۔ بدیں وجہ فقہاء کرام نے فرمایا کہ جو شخص بغیر تحقیق مستفتی اور زمانے کا حال جانے بغیر فتویٰ جاری کر دے۔ وہ جاہل اور ظالم ہے۔ چنانچہ عقود رسم المفتی لعلامہ ابن عابدین صفحہ نمبر ۴۱ پر ہے۔ وَقَدْ قَالُوْا مَنْ جَهِلَ بِاَهْلِ زَمَانِهٖ فَهُوَ جَاهِلٌ (الخ) وَلَا يُفْتِيْ بِهٖ كَيْلَا يَجْرِيَ الظُّلْمَةُ ۝ (ترجمہ) قانون ساز علماء اسلام نے فرمایا کہ جو شخص اپنے زمانے کے باشندوں کے حالات سے بے خبر ہو وہ جاہل ہے اور ایسی بے خبری سے فتویٰ نہ دیا جائے۔ تاکہ ظلم جاری نہ ہو۔ ان شرعی پابندیوں کی بناء پر میں نے ہر دو فریق کے مکمل حلفیہ بیان لئے جس سے ثابت ہوا کہ سائل کا بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ لہٰذا قانون شریعت کے مطابق خطیب اول جس کو متولی اور صدر انتظامیہ کا درجہ بھی حاصل ہے اور مسجد میں کُلّی اختیار ہے۔ جس طرح اس کو یہ حق حاصل ہے کہ ایک سال پیشتر کسی شخص کو مدت معینہ تک خطابت کی اجازت دے دے۔ اسی طرح یہ بھی حق رکھتا ہے کہ وہ مسجد کے ملازمین کو بلا وجہ برطرف کر دے شرعاً آئین اسلامی کی رُو سے اراکین مسجد بلحاظ نظامت امور سب سے زیادہ بااختیار بانی مسجد ہوتا ہے۔ بانی ہی امام و مؤذن و خادم بنانے کا حق دار ہے۔ جس کو چاہے امامت و خطابت یا دیگر امور کی ذمہ داریاں سونپ سکتا ہے۔ بجز شریعت مطہرہ کے کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ اگر بانی مسجد شرعی ضابطوں سے امام و مؤذن وغیرہ مقرر کرتا ہے تو اسلام اس کو پورا پورا اختیار دیتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ بحر الرائق جلد پنجم صفحہ نمبر ۲۴۹ پر ہے۔ وَفِي الْمُجَرَّدِ عَنْ اَبِيْ حَنِيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

عَنْهُ اَنَّ الْبَانِیَ اَوْلٰی بِجَمِیْعِ مَصَالِحِ الْمَسْجِدِ وَ نَصْبِ الْاِمَامِ وَ الْمُؤَذِّنِ اِذَا تَاَهَّلَ لِلْاِمَامَةِ ؕ
ترجمہ:۔ کتاب مجرد میں لکھا ہے امام صاحب سے روایت ہے کہ بانیٔ مسجد زیادہ بہتر ہے۔ مسجد کی تمام مصلحتوں اور امام و مؤذن مقرر کرنے میں بانی ہی کا اختیار ہے۔ بشرطیکہ کسی اہل کو امام بنائے۔

اس عبارت سے ثابت ہُوا کہ امام وغیرہ مقرر کرنا بانیٔ مسجد کا اختیار ہے اسی طرح شرعاً بانی کو کُلّی حق پہنچتا ہے کہ مقرر شدہ امام یا مؤذن کو ان عہدوں سے علیحدہ کر دے۔ چنانچہ فتاوٰی دُرِّ مختار جلد پنجم صفحہ ۵۹۲ پر ہے:۔ لَا یَجُوْزُ الرُّجُوْعُ عَنِ الْوَقْفِ اِذَا اُسْجِلَ وَ لٰکِنْ یَجُوْزُ الرُّجُوْعُ عَنِ الْمَوْقُوْفِ عَلَیْهِ الْمَشْرُوْطِ کَالْمُؤَذِّنِ وَ الْاِمَامِ وَ الْمُعَلِّمِ وَ اِنْ کَانُوْا اَصْلَحَ ؕ ترجمہ بانی یعنی واقف کے لئے اپنے وقف سے رجوع کرنا بعد تکمیل وقف جائز نہیں۔ کیونکہ موقوف علیہ مشروط سے رجوع کرنا جائز ہے۔ جیسے:۔ کہ امام اور مؤذن یا معلّم مقرر شُدہ کو ہٹا سکتا ہے۔ مگر اس اختیار میں یہ شرط لازمی ہے کہ بانیٔ مسجد جس نے وُہ زمین مسجد یا عمارت وقف کی ہو۔ شریعت و عقائد دینیہ کا پُورا پُورا لحاظ رکھ کر امام یا مؤذن مقرر کرے۔ اگر اس تقرر میں شرعی حدود کا خیال نہ رکھا گیا۔ تو اہل بستی کو شرعاً حق پہنچتا ہے کہ وہ بانی کا مقرر کردہ امام وغیرہ علیحدہ کر کے اُس سے بہتر متقی عالم امام مقرر کریں۔ چنانچہ شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۵۹۷ پر ہے:۔ اَلْبَانِیْ اَوْلٰی بِنَصْبِ الْاِمَامِ وَ الْمُؤَذِّنِ فِی الْمُخْتَارِ اِلَّا اِذَا عَیَّنَ الْقَوْمُ اَصْلَحَ مِمَّنْ عَیَّنَهٗ ؕ اس سے پہلے ارشاد ہے:۔ اِنْ لَّمْ یَکُوْنُوْا اَعْلَمَ اَوْ تَحَادَ نُوْا فِیْ اَمْرِهِمْ ؕ (ترجمہ) مختار مذہب میں سب سے زیادہ مستحق اور مؤذن مقرر کرنے میں بانیٔ مسجد ہی ہے لیکن اگر بانی نے نا اہل یا گھٹیا لوگوں کو امامت وغیرہ کی ذمہ داری سُپرد کی۔ تو قوم بانی کے اس اختیار کو ختم کر کے لائق ترین امام مقرر کر سکتی ہے اور نا اہلی یہ ہے کہ یا تو نیک نہ ہوں۔ یا امام اور مؤذن و خادم اپنی کارکردگی میں سُستی کرتے ہوں بانیٔ مسجد خود بھی امام یا مؤذن بن سکتا ہے جبکہ وُہ اس ذمہ داری کو شریعت کے ضابطوں کے مطابق نبھانے کے لائق ہو۔ چنانچہ بحر الرائق جلد پنجم صفحہ نمبر ۲۴۹ پر ہے:۔ وَ قِیْلَ اَلْبَانِیْ بِالْمُؤَذِّنِ اَوْلٰی وَ اِنْ کَانَ فَاسِقًا بِخِلَافِ الْاِمَامِ وَ الْبَانِیْ اَحَقُّ بِالْاِمَامَةِ ؕ (ترجمہ) اور کہا گیا ہے۔ کہ بانیٔ مسجد مؤذن بننے میں زیادہ حقدار ہے اگرچہ فاسق ہو۔ بخلاف امام بننے کے کہ وہ فاسق نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ (اہلیت کی صُورت میں) بانیٔ مسجد ہی امامت کے لائق ہے یہ تمام گفتگو بانیٔ مسجد کے بارے میں تھی بانی وُہ ہوتا ہے جو زمین وقف کرے جس پر مسجد تعمیر ہوئی یعنی مسجد کی زمین وقف کرنے والا۔ بخلاف مسجد کے لئے زمین وقف کرنے کے کہ وہ شرعاً صرف واقف کہلاتا ہے اور مسجد کی زمین وقف کرنے والے کو واقف بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس کو اختیارات کی بنا پر بانی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح الرکین

موقوفہ میں بانی کے بعد سب سے زیادہ بااختیار مرتبہ متولّی کا ہوتا ہے۔ عام اصطلاح میں متولّی کو قیم اور ناظر بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰی ردّ المحتار جلد سوم ص۵۹۶ پر ہے:۔ وَالْقَيِّمُ وَالْمُتَوَلِّيُ وَالنَّاظِرُ فِيْ كَلَامِهِمْ بِمَعْنًى وَاحِدٍ ط (ترجمہ) اصطلاحِ فقہاء میں قیم، متولّی، ناظر ایک معنٰی میں مستعمل ہے شریعتِ اسلامیہ میں متولّی کے بالکل وہی اختیار ہوتے ہیں جو بانی کے ہیں۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر ۴۵۵ پر ہے:۔ وَاِذَا سُلِّمَ الْمَسْجِدُ اِلٰى مُتَوَلٍّ يَقُوْمُ بِمَصَالِحِهٖ يَجُوْزُ ط ترجمہ۔ جب کوئی مسجد کسی متولّی کے سپرد کر دی گئی تو اس کو اپنے اختیار سے مسجد کے کاموں کا انتظام کرنا بالکل جائز ہے۔ شامی جلد سوم ص۵۹۶ پر ہے:۔ لِاَنَّ التَّصَرُّفَ فِيْ مَالِ الْوَقْفِ مُفَوَّضٌ اِلَى الْمُتَوَلِّيْ ط (ترجمہ) اس لئے کہ وقف مالوں میں تصرف کا پورا اختیار متولّی کی طرف سپرد کیا ہوا ہے اس لئے فقہاء نے فرمایا:۔ اِذَا نَصَبَ الْوَاقِفُ مُتَوَلِّيًا فَهُوَ مَصَالِحِ الْوَقْفِ كَمِثْلِهٖ ط (ترجمہ) جب بانیٔ وقف کسی شخص کو متولّی بنا دے تو متولّی مسجد وغیرہ کے اُمور میں ہر چند طرح اسی طرح بااختیار ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ بانی اور بانی کے چند اختیار تو اُوپر بیان کر دیئے گئے کہ جس کو چاہے امام مقرر کرے۔ جس کو چاہے برطرف کرے۔ اور اگر متقی مؤمن ہے جب تو خود بھی امام بن سکتا ہے اور جس کو چاہے عارضی امام یا خطیب بنا دے۔ جب چاہے تو اس کو ہٹا دے۔ کسی کو اعتراض کا حق نہیں جب تک کہ شرعی بُرائی نہ ہو۔ بالکل یہی اختیار قانونِ شرعی سے متولّی کو ملتے ہیں۔ خواہ اس کو خود بانی نے متولّی بنایا ہو۔ یا قوم نے یا حکومت نے، بہرحال متولّی شریعت پاک کی طرف سے صاحبِ اختیار رہے۔ سوال مذکورہ میں سابقہ پچیس ۲۵ سالہ خطیب جو متولّی بھی ہے اور یونین کے (زیرِ نظر) فارم کے تحت انجمن مسجد مذکور کا صدر بھی بالکل جائز اختیار رکھتا ہے کہ عارضی خطیب کو فوراً مسجد کی اس خطابت سے علیحدہ کر دے جو صرف ایک سال کے لئے خود متولّی نے سپرد کی تھی۔ اور بجائے فتنہ فساد کرنے کے اس فتوے شرعی کے حکم کے ماتحت عارضی خطیب کا دستبردار ہونا ہی بہتر ہے۔ متولّی کا حکم ماننا ہر نمازی اور مسجد مذکورہ سے متعلق شخص کا فرض ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ط

کتبہ

عارضی مسجد بنانے کا بیان اور حُکم

سوال ۸۶: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ جو مسجد عارضی طور پر بنائی جائے۔ اور اب وہاں آبادی ختم ہو گئی۔ اُس کی لکڑی اینٹ، دروازے وہاں سے اکھاڑ کر فروخت کرنا اور وہ رقم یا خود

وہ اشیاء دوسری مسجد میں لگانی جائز ہیں۔ جبکہ اُسی جگہ رہنے سے اُن کے خستہ خراب ہوجانے کا بھی اندیشہ ہے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا۔

السائل :۔ محمد طفیل زرگر، گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ۔ مورخہ ۲۱/۱/۵۹

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق بے آباد مسجدیں تین قسم کی ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ کوئی اپنی زمین میں اپنے خرچ پر صرف اپنے پڑھنے کے لئے مسجد کی شکل میں چبوترہ نما کمرہ تعمیر کرلیتا ہے۔ جیسا کہ عام جنگل اور کھیتوں کے قریب کسان مسلمان بنا لیتے ہیں۔ دُوسری قسم یہ ہے کہ کسی کی زمین میں کسی قافلہ نے چار، پانچ ماہ کے قیام کے ارادہ پر کچی مٹی یا چٹائیوں کی دیواریں کھڑی کرکے نماز پڑھنی شروع کردی پھر وہ قافلہ چلا گیا۔ اور وہ جگہ اسی طرح بنی رہی۔ جیسا کہ عام طور پر گشتی فوج یا مسلمان خانہ بدوش کرتے ہیں۔ یہ دونوں رواج ہیں۔ اگرچہ مسجد کے نام سے موسوم ہوگئی ہیں۔ مگر اصطلاحِ شریعت میں وہ قطعاً مسجد نہیں۔ اس کی ہر چیز اینٹ، لکڑی، زمین، چٹائی وغیرہ مالکوں کی ہوگی۔ ایسی مسجد میں اگر کوئی دُوسرا شخص اپنی مرضی سے چٹائی وغیرہ وقف بھی کردے گا تو اس کو ھبہ یا تحفہ تو کہا جاسکتا ہے وقف للمسجد نہیں کہا جاسکتا۔ اس جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ بھی استعمال ہوسکتی ہے چنانچہ فتوٰی شامی جلد اوّل صہ ۶۱۵ پر ہے وَمَسَاجِدُ حِيَاضٍ وَأَسْوَاقٍ لَاتَوَاسَعُ۔ اگر پہلی کھیتوں والی مسجد کو مالک نے وقف کردیا۔ ظاہراً یا اشارۃً تو وہی مسجد اب مستقل مسجد متصور ہوگی۔ جب وقف ہوئی اس وقت تک اِس مسجد کو مسجدِ دار کی مثل کہا جائے گا۔ اور اس کو مسجد کا نام نہیں دیا جائے گا۔ اگرچہ محراب وغیرہ بھی بنا ہو۔ چنانچہ فتاوٰے تنویر الابصار جلد اوّل صہ ۶۱۵ پر ہے :۔ لِاَنَّهُ لَيْسَ بِمَسْجِدٍ شَرْعًا۔ اس لئے کہ وہ شرعی مسجد نہیں تیسری قسم یہ ہے کہ واقف نے اپنی زمین کو وقف کرکے باقاعدہ اس پر مسجد بنائی۔ اب یہ مسجد قیامت تک کے لئے مسجد ہے۔ آبادی ہو یا نہ ہو جماعت اور نماز، اذان ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صہ ۴۵۸ پر ہے کہ وَقِيْلَ هُوَ مَسْجِدٌ اَبَدًا وَهُوَ الْاَصَحُّ۔ کہا گیا ہے کہ یہ مسجد ہمیشہ ہمیشہ مسجد ہے۔ ایسی مسجد اگر زمانے کی گردش سے جنگل میں آگئی ویران ہوگئی۔ اُس کے آس پاس دُور دور آبادی نہ رہی تو اس کے سامان کو حاکمِ اسلام یا مفتیٔ وقت کے فیصلہ اور فتوٰی کے حکم سے کسی اچھی پاک جگہ لگانے کے لئے فروخت بھی کیا جاسکتا ہے اور فی سبیل اللہ دوسری مسجد میں بھی دیا جاسکتا ہے۔ مالک یا متولّی کا اس پر کچھ حق نہ رہا۔ چنانچہ شامی جلد سوم صہ ۵۱۲ پر ہے۔ کہ عَنْ شَمْسِ الْاَئِمَّةِ الْحُلْوَانِيِّ اَنَّهُ سُئِلَ عَنْ

مَسْجِدٍ اَوْ حَوْضٍ خَرَبَ وَلَا یَحْتَاجُ اِلَیْهِ لِتَفَرُّقِ النَّاسِ عَنْهُ هَلْ لِلْقَاضِیْ اَنْ یَصْرِفَ اَوْ یَصْرِفَ اَوْقَافَهٗ اِلٰی مَسْجِدٍ اَوْ حَوْضٍ اٰخَرَ۔ فَقَالَ نَعَمْ ۔ (ترجمہ) کسی نے شمس الائمہ حلوانی سے پوچھا کہ اگر کوئی مسجد یا کوئی حوض ویران ہو جائے۔ آبادی وہاں سے ہٹ جائے تو کیا قاضی کے حکم سے اس مسجد کا سامان وہاں سے لے جا کر اکھاڑ کر دوسری مسجد یا حوض میں لگا سکتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ہاں لگا سکتے ہیں۔ اسی کے صفحہ ۵۱۳ پر اس طرح ہے کہ قَالَ وَلَوْ خَرِبَ الْمَسْجِدُ وَمَا حَوْلَهٗ وَتَفَرَّقَ النَّاسُ عَنْهُ لَا یَعُوْدُ اِلٰی مِلْكِ الْوَاقِفِ (الخ) اسی طرح فتاوٰی قاضی خان میں ہے اور سامان اٹھا لینے کے بعد بطورِ نشان اس جگہ پر ایک چبوترا مع محراب کے بنا کر چھوڑ دیا جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ پھر کبھی وہاں آبادی ہو جائے تو وہاں مسجد ہی تعمیر ہو۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ۔

کتبہ

مسجد کے نیچے دکانیں بنانے کا حکم

سوال نمبر۱۸:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہماری مسجد جو کہ مقام منگووال مین بازار میں عرصہ چالیس سال سے پرانے وقتوں کی بنی ہوئی تھی۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مسجد کی پرانی عمارت کا بالائی حصہ مینار وغیرہ پھٹ کر کافی حد تک کمزور ہو چکے تھے جس کے کسی وقت بھی گر جانے کا خطرہ تھا۔ ۲: مسجد کی نیچے والی عمارت بھی پرانے زمانے کی اینٹوں کی گارے سے بنی ہوئی تھی۔ جس کے آس پاس کلر اور سیم کے کافی اثرات تھے۔ فرش بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ جس سے مسجد کی نیچے والی عمارت بھی تقریباً شکستہ ہی تھی۔ اگرچہ اس کی دیوار اور بنیادیں بدستور تھیں۔ کلر اور سیم سے مسجد کے ہال کمرے میں کچھ تعفن سا بھی پھیلا رہتا تھا۔ ۳: مسجد میں عام رسم و رواج کے مطابق محراب بھی کھلی شکل میں نہ تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر مسجد بھی بے آباد تھی۔ ۴: موجودہ زمانے کی بے حسی کے سبب اور اسلام کی بے رغبتی کی وجہ سے مسجد کی آمدنی کا بھی کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ لوگ اور عوام الناس مقامی طور پر مسجد کی ضروریات اور حالات زمانہ کے مطابق ہر ماہ چندہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان تمام چیزوں کے پیش نظر اور زمانے کی موجودہ تعمیراتی ترقیوں کی بناء پر جب کہ دنیا دار اپنے اپنے گھر بڑی شان و شوکت سے بنا رہے ہیں ہم اراکین مسجد ھٰذا نے تمام بستی والوں کے عوام، خواص اور تمام مسجد کے امام صاحبان کی صلاح اور مشورے

کے بعد مسجد کو شہید کرکے ایک نئے مضبوط طریقے کے مطابق جس سے مسجد کو دائمی طور پر فائدہ پہنچتا رہے۔ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ پھر اس منصوبے کی تکمیل کے لئے اس بستی کے لوگوں سے چندے وصول کئے گئے۔ جو بخوشی تمام لوگوں نے دیئے۔ چنانچہ ہم اراکین نے مسجد کی پرانی عمارت کو شہید کر دیا۔ اور نئے نقشہ کے مطابق اس کی بنیادیں بھر دیں۔ اور چند دنوں کے بعد تین دکانیں نیچے کے حصہ میں اور ایک چھوٹی سی مسجد تقریباً چھ صفوں کی تعمیر کر دی گئی۔ اور مزید وضوگاہ بھی نیچے کے حصہ میں تعمیر کی گئی۔ نیچے کے حصہ میں مزید وسعت کے لئے ۴ فٹ چوڑی اور ۲۰ فٹ لمبی زمین بھی شامل کی گئی۔ مسجد کی اوپر کی منزل کا سارا حصہ مسجد بنایا گیا۔ اور اوپر وسیع مسجد تعمیر ہوگئی۔ اس مسجد کے تمام رقبے میں ذرہ برابر بھی زمین یا تعمیری عمارت یا دروازہ وغیرہ کسی انسان کی ملکیت نہیں۔ سب ہی مسجد ہے۔ اس زیریں تعمیر مکمل ہونے کے بعد گاؤں کے چند لوگوں نے یہ اعتراض کر دیا۔ کہ یہ نیچے دکانیں بنانا غلط ہے اور یہ سب مسجد ناجائز ہے۔ یہاں نماز، درس و تدریس اور نماز جمعہ سب منع ہے یہاں تک کہ قریبی علماء سے اس بات کے فتوے بھی آئے۔ کہ مسجد کے نیچے دکانیں بنانا ناجائز ہے۔ ہم سب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا ہمیں قانونِ شریعت کا فتویٰ عطا فرمایا جائے کہ حدیث و قرآن کے قانون کے مطابق کیا یہ مسجد ٹھیک ہے یا نہیں؟ وہ فتوے بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ ہمارے اس بیان پر تمام گواہان حلفیہ بیان دیتے ہیں۔ یہ بیان بالکل سچا، حلفیہ اور درست ہے۔ لہٰذا آپ کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہمیں صحیح فتویٰ عطا کرکے پریشانی سے نجات دلوائی جائے۔

سائل: محمد صادق صدر انجمن محبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منگووال ضلع گجرات۔ ۱۰/۴ ۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ ط

الجواب

صورتِ مسئولہ میں بحیثیت مفتیِ اسلام ہونے کے میں نے بہت تحقیق و تفتیش کی ہے اور خود جا کر موقعہ دیکھا ہے۔ فریقین کے بیان سن کر قلم بند کئے ہیں۔ بیان کو حسبِ موقعہ پایا۔ وہ فتاویٰ بھی میری نظر سے بغور گزرے ہیں۔ جو میرے استاد بھائیوں، میرے بزرگوں نے مسجد مذکور کی عمارتِ نو کے خلاف جاری فرمائے۔ مگر میں اُن تمام فتاویٰ سے اتفاق نہیں کرتا۔ اُن فتاویٰ کے حوالہ جات اگرچہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح و درست ہیں۔ مگر اُن سے صورتِ مسئولہ کے عدمِ جواز پر استدلال محض عدمِ تفہیم کی بناء پر ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کتبِ فقہاء کی تمام مندرجہ عبارات کو متنازعہ فیہ صورت میں فریقِ مخالف کی دلیل بنانا کسی طور مناسب نہیں۔ شرعی قوانین سے ایسی کوئی عبارت ثابت نہیں۔ جس

سے مسجد کے لئے مسئولہ شکل میں دکانوں کا بنانا منع ہو۔ میری تحقیق کے مطابق منگووال کی یہ مسجد اور اس کی یہ نیچے دکانوں والی عمارت بالکل شرعاً جائز ہے اور قابل قبول ہے۔ لہٰذا شرعی فتویٰ جاری کیا جاتا ہے کہ مذکورہ مسجد کے نیچے دکانیں بنانا بالکل ٹھیک ہیں۔ کچھ ممانعت شرعی نہیں۔ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔ یہ فتویٰ مندرجہ ذیل دلائل کی بنا پر بالکل جائز اور صحیح ہے۔

دلیل ۱ فتاویٰ تنویر الابصار مکمل ایک جلد صفحہ ۳۸۹ پر ہے:۔ اَرَادَ اَھْلُ الْمَحَلَّۃِ نَقْضَ الْمَسْجِدِ وَبِنَاءَہٗ اَحْکَمَ مِنَ الْاَوَّلِ. اِنَّ الْبَانِیَ مِنْ اَھْلِ الْمَحَلَّۃِ لَھُمْ ذَالِکَ وَاِلَّا لَا وَاِذَا جَعَلَ تَحْتَہٗ سِرْدَابًا لِصَالِحِہٖ جَازَ ۃ۔ (ترجمہ) یعنی محلے والے بانی مسجد یا متولی مسجد کی اجازت سے پرانی مسجد کو شہید کرکے نئی مسجد جو زیادہ مضبوط اور فائدہ مند ہو۔ بنانا چاہیں تو جائز ہے۔ شریعت اسلامیہ میں کوئی ممانعت نہیں۔ اور جب وہ لوگ اسی مسجد کے نیچے تہہ خانے مسجد کے فائدے کے لئے بنانا چاہیں تو بھی شرعاً بالکل جائز ہے۔ یہ تھی فتاویٰ تنویر الابصار اور فتاویٰ دُرِّمختار کی مشترکہ عبارت، اس سے ثابت ہوا کہ پرانی مسجد شہید کرکے اس کے نیچے تہ خانہ بنانا جائز ہے۔ تہ خانہ کو عربی زبان میں سرداب کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔ جلد سوم صفحہ ۵۱۲ پر ہے:۔ "سِرْدَابًا" جَمْعُہٗ سَرَادِیْبُ وَھُوَبَیْتٌ یُّتَّخَذُ تَحْتَ الْاَرْضِ لِغَرَضِ تَبْرِیْدِ الْمَاءِ وَغَیْرِہٖ ۃ (ترجمہ) سرداب کی جمع سرادیب ہے وہ کمرہ جو زمین کے نیچے بنایا جاتا ہے پانی کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے یا کسی اور فائدے کے لئے۔ ظاہری طور پر سرداب اور دکان میں کوئی فرق نہیں۔ نہ اوپر نیچے سے کچھ فرق پڑتا ہے۔ جو چیز جس طرح بھی مسجد کو فائدہ پہنچا سکے وہ مسجد کے لئے نیچے اور اوپر بنانا جائز ہے۔ اس لئے ان دونوں عبارتوں میں پہلے تو لفظ "اَحْکَمْ" نے عمومیت پیدا کی۔ کیونکہ اَحْکَمُ "حُکْمٌ" سے بنا ہے جس کے معنیٰ مضبوط بھی ہیں اور فائدہ مند بھی۔

پھر دوسرا لفظ وَغَیْرِہٖ ہے۔ اس نے بھی عمومیت کا فائدہ پہنچایا۔ یعنی جس عمارت سے مسجد مضبوط بھی اور فائدہ مند بھی ہو۔ اُس نقشے پر مسجد بنانا جائز ہے اور ظاہر بات ہے کہ فی زمانہ دکانوں سے مسجد کو وہ فائدہ پہنچتا ہے جو دوسری طرح نہ پہنچ سکے اور جب فقہاءِ کرام کے نزدیک پرانی مسجد کو شہید کرکے از سرِ نو مسجد تعمیر کرنا یہاں تک کہ اس کے نیچے تہہ خانہ بھی بنانا جائز ہے۔ تو دکانیں بنانا کیوں منع ہوگا۔ **دلیل ۲**:۔ فقہاءِ کرام فرماتے ہیں کہ مسجد کا نقشہ بھی تبدیل کرنا جائز ہے چنانچہ فتاویٰ قاضی خان جلد دوم صفحہ نمبر ۲۹۳ پر ہے:۔ وَلِاَھْلِ الْمَحَلَّۃِ تَحْوِیْلُ

بَابَ الْمَسْجِدِ مِنْ مَوْضِعٍ آخَرَ۔ (ترجمہ) محلے والوں کے لئے جائز ہے کہ مسجد کا دروازہ سابقہ نقشے سے بدل دیں اور دوسری جگہ بنا دیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ پرانی مسجد کا نقشہ باقی رکھنا ضروری نہیں۔ **دلیل ۳**:۔ قانونِ شریعت کے مطابق مسجد کی وہ جگہ جہاں کبھی نماز پڑھی جاتی تھی۔ مسجد کو شہید کرنے کے بعد وہاں حوض بنانا یا وضوگاہ بنانا جائز ہے۔ چنانچہ علامہ شامی فتاویٰ ردُّ المختار جلد سوم صفحہ ۵۱۲ پر ہے:۔ وَاَمَّا اَهْلُهَا فَلَهُمْ اَنْ يَهْدِمُوْهُ وَيُجَدِّدُوْا بِنَاءَهُ وَيَفْرِشُوْا الْحُصُرَ وَيُعَلِّقُوْا الْقَنَادِيْلَ لٰكِنْ مِنْ مَالِهِمْ لَا مِنْ مَالِ الْمَسْجِدِ اِلَّا بِاَمْرِ الْقَاضِيْ۔ خُلَاصَةٌ۔ وَيَضَعُوْا حِيْضَانَ الْمَاءِ لِلشُّرْبِ وَالْوُضُوْءِ (الخ) (ترجمہ) محلے والوں کے لئے جائز ہے کہ اپنا علیحدہ چندہ کر کے سابقہ مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد تعمیر کریں۔ اس میں چٹائیاں بچھائیں۔ چراغاں کریں۔ لیکن مسجد کا سابقہ جمع شدہ مال بغیر حاکم یا مفتیٔ اسلام کے حکم کے خرچ نہ کریں۔ اور مسجد میں حوض بھی بنا سکتے ہیں۔ پانی پینے اور وضو کرنے کے لئے جب مسجد کی نئی تعمیر میں برائے وضو حوض بھی بنا سکتے ہیں جبکہ پہلے نہ تھے تو مسجد کی حدود میں بشکل نو تعمیر دکان بنانا بھی جائز ہے۔ اگرچہ پہلے وہاں نماز پڑھی جاتی رہی ہو۔ دیکھو مسجد میں وضو کرنا یا وضو کے قطرے ٹپکانا منع ہیں۔ مگر تعمیرِ نو کے بعد نقشے کی تبدیلی کی وجہ سے یہ کام جائز ہوا۔ اگرچہ صورت مسئولہ کے جواز کے لئے یہ دلائل کافی ہیں مگر چونکہ مزید وضاحت درکار ہے۔ اور سابقہ فتاویٰ کے پیش کردہ دلائل کا صحیح مطلب بتانا بھی اشد لازم ہے اس لئے ملاحظہ ہو۔ **دلیل ۴**:۔ ھدایہ شریف جلد دوم صفحہ ۶۲۰ پر ہے:۔ وَلَوْ كَانَ السِّرْدَابُ لِمَصَالِحِ الْمَسْجِدِ جَازَ كَمَا فِيْ مَسْجِدِ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ۔ وَرَوَى الْحَسَنُ عَنْهُ اَنَّهُ قَالَ اِذَا جَعَلَ السُّفْلَ مَسْجِدًا وَعَلٰى ظَهْرِهٖ مَسْكَنٌ فَهُوَ مَسْجِدٌ لِاَنَّ الْمَسْجِدَ مِمَّا يَتَأَبَّدُ وَذَالِكَ يَتَحَقَّقُ فِي السُّفْلِ دُوْنَ الْعُلْوِ وَعَنْ مُحَمَّدٍ عَلٰى عَكْسِ هٰذَا لِاَنَّ الْمَسْجِدَ مُعَظَّمٌ وَاِذَا كَانَ فَوْقَهٗ مَسْكَنٌ اَوْ مُسْتَغَلٌّ يَتَعَذَّرُ تَعْظِيْمُهٗ وَعَنْ اَبِيْ يُوْسُفَ اَنَّهٗ جَوَّزَ فِي الْوَجْهَيْنِ۔ (ترجمہ) اگر مسجد کے نیچے تہ خانہ ہو مسجد کے فائدے ہی کے لئے تو بالکل جائز ہے۔ جیسے کہ بیت المقدس کی مسجد کے نیچے تہ خانہ بنایا گیا۔ حسن نے امام اعظم سے روایت کیا کہ جب نیچے مسجد ہو۔ اس کے اوپر اور گھر بنانا جائز ہے۔ اس لئے کہ مسجد دائمی ہوتی ہے۔ یہ دوام کی بقا نیچے ہونے سے ہوگی نہ کہ اوپر سے۔ اور امام محمد کے نزدیک اوپر مسجد اور نیچے مکان وغیرہ جائز ہے۔ کیونکہ اللہ کی سب مسجدیں قابلِ تعظیم ہیں۔ اور تعظیم بلندی سے ہوگی۔ لیکن امام یوسف کے نزدیک دونوں طرح جائز

ہے۔ خواہ مسجد کے نیچے دکان ہو یا اُوپر مکان ہو بالکل جائز ہے۔ منگووال کی یہ مذکورہ مسجد امام یوسف اور امام محمد کے نزدیک بالکل جائز ہے۔ ان دونوں حضرات کو فقہیہ اسلامیہ میں صاحبین کا درجہ حاصل ہے۔ ان چار دلائل سے ثابت ہُوا کہ مسجد کی نئی عمارت ہو یا ابتدائی۔ ہر طرح جائز ہے کہ اس کے نیچے دکانیں بنائی جائیں۔ انہی دلائل کی رُو سے فتویٰ جاری کیا جاتا ہے کہ متنازعہ فیہ منگووال کی مسجد نئے نقشے پر تعمیر شدہ جس کے نیچے پہلے دکانیں نہ تھیں۔ اب بنائی گئی ہیں بالکل جائز ہے اور اس مسجد کی سابقہ عمارت کو اس لئے شہید کیا گیا تھا کہ وُہ بہت بوسیدہ ہوگئی تھی۔ اور جگہ جگہ پھٹ چکی تھی۔ کہ جس کے کسی نہ کسی وقت گر جانے کا اندیشہ تھا۔ جیسا کہ اہالیانِ منگووال کے حلفیہ بیانات رُوبرُو مخالف فریق درج سوال ہیں۔ قانونِ شرعی کے مطابق بلا ضرورت مسجد کو شہید کرنا بھی گناہ ہے۔ چنانچہ شامی جلد سوم صفحہ ۵۱۲ پر ہے ؛ وَعَنِ الْهِنْدِيَّةِ مَسْجِدٌ مَبْنِيٌّ. أَرَادَ رَجُلٌ أَنْ يَنْقُضَهُ وَيَبْنِيَهُ أَحْكَمَ لَيْسَ لَهُ ذَالِكَ لِأَنَّهُ لَا وِلَايَةَ لَهُ - إِلَّا أَنْ يَخَافَ أَنْ يَنْهَدِمَ إِنْ لَمْ يُهْدَمْهُ (ترجمہ) ایک شخص نے بنی ہوئی مسجد کے متعلق یہ ارادہ کیا کہ اس کو گرا کر نئی مضبوط عمارت سے تعمیر کر دوں۔ ہرگز جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مسجد میں کوئی حق نہیں (اس لئے کہ سب مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں)۔ ہاں اگر اس کو خوف ہو کہ اگر یہ شہید نہ کی گئی تو کبھی نہ کبھی گر جائے گی۔ تو گرا کر نئی بنا سکتا ہے۔ جب سوالِ مذکورہ سے ثابت ہوگیا کہ یہ بھی بوسیدہ ہو چکی تھی تب اس کا شہید کرنا اور دوبارہ بنانا جائز ہوگیا۔ اب بنانے والوں کو اختیار تھا کہ جس نقشے پر چاہتے بناتے۔ اس سابقہ نقشے کی پابندی شرط نہ تھی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا شرعی دلائل سے ثابت کیا گیا۔ اس فتویٰ کو سمجھ لینے کے بعد اب سابقہ مخالف فتووں کا جواب ملاحظہ فرمائیے اس تعمیرِ نو کی مخالفت میں میرے جن بزرگوں نے فتوے جاری کئے ہیں اُن کا مؤقف یہ ہے کہ ہر مسجد کی ابتدائی تعمیر کے وقت تو جائز ہے کہ نیچے دکانیں بنائی جائیں۔ لیکن بنی ہوئی مسجد کو شہید کرکے جب کہ پہلے زمین پر مسجد ہو۔ پھر اب نیچے دکانیں بنائی جائیں اُوپر مسجد بنائی جائے یہ منع ہے اِسی مؤقف کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ان لوگوں نے مذکورہ مسجد کی نئی تعمیر کو ناجائز قرار دیا۔ اسی مؤقف کی تائید میں حسب ذیل کتب فقہاء سے چند دلائل پیش کئے۔ مگر میں اس مؤقف کے خلاف ہوں۔ کیونکہ یہ مؤقف صراحتاً کہیں بھی موجود نہیں ہے اور نہ اُن کی پیش کردہ عبارات فقہ میں اس مؤقف کی تائید ثابت ہے۔ چنانچہ مخالف کی دلیل کی فقہی عبارت۔ فتاویٰ عالمگیری جلد دوم صفحہ ۴۵۵ پر ہے ؛ وَإِذَا أَرَادَ إِنْسَانٌ أَنْ يَتَّخِذَ تَحْتَ الْمَسْجِدِ حَوَانِيتَ غَلَّةً لِمَرَمَّةِ الْمَسْجِدِ أَوْ فَوْقَهُ لَيْسَ لَهُ ذَالِكَ

(ترجمہ) جب کسی انسان نے مسجد کے نیچے دکان بنانے کا ارادہ کیا مسجد کی مرمت کے لئے یا اس کے اوپر تو جائز نہیں۔ دُوسری عبارت یہ ہے:۔ قَیِّمُ الْمَسْجِدِ لَا یَجُوْزُ لَهٗ اَنْ یَّبْنِیَ حَوَانِیْتَ فِیْ حَدِّ الْمَسْجِدِ اَوْ فِیْ فِنَائِهٖ لِاَنَّ الْمَسْجِدَ اِذَا جُعِلَ حَانُوْتًا وَّمَسْكَنًا تَسْقُطُ حُرْمَتُهٗ وَهٰذَا لَا یَجُوْزُ ۵ تیسری عبارت بحر الرائق پنجم صفحہ ۲۴۹ پر ہے۔ لَا یَجُوْزُ لِقَیِّمِ الْمَسْجِدِ اَنْ یَّبْنِیَ حَوَانِیْتَ فِیْ حَدِّ الْمَسْجِدِ اَوْ فِنَائِهٖ ۵۔ چوتھی عبارت فتاوٰی قاضی خاں جلد دوم صفحہ ۲۹۳ پر ہے:۔ وَلَوْ اَنَّ قَیِّمَ الْمَسْجِدِ اَرَادَ اَنْ یَّبْنِیَ حَوَانِیْتَ حَرِیْمِ الْمَسْجِدِ مَسْكَنًا اَوْ مُسْتَغَلًّا ۵۔ انہی الفاظ میں فتاوٰی سراجیہ اور کتاب صلوٰۃ مسعودی کی عبارتیں بھی مرقوم ہیں مندرجہ بالا ہر چہار عبارات میں باوجود کچھ تغیّر لفظی کے ترجمہ یہی ہے کہ مسجد کے منتظم کے لئے جائز نہیں کہ حدودِ مسجد یا فنائے مسجد میں کوئی دکان یا مکان بنائے۔ یہ تھیں وُہ چند عبارت کہ جن میں غور نہ کرنے کی بنا پر ہمارے احباب نے دھوکا کھایا۔ ان عبارات میں صراحتًا کہیں بھی ایسا کوئی لفظ موجود نہیں۔ جن سے یہ موقف ظاہر ہو کہ مسجد کی ابتدائی عمارت میں تو دکانیں بنانا جائز ہیں۔ لیکن پرانی مسجد شہید کر کے نئے نقشے کے تحت دکانیں منع ہیں۔ پس ان حضرات کا مندرجہ عبارات سے اپنے موقف کے تحت استدلال قطعًا غلط ہوا۔ ہاں بادی النظر میں مطلقًا ممانعت ظاہر ہوتی ہے۔ مگر وُہ کسی کا مسلک نہیں۔ نہ ہمارے ان بزرگوں کا، نہ متقدمین و متاخرین، فقہاء کرام کا، کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں کہ ابتداءً مسجد کی زمین کی مصلحتوں کے لئے مَسْكَنٌ یا دُکان یا تہ خانہ بنانا منع ہے۔ اگر ان عبارتوں کا صحیح مفہوم نہ لیتے ہُوئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان عبارات سے مطلقًا ممانعت ثابت ہے تو ان عبارتوں سے ٹکراؤ اور تعارض پیدا ہو گا۔ جو اپنے دلائل کے ضمن میں ہم نے بیان کیں۔ حالانکہ ان اقوال سے بلا قید مطلقًا جواز ثابت ہو رہا ہے نہ ان عبارات سے یہ مقصد ہے کہ اوّلًا تو جائز ہے مگر جب مسجد کی عمارت مکمل ہو جائے۔ تب نیچے دکان یا مکان یا اُوپر مکان وغیرہ منع ہو۔ یہ مسلک بجز ان بزرگوں کے اور کسی محقق کا نہیں۔ کیونکہ اس موقف میں چند قباحتیں ہیں:۔

۱۔ پہلی یہ کہ ان عبارتوں میں اس موقف کی تائید میں اشارۃً یا کنایۃً بھی کوئی لفظ نہیں چہ جائیکہ صراحتًا ہو۔ ۲۔ دُوسری یہ کہ اس موقف سے بہت سی مساجدِ سابقہ پر زد پڑتی ہے۔ چنانچہ کائنات کی سب سے پہلی مسجد، مسجدِ اقصیٰ جس کی مختصر ابتداء حضرت ابراہیم نے ایک محراب بنا کر کی۔ اور جس کا سامانِ تعمیری پتھر، لکڑی، وغیرہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جمع کیا۔ اور جس کا سنگِ بنیاد حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے تین ہزار ایک سَو دس سال ۳۱۱۰ کے بعد اور حضرت ابراہیم کا عراق سے ہجرت کرنے

سے ایک ہزار بیس ۱۰۲۰ سال اور حضرتِ موسیٰ کے مصر سے نکلنے کے پانچ سو بانوے ۵۹۲ برس بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے رکھا۔ اور بہت بڑی مسجد بنائی۔ جس کا نقشہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ آپ نے اپنی وفات شریف سے چند دن پیشتر وہ تمام سامان اور خدا تعالیٰ کا بتایا ہُوا نقشہ حضرتِ سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا۔ اسی نقشے کے مطابق آپ نے تعمیر کی یہ عمارت بہت گہری بنیادوں والی سنگِ مرمر سے بنی ہُوئی جس کو یہودی اصطلاح میں ہیکل اور اسلامی تہذیب میں مسجد کہا جاتا تھا۔ لمبائی چوڑائی اور بلندی کے اعتبار سے ساٹھ ہاتھ تھی۔ اس کے اُوپر ساٹھ ہاتھ لمبا چوڑا اونچا بالاخانہ بنایا۔ اردگرد برآمدے اور کمرے بنائے گئے۔ مگر نیچے تہہ خانہ کوئی نہ تھا۔ دیکھو تفسیر حقانی جلد پنجم ص ۵۸ پر۔ حضرت سلیمانؑ کے ایک ہزار سال بعد بخت نصر نے مسجدِ اقصیٰ کو بنیادوں تک شہید کر کے آگ لگا دی۔ ستر سال بعد شاہِ ایران خسرو نے اس کو دوبارہ انہیں بنیادوں پر تعمیر کیا۔ پھر حضرت مسیح سے ایک سو پچاس ۱۵۰ سال پہلے رومیوں نے بیت المقدس پر حملہ کر کے شہر اور مسجد اقصیٰ کو بالکل گرا کر ہل چلوا دیا۔ پھر حضرت عیسیٰ کے عہد میں یہودیوں نے اُس کو تعمیر کیا۔ لیکن سابقہ نقشے سے مختلف انہوں نے نیچے تہہ خانہ بھی بنایا۔ اب تک وہی تعمیر ہے۔ اسی تعمیر میں آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شبِ معراج نماز میں امامتِ انبیاء کرام فرمائی۔ اسی تعمیر کی طرف نبی کریم اور تمام صحابہ عرصہ تک بطورِ قبلہ نمازیں ادا فرماتے رہے۔ مگر تعمیر جدید کی بنا پر کبھی اعتراض نہ ہُوا۔ نہ اس میں نماز سے روکا گیا۔ بلکہ تمام فقہاء کرام مسجد کے نیچے دکانیں اور تہہ خانے بنانے کے ثبوت میں مسجدِ اقصیٰ کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ چنانچہ بحر الرائق ص ۲۵۱ جلد پنجم، ھدایہ جلد دوم صفحہ ص ۶۲۰ پر ہے۔ فتاوٰی تنویر اور دُرِّ مختار ص ۵۱۲ جلد سوم میں ہے: اِذَا جَعَلَ تَحْتَہٗ سِرْدَابًا لِمَصَالِحِہٖ اَیِ الْمَسْجِدِ جَازَ کَمَسْجِدِ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ اھ (ترجمہ) مسجد کے نیچے تہہ خانہ بنایا مسجد کے فائدوں کے لئے تو جائز ہے۔ جیسے کہ بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ میں بنایا گیا۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرتِ سلیمان بانیٔ مسجدِ اقصیٰ نے ابتدائی تعمیر میں تہہ خانہ کوئی نہ بنایا۔ اور مفسرین و فقہاء فرماتے ہیں کہ اس کے نیچے اب تہہ خانہ ہے۔ ظاہر ہُوا کہ بعد میں بنایا گیا اور کسی بھی عمارت کے نیچے کوئی نئی عمارت بنانے کے لئے لازم ہے کہ پہلے سب پچھلی موجودہ عمارت ڈھا دی جائے یا خود گر جائے بغیر اس کے ناممکن ہے تو جب مسجدِ اقصیٰ کو ڈھا کر نئے نقشے پر نیچے تہہ خانہ بنانا جائز ہے۔ تو منگووال کی مسجد کے نیچے دکانیں بنانا کیوں منع ہوں گی۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ سابقہ فتووں کا یہ مؤقف ہی غلط ہے اور یہ مؤقف صرف اس لئے اختیار کیا گیا کہ ان کو دُرِّ مختار

کی ایک عبارت پر غور نہ کرنے کی بنا پر دھوکا لگا۔ وُہ عبارت یہ ہے۔ درِ مختار مکمل ایک جلد صفحہ ۳۸۹ پر ہے :- اَمَّا لَوْ تَمَّتِ الْمَسْجِدِيَّةُ ثُمَّ اَرَادَ الْبِنَاۤءَ مُنِعَ۔ وَلَوْ قَالَ عَنَيْتُ ذٰلِكَ لَمْ يُصَدَّقْ فَاِذَا كَانَ هٰذَا فِي الْوَاقِفِ فَكَيْفَ بِغَيْرِهٖ فَيَجِبُ هَدْمُهٗ ؕ (ترجمہ) لیکن اگر مسجدیت مکمل ہوگئی۔ پھر ارادہ کیا کچھ بنانے کا تو منع کیا جائے گا۔ اور اگر کہا کہ میں نے پہلے ہی ارادہ کیا تھا۔ اِس مکان بنانے کا۔ تو نہ مانی جائے گی۔ پس جب واقف پر یہ پابندی ہے تو دوسرے کا کیا حال ہے! لہٰذا واجب ہے اس کا گرانا۔ یہ ہے وُہ عبارت کہ جس میں ہمارے بزرگوں نے بغیر سوچے سمجھے نیچے دکانیں بنانے کے عدم جواز کا مُوقف بنایا۔ انہوں نے تمّتِ المسجدیت سے مسجد کی عمارت سمجھی۔ حالانکہ اسلام میں مسجد عمارت کا نام نہیں بلکہ موقوفہ زمین کا نام ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص زمین کا مخصوص ٹکڑا مسجد کے لئے وقف کر دیتا ہے اور لوگوں کو اِس میں عام نماز پڑھنے کی اجازت دے دیتا ہے اگرچہ کوئی چار دیواری یا حدود اربعہ بھی نہ لگائے گئے ہوں۔ عند اللہ مسجدیت مکمل ہے جیسے کہ عام عیدگاہوں میں دیکھا گیا ہے۔ اس عبارت میں تعمیر مُراد نہیں۔ ورنہ فقہاء کرام خود اِس طرح فرماتے۔ لَوْ تَمَّتْ عِمَارَةُ الْمَسْجِدِ ؕ اگر مسجد کی عمارت مکمل ہو جائے اور مسجدیت بمعنی مصدر کہنے کی بجائے صرف تَمَّتِ الْمَسْجِدُ ط کہا جاتا۔ مگر اس طرح نہ کہا۔ بلکہ مسجدیت کو مصدر بنا کر کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ یہاں تکمیلِ وقف مراد ہے۔ نہ کہ عمارت، یہاں عمارت مُراد لینے سے تین خرابیاں لازم آئیں گی۔ (۱) یہ عبارت کی تفسیر یا تشریح یا تاویل نہ ہوگی بلکہ تحریف ہوگی۔ اِس لئے کہ تفسیر کے لئے نقل اور تشریح یا تاویل کے لئے قرینہ شرط ہے (دیکھو کتب اصولِ تفسیر) اِس کے بغیر تحریف ہی ہوتی ہے اور وُہ گُناہ ہے۔ (۲) عبارت کا یہ مطلب آپ کے مذکورہ مُوقف کے بھی خلاف ہے اس لئے کہ جب عمارت مکمل ہوگئی تو نیچے دُکانیں کس طرح بن سکتی ہیں۔ کیا کاغذ کی عمارت ہے جو ذرا سی اُٹھا کر اُوپر کر کے نیچے جلدی سے دُکانیں بنالی جائیں۔ (۳) فقہاء کرام کی اِس عبارت کا اگر یہ مطلب لیا جائے کہ یہاں تکمیلِ عمارت ہی مراد ہے تو یہ بالکل ہی غلط ہے اور بیکار ہو جائے گی کیونکہ کسی بھی مکان یا مسجد کی عمارت کی تکمیل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب مکمل ہو۔ آج ایک منزل بنانے کا ارادہ ہے تو کل دُوسری منزل بنا لیتا ہے۔ بعض مساجد پانچ پانچ منزل ہوتی ہیں۔ ابھی بھی اُن کی تعمیر مکمل نہ ہوئی۔ بعض مسجدیں امراء کے محلوں میں چند ماہ میں تعمیراً مکمل ہو جاتی ہیں۔ اور بعض برسوں زیرِ تعمیر رہتی ہیں۔ تعمیر کے لئے یہ کہنا کہ (لَوْ تَمَّتْ) بالکل فضول ہے۔ پس دُرِ مختار کی اِس عبارت کو فضولیت سے بچانے کے لئے یہی تسلیم کرنا پڑیگا کہ

تکمیلِ وقف مراد ہے نہ کہ تکمیلِ عمارت۔ اور وقف صرف زمین کا ہو جانا ہی مسجدیت کی تکمیل ہے۔ اِس تمام گفتگو کو سمجھنے کے بعد اب غور کرو کہ ہمارے بزرگوں کی پیش کردہ جملہ عبارات جو ذیل میں درج کی گئیں اُن کا وُہ مطلب ہرگز نہیں جو اُنھوں نے سمجھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص مسجد میں اپنی ملکیت کا مکان یا دکان اُوپر یا نیچے نہیں بنا سکتا کیونکہ جب مسجد بطریقۂ وقف مکمل ہو گئی۔ تو وُہ سب کی سب خالص "اَللّٰہ" کے لیئے ہے۔ کسی مخلوق کا اِس میں کوئی دخل نہیں۔ اب اس میں اپنی ملکیت کا مکان یا دُکان اُوپر یا نیچے بنانا اس کی بے حُرمتی ہے۔ اِس لئے سخت حرام وگناہ ہے۔ اور ایسا مکان وغیرہ ڈھا دیا جائے گا۔ لیکن جب تک بطریقۂ وقف مسجد مکمل نہ ہو۔ اس وقت تک اگرچہ اِسکو مسجد کہا جائے مگر شرعی مسجد نہ ہوگی۔ اُس کے نیچے اوپر، ذاتی، مملوکہ مکان، دکان بنانا جائز ہے۔ یہاں تک کہ اِس مسجد کو بیچ بھی سکتا ہے اور مرنے کے بعد وُہ میراث بھی بن جائے گی۔ چنانچہ ھدایہ شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۶۲۰ پر ہے :۔ قَالَ مُحَمَّدٌ فِی الْجَامِعِ الصَّغِیْرِ وَمَنْ جَعَلَ مَسْجِدًا تَحْتَہٗ سِرْدَابٌ اَوْ فَوْقَہٗ بَیْتٌ وَجَعَلَ بَابَ الْمَسْجِدِ اِلَی الطَّرِیْقِ وَعَزَلَہٗ عَنْ مِلْکِہٖ فَلَہٗ اَنْ یَّبِیْعَہٗ وَاِنْ مَاتَ یُوْرَثُ عَنْہُ لِاَنَّہٗ لَمْ یَخْلُصْ لِلّٰہِ تَعَالٰی لِبَقَاءِ حَقِّ الْعَبْدِ مُتَعَلِّقًا لَہٗ وَلَوْکَانَ السِّرْدَابُ لِمَصَالِحِ الْمَسْجِدِ جَازَ ؕ (توجمہ) امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جامع صغیر میں فرمایا اگر کسی نے مسجد کے نیچے تہہ خانہ یا اس کے اُوپر گھر بنایا اگر اس کا دروازہ بھی علیحدہ عام گلی میں کر دیا۔ اور اُس کو اپنی طرف سے ملکیت سے علیحدہ بھی کر دیا۔ تب بھی اس مسجد کو فروخت کرنا جائز ہے۔ اور مرنے کے بعد وُہ مسجد میراثی مال ہوگا۔ امام محمد کی اِس عبارت کی دلیل میں صاحبِ ھدایہ نے فرمایا۔ اِس لئے کہ یہ مسجد خالص اللہ کی نہ ہوئی بلکہ اس میں بندے کا حق بھی شامل رہا تو گویا یہ وقف مکمل نہ ہوا۔ لیکن اگر وُہ یہ مکان وغیرہ بھی مسجد ہی کے لئے بناتا ہے تو جائز ہے اس عبارت نے مخالف کی تمام پیش کردہ عبارات کی تشریح کر دی۔ یعنی کسی کو ذاتی مکان یا دُکان وغیرہ بنانا جائز نہیں۔ جب واقف نے زمین مکمل طور پر مسجد کے لئے وقف کر دی تو اب اپنی مملوکہ دکان نہیں بنا سکتا۔ اگر وُہ کہے کہ میں نے نیت کی تھی کہ میں اس کے اوپر اپنا ذاتی مکان بناؤں گا۔ تب بھی نہ مانی جائے گی۔ کیونکہ مسجد تحت الثریٰ سے آسمان تک ہوتی ہے۔ نیچے یا اُوپر کسی اور کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ بخلاف دیگر عمارات کے کہ اُن کے نیچے اُوپر کے ملکیت مختلف ہو جاتی ہے جیسا کہ ہمارے شہر کی دگل بلڈنگ اور امریکہ، افریقہ کے بڑے شہروں کے تقریباً سبھی مکان کہ وہاں زمین طول وعرض سے علاوہ فضا کی بلندی بھی ناپ کر فروخت ہوتی ہے اور یہاں یہ عام رواج ہے۔ اِس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا

گویا کہ ہمارے فقہاء کرام کی یہ کرامت ہے کہ انھوں نے یہ قانون بنا کر بتا دیا کہ خبردار کوئی زمانہ ہو کوئی شہر ہو۔ تمہارا آپس کا رواج خواہ کیسا ہی ہو۔ مگر اللہ کی مسجدوں پر کوئی ذاتی گھر نہیں بنا سکتا۔ نہ اُوپر کی فضا فروخت ہو سکے۔ ہاں البتہ یہ قانون کب ہے۔ جبکہ مسجدیت یعنی وقفِ مسجد مکمل ہو جائے۔ پس ثابت ہُوا کہ تمام فقہاء کرام صرف اُن دکانوں کو منع کرتے ہیں۔ جو ذاتی ملکیت کی ہوں۔ جب کہ مسجد مکمل وقف ہو چکی۔ اس تمام گفتگو سے تین باتیں ثابت ہوئیں (۱) جب تک وقفِ مسجد مکمل نہ ہو گا۔ اور مسجد کی زمین یا عمارت واقف کے قبضے میں ہوگی تب تک اُس کو جائز ہے کہ ذاتی دُکان یا مکان اُوپر یا نیچے بنائے۔ چنانچہ بحر الرائق جلد پنجم صفحہ ۲۵۱ پر ہے:۔ اِذَا بَنٰی مَسْجِدًا اَوْبَنٰی غُرْفَۃً وَھُوَ فِیْ یَدِہٖ فَلَہٗ ذَالِکَ ؕ (ترجمہ) جس نے مسجد بنائی اور اپنا غرفہ ذاتی بنایا۔ حالانکہ یہ مسجد اُس کے قبضے میں ہے تو جائز ہے (۲) جب مسجدیت مکمل ہو جائے اور واقف اس جگہ کو مکمل وقف کرکے نمازیوں کے سُپرد کر دے۔ اب اِس میں ذاتی دکان وغیرہ نہیں بنا سکتا۔ یہی مطلب ہے درمختار کی لَوْتَمَّتِ الْمَسْجِدِیَّۃُ والی عبارت کا۔ اور اسی طرف بحر الرائق نے وضاحت فرمائی کہ ارشاد ہُوا وَاِنْ کَانَ حِیْنَ بَنَاہُ خَلّٰی بَیْنَہٗ وَبَیْنَ النَّاسِ ثُمَّ جَآءَ بَعْدَ ذَالِکَ یَبْنِیْ لَا یَتْرُکُہٗ ؕ (ترجمہ) اگر مسجد مکمل کرنے کے بعد پھر آ کر (غرفہ وغیرہ) بنایا تو نہیں چھوڑا جائے گا۔ بلکہ ڈھا دیا جائے گا۔ (۳) شرعی مسجد کے نیچے اُوپر نئی پُرانی عمارت میں دکان مکان وغیرہ ہر چیز بنانی جائز ہے جبکہ مسجد کے فائدے کے لئے ہو اور وقف ہو جیسا کہ اپنے چار دلائل میں ہم نے پہلے ثابت کر دیا۔ بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کا تہہ خانہ پر جو بعد میں ڈھا کر بنایا گیا ہے۔ کسی نے آج تک اعتراض نہ کیا۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ وُہ تہہ خانہ کسی کی ملکیت نہیں۔ چنانچہ ھدایہ شریف جلد دوم صفحہ ۶۲۰ بین السطور میں ہے:۔ کَمَا فِیْ مَسْجِدِ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ فَاِنَّ السِّرْدَابَ فِیْہِ لَیْسَ بِمَمْلُوْکٍ لِاَحَدٍ ؕ جیسے کہ (تہہ خانہ بنا ہے) بیت المقدس کی مسجد میں۔ کیونکہ وُہ تہہ خانہ کسی انسان کی ملکیت نہیں۔ ثابت ہُوا کہ اِذَا تَمَّتِ الْمَسْجِدِیَّۃُ جب مسجد ہونا مکمل ہو گیا۔ تب کوئی ذاتی مکان بنانا جائز نہیں۔ ہاں اللہ کی ملکیت میں بنانا جائز ہے اور اتمام مسجد مراد زمین کو وقف کرنا ہے۔ نہ کہ تکمیل عمارت۔ چنانچہ علامہ شامی اپنے فتاوٰی ردّ المحتار میں فرماتے ہیں صفحہ نمبر ۵۱۲ پر:۔ اَمَّا لَوْتَمَّتِ الْمَسْجِدِیَّۃُ اَیْ بِالْقَوْلِ عَلَی الْمُفْتٰی بِہٖ اَوْ بِالصَّلٰوۃِ فِیْہِ ؕ (الخ) اگر مسجدیت مکمل ہو جائے۔ یعنی بات سے اور یہی صحیح ہے یا نماز پڑھنے سے اُس جگہ ظاہر بات یہ ہے کہ کوئی عمارت کبھی باتوں سے مکمل نہیں ہوتی۔ ہاں وقف کرنا زمین مسجد کا صرف قول و تحریر سے ہی ہو سکتا ہے +

خیال رہے کہ وقف کرنا دو ۲ قسم کا ہے۔ (۱) قولی اور (۲) عملی۔ قولی تو یہ ہے کہ اپنی زرِ خرید زمین جو اپنے لئے خریدی تھی۔ وہ اب مسجد کو دیدے اور کہدے کہ یہاں مسجد کی عمارت بنالو۔ اِس میں مالک کا کہہ دینا اور مسلمانوں کے سپُرد کردینا ہی کافی ہے۔ اگر نہ کہے اور نہ سپُرد کرے تو شرعی مسجد نہیں ہوگی لیکن عملی مسجد۔ کہ کسی زمین کو مسجد کیلئے خریدنے کی نیت سے اپنا روپیہ مسجد کے نام پر نکالا یا لوگوں نے اِس نیت پر چندہ اکٹھا کیا۔ پھر اس روپے سے وہ زمین خریدی۔ تو اب قولی وقف کرنے یا کہنے یا سپُرد کرنے کی ضرورت نہیں۔ خریدتے ہی وُہ مُکمل مسجد ہے اور تمت المسجدیۃ کا حکم اِس پر جاری ہو جائیگا۔ جیسا کہ چوک پاکستان میں حکیم الامت مفتی احمد یار خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مسجد۔ کہ پہلے یہ حکومت کی زمین تھی۔ لوگ اِس پر غاصبانہ نماز پڑھتے۔ شرعاً و قانوناً مسجد نہ تھی۔ حضرت حکیم الامت کے حُکم سے لوگوں نے چندہ دیا۔ انجمن بنی۔ اور اُس چندے سے وُہ زمین حکومت سے خریدی گئی۔ شرعی طور پر خریدتے ہی وُہ مکمل مسجد بن گئی۔ اُس کی سابقہ عمارت بھی اب مسجد بنی۔ پھر اُسی انجمن کے اراکین نے سابقہ کمزور عمارت کو گرا کر نئی عمارت کو بنایا۔ اور نقشہ بھی تبدیل کرکے نیچے درمیان میں چھوٹی مسجد اور اردگرد تمام طرف دکانیں۔ اصل جماعت کی مسجد اُوپر بنائی گئی۔ اور یہ سب دُکانیں مسجد ہی کی ہیں۔ اِسی لئے کسی عالم نے اِس کو ناجائز قرار نہ دیا۔ خود حضرت حکیم الامت نے بھی اراکین پر شرعی اعتراض نہ فرمایا۔ اِس سے بھی ثابت ہُوا کہ مسجد کے نیچے دُکانیں بنانا جائز ہیں۔ جب واقف زمین کا مخصوص حصہ برائے نماز باجماعت وقف کرتا ہے تو شرعاً اُسی وقت وُہ مسجد بن جاتی ہے اور اس مسجد ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غیر کی ملکیت ختم صرف خالصتاً للہ ہوگئی۔ ایک ایک اِنچ مسجد ہوتی ہے۔ لیکن اِس کے باوجود اسی زمین میں طہارت خانے حجرے اور جائے نعلین بناوئے جاتے ہیں۔ کیونکہ اِس سے نہ مسجد کی حُرمت میں فرق پڑتا ہے نہ مسجدیت میں۔ حالانکہ طہارت خانوں میں پیشاب بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن فقہائے کرام کا یہ فرمانا کہ مکان بنانے سے مسجد کی بے حُرمتی ہے تعجب خیز بات ہے کہ پیشاب کرنے سے بے حُرمتی نہ ہو۔ طہارت خانے بنانے سے عزت میں فرق نہ پڑے مگر مکان بنانے سے یا دُکان بنانے سے عزت ختم ہو۔ ثابت ہُوا کہ یہاں حُرمت اور بے حُرمتی سے ہماری اصطلاح مُراد نہیں بلکہ مسجد کی قانونی بے حُرمتی یہ ہے کہ اللہ کے لئے خالص نہ کی جائے۔ کسی بندے کی مِلک شامل ہو۔ جس سے اس کی مسجدیت مکمل نہ رہے۔ جب مسجد میں نقصان اور ضرر واقع ہو تو یہ اُس کی بے حُرمتی ہے۔ لہٰذا خلاصہ کلام کا یہ ہے۔ کہ جس عمارت، دُکان یا مکان اُوپر یا نیچے، پُرانی ابتدائی عمارت یا نئی عمارت جیسے بھی ہو۔ بالکل جائز ہے۔ چنانچہ بحر الرائق جلد پنجم صفحہ ۲۵۱

پر ہے کہ لَوْ بَنٰی بَیْتًا عَلٰی سَطْحِ الْمَسْجِدِ لِسُکْنَی الْاِمَامِ فَاِنَّہٗ لَا یَضُرُّ فِیْ کَوْنِہٖ مَسْجِدًا لِاَنَّہٗ مِنَ الْمَصَالِحِ ﮯ (ترجمہ) اگر امام کی رہائش کے لیے مسجد کی چھت پر گھر بنایا تو جائز ہے کیونکہ اس سے مسجدیت کو کوئی نقصان نہیں ہوتا اس لیے کہ کسی غیر کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اور وہ مسجد ہی کے فائدے کے لئے ہے۔ منگووال کی مذکورہ مسجد کی تمام دکانیں وغیرہ خالص وقف ہیں۔ لہٰذا اِن سے بھی کچھ مسجدیت کی تکمیل میں فرق نہیں پڑتا۔ مَیں نے ہر شخص سے حلفًا یہ بیان بھی لیا تھا۔ کہ اِن دکانوں کی عمارت میں کوئی شخص ذاتی ملکیت کا دعویٰ دار تو نہیں۔ ہر دو فریق نے حلفًا کہا کہ یہ سب دکانیں بھی وقف للّٰہ تعالیٰ ہیں۔ اور مسجد کی ہی مصلحتوں، فائدوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ یہ سب بیان سوال میں درج ہے۔ لہٰذا شرعی تحقیقی فتویٰ جاری کیا جاتا ہے کہ منگووال کی مسجد مذکورہ شریعت کے مطابق عین درست ہے۔ کسی شخص کو اعتراض کرنے کا حق نہیں۔

خیال رہے۔ کہ اس فتوے کا حکم اسی صورت میں جاری ہو سکتا ہے جب کہ پرانی مسجد کو اشد ضرورت کے موقع پر پورا نقشہ تبدیل کر کے بالکل نئی طرز پر بنایا جائے۔ لیکن اگر نقشہ سابقہ ہی رہے۔ تو اس میں کوئی تبدیلی جائز نہیں۔ یہی مطلب ہے حضرت کے فتاویٰ نعیمیہ کی عبارت کا نقشہ تبدیل کرنے کی صورت میں۔ وہ اینٹیں جن پر نماز پڑھی جاتی رہی وہ پھر نماز کی جگہ ہی لگائی جائیں تاکہ مسجد کی حرمت برقرار رہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ﮯ

کتاب

کُفّار کی متروکہ جائداد کا حکم

سوال ۴۲ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہمارے گاؤں دیتوال تحصیل و ضلع گجرات میں سکھوں اور کافروں کا چھوڑا ہوا ایک گردوارہ ہے۔ ہمارے گاؤں کے ایک شخص بہادر خان ولد فضل احمد قوم گوجر نے وہاں مسجد بنانی شروع کر دی ہے۔ بہادر خان مذکور کے پاس نہ تو شریعت کا کوئی فتویٰ ہے اور نہ ہی کوئی حکومتِ پاکستان کا اجازت نامہ فرمایا جائے کہ کیا شریعت کے مطابق یہاں مسجد بنانا اور وہاں نماز پڑھنا جائز ہے کہ نہیں۔ ہم کو شریعت کا فتویٰ عطا فرمایا جائے۔ تمام گاؤں والے اس فتوے کے خواہش مند ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ یہ ہمارا بیان بالکل درست اور سچا ہے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ﮯ۔ اَلسَّائِل رحمت خاں ولد فتح علی نمبردار قوم گوجر ساکن دیتوال ضلع گجرات۔ بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ﮯ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق ہر وہ سامان اور زمین جو کافر لوگ بغیر جنگ اور قتل کے چھوڑ کر بھاگ جائیں وہ سب کا سب بیت المال کی ملکیت میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ زمین اور مکانات وغیرہ جو کافر چھوڑ گیا وہ بھی مالِ غنیمت نہیں بنے گا بلکہ کُلّی طور پر اسلامی بیت المال کی ملکیت میں ہوگا۔ اور بیت المال مکمل طور پر حکومت کے قبضے میں ہوتا ہے۔ بادشاہِ وقت کو اس پر پورا پورا اختیار ہوتا ہے۔ اس زمین وغیرہ کو بادشاہ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص استعمال نہیں کر سکتا۔ کافر کی اس متروکہ جائیداد کو عربی میں فَیْءٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر ۲۰۲ پر ہے:۔ فَالْاَرْضُ فَیْءٌ اِنْ شَآءَ الْاِمَامُ خَمَّسَهَا (الخ) وَاِنْ شَآءَ تَرَكَهَا عَلٰی حَالِهَا (الخ) (ترجمہ) کافر کی متروکہ زمین سب کی سب فئی ہے۔ حکومت کے اختیار میں ہے کہ اگر چاہے تو اس کو بانٹ دے اور اگر چاہے تو اسی طرح چھوڑی رہنے دے لہٰذا سوال مذکورہ میں جس گردوارے کو بہادر خان ولد فضل احمد مسجد بنانا چاہتا ہے۔ وہ قطعاً ناجائز ہے۔ شریعت کے قانون میں کافر کا چھوڑا ہوا مال تین قسم کا ہوتا ہے:۔ ۱ غنیمت جو جہاد کرکے حاصل کیا جائے یہ سب مال جمع کرکے پانچواں حصہ نکال کر مجاہدوں پر تقسیم کیا جاتا ہے ۲ مالِ صُلح وہ مال جو بغیر جہاد اور بغیر سختی کے کافر سے حاصل ہو جس کو کافر خود دے جائے یا خود چھوڑ جائے ۳ مالِ فئی جو جبراً کافر سے وصول کیا جائے۔ جیسے خراج اور جزیہ ہمارے پاکستان میں ہندو، سکھوں کی متروکہ تمام زمینیں، مکانات اور گردوارے، مندر وغیرہ سب کے سب مالِ صلح کہلاتے ہیں۔ مالِ صُلح کا حکم وہی ہے جو شریعت کے قانون میں مالِ فئی کا ہے۔ یعنی جس طرح مالِ فئی سب کا سب بیت المال اور حکومت کی ملکیت میں ہوگا اسی طرح مالِ صلح۔ چنانچہ فتاوٰی شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۳۱۵ پر ہے:۔ وَمُقْتَضَاهُ اَنَّ مَا اُخِذَ مِنْهُمْ بِالْقِتَالِ وَالْحَرْبِ غَنِيْمَةٌ۔ وَمَا اُخِذَ بَعْدَهٗ مِمَّا وُضِعَ عَلَيْهِمْ قَهْرًا كَالْجِزْيَةِ وَالْخَرَاجِ فَیْءٌ وَمَا اُخِذَ مِنْهُمْ بِلَا حَرْبٍ وَلَا قَهْرٍ كَالْهَدَايَةِ فَهُوَ الصُّلْحُ فَهُوَ لَا غَنِيْمَةٌ وَلَا فَیْءٌ۔ وَحُكْمُهٗ حُكْمُ الْفَیْءِ لَا يُخَمَّسُ وَيُوْضَعُ فِیْ بَيْتِ الْمَالِ ط (ترجمہ) یعنی کافر کا چھوڑا ہوا مال تین قسم کا ہے مالِ غنیمت، مالِ فئی اور مالِ صُلح ان دونوں کا حکم۔ یہ دونوں مال صرف حکومت کی ملکیت میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ شخص جو مرتد ہو کر کفرستان میں چلا جاتا ہے چنانچہ میراث کی مشہور کتاب سراجی کے صفحہ نمبر ۵۹ پر ہے:۔ وَمَا اكْتَسَبَهٗ فِیْ حَالِ رِدَّتِهٖ يُوْضَعُ فِیْ بَيْتِ الْمَالِ عِنْدَ اَبِیْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی وَمَا اكْتَسَبَهٗ بَعْدَ اللُّحُوْقِ بِدَارِ الْحَرْبِ فَهُوَ فَیْءٌ بِالْاِجْمَاعِ ط (ترجمہ) یعنی وہ مال جو مرتد نے مرتد ہونے کے

بعد کمایا۔ منقولہ ہو یا غیر منقولہ سب حکومت کی ملکیت سے بیت المال میں جمع کیا جائیگا۔ اور جو اس مُرتد نے کفرستان میں جا کر کمایا۔ تمام فقہاء کے نزدیک وہ جائداد و مال فَیْءٌ ہوگا۔ اسی صفحہ کے حاشیہ ۲ میں ہے :۔ وَمَالُ ذِمِّیٍّ لَا وَارِثَ لَهٗ ۔ (ترجمہ) وہ کافر جو پہلے اسلامی ملک میں رہتا ہو۔ پھر وہاں سے بھاگ جائے تو اس مال کا کوئی وارث نہیں۔ سب حکومت کے قبضے میں ہوگا۔ مندرجہ بالا قانونی عبارات سے ثابت ہوا۔ کہ کافر کی متروکہ جائیداد کے مالک صرف بادشاہ اور اسلامی حکام ہوتے ہیں۔ بغیر اُن کی اجازت کے کوئی شخص اُس پر کسی قسم کی ملکیت نہیں کر سکتا۔ اور وہاں حکومت کی اجازت کے بغیر، مدرسہ یا قبرستان بھی بنانا ہرگز جائز نہیں۔ اگر بنا لیا جائے تو بنانے والا شرعی اور قانونی مجرم ہوگا۔ ہندوؤں کے مندر یا گُردوارے اسی طرح یہود و نصاریٰ کے گرجے اور کنیسے بھی کفار کی عام جائیداد کی مثل ہیں کیونکہ شریعت کے مطابق کافر کا صحیح وقف نہیں ہوتا۔ چنانچہ فتاویٰ درمختار علی تنویر جلد سوم صفحہ نمبر ۴۹۸ پر ہے :۔ اَمَّا فِیْ مُسْلِمٍ فَلِعَدَمِ کَوْنِهٖ قُرْبَةً ۔ وَلَا یَصِحُّ وَقْفُ مُسْلِمٍ اَوْ ذِمِّیٍّ عَلٰی بِیْعَةٍ ۔ شامی میں ہے۔ اَمَّا فِیْ مُسْلِمٍ فَلِعَدَمِ کَوْنِهٖ قُرْبَةً فِیْ ذَاتِهٖ وَاَمَّا فِی الذِّمِّیِّ فَلِعَدَمِ کَوْنِهٖ قُرْبَةً عِنْدَنَا وَعِنْدَهٗ کَمَا مَرَّ ۔ (ترجمہ) لیکن مسلمان یا ذمی کافر کوئی بھی مندر وغیرہ کے لئے وقف کرے۔ تو وہ وقف صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مسلمان کے نزدیک تو وہ ثواب ہی نہیں۔ اور کافر کا وقف اہل اسلام کے قانون میں وقف و ثواب نہیں۔ فتاویٰ بحر الرائق میں جلد پنجم صفحہ نمبر ۱۹۰ پر ہے :۔ وَفِی الْحَاوِیْ وَقْفُ الْمَجُوْسِیِّ عَلٰی بَیْتِ النَّارِ وَالْیَهُوْدِیِّ النَّصْرَانِیِّ عَلَی الْبِیْعَةِ وَالْکَنِیْسَةِ بَاطِلٌ اِذَا کَانَ فِیْ عَهْدِ الْاِسْلَامِ ۔ (ترجمہ) فتاویٰ حاوی میں ہے کہ مجوسی نے اپنے مندر پر یا یہودی عیسائی نے اپنے بیعے، کنیسے پر وقف کیا۔ تو وہ وقف اگر مسلمان حکومت میں آ گیا تو باطل ہے ان شرعی دلائل سے ثابت ہوا کہ گردوارہ، مندر وغیرہ جب مسلمان حکومت کے قبضے میں ہوگا تو وہ حکومت کی ملکیت میں ہوگا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا کہ اس پر قبضہ کرے یا اس کو بلا اجازت توڑ پھوڑے۔ اگر غیر مسلم لوگ موجود ہیں تو وہ ہی اُس پر قابض ہوں گے۔ اپنے اپنے دین کے اعتبار سے یہاں تک کہ مندر کو گرجا یا گرجے کو مندر بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ اگرچہ اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ ۔ (ترجمہ) کہ سب کفر ایک ہی دین ہے کا حکم وارد ہو چکا ہے چنانچہ فتاویٰ شامی شریف جلد سوم صفحہ نمبر ۳۷۶ پر ہے :۔ وَمِنْهُمَا اَنَّهَا اِذَا کَانَتْ مُعَیَّنَةً بِفِرْقَةٍ خَاصَّةٍ لَیْسَ لِرَجُلٍ مِنْ اَهْلِ تِلْكَ الْفِرْقَةِ اَنْ یَصْرِفَهَا اِلٰی جِهَةٍ اُخْرٰی ۔ وَاِنْ کَانَ

اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ ط (ترجمہ) جب کہ وہ مندر وغیرہ کسی ایک فرقے اقلیت کا ہو۔ تو کسی کو جائز نہیں کہ عبادت گاہ کسی دوسرے فرقے کے لئے استعمال کی جائے لہٰذا سوال مذکورہ میں جس گردوارے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں حکومتِ پاکستان کی اجازت کے بغیر اسلامی قانون کی رُو سے ہرگز ہرگز مسجد بنانا جائز نہیں۔ نہ ایسی جگہ نماز پڑھنا جائز۔ کیونکہ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ کفار کی عبادت گاہ میں نماز پڑھنا منع ہے کیونکہ وہ شیطین کا مسکن ہے۔ اگر توڑ کر مسجد بنایا تب بھی بنانے والا فاسق گنہگار ہے۔ کیونکہ غیر کی جگہ میں بنانا یا اس پہ ناجائز قبضہ کرنا شریعت میں غصب اور منع ہے۔ چنانچہ شامی ردّ المحتار جلد اول صفحہ نمبر ۳۵۴ پر ہے:۔ وَکَذَا تُکْرَہُ فِی اَمَاکِنَ ط فِی طَرِیْقٍ وَمَزْبَلَۃٍ وَمَقْبَرَۃٍ (الخ) وَاَرْضٍ مَغْصُوْبَۃٍ (الخ) (ترجمہ) اسی طرح راستے میں اور مزبلہ (روڑی) اور مقبرے میں اور کسی کی چھینی ہوئی جگہ میں نماز پڑھنی مکروہ تحریمہ ہے۔ کیونکہ باصطلاح فقہاء مطلق مکروہ سے تحریمی مُراد ہوتا ہے۔ (شامی صفحہ نمبر ۳۵۴ جلد اول اور ۲۸۴ فتح القدیر) ایسی جگہ جو نماز بھی پڑھی گئی وُہ قابلِ اعادہ ہوگی۔ کیونکہ جو نماز کراہتِ تحریمی کے ساتھ ادا ہو۔ وُہ واجب الاعادہ ہے۔ اگرچہ اس کی نوعیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ مگر احتیاط لازم ہے۔ پس قانونِ شرعیہ کے مطابق بہادر خان ولد فضل احمد کو جائز نہیں کہ حکومت کی اجازت کے بغیر وہاں مسجد بنائے اگر وہاں مسجد کی ضرورت ہے تو دوسری زرخرید جگہ میں بنائی جائے یا حکومت سے اجازت لی جائے۔

نوٹ:۔ یہ تحریر چونکہ یک طرفہ بیان پہ جاری کی گئی ہے اس لئے یہ فیصلہ شرعی نہیں۔ بلکہ فتوٰی محض ہے۔ دوسرے فریق کا بیان لینے کی صورتِ مذکورہ میں مجھ کو ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ کام خود حکومت کا ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتاب الاُضْحِیَۃ

قربانی غلط ذبح ہو جائے تو اسکا کیا حکم ہے؟ ۲۸-۲-۹

سوال ۱۲۳ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہمارے علاقے میں سات شرکاء کی ایک گائے قربانی کی گئی۔ ذبح امام مسجد نے کیا۔ کچھ لوگوں نے دیکھ کر کہا کہ حلقوم دھڑ کی طرف ہے لہٰذا یہ جانور حرام ہے امام صاحب کو بلا کر پوچھا تو وُہ کہنے لگے کہ یہ ذبح دُرست ہے گائے حلال ہے اُن کی تسلی پر گوشت حصہ داروں میں تقسیم کیا گیا مگر چند شرکاء نے گوشت نہ لیا۔ انکا کہنا ہے کہ حلقوم یعنی گھنڈی نیچے کی طرف ہو تو جانور حرام ہوتا ہے۔ قربانی والوں کو سخت تشویش ہے اب قربانی کے متعلق تسلی نہیں لہٰذا جلدی فتوٰی عطا فرمایا جائے کہ اب ہم کیا کریں۔ سائل:۔ فیروز علی خادم درگاہ حضرت سلطان باہو علیہ الرحمۃ۔

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

قانونِ شریعت کے مطابق ذبح مذکور بالکل غلط ہوا ہے اور سب جانور حرام ہو گیا۔ کسی مسلمان کو اس کا کھانا جائز نہیں جن لوگوں نے گوشت نہیں کھایا انھوں نے ٹھیک کیا جن لوگوں نے کھا لیا بُرا کیا اسلئے کہ شریعت میں ذبح دو قسم کا ہے (۱) ذبح اختیاری جیسے کہ دن رات مذبح خانوں، شادی بیاہ یا گھروں میں قربانی وغیرہ کے مواقع پر ہوتا ہے ✽ (۲) ذبح اضطراری۔ جیسے کہ جب جانور گھریلو پاگل ہو جائے۔ یا وحشی ہو کر لوگوں کے قابو سے باہر ہو جائے۔ نہ کسی کو قریب آنے دے یا حوض یا کنوئیں میں اس طرح گر جائے کہ نکالنا نا ممکن ہو اور پہنچنا بھی اُس تک محال ہو تو شریعت میں اس کی اجازت ہے کہ خطرۂ موت کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ط پڑھ کر یا تلوار یا نیزہ بھالا یا تیر جس جگہ بھی مارو تو ذبح اضطراری صحیح ہوگا۔ اور کھانا حلال۔ گردن پہ ذبح شرط نہ رہے گا۔ بخلاف قسم اول ذبح اختیاری کے کہ وہاں گردن کو کاٹنا واجب ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم صفحہ ۲۸۵ پر ہے:۔ اَلذَّكٰوةُ نَوْعَانِ اِخْتِيَارِيَّةٌ وَاِضْطِرَارِيَّةٌ اَمَّا الْاِخْتِيَارِيَّةُ فَرُكْنُهَا الذَّبْحُ (ترجمہ) جانور کو پاک اور حلال کرنے کی دو اقسام ہیں۔ (۱) اختیاری ✽ (۲) اضطراری۔ لیکن اختیاری پس اُس کا داخلی فرض گردن کاٹنا ہے اور گردن کاٹنے میں ضروری ہے کہ چار رگیں کاٹی جائیں۔ فتاویٰ ہندیہ جلد پنجم صفحہ ۲۸۷ پر ہے:۔ وَالْعُرُوْقُ الَّتِيْ تُقْطَعُ فِي الذَّكٰوةِ اَرْبَعَةٌ۔ (ترجمہ) اور وہ رگیں جو وقتِ ذبح کاٹی جاتی ہیں۔ وہ چار ہیں:۔ شرطِ اول کی رگ حلقوم ہے۔ اسی کو گھنڈی یا نرخرہ کہا جاتا ہے باقی تین رگیں اسی سے متصل ہوتی ہیں اس کا کٹنا اشد ضروری ہے۔ باقی تین میں اگر ایک نہ بھی کٹے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسری رگ حلقوم اور پانی والی رگ کی ابتدا سینے سے کلیجی کے قریب پھیپھڑوں سے متصل ہوتی ہے اور انتہا اونٹ کے علاوہ باقی تمام جانوروں میں تین چوتھائی گردن تک یعنی سر سے قدرے نزدیک۔ سر تک نہیں پہنچتیں۔ بلکہ ایک جھلی کے تھیلے کے ذریعے اور چند باریک باریک دھاگوں کے ذریعے سر سے جڑ جاتی ہیں۔ کھینچ کر زبان باہر نکالنے سے گھنڈی سر کی طرف آجاتی ہے۔ دوسری دو خون کی رگیں جن کو عربی میں وَدَجَان کہا جاتا ہے۔ حلقوم سے نیچے حلقوم کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔ اُن کی ابتدا دل سے اور انتہا اُمُّ الدِّمَاغ تک اگر ذبح کرنے والا زور سے ذبح کرے تو یہ دونوں رگیں یا ایک ضرور کٹ جاتی ہے جس سے خون یعنی دمِ مسفوح سب نکل جاتا ہے حلقوم کو صحیح کاٹنے کے لئے لازم ہے کہ سر سے کچھ نیچے ذبح کیا جائے۔ اگر ذبح کرنے والے نے بالکل سر کے قریب ذبح کیا۔ تو حلقوم بوجہ نیچے رہ جانے کے بالکل نہ کٹا۔

اور حلقوم کے ساتھ پانی والی رگ بھی نہ کٹی۔ اس لئے ذبیحہ حرام۔ کیونکہ ذبح میں چار رگیں کٹنی مستحب ہیں۔ اور تین رگیں کٹنی فرض ہیں۔ اگر صرف دو رگیں کٹیں تو ذبیحہ حرام ہوگا۔ کم از کم تین رگیں کٹنا درستیٔ ذبیحہ کے لئے شرط ہیں۔ چنانچہ عالمگیری جلد پنجم صفحہ ۲۸۷ پر ہے:۔ فَاِنْ قُطِعَ كُلُّ الْاَرْبَعَةِ حَلَّتِ الذَّبِيْحَةُ وَاِنْ قُطِعَ اَكْثَرُهَا فَكَذٰلِكَ عِنْدَ اَبِیْ حَنِیْفَةَ رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَیْهِ فَاِنَّ لِلْاَكْثَرِ حُكْمُ الْكُلِّ ؂ (ترجمہ) اگر چاروں رگیں کٹ گئیں تو ذبیحہ بالکل درست اور حلال ہوگا۔ اور اگر اکثر رگیں یعنی تین بھی کٹ گئیں تب بھی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک حلال ہے کیونکہ لِلْاَكْثَرِ حُكْمُ الْكُلِّ ؂ یعنی اکثریت کو کل کا حکم دیا جاتا ہے۔ پس چونکہ سوالِ مذکورہ میں ذبح اختیاری کا ہی ذکر ہے۔ اور حلقوم و عرقِ خوراک دونوں نہ کٹیں۔ اس لئے کہ حلقوم کا آخری حصہ ذرا موٹا ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس کو گھنڈی کہا جاتا ہے۔ جب یہ دھڑ کی طرف آگیا تو گویا کہ حلقوم کٹا ہی نہیں اور نہ خوراک کی رگ۔ پس مذکورہ فی السوال قربانی کا جانور حرام ہوا۔ اگرچہ سارا خون بہہ جائے۔ کہ خون کا تعلق (نیچے والی دو رگیں) دوجان سے ہے۔ لہٰذا یہ قربانی بالکل ضائع ہوئی۔ جس کا جُرم امام مذکور پر وارد ہُوا۔ اور قانونِ شرعی کے مطابق ذبح کرنے والا امام مذکور حصہ دار کو اُس کے حصے کے تمام پیسے ادا کرے۔ اور وہ تمام قیمت ہر حصہ دار غریب کو صدقہ کر دے۔ قربانی کا حصہ دار خواہ امیر ہو یا غریب۔ چنانچہ فتاویٰ قاضی خان جلد سوم ص۳۵۵ پر ہے:۔ ضَمِنَ الذَّابِحُ قِيْمَةَ الشَّاةِ لِلْاٰمِرِ ؂ (الخ) يَتَصَدَّقُ بِقِيْمَتِهَا عَلَى الْفُقَرَآءِ ؂ (ترجمہ) ذابح ضمان دے بکری کی قیمت کا۔ قربانی والے آمر کو۔ اور وُہ سب قیمت خیرات کرنی پڑے گی۔ فتاویٰ فتح القدیر جلد ہشتم ص۸۰ پر ہے:۔ وَمَنْ اَتْلَفَ لَحْمَ اُضْحِيَّةِ غَيْرِهٖ فَلَهٗ اَنْ يُّضَمِّنَ صَاحِبَهٗ قِيْمَةَ لَحْمِهٖ۔ ثُمَّ يَتَصَدَّقُ بِتِلْكَ الْقِيْمَةِ ؂ جس شخص نے کسی غیر کی قربانی حرام کر دی۔ (ضائع کر دی) تو اُس ضائع کرنے والے کے لئے لازم ہے کہ قربانی والے کو جانور یا حصے کے پورے گوشت کی قیمت ادا کرے۔ پھر وُہ قیمت صدقہ کر دی جائے۔ یہ اُس وقت ہے۔ جب قربانی کے دن گزر گئے ہوں۔ لیکن اگر ایامِ قربانی موجود ہوں تو اُسی قیمت کا ایک اور جانور خرید کر قربانی کرنا واجب ہے:۔ هٰكَذَا فِیْ قَاضِیْ خَانْ ؂ پس سوالِ مذکورہ چونکہ ایامِ اضحیہ گزرنے کے بعد ہے۔ اس لئے امام سے ساری قیمت وصول کر کے غُربا میں صدقہ کر دی جائے۔ مگر یہ صدقہ غریب سیّد کو نہیں دیا جا سکتا۔ کہ بدلۂ جُرم ہے۔ اگر کوئی حصہ دار امام سے اس جُرم کا بدلہ نہیں لینا چاہتا۔ تو اس کو اپنے پلے سے اتنی ہی رقم صدقہ کرنی پڑے گی۔ جتنی پہلے حصہ قربانی میں مع خرچہ جانور و ذبح دے چکا ہے۔

اِس لئے کہ اب وہ تمام پیسے حقُ العبد وَحق اللہ بیک وقت بن چکے ہیں۔ امام کو معاف کرنا اِس لیئے جائز ہُوا کہ وہ حقُ العبد ہے اور اپنے پلّے سے پُوری قیمت اس لئے خیرات کرنا پڑے گی۔ کہ وُہ صدقہ حق اللہ ہے۔ جس کو بندہ معاف نہیں کر سکتا۔ تو جب وُہ مجرم کو چھوڑ رہا ہے تو خود خیرات کرے۔ وَاللہُ وَرَسُولُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہٗ

قربانی کی کھالوں کو دینی جلسوں کیلئے بیچ کر خرچ کرنیکا بیان

سوال نمبر ۸۴ - کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ قربانی کی کھالیں بیچ کر اُس کی رقم مسجد کی تعمیر وغیرہ میں خرچ کرنی جائز ہے۔ بکر کہتا ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کرام کے درمیان اختلافی ہے لہٰذا ہمیں فتویٰ عطا فرمایا جائے کہ کیا قربانی کی کھال بیچ کر اس کے پیسے کسی مسجد یا انجمن یا کسی تحریک یا دینی جلسے یا سڑکوں وغیرہ پر خرچ کرنی جائز ہے یا صرف غریبوں کو ہی دی جائے۔ اس کے بارے میں فتویٰ جلد از جلد تحریر کرکے جواب سے نوازا جائے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا۔

السّائل: - محمد ادریس محلہ اپر ٹوپہ تحصیل کوہ مری ضلع راولپنڈی مورخہ ۲/۴/۶۶

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

سائل نے مستفسرہ مضمون میں اگرچہ قبل ازیں تو کچھ اختلافِ علمی نہ تھا۔ مگر فی زمانہ ہمارے بعض احباب نے اس مسئلہ کو مختلف فیہ بنا دیا ہے۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ قربانی کی کھالیں بیچ کر مسجد میں خرچ کرنا تعمیر وغیرہ کے لئے جائز ہے۔ لیکن اُن کے پاس کچھ مضبوط دلائل نہیں۔ مجھ کو اپنے متاخرین اکابر کے نظریات و دلائل میسر نہ آئے لہٰذا سائل کے سوال کے بعد خود اپنی تحقیق کے ماتحت با دلائل فتویٰ شرعی جاری کرتا ہوں کہ قربانی کی کھال فروخت کرنے سے پہلے بوجہ نفلی صدقہ ہر طرح مستعمل ہو سکتی ہے خواہ بعینہٖ کھال استعمال کی جائے یا کسی غیر مستہلک منفعت والی چیز کے بدلے سے۔ اور خواہ قربانی والا اپنے مصرف میں لائے۔ یا کوئی بھی امیر یا غریب یا مسجد یا ادارے میں استعمال ہو۔ مثلاً کھال کے بدلے کوئی کپڑا اینٹ لکڑی وغیرہ لے لی جائے۔ اس کو گھر میں برتو یا مسجد وغیرہ میں شرعاً بالکل جائز ہے۔ لیکن جب کھال کو روپے پیسے سونا، چاندی سے فروخت کیا جائے۔ تو اب وہ رقم نہ خود قربانی والا برت سکتا ہے نہ کوئی امیر نہ صاحب قربانی غریب۔ اور نہ ہی مسجد میں صرف ہو سکے۔ نہ کسی ادارے یا رفاہِ عامہ میں۔ بلکہ وُہ رقم فقراء پر صدقہ

کرنا پڑے گی۔ اور فقیر کو اُس کا مالک بنانا پڑے گا۔ اِس لیئے کہ اب وُہ صدقہ واجبہ ہوگیا۔ اگرچہ صاحب قربانی یا کسی امیر شخص نے وُہ کھال کسی نیت سے فروخت کی ہو۔ اپنے لئے فروخت کی یا مسجد کے لئے فروخت کی قیمت صدقہ کرنی پڑے گی۔ ہاں غریب سیّد کو وُہ قیمت دی جاسکتی ہے کیونکہ سیّد کو صرف وُہ صدقات منع ہیں۔ جو وسخ ہوں۔ اُن کی تفصیل آئندہ بیان ہوگی۔ ہمارے مخالف چونکہ جواز کے قائل ہیں۔ اس لیئے اوّلاً اُن کے نظریات واستدلال مع جواب پیش کئے جاتے ہیں۔ اُس کے ذیل میں اپنے دلائل پیش کئے جائیں گے۔ مخالف کا پہلا نظریہ یہ ہے کہ قربانی کی کھال مطلقاً قربانی کے گوشت کی مثل ہے۔ اسی بنا پر ہر موقعہ کھال کو لحمِ قربانی پہ قیاس کرتے ہیں۔ اور اپنے مسلک پر اُن ہی عبارات کو دلیل بناتے ہیں جو فقہاءِ کرام نے گوشت کے کھانے اور بانٹنے پہ بیان فرمائی۔ حالانکہ اصل گوشت پہ کھال کی قیمت کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے اور غلط ہے۔ اپنے اِس نظریہ پہ وُہ ھدایہ کی عبارت سے استدلال لیتے ہیں۔ ھدایہ چہارم صفحہ ۴۲۸ پر ہے:۔ "وَاللَّحْمُ بِمَنْزِلَةِ الْجِلْدِ فِي الصَّحِيحِ ط (ترجمہ) اور گوشتِ قربانی، کھال کے درجے میں ہے صحیح مسلک میں مخالف کا یہ استدلال کچھ زیادہ مضبوط نہیں۔ اِس لئے کہ جب تک کہ کھال فروخت نہ ہو اُس وقت تک تو ہمارے نزدیک بھی دونوں کا ایک حکم ہے اسی طرح کھال اور گوشت کو کسی کپڑے وغیرہ سے تبدیل کرکے استعمال کرنا ہر شخص کو ہر جگہ کے جواز کے ہم بھی قائل ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہُوا۔ اُس کا کوئی منکر نہیں۔ نہ یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے۔ ھدایہ شریف کی عبارت میں صرف ان ہی لحاظ سے دونوں کا درجہ ایک ہے مطلق طور پر دونوں کا درجہ ایک نہیں ہے۔ اِس لئے کہ گوشت پوست میں بہت طرح اختلافات بھی ہیں۔ ۱۔ گوشت کھایا جاتا ہے مگر کھال نہیں کھائی جاتی۔ ۲۔ گوشت کے تین حصّے کرنا مستحب ہے لیکن کھال کے لئے یہ حکم نہیں وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ ہر طریقے سے دونوں کا ایک درجہ نہیں صرف دو صورتوں میں گوشت کھال کی مثل ہے لیکن پیسیوں سے فروخت کرنے کی صورت میں ہر دو کا حکم جُداگانہ ہے۔ چنانچہ سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد چہارم صفحہ ۹۵ پر ہے:۔ اَلْعُلَمَآءُ مُتَّفِقُوْنَ فِيْمَا عَلِمْتُ اَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ بَيْعُ لُحُوْمِهَا ط (ترجمہ) متفقہ طور پہ علماءِ کرام کے نزدیک قربانی کے گوشتوں کو فروخت کرنا ناجائز ہے۔ اور فروخت کرنے والا گناہگار ہوگا۔ اور قیمت کو صدقہ بھی کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ دیگر کتب میں تصریح ہے بخلاف کھال کے۔ کہ اُس کے فروخت کرنے کے بغیر چارہ نہیں۔ اس کی کثرت اور عدم اکل و اطعام بجز بیع کسی کی متحمل نہیں۔ معلوم ہُوا کہ بہت صورتوں میں گوشت کھال کے درجے میں نہیں۔ لہٰذا مطلقاً قیاس کرنا درست نہیں۔ اس وجہ سے مخالف کا پہلا نظریہ ٹوٹ

جاتا ہے۔ **دُوسرا نظریہ**:۔ یہ ہے کہ جس طرح کھال بکنے سے پہلے ہر جگہ لگ سکتی ہے۔ اسی طرح بکنے کے بعد بھی مسجد وغیرہ کی تعمیر میں یہ پیسے خرچ ہو سکتے ہیں اور اپنے نظریہ پہ یہ فرماتے ہیں کہ چونکہ قربانی ذبح کرنے کے بعد ہر چیز نفلی صدقہ ہے اور نفلی صدقہ ہر طرح صرف ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بعد بیع بھی نفلی ہی رہے گا۔ ورنہ انقلابِ حقیقت لازم آئے گا۔ جو محال ہے۔ یہ استدلال بھی غلط ہے کیونکہ قربانی کی کھال بکنے سے پہلے اگرچہ صدقہ نفل ہے لیکن بعد فروخت واجب ہو جاتا ہے۔ جس کے دلائل آئندہ بیان ہوں گے۔ اور اس نفلی کا واجبی بن جانا انقلابِ حقیقت نہیں۔ کیونکہ انقلابِ حقیقت تبدیلی بالعین کا نام ہے مگر یہاں تبدیلی بالغیر جیسے کہ اشراق وغیرہ کی نماز قبل شروع نفل ہیں۔ مگر بعد شروع واجب۔ اسی طرح قربانی کی کھال قبل بیع نفلی صدقہ۔ لیکن بعد بیع واجبی ہو جاتا ہے۔

چنانچہ علمِ اصول کی کتاب مسلم الثبوت صفحہ ۴۷ پر ہے کہ اَلْمُبَاحُ قَدْ یُصِیْرُ وَاجِبًا عِنْدَنَا۔ (ترجمہ) مباح نفلی عبادت کبھی واجب میں بھی بدل جاتی ہے۔ **مخالف کا تیسرا نظریہ** یہ ہے کہ اگر کھال کو قربانی کرنے والے نے اپنے یا بال بچوں کے لئے فروخت کیا۔ تو رقم کو خیرات کرنا واجب ہے کیونکہ اس میں تموّل ہے اور تموّل سے مال خبیث ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب مسجد پہ نہیں لگ سکتا۔ فقراء ہی کو دینا پڑے گا۔ اس پر فتاوٰی کفایہ جلد چہارم وفتاوٰی بنایہ جلد سوم کی عبارت مندرجہ سے استدلال کرتے ہیں کہ ارشاد ہے:۔ اَلْمَعْنٰی فِیْ عَدَمِ اِشْتِرَآءِ هَا لَا یُنْتَفَعُ بِهٖ اِلَّا بَعْدَ اِسْتِهْلَاكِهٖ اَنَّهٗ تَصَرُّفٌ عَلٰی قَصْدِ التَّمَوُّلِ وَهُوَ قَدْ خَرَجَ عَنْ جِهَةِ التَّمَوُّلِ فَاِذَا تَمَوَّلَهٗ بِالْبَیْعِ وَجَبَ التَّصَدُّقُ لِاَنَّ هٰذَا الثَّمَنَ حَصَلَ بِفِعْلٍ مَّكْرُوْهٍ فَیَكُوْنُ خَبِیْثًا فَیَجِبُ التَّصَدُّقُ۔ (ترجمہ) ردیوں وغیرہ سے خرید وفروخت ناجائز ہونا اسلیئے ہے۔ کہ بے شک وُہ تصرف ہے۔ تموّل کے ارادے پر اور وہ خارج ہوا ہے۔ تموّل کی وجہ سے پس جبکہ اس میں بذریعہ بیع تموّل ہو گیا۔ تو صدقہ کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ یہ ثمن (قیمت) حاصل ہوئی ہے فعل مکروہ سے۔ لہٰذا مال خبیث ہو جائے گا۔ پس واجب ہو گا صدقہ کرنا۔ یہ تھی بنایہ کی عبارت۔ مگر یہ استدلال بھی کمزور ہے اور خود مستدل کے خلاف ہے اس لئے کہ مخالف کہتا ہے کہ اگر عیال یا ذات کی نیت سے فروخت کیا۔ تب تموّل ہو گا۔ ورنہ نہیں۔ حالانکہ یہ عبارتِ بنایہ یہ کہہ رہی ہے کہ ردیوں سے فروخت کرنا ہی قصد تموّل ہے اور پھر یہ عبارت ہمارے نزدیک بھی قابلِ تسلیم نہیں۔ اس لئے کہ اس پر چند دُشواریاں ہیں۔ اوّلاً یہ کہ کیا وجہ ہے کہ کپڑے، اینٹ، لکڑی وغیرہ لعل جواہر موتی وغیرہ سے تبدیلی میں تموّل نہیں۔ اور پیسوں وغیرہ سے فروخت کرنے میں تموّل ہے۔ **دوسرا**۔

یہ کہ دیگر فقہاء کرام نے تمول یا تقرب کی شرط نہ لگائی۔ بلکہ مطلقاً فرمایا کہ اگر کھال درہم دینار یعنی سونے چاندی سے فروخت کی گئی۔ تو قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے چنانچہ دُرِّ مختار میں ہے۔ صفحہ ۲۸۵ جلد پنجم میں درج ہے۔ فَاِنْ بِیْعَ اللَّحْمُ اَوِ الْجِلْدُ بِہٖ اَوْ بِدَرَاھِمَ تَصَدَّقَ بِثَمَنِہٖ ط (ترجمہ) اگر فروخت کیا گیا گوشت یا کھال شئی مستہلک یا روپوں کے بدلے تو صدقہ کیا جائے اس کی سب قیمت کا۔ یہاں تمول کی کوئی قید نہ لگائی۔ اس لئے کہ قید بیکار تھی جب بھی جس نیت سے بھی فروخت کی گئی۔ تو تمول ہی ہوگا۔ اور بِیْعَ صیغہ مجہول سے یہ ثابت ہوا کہ جو بھی فروخت کرے خواہ خود یا کوئی امیر یا متول مسجد یا ناظم ادارہ وانجمن کسی کے لئے فروخت کرے تمول لازم ہوگا۔ **سوم**۔ یہ کہ تمول سے مال کا خبیث ہونا بھی عجیب ہے۔ حالانکہ بہت سے نفلی صدقات کو فروخت کرکے استعمال کرنا جائز ہے۔ پھر اگر تمول سے مال خبیث ہوجاتا تو کسی مسلمان کو بھی دینا جائز نہ ہوتا۔ کیونکہ اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ ط خبیث چیزیں خبیثوں کے لئے ہیں۔ کسی غریب مسلمان کو خبیث کہنا یا سمجھنا بدترین گناہ ہے اور پھر متفقہ مسئلہ ہے کہ غریب سید کو رقم دی جاسکتی ہے۔ لہٰذا یہ مال خبیث کس طرح ہوسکتا ہے۔ اگر تمول سے مال خبیث ہوجاتا تو بیع ہی ناجائز ہوتی منعقد ہی نہ ہوتی۔ جیسے مغصوبہ یا سود رشوت کی بیع کہ چونکہ یہ مال خبیث ہے اس لئے اس کی بیع منعقد ہی نہ ہوگی۔ بلکہ موقوف یا باطل ہوگی۔ بخلاف قربانی کی کھال کی بیع کہ منعقد شرعی ہو جائے گی۔ چنانچہ فتاوی فتح القدیر جلد ہشتم صفحہ ۷۹ پر ہے۔ اَمَّا الْبَیْعُ جَائِزٌ الخ لیکن بیع جائز ہے اگرچہ مکروہ تنزیہی ہے یعنی بیع مکروہ تحریمی نہیں۔ اس لئے کہ مکروہ تحریمی باعث معصیت ہے اور معصیت کو ختم کرنا واجب ہے چنانچہ شامی جلد چہارم صفحہ ۱۸۶ پر ہے وَھُوَ حَقٌّ لِاَنَّ رَفْعَ الْمَعْصِیَۃِ وَاجِبٌ بِقَدْرِ الْاِمْکَانِ ط یعنی حق یہ ہے کہ جمعہ کے وقت بیع قابل فسخ ہے۔ کیونکہ باعث معصیت ہے۔ دُرِّ مختار میں اسی جگہ پر ہے۔ اِنَّ فَسْخَ الْمَکْرُوْہِ وَاجِبٌ ط (ترجمہ) مکروہ تحریمی کا فسخ کرنا واجب ہے۔ دیکھو جمعہ کی اذان اول کے وقت خرید و فروخت خبیث ہے۔ اس لئے امام محی الدین ابن مالک اور نہایہ اور فتاوی نہر اور اکثر آئمہ کے نزدیک بیع فاسد ہے۔ قابل فسخ ہے (حوالہ از تفسیر روح المعانی پارہ ۲۸ صفحہ ۱۰۲، صاوی جلد چہارم صفحہ ۱۷۵) اگر قربانی کی جلد کی قیمت مال خبیث ہوتا۔ تو بیع فاسد ہوتی۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ مال خبیث مال حرام کو کہا جاتا ہے۔ اس لئے جائز نہیں ہے کہ بلا عذر سود لے کر غریبوں کو دے کہ وہ مال خبیث ہے۔ غریب کو دینا بھی منع ہے بلکہ فتاوی بزازیہ اور دُرِّ مختار نے حرام مال صدقہ کرنا کفر بتایا۔ **چہارم**۔ یہ کہ اگر صرف اپنے یا اپنے عیال کے لیئے فروخت کرنا تمول ہو جائے۔ تو امراء کے لئے فروخت کرنا تمول آگیا

نہیں یا دُوسرا امیر آدمی کسی سے قربانی کی کھال لے کر اپنے لیئے روپوں سے فروخت کرے تو تموّل ہوگا یا نہیں، اور اگر صاحب قربانی بلانیت فروخت کردے یا کسی ادارے کے لئے فروخت کرے اور پھر وہ خود رقم خرچ کرے تو جائز ہوگا۔ یا نہیں؟ اس لحاظ سے بقولِ مخالف تموّل نہ ہُوا۔ حالانکہ اب بھی یہ لوگ استعمال نہیں کر سکتے۔ ماننا پڑے گا کہ جس طرح بھی اور جس نیت سے کھال فروخت ہوگی۔ تموّل لازم صدقہ واجب اور بقاعدہ شرعیہ تموّل سے مال میں خبث نہیں لازم آتا۔ کیونکہ بہت صورتوں میں تموّل تقرب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۲۲۳ پر ہے:۔ قَالَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ نَفَقَةُ الْمَرْءِ عَلٰى عِيَالِهٖ صَدَقَةٌ ط لوگوں کا اپنے عیال پر خرچ کرنا صدقہ ہے اور صدقہ باعث تقرب ہے۔ دیکھو اپنے عیال کے لیئے پیسے کمانا تموّل یعنی مال حاصل کرنا ہے اور وُہی تموّل باعث تقرب و ثواب ہوگیا۔ اور مالِ خبیث کبھی بھی باعث ثواب نہیں ہوتا۔ چنانچہ فتاوٰی کاملیہ ص۱۵ پر ہے:۔ لَا تَجِبُ عَلَيْهِ فِيْهِ الزَّكٰوةُ بَلْ يَلْزَمُهُ النَّفَقَةُ بِجَمِيْعِهٖ عَلَى الْفُقَرَآءِ لَا بِنِيَّةِ الثَّوَابِ ط (ترجمہ) حرام مال پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ بلکہ اس کو فقیروں پر خرچ کردے۔ اس میں کچھ ثواب نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سُود لے کر غریب کو دیتا رہے یہ حکم بوجہ مجبوری ہے۔ جیسا کہ فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر مغصوبہ کا مالک نہ ملے تو خیرات کردے۔ جان بُوجھ کر سُود یا مغصوبہ چیز لے کر پھر غریب کو دینا گناہ ہے کیونکہ مالِ خبیث غریب کو دینا بھی منع ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس نیت سے بھی کھال فروخت کی تموّل لازم ہوگا لیکن اس سے خبث لازم نہ آئے گا۔ اور وُہ صدقہ کرنا لازم ہے۔ اِن مندرجہ بالا تین نظریوں کی بناء پر ہمارے احباب نے چوتھا نظریہ یہ قائم کیا کہ اگر مسجد کی نیت سے کھال فروخت کی۔ تو اس کی رقم مسجد میں لگ سکتی ہے اور دلیل یہ دی۔ کہ اِس میں تموّل نہیں بلکہ تقرب ہے۔ مگر یہ دلیل اس لئے کمزور ہے کہ عباراتِ فقہاء میں تقرب کی شرط نہیں بلکہ بحرالرائق کی عبارت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر بیع میں تموّل ہے۔ اور تقرب صرف صدقہ کرنا ہی ہے۔ یعنی قربانی کی کھال میں تقرب یہی ہے کہ اُس کو فقراء پر صدقہ کیا جائے۔ یہ تھے وُہ نظریات جن کی بناء پر ایک سیدھے سادھے مسئلہ کو ہمارے احباب نے مختلف فیہ بنا دیا۔ اب وُہ دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ کہ جن سے یہ بخوبی واضح ہوگا کہ قربانی کی کھال جب پیسوں کے عوض فروخت کی جائے۔ تو فقیر شخص کو دینا ہی لائق ہے۔ وہ رقم مسجد یا ادارے، رفاہِ عام میں بغیر حیلہ شرعی خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ دلیل نمبر۱:۔ قربانی کے لئے جب جانور خریدا تو اُس کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ (۱) ذبح سے پہلے (۲) ذبح کے بعد۔ ذبح سے پہلے جانور کی اُون کھال کے بال دودھ وغیرہ اُس کے جسم سے علیحدہ کرنے جائز نہیں۔ لیکن اگر بوجہ مجبوری سخت اون وغیرہ اکھیڑی گئی۔ تو صدقہ کرنا واجب ہے۔ چنانچہ

فتاوٰی عالمگیری جلد پنجم میں صفحہ ۳۰۱ پر ہے :۔ وَلَوْ حَلَبَ اللَّبَنَ مِنَ الْاُضْحِيَةِ قَبْلَ الذَّبْحِ اَوْ جَزَّ صُوْفَهَا يَتَصَدَّقُ بِهٖ وَلَا يَنْتَفِعُ بِهٖ ۔ (ترجمہ) اگر ذبح سے پہلے دودھ دوہا جائے یا اُون کاٹی جائے تو سب کا صدقہ کردے ۔ نفع حاصل کرنا ناجائز ہے ۔ ذبح کے بعد بعینہٖ ان اشیاء سے نفع حاصل کرسکتا ہے کہ صدقہ نفل ہے اور جب پیسوں سے فروخت کیا تو پھر صدقہ واجبی ہو گیا ۔ گویا کہ اشیاء قربانی اول آخر صدقہ واجب ہے درمیان میں صدقہ نفلی ہے ۔ لیکن یہ وجوب دیگر صدقات واجبہ کی طرح نہیں ۔ بلکہ یہ فرق ہے کہ غریب سید ہاشمی کو دینا جائز ہے ۔ اس لیے کہ سید کو صدقہ نہ دینے کی علت وسخ یعنی ہاتھوں کی میل ہوتا ہے ۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۶۱ پر ہے :۔ وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ابْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ اِنَّمَا هِيَ اَوْسَاخُ النَّاسِ وَاِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ رَوَاهُ مُسْلِمٌ ۔ (ترجمہ) فرمایا آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہ بے شک یہ صدقات لوگوں کے میل ہیں ۔ اس لئے نہیں حلال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم پر اور اُن کی آل کے لیے ۔ اور وسخ یعنی میل کیا ہے ؟ چنانچہ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف نے فرمایا :۔ وَاِنَّمَا سَمَّاهَا اَوْسَاخُ النَّاسِ لِاَنَّهَا تَطْهِيْرٌ اَمْوَالِهِمْ وَنُفُوْسِهِمْ ۔ (ترجمہ) صدقہ کو اس لیے وسخ کہا کہ وہ مال رُوحوں اور جسموں کو پاک کرنے والا ہے ۔ پس جس چیز سے مال یا جسم و رُوح یا عبادت پاک صاف ہو تو واجبی صدقہ ہے وُہ سیّدوں کو لینا جائز نہیں ہے ۔ اور جو واجبی صدقہ وسخ نہ ہوگا ۔ تو وہ سیّدوں کو لینا جائز ہے ۔ قانونِ شریعت کے مطابق صرف وہ صدقہ میل بنے گا جس سے مال کو پاک کیا جائے ۔ یا جُرموں کو معاف کرایا جائے ۔ جیسے مَنّت یا کفّارہ ۔ اس لیے سیّدوں کو زکوٰۃ فطرانہ مَنّت ، کفّارے کا صدقہ لینا منع ہے ۔ بخلاف مالِ غنیمت کا خمس اور قربانی کی اُون یا اُس کی قیمت قبل ذبح کھال وغیرہ کی رقم بعد ذبح ۔ تو جس طرح اون دودھ وغیرہ کی رقم متفقاً قبل ذبح صدقہ تو ہوگی ۔ مگر مسجد میں خرچ کرنا جائز نہیں ۔ اسی طرح بعد ذبح بھی ۔ ہاں اتنا فرق ہوگا کہ بعد ذبح کھال کو بطورِ مصلّٰی یا ڈول دینا جائز ہے ۔ **دُوسری دلیل** :۔ بعد ذبح کھال کو جس نیت سے بھی فروخت کیا جائے ۔ تموّل لازم آئے گا ۔ چنانچہ فتاوٰی فتح القدیر جلد ہشتم صفحہ ۷۸ پر ہے :۔ کہ فَاِنَّ الدَّرَاهِمَ مِمَّا لَا يُنْتَفَعُ بِعَيْنِهَا اَصْلًا اَيْ لَا مَعَ بَقَائِهَا وَلَا بَعْدَ اِسْتِهْلَاكِهَا وَاِنَّمَا هِيَ وَسِيْلَةٌ مَحْضَةٌ فَالْمَقْصُوْدُ مِنْهَا التَّمَوُّلُ لَا غَيْرُهٗ ۔ (ترجمہ) کیوں کہ روپے ، پیسے اُن چیزوں سے ہیں جن کی عین سے بالکل نفع نہیں ہوتا ۔ نہ بقاء سے نہ فنا

سے۔ وُہ صرف ایک وسیلہ محضہ ہوتا ہے۔ تو مقصود اُس سے خود بخود بلا نیت تموّل ہی ہوگا۔ نہ کہ غیر **تیسری دلیل**:۔ جب کھال فروخت کرنے سے تموّل ہُوا تو صدقہ کرنا واجب ہے جیسا کہ فتویٰ کفایہ وعنایہ سے ثابت ہو چکا۔ **چوتھی دلیل**:۔ صدقہ واجبہ میں تملیک شرط ہے کہ صدقہ کرنے والا صدقہ لینے والے کو مالک بنا دے۔ چنانچہ شامی صفحہ ۸۶ جلد اوّل میں ہے:۔ لِعَدَمِ التَّمْلِيْكِ وَهُوَ الرُّكْنُ۔ اور شامی میں ہے:۔ وَكَذَا كُلُّ صَدَقَةٍ وَاجِبَةٍ (ترجمہ) مالک بنانا فرض ہے:۔ اور اِسی طرح تمام صدقاتِ واجبہ میں تملیک داخل فرض ہے:۔ پس کھال کی رقم صدقہ کرنا واجب ہُوا تو تملیک بھی اشد ضروری ہے اور چونکہ مسجد میں تملیک نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہاں یہ رقم دینا منع ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ صدقہ فطرہ نذر کا مال دینا بھی اور مسجد میں خرچ کرنا بھی منع ہے کہ وہاں تملیک نہیں۔ بلکہ جہاں جہاں تملیک دُرست نہ ہوگی۔ وہاں وہاں صدقات واجبہ خرچ کرنے منع ہوں گے۔ چنانچہ بچے مجنون کے ہاتھ یا کفن میت میں صدقہ واجبہ صرف کرنا منع ہے۔ صرف اس لئے کہ تملیک نہ پائی گئی۔ اس لئے فتح القدیر ہشتم صفحہ ۸۵ پر ہے:۔ لَا يُصْرَفُ اِلٰى مَجْنُوْنٍ وَصَبِيٍّ غَيْرِ مُرَاهِقٍ وَلَا يُصْرَفُ اِلٰى مَسْجِدٍ وَلَا اِلٰى كَفَنِ مَيِّتٍ لِعَدَمِ صِحَّةِ التَّمْلِيْكِ وَلَا اِلَى السِّقَايَاتِ وَاِصْلَاحِ الطُّرُقَاتِ وَكُلِّ مَا لَا تَمْلِيْكَ فِيْهِ۔ (ترجمہ) زکوٰۃ وغیرہ صدقاتِ واجبہ بچے اور مجنون کے ہاتھ میں نہ دی جائے اور مسجد میں نہ کفنِ میت میں کیونکہ تملیک صحیح نہیں ہوتی۔ نہ سقاوؤں اور راستوں پر رفاہِ عام کے لئے خرچ کرو۔ اور ہر اُس جگہ خرچ کرنا منع ہے جہاں تملیک صحیح یعنی ملکیتِ غریب نہ پائی جائے۔ صدقاتِ واجبہ چار قسم کے ہیں۔ (۱) جو شرع سے واجب ہوئے۔ جیسے زکوٰۃ، فطرہ، نذر، کفارہ۔ (۲) جو بغیر جرم یا سزا کے محض تطہیر کے لیئے واجب ہُوئے۔ جیسے زکوٰۃ۔ نذر فطرہ۔ (۳) جو کسی جرم کی سزا کے طور پر واجب ہوئے۔ جیسے کفارہ۔

(۴) جو پہلے واجب نہ تھا۔ بلکہ نفلی تھا۔ بعد میں بندے کے فعل سے تبدیل ہو کر واجب ہوگیا۔ اور جُرم میں واجب نہ ہُوا۔ جیسے قربانی کی اون، دُودھ قبل ذبح۔ کھال کی قیمت بعد ذبح۔ پہلی دو۲ قسموں میں وسعت بھی ہے اور تملیک بھی ضروری۔ لہٰذا وہ صدقے نہ امیر کو جائز نہ غریب سید کو نہ مسجد وغیرہ کو مگر تیسری قسم کا صدقہ واجبہ۔ اس میں وسعت نہیں تملیک ہے۔ لہٰذا غریب سید کو جائز لیکن امیر کو بھی دینا منع۔ خود بھی خرچ کرنا منع کہ یہاں تملیک کی اہلیت نہیں۔ مسجد وغیرہ کو بھی منع کہ یہاں تملیک ناممکن۔ **پانچویں دلیل**۔ قانونِ شریعت میں کسی کو بلا عوض دینے کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ (۱) ھدایہ (۲) عطیہ۔ (۳) صدقہ اصطلاحِ شریعت میں ھدیہ کا لفظ دوست۔ احباب کو تحفہ تحائف دینے

کے لیے مستعمل ہے۔ اور لفظ عطیہ مسجد وغیرہ کے لئے۔ لیکن لفظ صدقہ صرف فقراء کے لیے مستعمل ہے اگرچہ گیارھویں، بارھویں ختم درود شریف چالیسواں قربانی، عقیقہ وغیرہ کا کھانا نفلی صدقہ ہی کہلاتا ہے اور امیر و غریب کو دینا صدقہ ہی دینا ہوتا ہے۔ مگر عرفِ عام میں یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ میں نے اپنے دوست کو صدقہ دیا۔ یا مسجد کو صدقہ دیا۔ ثابت ہوا کہ لفظ صدقہ فقیروں مسکینوں کو دینے کا نام ہے۔ چنانچہ لمعات جلد سوم باب مَنْ لَا تَحِلُّ لَهُ الصَّدَقَةُ میں ہے۔ وَالصَّدَقَةُ مَا يُنْفَقُ عَلَى الْفُقَرَاءِ وَيُرَادُ بِهٖ ثَوَابُ الْاٰخِرَةِ۔ وَالْهَدِيَّةُ يُرَادُ بِهَا الْاِكْرَامُ وَيُنْفَقُ عَلَى الْاَغْنِيَاءِ۔

(ترجمہ) جو صدقہ وہ ہے جو فقراء پر لِثَوَابِ الْاٰخِرَةِ خرچ کیا جائے۔ اور ہدیہ وہ ہے کہ جو امراء پر خرچ کیا جائے۔ تمام فقہائے کرام یہی فرماتے ہیں۔ کھال کا صدقہ مستحب ہے اور اس کی رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے۔ اگرچہ فقہاء نے یہ بتایا کہ کس کو صدقہ کرے۔ لیکن اصطلاح سے خود بخود پتہ چل گیا کہ صرف فقراء پر ہی خرچ ہو سکتا ہے۔ اس لئے بعض فقہاء نے تو بلا قید صدقے کا ذکر کیا۔ جیسے فتاوی نابلسیہ میں باب الاضحیہ میں ہے۔ اِذَا بَاعَ جِلْدَ الْاُضْحِيَةِ فَوَجَبَ لَهُ التَّصَدُّقُ اور تنویر الابصار صفحہ ۲۸۶ پر ہے۔ فَاِنْ بِيْعَ اللَّحْمُ اَوِ الْجِلْدُ بِهٖ اَوْ بِدَرَاهِمَ تَصَدَّقَ بِثَمَنِهٖ

(ترجمہ) جب کھال پیسے سے فروخت کی تو صدقہ کرنا واجب۔ مگر بعض نے عَلَى الْفُقَرَاءِ کی قید بڑھا کر مجمل کی تفصیل اور وضاحت کر دی۔ چنانچہ شامی جلد پنجم صفحہ ۲۸۶ پر ہے فَهٰذِهٖ كُلُّهَا سَبِيْلُهُ التَّصَدُّقُ عَلَى الْفَقِيْرِ (ترجمہ) یہ تمام چیزیں فقراء پر ہی صدقہ ہوں گی سبل السلام جلد چہارم صفحہ ۹۵ پر ہے۔ عَنْ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْمَ عَلٰى بُدْنِهٖ وَاَنْ اُقَسِّمَ لُحُوْمَهَا وَجُلُوْدَهَا وَجِلَالَهَا عَلَى الْمَسَاكِيْنِ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنْ اَتَصَدَّقَ (ترجمہ) حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا کہ حکم فرمایا مجھ کو نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم نے کہ آپ کے قربانی کے گوشت پر قائم ہو کر سب گوشت وغیرہ مساکین پر خیرات کر دوں۔ اس سے ثابت ہوا کہ لفظ صدقہ مساکین کے دینے کو ہی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا لازم آیا کہ مسجد کو کھال کی رقم دینا کہیں بھی ثابت نہیں۔ **چھٹی دلیل** فقہاء کرام کے نزدیک اگر کھال کو صدقہ کے لئے فروخت کیا جائے تب تو جائز ہے۔ ورنہ کسی اور کے لئے فروخت کیا تو جائز نہیں۔ چنانچہ بحر الرائق جلد ہشتم صفحہ ۱۷۸ پر ہے۔ وَلَوْ بَاعَهَا بِالدَّرَاهِمِ لِيَتَصَدَّقَ بِهَا جَازَ لِاَنَّهٗ قُرْبَةٌ (ترجمہ) اگر کھال کو درہموں پیسوں سے فروخت کیا جائے کہ صدقہ کرے گا تو جائز ہے۔ اس لیے کہ بس یہی طریقہ باعث ثواب ہے۔

اِس عبارت میں لِیَتَصَدَّقَ فرمایا لِیُھْدِیَ یا لِیُعْطِیَ نہ فرمایا۔ ثابت ہُوا کہ اگر دوستوں کے لئے یا مسجد کے لئے فروخت کیا جائے تو درُست نہیں ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہُوا کہ قربت یعنی ثواب بھی صدقہ کرنے میں ہوگا نہ کہ مسجد یا کسی ادارے میں دینے سے۔ **ساتویں دلیل**: قانونِ شرعی سے ثابت ہوگیا کہ اگر ثواب اور تقرّب کے لئے فروخت کیا تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ اور تقرب مالی دو قسم کا ہے۔ ۱ تملیک، ۲ اتلاف۔ چنانچہ فتاویٰ بحر الرائق جلد ہشتم صفحہ ۱۷۳ پر ہے: وَاعْلَمْ اَنَّ الْقُرْبَةَ الْمَالِيَةَ نَوْعَانِ نَوْعٌ بِطَرِيْقِ التَّمْلِيْكِ كَالصَّدَقَاتِ وَنَوْعٌ بِطَرِيْقِ الْاِتْلَافِ كَالْاِعْتَاقِ وَالْاُضْحِيَةِ ؂ (ترجمہ) مالی ثواب دو قسم کا ہے۔ ایک قسم تملیک کے طریقے پر۔ کہ جس میں کسی غریب کو مالک بنانا لازم ہے (۲) دوسرا اللہ کے راستہ پر کسی چیز کو فنا کرنا جیسے غلام آزاد کرنا اور اُضْحِیَہ قربانی میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ کہ اتلاف بھی ہے اور غریب کی ملکیت بھی ہے۔ مسجد میں قربانی کے پیسے دینے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قربانی کی کھال کے پیسے مسجد پر خرچ کرنے سے تقرّب ثابت نہ ہوگا۔ جیسے کہ فطرہ کے پیسے مسجد پر خرچ نہیں ہو سکتے۔ **آٹھویں دلیل**: لین دین کے معاملے میں مسجد مثل اُمراء کے ہے کہ جو چیز امیر غنی کو دینا منع ہے وُہی مسجد کو دینا منع ہے جیسے زکوٰۃ، فطرہ، کفارہ، نذر۔ لہٰذا چونکہ کوئی امیر آدمی بھی قربانی کی کھالیں بیچ کر اپنے پر خرچ نہیں کر سکتا بس اسی طرح یہ رقم مسجد پر بھی خرچ نہیں ہو سکتی یہ رقم غرباء کا حق ہے۔ غرباء کو ہی دی جائے۔ مسجد کو غرباء کے درجے میں نہ لاؤ۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب بھی قربانی کی کھال جو شخص فروخت کرے۔ خواہ خود یا کوئی امیر یا ناظم انجمن یا متولّی مسجد تو تموّل لازم آئیگا۔ اگرچہ بعض صورتوں میں تموّل مع تقرّب ہوگا لیکن بعد تموّل صدقہ۔ صرف فقراء کے لئے ہوتا ہے۔ اور تموّل سے مال میں خبث نہیں ہوتا۔ لہٰذا غریب سیّد کو بھی تملیک جائز اور صدقہ واجبہ میں تملیک اشد فرض۔ مسجد میں تملیک ناممکن۔ لہٰذا کھال کی قیمت مسجد پر خرچ کرنا منع ہے۔ ہاں خود کھال بعینہٖ یا کھال کے بدلے اینٹ، لوہا لکڑی سیمنٹ، مصلّا اور چٹائی وغیرہ مسجد میں صرف کرنا جائز۔ اگر کھال کی رقم ہی لگانی ضروری ہو تو مثل فطرہ وغیرہ حیلہ شرعی کرنا لازم ہے۔ مخالف کے نظریات مجھ کو کسی تحریر سے دستیاب نہ ہوئے بلکہ ایک بزرگ سے چند منٹ مکالمے میں استفادہ ہُوا۔ میرے جوابات پر وُہ خاموش ہو گئے۔ نہ معلوم کہ اُن کے پاس کوئی دلیل نہ رہی۔ یا محض میری عزّت کرتے ہُوئے خاموش ہو گئے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ؂

کتبہ

قربانی میں کون سا جانور چھ ماہا جائز ہے

سوال ۹۵:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ دنبہ تو چکلی والا چھ ماہا قربانی میں لگ جاتا ہے۔ مگر دوسرے اون والے جانور مثلاً بھیڑ چھترا وغیرہ لگ سکتے ہیں یا نہیں۔ ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ صرف دُنبہ دُنبی چکلی والا جانور تو چھ مہینے کا قربانی میں لگ سکتا ہے مگر اس کے علاوہ اُون والے جانور پُورے ایک سال ہونے شرط ہیں۔ آپ ہم کو فتوٰی ارشاد فرمائیں کہ شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے۔

سائل:۔ عبدالقدوس مقام چک ۴/۱۴-L ڈاک خانہ چک ۳۹/۱۴-L براستہ کسووال ضلع ساہیوال۔

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق کائنات میں جتنے بھی اون والے جانور ہیں اُن سب کی قربانی میں سال بھر کا ہونا شرط نہیں۔ چھ مہینے کا بچہ بھی قربانی میں ذبح کیا جا سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ چھ ماہا بچہ اتنا موٹا تندرست ہو کہ سال بھر کے ہم جنس جانوروں میں کھڑا ہو تو اچٹتی نظر میں فرق نہ لگے۔ اگر ایسا تندرست صحت مند ہو تو دُنبہ ہو یا بھیڑ مینڈھا چھترا ہر ایک کی چھ ماہ کی عمر میں قربانی جائز ہے۔ جن مولوی صاحب نے یہ کہا ہے کہ صرف چکی والا دُنبہ ہی چھ ماہا جائز ہے۔ باقی اون والوں میں پورے سال کی شرط ہے۔ وہ یا تو بالکل ہی علم سے ناواقف ہیں۔ یا اس مسئلے کی ان کو تحقیق نہیں ہے۔ بہرحال اُن کی بات شرعی لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ صحیح اور قابلِ عمل مسئلہ یہی ہے کہ ہر اُون والا جانور مذکر ہو یا مؤنث حاملہ ہو یا بانجھ ہر طرح چھ ماہا تندرست کی قربانی درست ہے۔ ہاں البتہ حاملہ کی قربانی بہتر نہیں کہ حمل ضائع ہوگا۔ مگر بہرحال جواز بادلائل ثابت ہے۔ کیونکہ باری تعالٰی نے کائنات میں انسانی ضرورت کے لئے دو قسم کے چوپائے پیدا فرمائے۔ پہلے کا نام حمولہ یعنی بوجھ اور مشقت اٹھانے والا اور دوسرے کا نام غنم جس کو قرآن پاک نے فرش فرمایا۔ چنانچہ پارہ ہشتم سورہ انعام آیت ۱۴۲ میں ارشاد باری تعالٰی ہے:۔ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا (ترجمہ) اور اللہ تعالٰی نے پھیلائے زمین میں گھریلو جانوروں میں حمولہ اور فرشا۔ پھر چونکہ انسانوں کی مشقتانہ ضرورت بھی دو قسم کی اور غیر مشقتانہ بھی۔ اس لئے خالق نے حمولہ کی بھی دو قسمیں پیدا کیں۔ اور فرش یعنی غنم کی بھی۔ یہ سب کچھ کیوں ہے صرف اس لئے کہ انسان اپنی بود و باش کے اعتبار سے چار قسم کی ضروریات کا حاجت مند ہے۔ اوّل کھیتی باڑی سے غذا کا حصول۔ دوم سفر سے تجارت اور خرید و فروخت کی حاجت۔ سوم لباس کی حاجت چہارم قوت والی خوراک

کی حاجت۔ کھیتی باڑی کے لئے بیل، گائے، بھینس وغیرہ سفر کے لئے اونٹ اونٹنی وغیرہ۔ یہ دونوں کام مشقت کے ہیں۔ اس لئے اُن کے لئے حمولہ جانور پیدا کئے۔ خیال رہے کہ دودھ کائنات میں سب سے زیادہ نرم سادہ اور قوی غذا ہے کہ اس میں خورد و نوش دونوں قوتیں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے ہر عمر میں ہر مخلوق کے لئے یکساں مفید ہے۔ پھر خیال رہے کہ مندرجہ بالا چار انسانی ضروریات میں سے لباس اور خوراک اہم ترین ضروریاتِ زندگی سے ہے۔ اور قانونِ فطرت ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ ضروری ہوگی۔ اُس کا حصول قدرت کی فیاضی کی طرف سے اُتنا ہی زیادہ آسان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ باری عزاسمہٗ نے لباس و خوراک کے لئے جو جانور پیدا کئے وُہ ایسے شاندار اور موزوں و مناسب پیدا کئے کہ جن سے ہر دو حاجتیں پوری کرنے میں بدنی، مالی کوئی مشقت نہیں کرنی پڑتی اسی مناسبت کی بناء پر عربی میں اس جانور کو غنم کہا جاتا ہے۔ لفظِ غنم غنیمت کا مصدر ہے۔ اس کا لغوی ترجمہ ہے بلا مُعاوضہ نعمت ملنا۔ چنانچہ منجدِ عربی صفہ ۵۹ پر ہے۔ غَنِمَ الشَّیْءَ۔ فَازَ بِہٖ وَنَالَہٗ بِلَا بَدَلٍ۔ (ترجمہ) وُہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ غنم جانور سے دو انسانی ضرورتیں وابستہ ہیں۔ ۱ لباس، ۲ خوراک۔ اور یہ دونوں ضرورتیں بلامشقت اس جانور سے حاصل ہو جاتی ہیں نہ کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے نہ محنت کرنی پڑتی ہے اور پھر یہ جانور نہ اتنا بلند ہے کہ اس کی بلندی سے حصول نعمت میں تکلیف ہو نہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس کی خوردی سے تکلیف ہو۔ اونٹنی۔ گائے بھینس بھی اگرچہ دودھ دیتی ہیں۔ مگر وہ سہولت نہیں جو بکری میں ہے۔ کیسی مشقت ہوتی دودھ نکالنے میں اگر بکری کا قد مرغی برابر ہوتا۔ اِن تمام باتوں کو سوچ کر قدرت کے شاہکار پر قربان ہونے کو دل چاہتا ہے۔ جتنی سہولت سے لباس و غذا کی ضرورت بلامعاوضہ اس جانور سے پوری ہوتی ہے اتنی کسی اور جگہ سے نہیں۔ اسی لئے اس کو عربی میں غنم کہتے ہیں۔ غَنَم کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم کا نام ہے مَعْز۔ دوسری قسم کا نام ہے ضان معز علیحدہ جنس ہے جس کی چار قسمیں ہیں۔ ضان اُون والی جنس کا نام ہے۔ یہ دونوں غنم کی قسمیں اسلئے ہیں کہ ان ہر دو سے مثل غنیمت بلامشقت اور بلا بدل نعمت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر خازن علی اربعہ تفاسیر جلد دوم صفہ ۲۹۷ پر ہے۔ وَالضَّانُ ذَوَاتُ الصُّوْفِ مِنَ الْغَنَمِ۔ وَالْمَعْزُ ذَوَاتُ الشَّعْرِ مِنَ الْغَنَمِ۔ (ترجمہ) ضان اُون والا جانور ہے غنم میں سے اور معز بالوں والی غنم ہے۔ ضان اور معز ایک ایک جانور کے نام نہیں بلکہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ جنسوں کے نام ہیں چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد چہارم صفہ ۱۴۸ پر ہے۔ وَالضَّانُ اِسْمُ جِنْسٍ کَالْاِبِلِ :۔ (ترجمہ) اور ضان اسم جنس ہے۔ جیسے کہ لفظِ ابل ایک جانوروں کی جنس کا نام ہے۔ منجد عربی مصری صفہ ۲۰۸ پر ہے۔ الضَّانُ اِسْمٌ

جِنْسٌ بِخِلَافِ الْمَاعِزِ مِنَ الْغَنَمِ۔ (ترجمہ) ضان جنسی نام ہے غنم کی دوسری قسم ماعز کے خلاف تفسیر روح البیان جلد سوم ص۱۱۳ پ۹ پر ہے۔ وَالضَّانُ مَعْرُوْفٌ وَهُوَ ذُوالصُّوْفِ مِنَ النَّعَمِ وَالْمَعْزُ ذُوالشَّعْرِ مِنَ النَّعَمِ۔ (ترجمہ) اور ضان تمام اون والے چوپایوں کا نام ہے اور معز تمام بال والے چوپایوں کا نام ہے۔ تفسیر ابن کثیر جلد دوم ص۱۸۳ پر ہے۔ ثُمَّ بَيَّنَ اَصْنَافَ الْاَنْعَامِ اِلٰی غَنَمٍ وَهُوَ بَيَاضٌ وَهُوَ الضَّانُ وَسَوَادٌ وَهُوَ الْمَعْزُ۔ (ترجمہ) پھر اللہ تعالٰی نے غنم چوپایوں کی قسمیں بیان فرمائیں۔ سفید اور سیاہ۔ سفید ضان ہیں اور سیاہ معز ہیں۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ ہر اون والا جانور ضان ہے اور ہر بال والا دو پستان والا جانور معز ہے۔ نہ معز ایک جانور کا نام نہ ضان۔ انسانی ضرورت کی ۲ دو نعمتیں اون اور دودھ ان میں سے ایک ایک نعمت ایک ایک جانور کو عطا ہوئیں۔ جو بلا مشقت و معاوضہ انسان کو مل جاتی ہیں۔ اون کی نعمتیں ضان سے اور دودھ کی نعمتیں معز سے ہر وقت اس کثرت سے میسر ہے جو کسی اور جانور سے ناممکن اون معز سے نہیں مل سکتی اور دودھ ضان سے بہت مشکل۔ جنسیت کے لحاظ سے سب اون والے جانور ضان ہیں۔ مگر نوعیت اور صنفیت اور شکل و صورت کے اعتبار سے۔ ضان کی چار قسمیں ہیں۔ اور معز کی بھی۔ ہماری اردو زبان میں جنسی نام کوئی نہیں۔ مگر نوعی صنفی نام علیحدہ علیحدہ۔ چنانچہ چکی والے کا نام دنبہ۔ دنبی۔ چھوٹی دم اور بڑے سینگ والے کا نام۔ ۲ مینڈھا مینڈھی بغیر سینگ اور لمبی دم والے کا نام۔ ۳ بھیڑا۔ بھیڑ چھوٹی دم چھوٹے سینگ لمبے کان والے کا نام ۴ چھترا۔ چھتری۔ عربی کی بلاغت یہ ہے کہ اس میں جنسی نام بھی ہے اور نوعی اسماء بھی۔ چنانچہ علی الترتیب دنبے کو عربی میں ۱ خروف کہتے ہیں۔ (المعجم ص۳۵۳) مینڈھے کو ۲ كَبْشٌ (المعجم ص۶۲۲) بھیڑ کو ۳ نَعْجَةٌ (المعجم ص۱۴۷) چھترے کو ۴ زوں الحصیعہ۔ یا كَبْشُ الْاُذَيْنُ۔ ان تمام کا جنسی نام ضان ہے۔ لفظ ضان مشترک ہے ان سب میں یہی وجہ ہے کہ اگر کسی اہل لغت نے اس کا ترجمہ کیا بھیڑ کسی نے ضان سے مراد دنبہ لے لیا۔ کسی نے اس کا مطلب كَبْشٌ کر دیا۔ چنانچہ لغاتِ کشوری ص۲۹۷ پر ہے۔ ضان بمعنی میش یعنی بھیڑی۔ منجد اردو مطبوعہ دار الاشاعت کراچی ص۶۱۷ پر۔ ضان کا ترجمہ کیا ہے۔ بھیڑ۔ دنبہ۔ علامہ شیرازی نے اپنی کتاب غریب القرآن ص۲۱۳ پر ضان کے معنی بھیڑ کئے ہیں۔ شرح وقایہ نے ضان کے معنی چکی والا دنبہ کیا ہے۔ چنانچہ وقایہ جلد چہارم ص۹۳ اور شامی جلد پنجم ص۲۸۱ پر ہے۔ وَالضَّانُ مَا تَكُوْنُ لَهٗ اِلْيَةٌ۔ (ترجمہ) ضان وہ ہے جس کی چکی ہو۔ ان تمام اقوالِ مختلفہ و تراجم منتشرہ سے ثابت ہوا کہ لفظ ضان مشترک ہے۔ اور بحیثیت اسم جنس ہونے کے سب کو شامل ہوتا ہے۔ پس جب کبھی لفظ ضان استعمال کیا

جائے۔ تو سارے اُون والے جانور مراد ہوتے ہیں۔ اب جو شخص صرف شرح وقایہ کی عبارت دیکھ کر یہ کہنا شروع کر دے۔ کہ قربانی میں صرف دُنبہ چھ ماہا جائز ہے۔ کوئی بھیڑ وغیرہ اونی جانور شش ماہی جائز نہیں۔ تو وہ اُن چار اندھوں کی مثل ہی ہو سکتا ہے۔ جنہوں ہاتھوں چھو کر ہاتھی کو دیکھا۔ جس نے صرف ٹانگوں پہ ہاتھ پھیرا۔ اس نے کہا۔ ہاتھی صرف ٹانگوں کا نام ہے۔ جس نے سونڈ کو ہاتھ لگایا۔ اُس نے صرف سُونڈ کو ہاتھی سمجھا۔ جس نے پیٹ پہ ہاتھ پھیرا وہ صرف پیٹ کو ہاتھی سمجھا۔ جس نے دُم کو پکڑے رکھا اُس کے گمان میں ہاتھی فقط دُم کو کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ہاتھی تو پورے مجموعے کا نام ہے ان کے خیال فعل و اقوال فاسد تھے۔ جب کوئی شخص کسی مسئلے میں تحقیق نہ کرے اور لوگوں کو بتانا شروع کر دے تو اس کی حالت انہیں اندھوں جیسی ہے۔ اسی لئے فقہاء فرماتے ہیں تبلیغِ احکام صرف محققین علماءِ اسلام کا کام ہے اور یہ مسئلہ تو قرآن کریم کے اقتضاء النص میں غور کرنے سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ ط (الخ)، وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ (الخ) اللہ تعالیٰ تبارک نے پھیلائے زمین میں ضان اور معز اور ابل اور بقر سے جوڑا جوڑا۔ مقصود باری تعالیٰ یہ بیان فرمانا ہے کہ گھریلو چوپائے سب حلال ہیں۔ جیسا کہ سیاقِ کلام سے ظاہر اس کے باوجود صرف چار نام لیئے ۱۔ ضان ۲۔ معز ۳۔ ابل ۴۔ بقر۔ حالانکہ اون والے جانور چار طرح کے۔ بکریاں بہت قسموں کی۔ اونٹ بے شمار نسلوں کے۔ گائے بہت اقسام کی۔ بھینس کا یہاں ذکر نہ ہوا۔ حالانکہ بھینس بھی گھریلو اور حلال جانور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں چاروں اسماء ایسے جامع مانع ارشاد فرمائے۔ کہ جن میں باقی جانور خود ہی شامل ہو جاتے ہیں۔ لفظ معز ہر قسم کی بکری کو شامل کیونکہ یہ اسمِ جنس ہے۔ نوعی طور پہ بکری کے لئے بہت عربی لفظ موجود ہیں مثلاً تَیْسٌ۔ وَعْلٌ۔ شَاۃٌ۔ عَنْزٌ۔ مگر یہ لفظ آیت میں ارشاد نہ ہوئے کہ یہ انفرادی اسماء ہیں۔ اور مقصود جمعیت ہے جو صرف لفظِ معز سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ابل بھی اسمِ جنس ہے جو اونٹ کی سب قسموں کو شامل کرتا ہے۔ نوعی اعتبار سے اونٹ کے اور بھی بہت سے نام ہیں۔ جَمَلٌ۔ بَعِیْرٌ۔ اٰذَکُ۔ فَالِجٌ۔ بَحْلُوْلٌ۔ بُدْنٌ۔ فِرْمِلٌ۔ نَاقَۃٌ۔ مِخْنَاقٌ۔ کُوْمَاءُ۔ مگر ان میں سے کوئی لفظ آیت میں ارشاد نہ ہوا۔ اس لیئے کہ یہ انفرادی نام ہیں ان سے کُلّیت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا تھا۔ بدیں وجہ اِبِلٌ اسم جنس استعمال فرمایا گیا۔ تاکہ سب کو شامل ہے۔ تفسیرِ معانی اور بیضاوی ص ۲۹۳ نے لفظِ ابل کو اسم جنس کہا ہے۔ اسی طرح بَقَرٌ بھی اسم جنس ہے۔ گائے کے انفرادی اسماء بہت ہیں۔ مثلاً ثَوْرٌ۔ تَیْنَسٌ۔ سَنَمٌ۔ مَوْدَمَۃٌ۔ جَلْجَاءُ۔ لمعات شرح مشکوٰۃ نے فرمایا کہ

جاموس یعنی بھینس بھی بَقَرَۃٌ کی قسم ہے۔ چنانچہ حاشیہ مشکوٰۃ شریف ص ۱۲۷ پر ہے۔ وَالْغَنَمُ صِنْفَانِ اَلْمَعْزُ وَالضَّانُ۔ وَالْجَامُوْسُ نَوْعٌ مِّنَ الْبَقَرِ۔ (ترجمہ) غنم کی دو قسمیں ہیں۔ معز اور ضان اور جاموس بقر کی ایک قسم ہے۔ بقر کے اسم جنس ہونے کی بناء پر ہی غالباً بنی اسرائیل کو اشتباہ پڑ گیا تھا۔ ان دلائل سے ثابت ہُوا کہ اس آیت کریمہ کے تین الفاظ معز۔ ابل۔ بقر۔ جنسی اسم ہیں۔ جب یہ تین جنسی نام ہُوئے تو لازماً ضان بھی جنسی نام ہُوا۔ ورنہ آیت میں بے مناسبی کے ساتھ ساتھ یہ اعتراض بھی وارد ہوگا کہ یہاں بجائے ضان۔ کبش یا خروف یا نعجہ کیوں نہ بولا گیا۔ اور پھر ضان اگر ایک ہی جانور کا نام ہو تو باقی اون والے جانور کی حلت کہاں سے ثابت کروگے۔ ثابت ہُوا کہ ضان بھی اسم جنس ہے اور ضان بول کر تمام اون والے جانور مُراد ہوتے ہیں۔ خیال رہے کہ اسم جنس وہ ہوتا ہے جو اپنے تمام انواع کی صفات ذاتیہ و خلقیہ کا حال ہو۔ تمام اون والے جانور خِلقتاً ہر طرح کمزور ہوتے ہیں۔ کمزور دِلی اور لحمی قوت کے لحاظ سے یہ جانور بکری سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ اس کی وجہ دیگر وجوہ کے علاوہ چربی کی زیادتی ہے اور یہ بات طبّی لحاظ سے متفقہ مسلّمہ ہے کہ چربی کی زیادتی کمزور دِلی اور ناطاقتی کا باعث اور چربی سے قوتِ لحمیہ بھی کم ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ مذکر حیوان میں چربی کم ہوتی ہے اور مونّث میں زیادہ۔ لہٰذا طاقت زیادہ مذکر میں ہوتی ہے۔

زیادہ چربی کھانے سے طبیب منع کرتے ہیں۔ شراب کی حُرمت کی وجہ یہ بھی ہے کہ شراب سے چربی بڑھتی ہے۔ اور چربی سے بُزدلی شرابی آدمی ظاہراً موٹا ہوتا جاتا ہے۔ مگر قوتِ جسمیہ و قلبیہ مفقود۔ جو جانور یا انسان چرب جائے وہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ چربی والا گوشت اسی لئے مفید نہیں ہوتا کہ اس میں قوت لحمیہ کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماءِ اسلام فقہاءِ عظام نے بھیڑ دُنبے کے گوشت سے زیادہ اچھا بکری کے گوشت کو فرمایا۔ اور بکری سے زیادہ بکرے کے گوشت کو فرمایا۔ چنانچہ نووی شرح مسلم جلد دوم ص ۱۵۵ پر ہے۔ وَقَالَ مَالِكٌ اَلْغَنَمُ (اَيِ الشَّاةُ) اَفْضَلُ لِاَنَّهَا اَطْيَبُ اور فتاوٰی بزازیہ جلد سوم ص ۲۸۹ پر ہے۔ وَمِنَ الْمَعْزِ الذَّكَرُ مِنْهُ اَفْضَلُ۔ (ترجمہ) اور فرمایا امام مالک نے کہ غنم یعنی بکری کی قربانی باقی سب جانوروں سے افضل ہے اس لئے کہ اس کا گوشت بہت طیب ہوتا ہے۔ بزازیہ نے کہا۔ اور معز میں مذکر افضل ہے۔ یعنی بکری سے زیادہ اچھا گوشت بکرے کا ہوتا ہے اس لئے کہ اس میں چربی کم ہوتی ہے۔ اون والے جتنے بھی جانور ہیں اُن میں چربی زیادہ ہوتی ہے۔ اور چربی سے گوشت میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے بھیڑ وغیرہ بمقابلہ بکری، گائے جلدی بلوغت کو کو پہنچتی ہے۔ اگر بکری سال بھر بعد بالغہ ہوگی تو بھیڑ ساتویں مہینے بالغہ ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی چھ ماہا قربانی جائز ہے۔ قربانی دینا بلوغت جانور سے پہلے منع ہے۔ ہر جانور کی قربانی کے لئے وُہی

مختلف عمریں مقرر کی گئی ہیں۔ جوان کی بلوغت کی عمریں بہ اعتبار فرماتے ہیں کہ زیادہ چربی کھانے والی لڑکی جلدی بالغہ ہوتی ہے۔ اسی لئے اُمراء اور قصابوں کی لڑکیاں جلدی بالغہ ہوتی ہیں۔ کہ گرم غذائیں کھا کر چڑھ جاتی ہیں۔ چربی سے طاقت و قوت کم ہوجاتی ہے۔ اُون والے جتنے بھی جانور ہیں دیگر جانوروں کے مقابلے میں بُزدل اور بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ اور بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔ اسی جنسی ضُعف اور کمزوری کی بناء پر ان کا نام ضان رکھا گیا۔ ضان کا لغوی ترجمہ ہے کمزوری۔ چنانچہ منجد عربی صـ۴۸۵ پر ہے:۔ اَلضَّانُ وَالضَّائِنُ فَاعِلٌ ضَعِیْفٌ۔ لَیِّنٌ۔ ترجمہ الضان اسکا فاعل ہے۔ ضائن اس کا لغوی معنیٰ کمزوری والا۔ بہت نازک۔ یہ کمزوری چونکہ سب اون والوں میں ہے اس لیے سب ہی ضان ہوئے۔ جب یہ سمجھ لیا تو اب حدیث پاک ملاحظہ ہو۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد اوّل صـ۱۸۱ پر ہے عَنْ اَبِیْ کِبَاشٍ قَالَ (الخ) فَلَقِیْتُ اَبَاهُرَیْرَةَ فَسَاَلْتُ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ یَقُوْلُ نِعْمَ اَوْ نِعْمَتِ الْاُضْحِیَةُ الْجَذَعُ مِنَ الضَّانِ (الخ) وَالْعَمَلُ عَلٰى هٰذَا عِنْدَ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَغَیْرِهِمْ عَنِ الْجَذَعِ مِنَ الضَّانِ۔ یُجْزِئُ فِی الْاُضْحِیَةِ۔ (ترجمہ) ابوکباش سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ میں نے کچھ قربانی والے جانور خریدے جو جذع یعنی شش ماہے تھے۔ میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا کر مسئلہ پوچھوں تو آپ نے فرمایا کہ میں نے آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ ضان کا جذعہ یعنی چھ ماہا جانور کی قربانی اچھی ہے اور ذی علم صحابہ کرام کا عمل شریف بھی یہی تھا کہ ضان جانوروں کا چھ ماہا قربانی میں جائز ہے۔ اسی حدیث شریف کو مسلم جلد دوم نے صـ۱۵۵ پر نقل فرمایا اور مشکوٰۃ صـ۱۲۸ پر بھی یہ حدیث شریف اسی معنیٰ میں موجود ہے۔ تمام فقہاء کرام بھی چھ ماہا قربانی میں ضان کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ بزازیہ جلد سوم صـ۲۸۹ اور فتاویٰ دُرِّمختار صـ۲۸ پر ہے۔ وَصَحَّ الْجَذَعُ ذُوْ سِتَّةِ اَشْهُرٍ مِنَ الضَّانِ اور شامی میں ہے قَیَّدَ بِهٖ لِاَنَّهٗ لَا یَجُوْزُ الْجَذَعُ مِنَ الْمَعْزِ وَغَیْرِهٖ بِلَاخِلَافٍ (ترجمہ) اور صحیح ہے جذع چھ مہینے کی عمر والا ضان جانور سے شامی نے اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ ضان کی قید اس لیے لگائی کہ بکری گائے بھینس کا جذعہ قربانی میں جائز نہیں۔ تمام فقہاء و محدثین نے جہاں بھی چھ ماہ کے جذعے کا ذکر کیا وہاں ضان کا نام لیا۔ صرف اس لئے تاکہ سب اون والے جانور شامل ہوجائیں۔ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو کبش وغیرہ کہدیتے۔ اب مسؤلہ فی السوال مسئلہ واضح ثابت ہوگیا کہ بھیڑ ہو یا دُنبہ۔ مینڈھا یا چھترا

مذکر ہو یا مؤنث سب قسمیں چھ مہینے کی قربانی میں جائز ہیں۔ ہاں البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ موٹا تازہ تندرست ہو سال بھر کے ہم جنسوں میں کھڑا ہو تو اُن جیسا ہی لگے۔ چنانچہ فتاویٰ بزازیہ جلد سوم صہ ۲۸۹ پر ہے۔
اِلَّا الْجِذْعُ مِنَ الْغَنَمِ اِذَا کَانَ عَظِیْمًا۔ وَاِذَا کَانَ صَغِیْرَ الْجِسْمِ لَا یَجُوْزُ اِلَّا اِذَا اَتٰی عَلَیْہِ عَامٌ۔ (ترجمہ) مگر چھ ماہ کا جذعہ غنم جانور سے جب کہ بڑا قد آور ہو لیکن جب چھوٹا کمزور ہو تو جائز نہیں بلکہ سال بھر پورا ہونے دے۔ **خلاصہ** کلام یہ ہے کہ ہر اُون والا جانور بھیڑ دُنبہ چھترا موٹا تازہ وغیرہ چھ ماہ کا قربانی لگ سکتا ہے جن مولوی صاحب نے دُنبے کی قید لگائی ہے وہ غلط ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

قربانی کے جائز اور ناجائز جانوروں کا بیان

سوال ۸۶ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میں نے قربانی کے لئے ایک گائے خریدی جس کے دونوں کان لمبائی میں دائیں طرف سے آدھے سے کم صرف چرے ہوئے ہیں۔ کل میرے بھائی نے وہ گائے آپ کو دکھائی تھی جس کو دیکھ کر آپ نے زبانی ارشاد فرمایا تھا کہ جائز ہے قربانی لگ سکتی ہے مگر اس سے پہلے ہمارے امام مسجد عبدالعزیز ولد محمد عالم امام مسجد ٹبی مرائی نے ہمکو مسئلہ بتایا کہ میں نے حاجی احمد شاہ سے جو پیر ولایت شاہ صاحب کے چھوٹے بیٹے ہیں مسئلہ پوچھا تھا اور گائے کے کان کی خبر سنائی تھی بالکل بتائی تھی انھوں نے فرمایا کہ قربانی مکروہ ہے۔ ہمارے قریب ایک نو عمر مولوی ہیں جن کا نام محمد افضل ہے مراڑیاں کے رہنے والے ہیں۔ مولوی محمد اسلم صاحب کے بیٹے ہیں۔ آپ سے پہلے میں نے اُن کو گائے دکھائی تو انھوں نے کہا کہ قربانی ناجائز ہے۔ کل ہم نے اُن سے کہا مفتی صاحب کے بیٹے نے فرمایا ہے کہ قربانی بالکل جائز ہے تو انھوں نے آپ کے خلاف بہت باتیں کیں اور کہا کہ ان کا مسئلہ غلط ہے ان کو میرے سامنے لاؤ۔ ایک منٹ بھی مجھ سے بات نہیں کر سکتے۔ اُن کو اردو کی کتاب میں لکھا ہوا مسئلہ بھی سمجھ نہیں آتا۔ مولوی افضل صاحب کے پاس ایک موٹی سی اردو کی کتاب تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ حدیث پاک ہے۔ پھر کہا کہ حیرانگی ہے۔ ان لوگوں کو مسئلہ بتانے کا شوق ہے۔ مگر کتابیں نہیں دیکھتے۔ پھر آپ کا نام لے کر کہا کہ اقتدار احمد خاں کو تو صحیح عربی پڑھنی نہیں آتی۔ ہمارا ایک ساتھی دیوبندی مولوی نذیر اللہ صاحب سے فتویٰ لایا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ قربانی جائز ہے۔ ہم بہت تشویش میں ہیں۔ دو مولویوں نے کہا کہ قربانی مکروہ و ناجائز ہے اور دو نے کہا کہ جائز ہے مولوی افضل کا لکھا ہوا مسئلہ اور مولوی نذیر اللہ صاحب کا پرچہ لکھا حاضر خدمت ہے۔ ہم سب کا مکمل فیصلہ ہے کہ جو آپ فتویٰ دیں گے اس پہ

عمل کیا جائے گا۔ کیونکہ آپ ہی کا فتویٰ چلتا ہے۔ سب لوگ آپ ہی سے فتویٰ لیتے ہیں۔ براہِ کرم آپ اپنا قیمتی وقت خرچ فرما کر ہم کو مدلل اور با مُہر فتویٰ عطا فرمایا جائے اگر قربانی واقعی ناجائز ہو تو ابھی وقت ہے ہم گائے بیچ کر دوسری خرید لیں، اگر یہی دُرست ہو تو ہم کو شرعی حکم بتایا جائے۔ تاکہ مولوی افضل اور اپنے امام صاحب کی غلط باتوں کو روکا جائے۔ محلے میں ان دونوں حضرات نے انتشار ڈالا ہوا ہے۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا۔

دستخط:- محمد صدیق محلہ امین آباد ۔۷۹-۱۰-۳۰

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

جہاں تک جواب سوال کا تعلق ہے وہ تو مندرجہ ذیل سطور میں پیش کیا جا رہا ہے مگر اوّلاً یہ سمجھو کہ مولوی عبد العزیز امام مسجد کا یہ کہنا کہ محترم سید حاجی احمد شاہ صاحب قبلہ کا یہ فرمانا کہ یہ گائے قربانی کے لیئے مکروہ ہے۔ یہ عبد العزیز صاحب کی غلط بیانی معلوم ہوتی ہے۔ حاجی احمد شاہ صاحب بہت بڑے عالم ایسا غلط مسئلہ نہیں بتا سکتے۔ حاجی احمد شاہ صاحب قبلہ عالم حضرت حکیم الامت والدِ محترم رحمۃ اللہ علیہ کے لائق شاگردوں میں سے ہیں، سب خاندان میں بڑے علم والے اور سب بھائیوں میں زیادہ محنتی۔ اُن کے بھائی سید محمود شاہ مجاہد ملت نڈر خطیب اور سید حامد علی شاہ صاحب مناظرِ اسلام ہو گئے۔ یہ ہر دو بھی والدِ محترم کے مکمل شاگرد ہیں۔ مگر منصب درس وتدریس اور درجۂ شیخ الحدیث جس کے لئے کثیر علم کی ضرورت ہے۔ وہ قبلہ حاجی احمد شاہ صاحب کے ہی سپرد ہُوا۔ مجھ کو ان تینوں بزرگوں کی علمی محنتیں یاد ہیں۔ جب سید حامد علی شاہ صاحب اور حاجی احمد شاہ صاحب ہمارے گھر پڑھنے کے لئے آیا کرتے تو والدِ محترم کی ان صاحبان کے ساتھ شفقت بھی بد ہے اور سید محمود شاہ پہلے شاگردوں میں سے ہیں۔ صاحبزادہ افضل اس قسم کے انسان نہیں وہ با ادب خاندانی علمی گھرانے کے فرد ہیں کہ یہ صاحب ابتداء سے انتہا تک میرے شاگرد رہے ہیں۔ از آمدن نامہ تا دورۂ حدیث انھوں نے مجھ سے پڑھا ہے۔ اُسوقت :. اُستاد جی اُستاد جی کہا کرتے تھے اور درس وتدریس میں محنتی تھے اُس وقت با ادب سوال کیا کرتے تھے۔ اب مقابلے میں آنے کی ہرگز جرأت نہیں کر سکتے۔ ان کے بڑے بھائی مولوی محمد اشرف صاحب نعیمی بھی میرے مکمل شاگرد ہیں۔ از اوّل تا آخر میرے پاس پڑھا ہے۔ بلکہ اُن کے والد صاحب بھی والدِ محترم حضرت حکیم الامت کے شاگرد ہیں اور میرے ہم سبق ہیں۔ دورۂ حدیث میں میرے آٹھ ساتھی تھے۔ جن میں صوفی محمد اسلم صاحب سب سے متقی اور صُوفی مَنش تھے۔ اپنے استادِ محترم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا انتہائی احترام کرتے۔ انھوں نے کبھی بے وضو مصافحہ نہ کیا۔ جب مصافحہ کرتے دست بوسی کرتے۔ اور بعدہٗ قدموں کو ہاتھ لگاتے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے ہمارے اس شاگرد کو

عجز اور ادب کی بنا پر بغیر محنت شرح صدر حاصل ہو گیا ہے یہ نہ بھی پڑھے تب بھی سینہ روشن ہے۔ میں نے اپنی عمر میں پیر اسلم اور مولانا بشیر احمد حافظ آبادی سے زیادہ با ادب کوئی شاگرد نہ دیکھا۔ پیر اسلم حضرتِ اعلیٰ حکیم الامت کی طرف کبھی پیٹھ نہ کرتے تھے۔ مولانا بشیر احمد حافظ آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک مرتبہ آدھے گھنٹے تک کھڑے رہے۔ صرف اس انتظار میں کہ حضرت نے اپنا پیر پھیلایا ہوا تھا۔ اور گزرنے کے لئے پیر شریف کو پھلانگنا پڑتا تھا۔ حضرت نے بوجہ انہماک تحریری کچھ توجہ نہ فرمائی۔ جب آپ خود متوجہ ہوئے اور حضرت مولانا کو دست بستہ کھڑے پایا تو پوچھا کیوں کیا بات ہے؟ عرض کیا حضور گزرنا چاہتا ہوں۔ ارشاد فرمایا گزر جاؤ۔ عرض کیا حضور آپ کا پاؤں شریف حائل ہے۔ تب حضور نے پاؤں سمیٹا اور بہت دُعائیں عطا کیں۔ اور فرمایا جاؤ میاں تم نے میرا ادب کیا تمہارا زمانہ ادب کریگا۔ اس دعائے مُتطلبی کا اثر آج بھی حافظ آباد میں دیکھ لو۔ کہ مزار پر میلہ لگا ہے۔ اِدھر صوفی اسلم صاحب کے ادبِ استاد کا نتیجہ بھی دیکھ لو کہ اژدحامِ عوام و خواص ہے۔ انہوں نے استاد کا ادب احترام کیا۔ دُنیا ان کا ادب کر رہی ہے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد اشرف بھی بڑے عاجزی انکساری پسند اور با ادب ہیں۔ والد اور بڑے بھائی کے اِس روّیہ و اخلاقِ حَسَنہ کو دیکھتے ہوئے افضل صاحب کے متعلق ایسی گفتگو لولنے پر یقین نہیں آتا ضرور کسی نے ان کی طرف ایسی عامیانہ باتوں کی جھوٹی نسبت کی ہے۔ کیونکہ کسی شخص کا بھی استادِ رُوحانی دینی اور پیر و مُرشد سے درجہ بُلند نہیں ہو سکتا۔ خواہ کسی مقام پر پہنچ جائے۔ ہاں البتہ رُوحانی جسمانی طور پر باپ سے بیٹے کا درجہ بُلند ہو سکتا ہے۔ مگر اُستاد سے کسی شاگرد کا مقام بُلند نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاءِ کرام کا کوئی استاد نہیں ہُوا بجز پروردگار۔ عوام کی ان حاسدانہ گستاخیوں سے مجھ کو کوئی غُصّہ نہیں۔ ہم لوگ ایسی سُننے کے عادی ہو چکے ایک عوام تو کس گیا ہیں حاسدین نے تو ہمارے بزرگوں سے جو سلوک روا رکھا ہم کو اس کا بھی گلہ نہیں۔ کیونکہ ان ہی حسد آمیز دشمنوں نے مجھ کو ترقی کی منزل پر پہنچایا۔ میں کس شمار میں ہوں حضرتِ محترم سے دشمن حاسدین نے کیا برتاؤ کیا۔ عام سنّیوں کی اور دشمن حاسدین کی اسی بے رُخی و حسد و دُشمنی کو دیکھ ایک شیعہ مجتہد نے حضرت سے عظیم علمی استفادہ کے بعد برملا کہا تھا کہ اگر حضرت حکیم الامت ہماری جماعت میں ہوتے تو آیتُ اللہ کا مقام حاصل کرتے۔ اور یہ حسد و بغض آج کی بات نہیں شروع سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے ہر بزرگ کے دشمن ہوتے رہے مگر بات یہ ہے کہ جو بے پانی بھی تر رہتے ہیں مرجھایا نہیں کرتے۔ مجھ کو یہ باتیں لکھنے کی حاجت نہ تھی۔ مگر چونکہ سوال میں ایسی باتیں شامل تھیں جن کی اثریت کو ختم کرنا ضروری تھا۔ رہا صاحبزادہ محمد افضل کا تحریری مسئلہ تو وہ انکی عدم تفکر ہے۔ مسئلہ اس طرح نہیں۔ بلکہ صورتِ مسئولہ میں قانونِ شریعت کے مطابق مذکورہ فی السوال گائے کی قربانی بالکل جائز

ہے۔ قوانینِ اسلامیہ میں صرف اس قربانی والے جانور کی قربانی منع ہے جس میں پانچ عیب ہوں۔ ۱؎ کانا اندھا ہو۔ ۲؎ لنگڑا جانور جو چل نہ سکے۔ ۳؎ بیمار جانور۔ ۴؎ انتہائی دُبلا جانور۔ ۵؎ عضبا جانور جس کی دُم یا کان یا سینگ آدھا یا زیادہ کٹا ہو۔ چنانچہ ابنِ ماجہ شریف صـ۲۲۷ اور طحاوی شریف جلد دوم صـ۲۹۶ پر ہے۔ عَنِ الْبَرَاءِ ابْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ (الخ) فَقَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ لَا یُجْزِیُ فِی الضَّحَایَا۔ اَلْعَوْرَاءُ الْبَیِّنُ عَوْرُھَا وَالْعَرْجَاءُ الْبَیِّنُ عَرَجُھَا وَالْمَرِیْضَۃُ الْبَیِّنُ مَرَضُھَا وَالْعَجْفَاءُ (الخ) ترجمہ:۔ پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ چار جانوروں کی قربانی ناجائز ہے۔ اندھا۔ کانا۔ لنگڑا۔ بیمار سخت۔ لاغر سخت۔ طحاوی شریف جلد دوم کے صـ۲۹۷ پر ہے:۔ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ عَضْبَاءِ الْقَرْنِ وَالْاُذُنِ۔ ترجمہ:۔ منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سینگ اور کان کے عضبا جانور کو۔ یعنی جس جانور کا آدھا سینگ یا آدھا کان کٹا ہو۔ وُہ جانور بھی قربانی میں ناجائز ہے۔ طحاوی میں اسی جگہ ہے۔ قَالَ قَتَادَۃُ فَقُلْتُ لِسَعِیْدِ بْنِ مُسَیَّبٍ مَا عَضْبَاءُ الْاُذُنِ۔ قَالَ اِذَا کَانَ النِّصْفُ اَوْ اَکْثَرُ مِنْ ذَالِکَ مَقْطُوْعًا۔ (ترجمہ) حضرت قتادہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت سعید ابن مسیّب سے پُوچھا۔ عُضبا جانور کیا ہے۔ جواباً فرمایا کہ آدھا یا آدھے سے زیادہ کان کٹا ہوا۔ خیال رہے کہ عضبا جانور تین قسم کا ہے۔ ۱؎ سینگ کٹا۔ ۲؎ کان کٹا۔ ۳؎ دم کٹا۔ پس ان احادیث کی رو سے پانچ جانوروں کی قربانی منع ہوئی۔ عرجا۔ عورا وعمیا۔ مریضہ۔ عجفا۔ عضبا۔ ان کے علاوہ باقی سب قربانی والے جانور جن کی شرعی عمر پُوری ہو قربانی میں ذبح کرنے جائز ہیں۔ ہاں اگر آدھے سے کم کان وغیرہ کٹا ہو تو قربانی جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت قتادہ کی سوال جواب والی حدیثِ مُطَہَّرَہ سے اقتضاءً ثابت ہُوا۔ نیز ابن ماجہ کی ایک روایت سے بھی دلالۃً واشارۃً یہی ثابت ہو رہا ہے کہ نصف سے کم دم یا کان کٹا ہوگا تو قربانی جائز ہے۔ چنانچہ صـ۲۲۷ پر ہے۔ فَاَصَابَ الذِّئْبُ مِنْ اِلْیَتِہٖ وَاُذُنِہٖ۔ فَسَاَلْنَا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَنَا اَنْ نُّضَحِّیَ بِہٖ۔ ترجمہ:۔ ایک بکری کو بھیڑیئے نے پکڑا اور اس کے کان اور دُم کا ٹکڑا لے گیا۔ ہم نے آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پُوچھا۔ آپ نے حکم فرمایا کہ ہم اُس کی قربانی کر سکتے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ بھیڑیئے نے کم حصّہ کاٹا ہوگا۔ ورنہ احادیث کی مطابقت کیونکر ہوگی اور اور عضبا کی تعریف کس طرح صادق آئے گی۔ سوال مذکورہ میں جس گائے کا ذکر ہے اس کو میں نے بغور دیکھا ہے۔ اس کا کان بالکل سلامت موجود ہیں۔ مندرجہ بالا پانچوں عیوب میں سے کوئی عیب

اس میں نہیں ہے۔ اس غور و تحقیق کے بعد یہ فتویٰ جاری کیا جارہا ہے۔ کہ مذکورہ گائے کی قربانی شرعاً بالکل جائز ہے۔ تردد یا شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ گائے مذکورہ کے دونوں کان لمبائی میں جانب زیریں تقریباً دو دو انچ چرے ہوئے ہیں۔ صرف چیری ہے۔ کچھ حصہ ذرا نہیں ہے۔ قانونِ شریعت کے مطابق کان چرا یا پھٹا ہونا خواہ کتنا ہی ہو۔ شرعی عیب نہیں ہے جس سے قربانی منع ہو۔ عیب شرعی صرف یہ ہے کہ کان یا دُم یا سینگ نصف یا زیادہ کٹ کر اکھڑ گیا ہو۔ اور نصف سے کم اکھڑ جانا بھی جانور میں شرعی عیب نہیں محض چیرا ہونا تو بالکل ہی عیب نہیں ہے چنانچہ فتاویٰ بحرالرائق جلد ہشتم صـ۱۷۷ لِاَنَّ مُجَرَّدَ الشَّقِّ مِنْ غَیْرِ ذَھَابِ شَیْئٍ مِّنَ الْاُذُنِ لَا یَمْنَعُ۔ ترجمہ۔ اس لیے کہ فقط کان کا چرا ہونا بغیر کسی چیز کے جدا ہونے کے کان سے جانور کو قربانی کے لئے ناجائز نہیں۔ فتاویٰ قاضی خان جلد سوم صـ۳۵۲ پر ہے:۔ وَشَقُّ الْاُذُنِ وَالْکَیُّ لَا یَمْنَعُ جَوَازَ الْاُضْحِیَۃِ۔ ترجمہ کان کا پھٹا۔ چرا ہونا یا داغا ہوا ہونا۔ قربانی کے جائز ہونے کو منع نہیں کرتا۔ فتاویٰ شامی جلد پنجم صـ۲۸۴ پر ہے۔ وَتَجْزِیِ الشَّرْقَاءُ مَشْقُوْقَۃُ الْاُذُنِ طُوْلًا۔ وَالْخَرْقَاءُ وَالْمُقَابَلَۃُ وَالْمُدَابَرَۃُ ترجمہ:۔ اور اُس جانور کی قربانی جائز ہے۔ جس کا کان لمبائی میں چرا ہوا اور اُس کی بھی قربانی جائز ہے۔ جس کا کان سوراخ کی طرح پھٹا ہوا ہو اور اسکی بھی قربانی جائز ہے۔ جس کے کان کا اگلا حصہ کٹ کر لٹک گیا ہو اور اس کی قربانی بھی جائز ہے جس کے کان کا پچھلا تھوڑا حصہ کٹکر لٹک گیا ہو۔ گویا کہ کان چرنے کی چار صورتیں ہیں۔ اور چاروں ہی سے جانور جائز ہی رہے گا۔ قربانی منع نہ ہوگی۔ اُن کے عربی نام ہیں ۱۔ شرقاء ۲۔ خرقاء ۳۔ مقابلہ ۴۔ مدابرہ۔ فتاویٰ بزازیہ جلد سوم صـ۲۹۲ پر ہے:۔ وَالَّتِیْ فِیْ اُذُنِھَا ثُقْبٌ اَوْ شِقَاقٌ مِنَ الْاَعْلٰی اِلَی الْاَسْفَلِ یُجُوْزُ۔ (ترجمہ) اور وہ جانور جس کے کان میں سوراخ ہے یا چیر ہے اوپر سے نیچے کی طرف وہ جانور قربانی میں جائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم صـ۲۹۸ پر ہے:۔ وَتَجْزِیُ الشَّرْقَاءُ وَالْمُقَابَلَۃُ وَالْمُدَابَرَۃُ۔ (ترجمہ) کان چرے ہوئے جانور شرقا اور مقابلہ جانور اور مدابرہ جانور کی قربانی بالکل جائز ہے۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ جانور کا کان جب لمبائی یا چوڑائی میں صرف چر جائے۔ کم یا زیادہ۔ جانور کی قربانی جائز رہے گی جن مولوی صاحبان نے اس کو ناجائز یا مکروہ کہا وہ غلطی پر ہیں۔ نہ یہ قربانی منع ہے نہ مکروہ تحریمی نہ تنزیہی۔ بلکہ بلا کراہت جائز ہے۔ ان ہر دو مولوی صاحبان نے غالباً اس حدیث سے دھوکہ کھایا جس کو ترمذی نے جلد اول صـ۱۸۱ پر اور ابن ماجہ نے صـ۲۲۷ پر اور ابوداؤد نے صـ۳۸۸ پر بروایت حضرتِ علی نقل فرمایا۔ مولوی مذکور نے مسئلہ بتانے میں سخت غلطی کی اور جلدبازی کی۔ اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

عَنْ عَلِیٍّ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّضَحّٰی بِمُقَابَلَۃٍ اَوْ مُدَابَرَۃٍ اَوْ شَرْقَاءَ اَوْ جَدْعَاءَ۔ (ترجمہ) روایت ہے حضرت علی شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے کہ ذبح کیا جائے قربانی کے لئے مقابلہ جانور۔ یعنی اگلا کان کٹا حصہ جو لٹک رہا ہو۔ اور مدابرہ پچھلا حصہ جو لٹک رہا ہو اور شرقا لمبائی میں چرا ہوا اور خرقا چوڑائی میں چرا ہوا کان والا جانور۔ یہ ہے وُہ روایت جس کی بناء پر مولوی مذکور کو غلط فہمی ہوئی۔

یہ ان کی نادانی اور کم فہمی ہے چند وجہ سے۔ پہلی یہ کہ کسی محدث اور مجتہد و فقیہ نے اس روایت پر عمل نہ کیا۔ بلکہ سب فقہاءِ کرام فرماتے ہیں۔ کہ کان چرنے سے قربانی منع نہ ہوگی۔ جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس روایت پر محدثانہ جرح سے یہ روایت قابل قبول نہیں رہتی۔ چنانچہ ترمذی شریف نے اس کو دو سندوں سے روایت کیا ہے اور اگرچہ اپنی ان سندوں کو صاحبِ ترمذی نے صحیح کہا ہے۔ مگر شارحین حضرات بابرکات ان کی صحت کو نہیں مانتے۔ شرح مشکوٰۃ صفحہ ۲۶۶ جلد دوم میں ہے۔ وَلَمْ یُبَالُوْا بِتَصْحِیْحِ التِّرْمِذِیِّ لَہٗ۔ فقہاءِ کرام نے ترمذی کے اس کہنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان کو نہ مانا۔ کسی شارح نے اس کو موقوف کہا۔ کسی نے اس روایت کو سنداً ضعیف کہا۔ کسی تاویل کی۔ مرقات نے بحوالہ دارِقطنی اس روایت کو موقوف کہا۔ چنانچہ مرقات دوم صفحہ ۲۶۶ پر ہے اَلْحَدِیْثُ مَوْقُوْفٌ عَلٰی عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کَمَا قَالَ لَہُ الدَّارَقُطْنِیُّ وَغَیْرُہٗ۔ فقہاءِ کرام کے اس روایت کو نہ ماننے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اس روایت کو دارقطنی وغیرہ محدثین نے موقوف کہا ہے حضرتِ علی پر۔ اس عبارت سے ثابت ہوا کہ محدثین کے نزدیک یہ روایت موقوف ہے۔ اسی کو بالتبع اثر بھی کہتے ہیں۔ موقوف حدیث وہ ہے جو سنداً صحابی تک پہنچے۔ چنانچہ تحفۃ الفکر صفحہ ۱۰۴ پر ہے۔ اَلْمَوْقُوْفُ وَھُوَ مَا یَنْتَھِیْ اِلَی الصَّحَابِیِّ (ترجمہ) موقوف وہ حدیث ہے سند میں صحابی تک ختم ہو۔ یعنی آخری راوی یہ کہے فلاں صحابی نے یہ فرمایا یعنی حدیث۔ یہ پتہ نہ چلے کہ صحابی خود نبی کریم سے سنا ہے یا کسی دیگر ذریعے سے صحابی کو یہ بات پہنچی ہے۔ روایتِ موقوف کو اثر بھی کہتے ہیں۔ اور اثر اسی کلام کو کہا جاتا ہے۔ جو نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد ہو۔ چنانچہ نزہۃ النظر صفحہ ۱۰۵ پر ہے! وَاعْلَمْ اَنَّ الْفُقَھَاءَ یَسْتَعْمِلُوْنَ الْاَثَرَ فِیْ کَلَامِ السَّلَفِ۔ (ترجمہ) جان لو کہ بے شک محدثین عظام و فقہاءِ کرام لفظِ اثر کو سلف کے کلام میں استعمال کرتے ہیں۔ سلف سے مراد صحابہ و تابعین و تبع تابعین ہیں۔ نہ کہ نبی کریم آقائے کُل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم صاحب مرقات اور دارقطنی اور

ان کے علاوہ بہت سے محدثین عظام نے اس روایت کو موقوف جیسا کہ لفظ غیرہ سے ثابت ہوا موقوف کہنے کی دو وجہ ہیں اولاً یہ کہ حضرت علی کی اس روایت میں محدثین کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ حضرت علی نے خود سنا اپنے کانوں مبارکوں سے یا کسی اور ذریعے سے۔ لہٰذا یہ حدیث موقوف ہوئی۔ ثانیاً اسلئے کہ بجز حضرت علی دیگر کسی صحابی نے یہ حکم روایت نہ فرمایا۔ لہٰذا یہ خبر واحد بھی ہوئی۔ اور خبر واحد بمقابلہ قیاس متروک ہے۔ جیسا کہ اصول شاشی ص ۱۹ پر ہے۔ یہ تو تھی متن حدیث پر جرح۔ جب اسکی اسناد دیکھی جائے تو ابوداؤد شریف کی سند میں زھیر بن مرزوق راوی شامل ہیں۔ اور وہ علم اسماء الرجال میں مجہول راوی ہیں۔ چنانچہ تقریبُ التہذیب لِابنِ حجر ص ۱۰۹ پر ہے۔ زُھَیر ابنِ مَرْزُوْقٍ مَجْھُوْلٌ مِنَ الثَّامِنَةِ۔ (ترجمہ) یعنی زھیر بن مرزوق آٹھویں درجے والے مجہول ہیں۔ اور مجہول راوی سے حدیث میں ضعیف آجاتا ہے۔ اتنے دلائل کے ماتحت یہ روایت کسی بھی حکم نافذ نہیں کرسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام فقہائِ کرام مجتہدین عظام نے اس روایت کو ترک کر دیا۔ اور ان چاروں قسم کے جانوروں کو قربانی کے لئے جائز رکھا۔ جن کا اس روایت میں بحکم ممنوعہ آیا ہے۔ اگر یہ روایت ضعیف نہ ہوتی اور قابل ہوتی تو فقہ اسلامی اس کو ترک کیوں فرماتا۔ محدثین عظام کے علاوہ فقہائِ اُمت میں بھی کسی نے اس روایت کا ضعف ثابت کیا کسی نے اس کو صحیح کہنا غلط ثابت کیا۔ کسی نے اس کی تاویل کی۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم ص ۲۹۸ پر ہے۔ مَا رُوِیَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (الخ) مَحْمُوْلٌ عَلَی النَّدْبِ (ترجمہ) اور وہ روایت حضرت علی سے موقوف ہے۔ وہ مستحب ہونے پر محمول ہے۔ فتاویٰ شامی جلد پنجم ص ۲۸۴ پر ہے۔ وَالنَّھْیُ الْوَارِدُ مَحْمُوْلٌ عَلَی النَّدْبِ۔ (ترجمہ) اور وارد شدہ نہی یعنی حضرت علی کی ممانعت والی روایت کا مطلب ہے کہ ایسے جانور کو ذبح کرنا بہتر نہیں۔ بحر الرائق جلد ہشتم ص ۱۷۷ پر ہے۔ وَتَاْوِیْلُ مَا رَوَیْنَا اِذَا کَانَ بَعْضُ الْاُذُنِ مَقْطُوْعًا (ترجمہ) وہ ممانعت والی روایت جس کو فقہاء ندب یعنی مستحب ہونے پر محمول کیا ہے۔ وہ جب ہے کہ کان کا بعض حصہ آدھے سے کم حصہ کٹ کر گر گیا ہو۔ تب بہتر ہے کہ جانور قربانی میں ذبح نہ کیا جائے۔ اگرچہ یہ بھی جائز بلا کراہت ہے۔ بحر الرائق کی اس عبارت کا مفاد یہ ہے کہ اگر تھوڑا سا بھی حصہ نہ کٹا ہو تو استحباب کا احتمال بھی ختم ہوگیا۔ مرأۃ شرح مشکوٰۃ جلد دوم کے ص پر حضرت حکیم الامت نے بھی یہی تاویل فرمائی۔ کہ آدھے سے کم چرا ہو تو قربانی جائز ہے۔ چرنے کا مطلب یہی ہے تو کان کا کچھ حصہ کٹ کر گر گیا ہو تو وہاں مقدار کی قید ہے۔ لیکن فقط چرنے میں کوئی مقدار بھی جواز سے مانع نہیں۔ نہ قربانی کے لئے مضر

خواہ سارا چرا ہو۔ جیسے ہم نے ابھی مندرجہ بالا سطور میں ۱ فتاوٰی بحر الرائق ۲ فتاوٰی شامی ۳ فتاوٰی عالمگیری ۴ فتاوٰی قاضی خان ۵ فتاوٰی بزازیہ کی منقولہ عبارات کے اطلاق سے ثابت کر دیا۔ احادیث کثیرہ سے بھی صرف چودہ (۱۴) قسم کے جانور منع ہیں۔ ان میں کان چرا جانور شامل نہیں۔ قربانی اسلام کا بہت اہم حکم آقائے کائنات صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے اس کے قوانین میں بہت اہمیت فرمائی کہ یہ یہ جانور جائز ہیں یہ یہ جانور منع۔ مقام غور ہے کہ اتنے اہم حکم کو ہم ایسی روایت سے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ جو خبر واحد ہو اور جس میں موقوفیت کے علاوہ ضعف کی بھی جھلک ہو۔ اگر مخالف اس روایت کو ضعیف نہ مانے تو اس کا سبب بتانا لازم ہے کہ فقہاء نے اس کو کیوں ترک کیا! کیا ان کو اس روایت کی قوت کا پتہ نہ چل سکا۔ خلاصہ یہی ہے کہ چونکہ احادیث کثیرہ نے کان چرے جانور کی قربانی مطلقاً جائز رکھی۔ تو فقہاء کرام نے بھی اسی پہ عمل کیا۔ ایک موقوف روایت سے اتنی احادیث نہیں چھوڑی جاسکتیں۔ بلکہ فقہاء کرام تو تمام مسائل لیتے ہی حدیث و قرآن سے ہیں۔ یہ تو غیر مقلدوں کا جاہلانہ حماقت ہے کہ وہ فقہ کو احادیث سے جدا کر بیٹھے۔ عقل کا بھی تقاضا ہے کہ کان چرا جانور قربانی کے لئے جائز ہو۔ اوّلاً اسلئے کہ جسم حیوانی میں تین قسم کے اعضاء پائے جاتے ہیں۔ ۱ اعضاءِ باطن ۲ اعضاءِ ظاہر ۳ اعضاءِ لطیف۔ اعضاءِ ظاہر دو قسم کے ہیں۔ عارضی اور دائمی۔ جب ان ہر سہ یعنی باطنی۔ لطیف۔ اور ظاہری دائمی میں سے کوئی پیدا ہونے کے بعد ختم ہو تو اس جانور کی قربانی جائز نہ ہوگی۔ اور جب تک عضو ختم نہ ہوگا۔ قربانی منع نہ ہوگی۔ اگرچہ بگڑ جائے۔ بگڑنے سے قربانی کے جواز میں فرق نہیں۔ یہ شرعی قاعدہ کلیہ احادیث مبارکہ سے سمجھا گیا۔ اسلام نے قربانی کے لئے جو جانور مقرر فرمائے ہیں۔ اُن میں جائز و ناجائز کل چوبیس (۲۴) ہیں۔ جن میں چودہ (۱۴) ناجائز ہیں۔ نو عدد جائز اور ایک عدد جائز ہے مگر وقتی و عارضی ناجائز ہو جاتا ہے۔ ان میں جتنے بھی ناجائز ہیں۔ وہ وُہی ہیں جن میں کوئی عضو ختم ہوگیا ہو۔ کان چرے جانور کا عضو بگڑ تو گیا مگر ختم نہ ہوا۔ لہٰذا یہ جانور قربانی میں جائز رہیگا۔ اسی قیاس و قاعدے سے فقہاء کرام نے شرقاً و خرقاً جانور کو جائز مانا ہے۔ روایت مندرجہ چونکہ اسی قاعدۂ عقلیہ و شرعیہ کے خلاف تھی۔ اسلئے متروک ہوئی۔ رہا بعض فقہاء کا یہ قول کہ تادیباً یہ نہی استحبابی ہے۔ تو یہ کوئی حتمی حکم نہیں۔ کیونکہ استحباب تو بہت دراز ہوتا ہے۔ اسکی کوئی حد نہیں۔ ہر شخص کی وسعتِ مال کے اعتبار سے استحباب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بلکہ ہر عبادت کا استحباب عباد کی حیثیت کے مطابق بدلتا چلا جاتا ہے۔ استحباب پر نہ قانون بنتا ہے نہ فتوٰی جاری ہوسکتا ہے۔

شریعت کے قانون میں مندرجہ ذیل جانور منع ہیں۔ ۱ عمیا۔ یعنی اندھا جانور۔ کیونکہ اسکا اندرونی عضو لطیف یعنی بینائی کی روشنی ختم ہوگی۔ ۲ عورا یعنی کانا جانور۔ اس کی بھی بینائی جو عضو لطیف ہے ختم ہوگئی۔

۳۔ عجفاء۔ انتہائی لاغر جس کی ہڈیوں کی مینگ یا جو باطنی عضو ہے ختم ہو جائے ۴۔ عرجاء۔ سخت لنگڑی۔ جس کے پٹھے کی چربی ختم ہو جائے۔ ۵۔ عضباء الذنب۔ جس کی آدھی یا آدھی سے زیادہ دم کٹ جائے۔ اور جدا ہو جائے۔ ۶۔ عضباء القرن جسکا اصل سینگ آدھا یا زیادہ ٹوٹ گیا ہو۔ ۷۔ عضباء الاذن۔ جس کا آدھا یا زیادہ کان کٹکر اکھڑ گیا ہو۔ انہی تین کو عضباء کہتے ہیں۔ آدھا یا زیادہ کل کے درجے میں ہے اور اصولِ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ۔ (ترجمہ) اکثر کو کل کا درجہ و حکم دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر دُم سینگ یا کان یا تینوں اکٹھے ایک ہی جانور کے آدھے سے کم کٹے ہوں۔ زیادہ باقی ہو تو کل باقی مان کر قربانی جائز رہیگی۔ ۸۔ ھتماء۔ جس کا دانت یا اکھڑ کر نکل گیا ہو یا جڑ سے جدا ہو ہو گیا۔ اگرچہ مسوڑھے میں پھنسا ہو۔ مگر جانور چر نہ سکے۔ ۹۔ سکاء۔ جسکا پیدائشی ایک کان نہ ہو۔ دوسرا صحیح و سالم ہو۔ ایک رحم میں نہ بنا۔ نسلاً کان لمبے ہوں۔ ۱۰۔ جذاء۔ جس کا کنارۂ پستان کٹ گیا ہو۔ یا رگوں کی چربی ختم ہو گئی ہو اور پستان سارا ہو گیا ہو۔ ۱۱۔ جدعاء جس کا ناک کٹ گیا ہو۔ ۱۲۔ مصرمہ جس کا پورا پستان کٹ گیا ہو۔ ۱۳۔ جرباء مھزولہ۔ سخت کھجلی والا جانور جس سے کھجلی کے جراثیم ہڈیوں کی چربی چاٹ لیں۔ اور جانور کا یہ عضو باطنی یعنی چربی ختم ہو کر جانور انتہائی دُبلا ہو جائے۔ ۱۴۔ خنثیٰ جانور جس کا آلۂ تناسل نہ ہو۔ غرضیکہ صرف وہی جانور قربانی میں ناجائز ہے جس کا کوئی عضو ختم ہو اور جانور ناقص الاعضاء رہ جائے۔ لیکن وہ جانور جس کے عضو موجود ہوں۔ خواہ کتنے ہی بگڑ جائیں اُن کی قربانی جائز ہے۔ چنانچہ اس قسم کے نو عدد جانور ہیں۔ ۱۔ جماء جسکے سینگ پیدا ہی نہیں ہوتے جیسے اونٹ یا بعض اس نسل کے بھیڑ بکری۔ گائے۔ ۲۔ خصی جانور۔ وہ نر جس کے فوطے یعنی پتا کوچڑھا دیئے گئے ہوں۔ ۳۔ ثولاء۔ وہ دیوانہ جانور جسکا اندرونی دماغ بگڑ گیا ہو۔ ۴۔ عظباء۔ وہ جانور جس کا خولِ سینگ اتر گیا ہو۔ خیال رہے کہ جسمِ حیوانی میں دو عضو عارضی ہیں ۱۔ بال اون۔ ۲۔ ناخن یا سینگ کا خول۔ ان عضو ہائے عارضی کا ختم ہونا جانور کو ناقص نہیں کرتا۔ ۳۔ جرباء سمینہ۔ وہ کھجلی جس سے چربی نہ ختم ہو۔ ۴۔ صمعاء۔ پیدائشی چھوٹے کان والا جانور۔ ۵۔ مجبوب جسکے آلۂ تناسل میں جماع کی طاقت نہ رہے۔ ۶۔ حولاء جو بھینگا ہو۔ ۷۔ مجزوز۔ جس کی اُون یا بال اُتار لئے گئے ہوں۔ یہ جانور قربانی میں جائز ہیں۔ اگرچہ ان کے عضو بگڑے ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ کوئی عضو ختم نہیں ہوا۔ اس لئے قربانی ممنوع نہیں۔ ایک جانور عارضی ناجائز ہوتا ہے اس کو جلالہ کہتے ہیں یعنی گندگی کھانے والا۔ اس کا گوشت بوجہ گندگی خراب ہوتا ہے اس لئے منع ہے۔ یہ ایک عارضہ ہے جو چند دن جانور کو باندھے رکھنے سے جاتا رہتا ہے۔ غرضیکہ صرف یہی چوبیس ۲۴ جانور ہیں۔ جنکا تعلق قربانی سے جائز و ناجائز طریقے

سے ہے۔ فتاوٰی بزازیہ جلد سوم ص۲۹۳ اور فتاوٰی شامی جلد پنجم ص۲۸۲ پر ایسا ہی لکھا ہے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں اگر اونٹ جلالہ ہو جائے تو چالیس دن باندھو۔ گندگی کے قریب نہ جانے دو۔ گائے بھینس جلالہ ہو تو بیس دن۔ جلالہ بکری بھیڑ وغیرہ دس دن۔ مرغی۔ بطخ جلالہ ہو جائے تو تین دن باندھ کر ذبح کی جائے۔ اگر کبوتر یا بٹیر یا چڑیا جلالہ ہو جائے اور ذبح کر کے کھانا مقصود ہو تو ایک دن قید رکھا جائے۔ **خلاصہ** یہ کہ سوالِ مذکورہ میں جس گائے کی قربانی کا ذکر ہے۔ وہ بالکل جائز ہے۔ اس کی قربانی لگ جائے گی۔ کیونکہ صرف کان کا چِرنا عیبِ شرعی نہیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتاب الصَّیْد والذَّبَائِح

کوّے کی حرمت کا بیان۔ غراب اور زاغ کی تحقیق

سوال ۶۸:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام اعظم کے نزدیک کون سا کوّا حلال ہے؟ وہابی لوگ کس کوّے کو حلال کہتے ہیں اور کوّے کی کتنی اقسام ہیں۔ معتبر کتب سے جواب ارشاد فرمائیے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا۔

سائل:۔ محمد حسین لائلپور گھنٹہ گھر مورخہ ۷۔۱۔۱۷

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق کسی امام مجتہد کے نزدیک کوئی کوّا حلال نہیں۔ نہ چھوٹا اور نہ بڑا۔ نہ مذکر اور نہ مؤنث۔ کوّا ایک مشہور پرندہ ہے۔ ہر بستی میں پایا جاتا ہے چیل سے چھوٹا ہوتا ہے۔ لمبی چونچ سیاہ رنگ کی۔ گردن کے پر سفید۔ باقی سب جسم اور پاؤں بالکل سیاہ۔ اس کو اُردو زبان میں کوّا اور فارسی میں زاغ یا زاغِ معروف۔ عربی میں غراب البقع کہا جاتا ہے۔ تمام مسلمان اس کو حرام سمجھتے ہیں حنفی شافعی، حنبلی تمام فقہاء کرام نے اس کو حرام پرندوں میں شمار فرمایا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی فتاوٰی عالمگیری جلد پنجم صفحہ ۲۹۰ پر ہے:۔ وَالْغُرَابُ الْاَبْقَعُ مُسْتَخْبَثٌ طَبْعًا۔ (ترجمہ) غراب غراب البقع یعنی زاغِ معروف طبعی طور پر خبیث ہے (الخ)، اور شریعت میں ہر خبیث حرام ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآنِ مجید ارشاد فرماتا ہے:۔ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ۝ (ترجمہ) اور حلال ہیں اُن کے لئے طیب چیزیں اور حرام ہیں اُن پر خبیث چیزیں + ھدایہ جلد چہارم صد ۴۳۹ پر ہے:۔ وَلَا یُؤْکَلُ الْاَبْقَعُ الَّذِیْ یَاْکُلُ الْجِیَفَ ۝ (ترجمہ) اور نہ کھایا جائے وہ ابقع جو مُردار کھاتا ہے۔ شرح وقایہ جلد چہارم صد ۹۰ پر ہے وَالْاَبْقَعُ غُرَابٌ بَیْضٌ ۝ (ترجمہ) اَبْقَعُ جنگل کے مشہور کوّے کو کہتے ہیں۔ کتاب تمیز الکلام فی بَیَانِ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ صد ۹ پر ہے۔ اس کو عربی میں اَلْبَقْعُ کہتے ہیں۔ وُہ حرام ہے اور صد ۱۲ پر ہے لیکن کوّے سیاہ میں اختلاف ہے۔ فتویٰ حُرمت پر ہے۔ تمام فقہاءِ کرام حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی چرند و پرند کی حُرمت پر ایک قاعدہ کلیہ متفقہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ ہر کیل والا دانت رکھنے والا چرندہ درندہ ہو یا نہ ہو جیسے شیر کتا وغیرہ کہ کیل نُما دانت بھی ہیں اور درندہ بھی ہے اور ہاتھی ریچھ کے کیل نما دانت تو ہیں مگر درندہ یعنی گوشت خور شکاری نہیں۔ مگر سب حرام ہیں۔ بعض فقہاء نے حلت کے لیے کُھر چیرے ہُوئے کی شرط لگائی ہے۔ اس لیئے گھوڑے گدے اور خچر کو مکروہ تحریمی و حرام کہتے ہیں۔ مگر یہ قاعدہ متفقہ نہیں۔ صرف فقہاءِ احناف کو مسلّمہ ہے۔ پہلا قاعدہ متفق علیہ ہے۔ اسی طرح پرندوں میں بھی یہ قاعدہ متفق ہے کہ ہر پرندہ جو درندہ ہو۔ یعنی شکار کرتا ہو اور پنجوں سے کھاتا ہو۔ شریعت میں حرام ہے چنانچہ بلغۃ السالک فقہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جلد اوّل صد ۳۲۲ پر اور حاشیہ بیجوری فقہ شافعی جلد دوم صد ۳۳۹ پر ہے:۔ وَیُحَرَّمُ مِنَ السِّبَاعِ مَالَهٗ نَابٌ اَیْ سِنٌّ قَوِیٌّ یَعْدُوْ بِهٖ عَلَى الْحَیْوَانِ کَاَسَدٍ وَیُحَرَّمُ مِنَ الطُّیُوْرِ مَالَهٗ مِخْلَبٌ یُجْرِحُ بِهٖ ۝ (ترجمہ) اور حرام ہے چرندوں میں سے وُہ کیلوں والا جانور جو حملہ کرتا ہو اور شکار کرتا ہے ان کیلوں سے حیوانوں پر جیسے کہ شیر اور حرام ہے پرندوں میں سے وُہ پنجوں والا جانور جو شکار کرتا ہے۔ ان پنجوں سے۔ اس قاعدہ کلیہ سے ثابت ہُوا کہ تمام آئمہ کے نزدیک وُہ جانور حرام ہے کہ جس کو اردو زبان میں کوّا کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کوّا اُردو میں صرف اسی کو کہتے ہیں۔ جو گھروں پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ چھوٹے پرندوں کا اور ان کے بچوں کا شکار بھی کرتے ہیں۔ مردار بھی کھاتے ہیں۔ خیال رہے کہ چرندوں میں تو کیل والے جانور کے لئے شکاری ہونا شرط نہیں۔ ہر کیل والا حرام ہے۔ مگر پرندوں میں پنجے والے جانور کے لئے شکاری ہونا شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک طوطا حرام نہیں اگرچہ پنجے سے لے کر کھاتا ہے۔ کوّا چونکہ پنجے والا بھی ہے پکڑ کر کھاتا بھی ہے اور شکار بھی کرتا ہے اس لئے حرام ہے۔ لیکن موجودہ وہابی اسی جنگل کے کوّے کو حلال کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک

بڑے وہابی صاحب کے اپنے فتاوی رشیدیہ جلد دوم مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ سنہری مسجد دہلی صفحہ ۱۴۰ پر ہے: مسئلہ جس جگہ زاغ معروفہ کو اکثر حرام جانتے ہوں اور کھانے والوں کو برا کہتے ہوں۔ تو ایسی جگہ اس کوا کھانے والوں کو کچھ ثواب ہوگا یا نہ ثواب ہوگا نہ عذاب؟ الجواب :۔ ثواب ہوگا فقط رشید احمد۔ یہ وہی وہابی لوگ ہیں جو فاتحہ نیاز اور امام حسین سید الشہداء کے شربت کا پینا کھانا حرام کہتے ہیں۔ مگر ان کے لئے کوا کھانا جائز ہوگیا۔ ہم لوگوں کو اللہ کریم پاک طیب، فاتحہ، نیاز کی چیزیں کھلاتا ہے ان کو خبیث کوا کھلاتا ہے اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ یہ بات پہلے ثابت کر دی گئی۔ کہ کوا صرف ایک ہی قسم کا جانور ہے۔ جس کو فارسی میں زاغ معروفہ کہتے ہیں کسی اور پرندے کو اردو میں کوا نہیں کہتے۔ ہاں فارسی اور عربی میں قلت لفظی کی بناء پر چند دوسرے پرندوں کو بھی زاغ اور غراب کا نام دے دیتے ہیں۔ چنانچہ فارسی زبان میں کوے کے علاوہ تین دوسرے پرندوں کو بھی تھوڑی مشابہت کی بناء پر زاغ کہہ دیتے ہیں۔ عربی میں انھیں تین پرندوں کو غراب کہدیتے ہیں۔ اور تعدد کی بناء پر برائے تفریق کچھ زائد لفظ کی قیدیں لگاتے ہیں۔ لہٰذا کوے کو جو اصل زاغ اور غراب ہے۔ فارسی میں زاغ معروفہ اور عربی میں غراب البقع کہتے ہیں۔ اسی کی حرمت شریعت اسلامیہ میں متفقاً ثابت ہے۔ اسی کو وہابی کھاتے ہیں۔ کیونکہ اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ " قرآن کریم" (ترجمہ) خبیث چیزیں خبیث لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔ اسی کوے کا ذکر مندرجہ بالا سوال اور جواب میں گزرا۔ دوسرا پرندہ جس کو قلت لفظی کی بنا پر زاغ یا غراب کہہ دیا جاتا ہے اس کو اردو میں مہوکہ کہتے ہیں۔ فارسی میں زاغِ کشت۔ عربی میں غراب زرعی کہتے ہیں۔ (از محولہ کتاب تمیز الکلام صفحہ ۹) یہ بالکل سیاہ ہوتا ہے۔ جسامت میں چیل سے مشابہ ہوتا ہے۔ رنگ میں کوئل کی طرح سب از سرتا پا کالا چونچ اور قدرے آواز میں کوے کے مشابہ اس تھوڑی سی مشابہت کی بناء پر اس کو زاغِ کشت یا غراب زرعی کہدیتے۔ یہ شکاری نہیں ہوتا۔ صرف کھیتوں اور گھوریوں پہ دانے چن کر کھاتا ہے۔ چنانچہ اردو کا مشہور فتوی بہار شریعت جلد دوم حصہ پندرھواں صفحہ ۱۲۶ پر ہے۔ مسئلہ :۔ اور مہوکا کہ یہ بھی کوے سے ملتا جلتا ہے۔ ایک جانور ہوتا ہے (دانے کھاتا ہے) حلال ہے فتاوی عالمگیری جلد پنجم صفحہ ۲۹ پر ہے :۔ فَاَمَّا الْغُرَابُ الزَّرْعِیُّ یَلْتَقِطُ الْحَبَّ مُبَاحٌ طَیِّبٌ (ترجمہ) لیکن غراب زرعی جو دانے کھاتا ہے۔ حلال اور طیب ہیں۔ تیسرا۔ پرندہ جس کو اردو اور فارسی میں عکہ یا زاغ عکہ کہتے ہیں۔ عربی زبان میں غراب عقعق کہتے ہیں۔ چنانچہ حاشیہ وقایہ جلد چہارم صفحہ ۹۰ پر ہے :۔ اِعْلَمْ اَنَّ الْغُرَابَ

اَرْبَعَةُ اَنْوَاعٍ وَالنَّوْعُ الرَّابِعُ حَلَالٌ عِنْدَ الْاِمَامِ الْاَعْظَمِ يُقَالُ بِالْفَارِسِيَّةِ عَكَّةٌ لِاَنَّهٗ كَالدَّجَاجَةِ ۔ (ترجمہ) جان تو کہ بے شک غراب چار قسم کا ہے اور چوتھی قسم امام اعظم کے نزدیک حلال ہے۔ فارسی میں اس کو عکّہ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ مرغی کی طرح ہے اس کا رنگ سیاہی مائل سفید ہوتا ہے۔ جیسے جنگلی کبوتر۔ (از فیروز اللغات کلاں) یہ دانہ بھی کھاتا ہے۔ اور مردار گوشت بھی۔ امام اعظم کے نزدیک اس لیے حلال ہے کہ شکاری نہیں۔ صاحبین کے نزدیک اس لیے مکروہ ہے کہ حرام کھاتا ہے اور گندگی پیٹ میں بھرتا ہے۔ ہمارے یُو۔پی کے علاقوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ بستیوں سے دُور رہتا ہے۔ اس پرندے کو بدایونی زبان میں عاکی کہتے ہیں۔ پنجاب میں بہت کم ہوتا ہے۔ فتویٰ شرعی کے مطابق یہ حلال ہے۔ چوتھا پرندہ جس کو عربی والے قلتِ لفظی پر غراب کہہ دیتے ہیں۔ وُہ چقار پرندہ ہے۔ وہ پرندہ سندھ و پنجاب کے مضافاتی جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ کیڑے مکوڑوں کا شکار کرتا۔ اس کو فارسی میں زاغ کلاغ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے سر پر چھوٹی سی پَروں کی کلغی ہوتی ہے۔ اور چونچ سُرخ کوّے سے چھوٹی ہوتی ہے۔ اور چیل کی طرح خم دار ہوتی ہے جس سے شکار میں مدد ملتی ہے۔ عربی میں اس کو غراب الغداف یعنی سخت سیاہ غراب۔ اس کو غراب البین اور غرابِ حبشہ بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ بھی حرام ہے۔ جب بولتا ہے تو چکار کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ اس نسبت سے اس کو اُردو زبان میں چقار کہتے ہیں غرض کہ چار جنگلی پرندوں کو تھوڑی تھوڑی نسبتوں کی وجہ سے زاغ یا غراب کہہ دیتے ہیں۔

۱۔ کوّا ۔ ۲۔ مہوکہ ۔ ۳۔ عاکی ۔ ۴۔ چقار ۔ یہ چاروں جنگلی پرندے ہیں اگرچہ کوّا یعنی زاغ معروفہ گھروں میں منڈلاتا ہے۔ لیکن چونکہ اصطلاح شریعت میں ہر وُہ جانور جو عادتاً گھروں میں پالا جاتا ہے۔ اس کو گھریلو اور جو گھروں میں پلتا اس کو جنگلی کہا جاتا ہے۔ دیکھو بندر ہماری بستیوں میں رہتے ہیں۔ مگر اس کو فقہاء کرام نے جنگلی کہا ہے۔ اسی طرح کُتا گھر میں پالنا شرعاً حرام ہے لہٰذا کُتے کے تین نام ہیں۔ ۱۔ جنگلی کُتا ۔ ۲۔ بازاری کُتا ۔ ۳۔ شکاری کُتا ۔ اسی طرح بعض اُردو فتاوٰی میں جنگلی کوّے کا لفظ لکھا ہے تو اس سے یہی کوّا مُراد ہے۔ بہرحال یہ امر متفقاً مسلم ہے کہ کوّا صرف ایک ہی جانور ہے۔ فتاوٰی تمیز الکلام میں کوّے کی چار اقسام لکھی ہیں۔ وہ لفظِ غراب کی وجہ سے غلطی ہوئی۔ کہ جس طرح شرح وقایہ میں محشی نے غراب کی تقسیم فرمائی۔ اس کی دیکھا دیکھی ہمارے مولوی صاحب کو غلطی لگی۔ حالانکہ لفظِ غراب کی تقسیم تو محض قلتِ لفظی کی وجہ سے ہے۔ جیسے کہ فارسی میں چیل کو زغن کہہ دیتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ چیل بالکل غیر جنس ہے۔ اور لفظِ کوّے کی مؤنث

کا نام ہونا چاہیئے۔ جس طرح بظاہر لفظِ زغن کوّے کی مؤنث معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت اور ہے۔
اردو زبان میں چونکہ ان چاروں پرندوں کے نام جُداگانہ ہیں۔ اس لیئے صرف ایک پرندہ کوّا ہے۔
عربی فارسی میں علیحدہ نام متعین نہیں۔ لہٰذا چاروں کی بوجہ تھوڑی تھوڑی مشابہت کے زاغ اور
غراب کہہ دیا گیا اور فرق کرنے کے لیئے لفظِ معروف اور لفظِ زرعی وغیرہ کی قیدیں لگا دیں۔ اس کے
باوجود جب مطلقاً زاغ یا غراب بولا جائے تو ہمارا کوّا ہی مراد ہے۔ چنانچہ لغات منتخب النفائس
صفحہ نمبر ۱۲۵ پر ہے:۔ **کوّا**:۔ درفارسی زاغ و درعربی غراب و درترکی قراغہ زاغ را گویند۔
لغاتِ کشوری ص ۳۳۳ پر ہے غراب، زاغ، کوّا اسی طرح فیروز اللغات کلاں ص ۳ پر مطلق غراب
سے کوّا مراد لیا ہے۔ پس ثابت ہُوا کہ غراب اور زاغ کی قسمیں تو ہیں مگر کوّے میں وہ حُرمت کی
وُہ تینوں شرطیں پائی جا رہی ہیں جو فقہاءِ کرام کے بیان کردہ مندرجہ بالا قاعدۂ کلیہ میں گزریں۔ کہ (۱) اس
کے پنجے بھی ہوں اور (۲) پنجوں سے پکڑ کر کھاتا بھی ہو (۳) اور شکار بھی کرتا ہو۔ اگر ایک شرط بھی کسی
پرندے میں کم ہو گئی تو وہ حرام نہ ہوگا۔ دیکھو بطخ، مرغابی، ہنس، راج وغیرہ حلال اور طیب ہیں۔
کیونکہ پنجے ہی نہیں کبوتر حلال ہے اگرچہ پنجے بھی ہیں اور پنجوں سے کھاتا بھی ہے لیکن تیسری شرط
شکاری ہونا نہیں ہے۔ اسی طرح جو جانور پروں والا ہو پنجے بھی ہوں۔ شکار بھی کرتا ہو۔ لیکن پنجوں سے
کھاتا نہ ہو۔ وُہ بھی شرعاً حلال ہے۔ جیسے مرغی کہ اس کے پنجے بھی ہیں۔ اور کیڑے مکوڑوں کا شکار
بھی کر لیتی مگر پکڑ کر نہیں کھاتی۔ اس لئے اس کے حلال اور طیب ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کوّا
قطعاً حرام ہے۔ کیونکہ شکاری بھی ہے پنجے بھی ہیں اور پکڑ کر کھاتا بھی ہے۔ مطلق غراب سے
یہی مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں قصہ ہابیل و قابیل کے ضمن لفظِ غراب آیا ہے۔ خلاصہ یہ
کہ کوّا حرام مطلق ہے۔ نہ معلوم وہابیوں کو اس میں کیوں مزا آتا ہے۔ جو اس کو کھانا ثواب بتایا۔
وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ؕ

کتبہ

کچھوے کی حرمت کا بیان

سوال ۸۹ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک غیر مقلد مولوی صاحب یہ کہتے ہیں کہ دریائی
جانوروں میں سے کچھوا بھی حلال ہے۔ اور اس کا کھانا جائز ہے۔ اپنے اس قول کی تائید میں مندرجہ ذیل
دلائل پیش کرتے ہیں:۔ **پہلی دلیل**:۔ اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ ؕ (سُوْرَۃ مائدہ آیت

نمبر ۹۶) ؕ (ترجمہ) حلال کر دیا گیا۔ تمہارے لئے دریا کا شکار۔ اور کچھوا یقیناً دریائی جانور ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس کا کھانا حلال ہے۔ **دوسری دلیل** :۔ مرفوع حدیث میں ہے۔ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْبَحْرِ اِلَّا وَقَدْ ذَکَّاهَا لِبَنِیْ اٰدَمَ رَوَاہُ قُطْنِیْ ؕ (ترجمہ) دریا کا ہر جانور اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے لئے حلال کر دیا۔ لہٰذا کچھوا حلال ہے۔ **تیسری دلیل** بخاری شریف۔ لَمْ یَرَ الْحَسَنُ بِالسُّلَحْفَاۃِ بَاْسًا ؕ (ترجمہ) کچھوا حلال جانور ہے اور جائز ہے۔ اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ فتح الباری میں بھی اسی طرح ہے۔ **چوتھی دلیل** :۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی مذہب ہے۔ اب پوچھنا ہے کہ اُن کے یہ دلائل کس حد تک درست ہیں بمسلک حنفی کیا ہے۔ ہمارے دلائل کیا ہیں۔ اور وہابیوں کے مندرجہ بالا دلائل کا جواب کیا ہے؟ یہ وہابی غیر مقلد مولوی چند دن سے اسی مسئلہ پر تقریر کر رہا ہے۔ گویا کہ کچھوے جیسی گھنونی چیز کو کھلانے پر مصر ہے۔ خود وہابی بھی اس کھانے سے متنفر ہیں۔ تاکہ اس وہابی خبیث کا منہ بند کیا جائے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ؕ

سائل :۔ محمد ایوب۔ نظام ساہی وال شہر۔ مورخہ ۱۹۷۱–۱۱–۱۰

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

الجواب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا طَعَامًا حَلَالًا طَیِّبًا مُبَارَکًا وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ وَقَانَا مِنْ خُبْثِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ۔ وَعَلٰی اٰلِهِ الَّذِیْ اَدْفَعَ عَنْ اَبْطَانِهِ اَشْیَاءَ الْحَرَامِ وَشِبْهَ الْحَرَامِ۔ وَعَلٰی اَصْحَابِهِ الَّذِیْنَ اَکَلُوْا مِنْ مَاکُوْلَاتِ الَّتِیْ کَانَتْ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نُوْرًا ط وَهُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الصَّمَدُ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ط هٰذِهٖ بَرَاءَۃُ الْاِسْتِهْلَالِ وَصَنْعَۃُ الْطِبَاقَا ؕ

اَمَّا بَعْدُ :۔ یہ میرے رب کی بے نیازی اور شانِ کریمی ہے کہ کسی کو اپنے دسترخوانِ ابدی کی نعمت ہائے گوناں و مشروباتِ رنگا رنگ سے محظوظ فرمایا۔ کہ طیب و طاہر معطر و منزہ مطعومات و حلوات و ثمرات کی فراوانی سے منہ پھیر گئے۔ اور کسی کو نعمت کدۂ لم یزلی سے ایسا دُر کارا کہ محرمات و خبائث میں منہ مارنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ کیا کرم ہے اُس کریم ازلی کا۔ کہ اس عبرت خانۂ کائنات میں اپنے پیارے نبی کے مجھ جیسے نعت خوانوں کو بشکل گیارھویں و بارھویں مرغوبات ہشت بہشت سے

حصہ وافر عطا فرمایا۔ مگر بارگاہ رضوانی سے کسی کو ایسا ہٹایا کہ خود اُن کے ہی منہ سے اُن طیبات کی حرمت کے فتوے صادر ہوئے۔ حضور غوث پاک کی نیاز کو حرام کہنے والوں کو آخر کار کوے ہی کھانے پڑے دیکھو نوائے وقت مورخہ ۲ جنوری ۱۹۶۰ء ۲ جھگڑے دیوبندی مولویوں نے بڑی دھوم دھام سے دعوت کی جس میں سب نے کوے کھائے۔ امام عالی شہید کربلا کے ایصال ثواب والے شربت کو حرام کہنے والے یقیناً کچھوے جیسے حیوانِ حرام ہی کھانے کے لائق ہیں۔ قانونِ شریعت کے مطابق تمام علماء و فقہاء کے نزدیک کچھوا اور سب دریائی جانور مطلقاً حرام ہیں۔ سوائے مچھلی کے۔ مچھلی کی تمام قسمیں حلال و طیب ہیں۔ غیر مقلد صاحب کا کچھوے کو حلال کہنا محض نادانی ہے۔ اُن کے پیش کردہ دلائل اُن کی نا سمجھی پر دال ہیں:۔ اولاً وہ دلائل بیان کئے جاتے ہیں۔ جن سے عقلاً و نقلاً کچھوے وغیرہ کی حرمت ثابت ہو۔ اس کے بعد سوالِ مذکورہ کی پیش کردہ دلیلوں کا صحیح مطلب بیان کیا جائے گا۔ یہ بات بدلائلِ کثیرہ قرآن و حدیث و کتبِ فقہ سے وضاحت شدہ ہے۔ کہ کچھوا وغیرہ دریائی جانور کھانا حرام ہیں۔ اس کے بے حد دلائل ہیں:۔

پہلی دلیل:۔ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ (پارہ ۹ نمبر ۹) ترجمہ اور رزاقِ کائنات جل مجدہٗ اپنے مومنوں پر خبیث چیزیں حرام فرماتا ہے یہ حقیقت مسلّمہ ہے۔ کہ بجز مچھلی۔ تمام دریائی جانور خبیث ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ بحر الرائق جلد ہشتم صفحہ نمبر ۱۷۲ پر ہے:۔ قَالَ فِی النِّهَایَةِ اَنَّ كَرَاهَةَ الْخَبَائِثِ تَحْرِيْمِيَّةٌ وَمَاسِوَا السَّمَكِ خَبِيْثٌ ؕ (ترجمہ):۔ نہایہ میں فرمایا۔ کہ بے شک خبیث چیزوں کی کراہت تحریمی ہے اور مچھلی کے علاوہ تمام جانور خبیث ہیں۔ خبیث وہ ہوتا ہے۔ جو جسم انسانی یا روحِ انسانی کے لیے مضر ہو۔ چنانچہ المنجد عربی مصری صفحہ نمبر ۱۶۲ پر ہے:۔ اَلْخَبِيْثُ هُوَ الْمُفْسِدُ ؕ (ترجمہ):۔ فساد اور نقصان ڈالنے والی اشیاء خبیث ہیں۔ طبِ یونانی اور ایلوپیتھک کی قدیم و جدید تحقیق نے ثابت کر دیا۔ کہ کچھوا اور تمام دریائی جانور بجز مچھلی بہت طریقوں سے بدنِ انسانی کے لیے مضر ہیں۔ چنانچہ بیاضِ اجمل میں لکھا ہے۔ کہ کچھوے کا گوشت کھانے سے جسم خستہ ہو جاتا ہے۔ قوتِ لمسی جس پر بدن انسانی کے نشو و نما کا دار و مدار ہے۔ سلب ہوتی جاتی ہے۔ جس طرح کہ شرابی کا بدن خمیرے آٹے کی طرح پھولا رہتا ہے مگر قوت و توانائی مفقود۔ اسی قسم کی بیماریاں سستی، کسل مندی کی کچھوا خوری سے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھوا سانپ خور ہے۔ اس کے گوشت میں زہری جراثیم بکثرت ہوتے ہیں۔ کتاب حیٰوۃ الحیوان جلد دوم صفحہ نمبر ۵۳ پر ہے:۔ وَصَحَّحَ الرَّافِعِيُّ التَّحْرِيْمَ لِاِسْتِخْبَاثِهَا لِاَنَّ غَالِبَ اَكْلِهَا الْحَيَّاتَ ؕ (ترجمہ):۔ علامہ رافعی نے کچھوے کی حرمت کو صحیح کہا ہے۔ بوجہ اس کے خبیث ہونے کے اس لیے کہ اس کی اکثر خوراک سانپ ہے۔ بعض حکماء فرماتے ہیں۔ کہ کچھوے کے گوشت کھانے سے تشنج کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ علامہ دمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے غرض کہ اس کی خباثت جسم انسانی کو بہت نقصان دیتی ہے۔ اسی طرح اس کی خوراک سے روحانی نقصان بھی ہوتا ہے۔ کہ شریعتِ مطہرہ نے جب اس کو حرام قرار دیا۔ تو یہ نجس ہوا۔ اور

ہر نجس شئے خبیث ہوتی ہے۔ چنانچہ منجد صفحہ نمبر ۱۶۲ پر ہے:۔ اَلْخَبِیْثُ النَّجِسُ ۵ (ترجمہ):۔ خبیث چیز ناپاک ہوتی ہے۔ پس ظاہر ہے۔ کہ ناپاک چیز کھانے سے کتنا سخت روحانی نقصان ہوتا ہے:۔

دوسری دلیل:۔ مشکوٰۃ شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۳۶۱ پر ہے:۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُحِلَّتْ لَنَا مَیْتَتَانِ وَدَمَانِ۔ اَلْمَیْتَتَانِ الْحُوْتُ وَالْجَرَادُ وَالدَّمَانِ۔ اَلْکَبِدُ وَالطِّحَالُ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَدَارُ قُطْنِیْ ۵ (ترجمہ):۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔ فرمایا کہ فرمایا رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہ ہم لوگوں کے لیے صرف دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں۔ دو مردار تو مچھلی اور آسمانی مکڑی ہے۔ اور دو خون کلیجی اور تلی ہے۔ اس حدیث طیبہ سے ثابت ہوا۔ کہ دریائی جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے۔ کیونکہ نبی کریم رؤف ورحیم نے صرف دو مردار کی حلت کا ذکر فرمایا۔ اور مردار وہ ہوتا ہے جس کی رُوح ذبح اختیاری یا اضطراری کے بغیر نکل جائے۔ یہ بات تحقیق شدہ ہے اور کسی دریائی جانور کو ذبح نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ذبح ہوتا ہے۔ حرام خون نکالنے کے لیے اور حرام خون اُن چار رگوں کے ذریعہ نکلتا ہے۔ جو گردن میں ہوتی ہیں۔ جن کو زبانِ شریعت میں حلقوم۔ ودجان۔ اور مری کہتے ہیں۔ مگر یہ رگیں کسی دریائی جانور میں نہیں ہوتیں۔ بلکہ بعض کی تو گردن ہی نہیں ہوتی ہیں۔ کچھوے کا منہ ہاتھی کی سونڈ کے مثل ہے خود مچھلی کی گردن بالکل نہیں۔ مگر مچھ کی بھی نہیں ہوتی اِس لیے اُن کا ذبح ناممکن۔ اگر کسی دریائی جانور کا گلا مشابہہ ذبح کاٹ بھی دیا جائے۔ تب بھی اس کا نام ذبح نہ ہوگا۔ بلکہ قتل ہوگا۔ خیال رہے۔ کہ دریائی جانوروں میں سے وہ جانور جو صرف پانی میں رہتے ہیں۔ اُن میں خون نہیں ہوتا۔ اور وہ صرف مچھلی ہے۔ مچھلی صرف پانی میں رہ سکتی ہے۔ باہر ایک منٹ زندہ نہیں رہ سکتی۔ بخلاف دیگر حیواناتِ آبی کے کہ وہ خشکی پر بھی کافی زمانہ زندگی گذار سکتے ہیں۔ جیسا کہ متعدد مشاہدوں سے ثابت ہے۔ کچھوا، مینڈک، پانی کا انسان، آبی گھوڑا، پانی کی بلی وغیرہ خشکی پر بھی بعافیت کافی ٹھہر سکتی ہے۔ اُن جانوروں کی موت خشکی سے نہیں ہوتی۔ لیکن مچھلی کی موت خشکی ہے۔ اِسی لیے اہل لغت کے نزدیک میتۃ البحر مچھلی کا لقب ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ دریا کا پانی پاک اور دریا کا مردار حلال، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں مردار سے مراد صرف مچھلی ہے۔ چنانچہ ہدایہ جلد چہارم صفحہ نمبر ۴۲۳ پر ہے:۔ وَالْمَیْتَۃُ الْمَذْکُوْرَۃُ فِیْمَا رُوِیَ مَحْمُوْلَۃٌ عَلَی السَّمَکِ ۵ (ترجمہ):۔ اور وہ مردار جو حدیث پاک میں مذکور ہوا۔ مچھلی پر ہی محمول ہے۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ پانی کا اصلی باشندہ صرف مچھلی ہے۔ بعض محققین فرماتے ہیں۔ کہ سوائے مچھلی کے باقی تمام جانوروں میں خون ہوتا ہے۔ علامہ دمیری نے کچھوے کے خون کے بہت اوصاف بیان کیے ہیں۔ دریائی گھوڑے کا خون تو بہت سی بیماریوں کی دوائیوں میں استعمال ہوتا ہے۔ دریائی مینڈک جو پیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ اُس کا خون تو میں نے خود دیکھا ہے۔ بعض مچھلیوں سے سرخ پانی نکلتا ہے۔ وہ خون نہیں ہوتا۔ کیونکہ خون کی پہچان یہ ہے۔ کہ وہ جم جاتا ہے۔ مگر مچھلی سے نکلا ہوا پانی

سفید ہو جاتا ہے بہر حال اگر محققین کی بات تسلیم کر لی جائے۔ تو شریعت کی حکمتوں میں سے ایک اس حکمت کا بھی پتہ لگ جاتا ہے۔ جن کی بنا پر مچھلی کو حلال رکھا گیا۔ اور باقی دریائی جانوروں کو حرام کیا گیا۔ کہ مچھلی کا تو خون ہوتا ہی نہیں۔ اس لیئے ذبح کی حاجت ہی نہیں۔ اور باقی جانوروں میں بقول محققین خون ہوتا ہے مگر ذبح ناممکن اس لیئے اس خون کو نکالنا محال ہوا۔ لہٰذا اُن کی موت اُن کو حرام کر دیتی ہے۔ جیسے کہ خشکی کے حلال جانور لیکن مچھلی کی موت مچھلی کو حرام نہیں کرتی سوائے بیماری کی موت کے مگر یہ صرف ایک حکمت ہے۔ ورنہ حیواناتِ پانی کی حرمت کی اور بے شمار حکمتیں ہیں۔ جن میں ایک خباثتِ طبعی بھی ہے۔ اسی خباثت کی وجہ سے کوا حرام ہوا۔ ابن ماجہ صفحہ نمبر ۲۳۴ فقہ السنن صفحہ ۲۲۸ پر ہے:۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَنْ يَأْكُلُ الْغُرَابَ وَقَدْ سَمَّاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاسِقًا وَاللّٰهِ مَا هُوَ مِنَ الطَّيِّبَاتِ۔

(ترجمہ):۔ ابن عمر نے فرمایا۔ کہ کوّے کو کون کھا سکتا ہے۔ حالانکہ نبی کریم نے اس کا نام خبیث رکھا قسم خدا کی کوا بالکل حلال نہیں:۔ **دوسری دلیل** سے بھی ثابت ہوا۔ کہ سوائے مچھلی کے باقی تمام جانور دریائی حرام ہیں:۔

تیسری دلیل:۔ فتاویٰ فتح القدیر جلد ہشتم صفحہ نمبر ۶۲ پر ہے:۔ وَلَا يُؤْكَلُ مِنْ حَيَوَانِ الْمَاءِ إِلَّا السَّمَكُ ط (ترجمہ):۔ سوائے مچھلی کے دریا کا کوئی جانور نہ کھایا جائے:۔ **چوتھی دلیل**:۔ ہدایہ شریف جلد چہارم صفحہ نمبر ۴۴۳ پر ہے:۔ وَمَا سِوَى السَّمَكِ خَبِيْثٌ (بین السطور) اَیْ يَسْتَخْبِثُهُ الطَّبْعُ ط (ترجمہ):۔ مچھلی کے علاوہ تمام دریائی جانور خبیث ہیں (سطروں کی درمیانی شرح میں لکھا ہے):۔ یعنی ان جانوروں کی طبیعت میں خباثت ہے:۔ **پانچویں دلیل**:۔ فتاویٰ درمختار جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۲۶۶ پر ہے:۔ وَالضَّبُعُ وَالثَّعْلَبُ وَالسُّلَحْفَاةُ وَالْغُرَابُ الْأَبْقَعُ حَرَامٌ لِأَنَّهُ مُلْحَقٌ بِالْخَبَائِثِ ط ترجمہ اور بھیڑیا، گیدڑ اور کچھوا اور گھریلو کوا حرام ہیں۔ اس لیئے کہ خبیث چیزوں سے ملحق ہے۔ فقہ حنفیہ کی اس مفصل، عبارت سے بھی کچھوے کی حرمت ثابت ہوتی ہے **چھٹی دلیل**:۔ فتاویٰ عالمگیری جلد سوم صفحہ نمبر ۲۸۹ پر ہے:۔

أَمَّا الَّذِيْ يَعِيْشُ فِي الْبَحْرِ فَجَمِيْعُ مَا فِي الْبَحْرِ مِنَ الْحَيَوَانِ يَحْرُمُ أَكْلُهُ إِلَّا السَّمَكَ خَاصَّةً ط:۔

لیکن وہ جانور جو دریا میں رہتے ہیں۔ پس تمام دریائی حیوان کا کھانا حرام ہے۔ سوائے مچھلی کے خاص کر۔ اس عبارت نے اس مندرجہ بالا دلیل ۲ کی وضاحت و تشریح فرما دی۔ جس میں میتتان کا ذکر تھا۔ کہ چونکہ دیگر جانور نہ خشکی پر اگر مرتے ہیں۔ نہ ذبح ہو سکتے ہیں۔ اس لیئے حرام ہیں۔ اور کچھوا بھی انہیں میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیوانات خشکی تین قسم کے ہیں۔ ۱:۔ حی یعنی زندہ ۲:۔ میتہ یعنی مردار ۳:۔ مذبوح یعنی ذبح کیا ہوا۔ مگر دریائی جانوروں کی اس لحاظ سے صرف دو قسمیں ہیں ۱:۔ زندہ ۲:۔ مردار۔ اگر مچھلی کے علاوہ کوئی اور جانور بھی حلال ہوتا تو دریا کی اس کی تیسری قسم بھی ہوتی۔ اور یا حدیث پاک میں میتتان نہ ہوتا۔ بلکہ لفظاً جمع ہوتا یا معناً۔ تثنیہ نہ لفظاً جمع ہو سکتا ہے۔ نہ معناً۔ یہ تھے وہ دلائل جن سے بالوضاحت کچھوے وغیرہ بجز مچھلی تمام حیواناتِ آبی کی حرمت ثابت

ہو رہی ہے۔ اب سائل کے پیش کردہ دلائل کا جواب ملاحظہ فرمایئے اوّلاً اتنا ضرور سمجھا جائے۔ کہ حرمت کے دلائل میں خاص طور پر کھانے کا ذکر ہے۔ کہ کچھوے وغیرہ کا کھانا حرام ہے۔ مگر وہابی صاحب اور دیگر تمام اُن کے لواحقین کی طرف سے جتنے بھی اب تک دلائل پیش ہوتے رہے۔ اُن میں کہیں بھی کچھوے وغیرہ کھانے کا ذکر نہیں۔ بلکہ مجمل طریقہ سے مشترک الفاظ والی روایات واقوال سے محض سہارا پکڑا گیا۔ حالانکہ قانونِ شریعت میں مفسر کے ہوتے ہوئے مجمل پر حکم نہیں لگایا جاتا۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود پھر بھی تقریباً وہ سب اقوال جن کو مخالفین نے اپنی دلیل سمجھا۔ تھوڑی تحلیل سے خود اُن کے ہی خلاف چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ مخالف کی دلیل نمبر ۱ :- اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ :- (ترجمہ تمہارے لیئے دریا کا شکار حلال کیا گیا مخالف وہابی کی کم عقلی پر تعجب اور حیرانگی ہے۔ کہ اس آیت کریمہ کو صرف کچھوے کی حلت پر کس طرح دلیل بنایا۔ حالانکہ آیتِ کریمہ کا سیاق وسباق صرف یہ بتا رہا ہے۔ کہ شکار بذاتِ خود حلال ہے کھانے اور طعام کا قطعاً ذکر نہیں۔ کیونکہ پہلے ارشاد تھا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ (ترجمہ):- اے مومنو جب تک تم احرام پہنے ہو۔ اس وقت شکار نہ کرو۔ یہاں لفظ الصید پر الف لام عہدِ ذہنی ہے۔ مگر شک پڑ سکتا تھا۔ کہ شاید الف لام استغراقی یا جنسی ہو۔ اور کوئی سمجھے کہ شاید سب شکار ہی حرام ہیں۔ خواہ خشکی کے ہوں یا دریا کے اس شک کو دور کرنے کے لیئے فرمایا گیا۔ کہ نہیں صرف خشکی کا شکار حرام ہے دریا کا شکار حرام نہیں بلکہ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ تمہارے لیئے بحالت احرام بھی دریائی شکار جائز ہوا کھانے نہ کھانے کا یہاں ذکر نہیں اور نہ شکار کرنے سے جانور کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دن رات شکاری لوگ شیر چیتے کا شکار کرتے ہیں۔ اور یہ شریعت میں بھی جائز۔ تمام فقہاء کرام شیر کے شکار کو حلال فرماتے ہیں مگر اس شکار سے اس جانور کا کھانا حلال نہ ہوگا۔ فعلِ شکار اور چیز ہے کھانا کچھ اور۔ یہاں فعلِ شکار مراد ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ صید البحر کیا چیز ہے ؟ یہ بات ہم نے پہلے بیان کر دی۔ کہ دریا کا اصلی باشندہ صرف مچھلی ہے اور عام شکاری بھی صرف مچھلی کو ہی شکار کرتے ہیں۔ دریا میں کثرت بھی اسی جانور کی ہے بڑے بڑے کاروبار مچھلی کے ہی شکار پر قائم ہیں۔ کوئی شکاری اپنے جال میں مچھلی کے علاوہ شکار کو پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا صید البحر سے مراد صرف مچھلی ہی کا شکار ہے۔ اور یہی شکار منقول عرفی وشرعی ہے کہ جب دریا کے شکار کا ذکر کیا جائے۔ تو فوراً ذہن مچھلی کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں منقول عرفی کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تمام مفسرین کے نزدیک بلکہ خود اس آیتِ پاک کی اگلی عبارت یہی ظاہر کر رہی ہے۔ کہ یہاں اصلاً صرف مچھلی کا شکار مراد ہے۔ بالتبع دوسرے جانوروں کا شکار شامل ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم نے فرمایا :- وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ - (ترجمہ) :- اور اُس کا کھانا تمہارے لیئے اور قافلے والوں کے لیئے حلال نفع ہے عام طور پر صرف مچھلی ہی کھائی جاتی ہے۔ اس کے

گوشت کی تجارت ہوتی ہے کبھی کسی وہابی کو بھی کچھوا کھاتے ہوئے نہ دیکھا گیا۔ ہاں چھپ کر کوئی کچھوا نہ جانے کیا کیا کھا جاتے ہوں گے۔ تفسیر روح المعانی جلد چہارم اس آیت کے ماتحت صفحہ نمبر ۳۰ پر ہے:۔ اَلَّذِیْ رُخِّصَ مِنْ صَیْدِ الْبَحْرِ لِلْمُحْرِمِ هُوَ السَّمَكُ خَاصَّةً :۔ (ترجمہ):۔ وہ شکار جس کی محرم کو اجازت دی گئی ہے وہ مچھلی ہے۔ خاص طور پر۔ تفسیر روح البیان جلد دوم صفحہ نمبر [illegible] پر ہے:۔ فَمَا یَعِیْشُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ كَالْبَطِّ وَالضِّفْدَعِ وَالسَّرَطَانِ وَالسُّلَحْفَاتِ وَجَمِیْعِ طُیُوْرِ الْمَاءِ لَا یُسَمّٰی صَیْدَ الْبَحْرِ بَلْ كُلُّ ذٰلِكَ صَیْدُ الْبَرِّ وَیَجِبُ الْجَزَاءُ عَلٰی قَاتِلِهٖ ۔ (ترجمہ):۔ پس وہ جانور جو خشکی میں بھی رہتے ہیں اور دریا میں بھی۔ جیسے کہ بطخ، مرغابی اور مینڈک اور کیکڑا اور کچھوا اور تمام آبی پرندے اُن کا نام دریائی شکار نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ وہ تمام خشکی کا شکار کہلاتے ہیں۔ اور بحالتِ احرام اُن کے شکاری پر شرعی کفارہ واجب ہے۔ اس عبارت سے ثابت ہوا۔ کہ کچھوا وغیرہ دریائی شکار ہی نہیں۔ تو وہ اس آیت اُحِلَّ لَكُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ میں داخل کس طرح ہو سکتا۔ لہٰذا اس آیت سے کچھوے کی حلت پر دلیل لانا بیوقوفی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ دریائی جانور ہونا اور چیز ہے دریائی شکار ہونا کچھ اور۔ قانوناً اور شرعاً ہر دو کے احکام جداگانہ دریائی جانور ہونا تو بھینس اور گھریلو بطخ کو بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل شکار نہیں۔ نہ برّی نہ بحری۔ کچھوا دریائی جانور تو ہے۔ مگر دریائی شکار نہیں دریائی شکار وہ ہے۔ جس کا شکار صرف دریا میں ہو۔ دریا سے باہر تقریباً ناممکن۔ مگر کچھوا وغیرہ دریا سے باہر بھی شکار کیے جاتے ہیں۔ جیسے خود میں نے چند بار دوستوں کے ساتھ مل کر ازراہِ تماشہ کچھوا قریبی جنگل سے شکار کیا۔ عقلاً و نقلاً و تجربتاً ثابت ہوا۔ کہ کچھوا دریا کا شکار نہیں۔ لہٰذا اس آیت میں بھی داخل نہیں۔ مخالف کی یہ دلیل بھی ٹوٹ گئی۔ اور یہ استدلال بھی غلط بلکہ منشاءِ آیت کے خلاف ہے۔ کیونکہ باری تعالےٰ دریائی شکار کی بحالتِ احرام اجازت فرما کر اشارۃً محرم حاجیوں کی خوراک کا انتظام فرما رہا ہے اور وہ خوراک بوجہ کثرت و نفاست و سہولت صرف مچھلی میں ہے۔ دیگر حیوانات میں نہ کثرت ہے۔ نہ نفاست نہ سہولت۔ تو اصلاً اُن کی اجازت بے مقصد ہو جاتی ہے۔ ہاں بالتبع دیگر حیوانات کی شمولیت ایک شاذ حکم ہے اسی لیے فقہاء کا اس میں اختلاف ہے مگر مچھلی کے شکار میں بحالتِ احرام کسی کا اختلاف نہیں۔ یہ سب گفتگو اشارۃ النص کے حکم کے بارے تھی لیکن عبارت النص میں وہی حکم ہے۔ جو پہلے بیان کیا گیا۔ کہ اس آیتِ کریمہ میں فقط شکار کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے شکار کو کھانے کی حلت یا حرمت مذکور نہیں۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد دوم صفحہ نمبر ۲۴۲ پر ہے:۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی:۔ صَیْدُ الْبَحْرِ۔ اَیْ یُصَادُ فِی الْمَاءِ ۔ (ترجمہ):۔ دریا کے شکار کا مطلب پانی میں شکار کیا جانا ہے۔ اب تک مخالف کے پہلے استدلال کا تحقیقی رد کیا گیا۔ لیکن الزامی رد اس طرح ہے۔ کہ اگر اس آیتِ کریمہ میں شکار کھانے کی حلت کا ذکر ہے۔ اور صید البحر سے یہ ثابت ہو رہا ہے۔ کہ دریا کا شکار کھانا ہر وقت ہر شخص

کے لیئے جائز ہے۔ تو لازم آئے گا۔ کہ دریا کے تمام جانور بلی، چوہا، خنزیر وغیرہ سب ہی حلال ہو جائیں۔ صرف کچھوے پر کفایت کس طرح ہو سکتی ہے۔ اور وہابی غیر مقلد صاحب کو چاہیئے۔ کہ ساروں کو حلال کہیں بلکہ دریائی خنزیر اور بلی چوہا ہی کھایا کریں۔ اس لیئے کہ اُن کی استدلالی آیت میں لفظ صید البحر مرکب اضافی مطلق جنسی ہے۔ اور اصولِ فقہ کا قاعدہ ہے۔ مطلق سب جنس کو شامل ہوتا ہے۔ اس میں سے کسی کو علیحدہ کرنا یا کوئی قید لگانا قطعاً جائز نہیں۔ چنانچہ نور الانوار صفحہ نمبر ۸۲ پر ہے:۔ اَنَّ الْمُطْلَقَ یَجْرِیْ عَلٰی اِطْلَاقِہٖ۔ (ترجمہ):۔ بے شک مطلق اپنے اطلاق پر جاری رہتا ہے۔ غیر مقلدوں کو کس طرح جائز ہے۔ کہ قرآن کریم کے مطلق کو اپنا مطلب حل کرنے کے لیئے توڑیں۔ اور صرف کچھوے کی حلت ثابت اور باقی کو حرام ہی رکھیں پس چاہیئے کہ سب کو حلال سمجھیں۔ اور سب کچھ کھائیں حالانکہ کوئی وہابی اس کا قائل نہیں۔ ہاں اگر کوئی قائل ہو۔ اور سب دریائی حیوانات کو حلال سمجھنے لگے۔ تو اس پر لازم ہے کہ صحیح حدیث اور قرآن حکیم سے مضبوط دلیل پیش کرے۔ مگر یہ ممکن نہیں۔ پس ثابت ہوا۔ کہ اس آیت میں صرف شکار کرنے کو حلال فرمایا جا رہا ہے نہ کہ کھانے کو۔ اسی لیئے آگے ارشاد ہوا:۔ وَحُرِّمَ عَلَیْکُمْ صَیْدُ الْبَرِّ مَادُمْتُمْ حُرُمًا ط (ترجمہ) اور حرام کیا گیا تم پر خشکی کا تمام شکار۔ جب تک تم احرام میں ہو۔ صاف معلوم ہوا۔ کہ اس میں شکار کا حکم بتایا جا رہا ہے۔ نہ کہ جانور کا۔ اصولی طور پر ان آیات میں لفظ صَیْدُ مطلق ہے اور کیفیت صید مقید ہے۔ اگر حالت و کیفیت بھی مطلق ہو جائے۔ تو مَادُمْتُمْ حُرُمًا ط کا جملہ بیکار ہو جائے گا۔ مخالف کی دوسری پیش کردہ دلیل کا تردیدی جواب غیر مقلد صاحب نے دارقطنی کی ایک روایت پیش کی۔ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْبَحْرِ اِلَّا وَقَدْ ذَکَّاھَا لِبَنِیْ آدَمَ ؕ (ترجمہ):۔ نہیں کوئی دابہ دریا میں حالانکہ بے شک پاک کر دیا اُس کو انسان کے لیئے۔ مخالف اس روایت سے کچھوے کی حلت پر دلیل بناتا ہے۔ اور اس روایت کو مرفوع کہا گیا۔ لیکن یہ دلیل بھی مخالف کے حق میں چار طرح سے کمزور اور نقصان دہ ہے:۔

پہلی وجہ:۔ یہ حدیث خود وہابیوں کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ اس حدیث سے تمام دریائی جانوروں کو حلال ماننا پڑے گا۔ حالانکہ مذکورہ فی السوال غیر مقلد صاحب اسی روایت سے صرف کچھوے کو حلال کرنا چاہتے ہیں۔ دیگر جانوروں کو حرام ہی رکھنے کا خیال ہے۔ جیسا کہ سوال کی عبارت سے ظاہر ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اُن کے حق میں ہرگز فائدے مند نہیں۔ ان کے استدلال سے ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے۔ جو اصول شریعت میں ناجائز ہے۔ مگر ایسا غور و فکر ان کو کہاں نصیب یہ تو فقط اپنے مذہب کو بچانے کی فکر میں مضطرب ہیں۔ اس روایت میں لفظ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ ط عمومی لفظ ہے۔ پس اگر غیر مقلدین کے منشاء کے مطابق مطلب کیا جائے۔ تو سب جانور آبی حلال ماننے پڑیں گے۔ جو خود غیر مقلدین کے لیئے نقصان دہ ہے:۔ **دوسری وجہ**:۔ اس روایت سے کچھوے وغیرہ کو حلال مانتے ہیں۔ ہماری پیش کردہ حدیث مطہرہ سے تقابل لازم آئے۔

گا۔ کیونکہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا۔ کہ شریعتِ مطہرہ نے صرف دو مردار حلال فرمائے اور ان کا تعین خود زبانِ پاکِ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمادیا۔ کہ ایک مردار آسمانی مکڑی اور ایک مچھلی۔ پتہ لگا۔ کہ مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے صرف دو ہی مُردے حلال فرمائے۔ مگر مخالف کے استدلال والی روایت سے ثابت ہوگا۔ کہ دریا کے سب جانور ہی حلال ہیں۔ اور یہ بات پہلے ثابت کر دی گئی۔ کہ دریا کا کوئی جانور ذبح نہیں ہوسکتا۔ سب مُردہ ہوکر ہی قابلِ خوراک ہو سکتے ہیں۔ تو وہابی شرح کی بنا پر ایک حدیث تو یہ فرماتی ہے۔ کہ صرف دو مُردے حلال اور دوسری روایت تمام دریائی مُردوں کو حلال کر رہی ہے۔ کیسا نقصان دہ ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ انہی نادانیوں ناسمجھیوں نے چکڑالوی فرقہ جنم دیا۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّھَا۔ لہٰذا۔ اس تقابل و ٹکراؤ سے بچنے کے لیے اصول و قواعد کی روشنی میں ایسی شرح کی جائے۔ جس سے اقوامِ عالم کے قلوب میں احادیثِ رسول اللہ کا وقار پیدا ہو۔ صرف اہلِ حدیث نام رکھ لینا کمال نہیں۔ مدنی تاجدار کی احادیث طیبات کو محققانہ طریقے سے سمجھنا سمجھانا اصلی ایمان ہے۔ خیال رہے۔ کہ مشکوٰۃ شریف کی پیش کردہ حدیث پاک صحیح لذاتہٖ ہے۔ اور مشہور بھی ہے۔ چنانچہ فقہ السنن والآثار جلد اول صفحہ نمبر ۳۲۹ پر ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعًا اُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ فَاَمَّا الْمَيْتَتَانِ فَالْحُوْتُ وَالْجَرَادُ وَاَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ اَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ وَهُوَ حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ وَلِاَبِيْ دَاؤُدَ وَابْنِ مَاجَةَ بِسَنَدٍ جَيِّدٍ (ترجمہ) :۔ حضرت ابن عمر سے مرفوع حدیث مروی ہے۔ کہ حلال کیے گئے دو مردار اور دو خون لیکن مردار پس مچھلی اور آسمانی مکڑی ہے۔ اور دو خون کلیجی اور تلی ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے اس کو روایت کیا۔ اور یہ حدیث صحیح ذاتی ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ کے لیے اس روایت کی نئی سند ہے۔ اس کی شرح میں ہے۔

قُلْتُ رِجَالُهٗ رِجَالُ الصَّحِيْحَيْنِ (ترجمہ) میں کہتا ہوں۔ کہ اس حدیث شریف کے راوی مسلم و بخاری کے راویوں کی مثل ثقہ ہیں یہ حدیث مشہور اس لیے ہے۔ کہ بہت سی سندوں سے مکتوب ہے۔ چنانچہ ابوداؤد صفحہ نمبر ۲۴۱ پر اور ابن ماجہ صفحہ نمبر ۲۳۰ و بیہقی شریف جلد ۲ صفحہ نمبر [illegible] پر یہی حدیث پاک مختلف سندوں سے مروی ہے۔ دار قطنی جلد دوم صفحہ نمبر ۵۲۹ و صفحہ نمبر ۵۴۰ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا الْحُسَيْنُ بْنُ اِسْمٰعِيْلَ نَا عَلِيُّ بْنُ مُسْلِمٍ نَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ح وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مَخْلَدٍ نَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْعَتِيْقِيُّ حَدَّثَنَا مُطَرِّفٌ نَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (الخ) قَالَ اُحِلَّ لَنَا مِنَ الدَّمِ دَمَانِ وَمِنَ الْمَيْتَةِ مَيْتَتَانِ۔ فَمِنَ الْمَيْتَةِ الْحُوْتُ وَالْجَرَادُ :۔ (ترجمہ)

ہم سے حدیث بیان کی عثمان بن احمد نے ان سے یحییٰ بن ابو طالب نے ان سے عبدالوہاب نے ان سے طلحہ بن عمرو نے

اور عمرو بن دینار سے روایت ہے، فرمایا کہ فرمایا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خونوں میں دو خون اور مرداروں میں دو مردے ہم مسلمانوں کے لیے حلال کیے گئے۔ یہ روایت سندِ جید سے ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ یہ روایت مشہور ہے۔ اور بہت سی روایات مچھلی کی حلت والی اس کی تائید کر رہی ہیں۔ دارقطنی نے بہت سی ایسی احادیث روایت فرمائیں۔ جن سے صرف مچھلی کی حلت ثابت ہو رہی ہے۔ بخلاف مخالف کی پیش کردہ روایت کے کہ اس روایت کو بجز دارقطنی کے کسی محدث نے قبول نہ کیا۔ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۲۵۱ پر بھی دارقطنی ہی کے حوالے سے لکھی گئی۔ اس روایت سے کچھوے کی حلت پر استدلال کے کمزور ہونے کی تیسری وجہ یہ ہے۔ کہ یہ روایت اور اس حکم کی دیگر روایات سب ظنی ہیں۔ کیونکہ یہاں باوجود عموم ہونے کے امام مالک نے اور امام احمد نے دریائی کتا، بلا۔ سور کو حلت سے مستثنیٰ کر دیا۔ اور اصول کا قاعدہ ہے۔ کہ جب عموم میں سے کچھ مستثنیٰ کر دیا جائے۔ تو وہ حدیث ظنی ہو جاتی ہے اور جب کہ نص قطعی و حدیث مشہورہ سے کسی چیز کی حرمت ثابت ہوتی ہو۔ تو اس کے مقابل حدیثِ ظنی سے حلت ثابت نہیں ہو سکتی۔ چوتھی وجہ یہ ہے۔ کہ مخالف اس کو حدیث مرفوع کہتا ہے۔ حالانکہ یہ روایت سنداً غریب ہے۔ کیونکہ اس کا ایک راوی مشہور ہے۔ اور ایک ہی سند سے معروف ہے۔ چنانچہ دارقطنی نے یہ حدیث اس طرح روایت کی:۔ حَدَّثَنِیْ عُثْمَانُ بْنُ عَبْدِ رَبِّہٖ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ رَوْحٍ حَدَّثَنَا شَبَابَۃُ حَدَّثَنَا حَمْزَۃُ بْنُ عَمْرِو بْنِ دِیْنَارٍ۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْبَحْرِ اِلَّا وَقَدْ ذَکَّاھَا اللّٰہُ لِبَنِیْ اٰدَمَ (دارقطنی ج ۲) مجھ سے حدیث بیان کی عثمان بن عبدربہ نے ان سے عبداللہ بن روح نے ان سے شبابہ نے ان سے حمزہ بن عمرو بن دینار نے وہ روایت کرتے ہیں۔ حضرت جابر سے انہوں نے فرمایا۔ کہ فرمایا آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہیں ہے کوئی دابہ دریا میں مگر بے شک ذبح کر دیا۔ یعنی حلال کر دیا اس کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے۔ اس روایت کی سند میں صرف ایک راوی عثمان بن عبدربہ مشہور ہیں۔ اس بنا پر یہ روایت غریب ہو کر خبرِ واحد کا درجہ لیتی ہے۔ آس کے آخر کی راوی حمزہ بن عمرو ہیں۔ اُن کو دادا کی طرف نسبت کر کے حمزہ بن دینار بھی کہا جاتا ہے۔ کتب اسماء الرجال میں ان کا یہی نام مشہور ہے۔ محدثین کے نزدیک مجہول ہے۔ چنانچہ تقریب التہذیب صفحہ نمبر ص۹۳ پر ہے حَمْزَۃُ بْنُ دِیْنَارٍ عَنِ الْحَسَنِ مَجْھُوْلٌ مِنَ الثَّامِنَۃِ۔ (ترجمہ) حمزہ بن دینار حسن کی طرف سے مجہول راوی ہیں۔ آٹھویں درجہ کا ہے۔ اصول حدیث کے قانون میں جس روایت کا راوی مجہول ہو۔ اور روایت ثقہ رواۃ کی روایت کے خلاف بھی ہو تو اس کا درجہ شاذ کہلاتا ہے۔ اور شاذ روایت مرجوح ہوتی ہے نہ کہ راجح۔ چنانچہ خطبہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۳ پر ہے

وَالشَّاذُّ وَالْمُنْكَرُ مَرْجُوْحَانِ وَالْمَحْفُوْظُ وَالْمَعْرُوْفُ رَاجِحَانِ ط حمزہ ابن دینار تبع تابعی ہیں۔ وہ حضرت جابر صحابی سے روایت کر رہے ہیں۔ تو لازمًا درمیان سے ایک راوی رہ گئے ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث مرفوع نہ ہوئی۔ بلکہ منقطع اور منقطع وہ روایت ہے جس کے سلسلے میں سے ایک راوی رہ جائے۔ چنانچہ مقدمہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۳ پر ہے :۔

فَاِنْ كَانَ وَاحِدًا اَوْ اَكْثَرَ مِنْ غَيْرِ مَوْضِعٍ وَاحِدٍ يُسَمّٰى مُنْقَطِعًا ط (ترجمہ) :۔ اگر روایت کی سند میں سے ایک یا دو جگہ راوی چھوٹ جائیں۔ تو اس کا نام منقطع رکھا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مخالف کی پیش کردہ روایت سند کے اعتبار سے غریب ہے۔ شہرت کے اعتبار سے خبر واحد ہے۔ راوی کے لحاظ سے شاذ ہے۔ اور سلسلے کے لحاظ سے منقطع ہے۔ یہ تھی اس روایتِ استدلالیہ کے بارے میں محدثانہ گفتگو۔ اب اس روایت کو فقہی تحقیق سے دیکھا جاتا ہے۔ محدثانہ گفتگو سے قطع نظر۔ اگر فرضًا اس کو بالکل درست کر لیا جائے۔ اور روایت کو قابل عمل بنایا جائے۔ تب بھی مخالف کا استدلال اس روایت سے حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں مَا مِنْ دَآبَّةٍ کا جملہ ثابت کر رہا ہے۔ کہ دریائی جانوروں میں صرف مچھلی ہی حلال ہے۔ باقی کسی حیوان کو کھانا حلال نہیں۔ اس لیے کہ مَا مِنْ کے الفاظ عموم نوعی ثابت کر رہے ہیں۔ نہ کہ جنسی اس کی وجہ یہ کہ لفظ دَآبَّةٍ ط لغوی اعتبار سے صرف اس کو کہتے ہیں۔ جو زمین پر چلے۔ حقیقی معنیٰ کی رو سے دریائی اور ہوائی حیوانات کو دآبہ نہیں کہا جاتا۔ بلکہ عربی میں ہوائی مخلوق کو طیور کہا جاتا ہے۔ اور دریائی کو بحریہ یا حیوان بحریہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح المعجم اردو عربی صفحہ نمبر ۲۴۳ پر ہے۔ مگر دآبہ صرف زمینی مخلوق کو کہا جاتا ہے چنانچہ منطق کی مشہور کتاب مرقات صفحہ نمبر ۵ پر ہے :۔ لَفْظُ الدَّابَّةِ كَانَ فِي الْاَصْلِ مَوْضُوْعًا لِمَا يَدِبُّ عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ نَقَلَهُ الْعَامَّةُ لِلْفَرَسِ اَوْ لِذَاتِ الْقَوَائِمِ الْاَرْبَعِ ط (ترجمہ) :۔ دآبہ کا لفظ حقیقی معنیٰ کے لحاظ سے صرف ان جانوروں کے لیے بنایا گیا۔ جو زمین پر چلتے ہیں۔ پھر عام اصطلاح میں گھوڑے یا ہر چوپائے کے لیے منتقل ہوا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے :۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ط سورۃ هود آیت ۵ مع (ترجمہ) :۔ اور نہیں ہے کوئی دآبہ زمین میں اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے پروں سے اڑتا ہے، مگر تمہاری ہی طرح (اے مسلمانوں) رسول اللہ کی اُمت ہیں۔ اسی طرح قرآنِ کریم نے کُل اٹھارہ جگہ لفظِ دآبہ ارشاد فرمایا وہ زمین سے ہی منسوب رہا۔ کہیں بھی لفظِ دآبہ کو قرآن پاک نے دریائی یا ہوائی مخلوق کے لیے استعمال نہ فرمایا اس لیے کہ لفظ دآبہ دبّ سے مشتق ہے۔ جس کا ترجمہ ہے۔ زمین کو روندنا، اکھیڑنا۔ یہی وجہ ہے کہ ریچھ اور بچھو کو عربی میں دبابہ کہتے ہیں۔ ریچھ روندتا گھسٹتا ہوا چلتا ہے۔ اس لیے اس کو بھی عربی میں دُبّ کہتے ہیں۔ چنانچہ منجد عربی مصری صفحہ نمبر ۲۰۱ پر ہے :۔ اَلدُّبَّةُ حَيَوَانٌ مِنَ السِّبَاعِ ط (ترجمہ) :۔ ریچھ جنگل کا ایک درندہ ہے۔ سخت پنڈلی والے گنوار کو بھی عربی میں دآبہ کہہ دیتے ہیں (منجد) ان دلائلِ علمیہ

تقریر سے ثابت ہوا۔ کہ دابّہ حقیقی معنٰے میں صرف حیواناتِ خشکیہ کے لیئے وضع ہے۔ اور لغوی طور پر زمین کو روندنے والی چیزوں کو بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن دریائی مخلوق کے لیئے نہ حقیقی طریقے پر استعمال ہو سکے نہ لغوی بلکہ بوقت قرینہ مجازی طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور مجازی معنٰی میں اہل زبان کی اصطلاح کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ پس اس روایت میں مَا مِنْ دَآبَّۃٍ کے لفظ سے صرف مچھلی مراد لی جا سکتی ہے نہ کہ کوئی اور دریائی جانور۔ کیونکہ یہاں لفظِ دَآبَّۃٍ مجازًا استعمال ہوا ہے۔ اور اہل عرب سے صرف مچھلی کے لیئے دَآبَّۃٍ کا لفظ سنا گیا۔ چنانچہ نسائی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۱۹۲ پر ہے:۔ فَاَلْقَى الْبَحْرُ دَآبَّۃً يُقَالُ لَهَا الْعَنْبَرُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ نِصْفَ شَهْرٍ ط (ترجمہ):۔ لشکرِ اسلام کے لیئے دریا نے بہت بڑی دآبّہ باہر پھینک دی جس کا نام عنبر تھا۔ پس ہم نے پندرہ دن تک اُس کو کھایا۔ تمام شکاری جانتے ہیں۔ کہ عنبر مچھلی کا نام ہے۔ خود راوی حدیث کچھ پہلے تشریح کر کے بتا چکے ہیں۔ عنبر ایک خاص قسم کی مچھلی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ نسائی کے اسی صفحہ نمبر ۱۹۲ پر ہے:۔ فَاِذَا هُوَ بِحُوْتٍ قَذَفَهُ الْبَحْرُ (الخ) ترجمہ:۔ جب لشکر دریا کے کنارے آیا۔ تو اچانک وہاں بڑی مچھلی پڑی تھی۔ جس کو دریا کی لہروں نے پھینکا تھا۔ یہ لشکر حضرت ابو عبیدہ بن جراح کی ماتحتی میں تین سو نفر پر مشتمل تھا۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہوا۔ کہ دابّہ صرف مچھلی کو کہا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ دبّ کا معنوی قرینہ یہاں موجود ہے۔ کیونکہ دبّ کا معنٰی روندنا، ہلچل پیدا کر دینی۔ زمین پر تو سب سے زیادہ ہلچل گھوڑا مچاتا ہے۔ اس لیئے منقول اصطلاحی نے یہ لفظ اس کے لیئے خاص کر دیا۔ اور دریا میں سب سے زیادہ ہلچل مچھلی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ پانی میں سب سے زیادہ تیز بھاگتی ہے۔ اس لیئے مجازًا مچھلی کو بھی دابّہ کہہ دیا گیا۔ عربیوں سے بجز مچھلی کے کسی دریائی جانور کے لیئے دابّہ کا استعمال نہ سنا گیا۔ ہم نے تو ظاہری عبارت سے ثابت کر دیا۔ کہ مچھلی کو دابّہ کہہ دیا جاتا ہے۔ غیر مقلد صاحب کو چاہیئے۔ کہ کسی اور جانور کے لیئے اسی طرح باوضاحت لفظ دابّہ ثابت کریں۔ ہماری اس گفتگو سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہ مخالف کی پیش کردہ دار قطنی کی روایت میں دابّہ سے مراد صرف مچھلی ہے۔ اسی لیئے کنوز حقائق علّامہ جامع صغیر جلد دوم صفحہ نمبر ۳۰ پر طبرانی کی یہی روایت کچھ تغیرِ لفظی سے اس طرح نقل کی۔ قَدْ ذُبِحَ كُلُّ نُوْنٍ فِي الْبَحْرِ لِبَنِيْ آدَمَ ط (رَوَاهُ طَبْرَانِيْ):۔ (ترجمہ):۔ بے شک ذبح کی گئیں۔ تمام مچھلیاں جو دریا میں ہیں۔ بنی آدم کے لیئے (طبرانی) اس حدیث اور پہلی روایت کا مضمون بالکل ایک جیسا ہے۔ فقط کچھ لفظی تبدیلی ہے۔ گویا کہ یہ حدیث پاک شرح فرما رہی ہے۔ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ کے لفظ کی كُلُّ نُوْنٍ سے کہ دآبّۃ کا معنٰی ہے۔ تمام مچھلیاں۔ ہر عالم جانتا ہے۔ کہ نون مچھلی کا جنسی نام ہے۔

خود دارقطنی نے جلد دوم صفحہ نمبر ۵۲۹ پر۔ باسند صحیح تین احادیث روایت کیں۔ جن میں بالکل یہی ہے۔ مگر دآبّۃ کا لفظ نہیں۔ چنانچہ پہلی حدیث پاک اس طرح ہے:۔ حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَحْمَدَ قَالَ حَدَّثَنَا یَحْیٰی بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ نَا طَلْحَۃُ بْنُ عَمْرٍو عَنْ عَمْرِو بْنِ دِیْنَارٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اِنَّ اللّٰہَ ذَبَحَ مَا فِی الْبَحْرِ لِبَنِیْ آدَمَ ط (ترجمہ):۔ ہم سے حدیث بیان کی عثمان بن احمد نے اُن سے یحییٰ اُن سے ابو طالب نے اُن سے عبدالوہاب نے اُن سے طلحہ بن عمرو نے وہ عمرو بن دینار سے راوی ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ مجھ کو خبر پہنچی ہے۔ کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ذبح فرما دیں۔ وہ جو دریا میں ہے۔ انسان کے لیئے یہ حدیث مقطوع ہے۔ اور مجمل ہے۔

دوسری حدیث:۔ دارقطنی جلد دوم صفحہ نمبر ۵۲۸ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِیْمُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْعُمَرِیُّ حَدَّثَنَا عُبَادُ بْنُ یَعْقُوْبَ نَا یَحْیٰی عَنْ اَبِیْ اَبِیْ بَشِیْرٍ عَنْ عِکْرَمَۃَ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا بَکْرٍ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی ذَبَحَ لَکُمْ مَا فِی الْبَحْرِ فَکُلُوْہُ کُلَّہٗ بِاَنَّہٗ ذَکِیٌّ ط (ترجمہ):۔ ہم سے بیان کیا۔ ابراہیم بن محمد العمری نے (الخ) روایت ہے۔ حضرت ابن عباس سے انہوں نے فرمایا۔ کہ میں نے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا۔ آپؓ فرماتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ذبح فرمایا۔ تمہارے لیئے وہ سب جو دریا میں ہے۔ پس کھاؤ۔ اس کو اس کا تمام اس وجہ سے کہ وہ پاک ستھری ہے۔ یہ روایت موقوف اور مجمل ہے۔ لیکن یہاں لفظ کُلَّہٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب۔ اشارۃً کسی خاص ایک جانور کی وضاحت کر رہی ہے۔ اگر تمام دریائی جانور مراد ہوتے تو کُلَّہٗ مرکب اضافی نہ ہوتا۔ مگر چونکہ یہ ہر دو حدیث مجمل ہیں۔ اور مجمل میں ہر طرح کے احتمالات نکل سکتے ہیں۔ لہٰذا کسی تفصیل کی لازمی حاجت ہے۔ پس دارقطنی کی تیسری حدیث اِن سب روایات کی شان دار شرح فرما رہی ہے چنانچہ صفحہ نمبر ۵۲۹ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَلِیٍّ الْمَالِکِیُّ نَا بَشِیْرُ بْنُ آدَمَ۔ نَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ الْاَنْصَارِیُّ نَا سَعِیْدٌ عَنْ قَتَادَۃَ عَنْ لَاحِقِ بْنِ حُمَیْدٍ۔ وَ عِکْرَمَۃَ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ اَبَا بَکْرٍ قَالَ السَّمَکُ ذَکِیٌّ کُلُّہٗ ط (ترجمہ):۔ ہم سے ابو علی مالکی نے حدیث بیان کی اُن سے بشیر بن آدم نے اُن سے محمد بن عبداللہ انصاری نے اُن سے سعید نے وہ قتادہ سے راوی وہ لاحق بن حمید سے اور عکرمہ سے وہ ابن عباس سے فرمایا۔ کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ مچھلی تمام کی تمام ہی پاک طیب حلال ہے۔ دیکھئے پہلی روایت اور یہ روایت سلسلۂ اسناد کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ کہ وہاں بھی عکرمہ ابن عباس اور سیدنا ابوبکر صدیق ہیں۔ اور یہاں بھی۔ وہاں عبارت مطلق تھی۔ کہ ارشاد تھا۔ مَا فِی الْبَحْرِ یعنی جو بھی دریا میں ہے۔ سب کھانے کے لیئے حلال۔ مگر اس عموم پر عمل ناممکن۔ کیونکہ دریا میں تو اینٹ پتھر بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابن عباس کی ہی دوسری روایت نے وضاحت فرما دی۔ کہ مافی البحر سے مراد صرف مچھلی ہے۔ دارقطنی کے اسی صفحہ نمبر ۵۲۹ پر ایک روایت اس طرح ہے:۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ

ابْنُ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ - نَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ - عَنْ قَتَادَةَ عَنْ جَابِرِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ - اَلْحُوْتُ ذَكِيٌّ كُلُّهٗ وَالْجَرَادُ ذَكِيٌّ كُلُّهٗ (ترجمہ) :- جابر بن زید سے روایت ہے۔ فرمایا - کہ فرمایا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے - مچھلی تمام کی تمام حلال و طیب و طاہر ہے اور اسی طرح ٹڈی تمام کی تمام پاک ہے کُلُّهٗ کا مطلب یہ نہیں کہ بول و براز بھی پاک ہے۔ (معاذ اللہ) بلکہ مطلب کہ جس طرح دیگر خشکی کے حلال جانور میں بعض چیزیں مکروہ ہوتی ہیں - ویسا یہاں نہیں - ان تمام روایات سے بھی صرف مچھلی کی ہی حلت ثابت ہو رہی - اور وہابی بے چاروں کی دال گلتی نظر نہیں آتی - مخالف کی تیسری دلیل جس پر غیر مقلدین کو بڑا ناز ہے - اس لیے کہ یہاں سلحفاۃ یعنی کچھوے کا صاف طور پر نام آگیا - اہل سنت مسلمان غیر مقلدوں پر اکثر یہی طعن کرتے ہیں - کہ ان وہابیوں کے پاس کوئی بھی ایسی صاف دلیل نہیں - کہ جس سے یہ اپنا مذہب بچا سکیں - توڑ مروڑ اور غلط تاویلیں کرکے ہی یہ لوگ اپنا مذہب بنائے ہوئے ہیں - اس طعن کو دھونے کے لیے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچھوے کھانے کے شوق میں کچھوے کی حلت پر ایک عبارت نکال لائے - چنانچہ بخاری شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۸۲۶ پر اسی آیت احرام - اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ :- کے تحت لکھا ہے - وَلَمْ يَرَ الْحَسَنُ بِالسُّلَحْفَاةِ بَاْسًا (ترجمہ) :- خواجہ حسن بصری نے کچھوے میں کوئی نقصان نہ دیکھا - یہ ہے مخالف کی بہت بڑی دلیل - حالانکہ یہ دلیل بھی مخالف کو سخت نقصان دہ ہے - چار وجہ سے :-

پہلی وجہ :- یہ کہ مخالف اپنے آپ کو غیر مقلد اور اہل حدیث کہتے ہیں اور عمل بالحدیث کے دعوے دار ہیں - ہم سے ہر بات میں صحیح حدیث کا مطالبہ کرتے ہیں - مگر خود کا یہ حال کہ اپنے دعوے میں نہ قرآن نہ حدیث - بلکہ ایک صوفی کی بات نقل کرکے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی ٹھانی - کیا یہ اہل حدیث اور غیر مقلدیت ہے - اسی کا نام تقلید شخصی ہے - جس کو خود ان لوگوں نے ہی شرک فی الرسالت کا خود ساختہ لقب دیا - اور بقول شخصے چاہ کن را چاہ در پیش - خود سرکے بل اسی شرک میں گر پڑے **دوسری وجہ** یہ کہ خواجہ حسن بصری کا یہ قول مجمل بلکہ خفی ہے - اس لیے کہ لفظ باس کا معنیٰ ہے نقصان - مضائقہ اس میں بہت سے احتمال نکل سکتے ہیں - لیکن کوئی بھی یقینی نہیں ہو سکتا - چنانچہ نور الانوار صفحہ نمبر ۹۵ پر ہے :-

وَاَمَّا الْمُجْمَلُ فَمَا ازْدَحَمَتْ فِيْهِ الْمَعَانِيْ وَاَشْتَبَهَ الْمُرَادُ بِهٖ اِشْتِبَاهًا لَا يُدْرَكُ بِنَفْسِ الْعِبَارَةِ (ترجمہ) :- مجمل وہ ہے - جس میں بہت سے معنے نکل سکیں - اور مشتبہ ہو جائے - اسی طرح کہ عبارت سے کوئی مطلب اخذ نہ ہو سکے - مخالف نے اس سے حلت کا مطلب نکال لیا - حالانکہ یہ بہت دور کا احتمال ہے - کسی مفسر کسی شارح کسی محشی نے - خواجہ حسن بصری کی اس عبارت کا یہ مطلب نہیں نکالا نہ کوئی کچھوے کے کھانے کا قائل ہوا

تیسری وجہ: ۔ خواجہ حسن بصری تصوف و معرفت کے امام اکبر ہیں۔ علوم اسرار میں آپ کا واقعی مقام ہے مگر علم شریعت اور مہارتِ اجتہاد میں ائمہ اصول و فروع تک آپ کا مقام نہیں پہنچ سکتا۔ صحیح یہ ہے کہ آپ تابعین سے ہیں۔ (از نزہۃ صفحہ نمبر ۲۸) امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ امام شافعی کے ہم استادوں کے استاد ہیں۔ یہی رابعہ بصریہ کا دور ہے۔ رضی اللہ تعالٰی علیہم اجمعین۔ تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ امام اعظم کے مقابل اور ظاہر روایات کے ہوتے ہوئے خواجہ حسن کی بات کو فقہ اسلامی میں ترجیح دی جائے۔ **چوتھی وجہ:** ۔ یہ ہے کہ جب اس عبارت میں کوئی حتمی احتمال معین نہیں۔ تو عقل و قیاس کے مطابق ایسا احتمال قابل تسلیم ہوگا۔ جو موقعہ محل کے نزدیک تر ہو۔ اور وہ احتمال یہی ہے۔ کہ سب فقہاء فرماتے ہیں۔ کہ اگر احرام کی حالت میں کوئی محرم کچھوے کا شکار کرے یا تیر سے یا بندوق وغیرہ سے کچھوے کو مار ڈالے تو شرعی کفارۂ احرام واجب ہوگا۔ کیونکہ کچھوا ان فقہاء امت کے نزدیک خشکی کا شکار ہے۔ اور اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ کے ماتحت کچھوا داخل نہیں۔ مگر خواجہ حسن بصری فرماتے ہیں۔ کہ میرے نزدیک کچھوا دریائی جانوروں میں شمار ہے اور محرم اگر بحالتِ احرام اس کو شکار کرکے مار ڈالے۔ تو کفارہ واجب نہ ہوگا۔ اسی مسلک کو ظاہر کرنے کے لیے امام بخاری نے فرمایا۔ لَمْ يَرَ الْحَسَنُ بِالسُّلَحْفَاةِ بَأْسًا ط حضرت حسن نے کچھوے کے شکار میں کوئی مضائقہ اور محرم کے لیے نقصان نہ سمجھا۔ اس سے کچھوا کھانے کی حلت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ اور کس طرح ہو سکتی ہے۔ جب کہ خبرِ واحد کو قیاس سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور حدیث ظنی سے کسی حرام کو حلال نہیں کیا جا سکتا تو خواجہ حسن کے ایسے مجمل کلام سے حلت کیسے ثابت ہو سکتی ہے مخالف کی چوتھی دلیل۔ کہ امام مالک۔ امام شافعی اور احمد کا بھی یہی مسلک ہے۔ کہ کچھوا حلال ہے۔ **جواب:** ۔ مخالف کی یہ دلیل قطعًا غلط ہے۔ اور مخالف کے علومِ شریعت سے ناواقفی کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس لیے کہ امام مالک کی طرف کچھوے کے بارے میں بہت سے قول منقول ہیں۔ چنانچہ کتاب الفقہ علی مذاہب اربعہ مترجم اُردو مطبوعہ محکمۂ اوقاف پاکستان جلد دوم صفحہ نمبر ۵ پر ہے۔ امام مالک کے نزدیک سب دریائی جانور مباح ہیں۔ بغیر ذبح یہاں تک کہ طافی مچھلی بھی۔ مگر بحری خنزیر میں توقف ہے۔ فتاوٰے بلغۃ السالک جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۲۲ پر ہے۔ وَالْمُبَاحُ الْبَحْرِيُّ مُطْلَقًا وَإِنْ مَيْتًا أَوْ كَلْبًا أَوْ خِنْزِيرًا أَوْ تِمْسَاحًا أَوْ سُلَحْفَاةً وَلَا يَفْتَقِرُ لِذَكَاةٍ (ترجمہ):۔ اور دریائی جانور مطلقًا حلال ہیں۔ اگرچہ مردار ہو یا کتا یا آبی سور یا مگرمچھ یا کچھوا۔ اور ذبح کی حاجت نہیں ایک قول ہے۔ کہ پانی کا کتا، انسان، خنزیر امام مالک کے نزدیک حرام ہیں۔ باقی سب حلال۔ غرض کہ مختلف اقوال کی بنا پر حتمًا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کچھوے کو امام مالک کے نزدیک حلال ہی تصور کرو۔ تب بھی مخالف کا منشاء حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ امام مالک کا اپنا اجتہادی قیاس ہے۔ جو مقلدین

کو تو فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ مگر غیر مقلد کو نقصان دہ۔ امام احمد بن حنبل کے نزدیک بجز مگرمچھ اور سانپ اور مینڈک کے باقی وہ جانور جو پانی سے باہر زندہ نہ رہ سکیں۔ حلال ہیں۔ اسی طرح تمیز الکلام صفحہ نمبر ۱۳ پر لکھا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ امام احمد کے نزدیک کچھوا حرام ہے۔ کیونکہ وہ پانی سے باہر زندہ رہتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک کچھوا بالکل حرام ہے چنانچہ فقہ شافعی لعلامہ بیجوری جلد دوم صفحہ نمبر ۲۴۲ پر ہے:۔ وَيَحْرُمُ مَا يَعِيْشُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ كَالضِّفْدِعِ وَالتِّرْكَانِ يُسَمّٰى عَقْرَبَ الْمَاءِ وَالْحَيَّةِ وَالتِّمْسَاحِ وَالسُّلَحْفَاةِ بِضَمِّ السِّيْنِ وَفَتْحِ اللَّامِ لِخُبْثِ لَحْمِهَا ۔ (ترجمہ): اور حرام ہے۔ وہ حیوان جو دریا اور خشکی میں رہتا ہے۔ جیسے کہ مینڈک، سرطان جس کا نام آبی بچھو بھی ہے۔ اور سانپ اور مگرمچھ اور کچھوا۔ کیونکہ ان کا گوشت خبیث ہے۔ تمیز الکلام صفحہ نمبر ۱۸ پر ہے۔ کہ امام اعظم اور امام شافعی کے نزدیک کچھوا حرام ہے۔ لیکن امام مالک اور امام احمد کے نزدیک مختلف ہے مخالف کا ائمہ ثلاثہ میں سے امام شافعی کے متعلق یہ حلت منسوب کرنی جہالت ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ کچھوا شریعت اسلامیہ میں عقلاً نقلاً اور قرآن و حدیث کی رو سے حرام ہے۔ کیونکہ جسم انسانی کو اس کا گوشت نقصان دہ ہے۔ جیسا کہ پہلے ثابت کر دیا گیا۔ اور نقصان دینے والی چیزیں اسلام میں حرام ہیں۔ چنانچہ سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد چہارم صفحہ نمبر ۷۵ پر ہے:۔ اِنَّ جَرَادَ الْاَنْدَلُسِ لَا يُؤْكَلُ لِاَنَّهٗ ضَرَرٌ مَحْضٌ ۔ فَاِذَا ثَبَتَ مَا قَالَهٗ فَتَحْرِيْمُهَا لِاَجْلِ الضَّرَرِ كَمَا تَحْرُمُ السُّمُوْمُ وَنَحْوُهَا ۔
ترجمہ:۔ اندلسی ٹڈی نہ کھائی جاوے۔ کیونکہ اس میں جسمانی نقصان ہوتا ہے۔ تو جب وہ ثابت ہو گیا جس کو فرمایا پس لازم ہوئی۔ اس کی حرمت نقصان کی وجہ سے جیسے کہ شریعت میں زہر وغیرہ کھانے حرام ہیں۔ اور بلغۃ السالک جلد اول صفحہ نمبر ۲۳۳ پر ہے:۔ اِلَّا اَنْ يَّتَحَقَّقَ ضَرَرُهَا فَيَحْرُمُ اَكْلُهَا لِذٰلِكَ۔ الخ (ترجمہ):۔ مگر جب اس جانور میں نقصان ثابت ہو جائے۔ تو اس کا کھانا اس نقصان دہی کی وجہ سے حرام ہو گا۔ اسی نقصان سے بچانے کے لیے تو حدیث پاک نے اس حلال گوشت کو بھی حرام فرما دیا۔ جو تعفن بن جائے۔ چنانچہ مسلم شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۱۴۷ پر ہے۔
عَنْ اَبِيْ ثَعْلَبَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الَّذِيْ يُدْرِكُ صَيْدَهٗ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَكُلْهُ مَا لَمْ يُنْتِنْ ۔
ترجمہ:۔ ابی ثعلبہ نبی کریم علیہ السلام سے راوی اور گوشت کے بارے میں جس کا شکار تین دن بعد ملے۔ تو اگر صحیح ہو تو کھاؤ بدبو چھوڑ دے۔ تو نہ کھاؤ۔ احناف اور شوافع کے نزدیک تو بھسا ہوا گوشت بالکل حرام ہی حرام ہے۔ لیکن نووی مالکی فرماتے ہیں قَالَ بَعْضُ اَصْحَابِنَا يَحْرُمُ اللَّحْمُ الْمُنْتِنُ ۔ (ترجمہ):۔ بعض مالکی اصحاب نے فرمایا کہ بھسا گوشت حرام ہے۔ الغرض یہ کہ یہ صرف نقصان دہی کی بنا پر بہر حال کچھوا حرام ہے۔ اور آج تک اس کی حلت پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکی۔ غیر مقلدوں کا عقیدہ بالکل غلط ہے

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ۔

کتبہ

☆ ☆ ☆ ☆

مشین کے ذریعے ذبح کرنے اور اس کا شرعی حکم

سوال ۸۹:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سوئزر لینڈ میں ایک ذبح کرنے کا آلہ ہے۔ اس میں ذبح کا یہ طریقہ ہوتا ہے۔ کہ جانوروں کو پہلے بجلی کے ذریعہ سے بیہوش کیا جاتا ہے۔ یعنی جانور کے سر میں بجلی کا کرنٹ لگایا جاتا ہے۔ جب جانور بیہوش ہو جاتا ہے۔ تو اس کو اٹھا کر مشین میں لگی ہوئی چھری کے قریب کر دیا جاتا ہے اور چھری جانور کو کاٹ دیتی ہے۔ اب اس جانور کا کھانا کیسا ہے صورت مسئولہ میں باحوالہ فتوی دے کر ثواب حاصل کریں۔

السائل:- (شیخ الحدیث قبلہ حضرت) عبد المصطفےٰ الازہری آرام باغ کراچی

بِعَوْنِ اللّٰہِ الْوَھَّابِ

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق ذبح میں تین باتیں ہونا لازم ہیں (۱) ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا صحیح اہل کتاب مشرک یا کافر نہ ہو۔ موجودہ عیسائیوں کی طرح ملحد نہ ہو۔ اور اہل کتاب یہود کا یا عیسائی جان کر یا بھول کر تکبیر نہ چھوڑے۔ مسلمان جان کر تکبیر نہ چھوڑے (۲) جانور کا بقدر صحت وجسم خون بہ جائے (۳) جانور کی وہ چار رگیں کٹ جائیں یا ان میں سے اکثر کٹ جائیں۔ اگر مذکورہ تینوں شرطیں مشین سے ذبح کرتے وقت پائی گئیں۔ تو جانور حلال ہوگا۔ ورنہ حرام۔ لہٰذا اگر مشین چلنے کے وقت مسلمان قصائی موجود تھا۔ اس نے بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ بھی کہا۔ اور پھر اس طرح جانور کو لٹایا۔ کہ چھری سے چار رگیں کٹ گئیں۔ خون بقدر صحت وجسم خوب نکلا تو حلال شرعی ہوگا اور کھانا جائز ہوگا۔ شریعت میں جانوروں کی جو چار رگیں کٹنی واجب ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ کہ ۱ حلقوم ۲ اور دو رگیں خون کی جن کو عربی میں ودجان کہتے ہیں۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری کا جلد ۵ صفحہ ۲۸۶ پر ہے:- وَالْعُرُوْقُ تُقْطَعُ فِي الذَّكٰوةِ اَرْبَعَةٌ اَلْحُلْقُوْمُ وَهُوَ مَجْرَى النَّفْسِ، وَالْمَرِيْ وَهُوَ مَجْرَى الطَّعَامِ وَالْوَدْجَانِ وَهُمَا عِرْقَانِ فِي جَانِبَيِ الرَّقَبَةِ يَجْرِيْ فِيْهِمَا الدَّمُ۔ یا تو یہ چار رگیں کٹیں یا اکثر ان میں کیوں کہ علم اصول کا قاعدہ کلیہ ہے۔ لِلْاَكْثَرِ حُكْمُ الْكُلِّ۔ مگر حلقوم شرط ہے۔ ذبح کی مندرجہ بالا شرائط سے ایک تو ذبح میں ہونی چاہیے اور دوسری مذبوح میں یہ دو شرطیں جس دھار دار چیز سے بھی پائی جائیں۔ ذبح صحیح ہو جائے گا۔ خواہ اس مشین مذکورہ فی السوال سے یا قصائی کی چھری چاقو، یا لوہے کا پترا یا تیر کے پھل سے یا گنے کے چھلکے سے کبوتر یا خرگوش، بٹیر، چڑیا جیسے جانور کو ذبح کیا۔ جانور بہرحال حلال ہوگا۔ کھانا حلال اور درست ہوگا۔ جانور اگرچہ بیہوش ہو یا کیا گیا ہو ہاں اتنا ضرور خیال رہے کہ وہ جانور کرنٹ سے قبل ذبح مر نہ جائے۔ اگر یہ تین شرطیں مکمل طور پہ نہ پائی جائیں۔ تو جانور کا ذبح کرنا بھی ناجائز۔ اور مسلمانوں کو کھانا اور کھلانا بھی حرام ہوگا۔ اسی طرح جھٹکا کرنا یعنی گردن کے اوپر سے چھری چلانا اس سے بھی جانور حرام

ہو جاتا ہے ۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض آخر

یہ فتاوٰی مختلف اوقات میں لکھے گئے جن کی تاریخیں سوالات کے ساتھ درج ہیں ان فتاوٰی میں کوئی ترتیب نہ تھی ۔ اسی طرح ہی طباعت کا ارادہ تھا ۱۹۷۶ء مطابق ہجری ۱۳۹۶ھ میں جب نظر ثانی کر کے کاتب کو دینے کی ضرورت پیش آئی ۔ تو بہت کمی زیادتی کرنی پڑی ۔ بعض فتاوٰی میں کچھ عبارتیں نکالنی پڑیں اور بعض میں مزید حوالے و مطالب شامل کرنے ضروری سمجھے ۔ اس نظر ثانی میں تقریباً چھ ماہ کا عرصہ صرف ہوا یہ دراز مدت کچھ تو فتاوٰی کی دقت کی بنا پر اور کچھ وقت تدریس و تفسیر نعیمی میں مشغول ہونے کی بنا پر ہوئی ۔ بعض حوالوں کے لیے مجھ کو بہت دراز سفر کرنے پڑے ۔ میں نے اپنے ان فتاوٰی میں نہ تو سنی سنائی عبارت درج کی نہ ہی باحوالہ ۔ جب تک خود اپنی نگاہ سے وہ حوالہ نہ دیکھ لیا اس وقت تک فتوے میں شامل نہ کیا ۔ جب یہ فتاوٰی زائد از نصف کتابت ہو چکا ۔ تو مجھ کو میرے محترم علامہ احمد حسن نوری صاحب خطیب جامع فاروقی ڈاک خانہ مغل پورہ نے ارشاد فرمایا ۔ کہ یہ مجموعہ ترتیب وار ہونا چاہیے مگر اس وقت بوجہ کتابت یہ ناممکن تھا ۔ مگر اب جب کہ بحمدہ تعالٰی اللہ کی عطا سے ایمان سلامتی کی زندگی نے وفا کیا اور اسی رب کریم کی توفیق سے یہ فتاوٰی چھاپنے کی سعادت خود مجھ کو ہی نصیب ہوئی تو پہلی ترتیب ختم کر کے عربی کتب فتاوٰی کی ترتیب سے تمام فتاوٰی کتابت کرا دیے گئے اور نئے فتوے جو اس تین سالہ دور میں مختلف جگہ اندرون و بیرون ملک روانہ کیے گئے جن کی نقل محفوظ تھی وہ بھی ان میں شامل کر کے ۔ فتاوٰی کے اس مجموعے کی دو جلدیں کر لیں ۔ اگرچہ اس میں محنت کافی ہوئی مگر قارئین اور استفادہ چاہنے والوں کے لیے بہت آسانی ہو گئی ۔ میں اس محنت کے لیے اپنے عزیز راجہ محمد صدیق خوشنویس ولد احمد دین ساکن کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ و تحصیل وزیرآباد کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے نہایت محبت و جانفشانی سے اس کی کتابت فرمائی ہے اللہ کا شکر ہے کہ آج مورخہ ۱۔۲۔۸۲ء بروز پیر مبارک مطابق چھ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ رات کے بارہ بجے مجموعہ فتاوٰی العطایا الاحمدیہ فی فتاوٰی نعیمیہ پہلی جلد کی کتابت مکمل ہوئی اس کے بعد دوسری جلد کی کتابت شروع ہوئی ۔ دعا ہے کہ وہ بھی جلد مکمل ہو کر منظر عام پر آ جائے اور ہمارے کاتب راجہ صاحب کو رب تعالٰی زندگی تندرستی اور ایمان مضبوط عطا فرمائے ۔ آمین یا رب العالمین ۔

تمت بالخیر ۔ صلی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ محمد وعلٰی آلہٖ وبارک وسلم ۔ تمت بالخیر